پسِ نوشت

اور

پسِ پسِ نوشت

پروفیسر ڈاکٹر پرویز پروازی

نیا زمانہ

نیازمانہ پبلیکیشنز

پس نوشت
اور
پسِ پس نوشت

پروفیسر ڈاکٹر پرویز پروازی

نیازمانہ پبلیکیشنز

پس نوشت
اور
پس پسِ نوشت

پروفیسر ڈاکٹر پرویز پروازی

ISBN 978-969-9179-01-3

نیا زمانہ

محمد شعیب عادل نے
حاجی حنیف پریس سے چھپوا کر
نیا زمانہ پبلیکیشنز،
14 بی، ٹیمپل روڈ، لاہور سے شائع کی

ماہنامہ نیا زمانہ، 14 بی ٹیمپل روڈ، لاہور، فون 042 5065015

Email:niazamana@yahoo.com, www.niazamana.com

قیمت —— 600 روپے

انتساب

میں اس کتاب کو بھی اپنے
نادیدہ کرم فرما اور بزرگ دوست
جناب شیخ منظور الٰہی
''صاحبِ درِ دلکشا''
کے نام نامی سے معنون کرتا ہوں
گر قبول افتد زہے عز و شرف!

اعترافات

اس کتاب کے سلسلہ میں متعلقہ کتب کی فراہمی کے باب میں جناب بیدار بخت، کرنل انور احمد، جناب شمیم احمد، سید نعیم احمد، جناب عبدالوہاب خاں سلیم، جناب اکرام بریلوی، جناب محمود احمد اور عزیزی عابد محمود نے از راہ کرم دستِ تعاون بڑھایا ان کی اعانت کے بغیر اس کتاب کا مواد فراہم نہ ہو سکتا۔ فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔ جناب عبدالوہاب خاں سلیم صاحب کا خصوصی شکریہ کہ انہوں نے اپنے قیمتی کتب خانہ میں سے بہت سی کتب عاریتاً مرحمت فرمائیں۔ دیارِ غیر میں بیٹھ کر ایسی کرمفرمائی ان جیسے حوصلہ مند اہلِ ذوق اور اہلِ دل ہی کا کام ہے۔

مسودہ کی پروف ریڈنگ میں میرے دوست کرنل راجہ محمد اسلم اور استاذی پروفیسر مبارک احمد انصاری نے بہت وقت صرف کیا اور دقتِ نظر سے پروف ملاحظہ فرمائے۔ اب اگر کوئی غلطی رہ گئی ہے تو اس کی تمام تر ذمہ داری میری لاعلمی پر عاید ہوتی ہے۔

مسودہ کو فنی لحاظ سے مکمل اور چھپنے کے لئے تیار کرنے میں عزیزم نسیم مہدی، عزیزی ہدایت اللہ ہادی، جناب شفیق اللہ صاحب اور رانا نبیل احمد، عزیزی ثمر احمد چوہدری، عزیزی عرفان احمد میاں اور بہت سے دیگر احباب نے بہت محنت کی میں ان سب کا شکر گذار ہوں۔

مندرجات

پسِ پس نوشت

انگریزی سے ترجمہ

◎

دیباچہ حصہ اول

اردو کی خودنوشت سوانح عمریوں پر برصغیر میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہوگا مگر میری نگاہ سے نہیں گذرا۔ اپسالا یونیورسٹی سویڈن میں بعض ریسرچرز کو برصغیر کے مدبرین کی سیاسی سوانحعمریوں پر کام کرواتے ہوئے اردو کی خودنوشتوں پر کام کرنے کی تحریک ہوئی۔ اس سلسلہ میں اصل کام تو متعلقہ کتب کی فراہمی کا تھا بہت سے دوستوں نے دستِ تعاون بڑھایا اور ہوتے ہوتے یہ مطالعہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ لاہور کے رسالہ علامت میں اس سلسلہ کے کچھ مضامین چھپے تو قارئین نے ان کی پذیرائی کی کچھ اس وجہ سے کہ موضوع نیا تھا کچھ اس وجہ سے کہ ہمارے ہاں لوگ اپنے تنقیدی مطالعوں کی بنیاد ستائش باہمی پر اٹھاتے ہیں اور خودنوشت کے ان پہلوؤں کو نظرانداز کرجاتے ہیں جو مصنف کی شخصیت ومنشا کے خلاف ہوں۔ حالانکہ خودنوشت سوانح حیات لکھنے والا اپنے ہم عصروں سے مخاطب نہیں ہوتا اس کا تخاطب آئندہ آنے والی نسلوں سے ہوتا ہے۔ وہ آئندہ نسلوں کے لئے اپنی شخصیت کی مختلف پرتوں کو واضح کرتا ہے ورنہ اس کے ہم عصر تو اس کی شخصیت کو جانتے پہچانتے ہیں اور اس کے مرتبہ و منصب سے آشنا ہوتے ہیں۔ اگلی نسل کا یا، سو، پچاس برس بعد آنے والا قاری جب اس خودنوشت کو دیکھے گا تو اس کے سامنے نہ وہ شخصیت موجود ہوگی نہ اس کی مدح وستائش یا ذم وتخفیف کرنے والے۔ وہ تو اس خودنوشت کے آئینہ میں اس کی شخصیت کے خدوخال تلاش کرے گا۔ اسی لئے علمائے ادب نے کہا ہے کہ خودنوشت میں لکھے گئے حالات وقت کی چھلنی میں چھانے جائیں گے اس لئے خودنوشت لکھنے والے کے لئے لازم ہے کہ صرف وہ باتیں لکھے جن کی صداقت کا اسے وثوق ہو۔ وقت کے آگے جھوٹ یا دروغ کے چراغ نہیں جل سکتے۔ خودنوشت میں اگر کوئی لکھنے والا اپنی شخصیت کے گرد ایسا ہالہ تعمیر کرتا ہے جس کی نیو حقائق پر استوار نہیں تو اس کی شخصیت کی ساری عمارت دھڑام سے نیچے آپڑے

گی۔تب اسے کوئی سہارا دینے والا نہیں ہوگا۔ ہمارے ہاں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں جہاں خود نوشت لکھنے والوں نے خود اپنی شخصیت کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔اسی لئے میرے بزرگ دوست شیخ منظور الٰہی نے جن کی بات کو میں بہت وزن دیتا ہوں اپنے تبصرہ میں یہ شکوہ کیا کہ میں نے بعض مصنفین کے باب میں تعریض و تشنیع و توبیخ سے کام لیا ہے۔ میں نے اپنے لکھے کو مکرر پڑھا مگر میرا ضمیر مطمئن ہے کہ جہاں میں نے ایسا کیا وہ مصنفین اسی بات کے مستحق تھے کہ ان کی دروغ بافیوں اور غلط بیانیوں کو طشت از بام کیا جائے۔ جو کچھ خودنوشت والوں نے لکھا وہ بھی مستقبل والوں کے لئے ہے جو کچھ میں نے لکھا اس کے حسن و قبح اور مناسب و غیر مناسب ہونے کا فیصلہ بھی وقت کرے گا۔مغرب میں اتنا عرصہ رہنے کے بعد یہی بات میں نے سیکھی ہے کہ سچ کو سچ کہو خواہ وہ سچ کڑوا ہی کیوں نہ ہو۔ان معروضات کے ساتھ اپنے تجزیہ کو وقت کے سپرد کرتا ہوں۔

ڈاکٹر پرویز پروازی

پروفیسر، سابق صدر شعبہ اردو

تعلیم الاسلام کالج ربوہ پاکستان

۲۳ مارچ ۲۰۰۳ء

حصہ دوم کے دیباچے کے عوض ڈاکٹر داؤد رہبر کے دو خط

پس نوشت چھپنے کے بعد

فلوریڈا

۱۲ جنوری ۲۰۰۴

کرمفرما ڈاکٹر پروازی صاحب

السلام علیکم۔ پس نوشت کا تحفہ موصول ہوا۔ میں نے بہت دلچسپی کے ساتھ اسے دو تین بار پڑھا۔آپ بیتیوں کا مجھے خاص شوق ہے۔آپ کی تصنیف میں بہت سی ایسی کتابوں کا ذکر ہے جو میری نظر سے نہیں گذریں۔اسے پڑھ کر میری معلومات میں اضافہ ہوا۔

تین اہم آپ بیتیوں کا آپ نے ذکر نہیں کیا۔

ذکر میر۔میر تقی میر اس کا ترجمہ اردو میں دستیاب ہے۔

خاطرات از ظفر حسن آئیبک

نامہ اعمال از سر محمد یامین خاں

آئیڈیل آپ بیتی کا معیار آپ کے ہاں بہت بلند ہے چنانچہ کم ہی ایسی آپ بیتیاں ہیں جو آپ کی کسوٹی پر پوری اتری ہیں۔اختر حسین رائے پوری، اختر الایمان، ادا جعفری، ڈاکٹر وزیر آغا، حمید نسیم اور حمیدہ اختر حسین کی خودنوشتوں کو آپ نے پسند کیا۔چوہدری ظفر اللہ خاں اور سر رضا علی کی بھی تعریف کی ہے۔ یہ دو تو بڑے بزرگ ہیں اور ان کے اسلوب بھی پختہ ہیں۔ چوہدری صاحب کی نثر ستھری اور عمدہ ہے چہل اور بذلہ سنجی کی باتیں اس میں نہیں ہیں۔البتہ ولولہ پیہم ہے، سر رضا علی علیگ برادری کے آدمی ہیں ان کا دبستان اور ہے۔

دکھی قلمکار کی آپ بیتی صرف یادنویسی نہیں ہوتی فریادنویسی بھی ہوتی ہے۔فریاد کی کوئی لے

نہیں ہوتی۔ نالہ کو اگر پابندِ نے کیا گیا تو اسے مے کی ضرورت پڑے گی۔ لکھنے والا کہتا ہے دیکھو مجھ پر کیا بیتی۔ اس کی مثال کشور ناہید کی آپ بیتی ہے۔ آپ بیتی جس عمر میں بھی بے طرح کسی کا جی چاہے تو وہ اسے لکھنے کو بڑھاپے کی آمد پر کیوں اٹھا رکھے۔ قمری اور بلبل اپنا نالہ ملتوی کیسے کریں۔ جز نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے۔ جنگل کی کسی ٹہنی پر بیٹھا ہوا کوئی پرندہ صدا زن ہوتا ہے تو اس کا روئے سخن حلقہء اربابِ ذوق کی طرف نہیں ہوتا۔ یہ صدائے بیکسی اس امید پر ہوتی ہے کہ کوئی ہم نفس جاندار صدا سن کر ہم صفیر ہو جائے اور تنہائی تھوڑی دیر کے لئے دور ہو جائے۔

صداقت کا فرض مؤرخین پر عاید ہوتا ہے۔ آپ بیتی لکھنے والوں میں مؤرخ سب نہیں ہوتے۔ آپ بیتی میں صداقت کی کمی ہو تو اسے معاف کر دینا چاہئے۔ حیوانِ ملبوس اور سوانگ لازم وملزوم ہیں۔ ینگ نے کہیں لکھا ہے کم از کم ایک خاص اور بڑا راز اپنے اعمال کا اپنے تک ہی رکھو اور راز داں کو بھی اس میں شریک نہ کرو تو اس سے تمہیں طاقت حاصل رہے گی۔

آپ بیتی لکھنے والوں کے اخفا سے میں تو محظوظ ہوتا ہوں اس لئے کہ میں خود آپ بیتی لکھوں تو اخفا میرا پیچھا نہ چھوڑے گا۔ مولانا حالی فرما گئے ہیں

تھے لب پے اظہار پر اب آ کے کھلا ہے۔ انسان کو اخفا کے لئے نطق ملا ہے

کوئل کی صدا ہوتی ہے کُوک۔ کبوتر کی غٹرغوں، فاختہ کی کُوکُو، اور پپیہے کی پِیُو پِیُو اور کوے کی کاؤں کاؤں۔ کوے سے یہ کہنا بے سود ہے کہ کوے جا کسی استاد سے سر لگانا سیکھ۔ مولوی نذیر احمد نے اپنے کسی ناول کے اخیر میں ایک ترکیب بند کہہ کر طبع آزمائی کی ہے۔ اس کا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔

گر لاکھ ہیں تو لاکھ میں نوے ہزار ہیں

طوطی چمن میں ایک ہے کوے ہزار ہیں

اگلے وقتوں میں اپنی تصنیف کی طباعت سے پہلے مصنف معاصر بزرگوں سے تقریظیں لکھوایا کرتے تھے اور تقریظ تعارف اور حوصلہ افزائی کے پیرائے میں ہوتی تھی اور دعائے خیر پر ختم ہوتی تھی۔

آپ کے مشاہدات معروضیت اور معقولیت کی راہ سے ہیں۔ میں مبصروں سے رحم دلی اور دعائے خیر کی امید بھی رکھتا ہوں

ٹپکا ہے جو زبان سے خونِ جگر ہے یہ

للہ ہم پہ حملہء نقد ونظر نہ ہو!

زندگی کٹھن چیز ہے۔ متنفس دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں سے آٹھ نو گھنٹے سوتا ہے پندرہ سولہ گھنٹے جاگتا ہے۔ بیداری کے گھنٹوں میں جھمیلوں سے نپٹتا ہے پھر آپ بیتی لکھتا ہے۔ بہت سے کلاکار برسوں ریاض کرتے ہیں۔ پھر گاتے بجاتے ہیں تو امید رکھتے ہیں کوئی کہہ دے واہ! نادار لیکن مہماں نواز میزبان معمولی روٹی سے مہمان کی تواضع کرے اور مہمان معروضیت کے ساتھ کہہ دے یہ سالن کچھ ایسا اچھا نہیں میں نے اس سے بہتر سالن اپنی زندگی میں کھائے ہیں تو ہر چند مہمان کی طرف سے یہ تبصرہ صداقت پر مبنی ہے لیکن اسے رحم دلی نہیں کہہ سکتے۔

آپ بیتی لکھنے والے رادھا کے ہم نوا ہو کر گاتے ہیں ''میری سنو شام''!

جناب عبدالوہاب خاں سلیم نے مجھے بتایا کہ آج کل آپ کچھ علیل ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی تندرستی برقرار رکھے۔

آپ کے افادات کا قدردان

داؤد رہبر

☆

پس نوشت کا دوسرا حصہ چھپنے سے قبل

فلوریڈا

۲۰ مئی ۲۰۰۵

محبِ محترم ڈاکٹر پرویز پروازی صاحب

السلام علیکم۔ پس نوشت کا ضمیمہ (یعنی دوسرا حصہ) آپ نے ملاحظہ کے لئے بھیجا۔ بڑی مہربانی۔ میں نے دلچسپی کے ساتھ اسے پڑھا۔ مشاہدات کے بیچ بیچ میں آپ نے زیرِ تبصرہ مصنف کے اقوال پیش کر دئے ہیں یہ ترکیب کارگر ہے آپ بیتی لکھنے والا غائب نہیں رہتا حاضر ہوتا رہتا ہے۔

آپ کی زبان کی شستگی نہایت قابلِ تعریف ہے۔ برمحل اشعار اور امثال سے آپ کی عبارات

آراستہ ہیں۔ آپ کی نثر تیز رفتار ہے۔ موسیقی کی اصطلاح میں کہیں گے آپ کی نثر کی لے درت ہے۔

آپ نے آہ کہیں نہیں بھری نہ ہاتھ اٹھا کر واہ کہہ کر کہیں داد دی ہے۔

آپ کی تنقیدات سے آپ کی طبیعت کی برہمی آشکار ہے۔ یہ برہمی بے جا نہیں۔ پس نوشت (طبع اول) کے گرد پوش کے پچھلی طرف آپ کی تصویر کے نیچے جو عبارت ہے اس میں بتایا گیا ہے ۱۹۹۷ میں جاپان سے آپ ''واپس آ کر محکمہ تعلیم کی چیرہ دستیوں کا شکار ہوئے اور ۱۹۰۹ میں ہجرت کر کے سویڈن آ گئے۔۔۔ اور اب سویڈن کے شہری ہیں''۔

آغا سہیل کے ساتھ ہم نوا ہو کر آپ نے لکھا ہے ''جب شہر گونگے اور بہرے ہو جائیں تو ان میں رہنے والوں کی منزل کھوٹی ہو جاتی ہے۔ ہم سب اسی المیہ کا شکار ہیں''۔

آپ کے تبصروں پر میرے تاثرات

(۱) احمد بشیر سے آپ ناخوش ہیں اس لئے کہ ''ان کے نام کے ساتھ جس بے خوفی اور برملا گوئی کا تصور وابستہ وہ (آپ بیتی میں) سامنے نہیں آتی۔ اور ان کی آپ بیتی ''سرگزشت اسیرانا'' معلوم ہوتی ہے۔ ان سے آپ کو خاص شکایت یہ ہے کہ انہوں نے مولانا عبدالمجید سالک کو متہم کیا ہے۔

(۲) فرحت اللہ بیگ پر آپ اس لئے طعنہ زن ہیں کہ یہ حیدر آباد دکن کا فصلی سن پوری تفصیل سے لکھتے ہیں۔ عیسوی سن لکھنے سے ان کی ہوس پوری نہیں ہوتی۔ ان کی اس عادت نے آپ کو جز بز کیوں کیا؟ ہوس کا یہاں کیا سوال ہے فصلی سن انہوں نے حیدر آبادی قارئین کی سہولت کے لئے لکھ دیا تو کون سی مصیبت آ گئی؟

فرحت اللہ بیگ نے اپنی آپ بیتی کی اداسی کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے ''اس کہانی میں خوش مذاقی کا پہلو کم ہے تو یہ ہونا بھی چاہئے کیونکہ دنیا میں رونا زیادہ ہے اور ہنسنا کم''۔ اس پر آپ کا ریمارک ہے'' یہ دلیل تو اپنی جگہ درست ہے مگر ایک صاحبِ طرز ادیب کا یہ عذر قابلِ قبول نہیں''۔ فرحت اللہ بیگ نے سچ بولا تو آپ اس سچ سے خفا ہو گئے۔ میں کہوں گا سن رسیدگی کے بعد طبیعت مضمحل اور اداس ہو جائے تو ادبی طرز کو نبھانے کے لئے کوئی اپنے اسلوب کو طربناک کیوں اور

کیسے رکھے۔

مارک ٹوین سے زیادہ بذلہ سنج اور کون ہو گا بڑھاپے میں وہ کہا کرتا تھا عمر بھر میں نے دوسروں کو ہنسایا اب میں افسردہ ہوں تو یہ توقع رکھتا ہوں کہ دوسرے مجھے بہلائیں اور ہنسائیں۔

(۳) ظفر حسن آئیبک کی آپ بیتی پڑھ کر میرا تاثر یہ ہے کہ یہ ایک باہمت آدمی کی داستان ہے۔ جس نے ترکیہ جا کر اعلیٰ درجے کی عسکری ٹریننگ حاصل کی اور ایک ترک شریف زادی سے شادی کر کے ترکوں میں گھل مل کر زندگی بسر کی۔ مولوی شبلی کی سیرۃ النبی کا ترکی ترجمہ کر کے شائع کیا اور نام پیدا کیا۔ سپاہیانہ پیشہ اور عالمانہ قابلیت کا جوڑ میرے خیال میں تحسین کا سزاوار ہے۔ آپ نے ان کی زندگی کے اواخر پر غور نہیں کیا۔ انہوں نے ترکی شہریت اختیار کر لی تھی اور استنبول کے فضلا ان کی علمی فضیلت اور حسنِ اخلاق کے قدردان تھے۔ ان کی واقعہ طلبی کی داد دیجئے کہ اس سے ایک سفرنامہ حاصل ہوا اور ایک غیر معمولی کہانی بنی۔ بعض کہانیاں سنسنی خیز ہوتی ہیں ان کی فلمیں بنائی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر محمد یوسف کے برادر خورد محمد اکرم کی قید یاغستان کی طرح خاطرات بھی سنسنی خیز ہے۔ ہرچند کہ بقول آپ کے ظفر حسن آئیبک اور ان کے ساتھی ''کسی خیالی دنیا میں بس رہے تھے'' اور یہ خواب دیکھ رہے تھے کہ ترکوں کی مدد سے ہندوستان کو انگریزی تسلط سے آزادی دلائیں گے۔

(۴) ابوالحسن نغمی کی آپ بیتی مجھے پسند آئی۔ اس کا وصف انبساط ہے۔ آپ نے اس کتاب سے یہ تاثر لیا ہے کہ نغمی صاحب اپنی بڑائی جتاتے رہتے ہیں۔ برعکس اس کے مجھے محسوس ہوا کہ ان کی سکرپٹ رائٹر کی ملازمت قلم کی مزدوری تھی۔ ریڈیو کے بعض افسران ان کی طبیعت داری سے حسد کرتے تھے اور ان سے حقارت کا سلوک کرتے تھے اور ان کی تعلیمی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتے تھے ، مجھے تو یہ مظلوم آدمی لگے۔

(۵) رفعت سروش کا ذکر کرتے ہوئے خواجہ احمد فاروقی کے ضمن میں آپ نے ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کا ذکر استہزاء کے ساتھ کیا ہے۔ راہ چلتے ایسی تضحیک آپ جیسے سنجیدہ مبصر کو زیب نہیں دیتی۔

(۶) آغا ناصر کی آپ بیتی پر تبصرہ آپ نے ان الفاظ پر ختم کیا ہے ''آغا ناصر کے یہ مضامین

سنگ میل والوں نے چھاپے ہیں اور اس لئے چھاپ دئے ہیں کہ وہ بڑے سرکاری افسر ہیں۔ اب وہ سرکاری افسر نہیں رہے تو انہیں اپنے قلم کے زور پر اپنے آپ کو منوانا ہوگا‘‘۔ جاتے جاتے آپ نے انہیں بھی ایک جوتی جڑ دی۔ اس کی کیا ضرورت تھی؟

ضمیمہ میں آپ نے چند آپ بیتیوں کو سراہا بھی ہے۔ کردار کی خوبی آپ نے جن لکھنے والوں کی تسلیم کی ہے وہ ہیں۔ مسعود کھدرپوش، ظفر اللہ پوشنی، جنرل عتیق الرحمن، احسان دانش اور اقبال اخوند۔

(۷) قیصری بیگم، شہزادی عابدہ سلطان اور ملکہ فرح پہلوی کی آپ بیتیوں میں ایسی تاریخی معلومات ہیں جن سے ہم سب کو دلچسپی ہے۔ ان کی قدردانی میں ہم آپ کے شریک ہیں۔

(۸) میر ولایت حسین کی آپ بیتی کی تاریخی اہمیت پر آپ کا تبصرہ منصفانہ اور مؤدبانہ ہے۔

اب ان باحیثیت شخصیتوں کا ذکر باقی ہے جنہوں نے سیاست کی بازیوں میں حصہ لیا۔ الطاف گوہر، نسیم حسن شاہ، سجاد علی شاہ، محمد احمد خاں صمدانی اور اجمل میاں۔ ان کے کرداروں کی جو اچھائیاں اور برائیاں ان کی آپ بیتیوں میں آپ کو نظر آئیں ان پر رائے زنی کی لیاقت مجھ میں نہیں۔ میری زندگی کے گزشتہ پچپن برس دیارِ مغرب میں گذرے ہیں۔ پاکستان کی اقتصادی اور دینی سیاست سے میری ناواقفیت عبرتناک ہے۔ زندگی کے کسی دور میں بھی اخبار بینی میرے معمولات میں جگہ نہیں پا سکی۔

پس نوشت کے پہلے ایڈیشن (یعنی حصے) اور اس کے ضمیمے کو پڑھتے ہوئے فرائڈ کے ایک قول کا خیال مجھے برابر آتا رہا‘‘ دو باتوں کا اثر زندگی میں سب سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ اول آپ نے روزی کس پیشے سے کمائی۔ دوم۔ شادی کس سے کی۔‘‘

اردو میں آپ بیتی لکھنے والے اپنے پیشے سے متعلق بہت کچھ لکھتے ہیں لیکن نجی حالات کی تفصیل میں نہیں جاتے۔ ماں باپ کے ازدواج کے کوائف، ماں باپ سے اپنی محبت یا شکایات کی باتیں، بھائیوں اور بہنوں کے درمیان محبتوں اور رقابتوں کے قصے، اپنی ازدواج کی آسودگی یا ناآسودگی کی تفاصیل، بیان سے باہر رہتی ہیں۔ فرائڈ نے سمجھایا ہے کہ بلوغت کے بعد تادم مرگ فرد کے بشری تعلقات کا ڈرامہ ان گھریلو تعلقات کی نوعیت سے بے طرح متاثر رہتا ہے۔

آپ بیتیوں کو آپ صرف صداقت کی کسوٹی پر گرتے ہیں۔ یہ بھی تو سوچئے کہ انسان حیوانِ

ملبوس ہے، دیکھا جائے تو پہلا دروغ تو لباس ہے۔ بعض ضیافتوں میں شرکت کے لئے ڈنر سوٹ کی شرط لگا دی جاتی ہے۔۔ چھریرے اور بانکے بھدے اور بے ڈول ابدان ان سب کو ڈنر سوٹ یکساں کر کے رکھ دیتا ہے۔ جنٹلمین کسے کہتے ہیں اس کا جواب برنارڈ شاء نے خوب دیا A gentleman is a head sticking out of a suit

جسٹس محمد احمد خاں صمدانی کی آپ بیتی آپ کو بہت پسند آئی۔ اس کی تعریف میں ایک جملہ لکھتے ہی آپ کا خیال ان آپ بیتیوں کی طرف پھر گیا جو آپ کی رائے میں محاسبہءِ نفس کی تپیا کے بغیر لکھ ڈالی گئیں۔ آپ لکھتے ہیں ’’اردو کی خودنوشتوں میں حال ہی میں جسٹس محمد احمد خاں صمدانی کی مختصر اور خیال انگیز خودنوشت ’’جائزہ‘‘ تازہ ہوا کا خوش گوار جھونکا بن کر نمودار ہوئی ہے۔ پچھلے کچھ برسوں میں اردو کے ادب میں ضخیم اور لایعنی تفصیلات سے مملوئی خودنوشتیں منظر عام پر آئی ہیں۔ جن میں لکھنے والوں نے اپنی شخصیت کو نت نئے زاویوں سے کرشماتی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اپنے آپ کو زمانے سے ماوراء کوئی شے سمجھ لیا ہے۔ کچھ نے یہ جانا ہے کہ وہ اپنی جوانی کی بے راہ رویوں کو بیان کر دیں گے تو لوگ ان کی اس جراتمندانہ سعی پر داد وتحسین کے ڈونگرے برسائیں گے۔ کچھ نے یہ فرض کر لیا ہے کہ وہ جو کچھ لکھیں گے لوگ ان کی باتوں پر بے سوچے سمجھے آمنا وصدقنا کہیں گے مگر ایسے لوگ یہ بھول گئے کہ خودنوشت لکھنا اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا انہوں نے جان لیا ہے۔ اپنی شخصیت کو دیانت داری سے خود جانچنا پرکھنا اور پیش کرنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے۔ لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا!‘‘۔ آپ کے اس قول کو پڑھ کر میں سوچ رہا ہوں کیوں نہ ڈاکٹر پروازی صاحب خود ایک آپ بیتی لکھ کر دکھائیں کہ مثالی آپ بیتی یوں لکھی جاتی ہے۔

اردو کی آپ بیتیوں سے تعارف کرانے میں سبقت کا سہرا آپ کے سر ہے۔ اس پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ آپ کی تنقید کا لہجہ اگر نرم ہوتا تو کتاب کی خوبی بہتر ہوتی۔

نیازمند

داؤد رہبر

ڈاکٹر داؤد رہبر صاحب کے ان دونوں خطوں کو میں بلا پس وپیش قارئین کی نذر کر رہا ہوں اگر مجھے خودنوشت سوانح نگاروں کی تصانیف کا کڑے معیار پر مطابق تجزیہ کرنے کا حق حاصل ہے تو دوسروں کو بھی میرے ساتھ اختلاف کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ والسلام

ڈاکٹر پرویز پروازی

5914 Long Valley Road,

Mississauga. Ont. L5M 6J6 Canada.

یکم جون ۲۰۰۷

خودنوشت سوانح عمری کا فن اور تاریخ

اردو میں سوانح عمریوں کا سلسلہ تو پرانا ہے مگر خودنوشت سوانح عمریوں کا رواج انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں ہوا۔ ہمارے ورثہ میں سوانحی ادب کے طور پر توزک نویسی کا سکہ رائج رہا۔ توزک بابری اور توزک جہانگیری کا تذکرہ جہاں تہاں ہمارے ادب میں مل جاتا ہے مگر ہم نے روایتاً اس اسلوب کو تاریخ نویسی کا جزو ہی خیال کیا۔ پھر ہمارے ہاں وقائع کا لفظ بھی موجود ہے اس لفظ سے بھی سوانح' یادداشت اور تاریخ تینوں کی خوشبو آتی ہے۔ مگر باقاعدہ ادبی روایت کے طور پر ہمارے ہاں اردو میں خودنوشت سوانح عمری کا رواج بہت دیر سے ہوا۔ اگرچہ برصغیر میں سیاسی مدبرین نے اپنی خودنوشت سوانحعمریاں لکھنے کی طرح ضرور ڈال دی تھی مگر اردو والوں نے اس روایت کو دیر سے پذیرائی بخشی۔ دیر آید درست آید۔

ادب کی تاریخ میں سوانحی ادب کی اصطلاح خاصی وسیع اصطلاح ہے اس میں تاریخ' حالات' وقائع' ڈائری' جرنل اور رجال سب کچھ ہی سما سکتا ہے۔ مگر اس دائرہ کو تنگ کرتے ہوئے علمائے ادب نے بیسویں صدی کے آغاز تک یادداشتی ادب یعنی MEMOIRS اور سوانحی ادب یعنی BIOGRAPHY کو جدا جدا اکائی کی حیثیت سے تسلیم کیا اور انہیں اسی حیثیت سے جانچا اور پرکھا ہے۔ سوانحی ادب میں خودنوشت سوانح عمری کا لفظ تو 1809ء میں استعمال میں آنا شروع ہوا مگر جن ابتدائی خودنوشت سوانح عمریوں کا ذکر انگریزی ادب میں موجود ہے ان میں سینٹ آگسٹین (۳۵۰۔ ۴۰۳) کے ''اعترافات'' کو پہلی خودنوشت سوانح عمری قرار دیا جاتا ہے۔ اعترافات ۳۹۹ عیسوی میں لکھے گئے اور ان میں سینٹ موصوف کے بچپن کی منظر کشی' ماں کے پیار کا بیان' صداقت کی جستجو میں گناہ و

ثواب کی کشمکش اور بالآخر عیسائیت کی قبولیت کو بڑے دلنشیں طریق سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ اعترافات صدیوں بعد بھی اسی طرح مقبول سمجھے جاتے ہیں۔

خودنوشت سوانح عمریوں کے تاریخی ارتقاء کا جائزہ لیتے ہوئے انہیں چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ سینٹ آگسٹین کے اعترافات کو پرانی اور کلاسیکی دنیا کے زوال سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے نتیجہ میں سینٹ موصوف کو خیال پیدا ہوا کہ انہیں اپنے اعترافات کو منظرِ عام پر لانا چاہئے اگر معروضی طور پر وہ حالات پیدا نہ ہوتے تو شاید یہ اعترافات سامنے نہ آتے۔ اس وقت سے لے کر نشاۃ ثانیہ اور اصلاحات کے زمانے تک کوئی قابل ذکر خودنوشت نہیں لکھی گئی تا آنکہ ان دونوں تحریکوں نے فرد کی انفرادیت پر مہر تصدیق ثبت کردی۔ خودشناسی پرانی دنیا میں معدوم تھی مگر نشاۃ ثانیہ اور اصلاحات نے قدیم دور کی حکمت کو بھی دریافت کیا اور اس طرح فرد کو ماضی کے تناظر میں اپنے اندر جھانکنے پر آمادہ کیا اس طرح خودشناسی وجود میں آئی۔ اس نے انسان کو اپنی ذات کے اظہار پر مجبور کیا اور اسے اپنے سامنے جواب دہ قرار دیا جب کہ حکمت قدیم والے اسے محض خدا کے سامنے جواب دہ جانتے تھے۔ اس دور کے تین خودنوشت سوانح نگاروں کو نمائندہ قرار دیا جاتا ہے۔ سیلینی (۱۵۰۱-۱۵۷۱) جیروم کارڈان (۱۵۰۱-۱۵۷۶) اور مانٹین (۱۵۳۳-۱۵۹۲)۔ ان لوگوں نے خودنوشت سوانح عمری کے فن کو آگے بڑھایا۔ اول الذکر ایسے مصنف تھے جنہوں نے اپنی زندگی کو موضوع بنایا ہے اور ان کا بیان اتنا دلنشیں ہے کہ قاری پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ سینٹ آگسٹین نے اپنے اندر کو موضوع بنایا تھا سیلینی نے باہر کو موضوع بنایا ہے اس شخص کے ہاں بے پناہ خودشناسی اور ایک حد تک خودستائی بھی تھی۔ مؤخر الذکر دونوں مصنفین کے ہاں بیان کرنے کو کچھ نہیں مگر خودستائی میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ کارڈان صاحب پہلے تو مرد کے سارے اوصاف بیان کرتے ہیں اور پھر نمبروار اپنی ذات کو ان اوصاف سے متصف کرتے چلے جاتے ہیں۔ انہوں نے ہمارے جوش صاحب کی طرح جھوٹ اور غلط بیانی کی اپنی تعریف نہیں گھڑی اور خود کو اپنی بیان کی ہوئی جھوٹ کی تعریف کے مطابق بری الذمہ قرار نہیں دیا۔ مگر کارڈان صاحب کا تخیل کہیں کہیں ان کی زندگی کے حقائق پر ضرور غالب آ گیا ہے۔ ان کے ہاں ترتیب تو شاید موجود نہیں مگر انہوں نے کسی موقع پر بھی عقل و تعقل کا دامن نہیں چھوڑا۔ اس طرح ان کے ہاں بہت سی

داخلی کیفیات ابھر کر سامنے آگئی ہیں۔ دوسرے دور کے ان مصنفین میں بہت سے دوسرے مصنفین کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے جن میں ایک نام جان بنین کا بھی ہو سکتا ہے جس نے اپنی خودنوشت کو افسانوی روپ دے دیا تھا۔

اٹھارویں صدی میں جب انسانی ذہن کا افق وسیع تر ہو گیا تو خودنوشت سوانح عمریوں کا بھی ایک نیا باب طلوع ہوا۔ اس دور کا نمایاں ترین خودنوشت سوانح نگار تو روسو (۱۷۱۲-۱۷۷۸) ہے جو اپنی ذات کے سوا کسی اور کو ذرا سی اہمیت دینے کر تیار نہیں تھا۔ نہ ہی اسے دوسروں کی تجویز کی ہوئی زندگی گذارنے کی خواہش تھی۔ اس نے اپنی زندگی اپنے اصولوں کے مطابق بسر کی اور اپنے نظریات پر بھی پوری ثابت قدمی سے قائم رہا۔ اس کے اعترافات اس کی زندگی کے پورے پورے مظہر ہیں۔

بیسویں صدی کے ساتھ خودنوشت سوانح نگاری کا بھی ایک اہم باب طلوع ہوا کیونکہ علمِ نفسیات والوں نے انسانی ذات کی باریک در باریک پرتوں کو بھی دریافت کرنا شروع کر دیا۔ اس سلسلہ میں ہمارے ہاں علی عباس جلالپوری نے جوش صاحب کی ''یادوں کی برات'' کا ایسا تجزیہ کیا تھا کہ اس جیسا تجزیہ اس سے پہلے شاید ہی کسی نے کیا ہو۔ ایک بڑے آدمی کے اندر جھانک کر اس کی ذات کے گرد بنے ہوئے مکڑی کے جالے کا تار و پود بکھیر دینا اس سے پہلے کم از کم اردو ادب میں نہیں ہوا تھا۔ پھر بیسویں صدی میں نظریاتی سطح پر مختلف نظریات ہی وجود میں نہیں آئے ان نظریات کی بنیاد پر نظام وضع ہوئے اور ان کی عملی صورتیں تشکیل پذیر ہوئیں۔ انسان ایسے ذہنی اور جسمانی تفرقہ اور عصبیت کا شکار ہوا کہ پہلے زمانوں میں اس کی وسعت کا تصور بھی ممکن نہیں تھا اس دور میں ہر شے عالمی سطح پر آ گئی۔ جنگیں بھی عالمی سطح پر ہوئیں اور خون خرابہ بھی اسی وسیع تر سطح پر ہونا شروع ہوا۔ ذرائع مواصلات و ابلاغ نے بے پناہ وسعت اختیار کر لی ان تمام باتوں نے فرد کے ذہن کو بھی عالمی وسعت اور ہمہ گیری دے دی۔ اس صدی میں خودنوشت لکھنے کی طرف توجہ بھی زیادہ ہوئی مگر لکھنے والوں کو احساس بھی ہوا کہ اب کسی فرد کا اپنی ذات کے بارہ میں لکھا ہوا ہر صحیفہ بلا چون و چرا تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ اس کی جانچ پرکھ سائنسی اصولوں پر ہو گی اور دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔ جہاں خودنوشت نگار کا ذہن اکیلا نہیں رہا وہاں پڑھنے اور جانچنے والا بھی تنہا نہیں رہا۔

سوانحی ادب کی تین بنیادی اکائیوں توزک، یادداشتوں اور خودنوشت سوانح عمری میں بہت باریک سا فرق ہے۔ بہت لوگوں نے اپنی خودنوشت سوانح نگاری کو اپنے میمائرز یا یادداشتیں کہا ہے۔ مثلاً آغا خاں سوئم، سر سلطان محمد خاں نے اپنی خودنوشت سوانح عمری کو THE MEMOIRS OF THE AGA KHAN کہا اور لکھا ہے۔ اس صدی کے شروع تک یادداشتوں اور خودنوشت سوانح عمریوں کو دو علیحدہ علیحدہ اکائیاں سمجھا جاتا تھا اور اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی تھی کہ یادداشتیں لکھنے والے کو کوئی مشہور و معروف شخصیت ہونا چاہئے جس نے تاریخ میں کوئی اہم کردار ادا کیا ہو یا اپنی آنکھوں کے سامنے تاریخی واقعات کو رونما ہوتے دیکھا ہو۔ مثلاً انگلستان کی سترھویں صدی کی خانہ جنگی کے بعد مشہور و معروف لوگوں نے اپنی یادداشتیں رقم کیں اور فرانسیسی یادداشت نگاروں نے تو اس صنف میں کمال حاصل کیا۔ یادداشتیں لکھنے والے کی شخصیت کی بہت سے پرتیں لکھتے لکھتے سامنے آتی چلی جاتی ہیں مگر ان کا بنیادی مقصد اپنے اردگرد ہونے والے واقعات و حالات کا بیان ہوتا ہے اسی طرح دیگر افراد کے احوال کا ذکر بھی۔ اس لئے یادداشتی ادب کو عین مین خودنوشت سوانح عمری نہیں کہا جاتا تھا۔ سر آغا خان نہ صرف ہندوستان بلکہ انگلستان اور افریقہ میں رونما ہونے والے بہت سے واقعات و احوال کے گواہ تھے بلکہ بہت سے تاریخ ساز واقعات کا خود بھی حصہ تھے اس لئے ان کی خود نوشت کے لئے میمائرز سے بہتر لفظ ملنا ممکن ہی نہیں تھا۔

خودنوشت سوانح عمری کی سادہ سی تعریف تو بس اتنی سی ہے کہ وہ سوانح عمری جو خود لکھی گئی ہو بالکل افسانہ کی سہل ممتنع تعریف کی طرح کہ مختصر افسانہ وہ افسانہ ہے جو مختصر ہو۔ مگر خودنوشت سوانح عمری پر غالب کا کہا صادق آتا ہے کہ ''لکھنا'' ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے۔ دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں۔ اس لئے خودنوشت سوانح عمریوں کے تاریخی اور ارتقائی جائزہ سے پہلے اس صنف کے فن کے باب میں بھی کچھ کہنا مناسب ہے۔ بات پھر غالب پر آ کر رکتی ہے کہ '' ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال''۔ اسی طرح جتنے منہ اتنی باتیں کے مصداق خودنوشت سوانح عمری کے اسلوب کے بارہ میں یہ محاورہ وضع کر لینے میں کوئی ہرج نہیں کہ جتنے خودنوشت سوانح نگار اتنے ہی اسلوب۔ اگر ایسا نہ ہو تو لوگوں کو کیا پڑی ہے کہ وہ زید بکر یا عمرو کی خود لکھی ہوئی سوانح پڑھتے پھریں؟ ان اسالیب کا جائزہ واضح

کرتا ہے کہ خودنوشت سوانح عمریاں ذاتی اور ذہنی سطح پر ایک دوسرے سے ممتاز، منفرد، جدا اور مختلف ہوتی ہیں۔ ذاتی سطح پر یوں کہ لکھنے والا کون ہے اور کس نے واقعات و احوال کو کتنی اہمیت اور جگہ دی ہے اور ذہنی طور پر یوں کہ کس نے کس واقعہ کے بارہ میں کیا ردعمل ظاہر کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ خودنوشت سوانح عمریاں اپنی وسعت اور تنوع کے اعتبار سے بھی مختلف ہوتی ہیں۔ یہ عنصر بھی اہمیت رکھتا ہے کہ لکھنے والے نے رجال کو کتنی اہمیت دی ہے اور اپنی ذات کے اردگرد کس نوعیت کا تانا بانا بنا ہے۔ تیسری بات اخلاقیات سے تعلق رکھتی ہے کہ لکھنے والے نے احوال و واقعات کے بیان میں کہاں تک سچ برتا ہے اور کہاں کہاں اس کے بیان میں دروغ بافی آ شامل ہوئی ہے۔ خودنوشت کے موضوع یعنی مصنف کی یادداشت نے کہاں کہاں اور کس کس موقع پر اس کا ساتھ دیا ہے یا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ اس نے اپنے تعصّبات و اعتقادات کے اظہار میں کس حد تک ذہنی سچائی اور خلوص و صداقت کو ملحوظ رکھا ہے۔ اس نے اپنے نظریات کے باب میں کس حد تک توازن برقرار رکھا ہے کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ اپنا بیان حسنِ طبیعت نہیں مجھے کہنے کے باوجود وہ اپنے بیان کی رو میں بہہ گیا ہے؟ اور چوتھی بات جو اس بارہ میں اہمیت رکھتی ہے وہ لکھنے والے کا اسلوب ہے۔ اچھا ہو یا برا۔ دل نشیں ہو یا غیر دلچسپ مبالغہ سے مملو ہو یا خاکساری وانکساری سے بھرپور لکھنے والے کا اسلوب بہر حال اس کے ساتھ رہتا ہے اور کسی خودنوشت کے پسندیدہ یا ناپسندیدہ ہونے یا ادبی لحاظ سے وقیع یا غیر وقیع ہونے کا بیشتر انحصار اس اسلوب پر ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں کے بعض اچھے ادیبوں کی خودنوشت سوانح عمریاں ان کی ادبی بڑائی اور سچائی کا ساتھ نہیں دے سکیں۔

اپنی سوانح عمری لکھنے والوں کے اسالیب کے ساتھ ان کے مقاصد بھی مختلف ہوتے ہیں۔ اہم لوگوں نے بھی اپنی سوانح عمریاں لکھی ہیں غیر اہم لوگوں نے بھی۔ اچھوں نے بھی بروں نے بھی، بڑوں نے بھی چھوٹوں نے بھی۔ صاحبِ طرز ادیبوں نے بھی عام قلم کاروں نے بھی مگر غور سے تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سب لکھنے والوں نے اپنے آثار و احوال سے ایک حد تک بعد اور فاصلہ ضرور قائم رکھا ہے۔ کسی نے اپنی زندگی کو ایک پوری اکائی کے طور پر بیان نہیں کیا۔ ان کے تجربات ایک خاص نہج تک محدود رہے یا انہوں نے ایک خاص نہج پر انہیں بیان کیا ہے۔ انہوں نے اپنی ناکامیوں

اور کامیابیوں کو ایک خاص حد تک بیان کیا ہے کامیابیوں کو زیادہ ناکامیوں کو نسبتاً کم ۔ دونوں صورتوں میں افراط وتفریط بھی دیکھنے میں آئی ۔ بعض نے اپنی ذات کو اس حد تک نفی کر دیا کہ ان کے ارد گرد ہونے والے واقعات میں ان کا کردار واضح نہ ہو سکا' بعض نے اپنے ذاتی احوال کو اس حد تک بڑھا دیا کہ ساری دنیا انہی کے گرد گھومتی دکھائی دیتی ہے ۔ یہ درست ہے کہ خودنوشت کا مرکزی کردار لکھنے والے کی ذات ہوتی ہے اس لئے تاریخ یا واقعات کو اس کے سیاق وسباق میں دیکھنا چاہئے مگر یہ تو نہیں ہونا چاہئے کہ مصنف بالکل منہا ہو جائے یا کلیتہً مرکزی حیثیت اختیار کر لے ۔ لارڈ بٹلر نے جو رائیل سوسائٹی آف لٹریچر کے صدر تھے اپنے مشہور زمانہ لیکچر THE DIFFICULT ART OF AUTOBIOGRAPHY میں لکھا ہے کہ لارڈ ارون (جو وائسرائے ہند ہونے کے وقت لارڈ ارون کہلاتے تھے اور بعد کو اپنے باپ کی وفات کے بعد لارڈ ہیلیفیکس کہلائے) نے اپنی خودنوشت میں گھوڑوں اور کتّوں کا ذکر تو بہت کیا ہے مگر اپنے سیاسی کردار کو اس حد تک نظرانداز کر دیا ہے کہ کوئی انجان مؤرخ انہیں تاریخ سے منہا بھی کر سکتا ہے ۔ اسی طرح لارڈ برکن ہیڈ نے اپنی خودنوشت میں اتنی مبالغہ آمیزی سے کام لیا ہے کہ سوانح عمری کے مقابلہ میں لارڈ برکن ہیڈ بہت چھوٹے لگنے لگتے ہیں ۔ چرچل کی خودنوشت کے بارہ میں لارڈ بالفور کا یہ فقرہ بھی لارڈ بٹلر ہی نے روایت کیا ہے کہ "میں آج کل چرچل کی خودنوشت پڑھ رہا ہوں جو اس نے تاریخ عالم کے نام سے لکھی ہے" اور ہمارے ہاں بھی ایسے بزرگوں کی کمی نہیں ۔

خودنوشت لکھنے کے محرکات بھی مختلف ہوتے ہیں ۔ مثلاً اپنی زندگی کی افادیت کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے یا خود کسی عظیم مقصد میں کامیاب ہونے کے بعد دوسروں کو بھی ایسے ہی مقاصد کے حصول پر اکسانے کے لئے' اپنے ماحول کو تغیر آشنا کرنے کے لئے یعنی "دوسروں کی اصلاح" کے لئے یا خود کسی ناکامی سے دوچار ہونے کے بعد دوسروں کو متنبہ کرنے کے لئے کہ "من نہ کردم شما حذر بکنید" ۔ اکثر صورتوں میں اپنے کارناموں کے بیان کے لئے کہ مبادا تاریخ دان صحیح علم نہ ہونے کی وجہ سے تاریخ میں ان کے کردار کو نظرانداز کر دے ۔ چرچل کی خودنوشت سوانح حیات تاریخ کو درست رکھنے کی ایک کوشش کے سوا اور کیا ہے؟ ہمارے ہاں اردو میں تین سیاسی خودنوشتیں چھپیں ۔ تقسیم ملک سے پہلے سر

رضا علی کی اعمال نامہ اور تقسیم ملک کے بعد سر ظفر اللہ خان کی "تحدیثِ نعمت" اور سر یامین خاں کی "نامہ ء اعمال" ۔ سر رضا علی نے علی گڑھ تحریک اور علی گڑھ کالج کی تاریخ کو درست رکھنے کی غرض سے یہ کتاب لکھی تھی ۔ سر ظفر اللہ خان نے اپنی خودنوشت کا نام ہی تحدیثِ نعمت رکھا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر اور ان نعمتوں میں اہلِ ہند اور بالخصوص مسلمانانِ ہند کی ان سیاسی خدمات کا بھی برملا ذکر ہے جن کی توفیق انہیں اللہ کے فضل وکرم سے نصیب ہوتی رہی اور جنہیں آج کے نام نہاد دیانت دار مؤرخین نظرانداز کرنے کی سعی ء بلیغ میں مصروف ہیں ۔ "نامہ ء اعمال" تقسیم ملک سے عین قبل کی سیاسی ڈائری کا حکم رکھتی ہے اور قیام پاکستان کے بعد کی ابتدائی صورت حال پر بھی ایک جامع تبصرہ ہے ۔

لارڈ بٹلر نے خودنوشت سوانح نگاری کے فن پر بھی کچھ باتیں ایسی لکھی ہیں جنہیں اردو کے قارئین کے علم میں بھی ہونا چاہئے ۔ آپ نے فلپ گیدلا (۱۸۹۹ـ۱۹۴۴) کا حوالہ دیا ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ "سوانح نگاری ایسا علاقہ ہے جس کے شمال میں تاریخ' جنوب میں فسانہ طرازی' مشرق میں تعزیت نگاری اور مغرب میں کوفت اور ناگواری کے علاقے واقع ہیں" اور یہ سارے علاقے خودنوشت سوانح نگار کو بھی فتح کرنے یا کم از کم تصرف میں لانا پڑتے ہیں ۔ اس لئے خودنوشت سوانح نگار کا کام محض سوانح نگار سے زیادہ مشکل' پیچیدہ اور دشوار ہو جاتا ہے ۔ اس نے جانسن کی سوانح کا حوالہ دیا ہے کہ جانسن نے اپنی خودنوشت لکھی مگر پھر اسے اپنے ملازم کی موجودگی میں نذرِ آتش کر دیا ۔ اس کے بعد باسویل نے جانسن کی سوانح عمری لکھی ہے جسے انگریزی زبان کی سب سے مستند سوانح عمری کہا جاتا ہے اس میں مصنف نے جانسن کے سنکی ہونے کا دل کھول کر ذکر کیا ہے جانسن خود اس بات کا ذکر کہاں کرتے؟ جانسن نے اپنی سوانح عمری ضائع کرنے کا ایک سبب یہ بھی بیان کیا کہ " کون ہے جسے اپنا اعمال نامہ خود لکھنے کی وجہ سے شہرت ملی ہو؟" ڈاکٹر جانسن اپنے زمانہ کے مشہور ادبی رسالہ THE CRITICAL REVIEW (۱۷۵۶ـ۱۷۹۰) میں لکھا بھی کرتے تھے اس میں انہوں نے لکھا کہ "ہم خود پسندوں کو چار طبقوں میں تقسیم کر سکتے ہیں پہلا جولیس سیزر کہ وہ اپنے معاملات کے باب میں خود بیان کرتا ہے مگر اس کی تصدیق اس کے عمل سے بھی ہوتی ہے اور اس کی شخصیت میں ایک خاص تہور اور وقار بھی موجود ہے دوسرے طبقہ میں انطونیو ہے جس کا شریفانہ خلق اس کو مقبول عام بناتا ہے

تیسرا طبقہ وہ ہوتا ہے جو اپنی ذاتی تاریخ کو ادبی واقعات کی آمیزش سے وقیع بنانے کی کوشش کرتا ہے اور چوتھے وہ لوگ ہیں جو روحانی وقائع نگار ہیں جو اپنے تعصبات کو ہوا دیتے ہیں''۔ لارڈ بٹلر کا خیال ہے کہ یہ باتیں آج کے خودنوشت سوانح نگاروں پر بھی منطبق کی جاسکتی ہیں۔

کسی خودنوشت سوانح نگار کو اپنی انا جیسے دشمن ہی سے برسرِ پیکار نہیں ہونا ہوتا اس کی راہ میں اور بھی بہت سی مشکلات حائل ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ہماری توزک کی روایت میں بادشاہوں کے روزنامچے موجود ہیں مگر وہ اپنے دور کی مستند تاریخ تو نہیں کہلا سکتے مگر شاہوں کے ان فرامین سے عوام کے ردعمل کا اندازہ ضرور ہوجاتا ہے۔ توزک انا پرستوں کے لئے بہترین اسلوب ہے اور عمرانیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے دلچسپی کا موجب بنتا ہے اس لئے موجودہ دور کے فنی لوازم کا لحاظ رکھتے ہوئے ہم توزک کو خودنوشت سوانح کے زمرہ میں شمار نہیں کرسکتے۔ توزک انا پرستی کا نادر نمونہ ہوتی ہے' مطلق العنان بادشاہوں کا کہا سنا لکھا سب مستند ہوتا ہے۔ مستند ہے میرا فرمایا ہوا۔ مگر خودنوشت سوانح نگار اگر اپنے لکھے کو مستند کہنا چاہے گا تو اسے قدرت اللہ شہاب کی طرح تاریخ کو مسخ کرنا ہوگا یا جوش صاحب کی طرح اپنی تاریخ خود بنانی پڑے گی۔ ''خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں''۔

خودنوشت کے اسلوب میں یادداشتیں بھی اہمیت رکھتی ہیں ان میں بھی راوی مصنف کی اپنی ذات ہوتی ہے مگر اسے ایک مناسب حد تک اپنے کو فاصلہ پر رکھنا پڑتا ہے تاکہ وہ واقعات کو مناسب فاصلے سے دیکھ سکے اور رجال کو مناسب نزدیکی سے پہچان سکے۔ ہمارے ہاں یادداشتوں کا سب سے عمدہ نمونہ مرزا ظفر الحسن کی کتاب ''ذکرِ یار چلے'' ہے' صدیق سالک نے اپنی کتاب سیلوٹ میں کرنل محمد خان کی کتاب بجنگ آمد کو ان کی جنگ عظیم دوم کی یادداشتیں کہا ہے ان مثالوں سے یادداشتوں اور خود نوشت کا فرق واضح ہوجانا چاہئے مگر دوستوفسکی کا یہ مقولہ یاد رکھنے کی چیز ہے کہ ''ہر آدمی کی کچھ یادیں ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں وہ ہر کس و ناکس کے سامنے بیان نہیں کرسکتا۔ صرف اپنے دوستوں کے سامنے بیان کرسکتا ہے۔ پھر کچھ ایسی یادیں ہوتی ہیں جنہیں وہ اپنے دوستوں کے سامنے بھی بیان نہیں کرسکتا ہاں کبھی کبھار تنہائی میں اپنے آپ سے دہراتا رہتا ہے وہ بھی پوشیدہ طریق سے اخفا کے ساتھ اور بعض چیزیں تو ایسی ہوتی ہیں جنہیں وہ اپنے آپ سے بھی چھپاتا ہے اور کسی صورت میں ظاہر نہیں کرنا چاہتا

اور ایسی چیزیں تھوڑی نہیں ہوتیں بہت ہوتی ہیں''۔

شعوری یا تحت الشعوری اخفاء کے باوجود خودنوشت سوانح نگار کو بہرطور اپنی یادداشت پر انحصار کرنا ہوتا ہے خواہ محض یادداشت کا سہارا لے یا ڈائری کا جرنل کا یا اپنے نوٹس سے کام لے مگر یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ انسان کی یادداشت اسے دھوکا بھی دے سکتی ہے۔ انسان کا ذہن فراموش ہی نہیں کرتا چیزوں کی کانٹ چھانٹ بھی کرتا رہتا ہے اور صرف وہی حقائق ہمارے ذہن میں محفوظ رہ جاتے ہیں جنہیں وہ محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ اور وقت کی کانٹ چھانٹ کے باوجود انہیں فراموش نہیں کر پاتا۔ ہڈسن نے لکھا ہے ''جب کوئی شخص اپنی زندگی کے ابتدائی واقعات کو یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ ایسا ہونا کلیتہً ممکن نہیں۔ اس کی مثال اس شخص کی سی ہوجاتی ہے جو پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہوکر سامنے کا منظر نامہ دیکھنا چاہتا ہے ان میں سے کچھ بادلوں میں چھپا ہوا ہے۔ وہ فاصلہ سے دیکھتا ہے تو اسے کوئی شے یہاں سے دکھائی دیتی ہے کوئی وہاں سے۔ کہیں زمین کا منظر ہے کہیں پہاڑ کا یا جنگل کا نظارہ ہے یا کوئی اونچی چیز ہے جس پر روشنی پڑ رہی ہے ان کے علاوہ جو کچھ ہے وہ اس کی نگاہوں سے پوشیدہ رہتا ہے اس طرح خودنوشت سوانح نگار اس شبہ میں پڑسکتا ہے کہ وہی چیزیں اس کی زندگی میں اہم تھیں جو اسے یاد رہ گئی ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا بہت سی ایسی چیزیں ہوتی ہیں جو اس کے ذہن سے کلیتہً محو ہوگئی ہوتی ہیں۔'' جارج مور نے لکھا ''ہم اپنے ماضی کو پڑھنے کی کوشش کریں تو گویا ہم ایسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہیں جس کے کچھ صفحے کٹے پھٹے ہیں اور کچھ بوسیدہ یا ان اوراق کو دیمک نے چاٹ لیا ہے۔'' ییٹس نے اپنی خودنوشت کے بارہ میں کہا تھا کہ ''میں نے اس میں کوئی دانستہ ردوبدل نہیں کیا ہاں غیر دانستہ طور پر ہوسکتا ہے کچھ چیزیں بدل گئی ہوں''

یہ سب لوگ یعنی دوستوفسکی' ہڈسن' ییٹس انیسویں صدی کے لوگ تھے جب پروفیسر شومیکر کے لفظوں میں ''لوگ خودنوشتیں محض روایت کے طور پر لکھ رہے تھے اور انہیں اس کے باقاعدہ کسی صنفِ ادب ہونے کا گمان تک نہیں تھا''۔

ان تمام تصریحات سے نتیجہ یہ نکلا کہ خودنوشت کے فن میں کم از کم تین عناصر اہم ہیں۔ لکھنے والے کی یادداشت' لکھنے والے کا اسلوب اور لکھنے والے کے اردگرد کا حلقہء رجال و احباب۔ ایک اور

بات یاد رکھنے کی ہے کہ کم گوئی اور اخفائے ذات کے نتیجہ میں حقائق کا اخفاء بھی ہوسکتا ہے اور اکثر لوگ ایسی باتیں بیان کرنے کی جرات نہیں کرتے جو ان کی شخصیت کے کمزور پہلوؤں سے تعلق رکھتی ہوں۔ مثلاً ہمارے ہاں خواجہ حسن نظامی نے اپنی خودنوشت میں اچھی بری نیک و بد گناہ وثواب کی سب باتیں لکھ دینے کا تہیہ کیا تو ان کے احباب آڑے آگئے کہ ایسی باتیں مت لکھو۔ وہ دوستوں کے مشوروں کو نظرانداز کرنے کو تیار تھے مگر اکبرالہ آبادی کی بات کو رد نہ کرسکے اور ان کی وہ باتیں ان کہی رہ گئیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ لوگ اپنی ناکامیوں کو کب بیان کرتے ہیں۔ آزاد انصاری کی بات باون تولے پاؤ رتی کی ہے کہ افسوس بے شمار سخن ہائے گفتنی' خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے۔ خوفِ فسادِ خلق سے جو باتیں ناگفتہ رہ جاتی ہیں وہ کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی معرضِ اظہار میں آ ہی جاتی ہیں مگر جو باتیں خودنوشت نگار کے احساسِ کمتری کی وجہ سے بیان نہیں ہوتیں وہ بہر حال ان کہی رہ جاتی ہیں۔ اسی لئے تو کہا جاتا ہے کہ خودنوشت سوانح عمری کسی شخص کی مکمل سوانح عمری نہیں ہوتی اس میں وہ باتیں بیان ہوتی ہیں جنہیں بیان کرنے والا بیان کرنا چاہتا ہے۔ برٹرنڈ رسل نے یہ جدت روا رکھی کہ اپنی زندگی کے وہ پہلو بھی بیان کردئے جنہیں عام خلق خدا کی نگاہ میں مستحسن نہیں سمجھا جاتا۔ جوش صاحب کے کانوں میں بھی اس کی بھنک پڑی تو اپنے اٹھارہ معاشقوں کا حال رقم فرمادیا مگر یہ بھول گئے کہ معاشرہ کے ناپسندیدہ امور کا بیان ہی جدت پسندی نہیں کہلاسکتا' اس بیان میں صداقت اور صاف گوئی کا عنصر بھی ضروری ہوتا ہے۔

یہاں تک تو مغربی ادب والوں کا ذکر تھا کہ خودنوشت سوانح عمریوں کا سلسلہ انہی کے تتبع میں جاری ہوا مگر ہمارے اردو کے جن ادیبوں نے خودنوشت سوانح عمریاں لکھی ہیں ان لوگوں نے بھی بساط بھر اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ میں ان کا ذکر کرنے سے قبل اردو کے مشہور عالم رسالہ نقوش لاہور کے آپ بیتی نمبر مطبوعہ ۱۹۶۴ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ دو ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل اس نمبر میں مختلف نئے پرانے ادیبوں کی خودنوشت آپ بیتیوں کا کچھ حصہ درج ہے۔ اپنی تمام تر افادیت کے باوجود اس رسالہ میں بعض ایسی باتیں در آئی ہیں جو بالکل بے سروپا ہیں۔ مولینا علم الدین سالک نے ''اردو کی پہلی خودنوشت سوانح عمری'' کالا پانی'' کے بارہ میں جو مولانا جعفر تھانیسری کی خودنوشت ہے عجیب بات لکھی ہے۔ مولانا جعفر تھانیسری کو انگریزوں نے کالے پانی کی سزا دی تھی۔ اس قید کے

حالات پر مشتمل پہلا حصہ ''تاریخ عجیب'' (۱۸۷۹) اور دوسرا حصہ رہائی کے بعد ''تواریخ عجیب'' (۱۸۸۵) کے نام سے شائع ہوا تھا' ان دونوں حصوں کو کالا پانی کا نام دیا گیا۔ سالک صاحب لکھتے ہیں ''آپ نے کوئلے سے دیواروں پر اپنی زندگی کے واقعات لکھ دئے جو بعد میں ان کے لواحقین نے نقل کرکے چھپوا دیئے۔ جب ان کا بیٹا ان کی رہائی کا فرمان لے کر انڈیمان پہنچا تو ان کا جنازہ قبرستان کی طرف دفن کرنے کے لئے لے جایا جارہا تھا'' (صفحہ ۵۵)۔ یہ ایک بے سروپا بات ہے۔ مولانا جعفر تھانیسری قید سے رہا ہوکر وطن مراجعت فرما ہوئے اور یہاں پہنچ کر کالا پانی کے نام سے اپنے حالات قلم بند فرمائے جو شائع ہوئے۔ مولانا نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں لکھا کہ ''یہ اس ربِ قدیر کا کام ہے کہ یہ سارے تماشے گرم سرزمانے کے دکھلا کر اس نے اپنے اس نالائق مفرور غلام کو پھر جیسے کا جیسا اس ملک میں لاکر پہلے سے دوچند لوگوں کی آنکھوں میں معزز وممتاز کردیا ہے **و ذالک فضل الله یو تیہ من یشاء**''۔ اور اس دیباچہ کی تلاش میں دور جانے کی ضرورت بھی نہیں۔ اسی رسالہ میں محمد ایوب قادری صاحب نے کالا پانی کا خلاصہ درج کیا ہے اس میں یہ لکھا ہوا موجود ہے۔ (صفحہ ۱۸۲) اور اب کالا پانی دارالسلام لاہور والوں کی جانب سے دوبارہ شائع ہوچکی ہے۔

اردو کی پہلی سیاسی خودنوشت یہی خودنوشت ہے کیوں کہ اس میں مولانا جعفر تھانیسری نے اپنے حالات کو سیاسی پس منظر میں بیان کیا ہے۔ پھر ''نقشِ حیات''، چھپی جو مولانا سید حسین احمد مدنی کی خودنوشت ہے۔ یہ وہی حسین احمد ہیں جن کے بارہ میں اقبال نے کہا تھا ''ز دیو بند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است''۔ میں خودنوشتوں میں اخفائے حقائق یا افشائے حقائق کا ذکر کررہا تھا۔ اس سلسلہ میں سر رضا علی کی خودنوشت اعمال نامہ کا ذکر مقصود ہے۔ اسے پروفیسر آل احمد سرور نے اردو کی بہترین خود نوشت قرار دیا ہے۔ رضا علی متحدہ ہندوستان کے سربرآوردہ مسلمان وکیل' دستور ساز اور سیاست دان اور صاحبِ ذوق ادیب تھے۔ وہ ''اعمال نامہ'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں ''حقیقت نگاری بڑا مشکل کام ہے بالخصوص جب انسان اپنی کہانی خود لکھنے بیٹھے۔ میری تمام تر کوشش یہ رہی ہے کہ انصاف سے کام لوں کہ کسی تصویر کا رنگ پھیکا پڑے نہ زیادہ گہرا ہونے پائے۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے بہت سے ایسے واقعات بھی لکھنے پڑے جن کے اظہار نہ کرنے سے میں اخفائے حق کا ملزم قرار پاتا۔ اپنی زندگی یا

اپنے زمانے کے واقعات لکھنے پر کوئی شخص مجبور نہیں البتہ ہر شخص کو اپنی کہانی لکھتے وقت دو باتوں کا خیال رکھنا چاہئے ایک یہ کہ سچے واقعات پورے طور سے بیان کردئے جائیں اخفائے حق نہ کیا جائے نہ کوئی بات ادھوری چھوڑی جائے'' اعمال نامہ کے مصنف نے اپنی بات کا پورا لحاظ رکھا اور سرسید کی وفات کے بعد علیگڑھ کے ٹرسٹیان کالج کا جو جلسہ ہوا اس کی روداد بلا کم و کاست بیان کردی اور یہ کوئی کم راست گوئی کی بات نہیں تھی۔ لکھتے ہیں ''۳۱ جنوری ۱۸۹۹ کو ٹرسٹیان کالج کا جلسہ نواب محمد حیات خاں (سرسکندر حیات خاں وزیراعظم پنجاب کے والد) کی صدارت میں ہوا۔ ایک طرف سید محمود اور دوسری طرف محسن الملک موجود تھے۔ میری یہ جسارت کہ برآمدہ میں پہنچ گیا۔ سید محمود نظیر اکبرآبادی کا یہ مصرعہ پڑھتے ہوئے سٹریچی ہال سے نکل رہے تھے:

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

سارے ٹرسٹی ایسے مغموم تھے گویا جنازے کے ساتھ جارہے ہوں۔ سید محمود کے پیچھے پیچھے محسن الملک تھے چہرہ زرد، آنکھوں میں آنسو، بھرائی ہوئی آواز، قدم ڈالتے کہیں تھے پڑتا کہیں تھا۔ ان کے پیچھے نواب محمد حیات خاں صاحب اور خان بہادر ملک برکت علی خاں اور خلیفہ محمد حسین تھے۔ تینوں سر سید کے سچے رفیق اور کالج کے بڑے معاون تھے ان تینوں کے بعد مسٹر بیک جن کو بارہ سال قبل سید محمود ولایت سے پرنسپلی کے عہدہ کے لئے منتخب کرکے لائے تھے۔ کچھ ٹرسٹی سٹریچی ہال کے برآمدہ میں تھے کچھ ہال سے نکل رہے تھے۔ ٹرسٹیوں نے اس ہنگامہ سے ذرا دیر پہلے سرسید علیہ الرحمتہ کی جگہ محسن الملک کو کالج کا آنریری سکرٹری منتخب کیا تھا۔ سید محمود فرماتے تھے میں لائف جائنٹ سکرٹری ہوں قواعد ٹرسٹیاں کی رو سے میرے موجود ہوتے تم محسن الملک کو یا کسی اور کو آنریری سکرٹری نہیں بنا سکتے۔ سید محمود کی حالت زخمی شیر کی سی تھی۔ بپھرے ہوئے تھے جو منہ میں آتا تھا کہہ رہے تھے سب ادھر ادھر دبک رہے تھے۔ شیر کا مقابلہ خود اس کے پرانے رفیق محسن الملک سے تھا سارے ٹرسٹیوں کی کوشش تھی کہ جس طرح بن پڑے خوش آمد درآمد کرکے غضب آلود شیر کو چیتے کی طرح رام کریں۔ اس کوشش میں سب سے نمایاں حصہ لینے والے مسٹر بیک معلوم ہوتے تھے۔ دورانِ گفتگو سید محمود مسٹر بیک کو تھیوڈر کہہ کر مخاطب کرتے تھے جس سے شیر برطانیہ اور معزول شیر علی گڑھ کی دوستی اور انتہائی بے تکلفی کا پتہ چلتا تھا

۔ شام کے پانچ بجے کا وقت تھا جلسہ سارے دن رہا تھا ٹرسٹیوں نے تو گتھی سلجھانے میں کوئی کمی نہیں کی تھی مگر سید محمود کی برہمی سے معلوم ہوتا تھا کہ سلجھنے کی بجائے گتھی میں اور پیچ پڑ گئے ہیں۔ بالآخر اسی شخص کی سوجھ بوجھ کام آئی جس کی فراست، ذکاوت اور ہوشمندی کا اب سے چند سال پہلے حیدرآباد میں ڈنکا بج رہا تھا۔ محسن الملک بڑھے اور سید محمود کے قدموں کی طرف جھکے۔ آن کی آن میں ایک سید کی ٹوپی دوسرے سید کے قدموں پر تھی۔ سید محمود نے ہاتھ پکڑ کر محسن الملک کو اٹھایا اور فرمایا ''مہدی تو کیا کہتا ہے؟''۔ محسن الملک کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا ''میں یہ کہتا ہوں اس وقت قوم کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو سوائے تمہارے اور کوئی نہیں بچا سکتا''۔ سید محمود بولے ''اچھا تو کہتا ہے تو میں راضی ہوں''۔ سید محمود کی آواز میں افسوس کا ذرا سا شائبہ نہ تھا۔ ہم سب محوِ حیرت تھے کہ ''ایں چہ می بینی؟ بہ بیداری است یا بخواب؟''

اخفائے حق سے بچنے کی دوسری مثال میر ولایت حسین صاحب کی خودنوشت ہے۔ جس میں انہوں نے لکھا ہے اور یہ روایت پروفیسر آل احمد سرور کی ہے ''انہوں نے شبلی، سید محمود، مولانا شوکت علی اور سرسید کے آخری ایام کی جو تصویر کشی کی ہے وہ بڑی سبق آموز ہے۔ سرسید کو سید محمود نے اپنے خللِ دماغ کے زمانہ میں گھر سے نکال دیا تھا۔ ان کا انتقال ایک دوست حاجی اسمٰعیل خاں دتاولی کے ہاں ہوا۔ تجہیز و تکفین کے مصارف محسن الملک نے یہ کہہ کے ادا کئے کہ اب یہ چندہ لینے تو نہ آویں گے''۔ ان دونوں اقتباسوں کو ملا کر دیکھئے تو ہماری تاریخ کا ایسا ورق سامنے آتا ہے جس پر اب تک مصلحت کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ ان دونوں خودنوشت سوانح نگاروں کی خوبی ہے کہ یہ لوگ خوفِ فسادِ خلق سے خاموش نہیں رہے۔ تاریخ کے کئی حقائق خودنوشت سوانح نگاروں کے ذریعے منظرِ عام پر آیا کرتے ہیں حالانکہ خود نوشت سوانح حیات تاریخ نہیں ہوتی۔

خودنوشت سوانح عمری کے فن کی طرف لوٹتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد کا کہنا ہے کہ ''آپ بیتی لکھی ہی نہیں جاسکتی۔ جتنی زندگی گذر چکی ہے گردن موڑ کر دیکھتا ہوں تو ایک نمودِ غبار سے زیادہ نہیں اور جو کچھ سامنے ہے وہ جلوۂ سراب سے زیادہ نظر نہیں آتا''۔ (نقوش آپ بیتی نمبر صفحہ ۶۷)۔

پروفیسر آل احمد سرور نے اپنی خودنوشت ''خواب باقی ہیں'' میں اس فن پر خامہ فرسائی فرمائی

ہے۔'' خودنوشت سوانح عمری کا فن نظارے کا فن نہیں نظر کا فن بھی ہے اس لئے سائنسی صحت اور واقعیت کی بجائے ایک مخصوص زاویہ ءنگاہ کی اہمیت شاید یہاں زیادہ ہے۔خودنوشت تاریخ نہیں مگر اس میں تاریخی حقائق ضروری ہیں۔ یہ واقعات کا خشک بیان نہیں ان واقعات کے ساتھ جو کیفیات وابستہ ہیں ان کی داستان بھی ہے۔ واقعات اس لئے اہم ہیں کہ ان واقعات نے کیا تاثرات اور کیفیات عطا کی ہیں یعنی ان سے دل پر کیا گذری ہے۔ آپ بیتی جگ بیتی بھی ہے کیونکہ اپنی زندگی میں ایک فرد اپنے خاندان۔ ماحول۔ علمی اداروں' تحریکوں' شخصیات' تہذیبی' ادبی' معاشرتی اور سیاسی حالات سے دوچار ہوتا ہے۔ان سب سے بہت کچھ لیتا ہے اور شاید تھوڑا بہت ان کو دیتا بھی ہے۔ بہر حال کوشش ہونی چاہئے کہ لکھنے والا اپنے ساتھ ایمان داری برتے''۔ اس بات کو جان ڈن نے ذرا مختلف طریق سے کہا کہ'' ہر آدمی اپنی ذات میں کوئی جزیرہ نہیں ہوتا بلکہ ایک براعظم کا حصہ ہوتا ہے یعنی ایک بڑے کل کا جزو''۔ ایک جزو کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ اپنے آپ کو متوازن نہ رکھے۔ پھر آل احمد سرور کی بات کہ'' وہ نہ تو یہ کوشش کرے کہ اپنی تلخیوں' محرومیوں اور ناکامیوں کی داستان بیان کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالے (جیسے جوش صاحب نے کیا) نہ اپنے آپ کو خلاصہ ءکائنات سمجھ کر ہر شخص پر ہمالہ کی بلندی سے تنقید کرے (جیسے قدرت اللہ شہاب نے کی)' نہ اپنا کوئی بت بنا کر پیش کرے کہ لوگ اس کی پرستش کریں اور نہ واقعات کو توڑ مروڑ کر اپنے کسی نظریہ کے شکنجے میں دم بدم بدلتی ہوئی متضاد رنگا رنگ حیرت انگیز جلوہ ہائے نو بہ نو سے معمور زندگی کو کسی اشتہار بازی کی سرخیوں سے آلودہ کرے۔

جینا ایک فن ہے اور آپ بیتی فنِ لطیف' اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے بڑی سچائی بڑے ریاض اور بڑے کھرے پن کی ضرورت ہے اس کا راستہ بھی پل صراط کی طرح بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے''۔ پروفیسر آل احمد سرور اردو کے ایسے نقادوں میں سے ہیں جنہوں نے اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کے ادب سے استفادہ کیا ہے۔ اس لئے ان کی بات کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ ان کے اس اقتباس میں دو جگہ بریکٹ میں میں نے دو بڑے خودنوشت سوانح نگاروں کا تجزیہ بھی درج کیا ہے یہ تجزیہ سرور صاحب کا نہیں میرا ہے مگر یہ باتیں میں نے سرور صاحب کے ارشادات کے نتیجہ میں اخذ کی ہیں۔ خودنوشت سوانح نگاری کے باب میں ان باتوں کو ملحوظ رکھا جائے تو اردو کے بیشتر نام آور خود

نوشت سوانح نگاروں کی خودنوشت سوانح عمریاں بازیچہ اطفال نظر آتی ہیں۔

خواجہ غلام السیدین نے اپنی خودنوشت'' مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں'' میں اس فن کی نزاکتوں کا ذکر کیا ہے'' کسی نے کہا ہے کہ ہر شخص کم از کم ایک اچھی کتاب لکھ سکتا ہے یعنی خود اپنی زندگی کی کہانی مگر مجھے اس میں شبہ ہے۔ اس کے لئے ایک ضروری شرط تو یہ ہے کہ زندگی میں کچھ واقعات کچھ کامیابیاں' کچھ ناکامیاں قابل ذکر ہوں مگر بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی زندگی میں بہ ظاہر معمول یا خلا کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا یا اگر ہوتا ہے تو وہ اسے بیان کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں۔ صلاحیت کے علاوہ غیر معمولی جرات کی بھی ضرورت ہے۔ اکثر لوگوں کی زندگی میں بہت سی باتیں خیالات' جذبات' نفسی گتھیاں ایسی ہوتی ہیں جن کو وہ لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رکھنا اور اگر موقع ملے تو ان کے سامنے ایک مثالی' غیر حقیقی تصویر پیش کرنا چاہتے ہیں جس کا اصلیت سے کوئی قریبی تعلق نہیں ہوتا''۔'' کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انداز بیان کا اعجاز مواد کے کھوکھلے پن کو سنبھال لیتا ہے''

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اپنی خودنوشت'' یادوں کی دنیا'' میں لکھا'' بیتے ہوئے زمانے کے واقعات و حالات جب حافظہ پر ابھرتے ہیں تو اصلی نقوش میں وہ مبہم اثرات بھی شامل ہو جاتے ہیں جو زندگی کے مشاغل سے لازمی طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ آپ بیتی زندگی کی تاریخ بھی ہے اور ماورائے تاریخ بھی۔ ادیب کے ہاتھ سے صداقت اور حقیقت کا دامن کبھی نہیں چھوٹنا چاہئے۔۔۔ جذبہ اور تخیل اگر صداقت سے بیگانہ ہیں تو وہ غیر متوازن ہو جائیں گے۔۔۔ جس طرح زبان خیال کی خدمت کے لئے ہے اسی طرح خیال صداقت کی خدمت کے لئے ہے جو ادب کا مقصود و منشاء ہے ۔۔۔ آپ بیتی میں گذرے ہوئے زمانے کی صداقتوں کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دوران کی کیفیت کو محفوظ کرنے کا واحد وسیلہ انسانی حافظہ ہے جو گذرے ہوئے لمحوں کو یک بیک گرفت کر لیتا ہے۔ ان میں ہر لمحہ اپنی قدر و قیمت رکھتا ہے اس کے علاوہ حافظہ گذری ہوئی یادوں کو ابھارتا ہے تاکہ ہمیں لزوم کی پابندی سے نجات ملے اور روحانی تخلیق کا دروازہ بند نہ ہو۔۔۔ آپ بیتی میں تاریخ کے برخلاف فرد کہانی کا موضوع ہوتا ہے اس کے دل کی دماغ کی عمل کی کہانی۔۔۔ اس میں افراد کی شخصیت از سر نو تخلیق کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔۔۔ آپ بیتی لکھنے والے اور مورخ میں یہ بات

مشترک ہے کہ دونوں صداقت کی روشنی میں اپنا قدم آگے بڑھاتے ہیں''۔ ''شخصیت کا تجزیہ بڑا مشکل کام ہے اس لئے کہ اکثر لوگوں کی زندگی منقسم ہوتی ہے چاہے وہ کتنی ہی تکمیل یافتہ کیوں نہ ہو۔ اس میں اچھائی اور برائی، نیکی اور بدی پہلو بہ پہلو موجود رہتی ہیں اس لئے کسی شخص کی زندگی کے متعلق حکم لگاتے وقت جزوی واقعات کی بجائے مجموعی کردار کو دیکھنا چاہئے۔ آپ بیتی میں بڑے کرداروں کے ساتھ چھوٹے کرداروں کی بھی اہمیت ہے اس لئے کہ ان کے بغیر اس زمانے کی فضا پیدا نہیں ہوتی۔۔ آپ بیتی لکھنے والے کے پیشِ نظر زندہ اور مردہ دونوں ہوتے ہیں اس کی یادوں کی بستی میں دونوں پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں''۔

جناب قدرت اللہ شہاب نے بھی اپنی خودنوشت وجود میں آنے کے اسباب بیان کئے ہیں۔

''میں نے فیصلہ کیا کہ جن واقعات، مشاہدات اور تجربات نے مجھے متاثر کیا ان کی روداد بے کم وکاست بیان کر دوں اس کے علاوہ یہ امر بھی مدِ نظر رہا کہ بعض غلط فہمیوں اور مفروضوں کی بنا پر میرے ماتھے پر کچھ ایسے کلنک کے ٹیکے لگ چکے ہیں جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔۔۔ مجھے توقع تھی کہ صحافی برادری جو بڑے بڑے سکوپ اڑانے میں مہارت رکھتی ہے ان میں سے کوئی صاحبِ دل میرے سر تھوپے ہوئے الزامات کی تحقیق و تفتیش کرنے کی زحمت بھی اٹھائے گا یہ امید نقش بر آب ثابت ہوئی الٹا بھیڑ چال کی صورت میں بہت سے حضرات بلا چون و چراں (کذا) یہی الزامات دہراتے رہے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر یہ کتاب لکھنے کا ارادہ اور بھی پختہ ہو گیا اس کا مقصد اپنی بریت اور معصومیت کا ڈھول پیٹ کر نمبر بنانا نہیں فقط حقائق کو ریکارڈ کرنا مقصود ہے'' ''اس کتاب میں واقعات سب صحیح ہیں لیکن اسلوب میرا ہے'' جہاں کہیں میں نے کوئی نتائج اخذ کئے ہیں یا کوئی رائے دی ہے ان کا ذمہ دار بھی میں ہی ہوں۔۔۔ اس کتاب کا مقصد جان بوجھ کر کسی کی کردار کشی، بت شکنی یا بت تراشی کرنا نہیں ہے جو لوگ تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں ان کی ذات انفرادی نہیں رہتی بلکہ اپنی طرز کا ایک ادارہ بن جاتی ہے۔ تاریخ کی سرچ لائٹ نہایت تیز اور بے رحم ہوتی ہے اس کی شعاعوں کی روشنی میں ہر شخص اور ادارے کے حقیقی خدوخال سامنے آجاتے ہیں۔ ان خدوخال کی لطافت یا کثافت کا ذمہ دار مصنف ہے نہ اس کی تصنیف۔ یہ تو محض افراد کے ذاتی صفاتی یا باطنی کردار کا عکس ہے۔۔۔ میں نے

حقائق کو انتہائی احتیاط سے ممکنہ حد تک اسی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس رنگ میں وہ مجھے نظر آئے''۔۔۔ شہاب صاحب کے اس اقبالِ جرم کے باوجود ان کی خودنوشت ایک ایسے بیوروکریٹ کی سطح سے اوپر نہیں جا سکی جو اپنی انا کا اسیر اور دوسروں پر اپنے فیصلے نافذ کرنے کا عادی رہا ہو اور جس کی زندگی کا ہر لمحہ اس کے اردلی کے لفظوں میں یوں گذرا ہو کہ ''صاحب بہادر امورِ سلطنت میں مصروف ہیں'' (صفحہ ۳۰۲) شہاب صاحب کے پرانے دوست احمد بشیر نے بھی یہی لکھا ہے کہ ''شہاب نامہ مجھے پسند نہیں آیا اگرچہ رپورٹ پٹواری مفصل ہے۔۔۔ میں شہاب کی بات کرتا ہوں اس نے کتاب نہیں لکھی بیان صفائی مرتب کیا ہے مگر ملزم مجھے باعزت بری ہوتا نظر نہیں آتا'' (جو ملے تھے راستے میں صفحہ ۲۰۱)۔ شہاب صاحب نے خود بلا تحقیق سربرآوردہ اشخاص پر الزام لگانے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کی تس پر انہیں گلہ ہے کہ صحافی برادری نے ان پر لگائے گئے الزامات کی چھان بین کیوں نہیں کی؟ اگر شہاب صاحب کے مرتبہ پر فائز شخص حقائق کو نظر انداز کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتا تو انہیں دوسروں سے شکوہ کرنے کا کیا حق ہے؟

وزیر آغا کی خودنوشت ''شام کی منڈیر سے'' کے دیباچے میں بھی اس فن کی بعض نزاکتوں کا ذکر ہوا ہے۔ ''اپنی کہانی ہر شخص سنانا چاہتا ہے کیوں؟ شاید اس لئے کہ اپنی تمام تر انکساری کے باوجود ہر شخص خود کو ''مرکزِ دو عالم'' سمجھتا ہے اور چاہتا ہے کہ اپنی شخصیت کو جھاڑ پونچھ کر اس طور پیش کرے کہ وہ پراسرار یا کرشماتی charismatic نظر آنے لگے۔ بعض لوگ جن کی زندگی میں سیاست اہم کردار ادا کرتی ہے اپنی کہانی سناتے ہوئے در پردہ یہ بتا رہے ہوتے ہیں کہ تاریخ میں ان کا مقام کیا ہے۔ بعض دوسرے اپنے کرادر کی سختی یا توانائی کو بیان کرتے ہیں جس کے طفیل وہ زمانے سے متصادم ہو کر ذرہ سے آفتاب بن گئے۔ اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو بے باکی اور صاف گوئی کو اپنا مسلک قرار دیتے ہوئے اپنے کردار کے ان پہلوؤں کو منظرِ عام پر لاتے ہیں جو خلقِ خدا کی نگاہ میں گردن زدنی قرار پا سکتے ہیں مقصود ان کا بھی اپنی شخصیت ہی کو ابھارنا ہوتا ہے گو وہ یہ کام اپنی شخصیت کی نفی کر کے سرانجام دیتے ہیں''۔ ''جب میں نے زیرِ نظر کتاب لکھنا شروع کی تو میرا مقصود اپنی شخصیت کو نمایاں کرنا ہرگز نہیں تھا۔ مقصود یہ تھا کہ اپنی اس داستانِ حیات میں دوسروں کو بھی شریک کروں جس سے میں خود تو آشنا ہوں

لیکن دوسرے لوگ واقف نہیں ہیں تاہم کہانی سناتے ہوئے مجھے معاً محسوس ہوا کہ میں کہانی سنا نہیں رہا ہوں سن رہا ہوں۔ یکا یک سامع بن جانے کے اس تجربہ نے مجھ پر بہت سی ایسی باتیں منکشف کیں جو بصورت دیگر میری نظروں سے اوجھل رہتیں بالخصوص اپنی تصانیف کے فکری پس منظر سے تو میں کہانی سنتے ہوئے ہی آگاہ ہوا''۔

اردو کے ان دو بڑے مصنفوں کی خودنوشت سوانح کا ایک بنیادی فرق بھی ان مصنفوں کے ان بیانات سے منکشف ہوا کہ ایک اپنی کہانی مجلسوں بیٹھکوں ادبی اداروں' ایڈمنسٹریٹو شاف کالجوں میں اور دوسرے سٹیجوں پر بیٹھ یا کھڑے ہو کر سناتا رہا اور سامعین کی داد وتحسین یا تنقید یا تنقیص سے اپنی کہانی کی نوک پلک سنوارتا رہا دوسرا اپنی کہانی کہہ نہیں رہا بلکہ خود اپنی زبانی سن رہا ہے۔ کہنے اور سننے کا یہی فرق ان دونوں کی سوانح عمریوں کو ممیز کرتا ہے۔ شہاب صاحب سنانے میں اور وزیر آغا سننے میں کہاں تک کامیاب ہوئے اس کا فیصلہ وقت کرے گا جو سب سے بڑا پارکھ ہے۔

''گرد راہ'' کے مصنف اختر حسین رائے پوری کا کہنا ہے کہ میں ''طبعاً خلوت پسند ہوں اور دنیا کو راز داں بنانا مجھے پسند نہیں۔ البتہ دوسروں کی طرح میں بھی اپنے دور کا گواہ ہوں اپنے مشاہدے اور مطالعے پر مجھے اعتبار ہے اور کئی ایسی تحریکوں اور شخصیتوں سے واسطہ پڑا جنہوں نے کسی نہ کسی طرح ماحول کو متاثر کیا۔ فطرت اور تاریخ سے دلچسپی نے کیا کیا تماشے دکھائے مشرق اور مغرب کی کیسی کیسی سیاسی اور ثقافتی محفلوں سے روشناس ہوا اور فکر وعمل کے کیا کیا تجربے ہوئے یہ تذکرہ خالی از لطف نہیں''۔

''ایک جنرل کی آپ بیتی'' والے جنرل شاہد حامد نے بھی اس موضوع کو چھیڑا ہے ''یہ کتاب ایک غیر ہنگامہ خیز زندگی کی یادوں کا مجموعہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ خود میری ذات کو اس کتاب کے واقعات میں کوئی نمایاں حیثیت حاصل نہیں۔ یہ تو یادوں کا ایک جلوس ہے'' نقاد کہتے ہیں کہ خودنوشت سوانح عمری لکھنے والے کو اس کتاب کا مرکزی کردار ہونا چاہئے۔ شاہد حامد کہتے ہیں ان کی زندگی کو ان کی خودنوشت سوانح حیات میں کوئی مرکزی حیثیت حاصل نہیں۔ کام کی بات جنرل صاحب نے کہہ دی کہ یہ یادوں کا کارواں ہے۔

اردو کا ایک خودنوشت سوانح نگار ایسا بھی تھا جو کسی مدرسہ کا پڑھا ہوا نہیں تھا مگر مدرسہء حیات کا

فارغ التحصیل تھا احسان دانش۔ اسے مشرق ومغرب کی تحریکوں سے کوئی سروکار نہیں رہا حالانکہ وہ شاعرِ مزدور کہلاتا تھا اور اس لئے کہلاتا تھا کہ وہ باقاعدہ مزدور تھا۔ محنت کش۔ ''جہانِ دانش'' کا مصنف کہتا ہے ''اب کچھ دنوں سے میں خود کو دنیا کا مقروض سا خیال کر رہا ہوں۔۔۔۔ میری عمر کی باولی گہری ضرور ہے مگر اندھیری نہیں جب اس میں جھانکتا ہوں تو چاروں طرف طاقوں میں چراغ جل اٹھتے ہیں اور سیڑھیاں اس قدر روشن ہو جاتی ہیں کہ درزیں تک نظر آنے لگتی ہیں۔ مجھے میرے ماضی نے اس قدر کھندلا ہے کہ کہیں تو پٹخنیاں کھا کھا کر میرا بدن نیلا پڑ گیا اور کہیں چوٹل جگہیں اپنی سطح سے ابھری کی ابھری رہ گئی ہیں مگر نظر میں تری آ گئی''۔ احسان دانش نے زندگی میں اس قدر تلخیاں دیکھنے کے باوجود زمانہ کو کوسا نہیں اور '' لا تسبو الدهر '' پر عمل کیا ہے۔

مرزا ادیب نے بھی اپنی سوانح عمری ''مٹی کا دیا'' میں خودنوشت کے فن کو موضوع بنایا ہے۔ ''میں نے آپ بیتی لکھی ہے تاریخ ہرگز نہیں'' (صفحہ ۶) ''خودنوشت سوانح عمری لکھنا ایک فساد انگیز امر ہے کسی مصنف کی کتابیں پڑھ پڑھ کر لوگ اس کے بارہ میں ایک خاص تصور قائم کر لیتے ہیں اور جب یہ مصنف اپنے حالات کو اس خاص تصور کے برعکس پیش کرتا ہے تو پڑھنے والوں کو یا تو اتنی مایوسی ہوتی ہے کہ وہ کتاب پڑھے بغیر چھوڑ دیتے ہیں'' (صفحہ ۴۰۲) ''ایک شخص اپنی آپ بیتی لکھنے بیٹھتا ہے تو زندگی کے سارے واقعات نہیں لکھ سکتا۔ یہ ممکن ہی نہیں۔ لازماً وہ انتخابِ واقعات کو راہ دیتا ہے۔ میں نے جب اپنے ماضی کا سفر شروع کیا تو اندھیارے میں کئی جگنو چمک اٹھے مگر جب انہیں پکڑنے کی کوشش کی تو کئی ایک بہت باریک لکیر چھوڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گئے اور بعض ذرا سی کوشش سے میری گرفت میں آ گئے میں نے انہیں آسانی سے گرفت میں آنے والے جگنوؤں تک اپنی توجہ محدود رکھی ہے (صفحہ ۴۰۹)۔ مرزا صاحب نے جن باتوں کا ذکر کیا ہے ان کا بیان کسی نہ کسی صورت میں پہلے ہو چکا ہے مگر ان کی بات اس لئے میں نے مکرر درج کر دی ہے کہ اس سے ان کی خودنوشت کو سمجھنے میں آسانی رہے گی۔

اردو کے ان خودنوشت سوانح نگاروں کے خیالات کا میں نے تفصیل سے اس لئے بھی ذکر کیا ہے کہ اس سے ان کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے مگر آگے بڑھنے سے پیشتر میں خودنوشت کے مختلف پیرایوں کے باب میں بھی کچھ کہتا چلوں۔ ورڈز ورتھ نے PRELUDE لکھ کر خودنوشت کو محض نثر

کے دائرہ تک محدود نہیں رہنے دیا۔ اسی طرح ٹینی سن کی IN MEMORIAM اس کے دوست کا مرثیہ ہونے کے باوجود اس کی اپنی منظوم سوانح عمری ہی تو ہے۔ ہمارے ہاں اردو میں شاید ایک ہی مثال ایسی ہے جس میں مصنف نے نظم اور نثر دونوں میں اپنی سوانح عمری لکھی ہے۔ وزیر آغا کی نظم ''آدھی صدی کے بعد'' ان کی منظوم خودنوشت سوانح عمری کا نمونہ ہے۔ ناصر کاظمی کی پہلی بارش کو ان کی منظوم خودنوشت مان لیا جائے تو انہوں نے نثر میں اپنی خودنوشت نہیں لکھی۔ اختر الایمان نے منظوم خودنوشت شروع کی لیکن اسے درمیان میں ہی چھوڑ دیا۔ مکمل ہو جاتی تو توقع ہے اردو کی منظوم خودنوشتوں میں ممتاز مقام حاصل کرتی۔

خودنوشت کا ایک اسلوب افسانہ طرازی ہے۔ ڈینیئل ڈیفو کی رونبسن کروسو یا سوفٹ کی گولیورز ٹریولز تو ایسی مشہور مثالیں ہیں جنہیں ہر کوئی جانتا ہے۔ ہمارے ہاں اس اسلوب میں ممتاز مفتی نے ''علی پور کا ایلی'' اور ''اولکھ نگری'' لکھیں۔ مگر سب سے عمدہ مثال مشتاق احمد یوسفی کی ''زرگزشت'' ہے۔ قرۃ العین حیدر کی ''کارِ جہاں دراز ہے'' اگر اتنی دراز نہ ہوتی تو شاید اس کا شمار اچھی خودنوشتوں میں ہوتا۔ قدرت اللہ شہاب کی ''شہاب نامہ'' فکشن اور فیکٹ کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ فکشن کی حد کہاں ختم ہوتی ہے اور فیکٹ کی حد کہاں شروع ہوتی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مصنف اس کتاب کے لکھنے پر مستعد تو تھا مگر اپنی افسری اور بشریت کے مابین حدِ فاصل نہ کھینچ سکا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں اس نے حقائق کو بیان کیا ہے وہاں اس کی افسریت آڑے آ گئی ہے جو ''سچ'' کہہ کر دینے کے خلاف ہے اور جہاں اس نے بشریت کا دامن تھامنے کی کوشش کی ہے وہاں اس کے تعصبات راہ روک کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ لا الی ھؤلاء۔ ولا الی ھؤلاء۔ ندا فاضلی نے بھی یہی اسلوب اپنانے کی کوشش کی۔ پہلے حصہ میں انہیں جرات نہ ہوئی کہ وہ اپنی افسانوی زندگی کو افسانوی کہہ دیں لیکن دوسرے حصہ کو سوانحی ناول کہہ بیٹھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی پہلی افسانوی زندگی کا تانا بانا بھی بکھر گیا اور وہ قاری کے اعتماد سے بھی محروم ہو گئے۔

◎

پس نوشت

میری داستان حیات

خودنوشت کے سلسلہ میں رجال کا حصہ بڑا اہم حصہ ہوتا ہے مگر ہمارے ہاں اس پہلو کو جاننے یا اس پہلو کا تجزیہ کرنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ مصنف جن لوگوں کے ساتھ رہا جن سے اس نے زندگی کرنا سیکھا یا جن کے ساتھ زندگی گذاری وہ اس کی شخصیت کو جاننے اور سمجھنے میں بہت ممد ثابت ہوتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ مصنف کی زندگی میں کتنے دخیل رہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ رجال ہی رجال سامنے رہ گئے خود مصنف کی شخصیت درمیان سے نکل گئی۔ اس طرح کی عبرت انگیز مثال ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی خودنوشت ''میری سوانح حیات'' ہے برق صاحب قبلہ نے اپنے تمام جاننے والوں دوستوں اور رفیقوں کے سوانح حیات بلکہ ان کے ''سی وی'' تک اپنی کتاب میں درج کر دئے اور خود ایک طرف چپکے بیٹھے دیکھا کئے۔ دوسری مثال ''یادوں کی برات'' ہے۔ جس میں رجال اور آباء و اجداد تو بہت ہیں خود مصنف کی شخصیت ان کے سامنے بہت حقیر ہو کر ابھرتی ہے۔ اس کتاب کا رجال کا حصہ پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ اگر جوش صاحب انہیں احباب کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے اور زندگی کرتے تھے تو ان کے اندر بھی ویسا ہی کمزور شخص بیٹھا ہونا چاہئے۔ ان کے دوستوں کا مذاق مبتذل' گفتگو فحش آمیز' اور عمل اس سے بھی زیادہ گھناؤنا ہے یعنی لکھنؤ کی گلیوں میں ''تلاشِ معاش'' میں گھومنا۔

رجال کا حصہ متوازن رہنا چاہئے جیسا کہ عبدالمجید سالک کے ہاں ہوا کہ سرگزشت میں رجال موجود ہیں مگر وہ سب عبدالمجید سالک کے حوالہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ وضع داری ان کا وصفِ اعظم اور ثقاہت ان کا جوہر ہے۔ انگریزی والوں کی مثل سامنے رہنی چاہئے کہ A MAN IS KNOWN BY THE COMPANY HE KEEPS. فرد جس ماحول میں پیدا ہوتا پرورش پاتا اور زندگی کرتا ہے اس کا اثر اس کی شخصیت پر ضرور مترتب ہوتا ہے۔ اس اثر کی تصویر کسی بڑی چابک دستی کی محتاج ہے۔ بچپن کا زمانہ ناسمجھی کا زمانہ ہے جو اس کے شعور کی گرفت میں نہیں ہوتا وہ دوسروں کی ''

حدیثِ متواتر'' کے طور پر بیان کی ہوئی باتوں کو اپنے شعور کی باتیں جاننے لگتا ہے۔ اسی دور کی پیدا کردہ عادتیں اور خصلتیں اس کی سائیکی کا پختہ جز و بنتی ہیں جن میں بعد کی زندگی میں کوئی قابلِ ذکر تغیر رونما نہیں ہوتا۔ اس دور کی تفصیلات اگر کسی سوانح نگار کے ہاں بیان ہوئی ہیں تو انہیں خودنوشت کے اصولوں پر جانچنے کی بجائے تاریخ کے اصولوں پر جانچنا چاہئے۔

اردو میں خودنوشت سوانح عمریوں کے تین اسلوب نمایاں ہوئے واحد حاضر میں لکھنے کا اسلوب جو ہماری بیشتر خودنوشتوں کا اسلوب ہے۔ صیغہء غائب میں لکھنے کا طریق مثلاً حمید نسیم کی ''ناممکن کی جستجو'' یا تیسرے شخص کو اپنی سوانح خود روایت کرنے کا اسلوب جیسے حکیم نور الدین کی ''مرقاۃ الیقین'' جو حکیم صاحب نے اکبر شاہ خان نجیب آبادی کو املا کروائی۔ صدر ایوب خان کی ''جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی'' اصلاً انگریزی میں لکھوائی ہوئی خودنوشت ہے جو بعد میں اردو میں ترجمہ ہوئی۔

اردو میں دو سیاسی سوانح عمریاں ایسی ہیں جنہیں اپنے مواد کے اعتبار سے بہت اہم جانا گیا۔ سر رضا علی کی ''اعمال نامہ'' اور سر ظفر اللہ خاں کی ''تحدیثِ نعمت''۔ یہ دونوں مدبر برطانوی دور کے مشہور معروف سیاست دان تھے۔ رضا علی اپنے کیریئر کی انتہا میں جنوبی افریقہ میں ہندوستان کے ہائی کمشنر رہے۔ سر ظفر اللہ خان' وائسرائے کی کاؤنسل میں وزیر' ہندوستان کی فیڈرل کورٹ کے جج' بعد ازاں پاکستان کے وزیر خارجہ' اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے صدر' بین الاقوامی عدالتِ انصاف کے رکن اور بعد کو اس کے صدر رہے۔ پاکستان کے کسی مدبر کو شاید ہی اتنے بڑے دنیاوی مناصب عطا ہوئے ہوں مگر سر ظفر اللہ نے اپنی خودنوشت کا عنوان ''تحدیثِ نعمت'' رکھا ہے یعنی اپنے رب کی نعمتوں کا شکر۔ فَامَّا بِنعمةِ ربّکَ فحدِّث۔ سر ظفر اللہ خان نے اپنے عقائد پر ثابت قدمی اور اپنے نظریات پر مکمل یقین کا اظہار کیا ہے کہیں ان کے پاؤں میں ذرا سی لغزش بھی نہیں آئی۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے ہاں انکساری اور عجز کے قابلِ تقلید نمونے ملتے ہیں۔ پڑھنے والا ان سے اختلاف عقیدہ کے باجود ان کی سوانح عمری پڑھتا ہے جس میں عالمی سطح کے مدبرین' سربراہانِ مملکت' شرفا' رؤسا اور سیاسین کا ذکر ہے مگر کہیں مصنف نے کسی شخص کی شخصیت کو مسمار کرنے یا تعمیر کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ایک موقع پر پنڈت نہرو کے بارہ میں ایک عالمی مدبر کا ایک فقرہ درمیان میں آ گیا ہے مگر سر ظفر اللہ

نے یہ کہہ کر اسے درج نہیں کیا کہ ''پنڈت نہرو کی وفات کے بعد اسے درج کرنا مناسب نہیں''۔ کہ یہی ہمارے ہاں کے شرفا کا وطیرہ تھا اور ہے۔ اس کے برعکس اردو ہی میں شہاب نامہ بھی موجود ہے جس میں لکھنے والے نے کسی کو معاف نہیں کیا۔ زندہ تھا یا مردہ' چھوٹا تھا یا بڑا۔ مصنف نے اپنی نفرت اور سیاست یا عقیدہ میں اپنے اختلاف کا سہارا لے کر ان کی شخصیتوں کو مسمار کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔ یہ درست ہے کہ لکھنے والا لکھنے میں آزاد ہے مگر میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ اکیسویں صدی میں لکھنے والا اکیلا ہے نہ جانچنے والا تنہا۔ اب تو ہر بات کی جانچ پرکھ ہوسکتی ہے۔ ہر چیز سامنے لائی جاسکتی ہے۔ نفرت کرنا ہر شخص کا حق ہے مگر خودنوشت سوانح عمری کا سہارا لے کر اس نفرت کو اچھالنا کسی دور میں بھی مناسب نہیں جانا گیا خصوصاً ایسے حالات میں جہاں مصنف نے اپنی نفرت کے اظہار میں تاریخ کو مسخ کرنے سے بھی گریز نہ کیا ہو۔

جوش صاحب نے اپنے آبا و اجداد کی شخصیتوں کو شایانِ شان طریق سے تعمیر کیا ہے مگر اس طرح اودھ کے تعلقہ داران جن میں جوش صاحب کے آبا و اجداد بھی شامل ہیں محض جاہل ان پڑھ اور غصیلے اور جنسی مریض ثابت ہوتے ہیں جن کا واحد مشغلہ عورت ہے۔ لارڈ ویول نے اودھ کے تعلقہ داروں کو ''عجیب الخلقت اور غریب الدماغ لوگوں کا گروہ'' قرار دیا تھا جوش صاحب کی خودنوشت ان کی گواہ بنتی ہے۔ جنرل شاہد حامد کا ننھیالی رشتہ انہیں تعلقہ داروں سے تھا اختر حسین رائے پوری کی والدہ بھی اسی طبقہ سے تھیں اور اسی ماں کے ورثہ میں آئی ہوئی جائیداد ان کے آڑے وقت میں کام آئی اور وہ اسے بیچ کھوچ کر اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ سدھارے۔ ان دو اتنے ہی جانے پہچانے مصنفین نے اپنے بڑوں کو اتنا نہیں بڑھایا کہ ان جیسے سارے لوگوں کی صورت ہی مسخ ہوجائے۔

خودنوشت سوانح عمری لکھنے والوں کے لئے ایک اور بات بھی اہم سمجھی گئی ہے کہ وہ اس وقت اپنی خودنوشت لکھنے کے لئے قلم اٹھائیں جب ''پل کے نیچے سے بہت سا پانی گذر چکا ہو''۔ رضا علی کی اعمال نامہ ان کی زندگی کے آخری دور میں لکھی گئی۔ آل احمد سرور کی خواب باقی ہیں ان کی عمر کے پچھترویں برس میں سامنے آئی۔ جوش صاحب کی یادوں کی بارات ان کی ضعیفی کے زمانہ میں تحریر ہوئی۔ یہی حال حمید نسیم صاحب کا ہے ان کی ناممکن کی جستجو ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد لکھی گئی۔ وزیر آغا کی شام کی منڈیر سے ان کے چونسٹھویں برس میں مرتب ہوئی۔ سالک صاحب کی سرگزشت اور

ذوالفقار علی بخاری کی سرگزشت بھی ان کے ارزل العمر کی کتابیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان ادیبوں نے عمر کے ایک خاص حصہ میں محسوس کیا ہوگا کہ انہیں دنیا کو کچھ دینا ہے۔ وہی احسان دانش کی بات کہ کچھ قرض سا اتارنا ہے زندگی میں ایک ایسی عمر آیا کرتی ہے جہاں پہنچ کر انسان میں یہ حوصلہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنی تکمیل کے احساس میں دوسروں کو شریک کرے۔ خودنوشت سوانح نگار اگر دوسروں کو اپنا شریک نہیں بنا سکتا اور انہیں اپنی انا کی بلند تر سطح سے مخاطب کرتا ہے تو وہ خودنوشت کامیاب خودنوشت نہیں کہلاسکتی۔ مگر ہمارے ہاں رو' سی چل نکلی ہے کہ ایسے لوگ بھی اپنی خودنوشت لکھنے بیٹھ گئے جنہیں ابھی اپنی زندگی کا بہت سا سفر طے کرنا تھا۔ ہمارے ہاں کشور ناہید' جاوید شاہین ڈاکٹر مبارک علی جیسے لوگوں کی سرگزشتیں بے وقت کی لکھی ہوئی سرگزشتیں ہیں۔ بلکہ جاوید شاہین نے تو کشور ناہید کو نوعمری میں خودنوشت لکھنے کا طعنہ دیتے ہوئے خود وہی کام کیا ہے یہ ایسے وقت کی سرگزشتیں ہیں جہاں انسان قرض نہیں اتارتا' چھدا اتارتا ہے۔

ایک بدعت ہمارے یہاں خودنوشت کو اپنے نظریات کی تبلیغ وتشریح کا ذریعہ سمجھنے کی چل نکلی۔ سر رضا علی نے اعمالنامہ کے تین باب اپنے نظریات کے لئے وقف کردئے ان میں اپنے مذہب سے لے کر عشق ومحبت تک کے موضوعات شامل ہیں۔ شہاب نامہ کا آخری باب بھی اسی زمرہ میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ حکومت کے عہدیدار کو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ لوگ اس کی باتیں سنتے ہیں۔ رضا علی نے اسی لئے اپنے نظریات کو باقاعدہ تھیوری بنا کر پیش کیا اور اپنی کتاب کی وحدت کو مجروح کرلیا۔ اسی طرح سر رضا علی نے محسن الملک کی ناراستیوں کو بھی جائز ثابت کرنے کی سعیء بلیغ کی۔ اس روایت سے جوش صاحب نے فائدہ اٹھایا۔ مگر ہمارے افسروں میں منظور الٰہی کی سلسلہء روز وشب ان کی باقاعدہ خودنوشت تو نہیں مگر ان کی زندگی کے بیشتر حصہ کی تصویر کشی کرتی ہے (ان کی خودنوشت ہم کہاں کے دانا تھے خدا جانے کب سے چھپ رہی ہے)۔ مگر منظور الٰہی کے ہاں کہیں بے جا تفاخر یا برتری اور حاکمیت کا احساس در نہیں آیا جو سر رضا علی یا شہاب صاحب کے ہاں موجود ہے۔ اسی طرح سر ظفر اللہ خان اپنے عقیدہ پر مضبوطی سے قائم رہنے کے باوجود کہیں تبلیغ یا تلقین کے مرتکب نہیں ہوئے اور عام لوگوں سے مختلف عقیدہ رکھنا کوئی انہونی یا بری بات نہیں ہوتی۔ مرے بت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو۔

خودنوشت نساخ

عبدالغفور نساخ کی خودنوشت انیسویں صدی کے اواخر میں لکھی گئی مگر سو سال بعد چھپی۔ یہ کالا پانی سے کہیں بہتر اور مربوط خودنوشت ہے۔

عبدالغفور نساخ کا نام اردو کے کلاسیکی ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے نیا نام نہیں۔ یہ نہ صرف نغز گو شاعر تھے بلکہ اپنی تنقیدی صلاحیتوں کی وجہ سے بھی ممتاز تھے ان کی خودنوشت میں غالب اوران کے ہم عصروں کا ذکر ہے بعد کے زمانہ میں داغ سے ملاقات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ وہ دبستانِ دلی سے بھی متعلق رہے دبستانِ لکھنؤ والوں سے بھی ان کی شناسائی رہی انیس و دبیر کا زمانہ بھی انہوں نے دیکھا غرض وہ ہمارے ادب کے ایک اہم دور کے چشم دید گواہ ہیں۔ ۱۸۸۶ء میں لکھی جانے والی ان کی خودنوشت پورے ایک سو سال کے بعد کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی نے ۱۹۸۶ء میں چھاپی۔ ڈاکٹر عبدالسبحان صدر شعبہ اردو مولانا آزاد کالج نے اسے مرتب کیا ہے۔ پونے دو سو صفحات کی یہ خودنوشت نساخ کی زندگی کی مکمل سرگزشت نہیں۔ مگر جتنی ہے وہ بھی اس دور کے بارہ میں بہت سی معلومات فراہم کرنے کے علاوہ اس دور کی معاشرتی اور تہذیبی قدروں پر روشنی ڈالتی ہے۔ نساخ کا انداز بھی سیدھا سادہ واقعاتی انداز ہے۔ وہ صرف احوال کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتے چلے جاتے ہیں مگر اس انداز سے مترشح ہوتا ہے کہ غالباً انہیں اس بات کا یقین بھی تھا کہ کبھی نہ کبھی وہ اس احوال کو ضرور چھاپیں گے۔ مگر ان کی زندگی میں ایسا نہ ہو سکا۔ ان کی وفات کے وقت یہ خودنوشت جیسی اور جتنی موجود تھی ایشیاٹک سوسائٹی نے اسے چھاپ دیا ہے۔

اس معاشرہ کی ایک بات جو مجھے اچھی بھی لگی اور پہلی بار نظر آئی وہ نساخ کی خودنوشت کا عطیہ ہے۔ شرفا کا دستور یہ تھا کہ کسی کا ذکر کرتے ہیں تو ساتھ میں اس کے باپ دادا کا نام تو لکھتے ہی ہیں اگر معلوم ہو تو اس کے خاندان کا ذکر بھی تفصیل سے کرتے ہیں۔ خصوصاً رشتہ ناطہ کے سلسلہ میں تو اس بات

کا بہت لحاظ رکھا جاتا تھا کہ خاندان میں تو کوئی نئی نہیں؟ ابھی کل ہی میں نے جنرل جہانداد خان صاحب کی خودنوشت پڑھی ہے اس میں وہ نواب کالا باغ کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ وہ کہا کرتے تھے کہ "ہم لوگوں نے گھوڑا یا کتا بھی خریدنا ہو تو اس کی نسل کی تحقیق کر لیتے ہیں آپ لوگ فوج میں افسروں کے انتخاب کے وقت ایسی کسی چیز کا لحاظ نہیں رکھتے۔" اس باب میں میں کیا کہہ سکتا ہوں مگر ہمارے بڑوں میں یہ رواج تھا اور نساخ نے اس کی گواہی دی ہے۔ لوگ خاندانی نجابت و شرافت کا لحاظ رکھتے تھے۔ اب وہ لحاظ ہی نہیں ساری قدریں ہی نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئی ہیں۔ شرفا کے بچوں کی تعلیم و تربیت کا طریق یہ تھا کہ عربی فارسی اور صرف و نحو کی تعلیم ضروری خیال کی جاتی تھی اور وہی شخص پڑھا لکھا شمار کیا جاتا تھا جو ان علوم کی تحصیل کر چکا ہو۔ مدرسے جاری ہو چکے تھے۔ لکھتے ہیں: "ان دنوں میرا سن بارہ تیرہ برس کا تھا۔۔ انہیں دنوں بزرگوں کی رائے ہوئی کہ ہم لوگوں یعنی مجھ کو اور میرے منجھلے بھائی مولوی عبدالباری صاحب کو ہوگلی میں پڑھنے کے واسطے بھیج دیں۔ ان دنوں ہم لوگ مدرسہ کے انگریزی سکول کی اول جماعت میں پڑھتے تھے (صفحہ ۷) اس واقعہ کے چھ سال بعد اپنے وطن جانے کا ذکر ہے مگر یہ ذکر نہیں کہ آپ نے کیا پڑھا یا کیا سیکھا۔ مدرسہ کے بارہ میں لکھا ہے "مدرس اول مولوی رمضان اللہ تھے اور وہ شرح ملا پڑھانے میں بے مثل تھے۔ بہت سے طالب علم جا بجا سے شرح ملا پڑھنے کے لئے ہگلی جاتے تھے اور شرح ملا پڑھ کے چلے آتے تھے"۔ غالباً ان بھائیوں نے بھی یہی کچھ پڑھا ہوگا مگر اتنا کچھ ضرور سیکھ لیا کہ جب بیلی صاحب ڈھاکہ کے ایڈیشنل جج ہوئے تو آپ نے انہیں محرری کی ملازمت دے دی اور سررشتہ کا کام سکھلایا۔ لکھتے ہیں ملازمت شروع کرنے سے قبل میں نے "حلف کیا کہ خود بھی رشوت نہیں لوں گا اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی رشوت نہیں لینے دوں گا" (صفحہ ۱۱)

اس زمانہ کا ایک برا دستور یہ تھا کہ اگر کوئی شخص کسی علم یا فن میں کمال حاصل کر لیتا تھا وہ تو وہ دوسروں کو سکھاتا نہیں تھا۔ نساخ نے ایک ایسے ہی فنکار کا ذکر کیا ہے "کلکتہ میں ایک شخص کو خطِ ناخن لکھتے دیکھا اور میں نے سیکھنا چاہا انہوں نے بتایا نہیں۔ اور معلوم ہوا انہوں نے ہوگلی میں میرزا امیر جان خوش نویس سے سیکھا تھا اس لئے ہوگلی میں ان کے پاس اس غرض سے جانے لگا لیکن مجھ کو معلوم ہوا کہ وہ شاید نہ بتلائیں" (صفحہ ۸) یہ روایت طب میں بھی جاری تھی۔ حکیم نورالدین صاحب مرقاۃ

الیقین کے ذکر میں آگے آئے گا کہ حکیم صاحب نے دستورِ زمانہ کے برعکس اپنی بیاض چھاپ دی تھی اور لوگ اب تک اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں حالانکہ حکماء کا دستور یہ تھا کہ وہ اپنے نسخوں کو حرزِ جاں بنا کر رکھتے تھے اور اپنی اولاد و اخلاف تک سے اخفا روا رکھتے تھے۔

نساخ نے بہتر ملازمت کی تلاش جاری رکھی اس سلسلہ میں بیلی صاحب نے ایک دوسرے انگریز سے ان کی سفارش بھی کی۔ وہ صاحب بیلی صاحب کے ماتحت تھے اس کے باوجود انہوں نے اس سفارش کی پروانہ کی۔ اب نساخ صاحب اولیا کی طرف رجوع ہوئے ''میں نے جناب میر محمد واحد صاحب چشتیہ ابو العلاء دانا پوری سے کہا میں ڈپیوٹی مجسٹریٹی کا عہدہ چاہتا ہوں۔ وہ ولی کامل تھے اور مجھ سے از حد محبت رکھتے تھے ان سے حد درجہ کی بے تکلفی تھی حالانکہ میری اور ان کی عمر میں قریب تیس برس کا فاصلہ تھا۔ انہوں نے مجھ کو تسخیر کا عمل بتا دیا اور اس کا بنانا بھی بتا دیا۔۔۔ میں گھبرا گیا اور ان سے کہہ کے چھوڑ دیا'' (صفحہ ۱۵)۔ اس کے بعد انہوں نے ایک اور عمل بتایا ''اس میں ترکِ حیوانات کرنا تھا اور ایک جگہ میں سونا تھا تین چار روز ترکِ حیوانات کر کے پڑھا بعد ازاں گھبرا گیا۔ میر صاحب موصوف نے بکرے کا گوشت کھانے کو کہا اور سب طرح کے حیوانات سے پرہیز کرنے کو کہا لیکن دو چار دس روز کے بعد میں نے سب شرطیں اٹھا دیں نہ سونے کی جگہ کا تعین رہا نہ کھانے کا پرہیز رہا نہ پنج وقتی نماز کا خیال رہا فقط جس وقت عمل پڑھتا تھا اسی وقت نماز پڑھتا تھا اسی طرح برابر عمل کرتا رہا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ میں نے جناب میر محمد واحد صاحب سے کہا انہوں نے ایک اور چلہ پڑھنے کو کہا میں نے ایک اور چلہ اسی طرح پڑھا لیکن ڈپیوٹی مجسٹریٹی کا اثر آثار نظر نہیں آیا۔ میں نے میر صاحب سے کہا انہوں نے مسکرا کر فرمایا آپ نے جس طرح پر اس عمل کو پڑھا ہے آج تک کسی نے نہیں پڑھا اگر کوئی دوسرا شخص اس طرح بد پرہیزیاں کرتا تو رجعت ہو جاتی۔ آپ پر جو بلا آتی تھی اس کو میں روکتا تھا'' (صفحہ ۱۶)۔ غرض ان ''بد پرہیزیوں'' کی وجہ سے ان کی ڈپیوٹی مجسٹریٹی دو سال تک ملتوی ہو گئی اور جب ملی تب بھی مرشد کے تصرف سے ملی۔ اسے اس زمانہ کا عام رجحان کہئے یا ضعیف الاعتقادی کہ ڈپیوٹی مجسٹریٹ ہو گئے تب بھی انہیں یہ گمان نہیں گذرا کہ یہ عہدہ انہیں ان کی قابلیت سے ملا ہے وہ اسے اپنے مرشد کا تصرف ہی سمجھتے رہے۔

یہاں مشہور یورپی مستشرق اور دانشور ایڈورڈ بیلس کاوال (۱۸۲۶ء۔۱۹۰۳ء) کا ذکر ہے کہ وہ فارسی پڑھنے کے لئے کسی استاد کے متلاشی تھے۔ نساخ سے انہوں نے خمسہ خسرو کے چند اشعار کا ترجمہ پوچھا اور ان کی قابلیت سے مطمئن ہو کر ان کی شاگردی اختیار کی۔ اس تعلق نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں انہیں بہت فائدہ پہنچایا۔ لکھتے ہیں: ''میں ان دنوں روزانہ کاوال صاحب کے یہاں جاتا تھا اور ان سے بالکل صحیح خبریں سن کر احباب سے کہتا تھا ایک دن خبر معلوم ہوئی کہ کل بارک پور (یعنی چانک) کے سپاہیوں سے حربہ لے لیا جائے گا۔ اگر وہ لوگ حربہ دے دیں گے تو خیر ہے ورنہ وہ لوگ کلکتہ پر تاخت کریں گے۔ ان دنوں بیشتر اہلِ یورپ اور یوریشین جہازوں پر جا کے سوتے تھے۔ میں جو گھر سے نکلا تو دیکھا کہ شہر میں خاک اڑ رہی ہے ہر طرف انگریز لوگ سوار اور پیدل مضطربانہ دریا کی طرف جاتے ہیں ایسا حال شہر کا میں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔۔۔ چار بجے کاوال صاحب کے یہاں گیا اور سنا کہ باغیوں نے ہتھیار دے دیا۔۔۔ دوسرے روز ہتھیار دے دینے کی بات مشہور ہو گئی شہر میں ہر طرف امن ہو گیا'' (صفحہ ۲۴۔۲۵)

اس خودنوشت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ''شرفا پیسے اپنے پاس نہیں رکھتے تھے'' (صفحہ ۳۴) سخاوت کا بھی بہت رواج تھا ایک دوست کا ذکر کرتے ہیں کہ سائل نے ان سے سوال کیا اتفاق سے گھر میں کوئی رقم موجود نہ تھی اس سفید پوش کی ضرورت پوری کرنے کے لئے ایک چاندی کا فریم نوکر کو دیا کہ بازار میں گروی رکھ کر پیسے لے آئے وہ پیسے آئے تو سائل کی ضرورت پوری کر دی'' (صفحہ ایضاً)۔

ان کی ضعیف الاعتقادی کا تو ذکر ہو ہی چکا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ''کشتی ڈوبا ہی چاہتی تھی مگر میرے پاس ایک تعویذ تھا جس کی برکت سے کشتی نہیں ڈوبی'' (صفحہ ۸۶)۔ ''تنخواہ میں اضافہ ہونے کے لئے پھر وظیفہ پڑھنے کا سہارا لیا'' (صفحہ ۱۶۳) اور مرے پر سو درے کہتے ہیں ''میں مقدمات کے فیصلہ میں علم نجوم سے بھی کام لیتا تھا'' (صفحہ ۵۳)۔

یہ تو ان کی ذاتی ''خوبیاں'' تھیں اب معاشرت کا احوال سنئے۔ بیمار ہوئے تو علاج کے لئے دلی گئے ''حکیم محمود خاں سے علاج کیا بخوبی آرام ہو گیا وہاں مفتی صدر الدین خاں آزردہ اور نواب ضیاء الدین احمد نیر رخشاں۔۔۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب' نواب مصطفیٰ خان شیفتہ۔۔۔ خواجہ امان

صاحبِ ترجمہ بوستانِ خیال، شہزادہ مرزا الٰہی بخش وخواجہ بدرالدین ابن میاں کالے صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اور یہ سب مجھ سے از حد مہربانی سے پیش آئے۔ (صفحہ۹۴) اسی دوران کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''مرزا غالب نے ایک دن مجھ سے کہا مولوی معلوم ہوتا ہے کہ تم بھی میری طرح سات آٹھ برس کے سن سے شعر کہتے ہوگے۔ میں نے کہا ہاں۔ عید کے روز مرزا صاحب نے اپنی مثنوی گہربار کے تین چار سو (؟) شعر میرے سامنے پڑھے۔ اہلِ دہلی کو بڑا تعجب ہوا کہ مرزا صاحب نے چار پانچ برس سے کسی کے سامنے شعر پڑھے نہ تھے بلکہ کوئی اگر ان سے شعر پڑھنے کو کہتا تھا تو وہ خفا ہوتے تھے'' (صفحہ ایضاً)۔ دہلی والوں کی ایک نئی وضع داری بھی انہی کی کتاب سے معلوم ہوئی کہ: ''نواب مصطفیٰ خان سا مہذب آدمی میں نے نہیں دیکھا انہوں نے اپنے مکان پر مجھ کو شعر پڑھنے کو کہا نہیں بلکہ اپنے مکان پر اپنا شعر خود سناتے تھے اور جب میرے مکان پر آتے تھے تب مجھ سے شعر پڑھنے کو کہتے تھے (صفحہ ایضاً)۔ راقم الحروف نے ایسی وضعداریوں کی بات ایک بار استاذی المحترم پروفیسر وزیرالحسن عابدی سے سنی تھی۔ اس کی سند اب آ کے نساخ کے ہاں ملی ہے۔ دہلی اور لکھنؤ دونوں ان کے دیکھے بھالے شہر تھے دہلی والوں کے بارہ میں ان کا کہنا ہے ''دہلی میں لوگ اچھے ہیں دل وزبان ایک ہے'' (صفحہ۹۵) اور لکھنؤ: ''یہاں کے اکثر لوگ زبانی محبت دکھلاتے ہیں لیکن دل میں کچھ نہیں ہے لکھنؤ کے لوگ باتیں خوب بناتے ہیں'' (صفحہ۹۷) دہلی کا حال یوں ہے: ''تپ وبائی میں مبتلا ہو کر ۔۔۔ دہلی گیا۔ قبل ازیں تین بار دہلی کو گیا تھا لیکن اس دفعہ جو گیا تو وہاں کے بعض بعض ہندو مسلمان انگریزی کپڑے پہننے لگے ہیں۔ اس دفعہ دہلی میں نواب مرزا خاں داغ سے خوب ملاقات رہی۔ ایک بار انہوں نے ہنسی میں مجھ سے کہا کہ آپ نے دغا کی۔ میں نے کہا نساخ میں تو دغا نہیں بلکہ داغ میں دغا ہے داغ دغائے مجسم ہے'' (صفحہ۱۷۴)۔ یہ خودنوشت اپنے زمانہ کے معاشرتی احوال اور مشاہیرِ ادب سے نساخ کی ذاتی ملاقاتوں کے بیان کی وجہ سے اردو کی خودنوشتوں میں ممتاز رہے گی۔

◎

نقشِ حیات

اس کے بعد کی خودنوشتوں میں حسین احمد مدنی کی ''نقشِ حیات'' کو استاذی ڈاکٹر سید عبداللہ نے نقوش کے آپ بیتی نمبر میں ایسی آپ بیتی قرار دیا ہے ''جو اس صنف کے اوصاف کو کسی حد تک پورا کرنے والی کتاب ہے'' (نقوش آپ بیتی نمبر صفحہ ٦٦) معلوم ہوتا ہے استاذی المحترم کی نگاہ سے ''نقشِ حیات'' کا صرف پہلا ۱۹۴۰ء کے قریب لکھا جانے والا حصہ گذرا ہے جس میں انہوں نے اپنے خاندانی حالات رقم فرمائے ہیں اور اپنی ہجرت مدینہ کا ذکر کیا ہے۔ باقی حصے تو کاملاً مولانا کے سیاسی افکار و مقالات سے بھرے پڑے ہیں اور ایسی تفصیلات سے مملو ہیں جنہیں خودنوشت سوانح حیات کے فن سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ علاوہ ازیں زبان و بیان مغلق اور معرّب ہے جسے کوئی ایسا شخص سمجھ نہیں سکتا جسے زبانِ عربی کے سمجھنے کا محاورہ نہ ہو۔

مولانا حسین احمد مدنی کی ۷۰۳ صفحات کی خودنوشت کے دونوں حصوں کو اگر ان کے ملفوظات کہہ دیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ ملفوظات کا لفظ میں اس لئے بھی استعمال کر رہا ہوں کہ انہوں نے اپنے اساتذہ کے فتاویٰ تک درج کر دئے ہیں اور جب ان پر وہابیت کا الزام لگا تو الزامی جواب دیتے ہوئے وہابی ائمہ کے خلاف بڑی سخت زبان استعمال کی اور بڑی تحدی سے جواب دیا کہ ہم لوگ وہابی عقائد کے سخت خلاف ہیں۔ ''وہابی مسلمانوں کو ذرا ذرا سی بات میں مشرک اور کافر قرار دیتے ہیں اور ان کے مال اور خون کو مباح جانتے ہیں ۔۔۔ (ہمارے) اکابر کا متفق علیہ قول یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان کے کسی قول اور عقیدہ میں سو احتمال ہوں جن میں سے ننانوے احتمال کفر کے ہوں اور ایک احتمال بھی ایمان کا ہو تو اس کی تکفیر جائز نہیں اور نہ وہ مباح الدم والمال ہو سکتا ہے۔ بلکہ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز اپنے مکتوب انوار القلوب میں تصریح فرماتے ہیں کہ یہ قول فقہا ''ننانوے احتمال'' کا تحدیدی نہیں ہے بلکہ اگر کسی کے کلام میں ہزار احتمال ہوں جن میں سے نو سو ننانوے احتمالات کفریہ

ہوں اور صرف ایک احتمال ایمان کا ہو تو اس کی بھی تکفیر جائز نہیں، ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بہ کجا''
(صفحہ ۱۲۶) نقشِ حیات میں درج فتویٰ اب ان کے پیروکاروں کے نزدیک کیا قدر و قیمت رکھتا ہے
اس کے بارہ میں میں کیا کہہ سکتا ہوں۔

◎

آپ بیتی

خواجہ حسن نظامی دہلوی کی آپ بیتی کا عنوان ''آپ بیتی'' ہے جو ۱۹۱۹ء میں لکھی گئی۔ اس وقت اردو میں خودنوشت سوانح عمریوں میں سے ایک یا دو خودنوشتیں معرضِ تحریر میں آئی تھیں اور ضروری نہیں کہ خواجہ صاحب کی نظروں سے گذری ہوں اس لئے خواجہ صاحب لکھتے ہیں ''ایک عرصہ ہوا میں نے آپ بیتی کے عنوان سے ایک کتاب لکھنی شروع کی مگر پھر اس کو ترک کر دیا کیونکہ اس میں مجھ کو خود نمائی کی بو آئی۔ اب خیال آیا کہ پیر بھائیوں کے تجربہ کے لئے اپنے سب نیک و بد حالات مرتب کر دینے مناسب ہیں کہ اس سے ان کو میری زندگی کے تاریک حالات بھی معلوم ہو جائیں گے۔ میں کوشش کروں گا کہ اپنی کسی مخفی بات کو بھی پردہ میں نہ رکھوں اور اپنے ان کاموں کو بھی لکھ دوں جو لوگوں کی نظر میں اچھے ہیں اور ان کو بھی بیان کر دوں جو عیب گناہ اور خلاف آدمیت ہیں۔ دوسرا آدمی میرے حالات لکھے گا تو چن چن کر خوبیاں بیان کرے گا اور عیبوں کو چھپائے گا اور ضرورت یہ ہے کہ خدا کے بندوں کو دھوکا نہ دیا جائے انسان کی جو اصلی حالت ہے وہی لکھی جائے تا کہ سب اچھی بری باتیں معلوم کر کے دوسرے لوگ اس شخص کی نسبت صحیح رائے قائم کر سکیں اور میرے صحیح حالات کا شائع ہونا اس واسطے بھی بہت ضروری ہے کہ میں مرید کرتا ہوں اور ہزاروں آدمی ایسے میرے مرید ہوتے ہیں جنہوں نے مجھ کو نہیں دیکھا خط کے ذریعہ مرید ہو جاتے ہیں یا لاکھوں آدمی ایسے ہیں کہ میری تحریریں دیکھ کر حسنِ عقیدت رکھتے ہیں تو مرید ہوتے وقت ان کو غور کر لینے میں آسانی ہو گی کہ ایسا آدمی پیر بنانے کے قابل بھی ہے یا نہیں'' (صفحہ ۱۵۔۱۶)

اس تمام رد و قدح کے باوجود اس آپ بیتی میں سے حضرت اکبر الہٰ آبادی کے حکم اور اصرار پر وہ تمام باتیں حذف کر دی گئیں جن سے ''کچھ حاصل نہیں ہوتا'' (صفحہ ۲) اس لئے یہ آپ بیتی ایسے واقعات سے معرا ہے جن کو مولانا عبد الماجد دریابادی کے قول کے مطابق بے کم و کاست بیان ہونا

چاہیے تھا۔ بہرطور اس آپ بیتی کے زیادہ تر مخاطب خواجہ صاحب کے مرید ہیں اس لئے عام طور سے انہوں نے ہی اس آپ بیتی کو قبول عام بخشا اور اب تک اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ عبرت کی بات یہ ہے کہ یہ آپ بیتی ایک صاحبِ طرز نثر نگار کی آپ بیتی ہے لیکن ان کے مخصوص طرزِ تحریر کی آئینہ دار نہیں۔ اس میں زبان کی وہ چاشنی نہیں جو خواجہ حسن نظامی کی تحریر کا خاصہ ہے۔

اس آپ بیتی کے تین دیباچے ہیں ایک خواجہ بانو یعنی خواجہ صاحب کی بیگم نے لکھا ہے اور اپنے شوہر اور پیر کی مرید عورتوں کو اپنے پیر کے نقشِ قدم پر چلنے کی تاکید کی ہے دوسرا ان کے مرید باصفا ملا واحدی نے لکھا ہے اور تیسرا مولوی شیخ محمد احسان الحق قادری المعروف بہ بھیا احسان الحق عشقی نے لکھا ہے اور اس بات پر تاسف کا اظہار کیا ہے کہ خواجہ صاحب نے بے کم و کاست اپنے حالات کو کیوں بیان نہیں کیا ''میں آپ بیتی کو بہت زیادہ قابلِ قدر بلکہ دنیا کی ایک بہترین کتاب سمجھتا اگر وہ حصے جو مسودہ میں سے خارج کردئے گئے ہیں اس میں شائع کردئے جاتے'' (صفحہ ۱۰)

ان تمام باتوں کے باوجود یہ خودنوشت بہت سی خودنوشتوں سے اس باب میں نمایاں ہے کہ اس میں مشفق خواجہ کے قول کے مطابق ''خواجہ صاحب نے بعض ایسی باتیں لکھی ہیں جو کوئی دوسرا اپنے بارہ میں لکھنے کی جرات نہیں کرسکتا۔ مثلاً انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ وہ خود پسند ہیں اور اس حد تک کہ کسی دوسرے کی جائز تعریف بھی برداشت نہیں کرسکتے۔ خوشامد ان کا دل خوش کردیتی ہے یہ جانتے ہوئے بھی کہ خوشامد بری چیز ہے خوشامدیوں کو اپنے گرد و پیش دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ خلافِ ضمیر کام کرنے پر بھی ان کی طبیعت ہمیشہ آمادہ رہتی ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنے آپ کو سنگ دل بھی لکھا ہے فرماتے ہیں بیوی مرگئی دو بیٹے مرگئے ایک بیٹی مرگئی لیکن میرے دل پر ذرا سا اثر نہ ہوا'' (خامہ بگوش کے قلم سے صفحہ ۱۶۰)۔ خواجہ صاحب نے یہ تمام باتیں جگہ جگہ مختلف مواقع پر کہی تھیں مشفق خواجہ نے ان کو یکجا کردیا ہے اور ایک لحاظ سے خواجہ صاحب کی شخصیت کا تجزیہ کردیا ہے۔ خواجہ صاحب کی آپ بیتی کا اسلوب یہی رہا ہے کہ وہ ایک واقعہ بیان کرتے اور پھر اس سے اپنے مریدوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے کوئی نتیجہ نکال کر دکھاتے ہیں۔ یہ آپ بیتی ''پندنامہ حسن نظامی'' بن کر رہ گئی ہے۔

مرقاۃ الیقین

۱۹۱۲ء میں حکیم نورالدین کی خودنوشت سوانح حیات ''مرقاۃ الیقین'' پہلی بار چھپی۔ یہ خود نوشت حکیم صاحب نے اپنے ایک مرید اکبر شاہ خان نجیب آبادی کو لکھوائی تھی۔ اکبر شاہ خان صاحب اپنے مرشد کی خدمت میں حاضر رہتے اور ان کے بیان فرمودہ حالات کو قلمبند کرتے چلے جاتے۔ حکیم صاحب اپنے زمانہ کے بزرگ عالم، مفسر قرآن حکیم اور صوفی تھے۔ حصولِ تعلیم کے لئے پہلے تو ہندوستان کی خاک چھانی اس کے بعد مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں لمبے عرصہ تک علما کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا نوجوانی میں حصول علم کے لئے روانہ ہونے لگے تو علم دوست باپ نے کہا ''اتنی دور جاکر پڑھو کہ ہم میں سے کسی کے مرنے جینے سے ذرا سا بھی تعلق نہ رہے (صفحہ ۱۳۲) چنانچہ حکیم صاحب اپنے مولد و مسکن بھیرہ سے روانہ ہوکر رامپور، لکھنؤ، بھوپال اور پھر مکہ مدینہ پہنچے اور جب تک حصولِ علم سے مطمئن نہ ہوئے وطن کا رخ نہیں کیا۔ جہاں کسی عالم کی موجودگی کی بھنک کان میں پڑتی فوراً توکل علی اللہ ادھر کا رخ کرلیتے زادِ راہ کی فکر کرتے نہ کرائے بھاڑے کی۔ مرقاۃ الیقین توکل علی اللہ کے خوارق سے بھری پڑی ہے۔

مرقاۃ الیقین سے انیسویں صدی کے مسلمانوں کے مذہبی مسائل اور رویوں سے بھی آگاہی حاصل ہوتی ہے کہ کس طرح اہلِ فقہ فروعی اختلافات میں الجھے ہوئے تھے حتیٰ کہ عرب کے مسلمان بھی اسی بدعت کا شکار تھے ذرا ذرا سے اختلاف پر کفر کے فتوے جاری ہوتے تھے۔ حکیم صاحب نے اپنے اساتذہ سے حدیث اور قرآن سیکھا بلکہ ان میں سے بزرگ اساتذہ سے بیعت بھی ہوئے۔ اس طرح رشد و ہدایت میں دن دونی رات چوگنی ترقی کی۔ بعد کے زمانہ میں حکیم صاحب نے اپنی طبابت کے بل بوتے پر مہاراجہ کشمیر کے دربار سے توصل حاصل کیا مگر غریب غربا کا علاج مفت ہی کرتے رہے۔ ایک بار مہاراجہ کے دربار سے بلاوا تھا ادھر جارہے تھے کہ رستہ میں ایک حلال خوری نے ان کو روکا کہ میرا بیٹا بڑا

سخت بیمار ہے اسے دیکھ لیں۔شاہی دربار کا سفر قطع کر کے اس کے گھر چلے گئے بچے کو دیکھا دوا تجویز کی
کچھ دوائیں اپنے پاس سے دیں اور پھر مہاراجہ کے ہاں گئے۔حکیم صاحب کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ نے شفا
بھی بہت رکھی تھی اس کے ساتھ منصب رشد پر تھے اس لئے ان کی جانب لوگوں کو رجوع بھی بہت تھا۔
حکیم صاحب نے اپنے تمام نسخے بیاض نورالدین کے نام سے چھپوا دئے تھے اور حکما اب تک ان سے
مستفید ہوتے ہیں۔مرقاۃ الیقین ایک صوفی ءمرتاض حکیم حاذق عالمِ باعمل اور مرشد کامل کی داستانِ
حیات ہے ان کے خوارق پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انسان تذکرۃ الاولیاء پڑھ رہا ہو۔

اعمال نامہ

''اعمال نامہ'' سر رضا علی کی خودنوشت ہے جو پہلی بار ۱۹۴۳ء میں چھپی۔سر رضا نے اپنی خود
نوشت میں بڑی ترتیب ملحوظ رکھی ہے اور ہر بات کو پورے سیاق وسباق میں لکھا اور پیش کیا ہے۔سر
رضا نے اپنے عہد کے مسلمانوں کی گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔علی گڑھ تحریک کے ساتھ عملی طور پر
وابستہ رہے اور ہر ممکن حد تک تعاون کرتے رہے ان کے خیالات ایک حد تک اس دور۔کے مقتدر
مسلمانوں کے خیالات سمجھے جاتے تھے۔انہیں سرسید کے ساتھ ساتھ بنیاد پرست مسلمانوں کے ساتھ
بھی بڑا جہاد کرنا پڑا کیونکہ وہ دیانت داری سے سمجھتے تھے کہ:'' دینیات کی تعلیم اس زمانہ میں ان علماء سے
دلوانا جن کو طلبا کے شکوک وشبہات کا کچھ اندازہ نہیں اسلام میں چرچ قائم کرنے کی بنیاد ڈالنا ہے۔ہم
مسلمانوں کو شکر کرنا چاہئے کہ ہمارے مذہب میں کبھی چرچ قائم نہیں ہوا۔یہودیوں عیسائیوں ہندوؤں
اور پارسیوں میں چرچ قائم ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہبی تعلیم کے اجارہ دار بطریق پادری برہمن اور
دستور بن گئے۔اسلامی عقائد کے بموجب عالم یا مجتہد کا کام ہے نماز کے وقت امامت کرے اپنے پیشہ
کے فرائض (خواہ وہ درس وتدریس ہوں یا لوہار بڑھئی کا کام یا کاروبار تجارت) انجام دے اور لڑائی کے
وقت لشکرِ اسلام کا سپاہی بن جائے۔پیشہ ور پجاری یا پادری کی منظم جماعت قائم کرنا حق کی جستجو اور
اسلامی تعلیمات کے بالکل منافی ہے''(صفحہ ۱۴۰)

سر رضا علی کی جرات کی داد دینی چاہئے کہ انہوں نے جس بات کو حق جانا اس کے اظہار میں
کوئی باک محسوس نہیں کیا۔سر رضا نے سرسید کے نورتنوں حالی اور نذیر احمد کا ذکر بھی کیا ہے اور ان کی ادبی
حیثیت کا محاکمہ کرنے کی کوشش کی ہے مگر وہ ایک عام مدبر کا محاکمہ ہے کسی ادیب یا نقاد کا محاکمہ نہیں
۔شبلی کے بارہ میں ان کی رومانی اور چلبلی طبیعت کا ذکر ہے اور عطیہ بیگم اور زہرا بیگم کے نام ان کے خطوط
کا بھی۔اعمال نامہ ایک حد تک مکمل خودنوشت سوانح عمری ہے جس میں مصنف نے اپنے زمانے کے

سیاسی سماجی اور علمی حالات کو بیان کیا ہے اور اپنے حوالہ سے بیان کیا ہے مگر آل احمد سرور کے لفظوں میں اسے اردو کی بہترین خودنوشت قرار نہیں دیا جاسکتا کہ اس کی ادبی خوبیاں نمایاں حد تک غیر نمایاں ہیں۔ یوں کہنے کو سر رضا علی کو مشاعروں کا بڑا کامیاب صدر کہا جاتا تھا اور ان کی صدارت میں بقول شخصے بڑے سے بڑا دم گلا شاعر بھی دم نہیں مارتا تھا مگر ادبی دبدبہ اور چیز ہے ادب لکھنا اور چیز۔ یہ خودنوشت مصنف کی زندگی میں شائع ہوگئی تھی اس لئے اسے مارک ٹوین کے لفظوں میں قبر سے لکھی جانے والی خودنوشت قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ایک اور جدت سر رضا نے یہ کی کہ جہاں جہاں فارسی شعر سند میں لکھے ہیں ساتھ ہی ان کا ترجمہ درج کر دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا انہیں اپنے دور ہی میں فارسی کے مٹتے ہوئے ذوق کا اندازہ ہوگیا تھا۔ پاکستان میں ان کے داماد ابو طالب نقوی نے کمشنر کراچی کی حیثیت سے بہت نام کمایا مگر جوش صاحب کی بے جا حمایت اور ناز برداری انہیں لے ڈوبی۔ ہم تو ڈوبے ہیں صنم تجھ کو بھی لے ڈوبیں گے۔

اعمال نامہ علی گڑھ کے ایک قدردان کی لکھی ہوئی سرگزشت ہے مگر حیرت کی بات ہے کہ سر رضا کھیلوں کے قدردان نہیں تھے۔ کھیلوں میں علیگڑھ کے غلو کو علمی ذوق کی ناقدری سے تعبیر کرتے تھے۔ علی گڑھ کے کھیلوں کے بارہ میں رشید احمد صدیقی رطب اللسان ہیں۔ شاہد حامد کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی کو علیگڑھ کا نمایاں وصف قرار دیتے ہیں آل احمد سرور اور غلام السیدین بھی کھیلوں اور علیگڑھ کو ایک دوسرے کا مترادف جانتے ہیں مگر سر رضا: ''میرے زمانے میں علی گڑھ میں کرکٹ اور فٹ بال کھیلنے والوں کی خاصی قدر تھی ادبی مذاق پیدا کرنے یا طلبا کا علمی مذاق بڑھانے یا ان کی ہمت بندھانے کا خیال اساتذہ کو تھا نہ ٹرسٹیوں کو'' (صفحہ ۵۷)۔ آخر ہر شخص کھیلوں کا قدردان بھی تو نہیں ہوسکتا۔

◎

حیاتِ قدسی

حکیم نورالدین صاحب ہی کے ایک مرید مولانا غلام رسول راجیکی کی خودنوشت ''حیاتِ قدسی'' بھی ایک عجیب صحیفہ ہے۔ اس کا پہلا حصہ ۱۹۵۱ء میں اور پانچواں حصہ ۱۹۵۷ء میں حیدرآباد دکن بھارت سے شائع ہوا۔ راجیکی صاحب گجرات (پنجاب) کے ایک ایسے صوفی گھرانے میں پیدا ہوئے ''جس کی خداپرستی اور بے نفسی کی وجہ سے لوگ اسے آج تک سات پیڑھیے ولیوں کا خاندان کہتے ہیں۔ قرآن مجید کے ساتھ اس خاندان کو اتنا شغف تھا کہ بعض پشتوں میں اس کے نو نو دس دس حفاظ ایک وقت میں مل جاتے تھے۔ پھر اس خاندان کی خواتین میں سے بعض کا یہ دستور العمل چلا آتا تھا کہ وہ ہمیشہ اپنے بچوں کو وضو کر کے دودھ پلایا کرتی تھیں (صفحہ ٦)۔ مولوی غلام رسول راجیکی قرآن و حدیث کے بہت بڑے عالم اور باعمل صوفی تھے۔ آپ صاحب' رویا و کشوف تھے اور حیات قدسی میں بہت سے ایسے واقعات روایت ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں قبولیت دعا کا معجزہ بھی عطا کر رکھا تھا اس لئے ان کی طرف رجوع خلائق بھی بہت تھا لوگ دور دور سے دعا کروانے کے لئے ان کی خدمت میں حاضری دیتے تھے ایسے بے نفس اور دعا گو وجود بہت کم پائے جاتے ہیں۔ حیات قدسی پڑھنے والے کو عجیب عالمِ روحانیت میں پہنچا دیتی ہے اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا ابھی اولیاء اللہ سے خالی نہیں ہوئی۔ حیات قدسی کی پانچ جلدیں ہیں ہر جلد کا انداز واقعاتی بیان کا ہے زمانہ کی تقدیم تاخیر کا لحاظ بھی نہیں رکھا گیا جیسے جیسے کوئی بات ذہن میں آتی چلی گئی بیان ہوتی گئی۔ یہ خودنوشت فی نفسہ ماورائے زمانہ لگتی ہے۔

◎

آپ بیتی

"آپ بیتی" کے عنوان سے دو اور آپ بیتیاں بھی شائع ہوئیں قادیان والے میر محمد اسمٰعیل صاحب اور مولانا عبدالماجد دریابادی کی۔ میر محمد اسمٰعیل صاحب حضرت خواجہ میر درد کے خانوادہ کے چشم وچراغ تھے پیشہ کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے عمر کا زیادہ عرصہ پنجاب کے مختلف ہسپتالوں میں اسسٹنٹ سول سرجن اور پھر سول سرجن رہے۔ یہ خودنوشت واقعاتی انداز میں لکھی گئی ہے یعنی زندگی کے مربوط حالات لکھنے کی بجائے میر صاحب نے اپنی سادہ شگفتہ زبان میں واقعات قلمبند کر دئے ہیں جن کا مقصد اخلاقی اور معاشرتی اصلاح ہے۔ ان کا طریق یہ ہے کہ کوئی واقعہ بیان کر کے چپکے سے آگے گذر جاتے ہیں اور پڑھنے والا اس کے عواقب ونتائج کے بارہ میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ خود کچھ نہیں کہتے جس طرح خواجہ حسن نظامی "نتائج نکال کر دکھاتے ہیں" میر صاحب ایسا نہیں کرتے۔

ایک واقعہ دیکھئے "ایک میرے دوست تھے جو حکیم بلکہ اشتہاری حکیم تھے ان کی چار بیویاں تھیں بیچارے کہیں سے یہ بھی سن بیٹھے تھے کہ شریعت کا حکم ہے کہ جب تم ایک سے زیادہ بیویاں کرو تو عدل وانصاف پر عمل کرو۔ ایک دن ان کی ایک بیوی ہمارے ہاں آئیں تو ان کے جسم پر تازہ نشانات زدوکوب کے تھے۔ کسی نے پوچھا "کیا حکیم صاحب آپ سے ناراض ہیں؟" کہنے لگیں "نہیں تو۔ وہ تو بیوی نمبر دو سے ناراض تھے"۔ پوچھنے والے نے پوچھا "پھر یہ چوٹوں کے نشان آپ کے جسم پر کیسے ہیں؟"۔ کہنے لگیں "یہ عدل وانصاف کے نشانات ہیں"۔ اس نے تعجب سے پوچھا "ہیں؟ وہ کیسے؟"۔ اس پر انہوں نے کہا "حکیم جی جب اپنی کسی بیوی پر ناراض ہوتے ہیں تو اسے خوب پیٹتے ہیں۔ مگر پیٹنے کے بعد اپنی باقی بیویوں کو سامنے بلا کر فرماتے ہیں کہ اب جب میں گھر سے باہر جاؤں گا تو تم تینوں اس کی نقلیں کرو گی اور اسے چڑاؤ گی۔ نیز انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جب اسے مار پڑی ہے تو تمہیں بھی پڑے۔ اس لئے اب میرے پاس آجاؤ۔ اس کے بعد جس قدر مار پہلی کو پڑی تھی اتنی ہی مار کوٹ سے باقیوں کی بھی تواضع فرماتے ہیں۔ یہ میرے جسم پر اس عدل وانصاف کے نشانات ہیں ناراضگی

کے نہیں"۔ (صفحہ ۲۴۲)۔

یہ آپ بیتی ایسے ہی دلچسپ واقعات کی وجہ سے چوتھی دہائی میں خوب مقبول ہوئی تھی اب شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی نے دوبارہ اسے لاہور سے شائع کیا ہے۔

آپ بیتی جگ بیتی

لاہور ہی سے ''کچھ آپ بیتی کچھ جگ بیتی'' کے ذیلی عنوان کے تحت گوپال متل کی قیام لاہور کی یادیں ''لاہور کا جو ذکر کیا'' مکتبہ اردو ادب بازار استھان اندرون لوہاری گیٹ نے شائع کی ہیں۔ اس پر تاریخِ اشاعت درج نہیں مگر یادیں قیام پاکستان سے قبل کی ہیں۔ اگر گوپال متل نے قیام پاکستان کے بعد کے حالات لکھے ہیں تو وہ اس میں شامل نہیں البتہ ان کے بعض حوالے موجود ہیں۔ گوپال متل اپنے وقت کے مشہور صحافی تھے مالیر کوٹلہ کی ریاست کے رہنے والے تھے مگر عمر کا بیشتر حصہ لاہور نوردی میں گذرا۔ گوپال متل نے اس دور کی ہندو صحافت اور صحافتی رویوں کی خوب تصویر کشی کی ہے۔ ہندو مسلمان اخبارات کی مسابقت کا بھی بڑا متوازن انداز میں ذکر ہے۔ شاعروں میں اختر شیرانی کا ذکر بڑا اثر انگیز ہے اور اس شاعر رومان کے بارہ میں پھیلائی گئی بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کرتا ہے۔ ''وہ اپنے دور کے مقبول ترین شاعر تھے ایک امیر اور انتہائی ذی وقار باپ کے بیٹے تھے اور ادب اور شاعری ان کے لئے پیشہ نہیں مشغلہ تھے۔ ان کی شاعری کے رومانی ماحول' ان کی مے نوشی اور آوارہ مزاجی نے انہیں دنیائے شعروادب کا رومانی شہزادہ بنادیا تھا۔ رومانی شہزادہ بننا آسان ہے لیکن بنے رہنا اتنا آسان نہیں لوگ رومانی شہزادے سے ہمہ وقت فوق الفطرت کارناموں کی امید رکھتے ہیں اور یہ کسی گوشت پوست کے انسان کے لئے ممکن نہیں ہوتا۔ اپنے والد حافظ محمود خان شیرانی سے ان کا قریب قریب تعلق منقطع ہو چکا تھا جو شخص دوسروں کو پانی کی طرح شراب پلاتا تھا وہ اب شراب کے لئے دوسروں کا دست نگر تھا۔ اس پر لوگ اس سے کنی کترانے لگے تھے لیکن جو لوگ ان پر اس قسم کے الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے باقاعدہ دریوزہ گری شروع کردی تھی وہ غالباً ذاتی تجربہ بیان کرنے کی بجائے سنی سنائی باتیں دہراتے ہیں۔ اختر نے شرافت نفس کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا روپے پیسے کو وہ آخر وقت تک حقارت سے دیکھتے رہے اور بے تکلف دستِ سوال بڑھادینا ان کے بس

ہی میں نہیں تھا'' (صفحہ ۳۸)۔

صحافیوں میں سے ظفر علی خان کا ذکر۔ ''ظفر علی خان کا ''تکل'' صرف صحافتی پتنگوں سے ہی نہیں لڑا وہ سیاست کے میدان میں ہر کسی سے لڑے۔ ان کا قلم کسی سیاسی منصوبہ بندی کے تحت نہیں بلکہ جذبات کے وقتی جوش پر چلتا تھا۔ خوش ہوئے تو تعریف کردی خفا ہوئے تو ہجو لکھ ڈالی۔ عجیب بات ہے مولانا کے تلون کے باعث ان کی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آیا جو لوگ ان کے تیغ قلم کے قتیل تھے وہ بھی اس کی برش کی داد دیتے تھے۔ لوگ ان کی نزاکت آواز کے اتنے شیدائی تھے کہ ان کی دشنام ''طبعِ حزیں'' پر گراں نہیں گزرتی تھی۔ اس افتادِ طبع کا آدمی قصیدہ گوئی پر بھی آمادہ ہوگیا۔ صرف نظام حیدرآباد اور بیگم بھوپال کے ہی قصیدے نہیں لکھے بلکہ کشمیر کے سابق حکمران مہاراجہ ہری سنگھ کا قصیدہ بھی لکھا'' (صفحہ ۴۴۔۴۵ جستہ جستہ)

لاہور کی نمایاں شخصیتوں میں سرعبدالقادر کا تذکرہ کئی لحاظ سے معنیٰ خیز ہے۔ ''سرعبدالقادر ریٹائر ہو کر لاہور میں فروکش تھے۔۔۔ ریاض قادر سے مراسم بڑھے تو۔۔۔ شام کو کبھی کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگا۔ یہ ملاقاتیں میرے لئے بڑی ہی بصیرت افروز ثابت ہوئیں اور تاریخ ادب کے ایسے گوشے ظاہر ہوئے جو بصورت دیگر میری نگاہوں سے ہمیشہ مخفی رہتے۔ ایک ملاقات میں انہوں نے ڈاکٹر اقبال کی زندگی اور ان کی شاعری کے پس منظر پر روشنی ڈالی اور ایسے کئی نکات بیان فرمائے جو شارحین اقبال کی نگاہوں سے اس وقت بھی مخفی تھے اور اب بھی مخفی ہیں۔ اقوام متحدہ کے متعلق (راقم الحروف عرض کرتا ہے اس زمانہ میں ''اقوام متحدہ'' کا وجود نہیں تھا البتہ لیگ آف نیشنز کے نام سے ایک عالمی ادارہ ضرور موجود تھا۔ گوپال متل کا اشارہ غالباً لیگ آف نیشنز کی جانب ہے) ان کا ایک فارسی قطعہ ہے جس کے آخری دو مصرعے ہیں:

من ازیں بیش نہ دانم کہ کفن دزدے چند
بہرِ تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

اس پر شارحینِ اقبال نے استدلال کی ایک عمارت کھڑی کر لی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس انجمن میں ہندوستانی نمائندہ نامزد ہونے کے لئے اقبال نے بڑی ہی کوشش کی تھی مگر قرعۂ فال ان کی

بجائے سرعبدالقادر کے نام نکلا تو انہیں اس پر کفن چوروں کی انجمن کا گمان گذرنے لگا'' (صفحہ ۱۱۰)

ادبی شخصیتوں میں مولانا صلاح الدین احمد: ''وہ بحث میں شاذونادر ہی حصہ لیتے تھے صرف زیرلب مسکرادیتے تھے جیسے کوئی بزرگ نادان بچوں کی حرکتوں پر مسکرادیتا ہے'' (صفحہ ۱۰۴)۔ عاشق حسین بٹالوی سیاست میں ہنگامہ آرا بھی ہوئے اور رسوا بھی ہوئے۔۔۔حقیقی دلچسپی انہیں ادب سے تھی ۔۔۔روپے پیسے کے معاملے میں بے نیاز تھے'' (صفحہ ایضاً)

سیاسی جماعتوں میں احرار کا ذکر ۱۹۴۵ء کے انتخابات کے سلسلہ میں ہے۔''احراریوں کی اپنی حرکات انہیں ڈبونے کو کافی تھیں لیکن تھوڑی بہت جوکسر تھی وہ ہندو اخبارات کی تائید نے پوری کردی ۔۔۔انتخابات میں احراری نمائندوں کا جو حشر ہونا تھا وہ ہؤا لیکن ایک احراری ایسا تھا جو لینے تو آگ گیا تھا لیکن مل گئی پیغمبری۔ یہ شخص جو عرف عام میں زیرا کہلاتا تھا اور جس کا اصلی نام وزیر محمد تھا ایک خود ساختہ انجمن کا صدر تھا جس کا نام ''انجمن اصلاحِ چارسو بیساں'' تھا۔ لاہور کی شہری سیٹ سے اس نے بھی تفریحاً اپنے کاغذات نامزدگی داخل کردئے۔ اب کرنا خدا کا یہ ہؤا کہ اس سیٹ سے مسلم لیگ کے سرکاری امیدوار کے کاغذات نامزدگی نامنظور ہوگئے اور کسی ثانوی امیدوار نے اپنے کاغذات داخل نہیں کئے تھے سیٹ ہاتھ سے نکلتے دیکھی تو مسلم لیگیوں نے اسی زیرے کی طرف رجوع کیا اور اس برملا نعرے کے ساتھ کہ کبھی کھوٹا سکہ بھی کام آجاتا ہے۔ زیرے کو یہ بات سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ چارسو بیسیوں کی اصلاح تو بعد میں بھی ہوسکتی ہے اس وقت اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر اپنی حالت کو بہتر بنانا چاہئے۔ چنانچہ زیرہ کا عرف ختم ہؤا اور یہ صاحب معزز وزیر محمد بن کر مسلم لیگ کے امیدوار ہوگئے اور انتخاب میں معقول اکثریت سے جیتے بھی'' (صفحہ ۱۱۲)۔ احرار کی موقع پرستی کی یہ تاریخ مسلم لیگ کے دور جدید (یعنی دورِ نواز مسلم لیگ) میں بھی دہرائی گئی اور ایک وزیرا پاکستان کے صدر کی معزز ترین کرسی پر براجمان رہ چکا ہے۔ نیرنگیء سیاست دوراں تو دیکھئے۔ منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے۔

◎

آپ بیتی

''آپ بیتی'' نام کی تیسری خودنوشت مولانا عبدالماجد دریابادی کی ہے جو ۱۹۶۷ء میں لکھی گئی مگر ان کی وفات کے بعد سید ابوالحسن ندوی کے دیباچہ کے ساتھ شائع ہوئی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی بیسویں صدی میں اردو کے صاحبِ طرز انشاپرداز اور فلسفی تھے۔ ان کے شذرات جو ان کے اخباروں صدق یا صدقِ جدید یا سچ میں سچی باتیں کے عنوان سے شائع ہوتے رہے لکھنے والے کی سچائی' بے خوفی اور بے لوثی کی وجہ سے بہت مقبول جانے گئے اور سب حلقوں میں وقیع سمجھے گئے۔ مضطر عارفی کے شعر میں پوشیدہ تلمیح کو شاید ہمارے ہاں کے بہت کم لوگ سمجھیں گے کہ:

سچی باتوں سے ناحق بدنام ہؤا
عشق بھی عبد الماجد دریابادی ہے

عبدالماجد دریابادی اس کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں ''عزیزوں دوستوں اور مخلصوں کی ایک چھوٹی سی جماعت کا اصرار ہے کہ ۷۴' ۷۵ سال کی عمر کا ایک پیر نابالغ اپنی آپ بیتی دوسروں کو سنائے اور نادانیوں اور سفاہتوں کی لمبی سرگزشت دنیا کے سامنے اپنی زبان سے دہرائے۔۔۔ اللہ جانے انسان کو انسان کی پستیوں رسوائیوں فضیحتوں کی داستان سننے میں کیا مزا آتا ہے؟۔۔۔ ہم ایسوں کے لئے یہی بہت ہے کہ قلم کا دامن کذبِ صریح سے آلودہ نہ ہونے پائے'' (صفحہ ۱۲) اور مولانا نے آپ بیتی میں سب کچھ کھول کر بیان کردیا ہے۔ نکاحِ اول کی شوق سامانی سے لے کر نکاحِ ثانی کی نادانی تک سب کہہ گئے ہیں۔

عبدالماجد دریابادی کی شخصیت بڑی پہلودار تھی ادیب' صحافی' فلسفی' مفسر قرآن' عالم غرض کیا کیا۔ آپ نے لکھنؤ اور اودھ کی ثقافت اور تہذیب کا ذکر بڑی خوبی سے کیا ہے اگرچہ اپنے والد محترم کے بڑے عہدیدار ہونے کا ذکر درمیان میں لائے ہیں مگر صاف لکھ دیا ہے کہ: ''ہم میاں لوگوں کے

لئے اپنے ہاتھ سے کام کرنا سوعیبوں کا ایک عیب اور سوذلتوں کی ایک ذلت تھی۔ تجارت دکانداری کاشت کاری سب میں ہماری سبکی اور توہین۔ سارا سہارا زمینداری کے بعد بس ملازمت کا رہ گیا تھا یا پھر وکالت یا طبابت۔ باقی اکلِ حلال کے سارے راستے بند۔ خدمتی پیشے والے (نائی منہار کنجڑے قصائی وغیرہ) سب پر جا کہلاتے تھے ان کی نہ کوئی عزت تھی نہ ان کی عورتوں کی کوئی عصمت۔ ان سب کے مقابلے میں ہم میاں لوگ فرعونِ بے سامان بنے ہوئے۔ مجال نہیں کہ میاں لوگ بیٹھکے میں بیٹھے ہوں تو کوئی نیچ قوم کا لڑکا یا جوان ان کے سامنے سائیکل پر سوار گذر سکے'' (صفحہ ۲۴) اس صورت حال کی تفصیل تو جوش صاحب کی یادوں کی بارات میں موجود ہے مگر ان دونوں بلند پایہ مصنفین کا ردعمل اس صورت حال کے باب میں بالکل مختلف ہے جوش کے ہاں فخر و مباہات کا اور مولانا کے ہاں شرمندگی اور ندامت کا۔ آپ نے اپنے ادنیٰ ملازمین پر جو ستم ڈھائے ان کا ذکر بڑے تاسف سے کیا اور اپنے اس عمل کو سفاہت اور نادانی قرار دیا حالانکہ انہی کے ایک ہموطن نے ایسی ہی ظالمانہ باتوں کو اترا اترا کر بیان کیا ہے۔ ببیں تفاوت رااز کجاست تا بکجا۔

مولانا کی یہ خودنوشت اس لحاظ سے بھی منفرد ہے کہ اس میں مولانا نے اپنی ذہنی زندگی کو سوچوں کو مذہبی تشکیک اور دوسروں سے اپنے مجادلوں کو ہرگز چھپانے یا انہیں روا ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ بعض اوقات معذرت خواہانہ انداز میں اپنی نادانیوں اور بے راہ رویوں کا تذکرہ کیا ہے۔ بہرطور مصنف نے اپنا انجام بخیر ہونے کی دعا بھی کی اور پوری پوری کوشش بھی کی ہے۔ یہ خودنوشت پڑھنے کے بعد ایسے شخص کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے جو مدت العمر برسر پیکار ہی رہا پہلے اپنے آبائی دین سے پھر الحاد اور فکرِ الحاد سے۔ مجموعی تاثر ایک خدا خوف، خداترس اور حق پرست اور حق آشنا کا ابھرتا ہے اور غالباً یہی ان کا منتہائے مقصود تھا۔

سرگزشت

سرگزشت کے عنوان سے دو خودنوشتیں چھپیں۔ عبدالمجید سالک کی اور ذوالفقار علی بخاری کی۔ زمانہ کے لحاظ سے سالک صاحب کی سرگزشت ۱۹۵۴ء میں چھپی اس لئے ذوالفقار علی بخاری نے یہ عنوان سالک صاحب سے مستعار لیا ہے۔ سالک صاحب کی سرگزشت قسط وار امروز میں شائع ہو کر کتابی صورت میں مرتب ہوئی۔ ذوالفقار علی بخاری کی سرگزشت کراچی کے اخبار حریت میں ۱۹۶۲ء میں قسط وار چھپی اور پھر مرتب ہوئی۔ عبدالمجید سالک اپنے زمانے کے نمایاں صحافی تھے۔ ''راہ و رسمِ منزلہا'' کے نام سے ان کا مجموعہ کلام بھی چھپ چکا ہے۔ مگر سالک صاحب کی پہچان ان کے ''افکار'' تھے۔ آپ نے اپنی صحافتی زندگی پھول اور تہذیبِ نسواں سے مولوی ممتاز علی صاحب کے زیر سایہ شروع کی پھر زمیندار میں ظفر علی خان کے ساتھ کام کیا۔ ظفر علی خان سے نہ نبھ سکی تو اپنا اخبار ''انقلاب'' نکال لیا۔ انقلاب پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کا ترجمان سمجھا جاتا تھا اور اقبال اور سر فیروز خان نون اس کے سرپرست گنے جاتے تھے۔ اس لئے ظفر علی خان نے بڑے معرکہ کی پھبتی کہی: ''مجموعہ انقلاب ہے اقبال و نون کا''

سالک صاحب کی سرگزشت چراغ حسن حسرت کے دیباچہ کے ساتھ پہلی بار ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی۔ حسرت نے دیباچہ میں لکھا ہے: ''بعض لوگوں نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں انا و لاغیری کا نغمہ اس زور سے الاپا ہے کہ جس زمانہ کا حال وہ بیان کرتے ہیں اس پر بظاہر چھائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ سالک صاحب کے ہاں نہ تو یہ کیفیت ہے کہ انہوں نے جن محفلوں اور صحبتوں کے نقشے کھینچے ہیں ان میں وہی صدر نشیں نظر آئیں نہ انہوں نے اتنا انکسار برتا ہے کہ ایک کونے میں دبکے بیٹھے رہیں اور کہیں دکھائی ہی نہ دیں۔ وہ انشا پردازی کی رسم و راہ سے آگاہ ہیں اور سوانح نگاری کے آداب سے پوری طرح باخبر اس لئے اعتدال سے قدم باہر نہیں رکھتے اور ہر موقع پر انہیں حفظِ مراتب کا

خیال رہتا ہے'' (صفحہ ۱۱) چراغ حسن حسرت ہی اس خودنوشت کے لکھنے کے محرک ہوئے تھے۔ اس دور کی صحافت اور سیاست کی باریک در باریک کیفیتیں سالک صاحب نے بڑی چابک دستی سے اپنی گرفت میں لی ہیں کہ یہ سرگزشت اس دور کی صحافت اور اس دور کے شرفا کی معاشرت کی تاریخ بن گئی ہے حالانکہ یہ تاریخ نہیں خودنوشت ہے۔ جس طرح سر رضا علی، میر ولایت حسین رشید احمد صدیقی آل احمد سرور اور خواجہ غلام السیدین کی خودنوشتیں علیگڑھ کالج اور یونیورسٹی کی مستند تاریخیں ہیں مگر ان کے لکھنے والے مؤرخ نہیں۔

سالک صاحب نے اقبال اور احباب اقبال کے تذکرے بڑے مزے لے لے کر کئے ہیں۔ اگرچہ ان کی کتاب ذکر اقبال آچکی ہے اور اقبال کی وقیع سوانح حیات گنی جاتی ہے مگر سرگزشت میں جو اقبال سامنے آتا ہے وہ اپنی جگہ اہم ہے۔ اقبال کے کہے کو ہی سالک صاحب نے اپنی سرگزشت کی بنیاد بنایا ہے:

قوم روشن از سوادِ سرگزشت
خود شناس آمدزیادِ سرگزشت
سرگزشت اوچوں از یادش رود
باز اندر نیستی می گم شود
ضبط کن تاریخ را پائندہ شو
از نفس ہائے رمیدہ زندہ شو

یہ سرگزشت نفس ہائے رمیدہ کی داستان ہے۔ جس میں اجمال بھی ہے تفصیل بھی ہے۔ رجال کا حصہ اہم ہے کیونکہ سالک صاحب نے انہیں رجال کا سہارا لے کر اپنی سرگزشت کہی ہے۔ پھر اس میں حکیم الامت جیسے رجال شامل ہیں کہیں مولانا گرامی کی بدحواسیاں ہیں کہیں حکیم الامت اور حکیم فقیر محمد چشتی کی بذلہ سنجیاں ہیں۔ کہیں ''خمیرہ گاؤزبان بہ ورقِ نقرہ پیچیدہ'' جیسی پھبتیاں ہیں کہیں سیاسی معرکہ آرائیاں ہیں اور کہیں ''بزمِ ارائیاں''۔ عبدالمجید سالک نے بہت سوں کو اس راہ پر ڈالا ذوالفقار علی بخاری نے تو اپنے دوست سے نام تک مستعار لے لیا۔

سرگزشت سالک صاحب کے اندازِ بیان کا نادر نمونہ ہے وہ خواجہ حسن نظامی کے لفظوں میں

نکا ہے لکھتے ہی نہیں بولتے بھی ہیں اور یہ انداز بیان کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ مزاح کی چاشنی، فقروں کی برجستگی پڑھنے والے کو مزا دے جاتی ہے۔ برمحل پھبتی کہنا بڑا جانکاہی کا کام ہے اور سالک صاحب کے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ چراغ حسن حسرت کے رنگ کی طرح سالک صاحب کا رنگ بھی ان کے ساتھ دفن ہوگیا۔ اب انہیں ڈھونڈھ چراغِ رخِ زیبا لے کر۔ سالک صاحب کے ہاں میں رجال کی اہمیت پر میں اس لئے بھی زور دے رہا ہوں کہ انہیں ان رجال کو برتنا آتا تھا۔ ہر شخصیت ان کے قلم سے چھن کر آتی ہے۔ اقبال جیسے رجل کے موجود ہونے کے باوجود مصنف کی مرکزی حیثیت متاثر نہیں ہوتی۔ اس سے سالک صاحب کی ثقاہت کا ثبوت بھی ملتا ہے مزاح ضرور موجود ہے مگر پھکڑ مفقود۔ اس روایت کا پرتو بہت بعد میں حمید نسیم کے ہاں نظر آیا۔

◎

رو میں ہے رخشِ عمر

سالک صاحب کے صاحبزادے عبدالسلام خورشید کی خودنوشت ''رو میں ہے رخشِ عمر'' کے نام سے چھپی مگر نہایت پھسپھسی اور بے رنگ خودنوشت ہے لگتا ہے خورشید صاحب نے اپنی صحافت کی تعلیم کے سلسلہ میں جو مواد اکٹھا کیا تھا اسے اپنی خودنوشت کا نام دے دیا ہے۔ یہ ایک بہت بڑے باپ کے بیٹے کی بہت چھوٹی خودنوشت ہے۔ سالک صاحب کے احباب میں سے احمد شجاع نے ''خوں بہا'' کے نام سے اپنی خودنوشت لکھی مگر اس میں رجال والے حصہ کی ذراسی دلفریبی کا سامان ہے باقی غیرضروری تفصیلات۔

نا قابل فراموش

صحافیوں میں ہی ریاست کے ایڈیٹر دیوان سنگھ مفتون نے جو راجوں مہاراجوں کے خلاف جنگ لڑنے میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے اپنے اخبار ریاست میں نا قابلِ فراموش کے عنوان سے اپنی زندگی کے بعض واقعات لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ بعد کو یہی سلسلہ نا قابلِ فراموش کے عنوان سے اور کچھ حصہ ''سیف وقلم'' کے عنوان سے چھپا۔ نا قابل فراموش میں دیوان سنگھ مفتون کی زندگی کے واقعات مرتب ہو گئے ہیں اور یہ سلسلہ سوانح عمری جیسا سلسلہ بن گیا ہے مگر ہم اسے باقاعدہ خودنوشت سوانح عمری قرار نہیں دے سکتے۔ ان کی نیت خودنوشت سوانح عمری لکھنے کی نہیں تھی **انما الاعمال بالنیات**.

نا قابل فراموش سردار دیوان سنگھ مفتون کی زندگی کے بعض واقعات کا بیان ہے جو خود ان کے قلم سے بیان ہوئے ہیں اور بس۔ سردار دیوان سنگھ مفتون نے اس امر کو اپنی زندگی کا مقصدِ وحید قرار دے لیا تھا کہ وہ ہندوستان کی دیسی ریاستوں کے راجوں مہاراجوں کی الف لیلوی زندگی اور ان کی حرامکاریوں کو طشت از بام کرتے رہیں گے۔ مفتون صاحب نے اس مقصد میں بہت کامیابی حاصل کی کیونکہ ان کا دل مخلص اور مقصد نیک تھا برطانوی حکومت بھی اپنی تمام تر قوت کے باوجود ان کے قلم کو نہ روک سکی۔ ریاست اخبار ریاستی درباروں میں کھلبلی مچاتا رہا۔ مفتون کے اس سلسلہ میں بھی واقعات کے ساتھ ساتھ رجال در آئے ہیں لیکن انہوں نے انہیں حاوی نہیں ہونے دیا۔

بوئے گل نالہ دل

شورش کاشمیری بھی سیاسی صحافتی طبقہ کے فرد تھے۔ ان کی خودنوشت ''بوئے گل نالہء دل دودِ چراغِ محفل'' ان کے متلون مزاج اور سیاسی افکار کی حامل ہے۔ شورش نوعمری ہی میں پس دیوار زنداں رہنے کی زندگی کے عادی ہوگئے تھے اور اس سلسلہ میں پولیس کے ان تمام مظالم کا نشانہ بنے جن کا نشانہ کچی عمر کے نوخیز لڑکے بنتے ہیں یا ان کا دوست اوم پرکاش بنا جو ''سولہ برس کا خوب صورت کھلونا تھا اس کا ملیح رنگ ہردوار کی گمشدہ سروں سے تیار ہوا تھا۔ ویدوں کے زمانہ کا ایک گیت تھا جس کو صدیوں کی روایتوں نے اس کے پیکر میں ڈھال دیا تھا'' (صفحہ ۳۴) اسی حوالہ سے ان کی کتاب ''پسِ دیوارِ زنداں'' بھی خاصے کی چیز بن گئی ہے اور اس کا حوالہ بار بار اس سرگزشت میں بھی آیا ہے۔ ان کی شخصیت بے لچک اور اکھڑ بن کر ابھرتی ہے اور یہی ان کی شخصیت کے صحیح خدوخال تھے کیونکہ جو بچہ نوعمری میں جنسی جبر کا نشانہ بنتا رہے اس کی شخصیت ایسی ہی بن کر ابھرتی ہے۔ شورش نے اپنے خدوخال چھپانے یا ان پر غازہ لگانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اول و آخر کانگریسی اور احراری تھے اور رہے اور اس پر انہیں کوئی ندامت نہیں۔ انہوں نے غربت میں آنکھ کھولی اور ترقی کرتے ہوئے قلعہ گوجر سنگھ سے مال روڈ تک پہنچے۔ شیخوپورہ میں مربعوں کے مالک بھی بنے۔ فاران والے مولانا ماہرالقادری نے بھٹو صاحب کے زمانہ میں ان کی شعلہ مزاجی کے ٹھنڈا پڑ جانے کی وجوہات بیان کی ہیں وہ اپنی جگہ اہم اور قائم ہیں۔ مولانا کوثر نیازی نے بھی ان کے ساتھ اپنی لپاڈگی اور پھر دوستی کا ذکر اپنے خالص ''شہابی'' رنگ میں کیا ہے۔

میں رجال کے سلسلہ میں بات کہتا ہوا دور نکل گیا۔ خواجہ غلام السیدین نے بھی اپنے احباب کی ایک فہرست مرتب کر رکھی تھی مگر موت نے انہیں رجال والا حصہ لکھنے کی مہلت نہیں دی۔ صالحہ عابد حسین نے وہ فہرست ''مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں'' کے ساتھ شامل کر دی ہے۔ خواجہ صاحب کس انداز میں اپنے احباب کا ذکر کرتے؟ اتنا یقین ہے افراط وتفریط کا شکار نہ ہوتے۔ وزیر آغا نے رجال کے حصہ

میں چند بے تکلف دوستوں کے سوا باقی رجال کو صرف تصویروں تک محدود کر دیا ہے ان رجال میں بیشتر پڑھے لکھے اور ادبی لحاظ سے وقیع لوگ شامل ہیں۔ پروفیسر آل احمد سرور نے رجال کا ذکر ایک حد تک کیا ہے مگر کہیں حد سے آگے نہیں بڑھے۔ اصل بات یہ ہے کہ کسی سرگزشت میں رجال کی موجودگی تو ضروری ہے مگر ان کی کانٹ چھانٹ اس سے بھی زیادہ ضروری ہے جس طرح ہر دوست ہر وقت آپ کی محفل میں بار پانے کا مستحق نہیں ہوتا اسی طرح ہر دوست آپ کی خودنوشت میں بیان کئے جانے کا استحقاق بھی نہیں رکھتا۔ سالک صاحب اس نکتہ سے بخوبی آشنا تھے اسی وجہ سے ان کی سرگزشت متوازن اور ثقہ سرگزشت ہے۔

سرگزشت

ذوالفقار علی بخاری کی سرگزشت کا دیباچہ آغا عبدالحمید نے لکھا اور اس میں آلڈس ہکسلے کا قول درج کیا ہے ''سچ جھوٹ کے پرکھنے کا معیار لکھنے والے کی اہلیت اور قوت اظہار کی قابلیت سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ سچ معلوم ہوتا ہے تو وہ سچ ہے'' (صفحہ۱۴)۔ ہمارے ہاں جو خودنوشت سوانح عمریاں لکھی گئیں ہیں ان کو پرکھنے کا آغا صاحب نے خوب معیار مہیا کیا ہے۔ اختر الایمان نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ میں اپنی جوانی کے واقعات بیان نہیں کروں گا کیونکہ وہ سچ بھی ہوں گے تو لوگوں کو جھوٹ معلوم ہوں گے اور شہاب صاحب نے اپنے افسانوں کو بھی اس چابکدستی سے پیراہنِ بیان سے آراستہ کیا ہے کہ لوگ انہیں سچ جاننے لگے۔ اور جوش صاحب نے اپنی زبان کے زور پر پوری تاریخ مرتب کر ڈالی۔ عالم تمام حلقہءِ دامِ خیال ہے۔

''سرگزشت'' والے ذوالفقار علی بخاری کے والد قبلہ سید محمد اسد بخاری باقاعدہ صاحبِ سلسلہ بزرگ تھے۔ بخاری صاحب لکھتے ہیں: ''ہم دونوں بھائیوں نے اپنے اندر بیعت لینے کی صلاحیت نہ پائی تو یہ سلسلہ ترک کر دیا۔ عبدالمجید سالک صاحب نے اپنی سرگزشت میں ذکر کیا ہے کہ ''وانا (آزاد علاقہ) میں چیف کمشنر کے ساتھ ایک صاحب سید محمد رفعت شاہ بخاری بھی آئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ہمارے احمد شاہ بخاری پطرس کے بڑے بھائی تھے آخر عمر میں چند سال عوارضِ دماغی میں مبتلا رہے) اس خاندان کا سب سے پہلا فرد جو مجھ سے متعارف ہوا وہ رفعت صاحب تھے'' (سرگزشت صفحہ۳۱) ۔پطرس اور ذوالفقار علی بخاری دونوں آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ رہے پہلے پطرس بخاری ریڈیو میں گئے پھر ذوالفقار صاحب کا چناؤ ہوا مگر انہوں نے وضاحت کر دی ہے کہ ''بھائی صاحب چناؤ کرنے والے بورڈ میں حکومت پنجاب کے نمائندہ کے طور پر شریک ہونے دہلی گئے تھے جب معلوم ہوا چھوٹا بھائی انٹرویو دے رہا ہے تو بورڈ میں شرکت سے انکار کر دیا'' (صفحہ۲۹) چھوٹے بخاری ڈائریکٹر آف

پروگرامز منتخب ہوئے۔ ''بڑے بخاری صاحب کو فیلڈن نے ڈپٹی کنٹرولر مقرر کیا تھا اس پر بہت ہنگامہ ہوا۔ وقتی طور پر انہیں دہلی سٹیشن کا ڈائریکٹر بنا دیا گیا رفتہ رفتہ وہ ڈپٹی کنٹرولر پھر کنٹرولر بنے (صفحہ۴۱) دونوں بھائیوں کا ایک ہی محکمہ میں ہونا ہمارے ملک میں بڑے اچنبھے کی بات تھی۔ دیوان سنگھ مفتون نے ''آل انڈیا ریڈیو پر بی بی سی یعنی بخاری برادران کارپوریشن کی پھبتی کہی'' (صفحہ۴۲)۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ دونوں بھائی بہت ذہین فطین اور اپنے کام کے ماہر تھے مگر خلقِ خدا کی زبان کس نے پکڑی ہے؟

بخاری برادران کی یہ وضع بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ''بڑے بھائی چھوٹے بھائی پر ہاتھ بھی چھوڑ بیٹھتے تھے'' (صفحہ۵۰) چھوٹے بخاری صاحب بڑے بھائی کے لئے ہمیشہ بھائی صاحب کا لقب استعمال کرتے تھے اور اس وضع میں آخر تک کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ مگر سالک صاحب نے یارانِ کہن میں ایک دلچسپ بات لکھی ہے کہ پطرس کے ہاں بیٹھک تھی۔ چھوٹا بھائی مہمانوں کی خاطر داری اور تواضع میں مصروف تھا اور بڑے بھائی اس پر تحدی کے ساتھ حکم چلا رہے تھے یہ کرو وہ نہ کرو۔ یہ لاؤ وہ نہ لاؤ۔ چھوٹے بخاری نے زچ ہو کر سالک صاحب سے کہا ''فارسی والوں نے کیا خوب بات کہہ رکھی ہے سگ باش برادرِ خورد مباش''۔ پطرس نے بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا ''سالک صاحب اب یوں کہا جاتا ہے سگ باش برادرِ سگ مباش''۔

ذوالفقار بخاری صاحب نے سرگزشت کے شروع ہی میں کہہ دیا ہے کہ میں ''طرفہ بزدل قسم کا انسان ہوں خدا سے ڈروں نہ ڈروں خدا کے بندوں سے ضرور ڈرتا ہوں'' (صفحہ۴۸) اس لئے چھوٹے بخاری صاحب نے کئی جگہ ''بندہ خوفی'' کا مظاہرہ کیا ہے اور خوفِ فسادِ خلق سے کئی مقامات پر جہاں انہیں بولنا چاہئے تھا وہاں چپ رہنے کو ترجیح دی ہے۔ اگرچہ وزیر اطلاعات کے سامنے کہ وہ صاحبِ ذوق بزرگ تھے بعض اوقات شوخی بھی کر جاتے تھے۔ ایک مولانا نے وزیر صاحب سے شکایت کی کہ انہیں ریڈیو والے اسی موٹر میں بٹھا دیتے ہیں جس میں گانے بجانے والوں کو بٹھایا جاتا ہے اس لئے ان کی توہین ہوتی ہے۔ ہوا صرف یہ تھا کہ ایک بار ریڈیو کی گاڑی مولانا کو چھوڑنے جا رہی تھی اسی وقت استاد بندو خان بھی فارغ ہو کر واپس جا رہے تھے۔ بخاری صاحب نے انہیں بھی اسی موٹر میں بٹھا دیا

تھا۔ بس مولانا کے تلوے سے جو لگی تالو سے نکل گئی۔ وزیر سے جا شکایت کی۔ وزیر نے بخاری صاحب سے پوچھا۔ بخاری صاحب نے کہا سر میں معافی مانگ لوں گا۔ وزیر نے مولانا کی تشفی کروادی کہ ریڈیو والے معافی مانگ لیں گے۔ جب بہت دنوں تک معافی کی کوئی صورت مولانا نے نہ دیکھی تو دوبارہ وہی فریاد کی۔ وزیر نے بخاری صاحب سے کہا ''آپ نے تو معافی مانگنے کا وعدہ کیا تھا اس کا کیا ہؤا؟'' بخاری صاحب نے مسمسے منہ سے کہا'' سر میں اس قصور پر استاد بندو خان سے معافی مانگ چکا ہوں''۔ وزیر صاحب کی شکل دیکھنے والی تھی مگر تھے صاحبِ ذوق۔ تحمل سے بات کو پی گئے۔ یہ وزیر خواجہ شہاب الدین تھے۔ ریڈیو کے ڈائیریکٹر جنرل فیلڈن سے تو ان کی خوب گھٹتی تھی۔ اس کا آغاز ان کے انٹرویو کے دن سے ہی ہوگیا تھا۔ یہ شملہ سے دہلی پہنچے اور سیدھے ریڈیو سٹیشن گئے۔ شملہ میں انگریزی گرم سوٹ ڈانٹ رکھا تھا اسی میں دہلی آ گئے یہاں دہلی میں آگ برس رہی تھی' فیلڈن صاحب ڈائریکٹر جنرل ایک بنیان پہنے ہوائی چپلی ڈانٹے کھڑے تھے۔ بخاری صاحب کے ہاتھ میں کسی راجہ مہاراجہ کے دئے ہوئے دو پالتو کتوں کی زنجیر تھی۔ اس نے جو کتوں والے صاحب کو سوٹ بوٹ میں ملبوس دیکھا تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ پہلے تو اس نے سوٹ بوٹ پر خوب ملاحیاں انہیں سنائیں۔ پھر کہنے لگا اور مستزاد یہ کہ تم اپنے ساتھ یہ کتے کیوں لئے پھرتے ہو؟ بخاری صاحب نے تحمل سے جواب دیا'' محض اس لئے کہ یہ میرے سوٹ بوٹ پر اعتراض نہیں کرتے''۔ بس فیلڈن ان کا گرویدہ ہوگیا۔ اس نے بھی وفا کی بخاری صاحب نے اس سے بڑھ کر وفا کی اور جب تک دونوں اس محکمہ میں اکٹھے رہے دونوں یک جان دو قالب بن کر رہے۔ فیلڈن وائسرائے لارڈ لنلتھگو کے عزیزوں میں سے تھا۔ اور انگلستان کی نوبیلیٹی میں سے ہونے کی وجہ سے بڑا بارسوخ تھا۔

ذوالفقار بخاری بمبئی ریڈیو کے سٹیشن ڈائیریکٹر تھے۔ ایک مرتبہ ان کے گھر دو مہمان تھے ایک استاد بندو خان اور دوسرے مرزا یگانہ۔ ملاقات ہوئی تو استاد بندو خان نے سے پوچھا'' یہ سارا سارا دن آپ کمرے میں بیٹھ کر کیا کیا کرتے ہیں؟''۔ مرزا نے جواب دیا شعر کہتا ہوں۔ بندو خان نے پوچھا دن میں کتنے شعر کہہ لیتے ہو؟ فرمایا'' کبھی کبھی ایک شعر کہنے میں کئی ہفتے گذر جاتے ہیں۔'' بندو خان بولے'' ریاض کی کمی معلوم ہوتی ہے''۔ (صفحہ ۲۳۸)

یہ سرگزشت اپنے مواد کے اعتبار سے بہت دلچسپ ہے بخاری صاحب کا انداز بیان ہو اور ریڈیو کی باتیں ہوں تو وہ کہیں اور سنا کرے کوئی کا مضمون ہوتا ہے۔ ایک آدھ جگہ بخاری صاحب کی یاد داشت نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ ایڈورڈ ہشتم کی تخت سے دست برداری کی روداد اور آخری براڈ کاسٹ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں'' سرجان ریتھ کی آواز آئی۔ یہ ونڈسر کاسل ہے ہز رائیل ہائی نس ڈیوک آف ونڈسر''۔ چلئے بادشاہ کا نام بدل کر ڈیوک آف ونڈسر ہوگیا'' (صفحہ ۸۶)۔ مگر حقیقت یہ ہے انہیں تسامح ہؤا۔ سرجان نے ہز رائیل ہائی نس ڈیوک آف ونڈسر نہیں کہا تھا'' ہز رائیل ہائی نس پرنس ایڈورڈ'' کہا تھا ڈیوک آف ونڈسر تو وہ دوسرے دن بنے (کنگز سٹوری پہلا ایڈیشن صفحہ ۴۱۱)۔ ''کنگز سٹوری'' ڈیوک آف ونڈسر کی خودنوشت سوانح عمری ہے۔

ذوالفقار علی بخاری کی سرگزشت اپنی سادگی و پرکاری کی وجہ سے اردو کی چند یادگار خودنوشتوں میں شمار کی جائے گی۔

◎

یادوں کی دنیا

یوسف حسین خان نے اپنی سرگزشت کا نام ''یادوں کی دنیا'' رکھا ہے۔ یہ ۱۹۶۷ء میں چھپی اس میں ایک باب تو ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب (سابق صدر جمہوریۂ ہند) کے ذکر و احوال پر مشتمل ہے جنہیں مصنف نے بجا طور پر فخرِ خاندان کہا ہے۔ اس خودنوشت کا اسلوب سیدھا سادہ استادوں والا اسلوب ہے جیسے کلاس میں پڑھا رہے ہوں۔ ترتیب کے ساتھ حالات وواقعات و رجال کا ذکر موجود ہے۔ یوسف حسین خاں صاحب کی زندگی کا بیشتر حصہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں گذرا اس لئے ڈاکٹر صاحب حیدرآباد اور اہل حیدرآباد کا ذکر بڑے احترام سے کرتے ہیں۔ مگر ان کی تعلیم علیگڑھ اور جامعہ ملیہ میں ہوئی تھی اس لئے مادر درسگاہوں کے بارہ میں ان کے ہاں ایک خاص قسم کا خلوص جھلکتا ہے۔ جامعہ ملیہ کے قیام اور مولانا محمد علی، ذاکر حسین خاں، اور حکیم اجمل خاں کی مساعی اور مولانا محمودالحسن کے افتتاحی خطبہ کا ذکر ہمارے ہاں انہی کی خودنوشت سے محفوظ ہوا۔ مولانا محمودالحسن کا خطبہ مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھ کر سنایا تھا کیونکہ مولانا خود بہت کمزور تھے۔ جامعہ ملیہ کے قیام کا اعلان ایم اے او کالج کی مسجد میں ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو ہوا۔

مولانا نے خطبہ میں فرمایا ''جب میں نے دیکھا کہ میرے درد کے غم خوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا۔۔۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ جس قدر میں بظاہر علی گڑھ کی طرف آیا ہوں اس سے کہیں زیادہ علی گڑھ میری طرف آیا ہے۔۔۔'' پھر آپ نے جامعہ ملیہ کے قیام کا مقصد بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ''ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنے کالجوں میں بہت سستے غلام پیدا کرتے رہیں بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہئیں بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کے اور ان عظیم الشان مدارس کے جنہوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا''

(صفحہ ۷۹) یوسف حسین خان صاحب کی خودنوشت جامعہ ملیہ کی اسی طرح کی مستند تاریخ ہے، جس طرح علیگڑھ کی تاریخیں علیگڑھ والوں کی خودنوشتیں ہیں۔

یوسف حسین خاں صاحب نے اس سرگزشت میں رجال کے حصہ میں بہت سی ادبی شخصیات پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور ان میں سے بعض کے ساتھ اختلاف کا اظہار بھی کیا ہے مگر کہیں ان کی تنقید تنقیص کے دائرہ میں داخل نہیں ہوئی۔ ہر شخص کا احترام ان کے پیشِ نظر رہا۔ علی حیدر نظم طباطبائی جو نظام کے خطاب یافتہ شاعر تھے اردو ادب کی تاریخ میں اپنی اس شہرہ آفاق نظم ''گورِ غریباں'' کی وجہ سے مشہور ہیں جو انگریز شاعر گرے کی نظم THE ELEGY کا اردو ترجمہ ہے۔ جس طرح گرے کی اس نظم کے علاوہ اور کوئی نظم مشہور نہیں ہوئی اسی طرح نظم طباطبائی صاحب کے اس ترجمہ کے علاوہ کوئی اور ترجمہ قبول عام حاصل نہیں کر سکا۔ یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے۔

عثمانیہ یونیورسٹی کی خدمات کا بھی بڑے متوازن انداز میں ذکر ہے۔ اس یونیورسٹی کے دار الترجمہ نے یونیورسٹی کی عموماً اور اردو کی خصوصاً بہت خدمات سرانجام دی ہیں۔ اس دارالترجمہ کے ساتھ بڑے بڑے ادیب اور شاعر وابستہ تھے جن میں مرزا محمد ہادی رسوا، عبدالماجد دریابادی، وحید الدین سلیم پانی پتی، مولانا عبداللہ عمادی، الیاس برنی، سید ہاشمی فرید آبادی، اور مولوی عبدالحق جیسے علما شامل تھے۔ ان لوگوں کے بارہ میں یوسف حسین خاں صاحب نے جچی تلی رائے دی ہے اور اپنے مقام اور مرتبہ سے اونچے لوگوں کا پورا احترام پیش نظر رکھا ہے کہ یہی ہمارے شرفا کا طریق تھا۔ جوش صاحب کے بارہ میں لکھا ہے ''جوش صاحب ناظر ادبی کی خدمت پر مامور تھے ان کا کام یہ تھا کہ ترجموں پر ادبی لحاظ سے ایک نظر ڈال لیں جو ترجمے وہ دیکھ چکے تھے ان میں سے بعض میرے پاس فنی نظر ثانی کے لئے آئے۔ میں نے دیکھا کہ جوش صاحب نے ان پر بڑی اچٹتی ہوئی نظر ڈالی تھی مجھے ان ترجموں کے اسقام پر بھی اپنی رائے دینی پڑی۔ بعض ترجموں میں چالیس پچاس صفحوں پر کہیں دو ایک جگہ جوش صاحب پنسل سے نشان لگا دیتے اور کبھی اپنی رائے بھی لکھ دیتے تھے۔ جہاں کہیں انہوں نے اپنی رائے لکھی تھی مجھے اس سے اتفاق تھا لیکن انہوں نے اپنا فرض جس محنت سے ادا کرنا چاہئے تھا نہیں ادا کیا۔ یہ شکایت میرے علاوہ دوسرے پروفیسروں کو بھی تھی'' (صفحہ ۲۴۷) جوش صاحب کے بارہ میں عام تاثر یہ ہے کہ وہ زبان و بیان کی غلطی برداشت نہیں کرتے حتیٰ کہ مولوی نذیر احمد کی زبان کی

اصلاح کر دینے سے بھی نہیں چوکتے۔ یوسف حسین خان صاحب جیسے بے لاگ رائے دینے والے ادیب کی یہ گواہی حیرت انگیز ہے۔ جوش صاحب نے اپنی خودنوشت میں وحیدالدین سلیم اور مولانا عبد اللہ عمادی کی کردار کشی کرنے سے بھی گریز نہیں کیا اگر کسی شخص نے صرف جوش صاحب کی کتاب پڑھی ہے تو وہ ان جید علما کے بارہ میں اچھی رائے قائم نہیں کرسکتا۔ جوش صاحب نے مولانا عبداللہ عمادی کو تو رنڈی کے کوٹھے پر ''گیارھویں شریف'' کے لئے مدعو کیا سو کیا اس آڑ میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی کردار کشی سے بھی نہیں چوکے کہ ''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس موقعہ پر ابوالخیر مودودی کے پیچھے ان کے چھوٹے بھائی ابوالاعلیٰ مودودی بھی تھے''۔ (یادوں کی برات صفحہ ۵۴۲)

اس خودنوشت میں عثمانیہ یونیورسٹی اور حیدرآباد کے جن اکابر کا ذکر ہے ان میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مسز سروجنی نائیڈو، شہزادی درشہوار۔ سر اکبر حیدری لیڈی اکبر حیدری، سالار جنگ سوم، مہدی نواز جنگ وغیرہم کا ذکر مختصر مگر اثر انگیز ہے۔ سقوطِ حیدرآباد کے بارہ میں بھی ان کی رائے بڑی وقعت رکھتی ہے۔ ان کے کہے کے مطابق: ''معاہدہ انتظام جاریہ کا جو مسودہ پہلے تیار ہؤا تھا اس کے متعلق محمد علی جناح سے مشورہ کرنے کے لئے نظام نے علی یاور جنگ اور عبدالرحیم کو کراچی بھیجا تھا۔ محمد علی جناح جو عملی سیاست کا وسیع تجربہ رکھتے تھے نے کہا کہ حیدرآباد کو ایک سال کے معاہدے کو قبول کر لینا چاہئے اور اس عرصہ میں غیر مسلموں کا زیادہ سے زیادہ تعاون اور اشتراک عمل حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اس معاہدہ پر دستخط ہونے سے پہلے لائق علی صدر اعظم مقرر ہو چکے تھے۔ وہ سیاست کی ابجد سے بھی واقف نہیں تھے۔ انہوں نے جو کونسل بنائی اس میں اونچے پائے کا کوئی شخص موجود نہ تھا جو سیاسی الجھنوں کو سلجھانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ خود صدر اعظم اور کونسل اتحادالمسلمین کے اشارے پر چلتی تھی ...۔ اتحادالمسلمین کی قیادت جس نے حقیقت سے آنکھیں بند کر لی تھیں بالآخر پوری ریاست کو لے ڈوبی'' (صفحہ ۳۰۴۔ ۳۰۵)۔ المختصر یوسف حسین خان صاحب کی یادوں کی دنیا مسلمانانِ ہند کی زندگی کے بعض گوشوں کی مستند تصویر کشی کرتی ہے۔ مصنف کا انداز بیان دلنشیں اور اسلوب استادانہ ہے ایک فلسفی اور مؤرخ ہونے کے باوصف مصنف نے اپنی خودنوشت میں فلسفہ نہیں بگھارا اسے خودنوشت کے فنی تقاضوں کے اندر محدود رکھا ہے۔

◎

گردراہ

''گردِراہ'' ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی خودنوشت ہے۔ اختر حسین رائے پوری اردو کے ایسے ادیب اور نقاد تھے جو سنسکرت اور ہندی کے بھی ودوان تھے اور ان زبانوں سے راست اردو میں ترجمہ کرسکتے تھے۔ انجمن ترقی اردو میں بابائے اردو کے ساتھ حیدرآباد میں کام کرنے کا موقعہ ملا اس کے بعد فرانس سے پی ایچ ڈی کرنے کے بعد درس وتدریس کا کام کرتے رہے۔ امرتسر کالج میں تاثیر کے ساتھ میل جول رہا۔ پھر ترقی پسند تحریک کے روح رواں بنے ''ادب اور انقلاب'' جیسا مضمون لکھنے کے بعد انہیں ادیب کے لحاظ سے بہت شہرت نصیب ہوئی اور ان کی باتوں پر کان دھرا جانے لگا۔ اختر حسین رائے پوری کی عمر قیامِ پاکستان کے ابتدائی برسوں کے سوا یونیسکو کی خدمت میں صرف ہوئی اور وہیں سے وظیفہ یاب ہوئے۔ پاکستان آتے ہی گمانِ غالب تھا کہ انہیں تعلیمات کا سربراہ بنایا جائے گا مگر کوئی سی ایس پی اس منصب پر فائز ہو گئے وہ انہیں طلب کرتے تو اپنے اردلی سے کہتے ''تعلیم والوں کو بلاؤ۔'' اس پر اختر حسین رائے پوری نے بڑے مزے کا شعر درج کیا ہے ''یوں پکارے ہیں مجھے کوچہءِ جاناں والے۔ ادھر آ بے او ابے چاک گریباں والے''۔ اختر حسین رائے پوری کے بارہ میں مجنوں گورکھپوری کا کہنا ہے کہ ''۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کا زمانہ برصغیر کی تاریخ میں صحیح معنوں میں نشاۃ ثانیہ کا دور تھا جس نے ہماری قومی فکر ونظر میں انقلاب برپا کر دیا اس دور نے ایسے ایسے مفکر اور مدبر پیدا کئے جنہوں نے ہم کو نئے موڑ اور زاویوں سے دیکھنا دکھانا سکھایا۔ انہیں میں ایک بہت اہم نام ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا ہے''۔ گردِراہ پچھلے ساٹھ برسوں کی ادبی تہذیبی سیاسی اور سماجی تاریخ کی زندہ دستاویز ہے''۔ فیض نے کہا ''اب کشاکشِ روزگار سے فراغت کے بعد آپ نے اپنی اس بھرپور زندگی کے تجربات اور مشاہدات کی یادداشتیں رقم کی ہیں''۔

گردراہ ایسے شخص کی خودنوشت ہے جس نے اردو ادب کی اپنے رنگ میں اس لحاظ سے بہت

خدمت کی کہ وہ نئی تحریکوں سے وابستہ رہا اور اردو زبان و ادب کو نت نئے خیالات سے آشنا کرتا رہا۔ اختر حسین رائے پوری کا قلم ادب اور زندگی لکھنے کے بعد اس طرح تو رواں نہیں رہا جس طرح ان سے توقع کی جاتی تھی مگر ادب ان کی پہلی محبت ضرور رہا۔ ترقی پسند ادب کو اردو میں مبسوط اور مدلل طریق سے روشناس کروانا ان ہی سے خاص ٹھہرا۔ اختر حسین رائے پوری اردو ہی کے نہیں ہندی کے بھی صاحبِ طرز ادیب تھے ان کی ادبی زندگی کی ابتدا ہندی میں کہانیاں لکھنے سے ہوئی پھر ہندی صحافت سے وابستہ رہے مگر اس دور کی ہندی صحافت پر ہندوؤں کا قبضہ تھا ۱۹۳۵ء کے حالات میں لکھتے ہیں ''میں نے علی گڑھ میں سنا کہ دہلی کے روزنامہ ہندوستان ٹائمز کو ایسے سب ایڈیٹر کی ضرورت ہے جو ہندی اردو پریس کا جائزہ روزانہ کالم میں پیش کر سکے میرے دو تین مضمون اس میں شائع ہو چکے تھے اور اس کے مینیجنگ ایڈیٹر دیوداس گاندھی (مہاتما گاندھی کے فرزند) مجھے جانتے تھے۔ جب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے میری عرضی انہیں دی تو وہ بہت خوش ہوئے اور کہا مجھ سے بہتر آدمی انہیں اس اسامی کے لئے نہیں ملے گا لیکن اخبار کے مالک سیٹھ برلا نے یہ کہہ کر مجھے مسترد کر دیا کسی مسلمان کی وابستگی انہیں پسند نہیں'' (صفحہ ٦٠) اس صورت حال سے اس دور کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ذہنی بعد کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اخبار کے مالک تک جنہیں رائے عامہ کا پیمانہ سمجھا جاتا ہے اس تعصب سے خالی نہیں تھے۔

وہ اردو ترقی پسند تحریک کے ہراول میں شمار ہوتے ہیں اور تحریک کے مقاصد کو مقبول بنانے میں بھی ان کا بڑا حصہ رہا ان کے ہاں ''سرسید کی معتزلہ روش پر اسلام کی عقلی تفسیر'' کے رویے بھی موجود ہیں اور ''علی گڑھ کے بند پانی میں پتھر پھینکنے'' کی کوشش بھی۔ اسی طرح حیدر آباد دکن میں مولوی عبدالحق کے ساتھ کام کرنے اور دکن کی تہذیب کو برتنے کا سلیقہ بھی۔ مولوی عبدالحق کا ذکر ڈاکٹر صاحب نے بڑے احترام سے کیا ہے کیونکہ بقول خود انہوں نے اس نظر سے مولوی صاحب کو دیکھا تھا جس نظر سے ''نوجوان گورکی نے بوڑھے طالسطائی'' کو دیکھا تھا۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے بارہ میں سجاد ظہیر نے روشنائی میں لکھا ''اختر حسین سے ملاقات ہوئی جو مولوی عبدالحق سے لڑ کر دلی آ گئے تھے وہاں کی انجمن ترقی پسند مصنفین کے معاملات سے میں مطمئن نہیں تھا لہذا ان سے کہا اس ذمہ داری کو سنبھال

لیں لیکن وہ تیار نہیں ہوئے کیونکہ انہیں بڑا آدمی بننے کی دھن تھی''۔ ڈاکٹر اختر حسین نے اس پر ایک فقرہ لکھا اور اپنی صفائی پیش کی ہے ''تعجب ہے سجاد ظہیر جیسے سنجیدہ آدمی کے قلم سے ایسی چھوٹی بات نکل گئی میں نے جواب میں ان سے یہی کہا تھا کہ میں دہلی سے جلد چلا جاؤں گا کیونکہ وہاں رہنے کا اب کوئی جواز نہیں ہے'' (صفحہ ۱۰۹) دکن کی مسز سروجنی نائیڈو کے خانوادہ کا بڑے احترام اور ادب سے ذکر ہے۔ وہ اسلام اور اسلامی تہذیب سے گہری ذہنی وابستگی رکھتی تھیں اور ''اسلامی اصول کی فلاسفی'' نامی کتاب ان کے سرہانے دھری رہتی تھی۔ مسز نائیڈو کانگریس کی صفِ اول کی رہنما ہونے کے باوجود مسلمانوں میں بہت مقبول تھیں۔

''گردِ راہ'' اردو پر اشتراکی ادب کے اثرات اور ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور کی مستند تاریخ ہے اور اسی وجہ سے اپنا منفرد مقام رکھتی ہے زبان و بیان کے تکلف یا تصنع یا ہندی اور سنسکرت۔ کے اثرات موجود نہیں صاف ستھری سیدھی زبان ہے۔ کتاب پڑھنے کے بعد ڈاکٹر صاحب کے اس مقولہ پر یقین کرنا پڑتا ہے کہ مجھے خلوت میں رہنا پسند ہے اور میں دوسروں کو اپنی تنہائی میں شریک نہیں کرنا چاہتا۔ آخری عمر میں جب ان کی بینائی جاتی رہی تو انہیں باہر کی مجالس میں جانے میں تامل ہوتا تھا کہ لوگ مجھے ترحم کی نظر سے دیکھیں گے۔ گرد راہ اپنے مصنف کی شخصیت کی پوری آئینہ دار ہے اس کا آخری حصہ مصنف نے املا کروایا تھا کیونکہ خود لکھنے سے معذور ہو گئے تھے اس کتاب کو آخری کتاب جانتے ہوئے یہ بھی لکھوایا تھا ''اپنی آخری کتاب کو ختم کرتے وقت کسی مصنف کو خوشی نہیں ہوتی بلکہ ویسا غم ہوتا ہے جیسا کسی عزیز دوست سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوتے ہوئے'' ہوتا ہے۔ سحر انصاری کی بات درست ہے کہ اس کتاب سے اختر حسین رائے پوری کی شخصیت کے بہت سے پہلو اجاگر ہوتے ہیں ان کے معمولات 'ان کی جائیداد اور عمارات سے بیزاری' انسان دوستی' موسیقی سے بے پایاں لگاؤ بے انتہا قوی ارادہ اور حوصلہ' سیر چشمی خودداری اور عزت نفس' دانش ورانہ صلاحیتوں کا ایک سمندر''۔ گرد راہ اردو کی چند باقی رہنے والی خودنوشتوں میں شمار ہوگی مگر اس کے ساتھ ہی حمیدہ اختر حسین رائے پوری کی خودنوشت ''ہم سفر'' کو بھی برابر کی اہمیت حاصل رہے گی۔ حمیدہ اختر حسین کی خودنوشت گرد راہ کا تتمہ ہے۔

◎

مٹی کا دیا

ترقی پسند ادب کے سلسلہ میں مرزا ادیب کی خودنوشت ''مٹی کا دیا'' کا ذکر بھی ہو جانا چاہئے۔ مرزا صاحب نے اپنی منکسر المزاجی کا ثبوت دیتے ہوئے اس خودنوشت کو مٹی کا دیا کہا ہے جو غریب غربا کی جھونپڑیوں میں جلتا اور اردگرد کے ماحول کو روشن کرتا رہتا ہے۔ ان کی پیدائش اور پرورش ایسے ہی ماحول میں ہوئی۔ غربت میں پرورش پانے کے باوجود مرزا ادیب کے اندر کا ادیب سو نہیں گیا وہ چنے کھا کھا کر اپنا وقت تیر کرتے رہے مگر ادب کے ساتھ اپنا لگاؤ قائم رکھا۔ ادب لطیف کے حوالہ سے وہ ترقی پسند تحریک کے مؤید رہے مگر پاکستان بننے کے بعد'' جب ۱۹۴۹ میں ترقی پسند اہلِ قلم کانفرنس اوپن ائیر تھیئٹر میں ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ کچھ ایسی باتیں ہو رہی ہیں جن کی میں اصولاً تائید نہیں کر سکتا'' (صفحہ ۳۶۲) تو آپ اس تحریک سے الگ ہو گئے۔ مگر حمید اختر نے اخبار کو جو بیان جاری کیا اس میں کہا کہ نظریاتی اختلاف کی بنا پر مرزا ادیب کو ترقی پسند تحریک سے علیحدہ کیا جاتا ہے۔

مرزا ادیب پاکستان میں ادب کے فروغ کے سلسلہ کا اہم نام ہے وہ رائٹرز گلڈ کی خدمت بھی کرتے رہے۔ اس خودنوشت کا انداز مرزا ادیب کا انداز نہیں دلاور علی کا انداز ہے۔ سادہ غریب منکسر المزاج اور مخلص۔ آپ نے رجال کے تعلق میں اپنے دوستوں کا ذکر میرے ہمدم میرے دوست کے باب میں اور اپنے زمانے کے بڑے ادیبوں کا ذکر میرے مکرم میرے محترم کے عنوان سے علیحدہ کیا ہے۔ دوستوں کے باقاعدہ خاکے لکھے ہیں جو علیحدہ بھی چھپ جاتے تو اچھے خاکے کہلاتے لیکن خودنوشت میں ان خاکوں کی موجودگی بے موقع لگتی ہے۔ خودنوشت میں در آنے والے رجال کا ذکر جس ذاتی اور شخصی لگاؤ کا متقاضی ہوتا ہے وہ اس میں نمایاں نہیں۔ بایں ہمہ مٹی کا دیا ایک اچھی خودنوشت ہے۔

◎

جنرل کی آپ بیتی

''جنرل کی آپ بیتی'' میجر جنرل شاہد حامد کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ شاہد حامد پاکستانی فوج کے بڑے نیک نام افسر تھے اور ایڈ جوٹنٹ جنرل کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ بعد ازاں مرکز میں وزیر اطلاعات رہے۔ آپ کا تعلق لکھنؤ کے ایک شریف سید گھرانے سے تھا آپ کے دادا اور والد دونوں انجینئر تھے جنہوں نے اپنے تعمیراتی کاموں میں بڑی نیکنامی کمائی۔ دادا سر سید کے ساتھیوں اور علی گڑھ کے پہلے پہلے سرپرستوں میں تھے اور اس تنظیم کے رکن تھے جس کے ارکان ایک دوسرے کو مائی لارڈ کہہ کر مخاطب کرتے اور یوں ایم اے او کالج کے لئے اچھی تجاویز پر غور کرتے اور نئی نسل کی راہنمائی کرتے تھے۔ شاہد حامد نے اپنے دادا کے ساتھ ایک ایسی ہی میٹنگ دیکھی ہوئی تھی اس کا ذکر انہوں نے خوب مزے لے کر کیا ہے مگر ایک دوسرے کو مائی لارڈ کہہ کر پکارنے کی لم انہیں سمجھ نہیں آئی۔ شاید یہ لوگ اپنے آپ کو علیگڑھ کے بڑے بوڑھے ہونے کے ناطے علی گڑھ کا ہاؤس آف لارڈز سمجھتے ہوں؟ مولانا عبدالرزاق کانپوری نے ''یاد ایام'' میں لکھا ہے کہ اس مجلس کا صدر ''ابو جہل'' کہلاتا تھا اور پہلے صدر پیسہ اخبار والے مولوی محبوب عالم منتخب ہوئے تھے'' (یاد ایام صفحہ ۲۵۰)

جنرل شاہد حامد لکھنؤ کی اس نسل سے تعلق رکھتے تھے جس نے اودھ کے جان عالم پیا کو فراموش نہیں کیا تھا۔ جوش صاحب کے ہاں بھی ایسی بڑی بوڑھیوں کا ذکر ہے مگر شاہد حامد نے اس نسل کے زوال کے اسباب و علل پر خوب غور و فکر کیا تھا اس کتاب کے ضمیمہ میں آپ نے اپنی تقریر بھی شامل کر دی ہے جو انہوں نے مرزا علی اظہر کی کتاب ''واجد علی شاہ'' کی تقریب رونمائی میں کی تھی۔ ''میرے دل میں ہمیشہ سے ایسی کتاب لکھنے کی خواہش موجود رہی جس میں واجد علی شاہ پر عائد کردہ الزامات کا جواب دیا جائے''۔ سلطان عالم کے باب میں انگریز ان تمام حوالوں اور آرا کو عوام سے چھپانے میں کامیاب ہو گئے تھے جو اصل حقائق کو ظاہر کرتی تھیں۔ آج بھی اس عہد سے تعلق رکھنے والی کئی دستاویزات (جو

انگلستان میں موجود ہیں) عوام کے لئے دستیاب نہیں کیونکہ انہیں حساس تصور کیا جاتا ہے‘‘۔ عام طور سے یہی سمجھا جاتا ہے کہ واجد علی شاہ ایک عیاش حکمران تھے اور انہیں رقص وموسیقی کے سوا اور کسی چیز سے دلچسپی نہیں تھی وہ ہر اس عورت کو اپنے حرم میں داخل کر لیتے تھے جو انہیں ذرا سی بھی پسند آتی تھی خواہ وہ عورت حلال خوری ہو یا سقنی۔ حلال خوری ہوئی تو اسے نواب مصفا بیگم کا لقب دے دیا سقنی ہوئی تو نواب آب رساں بیگم کہلائی۔ مگر شاہد حامد نے نواب واجد علی خان کے بارہ میں غلط فہمیوں کے ازالے کی پوری کوشش کی ہے اس طرح یہ باب ہماری تاریخ کا پڑھنے کے لائق باب ٹھہرتا ہے۔ شاہد حامد اسی تہذیب کی ماں کی گود کے پالے تھے حتیٰ کہ ان کی دادی تو انہیں ان کے قول کے مطابق کہا کرتی تھیں کہ ’’فوج میں شمولیت کر کے (آپ نے) اپنی مادری زبان بگاڑ لی ہے‘‘۔ زبان بگڑنے کے باوجود انہیں لکھنؤ سے اور اودھ کی تہذیب سے بے پناہ محبت تھی ’’سلطان عالم کے عہد میں لکھنؤ ہندوستان کا ثقافتی مرکز بن گیا تھا اور اس نے دہلی کی رونقوں کو بھی ماند کر دیا تھا جو کچھ لکھنؤ میں ہوتا تھا اس کی تمام ملک میں نقل کی جاتی تھی سامراجی حکمرانوں کے نزدیک یہ ثقافتی سرگرمیاں انحطاط اور بدکاری کی علامتیں تھیں اگر ایسا ہوتا تو اودھ کی مسلم فوجیں جدوجہد آزادی کی مشعل بردار ہراول دستہ کس طرح ثابت ہوتیں؟ مجھے اس تہذیب کے ساختہ پرداختہ ہونے پر فخر ہے جس نے ایک مہذب معاشرہ کی بنیاد رکھی‘‘ (صفحہ ۲۰۷)۔

شاہد حامد نے اپنی سینڈ ہرسٹ کی ٹریننگ کے دوران بھی اپنی تہذیبی روایات کو فراموش نہیں کیا اس ضمن میں ایک واقعہ لکھا ہے ’’ارل آف کیڈوگان نے اپنے خاندان سے ملوانے کے لئے مجھے اپنے گھر مدعو کیا ان کی والدہ ایک مہربان اور شفیق خاتون تھیں اور اپنے بیٹے کی طرح میرا خیال رکھتی تھیں۔ ڈنر کے بعد ملازمین نے صوفوں کے سامنے چھوٹے چھوٹے سٹول رکھ دئے تا کہ ہم سب ان سٹولوں پر اپنے پاؤں پھیلائیں۔ سوائے میرے سب نے اپنے پاؤں پھیلا کر ان سٹولوں پر رکھ لئے۔ بل کی والدہ نے مجھ سے بھی ایسا ہی کرنے کو کہا لیکن میں نے جواب دیا کہ ہمارے معاشرے میں بزرگوں کے سامنے پاؤں پھیلانا بدتہذیبی سمجھا جاتا ہے۔ وہ اپنے لڑکے کی طرف مڑیں اور کہا کہ ان کے بچپن میں برطانوی معاشرے میں بھی یہی رواج تھا‘‘ (صفحہ ۸۱)۔ شاہد حامد متحدہ ہندوستان کی افواج کے

کمانڈر انچیف سر کلاڈ آکن لیک کے پرائیویٹ سکرٹری تھے تقسیم کے بعد آپ نے پاکستان کی فوج میں آنا پسند کیا اور ترقی کرتے کرتے جرنیل کے عہدے تک پہنچے۔ شاہد حامد کی اس کتاب کا لہجہ قطعاً کسی لکھنوی کا لہجہ نہیں لگتا صاف ستھری زبان ہے تکلف یا تصنع سے بالکل پاک۔ لکھنوی تکلفات سے مبرا۔ مگر یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ جرنیل صاحب انگریزی میں سوچتے اور اردو میں لکھتے ہیں کیونکہ اکثر مقامات پر اردو کے فقرے انگریزی قواعد کے مطابق بنائے گئے ہیں۔ بہرطور ایک جنرل کی آپ بیتی اردو کی خودنوشت سوانح عمریوں میں ایک اچھا اضافہ ہے اور لکھنؤ علی گڑھ اور انگلستان کے تہذیب و تمدن پر مستند اور مفید حوالہ کے طور پر یاد رکھی جائے گی۔ ان کی شخصیت کے جو پہلو نمایاں ہوتے ہیں وہ ایمانداری اور اپنی تہذیب سے محبت کے پہلو ہیں اور یہی چیزیں ہمارے ہاں کمیاب ہیں۔

جرنیل صاحب نے ایک اپج اور کی ہے کہ ہر باب کے شروع میں کسی بزرگ کا کوئی قول نقل کر دیا ہے جسے اس باب کی حکمت بالغہ کہا جا سکتا ہے مثلاً پہلے باب کی ابتدا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس قول سے ہوتی ہے جو انہوں نے گورنر مصر مالک اشتر کے نام بھیجا تھا کہ ’’ہمارے نبی حضرت محمدؐ کی سیرت پاک آپ کی سنت قرآن پاک کے احکامات اور مختلف امور کو طے کرنے میں میرے طریق کار سے جو کچھ تم نے سیکھا ہے اس پر خوب اچھی طرح غور کرو‘‘۔ اس کے ساتھ اپنا خاندانی ماٹو بھی درج کیا ہے کہ ’’کام کرو اور نتیجہ کا انتظار کرو‘‘۔ پھر یہ قول بھی ابتدا ہی میں درج ہے کہ ’’لوگ تمہارے عدل پر بھروسا کریں گے اور اس کے نتیجہ میں تم پر ان کا اعتماد بالآخر تمہاری قوت ثابت ہوگا اور وہ تمہاری ذمہ داریوں کا بوجھ بٹانے کو تیار رہیں گے‘‘ یہ کتاب شروع سے آخر تک ایسی ہی حکمات بالغہ کی آئینہ دار ہے اور ایک عام شخص کی ترقی کی شاندار داستان ہے۔

سیلیوٹ

فوجیوں کا ذکر آ گیا تو صدیق سالک کی ''سیلیوٹ'' سامنے آ گئی۔ سیلیوٹ بریگیڈیئر صدیق سالک کی فوجی زندگی کی سرگزشت ہے اور اس میں ان کے کمیشن پانے سے ان کی زندگی کے اواخر تک کے حالات ہیں۔ صدیق سالک کا انداز ہلکا پھلکا ہے کہیں کہیں شگفتہ مزاح کے چھینٹے بھی ملتے ہیں۔ اس میں ایک بات بہت کھٹکتی ہے کہ صدیق سالک کو اپنے انگریزی میں ایم اے ہونے پر خدا معلوم کیوں اتنا ناز تھا؟ جہاں تہاں موقع بے موقع اس ''اعزاز'' کا ذکر کرنے سے نہیں رہ سکتے۔ حتیٰ کہ جب اپنے ایک افسر کے ساتھ انگریزوں کے چلے جانے کا ذکر کرتے ہیں تو بھی یہ کہتے ہوئے نہیں چوکتے ''انگریزی تو اب بھی بہت ہے مثلاً میں ایم اے انگلش، یہ آلو کا کٹلس انگلش، ریڈیو پر خبریں انگلش، لباس انگلش، کراکری کٹلری انگلش'' (صفحہ ۲۷) یہ موقع اپنے انگریزی کے ایم اے ہونے کا ذکر کرنے کا کہاں تھا؟ اس قسم کی بدذوقیوں کے باوجود ان کا سیلیوٹ منفرد ہے کہ ''ساری عمر اپنے سے سینئر کھمبوں کو سیلیوٹ کرتے رہے'' (۱۹)۔

اگرچہ صدیق سالک کی ''میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا'' اور ''ہمہ یاراں دوزخ'' دونوں ہی ان کی فوجی زندگی کی سرگزشت ہیں مگر ان کا انداز رپورتاژ کا ہے۔

◎

بری عورت کی کتھا

ڈھاکہ کا ذکر آیا تو کشور ناہید کا نام سامنے آ گیا۔ انہیں سرکاری طور پر ڈھاکہ بھیجا گیا تھا کہ وہاں جائیں اور اپنے فوجیوں کے کارنامے دیکھیں اور پھر انہیں بیان کریں۔ کشور نے جو کچھ دیکھا وہ اسے بیان نہ کر سکیں، حال ہی میں کشور ناہید کی خودنوشت ''بری عورت کی کتھا'' دہلی اور لاہور دونوں جگہ سے شائع ہوئی ہے۔ یہ صرف کشور ناہید کی سرگزشت ہی نہیں ہمارے ہاں کی تمام ناآسودہ اور مظلوم عورتوں کی کہانی ہے جو مرد کے، پھر اپنے معاشرہ کے پھر اپنے عقائد کے جبر کا نشانہ بنتی ہیں اور لبوں پر مہرِ خاموشی لگائے رکھتی ہے۔ مگر ''کشور ناہید ایک منہ پھٹ اور بڑبولی اور نہتی'' عورت ہے (صفحہ ۲۵) جب کسی ایسی عورت کا منہ کھل جائے تو اسے بند نہیں کیا جا سکتا۔ میں کشور ناہید کو اپنے یونیورسٹی کے زمانے سے جانتا ہوں۔ میں اس مزاج کے ''اندر کی لالوکا'' (صفحہ ۷۶) سے خوب واقف ہوں۔ میں ان لوگوں کو بھی جانتا ہوں جو اس کے سامنے تھر تھر کانپتے تھے مگر پیٹھ پیچھے اس کی برائی کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔ میں اس صحافی سے بھی واقف ہوں جس نے اسے ''چھپن چھری'' اور ''گشتی'' لکھا تھا اور پھر اس سے منہ چھپاتا پھرتا تھا۔ کشور نے اسے دور سے جاتے ہوئے دیکھ لیا لپک کر اسے جا لیا اور اس کا گریبان پکڑ کر کہنے لگی ''اگر تم نے جو کچھ لکھا ہے وہ سچ ہے تو منہ کیوں چھپاتے پھرتے ہو''؟ اب تو اس صحافی احمد بشیر نے وہ خاکہ اپنی کتاب ''جو ملے تھے راستے میں'' میں شامل کر دیا ہے اگرچہ اس کے ساتھ دو ضمیمے بھی لکھے ہیں۔

میں یوسف کامران کو بھی جانتا ہوں جو اس کا میاں تھا اور جس کے ساتھ نکاح کا ثبوت دینے کے لئے کشور کو کتاب کے آخر میں نکاح نامے کی نقل شائع کرنی پڑی ہے۔ کشور نے اس سرگزشت میں اپنی روایتی صاف گوئی سے کام لیا ہے اگر کشور ایسی خودنوشت نہ لکھتی تو ہمیں بہت مایوسی ہوتی۔ ہمیں ہی نہیں ان سب لوگوں کو مایوسی ہوتی جو بادشاہ کو ننگا کہنا چاہتے ہیں مگر کہہ نہیں پاتے مگر یہ ضرور چاہتے ہیں

کہ کوئی ایسا ضرور کہے۔ مشرقی پاکستان کی وہ تمام تیرہ چودہ برس کی بیٹیاں مایوس ہوتیں ''جن کی چھاتیاں سانس نہ لینے پائی تھیں مگر ان کے پیٹوں میں آٹھ آٹھ مہینوں کے حمل تھے کیونکہ وہ سرکاری غنڈوں کی درندگی کا نشانہ بنی تھیں'' وہ سب لوگ مایوس ہوتے جو مولویوں کا خطبہ نما ہذیان کھلے کانوں سنتے اور کچھ کہنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ وہ تمام لوگ بھی مایوس ہوتے جنہیں ''حبس کے موسم میں پرندے بھی مرجاتے ہیں'' کی بات تو سمجھ میں آتی ہے مگر اس بات پر حدیث کا لفظ لکھنے کی جرات نہیں کر سکتے۔ پاکستانی ایڈیشن میں یہ فقرہ یوں ہے ''یہ حدیث ہے مگر جب تک اس پر حدیث نہیں لکھا شائع نہیں ہوئی'' (صفحہ ۳۹)۔ دلی والے ایڈیشن میں ''یہ حدیث ہے'' والے لفظ نہیں ہیں۔ کشور نے تب بھی کسی کو مایوس نہیں کیا تھا کشور نے اب بھی کسی کو مایوس نہیں کیا۔

◎

آشفتہ بیانی میری

''آشفتہ بیانی میری'' ادیبِ شہیر رشید احمد صدیقی کی سرگزشت ہے مگر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اگر ''علی گڑھ'' کوئی فرد ہوتا اور وہ اپنی خودنوشت لکھتا تو اسے اس سے بہتر اسلوب نہ ملتا۔ اس خودنوشت میں رشید احمد صدیقی اور علی گڑھ یک جان دو قالب بن کر ابھرتے ہیں۔ صدیقی صاحب کے اسلوب کے بارہ میں جب بھی بات کی جاتی ہے اس نہج پر کی جاتی ہے کہ ان کی تحریر میں علی گڑھ کہیں نہ کہیں سے در آتا ہے مگر ''آشفتہ بیانی میری'' میں یوں محسوس ہوتا ہے رشید احمد صدیقی کہیں سے در آئے ہیں ورنہ اصل سرگزشت علی گڑھ کی ہے۔ رشید احمد صدیقی اردو ادب کے طنزیات و مضحکات میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں ان کے اسلوب میں جو برجستگی اور ان کی زبان میں جو رچاؤ ہے وہ کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ بات سے بات پیدا کرنا' محاوروں کو اپنے مطلب کے سانچے میں ڈھال لینا ان کا حصہ ہے۔ اور روزمرہ تو گویا ان کے سامنے دست بستہ حاضر رہتا ہے۔

آشفتہ بیانی میری کہنے کو تو صدیقی صاحب کی سرگزشت ہے کہ اس میں ان کے سوانح موجود ہیں مگر یہ سارے حقائق علی گڑھ کے چھاج میں پھٹکے ہوئے لگتے ہیں۔ جہاں تہاں علی گڑھ یہاں وہاں علی گڑھ۔ علی گڑھ سے مفر نہیں۔ صدیقی صاحب نے اس کالج کو یونیورسٹی بننے کے بعد اپنی اقدار میں انحطاط پذیر ہوتے بھی دیکھا ہے مگر آپ نے بلا خوفِ لومۃ لائم ہر بات کہہ دی ہے۔ کھیل کھلاڑیوں کا ذکر ہر علیگ نے کیا ہے سر رضا علی نے ناگواری کے ساتھ باقی لوگوں نے محبت کے ساتھ مگر رشید احمد صدیقی نے اس میں مسرت بھی ملا دی ہے اور علیگڑھ کے کھیلوں اور کھلاڑیوں کو باقاعدہ حصولِ مسرت کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ ایک پرانے علیگ کھلاڑی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ نیٹ پریکٹس کے دوران ایک پرانے کھلاڑی پنجاب سے آئے ہوئے تھے پریکٹس کرنے والا یوں بال کھیل رہا تھا کہ انہیں بہت تاؤ آیا فرمانے لگے ''تگڑا کھیل۔ یہ کیا مکھی ہانکتا ہے'' پھر اس کھلاڑی سے پوچھا کیا ماں کے دودھ کے بعد

پھر دودھ پینا میسر نہیں آیا؟ رشید احمد صدیقی نے اپنے مخصوص انداز میں بات کو بڑھالیا کہتے ہیں وہ بعد میں تگڑا کھیلنے کی تلقین کرتے رہے مگر ساتھ ہی دودھ پینے پر زور بھی زور دیتے رہے۔

غلام السیدین اپنی طالب علمی کے دوران تقریر کرنے کہیں ۱۹۱۵ء۔ ۱۹۱۶ء میں علی گڑھ گئے تھے لکھتے ہیں ''آواز اس وقت ان کی سکول ہی کے کسی ماسٹر کی آواز سے لگا کھاتی تھی۔ سیدین صاحب کا بیان ہے کہ عربی حروف کو صحیح مخارج سے اور ورزشی انداز سے ادا کرنے کی جو مشق چڑھی ہوئی تھی انقلابِ روس و روزگار سے باقی نہ رہی'' (صفحہ ۱۷) ''جو لوگ اس عہد کے علی گڑھ سے واقف نہیں وہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ ادب' زندگی' تنقید اور آرٹ کے کیسے کیسے فرعونِ بے سامان اس وقت کالج میں موجود تھے'' (صفحہ ۵۳)۔ کالج کے بعد جب ''مسلم یونیورسٹی ایم اے او کالج سے برآمد ہوئی لیکن بوجوہ اتنی ہونہار اور شاندار ثابت نہیں ہوئی جتنا ایم اے او کالج تھا اس لئے وہ ان توقعات کو کیا پورا کرتی جو اس سے کی جاتی تھیں لیکن حکومت نے یا کسی اور نے پوری نہ ہونے دیں'' (صفحہ ۴۸)

کالج اور بعد ازاں یونیورسٹی میں اپنے دور کے مشاہیر ادب آتے رہے ان سب کا مہمان خانہ رشید احمد صدیقی کا گھر رہا۔ جگر ہوں یا اصغر' حفیظ ہوں یا کوئی اور سب انہی کے ہاں فروکش ہوتے تھے اس لئے علیگڑھ کی ادبی سرگرمیوں کا عینی گواہ صدیقی صاحب کے سوا کون ہوتا؟ صدیقی صاحب نے یہ گواہی بتمام وکمال اگلی نسل تک پہنچائی ہے۔ آل احمد سرور صاحب نے اپنی بعد میں چھپنے والی سرگزشت میں صدیقی صاحب کے بارہ میں لکھا ہے کہ وہ جلدی گھلتے ملتے نہیں تھے خاص طور سے طلبا سے ایک فاصلہ رکھتے تھے مگر جب انہیں یقین ہو جاتا کہ کسی طالب علم میں ادب یا کرکٹ کے جراثیم ہیں تو پھر اس سے بے تکلف ہو جاتے تھے۔ اس زمانہ کی رسم تھی کہ یونین کا نائب صدر اپنا عہدہ سنبھالتا تو گولے چھوڑے جاتے۔ سرورِ صاحب وائس پریذیڈنٹ ہوئے تو ان کی اورنگ نشینی کے موقعہ پر بھی گولے چھوڑے گئے صدیقی صاحب نے لکھا ''اورنگ نشینی مبارک ہو۔ بقدر دو گولوں کے میں بھی متمتع ہوا''۔

اس سرگزشت میں رشید احمد صدیقی نے علیگڑھ کے ماحول کے علاوہ علی گڑھ کے اساتذہ کا ذکر بھی اپنے شگفتہ انداز میں کیا ہے اور ان لوگوں کا بھی جو وقتاً فوقتاً علی گڑھ آتے رہے۔ اساتذہ میں انگریز اساتذہ کا ذکر بھی شامل ہے جنہوں نے علی گڑھ کا نظم و نسق سنبھالا۔ خاصہ حصہ ڈاکٹر ذاکر حسین

خان صاحب کی خدمات اور علی گڑھ کے ساتھ ان کے حسنِ سلوک پر مبنی ہے اور ذاکر حسین خان صاحب کا حق تھا کہ انہوں نے اپنی وائس چانسلرشپ کے زمانہ میں اس ادارہ کی روایتوں کو قائم کرنے اور مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ بہت بعد میں چھپنے والی مسعود حسن خان صاحب کی سرگزشت ورودِ مسعود میں انہوں نے ذاکر صاحب کا قول روایت کیا ہے کہ جب تک رشید احمد صدیقی موجود ہیں شعبہ اردو کی ترقی ممکن نہیں۔ مسعود حسن خان کی باتوں کی سند خود ان کی اپنی باتوں سے بھی نہیں ملتی۔

ضمناً اقبال کا ذکر بھی آیا ہے ''بہت دنوں بعد جب میں خاصہ کم احمق رہ گیا تھا سر اقبال مرحوم سے پہلے پہل شرفِ نیاز حاصل کرنے لاہور گیا تو مرحوم کا اردو لہجہ اور تلفظ سن کر دم بخود ہو گیا۔ تلفظ کے ناہموار ہونے سے زبان کتنی غیر معتبر معلوم ہونے لگتی ہے'' (صفحہ ۵۴) رشید صاحب خود جونپور کے تھے۔

یہ خودنوشت اردو کی ان خودنوشت سوانح عمریوں میں ہمیشہ منفرد رہے گی جن میں تاریخ ادب رجال سب کچھ ہی نہایت معین اور متوازن انداز میں موجود ہے اور لکھنے والے کا شگفتہ اسلوب سونے پر سہاگہ ہے۔ سرسید کے ساتھیوں میں سے نذیر احمد کے ذکر میں لکھا ہے ''نذیر احمد پہلے شخص ہیں جنہوں نے عورت کو داستان طرازوں' پادشاہوں اور شاعروں کے قبضہ سے نکال کر روزانہ زندگی کے نشیب و فراز اور دھوپ چھاؤں میں دکھایا ہے'' اور ''یہ انداز ۱۹۳۴ء میں بدلا جب ترقی پسند تحریک وجود میں آئی اور جس طرح عورت کو پہلے داستان طرازوں پادشاہوں اور شاعروں کے قبضے سے رہائی دلائی گئی تھی اسی طرح نذیر احمد اور حالی (یا علی گڑھ) کی قید سے آزاد کیا گیا۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوا جیسے عورتوں نے خود اپنے سے رہائی حاصل کر لی ہو۔ کیا رہائی ہے۔ (صفحہ ۱۵۰) یہ سرگزشت ۱۹۶۲ء میں چھپنے کے بعد کئی بار منظر عام پر آ چکی ہے میرے پیشِ نظر تیسرا ایڈیشن ہے جو جامعہ ملیہ کا چھاپا ہوا ہے۔

◎

ناممکن کی جستجو

حمید نسیم کی سرگزشت ''ناممکن کی جستجو'' اگرچہ زمانہ کے لحاظ سے تاخیر سے آئی مگر اس کا ذکر میں چند دیگر مشہور سوانح عمریوں سے قبل کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ کسی ادیب کی سرگزشت نہیں ایک منجھے ہوئے براڈ کاسٹر کی سرگزشت ہے۔ جس طرح رشید احمد صدیقی کی سرگزشت علی گڑھ کی کہانی ہے اسی طرح یہ کہانی دراصل آل انڈیا ریڈیو سے لے کر ریڈیو پاکستان کی کہانی بن گئی ہے۔ حمید نسیم نے اس کہانی کو بیان کرنے میں بڑی فنکاری سے کام لیا ہے پڑھنے میں رواں ہے مگر اس خودنوشت سے وہی لوگ پورا حظ اٹھا سکتے ہیں جو اس میں موجود رجال کو اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں۔ یہ خودنوشت صیغہ غائب میں لکھی گئی ہے یعنی مصنف ''میں'' نہیں لکھتا ''وہ'' لکھتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اسے فطرت نے تخلیقی صلاحیتیں ودیعت کی تھیں مگر وہ ''تیسرے درجہ کی تحریریں لکھنے میں صرف ہو گئیں''۔ یہ خود نوشت بھی ریڈیو سکرپٹ لگتی ہے۔ ریڈیو کی باتیں یا تقریریں تو ویسے ہی ''پادر ہوا'' ہوتی ہیں اور یہ لوگ ساری عمر ''برباد'' یعنی ON THE AIR رہتے ہیں۔ مگر حمید نسیم نے محض ہوائیاں نہیں اڑائیں صاف ستھری سیدھی باتیں کی ہیں۔ اس سرگزشت میں ڈاکٹر تاثیر' فیض' صوفی تبسم' بڑے، بخاری' چھوٹے بخاری' ریڈیو کے بڑے بڑے افسر' علما ادیب سارے ہی موجود ہیں اور مصنف نے بڑی چابک دستی سے اتنے سارے رجال کے باوجود اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے اور اپنی حیثیت کو ممتاز رکھا ہے۔ وہ جو خودنوشت کے فن میں رجال کے حصہ میں محتاط رہنے کی باتیں کی جاتی ہیں ان کی سمجھ حمید نسیم کی خودنوشت پڑھ کر آتی ہے۔ کہ کس طرح وہ بتیس دانتوں میں زبان کی طرح رہے اور سب کا ذکر کرنے کے باوجود اپنے آپ کو صاف بچا لے گئے۔

شاد عظیم آبادی نے بھی اپنی خودنوشت ''شاد کی کہانی کچھ شاد کی کچھ میری زبانی'' خود ہی لکھی اور اپنے ایک شاگرد مسلم عظیم آبادی کے نام سے چھپوائی ہے مگر صیغہء غائب کے اس قرینہ کو نبھا نہیں

پائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض مقامات پر عجیب مضحکہ خیز صورت پیدا ہو گئی مگر خود ہی لکھتے ہیں کہ ''حضرت شاد کا قد مبارک پانچ فٹ سے ذرا ہی کم تھا''۔ اور خود ہی یہ بھی روایت فرماتے ہیں کہ ''حضرت شاد فلاں مقام پر تشریف لے گئے''۔ شاد کی یہ خودنوشت ان کے اپنے لفظوں میں ان کی وفات کے بعد دوسروں کو عبرت دلانے کے لئے چھپوائی گئی ہے۔ حمید نسیم صیغہء غائب کے باوجود کسی الجھن اور ستم ظریفی سے دوچار نہیں ہوئے۔ ناممکن کی جستجو ایک ایسے پڑھے لکھے آدمی کی سرگزشت ہے جسے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود ڈھنگ کی نوکری نہیں ملی مگر وہ ''ٹکر نویسی'' کرتا اور بہتر مستقبل کا انتظار کرتا رہا ادنیٰ ملازمت پر قانع ہو کر نہیں بیٹھ گیا۔ بالآخر ریڈیو والوں نے اسے جگہ دی ریڈیو میں جانا اس کی پہلی محبت نہیں تھی مگر اس نے اسے آخری محبت بنا لیا۔

مصنف نے صدیق سالک کی طرح اپنے انگریزی میں ایم اے ہونے کا ذکر بھی بہت کیا ہے اور جہاں کہیں موقع ملا ہے اپنا فلسفہ چھانٹنے یا اپنے عروضی ہونے کا ثبوت دینے سے گریز نہیں کیا بعض مقامات پر شعروں کی باقاعدہ تقطیع کرنے سے بھی نہیں چوکے۔ انگریزی اور فلسفہ میں اعلی تعلیم کے باوجود اچھی ملازمت نہیں ملی۔ اسی کا شاخسانہ لگتا ہے کہ ن م راشد کو بار بار کیپٹن راشد کہہ کر طعنے دیتے ہیں۔ بڑے بخاری صاحب سے محبت کے باوجود مصنف ایک حد تک ان سے ''خار کھاتا'' ہے مگر اس کے خلوصِ نیت پر کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اس نے اپنے نظریات کو بڑی ایمانداری سے بیان کیا ہے۔ تاثیر کے فیض کا جا بجا چرچا ہے۔ حمید نسیم انہیں اپنا استاد کہتے ہی نہیں سمجھتے بھی ہیں۔ اس سرگزشت کا وہ حصہ بڑا جاندار ہے جہاں مصنف نے امرتسر کا ذکر کیا ہے۔ تاثیر' محمود الظفر' رشید جہاں اور فیض کا ذکر ہے ترقی پسند تحریک کے مقاصد سے دلچسپی کے باوجود وہ فیض کی ''اشتراکیت'' کو ہضم نہیں کر پائے۔ اگر یہ جوہر ریڈیو کی نذر نہ ہو جاتا تو عین ممکن ہے مصنف کی ادبی حیثیت بہت مضبوط ہو کر ابھرتی۔ فارسی ادب کا عمدہ مطالعہ اور ادب کا ذوق یہ دو چیزیں ایسی ہیں جو اچھے ادیبوں اور شاعروں کے لئے ضروری ہوتی ہیں حمید نسیم نے یہ سب کچھ ریڈیو میں جھونک دیا۔ مگر خاتمہ بالخیر ہوا کہ قرآن کی تفسیر لکھی جو خاصے کی چیز سمجھی جاتی ہے اور ان کے ریڈیو کے بعد کے رفقا ان کی اس کایا پلٹ پر رطب اللسان ہیں۔

تحدیث نعمت

"تحدیثِ نعمت" پاکستان کے بین الاقوامی طور پر شہرت یافتہ مدبر، سیاستدان اور جج کی داستانِ حیات ہے۔ سر ظفر اللہ متحدہ ہندوستان میں وائسرائے کی کونسل کے رکن پھر انڈیا کی فیڈرل کورٹ کے جج رہے انہیں مسلمانانِ ہند کی سیاسی خدمات کی خوب توفیق ملی۔ برطانوی ہند کے آئینی مستقبل کے لئے جو تین گول میز کانفرنسیں ہوئیں سر ظفر اللہ ان تینوں میں شریک رہے۔ ان کی ابتدا فوجداری کے وکیل کی سطح سے ہوئی، ۱۹۲۶ء میں پنجاب کی قانون ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ وائسرائے کی کاونسل سے فیڈرل کورٹ میں گئے۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستان کے وزیر خارجہ بنے، عالمی عدالت انصاف کے رکن پھر بعد کو اس کے نائب صدر پھر صدر چنے گئے، اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے صدر بھی رہے۔ یہ پہلے شخص ہیں جو عالمی عدالت انصاف کی صدارت اور جنرل اسمبلی کی صدارت دونوں عہدوں پر فائز رہے۔ عالمی عدالت انصاف سے ریٹائر ہونے کے بعد عملی طور پر اسلام کی خدمت پر مستعد رہے اور اسلام، نبی کریم اور عقائد و مسائل پر انگریزی میں گرانقدر لٹریچر تخلیق کیا اپنی خود نوشت سوانح کا خود ہی انگریزی ترجمہ بھی کیا اور اس کا نام SERVANT OF GOD رکھا۔ بین الاقوامی حلقوں میں اس کتاب کو برصغیر کے کسی فرد کی بہترین خود نوشت سمجھا گیا۔

تحدیثِ نعمت چونکہ ایک سیاسی سوانح عمری ہے اس لئے لامحالہ اس میں سیاسی مسائل کا در آنا ضروری ہے۔ ظفر اللہ خان نے بھی تاریخ کو درست رکھنے کی غرض سے اپنی سیاسی زندگی کو صحیح تناظر میں بیان کیا ہے مگر خود کوئی نتیجہ اخذ کرنے سے گریز کیا ہے۔ متحدہ ہندوستان کے علاوہ انہیں پاکستان کے مدبرین اور پاکستان کا وزیر خارجہ ہونے کی حیثیت میں اور بعد میں اقوام متحدہ میں پاکستان کا مستقل مندوب ہونے اور مزید بعد میں جنرل اسمبلی کا پریزیڈنٹ ہونے کی وجہ سے انہیں جتنے سربراہانِ مملکت سے ملنے جلنے اور ان کے خیالات کو جاننے کا موقع ملا سر ظفر اللہ نے سب کچھ ریکارڈ کر دیا ہے مگر شہاب

صاحب کی طرح اپنے آپ کو ہمالہ کی بلندی پر نہیں رکھا اور دوسروں کی کردار کشی روا نہیں رکھی۔ سر ظفر اللہ کے عقائد سے اختلاف رکھنا ہر شخص کا حق ہے مگر ان کی خود نوشت پڑھنے کے بعد کسی کو یہ شک و شبہ نہیں رہتا کہ اس نے ایک دیندار اور راستباز شخص کی سوانح حیات پڑھی ہے۔

ہماری قومی زندگی کے بعض واقعات کا چرچا ہمارے ہاں ایسے رنگ میں کیا جاتا ہے جس سے ان واقعات کی اصل صورت مسخ ہو جاتی ہے۔ مثلاً پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کی حکومت کو تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے مگر سر ظفر اللہ نے اس پارٹی کی صفائی میں صرف اتنا لکھ کر آنے والے مورخین کی رہنمائی کر دی ہے کہ "اگر سر فضلِ حسین ایک مستحکم اور مضبوط بنیاد قائم نہ کر گئے ہوتے تو ۱۹۳۵ء کے بعد کی نہایت قابل قدر قیادت کو پاکستان کی عمارت تعمیر کرنے میں بہت دشواری پیش آتی۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر مرکزی اعلیٰ ملازمتوں میں مسلمانوں کے تناسب کے متعلق حکومت ہند کی ۴ جولائی ۱۹۳۴ء والی ہدایات جاری نہ ہو چکی ہوتیں تو ۱۹۴۷ء میں کتنے مسلمان ان ملازمتوں میں ہوتے اور کیا وہ تعداد ایک آزاد ملک کے صیغہ جات کو خوش اسلوبی سے چلانے کے قابل ہوتی؟" (صفحہ ۹۳۲)

دوسری مثال قیام پاکستان کے بعد کی ہے۔ جب ظفر اللہ خاں وزارت خارجہ میں تھے۔ SEATO ایک دفاعی معاہدہ ہے اس دفاعی معاہدہ پر دستخطوں کے لئے جو وفد شریک ہوا سر ظفر اللہ اس کے سربراہ تھے۔ ظفر اللہ خان نے اس معاہدہ کو پاکستان کے مفادات کے تحفظ کے لئے ناکافی قرار دے کر اس پر یہ لکھ کر دستخط کئے کہ "میں اس غرض سے دستخط کر رہا ہوں کہ حکومت پاکستان خود اس مسئلہ پر غور و خوض کے بعد خود فیصلہ کرے"۔ قدرت اللہ شہاب جیسے شخص کو سیٹو میں پاکستان کی شمولیت پسند نہ آئی اس لئے خوانخواہ سر ظفر اللہ کو درمیان میں کھینچ لائے کہ انہیں حکومت نے دستخط کرنے کا اختیار نہیں دیا تھا انہوں نے دستخط کئے اور قبول کرنے والوں نے خدا جانے کیوں ان کے دستخطوں کو قبول کر لیا۔ شہاب صاحب نے اپنے قول کے مطابق وزارت خارجہ سے اس معاہدہ کی تفصیلات دیکھنے کی ناکام کوشش کی مگر شہاب صاحب چاہتے تو تحدیثِ نعمت دیکھ لیتے کیونکہ یہ خود نوشت ان کی خود نوشت سے پہلے چھپ چکی تھی تو انہیں کاغذات دیکھنے کی ناکام کوشش نہ کرنی پڑتی اور انہیں صحیح صورت حال کا علم ہو جاتا۔ ایسے ہی بہت سے نازک معاملات کے بارہ میں "تحدیثِ نعمت" صحیح صورت حال بیان کرتی ہے۔

گورنر جنرل ملک غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کی جس کابینہ کو برطرف کیا تھا اس میں سرظفر اللہ بھی شامل تھے۔ سرظفر اللہ نے اس اجلاس کی روداد بیان کی ہے ''گورنر جنرل صاحب تشریف لائے عام طور سے سوائے رسمی تقریبات کے وہ لباس کے متعلق خاص احتیاط نہیں فرمایا کرتے تھے لیکن اس دن معلوم ہوتا تھا کہ لباس کے متعلق بھی پوری احتیاط کے ساتھ تیاری کر کے تشریف لائے تھے۔ بیٹھتے ہی فرمایا صاحبان میں نے آپ کو اس وقت یہاں آنے کی اس لئے تکلیف دی ہے کہ مجھے آپ سے ایک اہم بات کہنی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے سال گرمیوں میں میں نے آپ صاحبان کی خدمت میں گذارش کی تھی کہ ملک میں حکومت کا اعتماد کم ہو رہا ہے اور میں نے مشورہ دیا تھا کہ وزیر اعظم صاحب کابینہ میں یک جہتی اور اعتماد پیدا کرنے کے لئے مناسب اقدام کریں۔۔۔ میری دانست میں کابینہ کا نئے سرے سے تشکیل ہونا لازم ہے اور اس میں مزید تاخیر نہیں ہوسکتی۔ وزیر اعظم صاحب میں آپ سے آپ کی کابینہ کا استعفیٰ طلب کرتا ہوں تا کہ نئی کابینہ تشکیل دی جائے۔

وزیر اعظم صاحب: میں نہیں سمجھتا ہم کیوں استعفیٰ پیش کریں؟ آپ کو بے شک ہمیں موقوف کرنے کا اختیار ہے کیا آپ ہمیں موقوف کرنا چاہتے ہیں؟

گورنر جنرل: میں کوئی سخت لفظ استعمال نہیں کرنا چاہتا میں آپ سے استعفیٰ طلب کرتا ہوں۔

وزیر اعظم: اگر میں انکار کروں؟

گورنر جنرل: پھر مجھے کوئی اور رستہ تلاش کرنا ہوگا۔ وزیر خارجہ تم کیا کہتے ہو؟

ظفر اللہ خان: میرا قلمدان حاضر ہے۔

گورنر جنرل: سردار عبدالرب نشتر صاحب آپ کیا فرماتے ہیں؟

سردار عبدالرب نشتر: وزیر اعظم نے جو کچھ فرمایا ہے وہ ساری کابینہ کی طرف سے فرمایا ہے فرداً فرداً دریافت کرنے کی ضرورت نہیں۔

گورنر جنرل: تو اچھی بات صاحبان میں آپ حضرات کو موقوف کرتا ہوں۔ مجھے اس بات کا افسوس ہے۔ خدا حافظ'' (صفحہ ۶۰۴)

قطع نظر اس بات کے کہ گورنر جنرل کا یہ اقدام درست تھا یا نادرست۔ ظفر اللہ خان نے بے کم

وکاست سارا واقعہ بیان کر دیا ہے۔ اس سے گورنر جنرل غلام محمد کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ کسی پاگل اور بے تکے شخص کی تصویر نہیں ابھرتی۔ غلام محمد کی گفتگو سلیقہ کی اور بات قرینے کی ہے۔ ان کے لہجہ میں رکھ رکھاؤ ہے۔ وزیر خارجہ تو پھر وزیر تھے انہوں نے اپنے گورنر جنرل کا پورا احترام ملحوظ رکھا شہاب صاحب کی حیثیت محض ایک پرائیویٹ سکرٹری کی تھی جس کا اس وقت کا رینک زیادہ سے زیادہ ڈپٹی سکرٹری کا رینک ہوگا مگر شہاب صاحب نے اپنے ناپسندیدہ گورنر جنرل کو قلم کی زد پر رکھ لیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہ شہاب صاحب کا افسر نہیں کوئی ادنیٰ خادم تھا۔

تحدیثِ نعمت کا لکھا جانا اس لئے بھی ضروری تھا کہ بعد میں آنے والے خود ساختہ مؤرخین یا ناقدین اس دور کے لوگوں کو اپنی نفرت کی زد پر نہ رکھ لیں۔ یہ تحدیثِ نعمت کی خوبی ہے اور اپنی اسی خوبی کی وجہ سے یہ خودنوشت اردو کی سیاسی سوانح عمریوں میں ہمیشہ منفرد اور ممتاز رہے گی۔

تحدیث نعمت میں جن سیاسی اکابر کا ذکر ہوا ہے وہ بھی اپنی ذات میں بڑا اہم ہے کیونکہ برطانوی ہند میں گورنر جنرل کی کاؤنسل کا رکن ہونے کی وجہ سے اور بعد ازاں پاکستان کے وزارتی عہدیدار ہونے کی وجہ سے انہیں دنیا بھر کے مدبرین سے ملاقات کے مواقع ملتے رہے ان کا ذکر سرظفر اللہ نے مختصراً مگر ہر ایک مرتبہ کے لحاظ سے بڑے احترام اور ادب سے کیا ہے۔ ان کے ہاں احوال الرجال بھی دوسروں سے زیادہ معلومات افزا اور نمایاں ہے۔ ہندوستان کے آئینی مستقبل پر جو گول میز کانفرنسیں ہوئیں ان میں دوسری کانفرنس میں گاندھی جی بھی شریک تھے۔ ان کا ذکر: '' گاندھی جی مسلم وفد کے ساتھ تبادلہ خیالات کے لئے ہز ہائی نس سر آغا خان کے ہاں رٹز ہوٹل میں شام کے کھانے کے بعد تشریف لائے ۔ تمام حاضرین تعظیماً کھڑے ہو گئے ۔ ہز ہائی نس سر آغا خاں صاحب نے سب کی طرف سے عظیم المرتبت مہمان کو خوش آمدید کہا اور آرام کرسی آپ کے بیٹھنے کے لئے پیش کی۔ گاندھی جی نے انکار میں سر ہلایا مسکرائے اور فرمایا مجھے فرش پر بیٹھنا پسند ہے۔ آپ کے دائیں ہاتھ میں ساگوان کا ایک خوبصورت بکس تھا جو آپ نے فرش پر اپنے سامنے رکھ لیا اور قالین پر تشریف فرما ہو گئے ۔۔۔ گاندھی جی نے بڑے اطمینان سے اپنا بکس کھولا۔ اس میں سے ایک چھوٹا سا بہت خوب صورت پیتل کا چرخہ نکالا جو تہہ کیا ہوا تھا گاندھی جی نے احتیاط سے کھول کر فرش پر رکھا اور خاموشی سے چرخہ کاتنا

شروع کردیا جب دو ایک تاریں نکال چکے تو نگاہ اوپر اٹھائی اور مسکراتے ہوئے اشارہ کیا کہ ہم گفتگو کے لئے تیار ہیں (صفحہ ۲۹۱)

جب بادشاہ جارج پنجم نے مندوبین کے اعزاز میں دعوت دی اس کا احوال یہ ہے ''قصرِ بکنگھم میں مثلِ سابق نمائندگان کے لئے استقبالیہ دعوت دی گئی۔ سنا گیا کہ گاندھی جی نے دعوت تو قبول کرلی ہے لیکن اس تقریب کی خاطر اپنے لباس میں کوئی تبدیلی یا اضافہ کرنے پر رضامند نہیں ہوئے۔ اور آخر کار تاجدارِ برطانیہ کچھ تامل کے بعد انہیں ان کے روزمرہ کے لباس میں خوش آمدید کہنے پر رضامند ہو گئے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ یہ ہم نے بھی دیکھا کہ گاندھی جی اپنے روزمرہ کے لباس میں ہی تھے ہز میجسٹی نے مسکراتے ہوئے ان سے مصافحہ کیا اور دو تین منٹ آپس میں گفتگو رہی؟۔ شاہ جارج پنجم کی آواز کی گونج دور تک پہنچتی تھی ڈاکٹر امبید کار صاحب سے مصافحہ کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا'' ڈاکٹر امبید کار مجھے تو آپ سے مصافحہ کر کے بڑی خوشی ہوئی ہے ان دوسرے لوگوں کو آپ سے مصافحہ کرنے میں کیوں تامل ہوتا ہے؟'' (صفحہ ۲۹۴)۔

مسٹر چرچل کا ذکر: ''مسلمہ طور پر وہ برطانوی سیاست کے آسمان کے درخشندہ ستارے تھے۔ ایک ڈیوک کے پوتے' ایک وزیر خزانہ کے بیٹے پہلی عالمی جنگ میں برطانیہ کے بحری محکمہ کے وزیر ایک صاحبِ تجربہ سیاسی قائد' ایک بارعب رکن پارلیمنٹ' ایک بلند پایہ ادیب' ایک نامور نقاد اور مورخ غرض ہر لحاظ سے وہ ایک قابلِ احترام شخصیت تھے''۔ پارلیمنٹ کی جائنٹ سلیکٹ کمیٹی میں ان کی گواہی ہوئی۔ سر ظفر اللہ جرح کر رہے تھے'' میں نے اپنے سوالات میں ان کا پورا احترام مدنظر رکھا اور وہ بھی خوش اخلاقی سے جواب دیتے گئے۔۔ جب انہوں نے اندازہ کیا کہ یہ تو میرے مسلمات سے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ ہندوستان نہ صرف آزادی کا طالب ہے بلکہ آزادی کے لئے تیار بھی ہے تو ان کے رویہ میں تبدیلی ہوئی اور میرے سوالات کو ٹالنا شروع کیا۔ ایک سوال کو جب دو بار ٹال چکے تو میں نے عرض کیا' مسٹر چرچل مجھے مشکل یہ درپیش ہے کہ انگریزی میری مادری زبان نہیں۔ اور میں باوجود کوشش کے اپنا مطلب آپ پر واضح نہیں کر سکا اگر آپ اجازت دیں تو میں پھر کوشش کروں'۔ چونکہ اب وہ محتاط ہو چکے تھے اس لئے مجھے اپنے سوالات کو اس طریق پر ڈھالنا تھا کہ جواب میں ٹالنے کی گنجائش نہ ہو

۔۔۔ جرح ختم ہوئی تو مسٹر چرچل نے کمال فیاضی سے فرمایا لارڈ چیئرمین' میں نے تو محسوس نہیں کیا کہ مسٹر ظفر اللہ خاں کو انگریزی ان کی مادری زبان نہ ہونے کی وجہ سے کوئی مشکل پیش آئی ہو'۔ چوتھے دن جب مسٹر چرچل کی شہادت مکمل ہو چکی تو مسٹر چرچل اپنی کرسی سے اٹھ کر میرے پاس تشریف لائے مصافحہ کیا اور مسکراتے ہوئے فرمایا YOU HAVE GIVEN ME TWO MOST DIFFICULT HOURS BEFORE THIS COMMITTEE. ''یعنی اس کمیٹی کے روبرو تم نے دو گھنٹے میرا ناک میں دم کئے رکھا'' (صفحہ ۳۳۷)۔

اردن کے شاہ حسین بن طلال: '' جلالتہ الملک کے ساتھ میری تین ملاقاتیں ہوئیں ہر دفعہ بڑی محبت سے پیش آئے۔ ایک ملاقات میں تو صرف میں حاضرِ خدمت تھا۔ کھانے کے بعد جلالتہ الملک نے کمال شفقت سے ''ستارہ اردن'' کا سب سے اعلیٰ نشان مجھے مرحمت فرمایا۔۔۔ اردن کی حدود میں داخل ہوتے ہی محکمہ استقبال کی طرف سے چائے کا انتظام تھا۔ پریس کا ایک نوجوان لوکل نمائندہ بھی موجود تھا اس نے اپنے فرائض کی ادائیگی کے طور پر سوال کیا عمان کس غرض سے جا رہے ہیں؟ میں نے کہا ایک دوست کی ملاقات کے لئے۔ پوچھا کیا جلالتہ الملک کی خدمت میں بھی حاضری کا موقع ہوگا؟ میں نے کہا یہاں جو میرے دوست ہیں ان کا نام حسین بن طلال ہے'' (صفحہ ۶۱۲_۶۱۳)

سلطان عبدالعزیز ابن سعود: ''۱۲ مارچ کو میں ریاض حاضر ہوا۔ ریاض ٹیکساس کے شہروں کا مقابلہ کرتا ہے لیکن ٹیکساس کے شہروں کی کوئی عمارت ریاض کے محلات شاہی کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ جلالتہ الملک بہت تواضع سے پیش آئے اور بڑی ذرہ نوازی کا سلوک روا رکھا'' (صفحہ ۶۴۷)

صدر کینیڈی: '' امریکی وفد متعینہ اقوام متحدہ کی طرف سے مجھے بتایا گیا کہ صدر اسمبلی اپنی صدارت کے دوران واشنگٹن جائے تو صدر ریاستہائے متحدہ سے ضرور ملاقات کرتا ہے۔ چنانچہ واشنگٹن جانے پر میں صدر کینیڈی کی ملاقات کے لئے وائٹ ہاؤس گیا۔ صدر کینیڈی بڑے بااخلاق تھے بڑے تپاک اور بے تکلفی سے پیش آئے۔ ملاقات کسی خاص موضوع پر نہیں تھی مختلف امور پر گفتگو رہی۔ ان دنوں ہندوستان اور چین کی جھڑپ ہوئی تھی اس سلسلہ میں فرمایا ہم ایک لحاظ سے چین کے

ممنون ہیں کہ انہوں نے مسٹر کرشنا مینن سے ہماری خلاصی کروائی'' (صفحہ ۶۷۲)۔

شاہ حسن سلطان مراکش: ''ملاقات کے دوران میں سلطان کے چہرے پر ایک مشفقانہ تبسم تھا جب کوئی خاص جملہ تلطف کا فرماتے تو یہ تبسم اور بھی نمایاں ہو جاتا کلام آہستہ آہستہ اور بالکل سادہ زبان میں فرماتے جسے میں پوری طرح سمجھ لیتا ترجمے کی حاجت نہ رہتی۔ لیکن ترجمان کے ذمہ جو فرض عاید کیا گیا تھا انہیں بہر صورت ادا کرنا تھا اور میرا یہ کہنا کہ سلطان کے کلام کی ترجمانی کی ضرورت نہیں خلاف آدابِ دربار ہوتا۔ بیچارے ترجمان کی حالت قابلِ رحم تھی ان کا چہرہ پسینے سے تر تھا جلالتہ الملک جو کچھ تین منٹ میں فرماتے ترجمان اس کا خلاصہ نصف منٹ میں انگریزی میں کہہ دیتے سلطان میری طرف دیکھ کر مسکرا دیتے میرے جواب سے سمجھ جاتے کہ میں نے ان کی بات سمجھ لی تھی اسی طرح جو کچھ میں گزارش کرتا جناب ترجمان اس کا مختصر سے مختصر ترجمہ عربی میں کہہ دیتے اس پر سلطان پھر مسکرا دیتے۔ چونکہ ملاقات کا عرصہ پون گھنٹے کے قریب رہا اس قسم کی ترجمانی نے اسے ایک قسم کے ناٹک کا رنگ دے دیا' ملاقات کے آخر میں جلالتہ الملک نے ایک افسر کو اشارہ کیا وہ ایک بکس لے آئے اور سلطان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ سلطان نے فرمایا ظفر اللہ خاں تم نے جو خدمت مراکش کی اور میرے خاندان کی سرانجام دی ہے اس کا بدلہ تو ہم کسی صورت میں ادا نہیں کر سکتے۔ لیکن مجھے خوشی ہوگی اگر تم یہ نشان جو مراکش کا اعلیٰ ترین نشان ہے میری طرف سے میری خوشنودی اور دوستی کی یادگار کے طور پر قبول کرو۔ ترجمان صاحب نے ترجمہ کرتے ہوئے صرف اتنا کہہ کر جان چھڑائی کہ بادشاہ تمہیں یہ نشان بطور اعزاز عطا فرماتے ہیں۔ میں نے دو تین منٹ میں جلالتہ الملک کا مناسب الفاظ میں شکریہ ادا کیا اور گذارش کی کہ میں اگر مراکش یا اس کے لوگوں کی یا شاہی خاندان کی کوئی خدمت سرانجام دے سکا تو وہ میرا فرض منصبی بنتا تھا اور میرے لئے باعثِ راحت بھی تھا۔ ہر چند کہ میں ایک عاجز انسان اپنے آپ کو ان الطاف و اکرام کا جن کا میں یہاں پیہم مورد رہا ہوں اور اب اس اعزاز کا جو جلالتہ الملک بخشنا چاہتے ہیں مستحق نہیں سمجھتا لیکن اس تمام شفقت اور اخلاص کے شکریہ میں اسے قبول کرتے ہوئے اپنی طرف سے کمال اخلاص کا ہدیہ خدمت اعلیٰ میں پیش کرتا ہوں۔ ترجمان صاحب نے اس گذارش کا ترجمہ صرف اتنا کر کے پیچھا چھڑایا کہ ''میں اپنے تئیں اس کا مستحق تو نہیں سمجھتا لیکن آپ دیتے ہیں تو

میں لے لیتا ہوں''۔ (صفحہ ۶۹۴۔۶۹۵)

اور اب آخر میں ایک افریقی بادشاہ کا ذکر: ''یوگانڈا کے بادشاہ سر فریڈرک متیسا تھے ان کے آبا و اجداد صدیوں سے اس علاقہ پر حکمرانی کرتے چلے آئے تھے۔ سر فریڈرک کیمبرج کے تعلیم یافتہ تھے اور خوش خلق نوجوان تھے اپنی قوم میں ان کا درجہ صرف بادشاہ ہی کا نہ تھا بلکہ مذہبی حیثیت میں بھی وہ اپنی قوم کے سربراہ اور رہنما تھے۔ مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا۔ ان کی طبیعت میں کسی قسم کا تکلف نہیں تھا عادات و اطوار بالکل سادہ تھے زبان کے لہجے اور تلفظ پر کیمبرج کی گہری چھاپ تھی بہت دھیمی اور نرم آواز میں بولتے تھے یہ سب کچھ تو بیسویں صدی کے انگلستان اور کیمبرج کا اثر تھا لیکن جب ان کا کوئی عزیز یا ملازم کمرے میں داخل ہوتا تو دروازے سے ہی ہاتھ پاؤں پر رینگ کر ان تک پہنچتا اور اپنی گذارش کرتا۔ یہ صدیوں پرانی قومی روایت تھی اور ہماری موجودگی میں اس پر عمل کئے جانے سے کیمبرج کے تعلیم یافتہ نوجوان کے چہرے پر خجالت کے کوئی آثار نہ تھے''
(صفحہ ۶۸۴۔۶۸۵)۔

تحدیثِ نعمت اس لحاظ سے اردو کی منفرد خودنوشت رہے گی کہ اس میں دنیا بھر کے رہنماؤں کا ذکر از کار بھی موجود ہے جو شاید اور کسی خودنوشت میں موجود نہیں کہ اردو خودنوشت نگاروں میں سے کسی کو اتنے بلند دنیاوی مناصب نہیں ملے کہ وہ ذاتی طور پر ایسے لوگوں کا ذکر کر سکتا۔ یہ رتبہء بلند ملا جس کو مل گیا۔

◎

آتش چنار

سیاسی مدبرین کی خودنوشتوں کا ذکر ہے تو شیخ محمد عبداللہ کی ''آتشِ چنار'' کا ذکر بھی آ جانا چاہئے۔ شیخ محمد عبداللہ کی سرگزشت بھی لکھوائی ہوئی سرگزشت ہے جو آپ نے محمد یوسف ٹینگ صاحب کو لکھوائی۔ شیخ صاحب نے اس کتاب کو کشمیر کی تحریک آزادی کی تاریخ بنانے کی کوشش کی ہے اور تاریخ بھی وہ جو شیخ صاحب کے زاویہ نگاہ سے صحیح ہو۔ خود اپنے بارہ میں لکھا ہے کہ ''میں کشمیری عوام کی تحریک کا نشان بن گیا تھا اور میرے نام نے ایک اسطوری یعنی legendry حیثیت اختیار کر لی تھی (صفحہ ۲۷۲) حالانکہ تاریخ اس کی نفی کرتی ہے۔ بعض واقعات کو بار بار بیان کیا گیا ہے جس سے کتاب کی وحدت مجروح ہوئی ہے شیخ صاحب نے ایک ہزار صفحات کی اس کتاب میں اپنے ساتھیوں کی چھوٹی چھوٹی آویزشوں اور سیاسی حریفوں کی مذمت میں بہت سا وقت ضائع کیا ہے۔ شیخ صاحب کی آتشِ چنار ایک چھوٹی ریاست کے ایک چھوٹے مدبر کی داستانِ حیات ہے ان کی خودنوشت اس بات کی گواہ بنتی ہے کہ شیخ صاحب میں تدبر فراست اور بصیرت کا وہ خمیر ہی موجود نہیں تھا جس سے سیاسی مدبرین کی شخصیتیں ابھرتی اور پھولتی پھلتی ہیں۔

ایک اور سیاسی خودنوشت مخدوم زادہ حسن محمود کی خودنوشت ہے یہ بھی ایک ریاستی سیاست دان کی خودنوشت ہے جو مرکزی حکومت کے ایوانوں تک پہنچا۔ مخدوم زادہ صاحب نے اس کتاب میں اپنی تقریریں تک شامل کر دی ہیں اس لئے یہ خودنوشت ایک سیاسی روزنامچہ بن کر رہ گئی ہے۔

مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

خواجہ غلام السیدین کی خودنوشت ''مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں'' خواجہ صاحب کی وفات کے بعد ان کی بہن صالحہ عابد حسین نے شائع کر دی ہے۔ غلام السیدین ماہر تعلیم تھے علیگڑھ یونیورسٹی کے شعبہء تعلیم کے صدر تھے۔ آپ کی کتاب اقبال کا فلسفہء تعلیم بہت مشہور ہوئی۔ سیدین صاحب حالی کے پڑنواسے تھے اس لئے اصلاح انہیں ورثہ میں ملی۔ جہاں تہاں ان کے خیالات کی رو اصلاح کے دھارے میں بہہ نکلتی ہے۔ حالی کو اہالیانِ پانی پت نے کہاں تک عزت دی اس کا ذکر کرتے ہوئے سیدین صاحب نے لکھا ''۱۹۴۷ء میں قتل و غارت کا حشر برپا ہوا تو شرنارتھیوں نے پانی پت کے بیشتر قبرستان اکھاڑ دئے یہ شاید حالی کی روحانیت کا فیض تھا کہ ان کی قبر ان چند قبروں میں سے ہے جو محفوظ رہیں۔ قبر کی حفاظت اس شخص کے لئے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی جو اس میں دفن ہے کیونکہ جسم تو خاک ہے خاک میں مل جاتا ہے اور روح جو اصل حقیقت ہے قبر میں دفن نہیں ہوتی کسی اور مقام پر پہنچ جاتی ہے۔ ہاں اس کی حفاظت پسماندگان کا فرض ہے۔ اگر قبر اپنے کسی بزرگ یا قوم کے کسی محسن، کی ہے تو اس کی عزت کرنے میں ہم اپنی تہذیب کا احترام دکھاتے ہیں اور ان کی بے حرمتی کرنے میں اپنی بد تہذیبی بے حسی کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ بات صرف قبروں تک محدود نہیں بلکہ مسجدوں مندروں گوردواروں گرجاؤں سب پر صادق آتی ہے۔ یہ سب خدا کے گھر ہیں اور جو خدا کے گھر کی بے عزتی کرتا ہے وہ دلوں کو توڑنے میں باک نہ کرے گا کہ بالآخر اس کا گھر انسان کا دل ہے'' (صفحہ ۱۴) غلام السیدین صاحب کی خودنوشت کا یہی انداز ہے کہ ایک بات کہتے اور پھر اس کے تہذیبی عوامل و عواقب کا ضرور ذکر کرتے ہیں۔

غلام السیدین' کی کتاب اقبال کا فلسفہء تعلیم مشہور ہوئی تو اقبال تک بھی پہنچی۔ آگے عبدالمجید سالک کی سرگزشت کا اقتباس: ''۳۸ء ماہ جنوری میں جب ڈاکٹر اقبال ابھی بقید حیات تھے لاہور کے

انٹر کالیجیٹ مسلم برادرہڈ نے ملک بھر میں یومِ اقبال منایا۔ لاہور کے علاوہ ملک بھر کے قصبوں اور شہروں میں جلسے منعقد ہوئے جن میں بے شمار مقالے پڑھے گئے اور غالباً ڈاکٹر صاحب کے کلام کا کوئی پہلو ایسا باقی نہ رہا جس پر علمی اور تحقیقی اعتبار سے نظر نہ ڈالی گئی ہو ڈاکٹر صاحب اس زمانہ میں بیمار تھے میں کبھی کبھی حاضرِ خدمت ہوتا تھا تو دیر تک بٹھائے رکھتے اس لئے کہ میں مزے مزے کی باتوں اور لطیفوں سے ان کو شگفتہ رکھتا تھا اور وہ حالتِ علالت میں اس خوش صحبتی کو غنیمت سمجھتے۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے میں نے یوم اقبال کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ بے شمار عنوانات پر مقالے لکھے گئے ہیں مثلاً اقبال اور خدا، اقبال اور انسان، اقبال اور اسلام ۔۔۔۔ فرمایا، ہاں اور آپ نے ایک بات اور سنی ایک تعلیم یافتہ نوجوان نے اقبال کے فلسفہء تعلیم پر بھی ایک کتاب لکھ ڈالی ہے (اشارہ غلام السیدین صاحب کی کتاب ایجوکیشنل فلاسفی کی طرف تھا) بھلا مجھے فلسفہء تعلیم سے کیا تعلق؟ ان لوگوں کی تلاش کی داد دینی چاہئے جو میرے کلام سے اپنے مطلب کی ہر چیز نکال لیتے ہیں خواہ میں نے وہ چیز اس میں ڈالی ہو یا نہ ڈالی ہو'' (صفحہ ۴۰۲)

◎

شام کی منڈیر سے

''شام کی منڈیر سے'' ایک ایسے ادیب کی خودنوشت ہے جس کا تعلق کسی بڑے شہر یا خانوادے سے نہیں تھا۔ وزیر آغا نے اپنی زندگی کا سفر ایک چھوٹے سے گمنام گاؤں سے شروع کیا ان کے باپ دادا گھوڑوں کا کاروبار کرتے تھے یعنی تاجر تھے پھر گھوڑے پالنے لگے یعنی تجارت سے زمینداری پر آ گئے ان کی زمین گھوڑی پال مربعوں کی سکیم کی زمین تھی ان کے والد محترم جنہیں راقم الحروف کو ملنے کا اتفاق ہوتا رہا ویدانت کے مانے ہوئے ودوان تھے اور اپدیش دینے میں بڑے بڑے ویدانتیوں کو مات کرتے تھے۔ وزیر آغا کا بچپن اسی ماحول میں گذرا جس میں سفید پوشوں کو اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھنا بھی مشکل تھا ان معنیٰ میں عسرت اور تنگدستی تو ان کے ہاں نہیں آئی جس تنگدستی سے درمیانہ طبقہ کا سفید پوش طبقہ دوچار ہوتا ہے مگر وزیر آغا نے بچپن سے لڑکپن تک ''غربت'' کا مزا ضرور چکھا۔ بعد کو جب خود زمینوں کا کام سنبھالا اور جدید سائنسی بنیادوں پر کاشتکاری شروع کی تو ان کے ہاں خوش حالی آ گئی جسے ان کے ادبی مخالفین نے ''جاگیرداری'' کے نام سے یاد کیا۔ وزیر آغا نے اپنی خودنوشت میں جاگیرداری کے غلط تاثر کو دور کرنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ یوں لگتا ہے وہ اپنے مخالفین کے اعتراض کا جواب دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کا گاؤں ''وزیر کوٹ'' سرگودھا فیصل آباد روڈ پر ہے۔ بڑی سڑک سے ہٹ کر آب پاشی کی نہر کے کنارے کنارے چلتے جائیں تو کوئی دو تین کوس کے بعد ان کے پھلوں کے باغات شروع ہو جاتے ہیں اور پھر اچھے خاصے بلند و بالا پختہ مکانات ہیں۔ جہاں زمینداروں کے اصول کے مطابق ہر آنے جانے والے راہ بھاٹ کے مسافر کی مہمانداری کے انتظامات موجود ہیں۔ وزیر آغا یوں کرتے تھے کہ ان کے کسی مہمان کو آنا ہوتا اور وہ انہیں اپنے ورود مسعود سے مطلع کر دیتا تو وہ اپنا گھوڑا تانگہ بڑی سڑک تک بھیج دیتے تاکہ مہمان کو سفر کی صعوبت نہ اٹھانی پڑے۔ راقم الحروف کا مستقر ربوہ چونکہ ان کے گاؤں سے قریب ہی تھا اس لئے ہم لوگ تو انہیں

مطلع نہیں کرتے تھے بس کے ذریعہ نہر کے کنارے تک جاتے اور آگے سیر کرتے کرتے ان کے ہاں پہنچ جاتے' آغا صاحب موجود ہوتے تو نشست رہتی ورنہ کھانے پانی کی تو کمی نہیں تھی کچھ دیر بیٹھتے ستاتے اور پھر واپسی کی راہ پکڑتے۔ ہمارے لئے وزیر کوٹ جانا پک نک کا حکم رکھتا تھا۔ دور دراز سے آنے والے لوگوں کے لئے اہتمام ہوتا تھا اس لئے بڑے شہروں میں رہنے والے مخالفین کو یہ بات بڑی افسانوی لگتی تھی کہ نہر کے کنارے اتریں یا ریلوے سٹیشن پر ورود فرمائیں تو آگے گھوڑا تانگہ (یا مولانا صلاح الدین احمد جیسے ادیب شہیر کے لئے موٹر گاڑی) ان کے استقبال کو موجود ہو اور انہیں نہر کے کنارے کنارے گاؤں کے سرسبز و شاداب ماحول میں لے جائے۔ اس لئے وہ لوگ اس بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے تھے۔ ایک ادیبہ لاہور سے بڑے چاؤ کے ساتھ اپنے خاندان کے ساتھ وزیر کوٹ آئیں۔ کہنے لگیں آغا صاحب ہم نے بہت کچھ دیکھ رکھا ہے وزیر کوٹ صرف اس لئے آئے ہیں کہ ہم نے آج تک ''گندم کا درخت نہیں دیکھا وہ دکھایئے۔'' کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟۔ وزیر آغا نے اپنی خودنوشت میں جہاں دوسری باتوں کی تردید کی کوشش کی ہے وہاں اس الزام کا التزام سے تجزیہ کر کے پڑھنے والوں کو بتایا ہے کہ ان کے ہاں کوئی غیر معمولی امارت نہیں تھی ہاں دل کی امارت تو تھی اس کی گواہی تو ہم لوگ بھی دے سکتے ہیں۔ پھر ایک کوردہ میں اچھی خاصی علمی لائبریری قائم کر لینا بھی انہی کو سزاوار ہے۔ ان کا شغف زمینداری ہے یا کتابیں۔ باپ کا علمی ورثہ وزیر آغا تک تو آیا آگے ان کے بیٹے تک بھی منتقل ہو تو عجب نہیں۔

وزیر آغا اردو کے ایسے ادیب ہیں جس نے اپنا مقام خود بنایا اور اب ان کے ساتھی ان کے تتبع میں ادب کی راہ پر گامزن ہیں۔ ان کے مخالفین انہیں ایک علیحدہ دبستانِ ادب کا بانی مبانی قرار دیتے ہیں اور سرگودھا سکول کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ سہرا وزیر آغا نے خود تو اپنے سر نہیں باندھا۔

"شام کی منڈیر سے" کا امتیازی وصف اس کی زبان نہیں اس کا خیال یعنی THOUGHT CONTENT ہے۔ مصنف نے اپنی باہر کی زندگی کو اس حد تک بیان کیا ہے جس حد تک اس کی ضرورت تھی اس کے بعد اپنی تخلیقات کے پس منظر کے انکشاف نے انہیں اپنی طرف کھینچ لیا' اس کیفیت کو انہوں نے ''سامع'' بن جانے سے تعبیر کیا ہے۔ اس کتاب کو انہوں نے یادوں کی بازآفرینی

بھی کہا ہے۔ پروفیسر عبدالسلام ان کے ہم عصر تھے دونوں کی بعد میں ملاقات ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو لیکن ان کے ذہن میں ایک دوسرے کی یاد ضرور موجود رہی۔ پروفیسر سلام کے بارہ میں لکھتے ہیں '' جلسہء تقسیم انعامات میں سب سے زیادہ انعام چھوٹے سے قد کے ایک لڑکے کو ملے جو اس وقت میٹرک کا طالب علم تھا اسے کتابوں کا اتنا بڑا ڈھیر انعام میں ملا کہ اس سے اٹھایا نہیں جاتا تھا۔ اساتذہ آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے کہ یہ لڑکا تو جینیئس ہے۔ ریاضی اور سائنس اس کے مضامین تھے جن میں وہ اپنی کلاس کے طلبا سے میلوں آگے تھا۔ برسوں بعد اسے فزکس کا نوبل انعام ملا تو وہ دنیا بھر میں مشہور ہو گیا۔ میں کالج میگزین کا مدیر تھا مجھے اچھی طرح یاد ہے میں نے اس میں عبدالسلام کا ایک اردو ڈراما بھی شائع کیا تھا۔ پچھلے دنوں ڈاکٹر عبدالسلام نے مجھے پیغام بھیجا کہ میں انہیں وہ پرچہ مہیا کروں جس میں یہ ڈراما چھپا تھا مگر میں وہ پرچہ کہاں سے لاتا؟ کالج لائبریری میں بھی اس کا کوئی پرچہ محفوظ نہیں'' (۳۹)۔ کسی نوبل لاریئٹ کا رفیق ہونا معمولی بات نہیں ہوتی مگر وزیر آغا سرسری طور سے اس ''لڑکے'' کا ذکر کر کے آگے بڑھ گئے ہیں اور اپنے ''تعلقات'' کا کوئی مبالغہ آمیز ذکر اذکار نہیں کیا۔

وزیر آغا نے کہ انہیں حصول تعلیم کے مواقع میسر آئے علم حاصل کیا اور اپنے علم کو اپنی ذات تک محدود نہیں رکھا یا اسے اپنے ذہن کی پھٹکی میں بند کر کے نہیں بیٹھ گئے۔ ملازمت بھی نہیں کی۔ ہاں اس علم کو ادب کی تخلیق تنقید اور ادب کی ترویج میں صرف کیا۔ یہ خودنوشت منظرِ عام پر آنے سے قبل ان کی تیس سے زیادہ ادب کی کتابیں چھپ چکی تھیں۔ ایم اے تک ان کی تعلیم اقتصادیات میں ہوئی اس کے بعد مولانا صلاح الدین احمد انہیں ادب کی طرف کھینچ لائے۔ گاؤں کا رہنے والا یہ شخص تخلیقی تنقید کا جویا ہوا۔ وہ جو اقبال ساجد نے کہا ہے '' پچھلے برس بھی بوئی تھیں لفظوں کی کھیتیاں۔ اب کے برس بھی اس کے سوا کچھ نہیں کیا'' وزیر آغا کی زمینداری پر صادق نہیں آتا۔ ادب کی ساتھ ان کا تعلق ایسا استوار ہوا کہ اسے یہ زندگی بھر کے لئے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا بیٹھے۔ ادب کے ساتھ تعلق استوار ہوا تو گھر کے مائدہ یعنی ویدانت سے دوبارہ روشناس ہوئے '' میں سوچنے لگا تھا میں 'کُل' کا ایک گونگا بہرا یا بے حس جزو نہیں ہوں بلکہ اپنی ذات کو کل کی ہمہ گیریت سے بچانے پر بھی قادر ہوں۔ تصوف نے مجھے me اور not me کے فرق کو زائل کرنے کی تلقین کی جس کے نتیجہ میں زندگی میں میری

شرکت کے امکانات کم ہو گئے تھے مجھے اپنے ماحول کے درمیان ایک نئے رشتہ کا احساس ہوا تو وہ' مکالمہ' جاری ہو گیا جو مجھے آج تک عزیز ہے'' (صفحہ ۷۸) اس خودنوشت کا لب لباب یہی مکالمہ ہے اس نے انہیں متجسس بھی بنایا شانت بھی۔ اس کے نتیجہ میں آئندہ ادبی زندگی میں بہت انقلاب آفریں باتیں رونما ہوئیں۔ وزیر آغا اردو تنقید کا ایک معتبر نام بنا۔ ان کی کتاب اردو شاعری کا مزاج چھپی تو ایک بھونچال آ گیا۔ حالانکہ جو بات یعنی زمین سے محبت کہی گئی تھی وہ اتنی مردود بات نہ تھی۔ وزیر آغا نے یہ بات کیا لکھی ''دھرتی پوجا'' کا لفظ مقہور مردود ہو گیا۔ مگر وہ وقت بھی آیا جب لوگوں نے تسلیم کیا کہ جو بات وزیر آغا نے کہی تھی وہی درست تھی کہ زمین سے رشتہ منقطع کر کے آسمان سے رشتہ استوار نہیں ہو سکتا۔ پھر ان کی عہد آفرین کتاب ''تخلیقی عمل'' سامنے آئی۔ اس وقت تک طوفان تھم چکا تھا اور اردو تنقید ایک نئے رجحان سے آشنا ہو چکی تھی۔ اردو تنقید کی تاریخ میں تنقید کی تھیوری پر ''استاد نقادوں'' نے اتنی کتابیں نہیں لکھیں جو اس دیہاتی نے لکھ دیں۔

شام کی منڈیر سے دوسری خودنوشتوں سے ممتاز ہے مگر اس کی زبان جوش صاحب کی مرصع زبان نہیں، نہ شہاب صاحب کی افسانوی زبان ہے۔ آل احمد سرور کا خود پرستانہ لہجہ بھی نہیں کہ سند میں اپنے ہی شعر دیتے چلے جائیں۔ مگر اس میں کشش ضرور ہے ادبی چاشنی بقدر نمک ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کی خودنوشت ہے جس نے تنقید کو نیا لب ولہجہ' انشائیہ کو نیا ڈھنگ' اپنی کہانی کہنے کو نیا آہنگ عطا کیا اور خود کسی چیز کا سہرا اپنے سر نہیں باندھا۔ یہ ایسے شخص کی خودنوشت بھی ہے جسے جتنا متنازع بنانے کی کوشش کی گئی اس کی شخصیت اتنی ہی ابھر کر اور نکھر کر سامنے آئی ہے۔

وزیر آغا کی ایک خصوصیت اور ہے کہ آپ نے ''آدھی صدی کے بعد'' کے عنوان سے اپنی منظوم خودنوشت بھی لکھی ہے۔

◎

زرگزشت

''زرگزشت'' مشتاق احمد یوسفی کی خودنوشت یا ان کے لفظوں میں ان کی ''سوانح نوعمری'' ہے کیونکہ اس میں ان کی زندگی کا ایک چھوٹا سا عرصہ معرض بیان میں آیا ہے جو بقول مصنف بینکنگ کے ساتھ ان کے فلرٹیشن کے آغاز کا عرصہ تھا (صفحہ ۳۲) گویا یہ ان کی سودخواری کی زندگی کی شیرخواری کے زمانہ کی داستان ہے۔ مصنف کا دعویٰ ہے کہ یہ ایک عام آدمی کی یعنی اس کی اپنی کہانی ہے اور زخم کھانا اور دل گرفتہ نہ ہونا اس کا ادبی مسلک ہے۔

مشتاق احمد یوسفی اردو ادب کا بہت بڑا نام ہے۔ اردو مزاح کو انہوں نے نیا لب ولہجہ ہی عطا نہیں کیا اس میں بے پناہ گہرائی اور گیرائی بھی پیدا کی ہے۔ اس خودنوشت سے قبل ان کی دو کتابیں چھپ کر اپنا لوہا منوا چکی تھیں۔ پھر یوسفی صاحب نے مزاح کے رویہ میں اپنی خودنوشت لکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ خودنوشت لکھنا اور مزاح کے رویہ میں لکھنا بڑا جانکاہی کا کام ہے۔ مصنف نے اپنی بعد کی تصنیف 'آب گم' میں لارڈ کوئنٹن کا حوالہ دیا جو برٹش لائبریری بورڈ کا چیئرمین تھا کہ وہ خودنوشت سوانح کو سوانح عمریوں کے ساتھ کبھی نہیں رکھتا تھا مزاح کی الماری میں رکھتا تھا ایک تو خودنوشت لکھنا ہی ''خودبینی'' کا کام ہے تس پر مزاح کے رویہ میں لکھنا۔ ہر مردے و ہر کارے۔

زرگزشت کا اسلوب بھی احوال الرجال کا اسلوب ہے۔ یعنی اس میں یوسفی صاحب نے اپنی سرگزشت بیان کرنے کے لئے دوسروں کا سہارا لیا ہے اور اپنی زندگی کو ان کے آئینہ میں دیکھا ہے۔ یہی اسلوب ہمارے فکاہیہ نگار عبدالمجید سالک کا تھا انہوں نے بھی احوال الرجال کا سہارا لیا مگر وہاں مزاح آٹے میں نمک کے برابر تھا یہاں سارا احوال ہی مزاح کے پیرائے میں ہے۔ ہر فقرہ ہر ترکیب ہر بات مزاح کے سانچے میں ڈھل کر نکلتی ہے یہ بات کہنے میں کوئی باک نہیں ہونا چاہئے کہ یوسفی صاحب نے اس باب میں پڑھنے والوں کو مایوس نہیں کیا اور ان کا مزاح ہر آنے والی کتاب کے ساتھ اور زیادہ پختہ ہوتا چلا گیا ہے انحطاط پذیر یا بہ قول شخصے ''بزم ارائیاں'' نہیں ہو گیا۔ اس میں نئی

توانائی اور برجستگی آتی چلی گئی۔ اللھم زدفزد۔

زرگزشت کے فلیپ پر لکھا ہے ''یوسفی نے مزاح کا ہر حربہ آزمایا اور ہر داؤں اپنے اوپر آزمایا ہے اور بقول خود اپنے آپ کو زخمایا ہے۔ اس نے زندگی کو جس رخ سے دیکھا برتا اور پرکھا ہے اس نے اس کی تحریر کو نشاطِ کار کے ساتھ ساتھ جلال و جمال آگہی بھی بخشا ہے۔ اس کا اسلوب اور اس کے مزاح کی کاٹ' نری طنازی' لفظی الٹ پھیر اور خوش وقتی سے بالاتر ہے۔ ماورائے تبسم وہ کشادہ دلی اور فراخ حوصلگی بصیرت اور ٹھہراؤ نظر آتا ہے جو زندہ رہنے والے ادب کی پہچان ہوتا ہے''۔ بات باون تولے پاؤ رتی کی ہے۔ یوسفی کا فن اس کتاب کی روح رواں ہے۔ رجال اس کا وسیلہ ہیں منتہائے مقصود نہیں۔ اور ان سے متعارف ہونے کے بعد یہ نہیں پوچھنا پڑتا اَلیسَ مِنکُم رَجُلٌ رشید ؟ (تم میں کوئی عقلِ سلیم والا بھی ہے کہ نہیں؟) جیسا جوش صاحب کے رجال سے پوچھنا پڑتا ہے۔

زرگزشت نہ صرف مزاح کے اعتبار سے بلکہ خودنوشت کے اعتبار سے بھی بڑی وقیع جانی جائے گی کیونکہ اس میں ایک اچھی خودنوشت کے فنی لوازم بڑی خوش اسلوبی سے باہم دگر پیوست اور نمایاں ہیں۔ اس میں مصنف کو ''تاریخ'' کو درست رکھنے کی کوشش بھی نہیں کرنا پڑی حالانکہ وہ یہ کتاب لکھتے وقت یونائیٹڈ بنک کا پریزیڈنٹ تھا اور یہ کوئی کم ''تاریخی'' عہدہ نہیں ہوتا۔ مشتاق احمد یوسفی نے بھی اس کتاب کو تحدیثِ نعمت رب جلیل ہی قرار دیا ہے اور اپنی ترقی پر ذرا سے بھی تکبر یا تفاخر کا اظہار نہیں کیا۔ یہ ان کی وسعت قلب کا ثبوت ہے۔ یہ خودنوشت غالباً اردو ادب کی سنجیدہ قارئین میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والی سرگزشت ہے ورنہ دوسروں کو دوسروں کی زندگی سے اتنی دلچسپی کہاں ہوتی ہے؟ یا تو وہ شہاب صاحب کی طرح بڑا افسر ہو اور ایسی جگہ رہا ہو جہاں سے انقلاب کے سوتے پھوٹتے ہوں اور لوگ اس سے اپنے حاکموں کی اندر خانہ کی باتیں سننا چاہتے ہوں اور وہ سنسنی خیزی کے لئے حقائق کو افسانوی انداز میں بیان کرنے کو خودنوشت سوانح کے اصولوں کے منافی نہ جانتا ہو۔ یوسفی صاحب میں یہی سنسنی خیز عنصر نہیں نہ کوئی رازہائے درون میخانہ ہیں۔ لوگ محض ادبی چاشنی کی وجہ سے اس کتاب کو پڑھتے ہیں جس چیز کا فقدان نہیں وہ عقلِ سلیم ہے اور یہی چیز اس خودنوشت کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ یوسفی صاحب مزاح میں یوسفی کرنے اور طنز میں زلیخائی کرنے سے نہیں چوکتے۔

◎

جہان دانش

''جہان دانش'' اس شاعرِ مزدور کی سرگزشت ہے جس نے حقیقتاً اپنی زندگی ایک مزدور کی حیثیت سے شروع کی اور مزدور کی حیثیت ہی میں بسر کی۔ احسان دانش کی خودنوشت ایک دکھی اور بے حد تکلیف دہ زندگی گزارنے والے حوصلہ مند شخص کی داستان ہے۔ احسان دانش نے غربت میں ثابت قدمی اور عزتِ نفس جیسے اوصاف کو ضائع نہیں ہونے دیا بلکہ مضبوطی سے ان اوصاف کا دامن پکڑے رکھا۔ بعد میں جب ان کی شاعرانہ حیثیت مسلم ہوگئی اور وہ مشاعروں میں اصرار سے بلائے جانے لگے تو بھی انہیں بڑے تلخ تجربات ہوئے۔ میرٹھ میں ساغر نظامی نے انہیں اصرار کر کے بلایا احسان دانش پہلے تو انکار کرتے رہے لیکن ان کے تین خطوط کے بعد راضی ہو گئے۔ ان کی جیب میں خون پسینے کی کمائی کے چوبیس روپے تھے وہی لے کر چل دئے۔ اس کے بعد جو گذری ''مشاعرے کے بعد ساغر صاحب سے اپنے مصارفِ سفر لینے گیا تو وہ کچھ اس طرح پیش آئے کہ ان کے قول و عمل کا تضاد پل کے پل میں تعجب انگیز ہو گیا۔ ان کی گفتگو میں کوئی شاعرانہ یا مخلصانہ پہلو نہیں تھا وہ مطلق بھول چکے تھے کہ میں نے لاہور سے احسان دانش کو کوئی خط بھیج کر بلایا ہے۔ ان کی بول چال کے بے پروایانہ انداز میں ایک قسم کا سوقیانہ لہجہ' کھوکھلا پن اور اوچھے تاجروں والا لین دین بول رہا تھا جیسے ان شہریوں میں ہوتا ہے جو دیہات میں فصل کے ادھار پر تجارت کرتے ہیں۔ اس وقت مجھے ان کی باتوں سے ایسی مایوسی ہوئی کہ اثنائے عمر کے کئی اور خدوخال کو گھما پھرا کر باتیں بنانے والے میری نظر میں پھر گئے۔۔۔ میں لاہور آنے والی گاڑی میں سوار ہو کر دوسرے دن لاہور آ اترا۔۔۔ ساغر کے اس رویہ سے کوفت تو ضرور ہوئی لیکن سوچتا ہوں کہ اس حقیر رقم میں یہ تجربہ مہنگا نہیں پڑا۔۔۔ رفتہ رفتہ یہ راز بھی کھل گیا کہ جن کی شہرت نشیب کی نم آلود فضا میں جنم لیتی ہے وہ ذاتی تخلیقات اور شرافت کے معاملے میں ہمیشہ مشکوک ہی رہتے ہیں۔ الا ماشاءاللہ'' (صفحہ ۳۸۰۔۳۸۱)۔ یہ تو ساغر نظامی اور میرٹھ کی بات تھی لاہور والوں کا

حال احسان دانش کے لفظوں میں یہ ہے ''تہذیب وتمدن کا وہ قوام اور شعر وادب کی وہ قدریں جو صدیوں کی مشاطگی کے بعد تکمیل کو پہنچی تھیں برباد ہوگئیں۔ محبت کی جگہ تعصب نے لے لی اور فراخ دلی کی جگہ کم ظرفیاں آ گئیں۔ لاہور کے شعرا اور ادبا کو قریب ہو کر دیکھئے تو شعر وادب سے نفرت ہو جاتی ہے۔ دوسروں کا تو کیا ذکر اپنوں کی منافقت سے سڑاند آنے لگی۔ کسی بے راہروی پر کوئی معترض نہیں کسی غلطی پر کوئی ناقدانہ نظر نہیں ڈالتا حالانکہ اس سے ادب کی اصلاح ہوتی ہے'' (صفحہ ۵۲۰)

احسان دانش پہلے پہلے احسان بن دانش کہلاتے اور لکھتے تھے۔ لاہور کے ایک شاعر نے پھبتی کہی کہ ان کے نام کا انگریزی ترجمہ ہے۔ gratification without intelligence اس کے بعد آپ نے بن کا لفظ درمیان سے اٹھا دیا اور احسان دانش لکھنے لگے۔

ان کا تلخ زندگی کا تجربہ ذاتی تجربہ تھا سنا سنایا تجربہ نہیں تھا۔ ''پسماندہ طبقہ میں میری آمدورفت تھی اس سے جہاں مجھے زندگی چیونٹیوں بھرا کباب معلوم ہوتی تھی وہاں ایک زخمِ احساس اور بھی میرے درپے ہو گیا تھا وہ یہ کہ جب اور جہاں میں کسی محنتی انسان کی تعلیم ناقص اور شعور بیدار پاتا یا ناداری کے باعث کسی ذہین لڑکے کو تعلیم سے محروم دیکھتا تو مجھے سخت تکلیف ہوتی'' (صفحہ ۵۶۴) اس دردمندی نے انہیں بہت سے نادار طلبا کی اور ان لوگوں کی مدد کرنے پر اکسایا۔ اس بارہ میں دانش صاحب نے مرزا ناصر احمد (پرنسپل تعلیم الاسلام کالج) پروفیسر حمید احمد خان (پرنسپل اسلامیہ کالج) خواجہ دل محمد (پرنسپل دیال سنگھ کالج) اور رشید بخاری صاحب کا دل سے شکریہ ادا کیا ہے جنہوں نے نادار طلبا کو تعلیم دلانے کے سلسلہ میں دانش صاحب کی سفارشوں کا لحاظ رکھا۔ اس صورت حال کا راقم الحروف بھی گواہ ہے کہ دو بھائی تھے جو ناداری کے باعث تعلیم کا سلسلہ جاری نہیں رکھ سکتے تھے احسان دانش ان کا ہاتھ پکڑ کر تعلیم الاسلام کالج کے پرنسپل کے پاس لے آئے اور کہا کہ ان ذہین بچوں کو آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ دونوں بھائیوں نے تعلیم اسی کالج میں پائی۔ ایک سی ایس پی ہو گیا دوسرا بھی کسی اچھی ملازمت پر فائز ہوا۔ سی ایس پی لڑکا ایک کمشنری کا کمشنر تھا کہ میری اس سے ملاقات ہوئی۔ کہنے لگا اگر احسان دانش میرا ہاتھ نہ پکڑتے اور تعلیم الاسلام کالج میری دستگیری نہ کرتا تو میں کہیں گھاس کھود رہا ہوتا کیونکہ وہی عمر تعلیم کی اور مقابلہ کے امتحان کی عمر تھی وہ وقت ہاتھ سے نکل جاتا تو۔۔۔ اتنا کہہ کر کمشنر

صاحب گیلی آنکھوں سے فضا میں دیکھنے لگے۔ احسان دانش نے اس سلسلہ میں کسی خدمت کا کوئی کریڈٹ لینے کی کوشش نہیں کی۔ وہ لوگ جو نیچے سے ابھر کر اوپر آتے ہیں وہ خلوص دردمندی ہمدردی اور خلق میں کسی دوسرے سے ہیٹے نہیں ہوتے۔ قیس ہو کوہکن ہو یا حالی۔ عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں۔

جہانِ دانش کی زبان دہلی یا لکھنؤ کی زبان نہیں مگر میٹھی اور مدھر زبان ہے' دانش صاحب کاندھلہ کے تھے اس لئے کہیں کہیں ایسے لفظ آ جاتے ہیں جنہیں عام آدمی نہیں سمجھ سکتا احسان دانش نے ان الفاظ کے معانی حاشیے میں درج کردئے ہیں۔ مثلاً تھانگی کا لفظ ہمارے ہاں نہیں سمجھا جاتا اس کا مطلب کھوجی یا سراغرسان' بھورا کا مطلب ہے تہ خانہ' پٹھانے بھنے ہوئے چنوں کو کہتے ہیں تجربہ کار اور چوکھی معلومات رکھنے والوں کو ان کے ہاں ولی کھنگر کہا جاتا تھا۔ قس علیٰ ہذا۔

زبان و بیان پر انہیں قدرت حاصل ہے اور بے تکلف وہی لفظ لکھتے چلے جاتے ہیں۔ مختار مسعود نے ایک جگہ لکھا ہے کہ وہ جاننا چاہتے تھے کہ گیلی مچھلی کو تلنے کے لئے گرم تیل میں ڈالتے ہیں تو ایک آواز پیدا ہوتی ہے اس کے لئے اردو میں کون سا لفظ ہے؟ وہ سیدھے انارکلی اور ایبک روڈ کے اتصال پر واقع ''دانش کدہ'' کی سیڑھیاں چڑھ کر احسان دانش کے پاس پہنچے۔ انہوں نے فوراً کہا'' اس آواز کو ''شرَاٹا'' کہتے ہیں۔

زبان و بیان پر اس عبور کے علاوہ ان کا ادب کا مطالعہ ایسا تھا جو بڑے بڑے علما کو میسر نہیں تھا۔ ہمیں یاد ہے ۱۹۵۹ء میں اورینٹل کالج کے لان میں راقم الحروف کی انجمن اردو کی صدارت کے زمانہ میں احسان دانش کے ساتھ ایک شام کا اہتمام تھا۔ احسان صاحب بار بار کونے کے پیپل کے درخت کی طرف دیکھتے تھے۔ جب ان کی کچھ کہنے کی باری آئی تو یہی کہا میرے بچو اس پیپل کی جگہ ایک رہٹ کا کنواں تھا جس کا رہٹ کھینچنے پر میں مامور تھا میرے کھینچے ہوئے پانی سے یہ عمارت بنی ہے جس میں تم بیٹھے علم کے موتی رول رہے ہو۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ اسی پنجاب یونیورسٹی میں وہ ادیب عالم سے زیادہ کے کسی امتحان کے ممتحن نہیں بن سکتے تھے حالانکہ وہ علم اور تجربہ کے لحاظ سے پی ایچ ڈی کے طلبا کی رہنمائی کرنے کے اہل تھے اور رہنمائی کرتے تھے۔ بعد کو ان کے صاحبزادے عزیزی فیضان دانش نے پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کا امتحان پاس کیا۔ اگر پدر نتواند پسر تمام کند۔

دانش صاحب اس کتاب کا رجال کا حصہ علیحدہ لکھنا چاہتے تھے مگر موت نے مہلت نہ دی۔ شاید لکھا ہو مگر وہ چھپا نہیں۔ اگر لکھا گیا ہے تو ڈاکٹر فیضان دانش کو اس کے چھپوانے کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔ اس کتاب کا دوسرا حصہ چھپنے سے قبل وہ حصہ ''جہانِ دگر'' کے نام سے چھپ چکا ہے اور اس کا تجزیہ مناسب موقع پر شامل ہے۔

احسان دانش کی خودنوشت نے بہتوں کو ابھرنے کا حوصلہ دینے کے علاوہ بہت سے اخلاق عالیہ سے بھی روشناس کیا۔ اس خودنوشت کی یہی خوبیاں اسے اردو کی مقبول عام خودنوشتوں میں شامل رکھیں گی۔

یادوں کا جشن

کنور مہندر سنگھ بیدی کی خودنوشت ''یادوں کا جشن'' بڑی قابلِ ذکر سرگزشت ہے۔ بیدی صاحب بابا گورونانک دیوجی کی اولاد میں سے ہیں۔ اس کا پہلا باب ہے ''پدرم سلطان بود'' بیدی صاحب نے بات یہاں سے شروع کی ہے کہ ''میں حضرت بابا گورونانک دیوجی کی براہ راست سترھویں پشت ہوں'' جس طرح ان کا مسلک صلح کل تھا بیدی صاحب کا بھی وہی مسلک ہے۔ بابا گورونانک دیوجی کے بارہ میں لکھتے ہیں ''آپ صلح کل کے شیدائی وحدانیت کے پرستار اور امن و آشتی کے علم بردار تھے۔ مذہبی رواداری آپ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی'' رئیس امروہوی نے کنور مہندر سنگھ کے بارہ میں بھی یہی لکھا کہ: ''یہ بھی ہمہ اوست کے ترجمان ہمہ اوست کے رازدان اور وحدت الوجود کے مسلک پر عامل اور ہر مذہب وملت کے محبّ و محبوب ہیں'' کنور مہندر سنگھ کی خودنوشت اس بات کی گواہ ہے۔ مہندر سنگھ بیدی کو ہندوپاک دوستی کا ترجمان سمجھا جاتا ہے۔ ان کی خودنوشت اس دوستی کا نمونہ پیش کرتی ہے بلکہ آپ نے اس خودنوشت کو ہندوپاک دوستی کے نام معنون کیا ہے۔

کنور صاحب نے جوش صاحب کی طرح بڑی صاف گوئی سے کام لیا ہے مگر اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ ''میں جوش صاحب جتنی جرات نہیں رکھتا کہ سب کچھ کہہ دوں''۔ جوش صاحب اور ان کی محبوبہ کے عنوان سے لکھتے ہیں: ''جوش صاحب نے خیر سے اپنے اٹھارہ معاشقوں کا ذکر یادوں کی بارات میں کیا ہے اس لئے اگر میں ان کے ایک معاشقے کا کوئی واقعہ سنادوں تو مجھے یقین ہے ان کی روح مجھے معاف فرمادے گی'' اس تمہید کے بعد کنور صاحب نے جوش صاحب اور ان کی بمبئی والی محبوبہ کا واقعہ لکھا ہے کہ ''ایک بار جوش صاحب کی وہ محبوبہ جس کو سمندر میں ڈوبنے سے بچانے کے لئے جوش صاحب گیٹ وے آف انڈیا پر تیرنا نہ جاننے کے باوجود سمندر میں کود پڑے تھے دہلی آئی۔ جوش صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ اگر ان کے لئے ایک جائے رہائش اور ایک موٹر گاڑی کا انتظام کر

دیا جائے تو وہ دو چار دن دہلی ہی میں اپنی محبوبہ کے ساتھ گذارنا پسند کریں گے۔ چنانچہ ان کی خواہش کے مطابق شاہدرہ میں ایک بنگلے کا بندوبست ہوگیا اور میرے ایک نہایت ہی عزیز دوست نے اپنی موٹر ان کے حوالے کردی۔ جوش صاحب نے اپنی بیگم صاحبہ سے ایک دو مشاعروں کا بہانہ کیا اور گھر سے رخصت ہوکر شاہدرہ آگئے۔ اب ان کی شامت آئی کہ ایک شام وہ اپنی محبوبہ کو لے کر ہواخوری کے لئے نئی دہلی میں گھوم رہے تھے کہ بیگم جوش نے کہیں انہیں دیکھ لیا لیکن جوش صاحب نے گاڑی نہیں روکی بلکہ اور تیز کردی اور فوراً شاہدرہ پہنچ کر مجھے فون کیا۔ میں گھر پر نہیں تھا۔ لیکن گیارہ بجے کے قریب گھر پہنچا تو جوش صاحب موجود تھے اور بہت پریشان نظر آتے تھے۔ میرے پوچھنے سے پہلے ہی سارا واقعہ سنایا اور کہا جس طرح بھی ہو مجھے بچاؤ۔ جوش صاحب ایک باغی شاعر اور منکرِ خدا تو تھے مگر اپنی بیوی سے اتنا ڈرتے تھے کہ خدا کی پناہ۔ کہنے لگے اگر کسی ترکیب سے یہ معاملہ سلجھایا نہ گیا تو مجھے زندہ ہی دیوار میں چنوا دیا جائے گا۔ میں نے انہیں لاکھ تسلی دی اور یہ بھی کہا کہ آپ کے ہاں چار نکاحوں تک اجازت ہے آپ اپنی محبوبہ سے نکاح کیوں نہیں کر لیتے؟ مگر انہوں نے اسے محض ایک مذاق سمجھا اور تاکید کی کہ کوئی بھی صورت اختیار کرنی پڑے انہیں بچایا جائے۔

چنانچہ میں اگلی ہی صبح جوش صاحب کے گھر گیا۔ بیگم جوش جاتے ہی مجھ پر برس پڑیں اور کہنے لگیں کہ سنا تمہارے دوست نے کیا کیا؟ میں نے لاعلمی ظاہر کی تو کہنے لگیں تم سب ایک جیسے ہی ہو۔ میں نے کہا کچھ بتایئے تو سہی تو کہنے لگیں وہ مردود مجھ سے مشاعرہ کا بہانہ کر کے گیا ہے لیکن اس بمبئی والی چڑیل کو لے کر یہیں دہلی میں گھوم رہا ہے۔ میں نے کہا نہیں بھابی جان ایسا نہیں ہوسکتا وہ تو مجھے بھی دھوکا ہوگیا۔ کل شام میں کناٹ پلیس میں کھڑا ہوا تھا تو دیکھا کہ جوش ایک نہایت ہی خوبصورت عورت کے ساتھ ایک دکان سے نکل کر موٹر گاڑی میں بیٹھ رہے ہیں۔ میں فوراً لپکا اور پیچھے سے جا کر جوش صاحب کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دئے اور کہا بتایئے میں کون ہوں؟ جب وہ نہیں بولے تو میں نے ہاتھ ان کی آنکھوں سے ہٹالئے اور جب انہوں نے گھوم کر میری طرف دیکھا تو مجھے سخت ندامت ہوئی۔ وہ جوش صاحب نہیں تھے لیکن بالکل ایسی ہی شکل اور حلیہ تھا جیسے جوش صاحب کے جڑواں بھائی ہوں۔ میں انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا بلکہ ان کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس پر بیگم جوش نے تمام مردوں کی بے

وفائی اور دوستوں کو ایک دوسرے کی ناجائز مدد کرنے اور بیویوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے پر طویل گرما گرم لیکچر دیا جب ان کا غصہ ذرا ٹھنڈا ہوا تو میں نے پھر کہا بھابی جان میرے ساتھ چلئے آج شام پھر وہ صاحب کہیں نہ کہیں مل جائیں گے آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجئے گا۔ اس پر وہ خاموش ہوگئیں مگر ایسا محسوس ہوا انہوں نے سو فیصد یقین تو نہیں کیا میرا تیر نشانے کے قریب ضرور لگا ہے۔ جب میں لوٹ کر گھر آیا تو جوش صاحب وہاں موجود تھے میں نے سارا قصہ سنایا اور رائے کا بھی اظہار کیا کہ بیگم صاحبہ کی کچھ نہ کچھ تسلی تو ہوگئی ہے مگر ابھی کوئی اور ڈرامہ کھیلنا پڑے گا چنانچہ طے ہوا کہ جہاں جوش صاحب نے مشاعرہ میں شریک ہونے کا بہانہ کیا ہے وہاں سے ایک تار جوش صاحب کی جانب سے بیگم جوش کو دلوایا جائے کہ دو مشاعروں میں سے ایک مشاعرہ ملتوی کردیا گیا ہے اور جوش صاحب کل صبح واپس پہنچ رہے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بھی طے ہوا کہ دیوان سنگھ مفتون کی ''خدمات'' بھی اس سلسلہ میں حاصل کی جائیں چنانچہ جوش صاحب مفتون صاحب کے پاس پہنچے اور ساری بات سنائی اور ان سے کہا کہ آپ خدا پر تو یقین رکھتے نہیں میری خاطر ایک جھوٹی قسم بھی کھا لیجئے۔ کافی دیر سوچنے کے بعد یہ طے ہوا کہ دیوان سنگھ مفتون اپنے اخبار ریاست کے ساتھ ستر پرچے لے کر انہیں ریشمی رومال میں لپیٹ کر بیگم جوش سے ملیں اور کہیں سنا ہے آپ کے دل میں شک پیدا ہوگیا ہے کہ جوش صاحب اپنی کسی محبوبہ کے ساتھ یہیں دہلی میں عیش کر رہے ہیں میں آپ کا یہ شک دور کرنے آیا ہوں اور اپنے ساتھ گرنتھ صاحب بھی لایا ہوں تاکہ آپ کے سامنے گرنتھ صاحب کی قسم اٹھاؤں۔ چنانچہ دیوان سنگھ مفتون ان کے گھر گئے اور بیگم جوش سے یہی فقرے کہے۔ اس پر بیگم جوش نے جوش کی گذشتہ کارستانیوں اور کردار پر ایک تفصیلی تبصرہ فرمایا۔ مفتون صاحب سنتے رہے اور جب وہ ذرا رکیں تو کہنے لگے ''بھابی صاحبہ یہ دیکھئے میں گرنتھ صاحب اپنے ہمراہ لایا ہوں میں گرنتھ صاحب پر ہاتھ رکھ کر یہ کہہ رہا ہوں کہ آپ کو دھوکا ہوا ہے، مجھے خود دھوکا ہوا ہے وہ کوئی اور آدمی تھا جوش صاحب نہیں تھے۔ بیگم جوش نے یہ سمجھا ان ریشمی رومالوں میں واقعی گرنتھ صاحب ہے اور انہیں یقین آگیا۔

مفتون صاحب لوٹ کر جوش صاحب کو یہ خوش خبری سنائی مگر اس کے باوجود وہ اپنی بیگم کے

سامنے جاتے ہوئے گھبرا رہے تھے اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ بیگم جوش ہر مشاعرہ کے بعد جوش صاحب سے پائی پائی کا حساب لیتی تھیں اس مرتبہ جوش صاحب مشاعروں میں تو شریک ہی نہیں ہوئے تھے بلکہ الٹا اپنی جیب ہی سے کچھ خرچ کیا تھا کیا حساب دیتے؟ اس پر جوش صاحب کے دوستوں نے کچھ روپیہ فراہم کیا اور کہا کہ بیگم جوش کی خدمت میں پیش کر دینا کہ مشاعرہ والوں نے دیا ہے۔ اب جب جوش صاحب گھر جانے لگے تو مجھ سے کہنے لگے آپ بھی ساتھ چلئے۔ چنانچہ میں بھی ساتھ ہولیا اور جب ہم ان کے گھر پہنچے تو میں نے جاتے ہی بیگم جوش سے کہا کہ لیجئے آپ کا مجرم حاضر ہے اور ساتھ ساتھ جوش صاحب کو کوسنا شروع کر دیا کہ آپ کے گھر سے چلے جانے کی وجہ سے بیگم صاحبہ کو اور ہم سب کو کن کن غلط فہمیوں میں مبتلا ہونا پڑا اور اب ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اول تو آپ کو مشاعروں میں جانے نہیں دیا جائے گا اور اگر مجبوراً آپ کو جانا ہی پڑے تو کوئی نہ کوئی گھر والا ساتھ ہو۔ اس پر بیگم جوش کے چہرہ پر ذرا سی مسکراہٹ آئی ہم سب نے سمجھا تیر نشانے پر لگا ہے۔ جوش صاحب نے بھی منہ کھولا اور کہا جیسا آپ چاہیں گے ویسا ہی ہوگا۔ اس کے بعد میں اٹھنے لگا تو جوش صاحب نے کہا بھئی ناشتہ کر کے جانا اور بیگم صاحبہ سے کہا ان کے لئے ناشتہ منگوایئے۔ جب وہ یہ سن کر اٹھیں تو جوش صاحب کے دم میں دم آیا اور فرمانے لگے کہ یہ مصرعہ مدتوں سے سنتے آ رہے تھے رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت۔ لیکن آج صحیح طور پر سمجھے کہ اس کے معنی کیا ہیں'' (صفحہ ۶۲۴)۔ کنور مہندر سنگھ بیدی نے دوست کی خاطر جھوٹ بولا اس کا اعتراف کر لیا مگر جوش صاحب قبلہ اسے جھوٹ تھوڑے ہی مانتے تھے وہ تو اسے ایسی مصلحت آمیز بات کہتے تھے جس سے بیوی کا دل نہ ٹوٹنے پائے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی کی خودنوشت دوست نوازیوں کے تذکروں سے بھری پڑی ہے۔

احوال الرجال میں کنور صاحب نے بے شمار دوستوں کا ذکر کیا ہے مگر کسی کی کردارکشی نہیں کی ان کی انسانی ہمدردی اور مساوات کا ایک نمونہ تو یہ ہے کہ آپ دہلی میں سٹی مجسٹریٹ تھے تو اس وقت ان کی عدالت کے گن مین یعنی سنتری بسمل شاہجہانپوری تھے مگر مشاعروں میں دونوں اکٹھے جاتے تھے اور کنور صاحب ہمیشہ ان سے برابری کا سلوک روا رکھتے تھے۔ بسمل شاہجہان پوری کے بارہ میں لکھتے ہیں:

''جس طرح لوگوں کو نزلہ بخار ہو جاتا ہے اس طرح بسمل صاحب کو اسلام ہو گیا تھا وہ قرآن پاک کی تفسیر

اپنے ڈھنگ سے کرتے تھے اور اس پر اس سختی سے عمل کرتے تھے کہ بعض اوقات ان کے ہم مذہبوں کو بھی وہ باتیں گراں گذرتی تھیں۔

ایک بار کا ذکر ہے کہ جوش ملیح آبادی، پنڈت ہری چند اختر، ساحر ہوشیار پوری، مجھے اور بسمل صاحب کو علی گڑھ کے مشاعرہ میں شریک ہونا تھا۔ یہ طے ہوا تھا کہ سب میری کوٹھی پر چار بجے شام پہنچ جائیں۔ بسمل صاحب کے علاوہ سب وقت مقررہ پر پہنچ گئے چونکہ ہم لیٹ ہو رہے تھے اس لئے بسمل صاحب کے گھر پہنچے۔ ہم سب نے لعن طعن کی اور کہا آپ نے لیٹ کر دیا تو نہایت سنجیدگی سے فرمانے لگے کہ دراصل معاملہ یہ تھا کہ ہر مسلمان شوہر کا فرض ہے کہ اگر کہیں شہر سے باہر سفر پر جائے تو جانے سے پہلے اپنی بیوی کا ''حق زوجیت'' ادا کر کے جائے۔ ہمیں ہنسی تو بہت آئی مگر ضبط کر کے کہا اگر ایسا ہی تھا تو آپ یہ حق زوجیت پہلے ہی ادا کر دیتے۔ تو فرمانے لگے میری بیوی دوسرے محلّہ میں گئی ہوئی تھیں میں نے خاص طور سے انہیں وہاں سے بلوایا انہوں نے وہاں سے آنے میں دیر کر دی'' (صفحہ ۳۶۷۔۳۶۸) ایسے اسلام کے لئے اگر کنور صاحب نے نزلہ زکام کی مماثلت تلاش کی ہے تو کیا برا کیا ہے؟

خواب باقی ہیں

پروفیسر آل احمد سرور کی خودنوشت ''خواب باقی ہیں'' ۱۹۹۰ء میں منظر عام پر آئی۔ سرور صاحب کا نام اردو تنقید کا اہم نام ہے اور استاد نقادوں میں شاید ہی ان کے پائے کا کوئی نقادِ حیات ہو۔ ان کی خودنوشت ان کی کیا خود ہمارے زمانے کی سرگزشت ہے مگر پڑھنے والے کی طبیعت شروع ہی سے اچٹنے لگتی ہے کیونکہ ایک تو سرور صاحب کے اسلوب میں بھی وہی نقادانہ رنگ ہے حالانکہ انہیں تنقید اور خودنوشت کے رویہ میں فرق ملحوظ رکھنا چاہئے تھا۔ دوسرے یہ کہ واقعات کی بلاضرورت تفصیلات بیان کرتے چلے جاتے ہیں اور اس بات کا خیال نہیں رکھتے کہ پڑھنے والے کو ان کی زندگی سے دلچسپی ہے ان غیرضروری تفصیلات میں دلچسپی نہیں کہ فرشی ٹولہ سے کون سا راستہ مولوی ٹولہ کو جاتا تھا اور یہ ٹولے ''ٹولے'' کیوں کہلاتے تھے۔ بدایوں کے بارہ میں جتنی جغرافیائی معلومات سرور صاحب نے اکٹھی کی ہیں اتنی تو عبادت بریلوی صاحب نے بریلی اور لکھنؤ کے بارہ میں بھی جمع نہیں کیں۔ خودنوشت میں ایسی باتوں کی کتنی گنجائش ہوتی ہے؟ حیرت ہے سرور صاحب انگریزی ادب کے شناور ہونے کے باوجود ایسی بدعت کے مرتکب ہوتے رہے ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔ ''خواب باقی ہیں'' کا مواد غیرضروری تفصیلات کا خشک پلندہ بن کر رہ گیا ہے۔ ہاں اس بات میں کوئی کلام نہیں کہ سرور صاحب نے ادبی مجادلوں' کالجوں کے مباحثوں مشاعروں میں یہی تفصیلات روا رکھی ہیں جو پڑھنے والوں کی دلچسپی کا موجب بنتی ہیں۔ ان کی خودنوشت کا کینوس محدود ہو گیا ہے اور یہ صرف ان لوگوں کے لئے قابلِ قدر رہ گئی ہے جو اس میں موجود رجال کو جانتے ہیں ورنہ اس دور کے عمومی سیاسی سماجی علمی اور ادبی رجحانات کا ذکر بہت کم ہوا ہے اگر ہوا ہے تو اجمال کے ساتھ۔

سرور صاحب کے والد ماجد ڈاک خانہ میں ملازم تھے وہیں سے وظیفہ یاب ہوئے مگر آپ نے اپنے بچوں کو بڑی محنت سے تعلیم دلائی۔ بڑے بھائی علی گڑھ کے فارغ التحصیل تھے۔ سرور صاحب

بھی وہیں پہنچے اور وہیں سے تعلیم مکمل کی۔ آگرہ کالج کے ساتھیوں میں مجاز اور جذبی بھی تھے۔ پھر فانی کا جگر کا اصغر کا یگانہ کا سب کا ذکر اپنے اپنے مقام پر ہوا ہے۔ اقبال کے بچوں کی گورنس علی گڑھ کے ڈاکٹر اصغر علی حیدر کی منگیتر کی بہن تھیں ''ان کی منگیتر کی بہن جرمنی سے آئی ہوئی تھیں۔ نہایت حسین و جمیل اور شوخ و شنگ۔ سارا گھر ان کے پیچھے دیوانہ تھا بعد میں یہی اقبال کے بچوں کی نگران ہوئیں'' (صفحہ ۶۷) وہ بیان کرتی ہیں کہ جب وہ لاہور پہنچیں تو پہلے دن اقبال کھانے کی میز پر ان کی خاطر پورا لباس پہن کر آئے تھے بعد میں انہوں نے اجازت لے لی کہ وہ الگ اپنے عام لباس یعنی تہمد بنیان میں کھانا کھالیا کریں'' (۹۳)۔ یہ بات تو بہت اچھی ہے کہ پڑھنے والے کو اقبال کے بچوں کی گورنس کے بارہ میں معلومات مل گئیں لیکن ان کا سرور صاحب کی سوانح سے کیا تعلق ہے؟ کیا صرف اتنی سی بات کے لئے ان کا بیان کرنا ضروری تھا کہ سولن میں جب سرور صاحب رشید صاحب کے یہاں ٹھہرے تو وہ شوخ و شنگ جرمن خاتون بھی وہاں ٹھہری ہوئی تھیں؟

سرور صاحب نے ایک دو جگہ پر اس بات کا بڑے افتخار کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ انہیں غلام محمد صادق نے کشمیر یونیورسٹی کی وائس چانسلری پیش کی تھی مگر بات سرے نہ چڑھی تو وائس چانسلری کے بارہ میں سرور صاحب کا ردعمل یوں ہوا ''آج کل یونیورسٹیوں کی جو حالت ہوگئی ہے اس میں وائس چانسلری ایک عذاب بن گئی ہے'' (صفحہ ۲۷۸)۔ یہ ردعمل بالکل اسی طرح کا مایوسانہ اور منفی ردعمل ہے جیسا جوش صاحب کے ہاں رونما ہوا تھا۔ انہیں خدا جانے کیوں گماں ہونے لگا تھا کہ انہیں نوبل پرائز ملنا چاہئے۔ جب ایسا نہ ہوا تو نوبل پرائز والوں پر برس پڑے کہ یہ نرے جاہل لوگ ہیں ترجموں سے کسی ادب کو جانچتے ہیں اور ترجمہ میں کسی چیز کی ادبی شان قائم نہیں رہ سکتی۔ حالانکہ فی الحقیقت ایسا نہیں ہوتا کسی ادب کے اہلِ زبان ہی ادبا و شعرا کا کلام جانچتے ہیں اور جنہیں اس اعزاز کا مستحق سمجھتے ہیں ان کا نام آگے کمیٹی میں سفارش کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ سرور صاحب نے جس ردعمل کا اظہار کیا وہ ان کے ادبی مرتبہ سے فروتر ہے۔ ان کا مرتبہ اتنا ارفع ہے کہ کسی یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہونا ان کے لئے نہیں اس یونیورسٹی کے لئے باعثِ اعزاز ہوتا۔

سرور صاحب نے ایک بدعت اور کی کہ جہاں تہاں اپنے شعر سند میں پیش کرنا شروع کر

دئے۔ لکھنؤ سے علی گڑھ روانہ ہوا تو اپنا ایک شعر گنگنایا۔ فلاں موقع پر اپنا شعر یاد آیا۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ قائم کی تو پھر اپنا شعر۔ ہمارے ہاں اپنے ہی شعروں کو سند میں پیش کرنا کم ذوقی سمجھا جاتا ہے اس کی مثال یوں ہے کہ آپ کسی کو کوئی بات سمجھا رہے ہوں تو بجائے یہ کہنے کے کہ سعدی کا فرمودہ ہے یہ فرمائیں ''میرا فرمودہ ہے''۔ بہر حال ذوقی بات ہے مگر میں اپنی ناپسندیدگی کا ذکر کرنے سے رہ نہیں سکا۔ کئی اور لوگوں کی خودنوشتوں میں ایسی بدعت نظر آئی لیکن وہ کیفیت وکمیت کے لحاظ سے کہیں کم تھی۔ پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ سرور صاحب استاد اور نقاد تو بہت اعلیٰ پائے کے ہیں ان کا شاعرانہ مرتبہ ایسا نہیں کہ ان کی ادبی رفعت تک پہنچتا ہو اس لئے جہاں بھی انہوں نے اپنے شعر کی سند دی اس شعر نے ان کی بات کو تقویت نہیں دی۔ ہمارے ہاں بہت سی ایسی مثالیں موجود ہیں کہ لوگ نقاد اول درجہ کے ہیں شاعر تیسرے درجے کے بھی نہیں اس لئے اگر وہ سند میں اپنے ہی شعر دیں گے تو ان کی بات کا وزن کم ہو جائے گا۔ سرور صاحب کے ہاں تو یہ بے وزنی واضح طور پر محسوس ہوتی ہے مشاعروں میں استاد شعرا کی پذیرائی ان کے علمی احترام و مرتبہ کی وجہ سے ہوتی ہے ان کے شاعرانہ مرتبہ کی وجہ سے نہیں ہوتی۔

سرور صاحب نے اپنی قومیت کا چرچا بھی بہت کیا ہے جہاں کہیں کسی نے ہندوستانی مسلمانوں کے بارہ میں پوچھ لیا ہے آپ سیخ پا ہو گئے ہیں حالانکہ ایک ملک کا رہنے والا دوسرے ملک کے رہنے والے اپنے ہم مذہبوں کے بارہ میں پوچھتا ہے تو کوئی انہونی بات نہیں کرتا۔ ''ایک صاحب نے چھوٹتے ہی سوال کیا کہ ہندوستانی مسلمانوں پر کیا گذر رہی ہے؟ میں نے کہا آپ کو دریافت کرنے کا کیا حق ہے آپ تو پاکستان چلے آئے ہم کو ہماری جمہوریت نے جو حقوق دئے ہیں ان کے حصول کے لئے کوشش کرتے رہتے ہیں'' (صفحہ ۲۴۰) اسی طرح لندن میں سحاب قزلباش نے ان کا انٹرویو لیتے ہوئے پوچھا ''سچ سچ بتائیے ہندوستان میں مسلمانوں پر کتنے مظالم ہو رہے ہیں؟ میں ان پر برس پڑا'' (صفحہ ۲۴۳)

رجال والے حصہ میں رشید جہاں اور بنے بھائی یعنی سجاد ظہیر کے بارہ میں ان کی باتیں چونکا دینے والی ہیں ''سجاد ظہیر باتیں بھی ٹھہر ٹھہر کر کرتے تھے چال بھی نستعلیق تھی اور نقل و حرکت میں

آہستگی۔ وہ آئے تو رکشہ والا پیچھے پیچھے آیا انہوں نے اطمینان سے بیٹھ کر پہلے جیب سے رومال نکالا اپنا چہرہ پونچھا پھر دوسری جیب سے بٹوہ نکالا اور اطمینان سے رکشا والے کو دینے کے لئے ریزگاری نکالنے لگے۔ رشید جہاں اس پر آگ ہو گئیں کہنے لگیں کہ کب سے رکشا والا کھڑا ہے اور تمہارے نخرے ختم ہی نہیں ہوتے تمہاری اسی سستی کی وجہ سے میں نے تم سے شادی نہیں کی اگر شادی ہو جاتی تو کسی دن میں تمہیں تمہاری اس عادت کی وجہ سے قتل کر دیتی۔ سجاد ظہیر بیٹھے مسکراتے رہے'' (صفحہ ۳۱۲)۔
سرور صاحب انجمن ترقی پسند مصنفین کے سکرٹری بھی رہے اور ہر ہفتے اس کے جلسے ان کے گھر پر ہوتے رہے مگر وہ مارکسسٹ نہیں تھے۔ متوازن نکتہ نگاہ رکھنے والے ادیب اور نقاد شمار ہوتے تھے۔

ان کی سرگزشت اچھی سرگزشت ہے مگر پڑھنے والوں کو سرور صاحب سے جس بلند پایہ کی اور دلچسپ خودنوشت کی توقع تھی وہ پوری نہیں ہوئی۔ آپ نے ٹی ایس ایلیٹ کی بات سے بات شروع کی تھی ''ہر نئی کوشش ایک مختلف قسم کی ناکامی ہوتی ہے۔ مجھے یہ سطریں لکھتے وقت اس کا احساس ہو رہا ہے''۔ سرور صاحب کو لکھتے وقت اس بات کا احساس ہوا تھا مجھے ان کی خودنوشت پڑھتے وقت اسی بات کا احساس ہو رہا ہے۔

◎

یادِ عہدِ رفتہ

استاذی ڈاکٹر عبادت بریلوی کی خودنوشت ''یادِ عہدِ رفتہ'' ۱۹۸۸ء میں چھپی۔ یہ سرگزشت ایسے استاذ نقاد اور ادیب کی سرگزشت ہے جس کی ساری عمر ہی اس دشت کی سیاحی میں بسر ہوئی مگر مجال ہے عبادت صاحب نے اپنی خودنوشت میں عصری ادب کے رجحانات کا کسی پہلو سے ذرا سا بھی ذکر اذکار کیا ہو شاید وہ ''اردو ادب ۱۹۴۳ء میں'' لکھنے کے بعد ادیبوں کے ردعمل سے اتنے مایوس ہو گئے کہ انہوں نے اس موضوع کو ہی مرفوع القلم سمجھ لیا؟ دراصل ہوا یہ ہے کہ عبادت صاحب نے ہزارہا صفحات اس موضوع پر لکھے ہیں اور عبادت صاحب کی خوش بختی ہے کہ سارے کے سارے صفحات شائع ہو کر ضخیم کتابوں کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ اس لئے عبادت صاحب نے اپنی خودنوشت میں عصری ادب کو نہیں چھیڑا۔ ان کا کہنا ہے کہ ''گزشتہ نصف صدی ہماری سیاسی معاشرتی تہذیبی علمی و تعلیمی اور ذہنی وفکری زندگی میں بڑی اہمیت کی مالک ہے اس زمانہ میں آزادی کی جدوجہد تیز سے تیز تر ہوئی ہندوستان آزاد ہوا پاکستان کا قیام عمل میں آیا عظیم سیاسی رہنما' بلند پایہ شاعر اور ادیب' یگانۂ روزگار مفکر اور دانشور' عظیم اساتذہ اور ماہر تعلیم' شعلہ بیان خطیب اور مقرر' قلم کو تلوار بنانے والے صحافی اور اہلِ قلم اس زمانے میں پیدا ہوئے'' مگر اس سرگزشت میں ان لوگوں کے سرسری ذکر کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس لئے کہ عبادت صاحب نے ان لوگوں کو دور سے دیکھا ہے۔ قائداعظم کا اور لیاقت علی خان کا اتنا ہی ذکر ہے جتنا ''اینگلو عربیک کالج'' کے سلسلہ میں ہو سکتا تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ عبادت صاحب نے بریلی اور لکھنؤ کے کلچر کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ عہد رفتہ کا بیشتر ابتدائی حصہ ثقافتی معلومات کا بیش بہا ذخیرہ ہے اور سرور صاحب کی بیان کردہ تفصیلات کی طرح اکتا دینے والا نہیں۔ پھر ایسی باتیں بھی موجود ہیں جو انہوں نے اپنے بڑوں سے سنیں مگر انہیں آنکھوں دیکھی باتیں نہیں کہا۔ اگرچہ آپ نے بعض مقامات پر آنکھوں دیکھی باتوں کو ''خوفِ فسادِ خلق'' سے ناگفتنی ہی رہنے دیا ہے ''عید غدیر

کے اس موقعہ پر گھروں میں اور بھی بہت کچھ ہوتا تھا میں نے خود دیکھا ہے لیکن اس کی تفصیل خوفِ فسادِ خلق کے پیشِ نظر ناگفتنی رہے تو بہتر ہے'' (صفحہ ۸۸)۔ لکھنؤ کی عزاداری اور محرم کی تقریبات کا تفصیلی ذکر موجود ہے حالانکہ خود شیعہ نہیں تھے کہتے تھے ''اس مجلس میں کوئی سنی نہیں آ سکتا تھا صرف ایک سنی کی ننھی سی جان ہوتی تھی اور وہ میں تھا'' (صفحہ ۸۶)

عبادت صاحب کا کہنا ہے کہ ''میں اپوزیشن کا آدمی ہوں۔ جو حکومت آتی ہے مجھے اس سے اختلاف ہو جاتا ہے (صفحہ ۶۹) اگرچہ بعد کے حالات شاید استاذی المحترم کی اس بات کی تصدیق نہ کریں۔ بھٹو کے زمانہ میں سوشلزم کا نعرہ لگانے والا اور ضیاء الحق کے زمانہ میں ایوانِ صدر میں ہونے والی ادیبوں کی تقریبات میں شرکت کرنے والا ادیب ''اپوزیشن'' کا آدمی کیسے ہو سکتا ہے۔

عبادت صاحب نے اپنے اساتذہ کا ذکر بڑے پیار اور احترام کے ساتھ کیا ہے اگرچہ ایک بات احتشام حسین صاحب کے بارہ میں ایسی لکھ گئے ہیں جو ان کی اصول پرستی کے خلاف جاتی ہے کہ'' احتشام صاحب بڑے ہی انسان دوست آدمی تھے انسان کے دکھ کا انہیں شدید احساس رہتا تھا چنانچہ وہ ہر ایک کی مدد کرتے تھے اور مدد کرنے میں بعض اوقات بنیادی اصولوں تک کو خیرباد کہہ دیتے تھے۔ میرے خیال میں یہ انسانی عظمت کی انتہائی بلندی تھی جس کو انہوں نے چھو لیا تھا۔ میرے ایک عزیز دوست اور بچپن کے ساتھی تھے جو انٹرمیڈیٹ میں کئی سال فیل ہوتے رہے جب چوتھے سال انہوں نے امتحان دیا تو انگریزی کا ایک پرچہ خراب ہو گیا انہوں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ اگر اس سال بھی فیل ہو گئے تو پڑھنے لکھنے سے قطع تعلق کر لیں گے۔ مجھ سے ہر معاملہ میں مشورہ کرتے تھے پرچہ خراب ہوا تو میرے پاس آئے اور یہ بری خبر سنائی۔ میں نے ان سے کہا احتشام صاحب کے پاس چلتے ہیں وہ صحیح رائے دیں گے کہ کیا کرنا چاہئے۔ چنانچہ ہم لوگ احتشام صاحب کے پاس پہنچے۔ میں نے اپنے دوست کا تعارف کروایا اور پھر پوری کہانی سنائی۔ احتشام صاحب نے ایک منٹ میں فیصلہ کیا اور پوچھا ''کیا کل آپ دہرہ دون جا سکیں گے؟'' پرچہ دہرہ دون میں کسی صاحب کے پاس تھا میرے دوست نے کہا ضرور چلا جاؤں گا۔ احتشام صاحب نے اپنے لیٹر پیڈ پر اپنے ایک دوست کو جو دہرہ دون میں تھے یہ خط لکھا ''دوست وہ ہے جو دوست کے کام آئے۔ یہ صاحب آپ کے پاس آ رہے ہیں خود نہیں آ رہے ہیں میں انہیں بھیج رہا ہوں ان کی روداد سنئے اور ان کا کام کروا دیجئے'' یہ تیر نشانے پر لگا اور جو کچی

ان کے پرچے میں تھی وہ پوری کردی گئی۔ وہ پاس ہو گئے'' (صفحہ ۱۳۸۔۱۳۹)۔ ان کا تیر نشانے پر لگا اب ہم لوگ جو ''رجماً بالغیب'' کرتے پھرتے تھے اور آج کل کے اساتذہ کے رویہ کی مذمت کرتے پھرتے تھے کہ لوگوں کے پرچوں میں رہ جانے والی کمی بعد میں پوری کرتے پھرتے ہیں استاذی المحترم نے اپنے استاد کی سند پیش کردی اب ہمارے پاس اپنے عمل کا کیا جواز رہ گیا۔

عبادت صاحب نے منجملہ دیگر اداروں کے ریڈیو میں بھی ملازمت حاصل کرنا چاہی۔ پطرس بخاری نے انٹرویو لیا اور یہ کہہ کر انہیں ریڈیو میں نہیں لیا کہ ان کا ''مزاج تخلیقی سے زیادہ تنقیدی ہے اور یہ کہ میرا کسی یونیورسٹی ہی میں ہونا مناسب ہے کیونکہ میری صلاحیتوں کے جوہر کسی یونیورسٹی ہی میں کھل سکتے ہیں'' (صفحہ ۱۶۹) اس پر ان کا ردعمل تو جو ہوا سو ہوا کہ اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شدی مگر بابائے اردو پر رکھ کر پطرس کو ملاحیاں سنا دیں: ''دورانِ گفتگو یہ معلوم ہوا کہ بابائے اردو آل انڈیا ریڈیو کے ارباب اختیار خصوصاً بخاری صاحب کے سخت خلاف ہیں ایک تو اس وجہ سے کہ وہ زمانہ کی رفتار کو دیکھتے ہیں مصلحت کے دھارے پر اپنے آپ کو بہاتے ہیں ہندوؤں سے دب کر رہتے ہیں اردو کا کام نہیں کرتے اور یہ کہ خوشامد میں ہندی کو فروغ دے رہے ہیں۔ مولوی صاحب نے یہ بھی کہا کہ ریڈیو میں قابل لوگوں کو ملازم رکھنے سے گریز کرتے ہیں معمولی صلاحیت کے لوگوں کا انتخاب کرتے ہیں اور وہاں دوست نوازی بہت ہے'' (صفحہ ۱۷۲)

رجال میں اپنے اساتذہ علی عباس حسینی۔ حامد اللہ افسر کا ذکر کیا ہے۔ ساتھیوں میں آغا حسن عابدی کا۔ آغا حسن عابدی کا سرسری سا ذکر جوش صاحب کے ہاں ہوا ہے مگر وہ خوشامدانہ ہے عبادت صاحب کے ہاں اس نابغہ کی شخصیت کی جھلکیاں ہیں اور ذرا عاشقانہ ذکر: ''آغا حسن اسکول کے زمانہ میں بڑے جذب وکشش کا مالک تھا جو بھی اس سے ملتا تھا اس کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ میں بھی اس زمانے میں اس کے گرویدہ ہو جانے والوں میں سے ایک تھا اس کی شکل وصورت میں کوئی خاص بات نہیں تھی سانولا رنگ' کتابی چہرہ تیکھے نقوش اور اس کے گال پر جو ڈمپل پڑتا تھا وہ قیامت سے کم نہ تھا۔ میں اس کو دیکھ کر ہمیشہ میر صاحب کا یہ شعر پڑھا کرتا تھا 'رخسار اس کے ہائے رے جب دیکھتے ہیں ہم۔ جی چاہتا ہے آنکھوں کو ان میں گڑو دیئے'۔ یہ سب باتیں ایک جگہ لیکن آغا حسن کو خوش شکل نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے باوجود اس میں دل موہ لینے والی ایک کیفیت ضرور تھی۔ جوبلی کالج کے زمانہ میں آغا حسن

صاف ستھرا لباس پہنتا تھا بڑے پائینچوں کا خاص لکھنوی طرز کا پاجامہ' اس پر سفید تنزیب کا کرتا۔ لکھنوی وضع کی شیروانی اور سر پر خاص لکھنوی انداز کی دوپلی ٹوپی۔ اس وضع قطع سے یہ حضرت اپنے گھر سے چلتے تھے۔۔۔ پیچھے ایک بوڑھا ملازم ہوتا تھا جو ان کی کتابیں اور بستہ وغیرہ اٹھا کر ان کے ساتھ ساتھ چلتا تھا اس ملازم کے انداز سے یہ بات واضح ہوتی تھی کہ وہ صرف سامان ہی اٹھانے کے لئے نہیں آغا حسن کی حفاظت کرنا بھی اس کے فرائض میں شامل ہے۔۔۔ آغا حسن اس اہتمام سے کالج پہنچتے تھے اور پھر دن بھر ہمارے ساتھ رہتے تھے کھیل کود سے انہیں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی زیادہ وقت گھر پر گذارتے تھے اور شام کو اکثر میرے ہاں آتے تھے اگر میں گھر پر نہ ملوں تو پھر ان کی عجیب کیفیت ہوتی تھی پریشان ہو جاتے تھے اور اکثر کچھ اس طرح کی تحریریں چھوڑ جاتے تھے'' عبادت میں کل شام تمہارے گھر جا کر نا امید لوٹا تمہارے بھائی سے کہہ آیا تھا کہ آج صبح تم مجھ سے ضرور مل لینا مجھے بہت غصہ اور تکلیف ہے کہ تم کیوں نہیں آئے۔ ۹ نمبر حبیب اللہ ہوسٹل میں آج سے کل دوپہر تک آ کر مل لو ورنہ خودکشی کرلوں گا تمہارا۔ آغا حسن''۔ یہ آغا حسن آغا حسن عابدی بنے اور عبادت صاحب نے بجا طور پر اپنے بچپن کے اس دوست کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ان کے بنک میں جانے کا سبب عبادت صاحب ہی بنے۔

سیاست میں ان کی دلچسپی خود ان کے قول کے مطابق اکیڈیمک تھی ایک جلسہ کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہیں'' اعلان ہوا کہ نماز کے بعد جلسہ عام ہوگا اور اس میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری ۔مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی خان عبدالغفار خان مولانا مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید صاحب موجودہ سیاسی صورت حال پر تقریر کریں گے۔ میں بھی نماز کے بعد ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا اس خیال سے کہ دیکھیں کیا فرماتے ہیں یہ علمائے دین سیاست حاضرہ کے بارے میں۔ نماز کے بعد جلسہ شروع ہوا جامع مسجد میں ہزاروں انسانوں کے سامنے ان لیڈروں نے تقریریں کیں اور پاکستان بننے کے نقصانات گنوائے۔ اور مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے تو اپنی ساحرانہ خطابت کے بعد تمام حاضرین سے ہاتھ اٹھوائے کہ پاکستان کا قیام مسلمانوں کے لئے مناسب نہیں ہے'' (صفحہ ۲۱۴)

استاذی المکرّم نے اورینٹل کالج کی داخلی سیاست کے باب میں جو کچھ لکھا ہے وہ تیر بن کر دل پر لگا ہے اس لئے کہ راقم الحروف بھی اس کالج کا طالب رہا اور انہیں دنوں میں رہا جب استاذی

کالج میں استاد تھے۔ دو سال ایم کے چار سال پی ایچ ڈی کے چھ سال کا تعلق کوئی کم تعلق نہیں ہوتا اس لئے عین ممکن ہے راقم الحروف کو استاذ محترم کے تجزیہ سے اتفاق نہ ہو بلکہ کہیں کہیں شاید شدید اختلاف ہو مگر اس بات میں کوئی کلام نہیں کہ پنجاب یونیورسٹی کے حالات خراب سے خراب تر ہو رہے تھے۔ اورینٹل کالج بھی اسی یونیورسٹی کا حصہ تھا۔ بہر حال ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں کے مصداق میں اس موضوع کو چھوڑتا ہوں۔

عبادت صاحب کو سید صاحب کے جھوم جھوم کر پڑھانے کی عادت اچھی نہیں لگی حالانکہ خود بھی کلاس میں تشریف لاتے تو آرام کرسی پر تشریف فرما ہو جاتے ٹانگ پر ٹانگ رکھ لیتے اور لیکچر کے دوران ٹانگ ہلاتے جھلاتے رہتے۔ ان کے لیکچر کے باب میں کہیں اور کسی جگہ لکھ چکا ہوں کہ ایک مضمون کو سو رنگ سے باندھتے تھے یعنی ایک ہی بات کو بار بار دہراتے رہتے تھے یہی حال ان کی تحریر کا ہے۔ ضخیم کتابیں ان کی پہچان ہیں بلکہ ایک طنز نگار نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ ان کی کتابیں آلہ قتل کے طور بھی استعمال ہو سکتی تھیں' اٹھا کر دے ماریں تو مضروب پانی بھی نہ مانگے۔ ان کی سرگزشت میں بھی یہ تکرار لفظی نمایاں ہیں بلکہ بعض واقعات کو انجانے میں دوبارہ لکھ گئے ہیں۔ اینگلو عربیک کالج میں محصور تھے تو ان کے رفیق کار مولانا فارق نے دفاع کے سلسلہ میں مشورہ دیا ''صاحب آپ بالکل پروانہ کیجئے۔ آپ کے پاس ہتھیار تو ہیں نہیں۔ اگر حملہ ہو تو آپ اپنی موٹی موٹی کتابوں سے ہندوؤں کو ماریں آخر ان کتابوں کا بھی تو کوئی مصرف ہونا چاہئے'' (صفحہ ۲۰۹)۔ خدا لگتی بات ہے یہ فقرہ میری نظر سے گذرا تو اس طنز نگار کی بات یاد آئی۔ حیرت ہوئی کہ مولانا فارق نے اس طنز نگار کی بات کیسے اچک لی۔

اس سرگزشت کا آخری باب لندن سکول کے ساتھ ان کی وابستگی کی ڈائری ہے یا ترکی میں قیام کی داستان ہے، جس کا براہ راست خودنوشت سے کوئی تعلق نہیں۔

میری یہ کتاب کب کی لکھی جا چکی تھی اور اشاعت کی منتظر مگر خلش تھی کہ اپنے ہی استاد کی خود نوشت کا ذکر نہ کرنا بے ادبی بھی ہے اور محرومی بھی۔ اللہ بھلا کرے شمیم احمد صاحب کا کہ انہوں نے اپنی کتابوں کے ذخیرہ میں سے یہ سرگزشت کھود نکالی اور اس طرح میرے دل کا بوجھ اتر گیا کہ استاذ محترم کی سرگزشت کا ذکر کر پایا ہوں اس میں اگر کوئی گستاخی ہوئی ہے تو ان کی روح سے معافی کا خواستگار ہوں۔

◎

جو رہی سو بے خبری رہی

محترمہ ادا جعفری بدایونی کی خودنوشت ''جو رہی سو بے خبری رہی'' ایک ''بے چین اور بے خبر ہجوم میں تنہا لڑکی'' کی داستان ہے جو ایک پرانی حویلی سے نکل کر بہت دور تک باہر پہنچی۔ محترمہ ادا جعفری کا انداز اس لڑکی کا ہے جو بیخبر نہ رہی باخبر بن گئی۔ محترمہ ادا نے اس ''بے خبری'' سے ''باخبری'' تک کے سفر کا حال بڑے خلوص اور سادگی سے لکھا ہے۔ ہائی سوسائٹی میں آ جانے کے باوجود ان کے اندر کی شرمیلی اور لئے دئے رہنے والی لڑکی نے دم نہیں توڑ دیا۔ اس داستان میں اپنے دور کے تمام بڑے ادیبوں کا شاعروں کا ذکر بھی ہوا ہے مگر اس میں سب سے معتبر حوالہ ادا جعفری کا ہے وہ کسی سے دب کر یا ہیٹی ہو کر نہیں رہیں۔ محترمہ ادا نے اپنے وقار کا دامن کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اسی لئے قاری ان کی خودنوشت کو احترام اور ادب سے پڑھتا ہے اور یہی حال ان کے کلام کا بھی رہا ہے۔

اس خودنوشت میں ان کی زندگی کے چاروں ادوار بڑی چابک دستی سے بیان ہوئے ہیں۔ شادی اور تقسیم ملک سے پہلے کا بڑی حویلی کا احوال جہاں مردوں کے چشم و ابرو پر زندگی بھر کی محرومیوں یا خوشیوں کے فیصلے ہوتے تھے اور بیبیاں تھیں جو ان فیصلوں کو دین ایمان کی احکام کا درجہ دیتی تھیں (صفحہ ۹) پھر آزادی کے بعد اور ماں بن جانے کے بعد کا آزادانہ ماحول' ایک بیوروکریٹ کی بیوی ہونے کے ناتے سے اقتدار کی بھول بلیوں کا سفر اور پھر ماں سے نانی دادی بن جانے کے احساسات۔ ۔۔ادا جعفری نے ان تمام ادوار کی مخصوص کیفیات کو بڑے فنکارانہ انداز میں بیان کیا ہے اور کہیں اپنے اندر کے فنکار کو خفتہ نہیں ہونے دیا۔ ان کا شاعرانہ انداز بیان اور ان کی جمال پرستی قدم بہ قدم ان کے ساتھ چلتی ہے۔

کتاب کے آخری باب کا عنوان ہے ''جو رہی سو بے خبری رہی'' اور یہی اس کتاب کا سر عنوان بھی ہے۔ محترمہ ادا نے اس باب میں اپنی سرگزشت کا تنقیدی جائزہ لیا ہے'' یہ خودنوشت ایک

عام سی لڑکی اور روایتی گھریلو عورت کی چھوٹی سی کہانی ہے جس میں کوئی کہانی بھی نہیں ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ وہ لڑکی اکیلی تھی اور بہت اکیلی۔ اپنے دل کی تنہائی میں گرفتار (صفحہ ۳۶۰) اس تنہائی نے اس لڑکی کو شاعر بنا دیا شاعری اس کی بچپن کی ہمجولی ہے جس نے عمر بھر اس کا ساتھ نبھایا ہے۔ اکثر موقعوں پر محترمہ ادا جعفری نے اپنی بعض نظموں کے پس منظر کو بھی بیان کیا ہے اس طرح ان نظموں کو سمجھنے کا ایک نیا انداز سامنے آتا ہے۔

اس سرگزشت میں بہت سے رجال بھی ہیں مگر محترمہ ادا نے ''صرف ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جن سے ملاقات کے مواقع حاصل ہوتے رہے'' (صفحہ ۳۶۱)۔ اس کتاب میں آنے والے رجال میں جہاں مردوں کا ذکر آیا ہے وہاں محترمہ نے ان کی بیویوں کا ذکر ضرور کیا ہے۔ اگر خواتین کا ذکر ہے تو ان کے شوہروں کا ذکر بھی موجود ہے۔ یہ ہمارے ہاں کے اشراف کی وضع داریاں ہیں۔ اگرچہ ایک انوکھی وضع داری کا ذکر بھی اس کتاب میں ہے۔ اکبر عادل کے بارہ میں لکھتی ہیں ''ان کی وجہ سے ہم نے بیروت خوب گھوم پھر کر دیکھا اور سب سے انوکھا منظر جو وہاں دیکھا وہ اکبر عادل کی غیر معمولی وضع داری کا مظاہرہ تھا۔ وضع یہ تھی کہ جہاں بھی جاتے ان کے ہاتھوں میں پانوں کی ایک ڈبیا ہوتی اور ایک سفید فام بٹلر اپنی مکمل یونیفارم کالی بو اور کالے سوٹ میں ان کے پیچھے ان کا پاندان لئے ہوئے چلتا۔ جب کہ اکبر عادل خود شرٹ اور نیکر پہن کر گھومتے۔ بیرونِ ملک سیاحت کا یہ انداز حیران کر دینے والا تھا۔ اکبر عادل پاکستان کی وفاقی حکومت میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے'' (صفحہ ۲۹۶۔۲۹۷)

اس سرگزشت کا ایک پہلو قابلِ ذکر ہے۔ آپ نے اپنے زندہ ہم عصر احباب کے بارہ میں اپنے تاثرات لکھے ہیں اور یہ بڑا مشکل امر ہوتا ہے مگر ادا اس میں کامیاب رہی ہیں۔ مثلاً ''برسوں کے میل جول کے بعد ہم دونوں شہاب صاحب کی ایک ہی کرامت پر ایمان لائے اور وہ یہ کہ وہ نہایت پاک طینت انسان تھے'' (صفحہ ۱۸۲) مختار مسعود ''صاحبِ طرز ادیب ہی نہیں اپنی شب و روز کا حساب رکھنے میں بھی صاحبِ طرز ہیں'' (صفحہ ۱۵۰) ضمیر جعفری ''ایسا انسان جس کی اس دنیا اور اس زندگی کو اجالنے کی ہمیشہ ضرورت رہی ہے'' (صفحہ ۱۹۱) ''لگتا ہے کبھی کسی خواب میں میں نے بھی ایک بہن کے پورے مان کے ساتھ مرزا ادیب کو راکھی بھیجی تھی'' (صفحہ ۱۹۵) غرض اسی طرح یک فقری دو فقری

تاثرات لکھتی چلی جاتی ہیں اور جس کے باب میں لکھتی ہیں اس کی پوری شخصیت کو اجاگر کر دیتی ہیں۔
''منظور الٰہی اور زہرا بہن کا گھر ایسا تھا جہاں ہمیشہ ہی اپنائیت کا احساس ہوتا تھا ایسے دوست زندگی میں بہت کم میسر آتے ہیں۔ دردمند، خلیق، متواضع اور پرخلوص'' (۸۱۲) ہاں احمد ندیم قاسمی رہ گئے
''خاندان سے باہر جس ہستی نے مجھے پہلی بار بہن کہا تھا وہ احمد ندیم قاسمی ہیں'' (صفحہ ۱۹۶)

ان کے میاں نورالحسن جعفری اہم عہدوں پر رہے چار مارشل لاؤں کو بھگتایا۔ ایوب خان کا یحییٰ خان کا بھٹو کا اور ضیاء الحق کا۔ ایوب خان کی شخصیت کو ایک فقرہ میں نمٹا دیا ہے ''ہر آمر کی طرح وہ بھی اپنی ذات کے عشق میں مبتلا تھے'' (صفحہ ۳۰۷) یحییٰ خان کے دور کا مزاج ایک واقعہ سے عیاں کر دیا نور الحسن جعفری ''وزارت خزانہ کے ایڈیشنل سکرٹری تھے۔ ایک معروف مغنیہ اپنے طائفہ کے ساتھ ٹوکیو جا رہی تھی اور اپنے ساتھ اپنے پورے طائفہ کے لئے وزارتی مراعات سفر خرچ اور الاؤنس کی خواہشمند تھی۔ یہ فائل نور کے پاس پہنچی نور نے محترمہ کے لئے اول درجہ اور طائفہ کے لئے درجہ دوم کے افسران کی مراعات و اخراجات کی منظوری لکھ کر فائل متعلقہ وزارت ثقافت میں بھیج دی۔ اگلے دن یحییٰ خان کے سکرٹری عبدالقیوم کا فون آیا کہ صدر صاحب اس فیصلہ پر ناراض ہیں اور چاہتے ہیں اس فیصلہ پر نظر ثانی کی جائے۔ فائل واپس آ گئی جسے لے کر نور، اے جی این قاضی کے پاس گئے جو وزارت خزانہ کے سکرٹری تھے۔ قاضی صاحب نے نور کے فیصلہ کی توثیق کر دی۔۔۔ اس کے بعد دوبارہ قیوم صاحب کا فون آیا کہنے لگے صدر صاحب پوچھ رہے ہیں اس فیصلہ کا ذمہ دار کون افسر ہے اسے برخاست کر دیا جائے۔ پھر انہوں نے مشورہ دیا کہ اب تم اس فائل کو لے کر مشیر مالیات ایم ایم احمد صاحب کے پاس جاؤ اور ان کی ہدایات حاصل کرو۔ ایم ایم احمد نے فائل دیکھی نور سے سوالات کئے اور یہ فیصلہ کیا کہ ضابطے کے اندر رہتے ہوئے مغنیہ کی فرمائش پوری نہیں کی جا سکتی'' (صفحہ ۳۱۴)۔

ضیاء الحق کی بے رحمی کا ذکر ان کا نام لئے بغیر بڑی چابک دستی سے کیا ہے۔ ان کی ایک سہیلی کے بے گناہ بیٹے کو ''ایک بے رحم حاکم کے جلال حکومت نے بیگم رعنا لیاقت علی خان کی کسی تقریر پر مشتمل پمفلٹ بانٹنے کے جرم میں حوالات میں بند کر دیا تھا۔۔۔ اس وقت ضیاء الحق ملک پر حکمران تھے اسلام آباد میں پاکستانی ادیبوں کے جلسہ کے موقع پر جب ایک شام ہم سب ایوان صدر میں مدعو تھے ہم میں

سے چند خواتین نے یہ مقدمہ ان کے سامنے پیش کرنا چاہا جس پر انہوں نے جواب دیا تھا ''یہ رموز مملکت ہیں آپ انہیں نہیں سمجھ سکتیں'' (صفحہ ۱۳۱-۱۳۲) یحییٰ خان نے جن تین سو تیرہ افسروں کو بر طرف کیا تھا عدالت نے برسوں بعد انہیں بحال کر دیا۔ ضیاء الحق نے ایک ڈکٹیٹر کے احکام کو تحفظ دینے کے لئے دستور میں ترمیم کر دی۔ ایک متاثر (سید سعید جعفری) ضیاء الحق سے ملنے گئے ''انہوں نے بڑے اخلاق کا مظاہرہ کیا صبر سے سعید بھائی کی باتیں سنیں پھر کہنے لگے ''اب تمام دروازے بند ہو چکے ہیں''۔ سعید بھائی نے کہا ''ابھی اللہ کی عدالت کا دروازہ کھلا ہے جو کبھی بند نہیں ہوتا اب انصاف وہیں ہوگا'' (صفحہ ۳۱۲)

''جو رہی سو بے خبری رہی'' صہبا لکھنوی کی فرمائش پر لکھی گئی اور افکار میں قسط وار چھپی محترمہ ادا جعفری نے قسط وار لکھنے کی بڑی خوب صورت توجیح کی ہے کہ ''بھولی بسری یادوں سے تھم تھم کر گزرنے کے لئے وقت بھی بہت چاہئے'' (صفحہ ۲۲۱) صہبا صاحب کا ذکر آ گیا تو بات یاد آئی جملہ معترضہ کے طور پر لکھتا ہوں کہ جوش صاحب کی رباعی کا ذکر تھا کہ ''افسوس شراب پی رہا ہوں تنہا۔ غلطاں بہ سبو تمام خونِ فن ہا۔ ٹھٹھری ہوئی ساغر میں نظر آتی ہے 'صہبا رضی اللہ تعالیٰ عنہا'' ۔ میرے منہ سے نکلا'' صہبا رضی اللہ تعالیٰ عنہا'' تو صہبا صاحب کی ''تاریخ'' لگتی ہے۔ جن لوگوں نے صہبا صاحب کو دیکھ رکھا تھا کہ اردو شاعری کے روایتی عاشقوں کی طرح نحیف و نزار ہیں اور کمزور ایسے کہ پھونک سے اڑ جائیں وہ اس بات پر سر دھننے لگے۔ بات ہونٹوں نکلی کوٹھوں چڑھی۔ برسوں بعد پچھلے برس کسی نے ٹورنٹو میں مجھ سے کہا'' سنا ہے آپ کہتے ہیں یہ صہبا صاحب کی تاریخ ہے اس مصرعہ سے تو ان کا سن وفات نہیں نکلتا''۔ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔

یہ خودنوشت اپنے شاعرانہ انداز بیان کی وجہ سے بھی منفرد ہے شاعرہ ادا جعفری نے اس اداس اور تنہا لڑکی کا پیچھا نہیں چھوڑا (صفحہ ۲۴۸) بلکہ ادا جعفری کے لفظوں میں عمر بھر اس کا ساتھ دیا ہے۔

◎

شہاب نامہ

''شہاب نامہ'' قدرت اللہ شہاب کی سوانح عمری نہیں مگر عام لوگ اسے ان کی خودنوشت سوانح عمری سمجھتے ہیں۔ اس میں ان کے لفظوں میں ''جن واقعات مشاہدات اور تجربات نے انہیں متاثر کیا'' ان کا بے کم و کاست بیان ہے۔ میں نے اسے خودنوشت کے زمرہ سے دو وجہ سے خارج کیا ہے۔ اول یہ کہ اس میں شہاب صاحب کی سوانح حیات کے بنیادی نکات سامنے نہیں آتے مثلاً سوانح حیات میں زندگی کے حالات و کوائف کا بیان کم از کم ضروری ہوتا ہے شہاب صاحب نے انہیں بصیغہ راز ہی رکھا ہے' دوسرے اس کا انداز شروع ہی سے افسانوی ہے اس لئے اسے فکشن اور فیکٹ کا مجموعہ فیکشن قرار دیا جا سکتا ہے۔ انتظار حسین نے لکھا ہے کہ جمیلہ ہاشمی کے ہاں شہاب صاحب نے شہاب نامہ کو ناول کہہ کر سنایا تھا۔ ہمارے ہاں میمائرز کے لئے یادداشتوں کا لفظ مروج ہے مگر یہ لفظ اس ہمہ گیریت کا جامع نہیں جو میمائرز کے لفظ میں مضمر ہے۔ میمائرز لکھنے والے کی شخصیت کو اتنا ہمہ گیر ہونا چاہئے کہ اس نے تاریخ کو خود اپنی آنکھوں کے سامنے وقوع اور تشکیل پذیر ہوتے دیکھا ہو اور اس میں اتنا حوصلہ ہو کہ وہ ایک کنارے پر کھڑا ہو کر ان واقعات کو صحیح تناظر میں بیان کر سکے۔ شہاب صاحب اپنی اعلیٰ ملازمت کے دور میں پاکستان کی تاریخ کے کئی اہم واقعات کے گواہ ہیں اور انہوں نے ان واقعات کو اپنے سامنے رونما ہوتے ہوئے دیکھا ہے مگر ان کی کتاب پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں تاریخ دیکھنے کا موقع تو ملا تاریخ کو روایت کرنے کا حوصلہ ودیعت نہیں ہوا۔ تاریخ تو تعصب سے مبرا ہوتی ہے۔ میمائرز میں لکھنے والے کی ذات علیحدہ ہوتی ہے الگ نہیں ہوتی اسی طرح اس کی اپنی نفرتیں محبتیں وارداتیں سب ایک مناسب فاصلہ پر علیحدہ رکھی رہتی ہیں تاریخ میں ملوث نہیں ہوتیں۔ شہاب نامہ کا مصنف تو اپنی نفرتوں اور تعصبات میں ملوث ہی نہیں لتھڑا ہوا ہے۔ یہ بات شہاب نامہ کو میمائرز کے زمرہ میں بھی بہت کمزور کر دیتی ہے۔

قدرت اللہ شہاب اپنی سول سروس کی ملازمت کے دوران اتفاق سے ایسے عہدوں پر فائز
رہے جن عہدوں کو بااقتدار عہدے قرار دیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں سیاسی حالات اگر معمول کی ڈگر پر
چلتے رہتے تو کوئی بات نہ تھی مگر ابتدا ہی سے ہمارے ملک میں افراتفری اور طوائف الملوکی نے اپنے
قدم جما لئے اس لئے بقول قدرت اللہ شہاب جب انہوں نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا یا بقول خود
اپنے ماتھے کے کلنک کے ٹیکے دھونے کی سعی کرنا چاہی تو انہیں معلوم ہوا کہ لوگ ان کی باتیں سننے کے
خواہشمند ہیں۔ اس بات نے ان کا حوصلہ بڑھایا اور انہوں نے نمک مرچ لگا کر وہ حقائق کرداروں کا
نام بدلے بغیر افسانوی انداز میں بیان کرنا شروع کر دیئے کبھی دائرے کی تقریب میں، کبھی حلقہء
ارباب ذوق میں کبھی نیپا میں غرض وہ داستان جو شہاب نامہ کی صورت میں مرتب ہوئی وہ کتابی صورت
میں چھپنے سے پہلے ہی مقبول ہو چکی تھی اور لوگ اس انتظار میں چشم براہ تھے کہ دیکھیں ایک محرمِ رازِ
درونِ میخانہ کیا کہتا ہے۔

شہاب صاحب کو شکوہ ہے کہ حفیظ جالندھری نے یہ کیوں کہا کہ جب کہیں انقلاب ہوتا ہے۔
قدرت اللہ شہاب ہوتا ہے۔ یا یہ کہ سید محمد جعفری نے یہ بات کیوں عام کر دی کہ "یہ سوال و جواب کیا
کہنا۔ صدرِ عالی جناب کیا کہنا۔ کیا لکھایا ہے کیا پڑھایا ہے۔ قدرت اللہ شہاب کیا کہنا"۔ شہاب
صاحب کا خیال ہے سید محمد جعفری کی شہرت کی وجہ سے یہ اشعار زبان زد عام ہو گئے مگر وہ یہ بھول گئے کہ
باتیں بے پر کی باتیں نہیں تھیں ان کی ٹھوس بنیاد تھی۔

شہاب صاحب نے تاریخی حقائق کے ساتھ ان "بے بنیاد باتوں" کی تردید کی کوشش کی ہے اور
اپنی صفائی پیش کی ہے۔ اس سے بھی زیادہ عجیب بات ہے کہ خود شہاب صاحب نے ایک سے زیادہ مرتبہ
ایسی باتیں کی ہیں اور دوسروں پر بے بنیاد الزامات لگانے میں کوئی باک محسوس نہیں کیا۔ حالانکہ ان کی
باتوں کو تاریخ کے حوالہ سے جھٹلایا جا سکتا ہے۔ محترمہ ادا جعفری بدایونی نے اپنی سرگزشت "جو رہی سو بے
خبری رہی" میں بھی ان کی ایسی باتوں کا برا مانا ہے اور ایک خاص واقعہ کا حوالہ دے کر ان کی فسانہ طرازی
کی تردید کی ہے اور اپنی مہذب زبان میں صرف یہ لکھا ہے کہ "اس سے زیادہ ہوا تھا نہ اس سے کم"۔

ایک اور مثال۔ لکھتے ہیں "مہاراجہ پرتاپ سنگھ بے اولاد تھا اس نے اپنی برادری کا ایک لڑکا

منتخب کر کے متبنیٰ بنا رکھا تھا لیکن ہری سنگھ کے باپ راجہ امر سنگھ کو یہ بات گوارا نہ ہوئی کیونکہ وہ اپنے بیٹے
کو ریاست کا وارث بنانا چاہتا تھا اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے اس نے ریاست کے طول و
عرض میں سازشوں کا جال بچھا دیا اس ساز باز میں راجہ امر سنگھ کو حکیم نوردین سے بڑی مدد ملی۔ حکیم نور
دین مہاراجہ رنبیر سنگھ کے زمانہ سے ریاست کا شاہی طبیب تھا" (صفحہ ۳۵۸)۔ شہاب صاحب اس
بات کو بھول گئے کہ وہ لکھ چکے ہیں کشمیر کے مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے ساتھ ان کے والد ماجد کے بڑے
اچھے مراسم تھے ان کی وفات پر ہری سنگھ گدی پر بیٹھا تو اس سے ان بن ہو گئی سینتالیس کی عمر میں عبداللہ
صاحب نے ملازمت سے سبک دوشی حاصل کر لی (صفحہ ۱۱۰) چونکہ راجہ امر سنگھ اپنے بیٹے کو گدی پر
بٹھانے کی "سازش" میں کامیاب ہو گیا اور ہری سنگھ سے عبداللہ صاحب کی نہ بنی تو سارا ملبہ حکیم نور
دین پر گرا دیا شہاب صاحب نے ملبہ دوسروں پر ڈالنے کا کام ایک سے زیادہ مرتبہ کیا ہے۔ اب تاریخی
لحاظ سے اس کا جائزہ لیجئے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ ۱۸۵۷ء سے ۱۸۸۵ء تک تخت پر تھا۔ حکیم نوردین وہاں
سے رخصت ہو کر ۱۸۸۳ء میں اپنے وطن بھیرہ چلے گئے۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ ۱۸۸۵ء میں مہاراجہ بنا
اور ۱۹۲۵ء تک ریاست کا حکمران رہا۔ ہری سنگھ حکیم صاحب کے قیام کشمیر کے زمانہ میں ابھی پیدا بھی
نہیں ہوا تھا۔ وہ ان کے کشمیر سے چلے جانے کے دو برس بعد پیدا ہوا۔ اور ۱۹۲۵ء میں تخت پر بیٹھا۔ ان
حقائق کے ہوتے ہوئے حکیم نوردین کو ہری سنگھ کی تخت نشینی کی سازش میں وہی شخص شریک قرار دے
سکتا ہے جسے حقائق سے آنکھیں بند کرنے میں ید طولیٰ حاصل ہو۔ شہاب صاحب چونکہ حکیم نورالدین
جیسے ولی اللہ سے عقیدہ کا اختلاف رکھتے تھے اس لئے آپ نے تمام حقائق کو پس پشت ڈال دیا۔ ضمناً
یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اس بات کا شہاب صاحب کی سوانح سے کوئی تعلق نہیں سوائے اس کے کہ
شہاب صاحب ہری سنگھ کے زمانہ میں کشمیر میں پیدا ہوئے تھے۔ میں نے اس مضمون کے آغاز میں لکھا
تھا کہ بیسویں صدی میں لکھنے والا بے سروپا باتیں لکھنے میں آزاد نہیں کہ اب حقائق کی جانچ پرکھ بھی ہو
سکتی ہے۔ میں نے جب شہاب نامہ کا یہ حصہ دیکھا تو جستجو ہوئی کہ حقائق معلوم کروں کیونکہ میرے دادا
حکیم نورالدین کے ہاتھ پر بیعت تھے اور انہیں اپنا مرشد سمجھتے تھے۔ حکیم نورالدین صاحب مرقاۃ الیقین
کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شہاب صاحب عقیدہ کے اختلاف میں اتنی دور تک

جاسکتے ہیں کہ کھلی حقیقتوں کو جھٹلا بیٹھیں۔ شہاب صاحب کے مرتبہ کے لوگوں کی باتوں پر عام لوگ یقین کر لیتے ہیں انہیں کیا علم ہے کہ اعلیٰ مراتب تک پہنچ جانے کے باوجود بھی بعض لوگوں میں تعصب کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں۔ شہاب نامہ اس کی عبرت انگیز مثال ہے۔

کشمیر ہی کے سلسلہ میں لکھتے ہیں: ''۵۲ جولائی ۱۹۳۱ء کو شملہ میں فیئر ویو نامی کوٹھی میں ایک میٹنگ کے نتیجہ میں آل انڈیا کشمیر کمیٹی قائم کی گئی۔ اس میٹنگ میں جو حضرات شامل ہوئے ان میں علامہ اقبال، نواب سر ذوالفقار علی خان، خواجہ حسن نظامی، نواب کنج پورہ، نواب باغپت، سید محسن شاہ، خان بہادر رحیم بخش، عبدالرحیم درد، سید حبیب، اسمٰعیل غزنوی، صاحبزادہ عبداللطیف اور اے آر ساغر کے نام سر فہرست تھے بدقسمتی سے صدارت مرزا بشیر الدین محمود احمد نے کر ڈالی اور آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے صدر بھی وہی بن بیٹھے'' (صفحہ ۳۶۰)۔ میرا یہ منصب نہیں کہ میں اس بات کی تردید یا تائید کروں۔ عبدالمجید سالک ایڈیٹر روزنامہ انقلاب اس کمیٹی کی رپورٹ دیتے ہیں: ''شملہ میں مقتدر اور نمائندہ مسلمانوں کا ایک اجلاس ہوا جس میں جموں اور کشمیر کے بعض معززین بھی شریک ہوئے یہاں آل انڈیا کشمیر کمیٹی قائم کی گئی جس کے صدر مرزا بشیر الدین محمود احمد امام جماعت احمدیہ منتخب کئے گئے'' (سرگزشت صفحہ ۲۷۱)۔ ''بن بیٹھے'' اور ''منتخب کئے گئے'' میں جو فرق ہے وہ ناطق ہے۔

شہاب صاحب نے اس پر اس لئے کان نہیں دھرا کہ انہیں کشمیر کمیٹی کے منتخب ہونے والے صدر سے عقیدہ کا اختلاف تھا۔ اس صدر کا نام علامہ اقبال نے پیش کیا تھا اور تمام حاضرین نے متفقہ طور پر مرزا صاحب سے استدعا کی تھی کہ وہ صدارت کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ پھر شہاب صاحب کا بیان: ''آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی آڑ میں (احمدی رہنما) کی چالبازیاں دیکھ کر علامہ اقبال نے شملہ والی کشمیر کمیٹی سے علیحدگی کا اعلان کر دیا'' (صفحہ ۳۷۰) اس بارہ میں پھر راوی سالک صاحب ہیں ''جب احرار نے احمدیوں کے خلاف بلا ضرورت ہنگامہ آرائی شروع کر دی اور کشمیر تحریک کے مخالف عناصر کی ہم مقصدی اور ہم کاری کی وجہ سے جو قوت پیدا ہوئی تھی اس میں رخنے پڑ گئے تو مرزا بشیر الدین محمود احمد نے کشمیر کمیٹی کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور ڈاکٹر اقبال اس کے صدر مقرر ہوئے'' (سرگزشت صفحہ ۳۱۵)۔ اب قاری اس مخمصہ میں ہے کہ وہ ہم عصر اور معتبر صحافی عبدالمجید سالک کی بات مانے جو

ان تمام باتوں کا چشم دید گواہ تھا یا اس شخص کی جو اس وقت کھیل کود کی عمر سے گذر رہا تھا اور اب نوکر شاہی کا اہم ستون ہے اور اپنے عہدے کے بل بوتے پر سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کہہ رہا ہے۔ جنوں کا نام خرد رکھ دیا خرد کا جنوں۔ جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے۔ شہاب صاحب نے خود ہی تو لکھا ہے ''تاریخ کی سرچ لائٹ بڑی بے رحم ہوتی ہے''۔ حیران ہوں کہ ان کی یہ باتیں تاریخ کی سرچ لائٹ سے کیسے بچ سکیں گی؟

بااین ہمہ شہاب نامہ ہماری تاریخ کا ایسا ریکارڈ ہے جس کا لکھنا شہاب صاحب ہی کو سزاوار تھا کہ وہ ان میں بیشتر واقعات کے عینی گواہ تھے۔ یہ درست ہے کہ جن واقعات کے وہ چشم دید گواہ تھے اگر وہ ٹھیک روایت ہوئے ہیں تو ان میں پڑھنے والوں کے لئے دلچسپی اور عبرت دونوں کا وافر سامان موجود ہے۔ اگرچہ ایوانِ صدر کے ایک اور ملازم جناب محمد بشیر خالد (پی اے ٹو دی پریزیڈنٹ) نے اپنی کتاب ''ایوان صدر میں سولہ سال'' میں شہاب صاحب کی بعض باتوں کو درست قرار نہیں دیا۔ اب یہ فیصلہ کون کرے کہ کون ٹھیک کہہ رہا ہے کون غلط؟ دونوں ایوان صدر کے اندر کے آدمی تھے۔

نیشنل پریس ٹرسٹ والے باب میں شہاب صاحب نے پروگریسو پیپرز لمیٹڈ پر سرکاری قبضہ کا ذکر بڑے ڈرامائی انداز میں کیا ہے ''۱۷ اپریل ۱۹۵۹ء کی تاریخ تھی میں آرام سے سو رہا تھا کہ رات کے ساڑھے بارہ بجے میرے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ بریگیڈیر ایف آر خان فون پر بول رہے تھے انہوں نے فرمایا کہ اگلی صبح میں کراچی ایرپورٹ پر پہنچ جاؤں کیونکہ ہم نے پہلے جہاز سے لاہور کے لئے روانہ ہونا ہے۔ میں نے کہا میں صدر ایوب کی اجازت کے بغیر کیسے کراچی چھوڑ سکتا ہوں؟ علی الصبح جہاز کی روانگی سے قبل ان کی اجازت کیسے حاصل کروں گا؟'' میں پریزیڈنٹ ہاؤس ہی سے بول رہا ہوں'' بریگیڈیر صاحب نے کہا ''صدر صاحب ابھی ایک اہم میٹنگ سے فارغ ہو کر اپنے بیڈروم میں چلے گئے ہیں انہوں نے ہمیں اجازت دے دی ہے کہ ہم تمہیں اپنے ساتھ لاہور لے جائیں''۔

''کس کام کے لئے''؟ میں نے پوچھا

بریگیڈیر ایف آر خان نے کہا اس سوال کا جواب وہ ٹیلیفون پر نہیں دے سکتے۔ اگلی صبح ہوائی اڈہ پر پہنچا تو بریگیڈیر ایف آر خان لاہور جانے کے لئے ہوائی اڈہ پر موجود تھے۔ روانگی سے پہلے اور جہاز

کے سفر کے دوران میں نے کئی بار کام کی نوعیت کے بارہ میں پوچھا لیکن کوئی ٹھیک جواب نہ مل سکا۔ ۔۔۔ پردہ پوشی اور رازداری اور سکوت کی یہ فضا میرے لئے بڑا پراسرار معمہ بنی ہوئی تھی۔۔۔۔شام کے چار بجے بریگیڈیر ایف آر خان نے نہایت رازداری سے سرگوشیوں میں مجھے بتایا کہ آج رات اچانک چھاپہ مار کر میاں افتخار الدین کی پروگریسو پیپرز لمیٹڈ پر قبضہ کرنے کے انتظامات مکمل کر لئے گئے ہیں'' (صفحہ ۸۲۵۔۸۲۶) اس سارے بیان کا مقصد یہ ہے کہ شہاب صاحب قاری کو یہ باور کروانا چاہتے ہیں کہ انہیں پروگریسو پیپرز لمیٹڈ پر قبضہ کی اطلاع ۱۸ اپریل ۱۹۵۹ء کو شام کے چار بجے ہوئی۔

حال ہی میں حکومت پاکستان کے ایک نیک نام اور پڑھے لکھے افسر ڈاکٹر آفتاب احمد خان کے شخصی خاکوں کا مجموعہ ''بیادِ صحبتِ نازک خیالاں'' دانیال والوں کی طرف سے کراچی سے شائع ہوا ہے۔اس کا ایک حوالہ معنیٰ نگر ہے۔آفتاب صاحب کرنل مجید ملک کے بیان میں لکھتے ہیں: ''اپریل ۱۹۵۹ء کی ایک دوپہر کو میرے دروازے پر دستک ہوئی میں نے دروازہ کھولا تو مجید صاحب کا سٹاف ڈرائیور کھڑا تھا اور کہہ رہا تھا آپ کو صاحب نے دفتر میں یاد کیا ہے۔اس سے پہلے مجید صاحب نے کبھی مجھے دفتر میں نہیں بلوایا تھا مجھے حیرت ہوئی کہ نامعلوم معاملہ کیا ہے۔ میں جب وہاں پہنچا تو مجید صاحب اس وقت اپنے کمرے میں ٹہل رہے تھے مجھے انہوں نے بیٹھنے کو کہا پھر کمرے کے دروازے بند کر دئے اور میرے قریب آ کر بیٹھ گئے۔اس کے بعد انہوں نے نہایت سنجیدہ لہجے میں مجھ سے کہا ایک ایسا واقعہ ہونے والا ہے جس کا میرے دل پر بہت بوجھ ہے تم سے اس کا ذکر کرنا چاہتا ہوں تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم اس کا ذکر کسی سے نہیں کرو گے حتیٰ کہ اپنی آمنہ باجی سے بھی نہیں۔(آمنہ باجی' مجید ملک کی بیگم تھیں اور آفتاب صاحب کو اپنے عزیزوں کی طرح عزیز رکھتی تھیں)۔میں نے یہ وعدہ کر لیا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ پروگریسو پیپرز لمیٹڈ یعنی پاکستان ٹائمز امروز او ہفت روزہ لیل و نہار کو اپنے قبضہ میں لے لیا جائے اور یہ کہ اس سلسلہ میں آج شام کی گاڑی سے لاہور جا رہے ہیں۔مجید صاحب نے کہا میں نے اپنے طور پر اس کی بہت مخالفت کی مگر میری رائے سے کسی نے اتفاق نہیں کیا۔یہ کہتے ہوئے انہوں نے ایک فائل میری طرف بڑھا دی اور وہ نوٹ پڑھوایا۔جس میں انہوں نے اپنی مخالفانہ رائے قلمبند کی ہوئی تھی۔ میں نے کہا کہ مجید بھائی سرکار میں آپ کے کچھ دوست بھی ہیں آپ نے ان سے بات نہیں کی؟ کہنے لگے ''میں نے قدرت اللہ شہاب سے بات کی تھی

اور اس قوی امید کے ساتھ کہ وہ اس سلسلہ میں میری ہم نوائی کریں گے۔آخر انہوں نے رائٹرز گلڈ وغیرہ قائم کی ہے مگر شہاب نے یہ کہہ کر مجھے ٹال دیا کہ ملک صاحب یہ مارشل لا حکومت کا فیصلہ ہے آپ اور میں اس میں کیا کر سکتے ہیں؟ سوائے اس کے کہ جو کام ہمیں سونپا جائے اسے پورا کریں۔ مجید صاحب نے کہا میں یہ جواب سن کر بہت مایوس ہوا اور آخر میں نے یہ نوٹ لکھنے کا فیصلہ کیا اس کے سوا میرے پاس اور کیا چارہ ءکار تھا۔اس موقع پر مجھے لاہور میں موجود رہنے کا حکم دیا گیا ہے سب متعلقہ لوگ بھی قدرت اللہ شہاب سمیت وہاں موجود ہوں گے'' (صفحہ ۱۵۶۔۱۵۷) ڈاکٹر آفتاب احمد خان صاحب کے اس بیان سے شہاب صاحب کے ڈرامائی بیان کی قلعی کھل جاتی ہے۔ ہیں ستارے کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا۔

شہاب نامہ میں ایوان صدر کے اندر کی باتیں بہت بیان ہوئی ہیں۔قاری یہ بھی دیکھتا ہے کہ ملک کا صدر آئین کو ردی کاغذ trash کہتا ہے اور پھر جب اسے منسوخ کر دیتا ہے تو اس کی چھاؤں سے محروم ہو کر در بدر پھرتا بھی ہے۔

صدر ایوب کا زمانہ چونکہ مصنف شہاب نامہ کا طویل ترین دور اقتدار تھا اس لئے ان کی شخصیت کے بارہ میں قاری کو بہت کچھ معلوم ہوتا ہے اور ان کے بارہ میں شہاب صاحب نے بے رحمی کا مظاہرہ بھی نہیں کیا اگرچہ انہیں معاف بھی نہیں کیا۔ جہاں صدر ایوب نے مصنف کو آٹھ مربعے پیش کئے ہیں وہیں مصنف نے ایک فقرہ صدر کی کردار کشی میں لکھ ڈالا ہے کہ ''وہ خود زمینوں کا بہت شوق رکھتے تھے''۔مگر ان کے شوق کی کوئی مثال نہیں دی۔جس موقع پر شہاب صاحب نے یہ فقرہ لکھا ہے وہ موقع ہرگز اس بات کے کرنے کا نہیں تھا۔ورنہ بچارے غلام محمد اور یحییٰ خاں تو ان کی نفرت کی زد پر رہے۔وہ مثالی بیوروکریٹ ہونے کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر ایسی باتیں کر جاتے ہیں جو کوئی بیوروکریٹ نہیں کیا کرتا۔وہ جب چاہتے ہیں بیوروکریٹ بن جاتے ہیں جب چاہتے ہیں تلوار ہاتھ میں لے کر ''مخالف'' پر پل پڑتے ہیں۔

شہاب نامہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ اچھا بیوروکریٹ بننے کے لئے چند اصولی شرائط لازمی ہیں مگر وہ ان شرائط میں یہ شرط لکھنا بھول گئے کہ اچھا بیوروکریٹ اچھا انسان بھی ہوتا ہے، عدل و

انصاف اس کا زیور اور بلاخوفِ لومۃِ لائم سچ کہنا اس کا فرض ہوتا ہے۔ شہاب نامہ پڑھنے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے جیسے شہاب صاحب کے علاوہ جتنے لوگ کاروبارِ حکومت میں شریک تھے وہ سارے کے سارے اچھے بیوروکریٹ کے اوصاف سے عاری تھے صرف ان کی ذات ہی تمام خوبیوں کا سرچشمہ اور منبع تھی۔ یہ کتاب ایک نیک، خوآدمی کی انا پرستی کا نادر نمونہ ہے۔ وہ منکسرالمزاج آدمی ہیں مگر تعصب میں ان کی صفت انکسار مغلوب ہو جاتی ہے۔ وہ عدل کرنا چاہتے ہیں مگر ان کی میزان ایک طرف جھکی ہوئی ہے۔

شہاب نامہ ایک ایسے انسان کی سرگزشت ہے جو اپنی ذات میں دیندار مخلص مسلمان مذہبی اقدار کا پاس لحاظ رکھنے والا ہے۔ خاکِ مدینہ کو آنکھوں کا سرمہ بنانے والا اور درود شریف کو زندگی بھر کا وظیفہ بنانے والا ہے مگر ساتھ کے ساتھ پرلے درجہ کا توہم پرست اور ضعیف الاعتقاد بھی ہے۔ کنگ کی ۱۸ سول لائنز کی کوٹھی (صفحہ ۲۴۸) کے واقعات ان کے توہم پرست ذہن کے غماز ہیں۔ شہاب صاحب اپنے نفس کو سزا دینے کے لئے اپنے سر پر جوتے مارنے کا علاج بچپن سے کرتے آئے ہیں (صفحہ ۱۵۰) بلکہ بہت بڑے ہو جانے کے باوجود ان کی یہ بچگانہ عادت قائم رہی۔ روم کے ہوائی اڈہ پر فلسطین کے خفیہ مشن پر روانہ ہوتے وقت ''میں نے اپنے پاؤں کا جوتا کھولا اور اسے ہاتھ میں لے کر سات آٹھ بار اپنے سر پر زور زور سے مارا غالباً اس جھاڑ پھونک سے خوف و ہراس اور کمزوری اور بزدلی کے بھوت کا سایہ اتر گیا'' (صفحہ ۱۱۲۱)۔ اس عمل سے ان کی جو نفسیاتی پرتیں واضح ہوتی ہیں ان کا تجزیہ کرنا ماہرِ نفسیات کا کام ہے اور کسی وقت کوئی نفسیات داں ضرور ایسا پیدا ہوگا جو اس امر پر روشنی ڈالے گا۔ اب تک تو شہاب صاحب کی افسرانہ حیثیت کا اتنا دباؤ ہے کہ لوگ ان کی ہر بات کو بلاچون و چرا، درست تسلیم کرتے چلے جاتے ہیں۔

شہاب صاحب نے سفارت کے موضوع پر پورا ایک مقالہ قلمبند کیا ہے۔ ظاہر ہے شہاب صاحب ایک اچھے سفیر بھی تھے ''یہ عجیب و غریب مخلوق ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے نظر آتی ہے۔ ان سب کی وضع قطع تراش خراش چال ڈھال لب ولہجہ اور بندھی بندھائی پٹی پٹائی اصطلاحات و تلمیحات و محاورات پر اس محدود چار دیواری کی چھاپ ہوتی ہے جسے عرفِ عام میں DIPLOMATIC

ENCLAVE کہا جاتا ہے۔۔۔ گفتگو میں وہ چھپاتے زیادہ اور بتاتے کم ہیں اور ذو معنی اور گنجلک بات کو ابہام کی سان پر چڑھانا ان کا خاص طرہ امتیاز ہے۔۔۔ کہا جاتا ہے کہ سفارت کاری کا فن یونانی علم الاصنام کے ایک دیوتا HEMES کے زیر سایہ جنم لے کر پروان چڑھا اور یہ نہایت دلچسپ اور معنیٰ خیز اتفاق ہے کہ یونانی دیومالا میں اسی نام کے ایک دیوتا کو بیک وقت جھوٹوں، اٹھائی گیروں، آوارہ گردوں اور لچوں لفنگوں کا سرپرست بھی مانا جاتا ہے'' (صفحہ ۱۰۲۵)

شہاب نامہ اپنے انداز بیان الف لیلوی واقعات افسانوی تجسس انگیزی اور اپنی رواں دواں اور شگفتہ زبان کی وجہ سے ادب میں مدتوں یاد رکھا جائے گا اور اگر تاریخ کی بے رحم سرچ لائٹ نے ان کے بیان کردہ ''حقائق'' کا پردہ چاک نہ کر دیا تو اس کی تاریخی حیثیت بھی برقرار رہے گی مگر خدا معلوم شہاب صاحب نے جوش صاحب کے بے مثال انداز بیان کو اپنانے کی بھونڈی کوشش کیوں کی ہے؟'' ان بچاری میموں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ ان کی زلفوں، پیشانیوں، بھوؤں، آنکھوں، گالوں، ہونٹوں، دانتوں، ٹھوڑیوں، گردنوں، سینوں، بازوؤں، انگلیوں، ناخنوں، کمروں، کولہوؤں، پنڈلیوں، اور ایڑیوں کو فصاحت و بلاغت کے مبالغوں میں بھگو بھگو کر عجیب و غریب تشبیہوں اور استعاروں اور تلمیحوں کے سانچے میں ڈھالا جائے گا'' (صفحہ ۲۰۹)

شہاب نامہ کا ایک پہلو اور ہے جو قابلِ غور ہے کہ شہاب صاحب نے بقول خود ''خود احتسابی کی کدال سے اپنا اندر باہر کرید کرید کر'' یہ باتیں لکھی ہیں (صفحہ ۱۰) اور ''رنجشوں، کدورتوں، اور تنازعوں کو ہمیشہ عارضی اور دوستیوں محبتوں کو دائمی جانا ہے'' (صفحہ ۱۱) ان کے والد ماجد نے انہیں نصیحت کی تھی کہ '' کسی کی پیٹھ پیچھے وہی بات کہو جو اس کے منہ پر بھی کہہ سکو'' (صفحہ ۱۴۵) شہاب صاحب نے اس بات کو پوری طرح نبھایا تو نہیں مگر ''ایک حد تک انہیں اس پر عمل کی توفیق نصیب ہوتی رہی'' (صفحہ ۱۱) اور پھر شہاب صاحب کا کہنا ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد ہر سرکاری ملازم کو حق حاصل ہے کہ وطن کے دفاع اور سلامتی کے state secrets کو فاش کئے بغیر وہ اپنے مشاہدات اور تجربات کو آزادی سے بیان کرے۔۔۔ میں نے اس موقف کو اپنا کر یہ کتاب لکھی ہے دنیا بھر میں یہی چلن رائج ہے'' (صفحہ ۱۸)۔

خودنوشت سوانح یا میمائرز لکھنے والوں کو زمانے نے یہ حق ضرور دیا ہے کہ وہ اپنے تجربات اور

مشاہدات کو بیان کریں مگر یہ حق کسی نے نہیں دیا اور نہ ہی اس کا رواج ہے کہ وہ اپنی نفرتوں اور کدورتوں کو عام کریں۔ پھر تنقیدی اجازتیں ایک طرف رکھ دیں تو بھی یہ بات نامناسب لگتی ہے۔ شہاب صاحب اول و آخر ایک مسلمان ہیں اور اچھے مسلمان ہیں مگر انہیں اس بات کا خیال نہ آیا کہ اسلامی علم کلام میں وفیات کے باب میں بنیاد ہی اُذکرُوا مَوتکُم بِالخَیر پر رکھی گئی ہے کہ مرنے والوں کو اچھے لفظوں میں یاد کیا کرو۔ شہاب صاحب نے یہاں بھی اپنی روایتی بیوروکریٹ کی ٹوپی سر پر رکھ لینے کا عمل روا رکھا ہے۔ پی۔ جی وڈہاؤس کی یہ بات انہیں بہت پسند ہے کہ ''وہ زبان پر اس قدر حاوی رہتا ہے کہ موم کی ناک کی طرح اسے جس طرح چاہے مروڑ کر اپنے بے نظیر اسلوب میں ڈھال لیتا ہے'' (صفحہ ۱۰۸) شہاب صاحب نے یہ سلوک تاریخ سے روا رکھا ہے۔ انہی کے ہم عصر خودنوشت نگار صدیق سالک نے اپنی کتاب سیلیوٹ کے دیباچہ میں لکھا ہے ''میں نے وقائع نگاری کی آڑ میں فسانہ طرازی کی ہے نہ شخصیت نگاری کے لبادے میں کسی کی کردار کشی۔ میری نظر واقعات کی صحت اور میری سماعت ضمیر کی آواز پر رہی ہے اور مجھے خودنوشت کا اس سے بہتر اسلوب معلوم نہیں'' (سیلیوٹ دیباچہ)۔

شہاب صاحب نے پتہ کی بات کہی ہے کہ ''انسان کے اندر ایک ایسی خودکار مشین نصب ہوتی ہے جو اندرونی اضطراب کے وقت اسے اپنی مرضی کی سکون آور گولیاں بنا بنا کر کھلاتی رہتی ہے'' (صفحہ ۷۱۸)۔ اس کی مثال شہاب صاحب کی انا کی گولیاں ہیں جو انہیں اندر سے مل رہی ہیں۔ مثلاً قیام پاکستان کے معاً بعد انتظامیہ کا بوجھ انہیں افسروں کو اٹھانا تھا جو انڈین سول سروس کے لوگ تھے۔ اتفاق یہ ہوا کہ شہاب صاحب کی سروس اس وقت صرف سات برس تھی اور سینئر لوگ ان سے کہیں سینئر تھے۔ ان لوگوں کے بارہ میں ان کا یہ لکھنا کس قدر مضحکہ خیز لگتا ہے کہ ''اعلیٰ سطح کے بیشتر افسر برطانوی عہد کے تربیت یافتہ تھے ان کے کمال کا جوہر بندھی بندھائی پالیسیوں پر عمل کرنے، سکونیاتی جمود کو ثبات دینے اور مروجہ روشوں کو جوں کا توں رکھنے میں مضمر تھا وہ انگریزی نظام حکومت کی لکیر کے فقیر تھے آزادی کے تقاضوں کو نئی پالیسی کے سانچے میں ڈھالنا ان کے بس کا روگ نہ تھا''۔۔۔ ''ہماری وزارت خارجہ کے بالائی افسر سب کے سب پرانی آئی سی ایس کے ممبر تھے۔۔۔ اپنے مزاج، پس منظر، رجحانات، تعصبات اور ٹریننگ کی وجہ سے یہ سب لوگ پاکستان کی خارجہ پالیسی کو بین الاقوامی تعلقات کے تنے ہوئے

رسے پر حقیقت پسندانہ مہارت سے چلانے سے قاصر تھے'' (صفحہ ۴۴۴)۔ یہ رائے دینے والا اپنے سب کے سب سینئر افسروں کو بیک قلم نااہل قرار دے رہا ہے غالباً مصنف کا مطلب ہے کہ آسمان سے فرشتے اترتے کہ وہ یہ کام سنبھالتے یا ''مصنف'' اس مرتبہ پر ہوتا تو شاید پاکستان کی خارجہ پالیسی کو بین الاقوامی تعلقات کے تنے ہوئے رسے پر چلا سکتا۔ اس سے بڑی سکون آور گولی کوئی انا پرست اور کیا کھائے گا۔ اسی قسم کی انا پرستی کا ایک نمونہ اور بھی آیا ہے کہ صدر ایوب کو ''جو اقتصادی اور معاشی امور کے مشیر یا ماہر میسر آئے وہ یا تو نہایت لائق فائق قابل اور مستعد اکاؤنٹنٹ تھے یا غیر معمولی طور پر ذہین فطین سول سرونٹ تھے جن کا خاص طرہ امتیاز یہ تھا کہ ورلڈ بنک، انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ اور دیگر بین الاقوامی اداروں کی اصطلاحات اور جارگن نہایت خوش اسلوبی سے اپنا کر اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیتے تھے''۔۔۔ ''اس طرح پاکستان کی جدید اکانومی کا طیارہ سیکنڈ کلاس پائلٹوں کے ہاتھ میں آ کر تھرڈ ریٹ پٹرول کے سہارے بلند ترین فضاؤں میں پرواز کے لئے تیار کھڑا تھا۔'' (صفحہ ۸۳۹)۔ یہاں بھی یہ خواہش پکار پکار کر کہہ رہی ہے اے کاش اس اکانومی کو چلانے کا شرف مصنف کو ملتا تو ملک کے سارے دلدر دور ہو جاتے اور پاکستان کی اکانومی کا طیارہ سیکنڈ کلاس پائیلٹوں کے ہاتھ میں نہ رہتا۔ اس کی دلیل آپ نے یہ دی ہے کہ ''یہ سب لوگ اپنی اپنی جگہ بڑے عہدیدار تھے لیکن بنیادی طور پر ان کی تعلیم یا تو محاسبوں منیموں اور جمع خرچ نویسوں کے طور پر ہوئی تھی یا وہ ڈپٹی کمشنر کمشنر اور جائینٹ سکرٹری کے مرحلوں سے بہ خیر خوبی گذر کر ملک بھر کے اقتصادی اور منصوبہ بندی کے امور پر قابض ہو گئے تھے'' (صفحہ ۸۴۷) ''قابض'' ہو گئے تھے کا لفظ یہ بتاتا ہے کہ یہ لوگ مصنف کا حق مار کر ان مراتب جلیلہ پر قابض ہو گئے تھے۔ حالانکہ کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی شہاب صاحب نے سول سروس کے دوران اپنے استحقاق سے بھی بعض اوقات بڑھ کر ترقی حاصل کی تھی ''اپنی سروس کے دوران میں نے کبھی پوسٹنگ یا ٹرانسفر کے لئے کسی قسم کی سفارش یا خوشامد سے کام نہیں لیا اس کے باوجود مجھے اچھے سے اچھا عہدہ نصیب ہوتا رہا'' (صفحہ ۱۰) اس اظہار محرومی سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ باقی لوگوں نے سفارش یا خوشامد درآمد سے یہ اعلیٰ عہدے حاصل کر لئے تھے ایسا کہنا کسی اچھے بیوروکریٹ کو کم از کم زیب نہیں دیتا۔ اور یوں بھی محرومیوں ناکامیوں کا رونا رونا خودنوشت کے اصول کے منافی ہے۔

یادوں کی برات

''یادوں کی برات'' جوش صاحب کی خودنوشت سوانح عمری ہے جسے یوسفی صاحب نے ان کی ''شہوانح عمری'' قرار دیا ہے۔ اس سے زیادہ متنازعہ خودنوشت اردو میں نہیں لکھی گئی۔ جوش صاحب کا بیان ہو اور وہ خود وہ پری وش ہوں تو اندازِ گل افشانی گفتار دیکھنے کی چیز ہے۔ جناب علی عباس جلالپوری نے اس خودنوشت کے منظرِ عام پر آنے کے کچھ عرصہ بعد اس کے نفسیاتی پہلوؤں پر سیر حاصل تبصرہ کیا تھا جس سے جوش صاحب کی شخصیت کی کئی پرتیں منکشف ہوئی تھیں۔ مگر میرا منصب اس کے نفسیاتی پہلوؤں پر تبصرہ کرنا نہیں صرف اسے خودنوشت سوانح عمری کے اصول پر جانچنا پرکھنا ہے۔

یہ خودنوشت ایک بگڑے ہوئے رئیس کی نہیں ایک بگڑے ہوئے تعلقہ دار کی کہانی ہے جس کے پردادا اپنے وقت کے بطلِ جلیل، عالم اور سخن ور تھے۔ دادا تک پہنچتے پہنچتے ان کے خاندان کی دلچسپی صرف ''عورتوں'' تک محدود ہو کر رہ گئی اور مرزا احسو نے ان کے پردادا کی نصیحت کو نظر انداز کر دیا کہ ''ان کے واسطے گاؤں گراؤں ہرگز نہ خریدے جائیں'' کیونکہ وہ کثرتِ زر کی نحوست سے واقف تھے اور یہ بات ان کو پسند نہیں تھی کہ وہ اپنے ''اخلاف کے واسطے گاؤں گراؤں یا کسی قسم کی کوئی غیر منقولہ جائیداد ایسی چھوڑ جائیں کہ ان کے اخلاف دولت وعشرت کی فراوانی کے صیدِ زبوں ہو کر رہ جائیں'' (صفحہ ۳۳۰)۔ مگر ان کے نائب مرزا احسو ان کی اولاد کے حق میں کانٹے بونے سے باز نہ آئے نتیجہ معلوم کہ کثرتِ زر کی نحوستیں اس خاندان میں در آئیں۔

یادوں کی بارات سلطنتِ اودھ اور لکھنؤ کی تہذیب کے زوال کی عبرت ناک داستان ہے۔ سلطنتیں اجڑتی ہیں تو ایسا ہی ہوتا ہے کہ اشراف ذلیل اور چھوٹے بڑے ہو جاتے ہیں کہ یہی اصول تاریخ نے بیان کیا ہے مگر جوش صاحب کے خاندان کا زوال سلطنت اودھ کے ساتھ کسی بیرونی دشمن کے ہاتھوں وقوع میں نہیں آیا خود اپنے ہاتھوں ظہور میں آیا۔ جب باپ عالم اور بیٹا جاہل ہو تو وہی حال

ہوتا ہے جو حالی نے بیان کیا کہ ''باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو۔ پھر پسر وارثِ میراثِ پدر کیوں کر ہو؟'' ''اودھ کے تمام تعلقہ داروں کی طرح دادا میاں نے بھی اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف کوئی توجہ مبذول نہیں فرمائی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرے باپ کے علاوہ ان کے تمام فرزند جاہل رہ گئے'' (صفحہ ۳۴۰) جوش صاحب تک پہنچتے پہنچتے رہی سہی وضع داری بھی گئی بھائی نے بھائی کا مال ہڑپ کرنا اپنا حق جانا اور بھائی نے ''مروت میں آ کر'' بھائی کے فرمان پر آدھی جائیداد سے دست برداری کے کاغذ پر دستخط کر دئے۔ خاندانی جائیداد اور دولت گئی تو ملازمت کی نوبت آئی مگر ملازمت میں بھی یادوں کی بارات کے مصنف کی انا قائم رہی اور حیدر آباد سے نکالے گئے۔ جوش صاحب نے جو اسباب بیان کئے ہیں وہ اور ہیں مگر کام میں کوتاہی اور فرائضِ منصبی کی بجا آوری میں تساہل کا ذکر جوش صاحب نے نہیں کیا ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب نے کیا ہے۔

جوش صاحب نے علم اور مطالعہ پر بہت زور دیا ہے بلکہ ایک حد تک غلو کیا ہے وہ خود عالم بھی تھے اور زبان کے دھنی۔ ان کے شعروں کا رنگ بھی وہ ہے کہ عام قاری لغت دیکھے بغیر اسے سمجھ ہی نہیں سکتا یوں لگتا ہے اپنے قاری کو حریف جان کر اسے اپنے ہی لفظوں میں ''ذلیل شکست دینے پر تل گئے ہیں''۔ یادوں کی بارات کا ذخیرہ بھی بے پناہ ہے زبان پر انہیں وہ قدرت حاصل ہے کہ ایک ایک لفظ کے دس بیس مرادفات بلا تکلف لکھتے چلے جاتے ہیں ''اس بات کی لگن لگ گئی کہ علت العلل کا سراغ لگاؤں، ذات و صفات کے تمام مسائل کو الٹوں، پلٹوں، پگھلاؤں، کھرچوں، کریدوں، ناپوں، تولوں، جانچوں، پرکھوں، ٹھونکوں، بجاؤں، کوٹوں، چھانوں، پھٹکوں، اساؤں، چھوؤں، چکھوں، سونگھوں بلواؤں، سنوں اور دیکھوں''۔ (صفحہ ۱۷) بس یہی انداز ساری کتاب میں جاری وساری ہے۔

یادوں کی بارات جوش صاحب کی شخصیت پر پوری طرح حاوی ہے اور مصنف نے کہیں اپنی کسی علت کو یا اپنے کسی فعل کو چھپانے کی کوشش نہیں کی کہ انہیں یہی بتایا گیا تھا کہ اچھا خودنوشت سوانح نگار وہی ہے جو ہر چیز بے کم وکاست بیان کر دیتا ہے۔ جوش صاحب نے ایسا کرنے کے جوش میں سب کچھ کہہ دیا وہ جو گفتنی تھا اور وہ بھی جو گفتنی نہیں تھا۔ ان کے ہاں خوفِ فسادِ خلق سے کوئی سخنِ گفتنی ناگفتہ نہیں رہا۔ مگر اس کا ایک نقصان یہ ہوا کہ جوش صاحب کے احباب کے بے محابہ تذکرے سے ان کی

شخصیت کی جو مجموعی تصویر مرتب ہوئی وہ ایک عیش کوش محروم اور ناسٹالجیا کے مارے ہوئے ماضی پرست انسان کی نکلی جس میں اپنے زورِ بازو سے کوئی شے پیدا کرنے کا حوصلہ نہ ہو۔ اپنے داماد کے بارہ میں ان کا کہنا ہے کہ ''نامِ خدا نکھٹو ہیں'' اور ''خوش فکر اور صاحبِ فکر انسان ہونے کے باوجود (اس میں) جینے اور ابھرنے کا حوصلہ نہیں تھا اس لئے کثرتِ آرام سے بیمار ہو کر وہ بچارا بہت قبل از وقت دنیا سے سدھار گیا'' (صفحہ ۳۷۷) مگر دیکھا جائے تو جوش صاحب قبلہ کی بھی یہی تصویر بنتی ہے کہ انہیں بھی کثرتِ آرام کا عارضہ لاحق تھا اور وہ بھی سوائے اپنی انا کی پرورش کے اور کوئی کام کرنے سے عاری تھے۔

جوش صاحب کی شاعرانہ حیثیت مسلم مگر اس بات کا کیا علاج کیا جائے کہ اپنے احباب [illegible] طرح وہ فحش پسند اور بے حد غیر سنجیدہ مذاق کے انسان تھے جن کی محفل میں سنجیدگی بار نہیں پا سکتی تھی [illegible] طلوع ہوتے تو باقی ہر شے غروب ہو جاتی۔ مگر انہیں اپنے اوپر اتنا قابو ضرور تھا جس کا ذکر آل احمد سر[illegible] نے کیا ہے ''رشید جہاں رخصت ہوئیں تو جوش صاحب نے کہا لو اب مردانہ ہو گیا اور پھر وہی چہلیں اور پھکڑ شروع ہو گیا۔ سرور صاحب نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جوش صاحب جب چاہتے سنجیدہ ہو جاتے اور جب چاہتے غیر سنجیدہ ہو جاتے تھے مگر یادوں کی بارات سے تاثر ملتا ہے کہ وہ سنجیدہ ہوتے ہی نہیں تھے۔ آپ کو مولوی عبدالسلام جیسے عالم کی گفتگو میں فحش کی آمیزش ہی پسند آئی ہے۔ مولانا عبداللہ عمادی اور مولانا عبدالسلام کوئی ان کے قلم سے نہیں بچا۔ ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں۔ یہ ٹھیک ہے انسانوں کی زندگی کے بعض عریاں پہلو بھی ہوتے ہیں مگر اتنی زباندانی کے باوجود جوش صاحب کو ان پہلوؤں کے بیان کا سلیقہ نہ آیا۔ انہی کے ہمعصر حافظ مختار احمد شاہجہان پوری شاگرد امیر مینائی بھی تو تھے۔ میاں بیوی کے تعلقات زوجیت کے بیان کا موقع آیا تو زبان کا کیسا سہارا لیا ''کسی مرد کی شخصیت کو اس کی بیوی سب سے زیادہ سمجھتی ہے کیونکہ وہ اس کی برہنہ تجلیوں کی مورد ہوتی ہے''۔ کیا جوش صاحب زبان پر قادر نہیں تھے؟ تھے، مگر طبیعت میں اتنی بردباری اور مزاج میں اتنی متانت کہاں سے آتی؟ یادوں کی بارات ہمیں بتاتی ہے کہ ہمارے اتنے بڑے شاعر کے اندر اتنا چھوٹا اور غیر ثقہ آدمی بیٹھا ہؤا تھا۔

یادوں کی بارات اپنی زبان و بیان کے اعتبار سے نہایت اعلیٰ درجہ کی کتاب ہے۔ جوش

صاحب اپنے ماضی کی تصویر کشی پر جو قدرت رکھتے ہیں اب شاید ہی کوئی ایسا شخص پیدا ہو جو زبان و بیان پر ان جیسی قدرت رکھتا ہو۔ وہ واقعات جو ان کی ہوش کے زمانہ کے واقعات نہیں ان کا بیان بھی جوش صاحب نے یوں کیا ہے گویا وہ حاضر ناظر تھے۔ اپنی بسم اللہ کا حال لکھتے ہوئے انہیں اس بات کا خیال ضرور آتا ہے کہ ''اس موقعہ پر کیا کیا رسمیں ہوئیں یاد نہیں ہیں بس اسی قدر خیال ہے کہ کم عمری میں میری بسم اللہ ہوئی تھی۔ چاندی کی تھالی میں سونے کی دوات، سونے کے خول کا قلم اور قرآن میرے سامنے رکھا گیا تھا'' (صفحہ ۴۶) یہ باتیں بھی حدیثِ متواتر کے طور پر سنی ہوئی ہیں کہ چاندی کی تھالی میں سونے کا قلم تھا کم سن بچے کو یہ باتیں یاد نہیں رہتیں، جوش صاحب کے ہاں ایک سے زیادہ مرتبہ ایسی باتیں بیان ہوئی ہیں۔ اپنی مونچھوں کے کونڈوں کا ذکر کرتے ہوئے تو آپ نے اپنی ''سورۃ رحمٰن'' لکھ ڈالی ہے۔

اس کتاب میں جوش صاحب نے اپنے باپ دادا کے لئے احترام کی جو زبان استعمال کی ہے وہ تعجب انگیز نہیں ہونی چاہئے کہ یہی اس زمانہ کے شرفا کا طریق تھا اور بچے اپنے بڑوں کے لئے ایسی ہی زبان استعمال کرتے تھے اس میں جوش صاحب کا کمال نہیں ہماری تہذیب ہی یہی تھی۔ جوش صاحب نے اپنے مومن بالانسان ہونے کا بھی بہت چرچا کیا ہے مگر انسان دوستی کے سلسلہ میں ان کے کارہائے نمایاں پردہء اخفا ہی میں رہے۔ شاید جوش صاحب اپنے والد گرامی کی طرح نیکی میں اخفا کے قائل ہوں؟ دو چار واقعات جوش صاحب نے ایسے ضرور لکھے ہیں کہ فلاں کا وظیفہ جاری کروا دیا فلاں کا رکا ہوا کام کروا دیا مگر ایسے چھوٹے موٹے کام تو ہر شخص کرتا ہے اے کاش جوش صاحب اس باب میں زیادہ لکھتے۔

جوش صاحب کا شخصیت نگاری کا اپنا اسلوب ہے۔ قاضی خورشید احمد ''ریاضی استاد، شاعر و نقاد، فارسی و سنسکرت کے ماہر، مکذبِ بدیہیات، طفل حرکات، اخلاص شعار، دوست نواز، دشمن ناشناس، امرد پسند، آداب شکن، سریع الکلام، آشفتہ مزاج، غریب الخصائل، بظاہر بیگانہ بباطن یگانہ'' (صفحہ ۴۱۷)۔ حکیم صاحب عالم ''لکھنؤ کے حاذق و ممتاز طبیب، عربی و فارسی کے منتہی، مذہبی قصائد کے عدیم النظیر شاعر، یتیموں بیواؤں کے سرپرست، مملکتِ ظرافت کے تاجدار، اقلیمِ خلوص کے شہریار، اور کاروانِ زہد و اتقاء کے سالار، کیا بتاؤں کہ کس قدر خوش رو، خوش وضع، خوش طبع، خوش فکر، خوش اخلاق، خوش پوشاک، خوش تبسم، خوش اوقات، خوش مداہات، خوش میزبان اور خوش مطبخ تھے'' (صفحہ ۴۳۳)۔ جعفر علی خان اثر ''علم

عروض اور فنِ شاعری کے مرکزی استاد' فارسی اور انگریزی ادب کے نباض' قلزمِ انسانیت کے منارہء ضوبار' منبرِ انتقاد کے خطیب اعظم' مسندِ زبان کے قاضی القضاۃ' اور مدینہء تہذیبِ لکھنؤ کے طاقِ زریں کے ہزاروں بجھے ہوئے چراغوں کی قطار میں ایک ایسے تنہا چراغ تھے جن کے گل ہو جانے سے تمام شہر پر مہیب اندھیرا مسلط ہو کر رہ گیا ہے'' (صفحہ ۴۷۲)۔ ''تاج باختہ بادشاہوں' روزگار گزیدہ فنکاروں امید بریدہ مریضوں' شیب دریدہ محبوبوں' معشوق سوختہ عاشقوں' پریدہ رنگ بیوہ نوعروسوں' پسر مردہ باپوں اور پدر گم کردہ یتیموں کے خیمہء سوگواری میں بیٹھ کر۔۔۔ مغموم قدرت نے۔۔ غمِ دوراں وغمِ جاناں کے آفات' ورتھر کے مصائب اور شوپنہار کی نامرادی کے طشت میں دیوارِ گریہ کی مٹی کو۔۔۔ میر تقی میر کے آنسوؤں میں تر کر کے گوندھا۔۔۔ اور اس مٹی سے ایک دبلا پتلا گندمی رنگ کا پتلا بنایا اس پتلے کے دھڑکتے ہوئے دل میں تمنائے مرگ پھونک دی اور نام رکھ دیا اس کا فانی بدایونی'' (صفحہ ۴۸۷)

جواہر لال نہرو ''اپنی موہنی صورت کی جاذبیت' اپنے رنگ کی طلاقت' اپنی آنکھوں کی مروت' اپنے لہجے کی عذوبت' اپنے تکلم کی موسیقیت' اپنے تبسم کی حلاوت' اپنے خاندان کی وجاہت' اپنے دل کی آفاق در آغوش وسعت اپنے مزاج کی بے نظیر شرافت اور اپنے کردار کی بے مثال نجابت کے اعتبار سے ایسے انسان تھے جو اس کرہء ارض پر صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں'' (صفحہ ۵۱۳)

اتفاق یوں ہے کہ یادوں کی بارات کے علاوہ اردو کی کم از کم تین خودنوشت سوانح عمریاں ایسی ہیں جن میں جواہر لال نہرو کا ذکر ہوا ہے۔ سر ظفر اللہ کی تحدیثِ نعمت' شہاب صاحب کی شہاب نامہ اور شیخ عبداللہ کی آتشِ چنار۔ تینوں میں جواہر لال نہرو کا ذکر ہے۔ جوش صاحب نے جس جواہر لال کا ذکر کیا وہ دوست جواہر لال ہے ان تینوں نے جس جواہر لال کا ذکر کیا ہے وہ سیاست دان جواہر لال کا ہے۔ چونکہ یہ تجزیہ خودنوشتوں کے ذکر پر مشتمل ہے اس لئے دوست جواہر لال نہرو اور سیاست دان جواہر لال نہرو کا تقابلی بیان درج کر دینے میں کوئی حرج نہیں۔

سر ظفر اللہ کی تحدیث نعمت کا حوالہ: ''سر اوون ڈکسن جو بعد میں آسٹریلیا کے چیف جسٹس ہوئے کو مجلس امن (یعنی سیکیورٹی کاؤنسل) نے کشمیر کے قضیہ میں اپنا نمائندہ مقرر کیا۔ انہیں ہدایت کی گئی کہ وہ رائے عامہ کے استصواب کی شرائط طے کرنے کے بعد استصواب کا انصرام کریں۔۔۔ ایک

تجویز ان کے ذہن میں آئی جس کے خاکے کا ذکر انہوں نے دلی میں پنڈت جواہر لال نہرو سے کیا اور کہا پیشتر اس کے کہ میں اس تجویز کی تفاصیل تیار کروں میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تفاصیل تیار ہو جانے پر آپ اس تجویز کے متعلق میرے ساتھ اور وزیر اعظم پاکستان کے ساتھ تبادلہء خیال پر آمادہ ہوں گے یا نہیں؟ بقول سر اوون پنڈت صاحب نے آمادگی ظاہر کی اور سر اوون نے پنڈت صاحب سے کہا اب وہ کراچی جا کر وزیر اعظم پاکستان سے یہی استصواب کریں گے اور اگر وہ بھی تبادلہء خیال پر رضامند ہو گئے تو وہ تجاویز تیار کر کے دونوں کو اس تجویز پر تبادلہء خیال کی دعوت دیں گے۔ چنانچہ سر اوون کراچی تشریف لائے اور میرے اور چوہدری محمد علی صاحب کے ساتھ گفتگو کی ہم نے کہا اس تجویز کی تفاصیل ابھی تیار نہیں اگر تفاصیل تیار ہونے پر تبادلہء خیال کے بعد فریقین میں اتفاق رائے نہ ہو سکا تو کیا صورت ہوگی؟ انہوں نے فرمایا میں واضح کر دوں گا کہ ایسی صورت میں فریقین کے موقف پر کسی قسم کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ کشمیر کمشن کی قراردادیں جنہیں دونوں فریق تسلیم کر چکے ہیں بدستور قائم رہیں گی۔۔ اس شرط پر نواب زادہ لیاقت علی خان نے بھی سر اوون ڈکسن کی تجویز کی تفاصیل تیار ہونے کے بعد تبادلہء خیال کرنے پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔ سر اوون نے فرمایا یہ ابتدائی مرحلہ تو طے ہو گیا اب میں اپنی تجویز کی تفصیل طے کر کے فریقین کو تبادلہء خیال کی دعوت دوں گا۔ چوہدری محمد علی صاحب نے سر اوون سے کہا آپ پنڈت نہرو کو اطلاع کر دیں کہ چونکہ دونوں فریق آپ کی تجویز کی تفاصیل تیار ہونے پر اس پر تبادلہء خیال پر آمادہ ہیں لہذا آپ تجویز کی تفاصیل طے کر کے انہیں مطلع کریں گے۔ سر اوون کو ابھی پنڈت جی کے طریق کار کا تجربہ نہ تھا انہوں نے فرمایا اس کی کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ چوہدری صاحب پنڈت صاحب کو خوب جانتے تھے اس لئے مصر ہوئے کہ انہیں بذریعہ تار ضرور مطلع کیا جائے۔ ان کے اصرار پر سر اوون تار بھیجنے پر رضامند ہو گئے اور اسی شام سر اوون نے پنڈت جی کو تار دے دیا کہ جس تجویز کے خاکے کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا وزیر اعظم پاکستان بھی آپ کی طرح اس کی تفاصیل تیار ہونے پر میرے اور آپ کے ساتھ تبادلہء خیال کرنے پر آمادہ ہیں اس لئے میں اب تجویز کی تفاصیل تیار کر کے آپ کو مطلع کروں گا۔ دوسرے دن سر اوون تشریف لائے بڑے آزردہ تھے فرمایا تمہیں معلوم ہے پنڈت نہرو نے میرے تار کا کیا حیرت انگیز جواب دیا ہے؟ دریافت کرنے پر فرمایا پنڈت جی نے جواب دیا ہے ''مجھے تمہارے تار کی سمجھ نہیں آئی۔ مجھے تمہاری کسی تجویز کا علم نہیں۔

میرے لئے یہ بالکل نیا معاملہ ہے۔ تم دلی آؤ تو اس پر بات چیت کریں گے‘‘۔

سراوون نے فرمایا اس تجویز کے متعلق میری اور پنڈت نہرو کی جو گفتگو ہوئی تھی وہ بالکل واضح تھی اور اس میں کسی قسم کی غلط فہمی کا امکان نہیں تھا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ مزید غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہوں کہ میری تجویز پر تبادلہ ءخیال کرنا ان کے مفاد کے خلاف ہے اور اب وہ اس پر آمادہ نہیں لیکن ان کا یہ کہنا کہ انہوں نے پہلے اس تجویز کا ذکر بھی نہیں سنا اور ان کے لئے یہ نئی بات ہے بالکل خلاف واقعہ ہے۔ بہر صورت اگرچہ میرا دلی جانا بے سود ہے لیکن میں ان کی دعوت کو رد بھی نہیں کرسکتا لہٰذا کل میں دہلی جارہا ہوں شاید اس معمہ کا حل وہاں جاکر معلوم ہو‘‘۔ تیسرے دن وہ کراچی واپس آئے اور بتایا کہ دلی پہنچنے پر سر گرجاشنکر باجپائی (بھارت کی وزارت خارجہ کے سکرٹری جنرل) ان کی پیشوائی کے لئے مطار پر آئے ہوئے تھے۔ فرمایا جب ہم کار میں بیٹھ گئے تو میں نے ان سے کہا آپ کے وزیر اعظم کا رائے بدل لینا تو سمجھ میں آسکتا ہے لیکن انہوں نے یہ کیسے لکھا کہ انہیں میری تجویز کا علم ہی نہیں اور ان کے لئے یہ بالکل نئی بات ہے۔ اس کے جواب میں سر گرجاشنکر باجپائی نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا ’’سراوون میرا خیال ہے میرے وزیر اعظم پر شاید عارضی نسیان کا حملہ ہو گیا ہوگا‘‘۔ سر گرجاشنکر کا یہ فقرہ دہرانے کے بعد سراوون نے جو کچھ کہا وہ پنڈت جی کی وفات کے بعد ضبط تحریر میں لانا مناسب نہیں‘‘ (تحدیث نعمت صفحہ ۵۵۹۔۵۶۰)۔

دوسرا حوالہ شہاب نامہ کا ہے کہ صدر ایوب اور پنڈت نہرو کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس کو انہوں نے ایک مضمون کی صورت میں ڈھال کر چھپوا دیا‘‘ پنڈت جی ڈھٹائی سے مکر گئے کہ اس مضمون میں جو باتیں درج ہیں وہ سب غلط ہیں ایسی کوئی بات ہوئی ہی نہیں۔ یہ خبر پڑھ کر صدر ایوب بہت سٹپٹائے اور بولے میرے تصور میں بھی نہیں تھا کہ ایسا مشہور لیڈر اس قدر جھوٹ بھی بول سکتا ہے‘‘ (صفحہ ۹۱۲)۔ شہاب نامے ہی میں ایک اور مثال درج ہے کہ ایک وفد جو امریکہ کے ایوریل ہیری مین اور برطانیہ کے ڈنکن سینڈیز پر مشتمل تھا پاکستان آیا ہوا تھا اور یہ چاہتا تھا کہ انڈیا اور پاکستان چینی حملہ کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی صورت حال میں اچھے ہمسایوں کی طرح رہیں اور کوئی جنگ نہ ہو۔ اس وفد نے ایک معاہدہ کا مسودہ تیار کیا اور ’’ڈنکن سینڈیز اس دستاویز کو سینے سے لگائے پنڈت نہرو کی خدمت

میں پیش کرنے کے لئے لنچ کے فوراً بعد دہلی روانہ ہوگئے۔۔۔ خدا خدا کر کے نئی دہلی سے فون آیا کہ پنڈت نہرو نے معاہدے پر دستخط کر دئے ہیں۔۔۔ ۲۹ نومبر ۱۹۶۲ء کے معاہدے پر پنڈت نہرو کے دستخطوں کی مہم سر ہوتے ہی مسٹر ڈنکن سینڈیز فتح و نصرت کے جھنڈے لہراتے دہلی سے سوئے لندن روانہ ہوئے۔ ابھی وہ کراچی تک پہنچ پائے تھے کہ پنڈت جی نے ہندوستان کی لوک سبھا میں صدر ایوب کے ساتھ اپنے معاہدہ کی وضاحت میں منافقت سے بھرا ہوا ایک عجیب وغریب بیان دے ڈالا۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ حالات کی نزاکت کے پیش نظر یہ محض ایک رسمی کارروائی تھی اور اس معاہدہ کی وجہ سے کشمیر کے متعلق ہندوستان کے رویہ میں ہرگز کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوئی۔ مسٹر ڈنکن سینڈیز نے لندن کا سفر منسوخ کیا اور کراچی سے صدر ایوب کو بتایا کہ وہ نئی دہلی واپس جارہے ہیں اور پنڈت نہرو کو اس مفسدانہ بیان کی تردید پر مجبور کریں گے‘‘ (شہاب نامہ صفحہ ۹۲۳)۔

تیسرا حوالہ شیخ عبداللہ کی آتش چنار کا ہے۔ شیخ عبداللہ پنڈت جواہر لال نہرو کے بارہ میں کہتے ہیں: ’’وہ اپنے آپ کو ناستک کہتے تھے لیکن وہ ہندوستان کے اس ماضی کے عاشق زار بھی تھے اور قصیدہ خواں بھی جس میں ہندو احیا پرستی اور ہندو افسوں کا راج بھی تھا۔ ان کی ’’دریافت ہند‘‘ کبھی کبھی کے ایم منشی اور دیانند سرسوتی جیسے ہندو احیا پرستوں کے نظریہء تاریخ کے قریب تر آجاتی ہے۔ وہ اپنی ذات کو اس قدیم سلطنت کے پھر سے قائم و دائم کرنے کا ایک ہتھیار instrument سمجھتے تھے اور اسی لئے ان کی تصور پرستی میں میکاولی کی سیاست کاری اور شعبدہ بازی کے عناصر شامل ہوگئے تھے یہی وجہ ہے کہ مہاتما گاندھی جیسے اصول پسند عارف کا یہ چیلا بیک وقت قدیم ہند کے مشہور سیاست کار چانکیہ کا بے حد پرستار بھی تھا اور اس کی کتاب ’’ارتھ شاستر‘‘ جس میں اس نے سیاست کی فریب کاریوں کے گر بیان کئے ہیں جواہر لال کے اپنے اعتراف کے مطابق ان کے سرہانے رکھی ہوئی تھی۔ جواہر لال نے یہ سیاست کاری کشمیر میں ہمارے ساتھ برتی، پاکستان کے ساتھ بھی برتی اور بین الاقوامی سطح پر ہنگری اور دوسرے معاملات میں بھی اس کا مظاہرہ کیا‘‘ (آتش چنار صفحہ ۳۵۱)۔

یہ تینوں پہلو جو پنڈت جواہر لال نہرو کی سیاسی زندگی کے پہلو ہیں تین خودنوشت سوانح نگاروں کے قلم کے ذریعہ منظر عام پر آئے ہیں۔ جوش صاحب کا واسطہ کسی اور قسم کے جواہر لال سے تھا

انہیں اس جواہر لال کا تجربہ نہیں تھا جو اچھے سیاست دان کی خوبیاں اپنے اندر رکھتا تھا۔ اور اچھے سیاست دان کی خوبیاں جوش صاحب کے لفظوں میں یہ ہیں: ''اچھے سیاست دان کے واسطے یہ ایک لازمی شرط ہے کہ اصول خدمت وانسانیت کے لحاظ سے وہ ایک ناقابلِ برداشت حد تک برا آدمی ہو'' (صفحہ ۵۲۲)
خدا معلوم جوش کس جواہر لال نہرو کو روحِ انسانیت کا سجدہ قبول کرنے کو کہہ رہے ہیں؟

یادوں کی برات ہمارے ایک مہذب تعلیم یافتہ بڑے شاعر کی خودنوشت ہے اور اپنی تمام تر ناقابلِ قبول باتوں کے باوجود بعض معاملات میں دوسروں کی راہنما بنتی ہے۔ ایک سے زیادہ مرتبہ ایسا موقع آیا ہے کہ جوش صاحب کو دوسروں کا احسان اٹھانا پڑا اور جوش صاحب نے فراخ قلبی کے ساتھ دوسروں کے احسانات کا اعتراف کیا۔ ہمارے معاشرے میں احسان ناشناسی کی جو روایت، قبیحہ رائج ہو گئی ہے اس کے پیشِ نظر یہ بہت بڑی بات نظر آتی ہے۔ نظام کے دربار میں جلیل مانک پوری کا سرِ دربار یہ کہنا کہ ''خداوند! ان کے والد نواب بشیر احمد خان نے اس وقت میری امداد کی تھی جب میرا کوئی سرپرست باقی نہیں رہا تھا'' اور جلیل کی اس بات پر جوش کی آنکھوں کا ڈبڈبا جانا'' (صفحہ ۲۱۶) ایسی بات ہے جو ان کی شرافت نسبی کی دلیل ہے۔ دوسرا واقعہ دیوان سنگھ مفتون کا ہے ''یہ غالباً ۱۹۳۷ء کی بات ہے جب میں دہلی سے کلیم نکال رہا تھا اور معاش اور معاشقہ کے اعتبار سے وہ میرا بے حد پراگندہ حالی اور پریشاں خیالی کا دور تھا اور اس پر طرہ یہ کہ میری بیٹی کی شادی سر پر آچکی تھی کہ ایک روز وہ میرے گھر آئے۔۔۔ انہوں نے کہا میں بھابی سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ میں نے سخاوت سے کہا انہیں اوپر لے جاؤ۔ میری بیوی اس وقت تک پردہ کی پابند تھیں لیکن ان سے کا نا پردہ کرتی تھیں۔ جب وہ میری بیوی سے باتیں کر کے نیچے آئے تو دو منٹ کے اندر رخصت ہو گئے۔ اور جب میں اوپر گیا تو بیوی نے مجھ سے کہا سردار صاحب نوٹوں کا یہ بنڈل دے گئے ہیں'' (صفحہ ۴۳۵)۔ یہ دونوں ھَل جَزاءُ الاِحسانِ اِلّا الاِحسان کی عمدہ مثالیں ہیں اور اس قابل ہیں کہ ان کا چرچا کیا جائے۔

جوش صاحب نے کیا خوب صورت بات کی ہے کہ ''داستان گو خاموش ہو جائے گا داستان بولتی رہے گی'' یادوں کی برات اردو ادب میں اپنی زبان کی لطافت و امارت' اور مصنف کی خوش لہجگی کے باعث واقعی یاد رکھی جائے گی اور اس پنج عیبی شاعر کی نثر کا جیتا جاگتا نمونہ بنی رہے گی۔

◎

دیواروں کے بیچ

ہندوستان میں نوے کی دہائی میں تین خودنوشتیں چھپیں۔ ان سب کا تعلق ایک حد تک فلمی دنیا سے ہے۔ اختر الایمان کی خودنوشت ''اس آباد خرابے میں''۔ وامق جونپوری کی ''گفتنی ناگفتنی'' اور ندا فاضلی کی ''دیواروں کے بیچ''۔ ندا فاضلی کی خودنوشت کا دوسرا حصہ ''دیواروں کے باہر'' بھی چھپ چکا ہے۔ اختر الایمان نغز گو شاعر ہونے کے باوجود فلموں میں گیت نہیں لکھتے تھے محض مکالمے اور کہانیاں لکھتے تھے۔ ندا فاضلی اور وامق جونپوری ترقی پسند شعرا میں ممتاز ہونے کے علاوہ فلموں سے وابستہ رہے۔ تینوں میں ایک چیز مشترک ہے کہ تینوں خودنوشت سوانح نگاروں کا تعلق برصغیر کی اس نسل سے ہے جو تقسیم ملک کے بعد اپنے وطن ہی میں مقیم رہی ہجرت کے کرب سے آشنا نہیں ہوئی مگر تینوں کی خودنوشتیں اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ اگرچہ یہ لوگ نقلِ مکانی سے بچ گئے مگر ان کے ذہنوں کو وہ سکون نہیں ملا جس کی خاطر ان لوگوں نے نقلِ مکانی اور ہجرت نہیں کی تھی۔ تینوں میں سے دو اس دانشور طبقہ سے ہیں جو غربت سے ابھر کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا مگر اس کے ذہن میں ایک نامحسوس سی محرومی کلبلاتی رہی۔ ندا فاضلی کے ماں باپ بہن بھائی ادھر آ گئے تھے اس لئے ان کے ہاں تو جذبے بھی تقسیم ہو گئے' ماں باپ کے اصرار کے باوجود ندا صاحب نے ہجرت کرنا پسند نہیں کیا مگر دیواروں کے بیچ کا آخری باب اس بات کا شاہد ہے کہ پاکستان میں بنا ہوا وہ مکان جس پر باپ نے دوسرے بھائیوں کی طرح ان کا نام بھی کھدوا دیا تھا ان کے شعور کی سطح پر تیر رہا ہے۔

ایک اور قدر ان تینوں میں مشترک ہے کہ ان تینوں کے صہری تعلقات غیر مسلموں سے قائم ہوئے۔ اختر الایمان کی سالی ایک ہندو سے بیاہی گئی' اور گھر میں دو تہذیبیں ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔ ندا فاضلی کے برادر محترم ایک ہندو دوست لڑکی کو بچے کا تحفہ دے کر پاکستان کھسک آئے اور وامق جونپوری کا بیٹا ہندو بیوی بیاہ لایا ہے اس طرح ان تینوں کے ہاں ایک لادینی تہذیب پھلتی پھولتی نظر آتی

ہے ایسا ہی عصمت چغتائی کے ہاں بھی ہوا مگر ان کی خودنوشت زیر بحث نہیں۔ یہ سارے خاندان ایسے ہیں جنہیں اپنی دینی اقدار کی قربانی دینی پڑی ہے اور انہیں پروا بھی نہیں کہ ان لوگوں نے ایک نقلِ مکانی سے بچنے کی خاطر کتنی بڑی قربانی دی ہے۔ اختر الایمان نے ایک جگہ اس بات پر بے اطمینانی کا اظہار کیا ہے کہ بہن مصلے پر بیٹھی ہے اور بہنوئی اپنی پوجا پاٹ میں مصروف ہے مگر اس طرح گھر میں عجیب دوغلا پن پیدا ہوگیا ہے جو نئی نسل پر اثر انداز ہو رہا ہے۔

ندا فاضلی کی ''دیواروں کے بیچ'' صیغہ واحد غائب میں لکھی گئی ہے یعنی راوی روایت کر رہا ہے۔ مصنف نے کتاب کو یادوں کے نام معنون کیا ہے:

''ان یادوں کے نام
جو حال میں ہوں تو ستاتی ہیں،
جب ماضی بن جائیں تو لبھاتی ہیں،
ممکن ہے حال سے ماضی بننے کے سفر میں ان یادوں میں
کہیں کہیں وقت کی دوریاں شامل ہوگئی ہوں
اور یہ اب ویسے نہیں رہی ہوں
جیسی پہلے تھیں،
ان یادوں کا سلسلہ طویل ہے،
میں اک موڑ پر آکر رک سا گیا ہوں''۔

یہ خودنوشت افسانوی اندازِ بیان میں شروع ہوتی ہے۔ باپ کے بارہ میں لکھا ہے ''گھر میں اچھی شکل وصورت کی بیوی ہے اور ساتھ میں سیندھیا دربار کی ایک مغنیہ کی زلف کے اسیر ہیں'' (صفحہ ۱۱)۔ مگر ماں نے نہایت ثابت قدمی کے ساتھ اس صورتِ حال کا مقابلہ کیا ہے اور بچوں کی نگہداشت اور پرورش میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ ان کے والد بھی اپنی روش پر ثابت قدم رہے گھر میں والد کے بازاری عشق کی گواہی ''چھٹو'' بھی پرورش پا رہا ہے (صفحہ ۴۴)۔ اور گھر کی مالکہ اسے بھی صبر شکر کے ساتھ پرورش کر رہی ہے۔ ندا صاحب کو ایسی باتوں کے ذکر میں بڑا مزا آتا ہے۔ جاں نثار اختر

کے ذکر میں لکھتے ہیں '' جاں نثار اختر حال ہی میں علی گڑھ سے تعلیم مکمل کر کے آئے ہیں اور وکٹوریہ کالج میں لیکچرر منتخب ہوگئے ہیں۔ ان کی نظم ''گرلس کالج کی لاری'' کی شہرت ان کے یہاں آنے سے پہلے پہنچ چکی ہے۔۔۔ ان کی شراب نوشی اور شاعری کی طرح ان کا عشق بھی مشہور ہے۔ یہ عشق بھی غیر روایتی ہے۔ ایک شادی شدہ خاتون فاطمہ زبیر کو موضوعِ سخن بنائے ہوئے ہیں۔ شاعری اور عاشقی دونوں میں ترقی پسندی نمایاں ہے۔ فاطمہ زبیر کی دولڑکیوں اور لڑکوں کے نکاحی والد زبیر ہیں ان لڑکوں میں سے بڑے کا نام نثار پرویز ہے اس کا ذکر صفیہ اختر کے خطوط میں کئی جگہ ملتا ہے۔ شباہت کے لحاظ سے یہ سرتاپا جاں نثار اختر ہی ہیں۔ وہی لہجہ میں نرمی، آنکھوں میں وہی نیم غنودگی'' (صفحہ ۲۷) اس بات سے قطعِ نظر کہ اس بات میں کہاں تک صداقت ہے اس بات کا ندا فاضلی کی سوانح حیات سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بات بیان کرنے کی اس کے سوا اور کوئی وجہ سمجھ نہیں آتی کہ ان کے والد محترم اسی قماش کے تھے اس لئے انہیں ہر دوسرے شخص میں تیسرے کی شباہت نظر آتی ہے۔ انہی فاطمہ کے ساتھ جاں نثار اختر کے تعلق کے بارہ میں صفیہ اختر کی بہن حمیدہ سالم اپنی خودنوشت ''شورشِ دوراں'' میں لکھتی ہیں کہ جب جان نثار اختر کا رشتہ صفیہ سراج کے لئے آیا تو مجاز ''فاطمہ بہن کے ساتھ ان کے تعلقات سے واقف'' تھے۔ (صفحہ ۹۵) اور ''خود صفیہ اختر کو فاطمہ بہن یعنی بھائی اختر کی رشتہ کی بھاوج کے ان قریبی تعلقات کا پورا علم تھا جس کے متعلق اللہ جانے جھوٹ یا سچ طرح طرح کی افواہیں تھیں۔ انہیں اپنے انتخاب پر مکمل اعتماد تھا ایسا اعتماد تھا جس کو انہوں نے زندگی کی آخری سانس تک نبھایا اور فاطمہ بہن اور ان کے بال بچوں سے ایسی قربت کا رشتہ رکھا کہ زمانہ حیران رہ گیا'' (صفحہ ۱۳۳)۔

اپنی دانست میں ندا فاضلی نے جس چیز کا ڈرامائی انکشاف کیا اور شرفاء کی عام روش کے برعکس سنی سنائی باتوں کو حقیقت اور سچائی بنا کر جاں نثار اختر اور ان کی ایک بیاہی تیاہی بھابی پر انگشت نمائی کی وہ ندا فاضلی جیسوں کو ہی سزاوار ہے۔ خود ان کے ہاں زندگی جس ڈگر پر چلتی ہے وہ بھی اسی صورت حال کا شاخسانہ ہے۔ ان کے ہاں بھی خانگی زندگی کے متوازی ایک اور زندگی چلتی ہے اپنی ایک نظم کا حوالہ بھی آپ نے درج کیا ہے:

''ممکن ہے چندروز پریشان رہی ہوتم،
یہ بھی ہُوا ہو
وقت پر سورج اگا نہ ہو،
املی میں کوئی اچھا کتارا پکا نہ ہو،
چھت کی کھلی ہوا میں دوپٹہ اڑا نہ ہو،
دوتین دن رضائی کی سردی رکی نہ ہو،
کمرہ کی رات پنکھ پسارے اڑی نہ ہو،
ہنسنے کی بات پر بھی بمشکل ہنسی ہوتم،
ممکن ہے چندروز پریشان رہی ہوتم۔
کچھ دن خطوں میں آنسو بہے،
شوروغل ہُوا،
تم زہر کھا کے سوئیں،
میں انجن سے کٹ گیا،
پھر یوں ہُوا کہ دھوپ کھلی ابر چھٹ گیا،
میں نے وطن سے کوسوں پرے گھر بسالیا،
تم نے پڑوس میں نیا بھائی بنالیا۔''

دہلی کی ایک معزز خاتون حمید سلطان کو یہ نظم فحش محسوس ہوتی ہے وہ احتجاجاً برسرِ مشاعرہ کھڑی ہو کر اپنی رائے کا اظہار کرتی ہیں۔۔۔۔ مگر مخدوم محی الدین اپنی تنقید میں ندا کی نظم میں لب ولہجہ کی تازگی کو سراہتے ہیں'' (صفحہ ۱۲۰۔۱۲۱) نظم کے لب ولہجہ کی تازگی میں کوئی کلام نہیں مگر اس بات کو کیا کیجیے کہ ندارواروی میں اپنے برادرِ عزیز کے عشق کا تذکرہ بھی کر چکے ہیں جو کسی ہندولڑکی کو اپنے خون کی امانت سونپ کر پاکستان سدھارے ہیں۔ اس طرح یہ خودنوشت اپنی نوعیت کے لحاظ سے فلمی دنیا میں رونما ہونے والے روزمرہ کے واقعات کا آئینہ بن کر ابھرتی ہے۔

ساحر لدھیانوی کا ذکر بڑا فکر انگیز ہے۔'' ساحر لدھیانوی یوپی والوں کی طرح اندر کچھ باہر کچھ کی دورخی سے دور ہیں۔ ان کا غصہ اور خوشی کبھی اپنی پنجابیت نہیں چھوڑتے'' (صفحہ ۱۴۳) مگر ساحر کی پنجابیت برطرف۔ اہلِ ادب کو ہمیشہ ساحر کے ادبی انحطاط کا دکھ رہا۔ اور جہاں کہیں اس بات کی مثال دینے کی ضرورت پیش آتی ہے کہ فلمی دنیا سے وابستہ ہونے کے بعد شاعر کا فن انحطاط کا شکار ہو جاتا ہے ساحر کی مثال سامنے کی مثال بن جاتی ہے۔ ندا صاحب نے اس صورت حال کی ایک خوب صورت مثال دی ہے'' ایک دفعہ ساحر لدھیانوی اچانک برآمد ہوتے ہیں مکتبہ کے باہر اندر ان کو دیکھنے والوں کی بھیڑ لگ جاتی ہے گردن کی ایک خفیف سی جنبش اور ہلکی سی مسکراہٹ سے ایک ساتھ سب کو نپٹا کر سیدھے اندر جا کر علیک سلیک کرتے ہیں کچھ ہی دیر کی الٹ پھیر کے بعد ساری کتابوں کو اپنے معیار سے خارج کر کے پلٹ کے شاہد علی خاں سے سوالیہ انداز میں مخاطب ہوتے ہیں بھئی شاہد صاحب ادب کو کون سا روگ لگ گیا ہے کوئی معیاری شعری مجموعہ نظر نہیں آتا۔۔۔۔ وہاں بیٹھے باقر مہدی ان کے سوال کا جواب لفظوں میں دینے سے نہیں چوکتے۔ ساحر صاحب مجموعے تو کئی اچھے آچکے ہیں۔۔ آپ کو تلخیاں پڑھنے سے فرصت ہو تو دریافت کر لیجیے میں بتا دوں گا'' (صفحہ ۱۵۰)۔ ندا فاضلی کی یہ سرگزشت نیم حقیقت نیم افسانہ لگتی ہے۔ ادبی لحاظ سے کوئی ایسی معیاری سرگزشت نہیں مگر پڑھنے میں دلچسپ ہے اور احساس ہوتا ہے کہ لکھنے والے نے خلوصِ نیت سے ہر بات بے کم وکاست کہہ دی ہے۔

گفتنی ناگفتنی

وامق جونپوری کی ''گفتنی ناگفتنی'' ۱۹۹۳ء میں خدا بخش لائبریری پٹنہ والوں نے شائع کی۔
وامق صاحب نے اپنی خودنوشت کا نام گفتنی ناگفتنی رکھا ایڈیٹر نے مرتب کرتے ہوئے لکھا کہ کتاب کی اشاعت میں تاخیر اس وجہ سے ہوئی کہ ان کی آل اولاد اڑ بیٹھی کہ گفتنی شائع کردو ناگفتنی شائع نہ کرو۔ چنانچہ طے ہوا کہ ناگفتنی مولانا آزاد کی روایت کے تتبع میں تیس برس بعد چھپے گی۔ مگر کتاب پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ جو واقعات ناگفتنی کہہ کر حذف کئے گئے ہیں ان کی نوعیت جوش صاحب کے معاشقوں کی سی ہے۔ ایسے واقعات کے بیان کا موقع آیا ہے تو شائع کرنے والوں نے دو چار سطروں کی جگہ خالی چھوڑ دی ہے مثلاً ''نوجوان خاتون ڈاکٹر'' جے پی'' کی ہمدردی کا ذکر ہے کہ وہ انہیں ہسپتال سے گھر لے گئیں اور وعدہ لے لیا کہ ہر ہفتہ اسے ملنے جایا کریں گے'' (صفحہ ۸۲) ورنہ اور تو کوئی ایسی خاص بات نظر نہیں آتی۔ کمیونسٹ پارٹی کے سلسلہ میں تو ناگفتنیاں عام بیان ہوئی ہیں۔ اگر وامق صاحب کا خیال ہے کہ تیس برس بعد وہ اپنے معاشقوں کو طشت از بام کریں گے تو علیحدہ بات ہے۔

وامق جونپوری کمیونسٹ پارٹی کے باقاعدہ رکن تھے اور اس کی خاطر ہر قربانی دینے کو تیار تھے اور قربانیاں انہیں دینی بھی پڑیں۔ مجموعی تاثر یہ بنتا ہے کہ حالات نے انہیں پارٹی منشور سے بدظن کر دیا تھا مثلاً ایک جگہ ایک کٹر کمیونسٹ کی جیب سے ان لوگوں کی فہرست نکلی ہے جنہیں ''سرخ انقلاب کے بعد گولی کا نشانہ بننا ہے'' (صفحہ ۱۶۸) تو ان کا ردعمل استہزا کا ہے۔ یا حیدرآباد میں ایک راجہ کے ہاں دعوت کھانے کے بعد ان کے ساتھ تصویر کھچوانے کا موقع آیا ہے تو ان کا کہنا ہے بھلا انقلاب کے وقت اس راجہ کو کون گولی کا نشانہ بنائے گا؟

ترقی پسند تحریک کے ساتھ گہری وابستگی کے باوجود ایک وقت میں انہیں احساس ہوا کہ ''ارباب تحریک کوئی زیادہ منفعت بخش کام کرنے لگے تھے اس لئے میری فریاد اور تخلیقات پر توجہ دینے

کی فرصت کسے تھی؟'' (صفحہ ۳۳۸) علی سردار جعفری ان کی ناراضگی کا خاص ہدف ہیں کیونکہ وہ ۴۹۔۵۰ تک اقبال کے خلاف ایک طویل مقالہ لئے گھوما کرتے تھے۔۔۔ اور فیض کے متعلق انہوں نے خود وامق سے کہا تھا کہ دوسرے درجہ کے شاعر ہیں اور چند چلتی ہوئی بحروں میں نظمیں غزلیں کہتے ہیں'' (صفحہ ۳۳۷)۔ وامق صاحب کی مایوسی کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ ترقی پسند نقادوں نے انہیں نظر انداز کر دیا ''درآنحالیکہ میری ادھر کی غزلوں میں جدید کلاسیکیت neo classicism کو داخل کرنے کا پہلا تجربہ ہے'' (صفحہ ۳۴۰) اس تعلّی کے باوجود وامق جونپوری کا شعری مرتبہ ایک عام درجہ کے شاعر سے اوپر نہیں جاسکا۔ ان کا مرتبہ وہی ہے جس کے باب میں وہ کہہ چکے ہیں کہ ''۱۹۴۱ء سے آج تک ترقی پسند شعرا میں سب سے زیادہ مشاعروں میں میں نے شرکت کی ہے'' (صفحہ ۶)۔ وامق صاحب بچپن ہی سے نرگسیت کا شکار ہیں لڑکپن میں کھلاڑی تھے مدتوں بعد اس زمانہ کے کسی نامور کھلاڑی سے ملاقات ہوگئی تو بیان فرماتے ہیں'' خان صاحب بولے اچھا تو آپ ہیں وہ خوب صورت سے لونڈے جو گیند لے کر میرے قریب سے کبھی دائیں کبھی بائیں جھکائی دے کر نکل جاتا تھا'' (صفحہ ۱۰۳)

وامق صاحب ساٹھ کی دہائی میں کسی مشاعرہ میں شرکت کے لئے پاکستان تشریف لائے تھے۔ قرۃ العین حیدر سے ملاقات کا ذکر کرتے ہیں'' دوسرے دن عینی کی قیام گاہ پر گیا دیکھا کہ وہ اپنے مکان کے چمن میں پندرہ بیس نئی کتابوں کو سامنے رکھ کر کوئی نوٹ تیار کر رہی ہیں۔ یہ وہی زمانہ تھا جب ان کا معرکتہ الآرا ناول'' آگ کا دریا'' برصغیر میں اردو ناولوں کی سست رفتار دنیا میں ایک سنگ میل بن کر سامنے آیا تھا۔ میرے دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا کہ تاکہ میں آدم جی ایوارڈ کے لئے ڈی بار ہو جاؤں اس لئے مجھ کو ایوارڈ کی جیوری کا ممبر بنا دیا گیا ہے اور یہ سب دوسروں کے ناول ہیں جن پر مجھ کو رائے دینی ہے کہ ان میں سے کون اس اعزاز کا مستحق ہے میں نے سب ناول پڑھ ڈالے ہیں اور یہ سب دوسرے تیسرے درجہ کے ناول ہیں تاہم کسی ایک کو تو بہرحال آدم جی ایوارڈ ملے گا'' (صفحہ ۱۸۶)
یہ وہ زمانہ ہے جب شوکت صدیقی کی خدا کی بستی پر آدم جی ایوارڈ دیا گیا تھا۔

گفتنی ناگفتنی ترقی پسند تحریک کے وابستگان کے بعض انتہا پسندانہ رویوں پر روشنی ڈالتی ہے اور اس بات میں کوئی اشتباہ نہیں رہتا کہ یہ تحریک اشتراکی انقلاب کی راہ ہموار کرنے کے لئے بہ طور ایک

مہین نقاب کے استعمال ہوتی رہی ہے۔حمید نسیم نے ناممکن کی جستجو میں فیض صاحب کے ذکر میں لکھا تھا کہ ''پھر وہ زمانہ آ گیا کہ ادب وشعر میں خوب و ناخوب کا معیار سیاسی رفاقت اور ہم نظری بن گئے اور ادبی دیانت ختم ہوگئی۔ایک بڑی واضح مثال سامنے ہے۔ضیا جالندھری کا دوسرا مجموعہ کلام ''نارسا'' چھپا تو کراچی کے مؤقر روزنامہ ڈان میں ادبی کالم نگار اریل نے اس نئے شعری مجموعہ کی بہت تعریف کی کہ اس مجموعہ سے ضیا فکر وفن کی انتہائی بلندی پر پہنچ گیا ہے۔فیض صاحب کراچی آئے تو انہوں نے اس دیانت دار کالم نگار (محمد علی صدیقی) سے جو ترقی پسند ادیب سمجھا جاتا تھا کڑی باز پرس کی کہ اس نے ضیا کی اتنی کھل کر تعریف کیوں کی ہے؟ اس نے عرض کیا ''فیض صاحب ضیا واقعی باکمال شاعر ہے''، فیض نے فرمایا ''یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ وہ باکمال شاعر ہے مگر ہمارے مسلک کا نہیں۔اس لئے اس کی شہرت کا وسیلہ بننا سراسر غلط ہے'' (صفحہ ۱۰۴)۔فیض صاحب نے ایک نقاد کو ایک غیر ترقی پسند شاعر کی تعریف کرنے پر سرزنش فرمائی تھی مگر وامق صاحب کی خودنوشت ترقی پسند تحریک کے ایسے رویوں پر شاہدِ ناطق بن کر سامنے آئی ہے۔اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔

◎

اس آباد خرابے میں

اختر الایمان کی ''خودنوشت'' اس آباد خرابے میں'' ۱۹۹۶ء میں اردو اکادمی دہلی کی طرف سے چھپی۔مصنف کا اپنا بیان ہے کہ ''لوگوں کو شکایت ہے میری زندگی سے متعلق بہت سی باتیں ہیں جو میں نے دانستہ نظر انداز کر دی ہیں۔یا میرے ذہن سے نکل گئی ہیں''۔۔۔ مگر۔۔۔'میں نے اس خودنوشت میں جیسی مجھ پر گذری ہے سب کچھ لکھ دیا۔روکھے پھیکے واقعات ہیں ان میں کوئی جی لبھانے والی بات نہیں اگر کسی کو خودنوشت کا پڑھنا تضیع اوقات معلوم ہو تو شرمسار ہوں۔ساتھ ہی یہ بھی کہہ دوں کہ یہ پورے واقعات نہیں، کچھ ایسے لوگ ابھی تک حیات ہیں جن سے ذہنی یا قلبی واسطہ رہا جو صرف میرے اور ان کے درمیان تھا جن کا ان صفحات میں ذکر نہیں کیا۔دوسرا ڈر یہ تھا انہیں بیان کروں گا تو میرے واقعات جھوٹے لگنے لگیں گے۔میں بظاہر روکھا پھیکا سا آدمی ہوں میری زندگی میں کوئی چمک دمک یا افراط تفریط بھی نظر نہیں آتی۔بہت کچھ ایسا ہے کہ اسے لکھوں گا یا اس کے بارہ میں لکھوں گا تو افسانہ طرازی یا خودساختہ بات محسوس ہوگی'' (صفحہ ۸)۔پھر مصنف نے یہ بھی لکھا ''ایک زمانہ میں میں نے اپنی منظوم سوانح لکھنے کا ارادہ کیا تھا وہ خواہش تکمیل کو تو نہیں پہنچی مگر اس کے کچھ حصے ہو گئے تھے'' (صفحہ ۳۳) ''یہ جو کچھ ان صفحات میں درج کر رہا ہوں اسے سوانح کا نام نہیں دینا چاہئے یادداشت سمجھ لیجئے وہ بھی اس لئے قلمبند کر لی کہ سفر کے اختتام پر آدمی کو یاد تو رہے کیسے کیسے مقامات اور منزلوں سے گذرے ہیں'' (صفحہ ۴۲)۔

یہ خودنوشت ایسے شخص کی خودنوشت ہے جس نے زندگی کا سفر انتہائی کٹھن حالات میں طے کیا۔ والد کہیں ٹک کر نہیں بیٹھے اور معمولی ملازمت کی خاطر دربدر کی خاک چھانتے رہے۔ماں نے یہ سب تکلیفیں انگیز کیں مگر جب یہ معلوم ہوا کہ شوہر دوسرا بیاہ رچا کر بیٹھے ہوئے ہیں تو یہ صدمہ ان سے برداشت نہ ہوا اور اپنے ماں باپ کے ہاں اٹھ آئیں۔بعد کو یہ پتہ چل جانے کے باوجود کہ شوہر نے

دوسری شادی نہیں کر رکھی ہے یہ دوری قائم رہی۔ اختر الایمان کی شخصیت میں ''اجڑے خاندانوں'' کے
اجڑنے کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی ساری نفسیاتی کیفیتیں نمایاں ہیں۔ باپ کے استغنا اور ماں کے
انحصار دونوں کا ورثہ بیٹے نے پایا ہے۔ زندگی بھر باپ کی طرح خود بھی ٹک کر نہیں بیٹھے اور کسی نوکری کو
مستقل روزگار کا ذریعہ نہیں بنایا۔ تعلیم بھی اپنی محنت سے مکمل کی ورنہ انہیں موقع ہی کہاں ملتا کہ تعلیم کی
تکمیل کر سکتے۔ ماں نے جس عزیز کے سپرد کیا اس نے انہیں یتیم خانہ مؤید الاسلام میں داخل کروا دیا
(اس یتیم خانہ سے ایک اور دریکتا پیدا ہوا وہ ڈاکٹر خورشید الاسلام صدر شعبہ اردو علی گڑھ یونیورسٹی ہیں)
۔۔اس جگہ انہیں اچھے ہمدرد اساتذہ مل گئے جن کی ہمدردی اور محبت کا مصنف نے بڑے احترام سے
ذکر کیا ہے۔ ''ایک ماسٹر عبدالواحد صاحب تھے وہ احمدی فرقے سے تعلق رکھتے تھے میری ذہنی تربیت
میں ان کا بڑا ہاتھ ہے وہ مجھ سے تقریریں لکھواتے تھے اور جلسوں میں بولنے کی ترغیب دیتے تھے شعر یا
نثر جو کچھ بھی میں لکھتا اسے بڑی توجہ سے سنتے تھے یہ ان کی ترغیب اور ہمت افزائی ہی کا نتیجہ تھا۔۔۔
ایک استاد عبدالصمد تھے ان دو استادوں نے میرا مستقبل ہموار کرنے یا اسے دریافت کرنے میں میری
بڑی مدد کی'' (صفحہ ۴۲)۔ جو بچہ گردشِ روزگار سے یتیم خانہ میں پہنچ جائے اور اسے اچھے ہمدرد اساتذہ مل
جائیں وہ خوش نصیب ہی تو ہے۔

اختر الایمان کی اس ذہنی تربیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کالجوں یونیورسٹیوں کے مباحثوں میں
جانے لگے اور اس طرح ان کے اندر بیٹھا ہوا دانشور بیدار ہو گیا۔ ''لکھنؤ یونیورسٹی' علی گڑھ یونیورسٹی'
کانپور' آگرہ لاہور اور دلی کے مقامی کالجوں میں جتنے بھی اس نوعیت کے مقابلے ہوتے تھے اپنے کالج
کی طرف سے میں ان سب میں شریک ہوتا تھا ہر جگہ کا پہلا انعام گویا میرے لئے وقف تھا'' (صفحہ ۶۹)
آگرہ کے سینٹ سٹیفنز کالج میں دوسرا انعام ملا تو میں یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ آپ نے غلط فیصلہ کیا ہے۔
اس کالج میں میری پہچان ایسے دو لڑکوں سے ہوئی جن سے ابھی تک دوستانہ مراسم ہیں۔ یہ ہیں سید مظفر
حسین برنی اور دوسرے ہیں مشتاق احمد یوسفی'' (صفحہ ۷۰)۔ ان کے عظیم مقرر ہونے کی گواہی حمید نسیم
کے ہاں بھی ہے کیونکہ وہ بھی مباحثوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ اینگلو عریبک کالج کے ذکر میں لکھتے
ہیں: ''یونین کے سالانہ جلسے میں تقریری مقابلے ہوتے تھے ہندوستان کے ہر کالج سے لڑکے آتے

تھے حسبِ دستور تقسیم انعامات کے بعد مجھ سے فرمائش کی گئی اور میں نے نظم ''فرار'' پڑھی۔ اس نظم میں
ایک مصرعہ تھا ''جس طرح اک فاحشہ عورت کو شوہر کا خیال''۔ قریشی صاحب یعنی صدر مشاعرہ نے مجھے
روک دیا کہ ''یہ نظم فحش ہے بند کرو'' (صفحہ ۸۶)۔ اسی واقعہ کے راوی ناممکن کی جستجو والے حمید نسیم بھی ہیں
''صدر یونین نے کہا مباحثہ کے آغاز سے پہلے چھوٹی سی محفلِ مشاعرہ منعقد کی جا رہی ہے یہ اعلان کر
کے اختر الایمان سے استدعا کی کہ وہ اپنا کلام سنائیں۔ اختر الایمان صاحبِ اسلوب شاعر بن چکے تھے
ان کی نظم میں کوئی ناشائستہ مصرعہ ''فاحشہ عورت کا خیال'' آ گیا۔ اس پر کسی بزرگ نے اعتراض کیا اور
اختر الایمان کو سٹیج سے اتار دیا گیا۔ اس کے بعد اس کا (حمید نسیم) نام پکارا گیا۔ وہ سٹیج پر آیا تو بہت
خشمگیں تھا اس نے آواز پر قابو رکھتے ہوئے اتنا کہا جس محفل میں ایک نامور شاعر کی توہین کی گئی ہو کہ
اسے نظم ختم کرنے سے پہلے سٹیج سے چلے جانے کا حکم دیا گیا ہو اس میں اسے شعر پڑھنے کے لئے کہنا
نہایت بدمذاقی ہے آدابِ شائستگی سے نہایت گھٹیا انحراف ہے۔۔۔ یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ پر لوٹ آیا پھر
ہال میں ہنگامہ ہو گیا'' (ناممکن کی جستجو صفحہ ۱۷۱)۔

روایت میں تقدیم تاخیر کا فرق ہے مگر اتنے لمبے عرصہ کے بعد اس بات کا یاد رہ جانا ہی بہت
ہے۔ ظاہر ہے یہ ایسا واقعہ یا حادثہ تھا جو نہ صرف اس شخص کو یاد رہا جس کو پیش آیا تھا بلکہ ایک مہمان مقرر
کو بھی یاد رہ گیا۔ اس کا مطلب ہے اس واقعہ کا گہرا اثر حاضرین پر مرتب ہوا ہوگا۔ اختر الایمان جب
لاہور آئے تو ''نئے لکھنے والوں میں یوسف ظفر' قیوم نظر' احمد ندیم قاسمی' ضیا جالندھری' حمید نسیم اور بہت
سے لکھنے والوں سے ملاقات ہوئی۔ حمید نسیم کو میں پہلے سے جانتا تھا کیونکہ وہ بھی لاہور سے تقریری
مقابلوں میں آیا کرتے تھے'' (صفحہ ۱۰۴)۔ اینگلو عریبک کالج میں اختر الایمان کی ملاقات نواب زادہ
لیاقت علی خان سے ہوئی۔ انہوں نے مجھ سے کہا'' پاکستان بن جائے تو مجھ سے آ کر ملنا''۔ ''میں تو
تقسیم کے حق میں ہی نہیں'' میں نے ان سے کہا (صفحہ ۸۳)۔ اختر الایمان کو اپنے اس فیصلہ پر کوئی
افسوس ہے نہ ندامت' مرے بت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو۔

پونے میں اختر الایمان کا ساتھ جوش صاحب سے بھی رہا۔ جوش صاحب کے بارہ میں بڑی
دلچسپ باتیں لکھی ہیں دو چار بڑے کام کی باتیں بھی ہیں جن سے جوش صاحب کی شخصیت کو سمجھنے میں

مدد ملتی ہے'' ہم جوش صاحب کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے وہ ہمارے بزرگ تھے ہم ان کی نظمیں سنتے بھی تھے اپنی نظمیں سناتے بھی تھے۔ جب کچھ سنانے لگتے تو کہتے ''لو۔ مردودو سنو'' (صفحہ ۴۵) ''زمانے کے بعد ایک بار بمبئی کی ایک ادبی نشست میں ملاقات ہوئی۔ کیفی، سردار، وشوامتر عادل اور تقریباً سب ہی کی بیویاں جوان تھیں اور دیکھنے میں اچھی بھی لگتی تھیں۔ اس نشست میں شامل تھیں۔ میری بیوی سلطانہ بھی میرے ساتھ تھیں جوش محفل میں آئے تو سب لڑکیوں کو دیکھ کر کہا ''مردودوں نے کیا کیا عورتیں رکھی ہیں''۔ سلطانہ گھر آ کر بہت بگڑیں کہ کیا مطلب تھا جوش صاحب کا اس بات سے؟ وہ کیا سمجھتے ہیں عورتوں کو'' وغیرہ وغیرہ۔ میں نے ہنس کر ٹال دیا کہ جوش صاحب کا سنجیدگی سے کچھ بھی مطلب نہ تھا'' (صفحہ ۱۲۶)۔

سب سے دلچسپ بات لکھنے میں ذرا سا تردد ہے کیونکہ جوش صاحب قبلہ تو غیر ثقہ گفتگو فرما لیتے تھے ہم جیسوں کو جن کی تربیت شریفانہ ماحول میں ہوئی ہے یہ بات بہت کھلتی ہے مگر روایت کرنا بھی ضروری ہے کہ جوش صاحب کی شخصیت کی ایک پرت کھلتی ہے۔ اختر الایمان پونے کے شب و روز کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں'' اسی زمانہ کی بات ہے نشست کے لئے ایک روز جوش آئے اور کہنے لگے'' ارے صاحب کیا زمانہ آیا ہے بچے بڑوں کی سی باتیں کرتے ہیں؟''

''کیا ہوا؟ جوش صاحب''

''آج صبح سویرے ہی ہمارا نواسہ آیا اور پوچھنے لگا'' نانا بچے کہاں سے آتے ہیں؟ اب صاحب بتانا تو ضروری تھا میں نے ایک الٹی سیدھی کہانی سی بنا کر اسے بتایا کہ فرشتے لے کر آتے ہیں''

''پھر؟''

''وہ بیٹھا آرام سے سنتا رہا اور جب میں بتا چکا تو کہنے لگا'' اماں نانا کیوں چوتیاپن کی باتیں کرتے ہو'' (صفحہ ۱۲۳)۔ گندم از گندم بروید جوز جو۔

رشید احمد صدیقی کے بارہ میں کہتے ہیں میں نے پوچھا'' رشید صاحب صحیح تنقید کیا؟''

''حضت دو اور دو کتنے ہوتے ہیں؟''

''چار'' میں نے جواب دیا

''کوئی پانچ کہہ دے تو کہئے قریب قریب ٹھیک ہے''۔

ایک اور موقع پر میں نے پوچھا'' تنقید کرتے وقت کس بات کا خیال رکھنا چاہئے؟''

''شرافت کا'' ان کا جواب تھا۔ (صفحہ ۱۰۸)

اختر الایمان نے بھی ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے باوجود ان کے طریق کار سے اتفاق نہیں کیا۔ لکھتے ہیں ترقی پسند'' ادب میں اپنی اجارہ داری چاہتے تھے کہ ان کی مہر تصدیق کے بغیر کسی تخلیق کو قبول عام حاصل نہ ہو مگر ایسا نہ ہو سکا نتیجہ یہ ہوا کہ جتنے اچھے اور معتبر لکھنے والے تھے وہ ترقی پسند حلقہ سے باہر ہو گئے دوسرے تیسرے درجہ کے لکھنے والے ترقی پسندوں سے جڑے رہے اور انجام کار وہ بھی ختم ہو گئے اور ترقی پسند تحریک کا وقار بھی۔'' (صفحہ ۱۱۴)

اس خودنوشت کی آخری سطور یہ ہیں: '' مجھے ڈیالیسس DIALYSIS کرواتے دو برس سے اوپر ہو گئے۔ اب میں تھک گیا ہوں اس دوران میں نے حتی الامکان اپنے تمام کام تقریباً مکمل کر دئے۔ مری سرگزشت بھی بری بھلی جیسی بھی ہے میرے خیال میں پوری ہو گئی ہے اس، میں میں نے صرف یادداشت کے بھروسے پر کچھ واقعات اور چند ساتھیوں کا ذکر کیا اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ مجھے اپنی زندگی سے کوئی شکایت بھی نہیں'' (صفحہ ۲۴۳۔۲۴۴) اس اختتامیہ کا تتمہ بیگم اختر الایمان نے لکھا ہے'' ۹ مارچ ۱۹۹۶ء کو ڈیالسس کے بعد تقریباً ایک بجے دوپہر ہسپتال سے گھر آئے۔ میں نے کھانے کے لئے پوچھا تو منع کر دیا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی کبھی ہسپتال سے آکر وہ کھانا کھاتے تھے اور کبھی آتے ہی سو جاتے تھے۔ اس روز وہ بغیر کھانا کھائے لیٹ گئے انہیں سردی لگ رہی تھی میں نے ان کے پہلو میں گرم پانی کی بوتل رکھ دی اور کمبل اوڑھا دیا۔ حسب معمول وقفہ وقفہ سے انہیں دور سے دیکھ لیتی تھی وہ آرام سے سوئے ہوئے تھے۔ تقریباً پانچ بجے میں نے دیکھا کروٹ بدل چکے تھے اور کمبل پیروں سے ہٹ گیا تھا۔ میں نے کمبل بالکل پیروں سے ہٹا دیا اور ہلکی چادر اوڑھا دی۔ کچھ دیر کے بعد مجھے احساس ہوا کہ بدن میں کوئی جنبش نہیں ہے۔۔۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ ان کا انتقال کوئی ایک گھنٹے پہلے ہو چکا تھا'' (صفحہ ۱۰) اس طرح اختر الایمان کی کہانی اختتام کو پہنچی۔

''اس آباد خرابے میں'' سوغات میں قسط وار چھپ کر بعد کو کتابی صورت میں مرتب ہوئی اس

لئے اس میں واقعات میں کہیں کہیں تقدیم وتاخیر کا احساس ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے جیسے جیسے کوئی بات یاد آتی گئی اسے قلم بند کرتے گئے۔ مجموعی طور سے کتاب رواں دواں ہے جس میں کوئی تکلف یا تصنع نہیں۔ لکھنے والے کی زندگی بھی اسی طرح تکلف سے عاری تھی اس طرح یہ خودنوشت اپنے مصنف کی پوری اور مکمل تصویر ہے۔

◎

ورودِ مسعود

''ورودِ مسعود'' ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی خودنوشت ہے۔ مسعود حسین خان صاحب کا تعلق ڈاکٹر ذاکر حسین خان کے خاندان سے ہے۔ یہ ان کے سب سے بڑے بھائی کے فرزند ارجمند ہیں۔ اس خاندان کے ایک فرد ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب کی خودنوشت کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ مسعود حسین خان صاحب نے تینوں بھائیوں کی شخصیت کے بعض اہم پہلو منکشف کئے ہیں اور کوشش کی ہے کہ اپنے نامور بزرگوں کے دباؤ سے سبک دوش ہو جائیں۔ مسعود حسین خان صاحب تو یہ تک لکھنے سے نہیں چوکے کہ ذاکر حسین خان صاحب خاصے غصہ ور آدمی تھے اور نوکروں پر سخت گیری کرنے سے بھی نہ چوکتے تھے حتیٰ کہ ایک نوکر کو کنویں میں لٹکا دیا تھا۔ (ورودِ مسعود صفحہ ۱۷) اور یوسف حسین خان صاحب کہ وہ جائیداد کے معاملہ میں بڑے بھائی سے یہاں تک الجھ پڑے تھے کہ ان کی ملک کی صدارت کے زمانہ میں ان کی پوزیشن کا خیال نہ کرتے ہوئے انہیں دھمکی دی تھی کہ وہ ایوانِ صدر کے سامنے دھرنا دینے سے بھی نہیں باز آئیں گے (صفحہ ۷۷)۔ ڈاکٹر محمود حسین صاحب کو غصہ آیا تو نوکر کو چھتری سے مار مار کر چھتری توڑ لی۔ (صفحہ ۴۷)

لیکن ان بزرگوں کی جلالی جمالی کیفیتوں کے مابین مسعود حسین خان صاحب نکتہ چین اور مین میخ نکالنے والے بھائی کی حیثیت سے ابھرتے ہیں جو نہ بڑوں کو معاف کر سکتا ہے نہ چھوٹوں کو اور سارا وقت اسی احساس کمتری میں مبتلا ہے کہ لوگ انہیں جو کچھ بھی سمجھتے ہیں اس میں بڑی حد تک بڑے چچا کی وجاہت اور مرتبہ کا اثر بھی شامل ہے۔ یہی احساس آگے چل کر اساتذہ کے بارہ میں بھی نمایاں ہوتا ہے کہ وہ اپنے اساتذہ پر بھی نکتہ چینی سے باز نہیں آتے۔

مسعود حسین خان صاحب علی گڑھ کے طالب علم رہے ایم اے وہیں سے کیا پھر پی ایچ ڈی کے لئے لندن سکول آف اورینٹل سٹڈیز میں گئے وہاں پروفیسر فرتھ سے نہ بنی اور بقول خود ان کے

سامنے ان کا پیشاب خطا ہونے لگا (صفحہ ۱۳۶) تو فرانس چلے گئے اور وہاں سے ''لفظ'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی۔ (غالباً ''حرف گیری'' کی ایک لم یہ بھی ہے)۔ واپس آ کر عثمانیہ یونیورسٹی میں صدر شعبہ اردو ہو گئے۔ علی گڑھ آنا چاہتے تھے اور پروفیسر آل احمد سرور کی کوشش سے جون ۱۹۶۸ء میں ان کا تقرر ہو گیا۔ سرور صاحب نے اپنی خودنوشت میں ہلکا سا شکوہ کیا ہے کہ مسعود حسین خاں صاحب نے ورود مسعود میں علی گڑھ یونیورسٹی میں اپنے آنے کے لئے صرف علیم صاحب وائس چانسلر کی عنایات کا ذکر کیا (صفحہ ۲۲۷) اور سرور صاحب کی کوششوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔

تینوں بزرگ جامعہ ملیہ میں رہے۔ ذاکر حسین خاں تو اس کے بانی اساتذہ میں سے تھے۔ یوسف حسین خان صاحب نے لکھا ہے ''جامعہ کی ابتدا شدید دینی جذبہ سے ہوئی۔ ایم اے او کالج کے آسائش اور آرائش والے کمرے چھوڑ کر نوجوانوں نے انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں ایک دو دن نہیں مہینوں پر مہینے کاٹ دئے۔۔۔ جامعہ کے نصب العین میں ایسی جاذبیت تھی کہ مولانا محمد علی کے علاوہ ملت کے دوسرے زعمانے بھی اس ادارے کے لئے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ حکیم اجمل خاں جامعہ کے پہلے امیر مقرر ہوئے'' (یادوں کی دنیا۔ صفحہ ۷۸ تا ۸۱ جستہ جستہ)۔ ''جب جامعہ ملیہ پر مشکل وقت پڑا تو اس کے بانی اساتذہ نے عہد کیا کہ وہ بلا معاوضہ کام کرنے کو بھی تیار ہیں۔ گیارہ استادوں نے حیاتی رکن بننا قبول کیا رکنیت کی شرط یہ تھی کہ وہ بیس سال تک اور اگر زندگی اس سے پہلے ختم ہو گئی تو آخری وقت تک جامعہ کی خدمت کا عہد کرتے ہیں اور کبھی ایک سو پچاس روپیہ سے زیادہ معاوضہ طلب نہیں کریں گے'' (صفحہ ۸۶)۔ مسعود حسین خان خدا جانے کس کل جگ کے زمانہ میں جامعہ سے وابستہ ہوئے کہ ''جامعہ کے استادوں میں بعض سیاہ روسیاہ کار بھی تھے۔ نہایت رکیک حرکتیں کرنے والے رسوائے زمانہ دوسروں کی بہو بیٹی کو بہکانے اور ہر قسم کا نشہ کرنے والے۔۔۔ کسی نے فائل سے ہائی سکول کا سرٹیفیکیٹ غائب کروا کے اپنی تاریخ پیدائش بدلوا دی۔۔۔ ایک صاحب ہائی سکول تا ایم اے تھرڈ ڈویژن سے سرفراز تھے لیکن پروفیسر بنے بیٹھے تھے''۔ مگر مسعود حسین خان صاحب کی شکایتوں کے باوجود جامعہ ملیہ کے بانی ارکان کی قربانیوں کو کون نظر انداز کر سکتا ہے؟ بہتر ہوتا کہ وہ اساتذہ کی رکیک حرکتوں کو اچھالنے کی بجائے اپنے ادارہ کی پردہ پوشی کرتے۔ اگر وہ اپنی خودنوشت میں ان باتوں کا رونا

نہ روتے تو ان کے لئے بہتر ہوتا۔

مسعود حسین خان نے اپنے علی گڑھ کے دو اساتذہ پروفیسر رشید احمد صدیقی اور آل احمد سرور کا موازنہ بھی کیا ہے۔ حالانکہ رشید احمد صدیقی نہ صرف ان کے بلکہ ان کے استاد آل احمد سرور کے بھی استاد تھے گویا ان کے لئے ان کا مرتبہ استاذ الاساتذہ کا تھا۔ اس کے باوجود وہ اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر ذاکر حسین پر دھر کر یہ بات کہنے سے نہیں چوکے کہ ''جب تک رشید صاحب شعبہ اردو کے سربراہ ہیں اس کی ترقی ممکن نہیں'' (صفحہ ۸۳)۔ سرور صاحب کے بارہ میں فرماتے ہیں ''سرور صاحب نسبتاً تنگ دل رکھتے ہیں وہ ابتدا میں جس کو بڑھاتے ہیں آخر میں اسی سے رشک کرنے لگتے ہیں''۔ پھر باقاعدہ ''موازنہ انیس و دبیر'' کہ: ''رشید صاحب کی شخصیت زیادہ کڑھی ہوئی تھی۔ صدیقی دونوں تھے لیکن رشید میں شیوخ کی آن بان تھی ان کے کردار کی نمایاں خصوصیت ان کی فیض رسانی اور کریم النفسی تھی ۔۔۔ سرور صاحب میں تواضع کرنے سے زیادہ تواضع کروانے پر زور ملتا ہے۔ رشید صاحب کا دسترخوان بہت کشادہ تھا ان کے یہاں معقول نامعقول ہر قسم کے مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا تھا خود سدا کے حاجت مند ہوتے ہوئے بھی دوسروں کی حاجت روائی کرتے رہے۔ (صفحہ ۸۴)

(معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر مسعود حسین خاں بھی کسی نہ کسی زمرہ میں ان کے دسترخوان سے فیضیاب ہوتے رہے ہیں)۔ پروفیسر آل احمد سرور نے خواب باقی ہیں میں جو باتیں ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب کے بارہ میں لکھی ہیں اس موازنہ سے ان کی لم سمجھ آ جاتی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ پانی کس نشیب میں مرتا ہے۔

مسعود حسین خاں صاحب کی اسی نکتہ چینی کی لپیٹ میں نامور محقق ڈاکٹر گیان چند جین بھی آ جاتے ہیں حالانکہ وہ تو ان کے ''استاد'' بھی نہیں۔ اتفاق ہے کہ ڈاکٹر گیان چند عثمانیہ یونیورسٹی میں پروفیسری کے امیدوار تھے۔ اتفاق سے مسعود حسین خان بھی امیدوار تھے اور وہ منتخب ہو گئے گیان چند منتخب نہ ہو سکے۔ اب آگے وہ دون کی لیتے ہیں ''میں سروری صاحب کے یہاں جا کر ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب سے ملا تو انہوں نے بڑے مزے لے لے کر گیان چند صاحب کی امیدواری کا قصہ سنایا۔ کہا، جیسا کہ آپ لوگوں کو معلوم ہو گا یہ الہٰ آباد کے طالب علم رہے ہیں لیکن وہاں سے فارغ التحصیل ہونے

کے بعد انہوں نے ہمیں کبھی نہیں پوچھا۔ اب جو انہیں اس انتخابی کمیٹی کے رکن ہونے کی خبر ملی تو اچانک میرے پاس ان کا خط آیا اور مجھے کسی زبانی امتحان کے لئے بھوپال آنے کی دعوت دی جہاں وہ اس وقت حمیدیہ کالج میں اردو کے استاد کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ میں نے بھی یہ خیال کیا کہ حیدرآباد ہی تو جانا ہے ایسی تاریخ دی کہ میں بھوپال ہوتا ہوا حیدرآباد پہنچوں۔ چنانچہ بھوپال میں امتحان لیا اور جب حیدرآباد کے لئے روانہ ہوا تو وہ بھی امیدوار کی حیثیت سے میرے ہمسفر تھے''۔۔۔

وہ جو کہتے ہیں دروغ گورا حافظہ نباشد دو چار ہی سطروں کے بعد رقم طراز ہیں ''دو روز کے بعد علی گڑھ کے لئے واپسی کا سفر اختیار کیا تو اپنا ہم سفر ڈاکٹر اعجاز حسین کو پایا۔ اسی سفر میں انہوں نے مجھے گیان چند صاحب کے ہم سفر ہونے کا قصہ سنایا '' (صفحہ ۱۹۶)۔ خدا معلوم کون سی بات درست ہے۔ مگر مسعود حسین خان صاحب کا بار بار ڈاکٹر گیان چند کے مقابلہ میں اپنے انتخاب کا ذکر کرنا اس بات پر دال ہے کہ ان کی کامیابی میں ان کی خاندانی وجاہت کا زیادہ اور ان کے علمی مرتبہ کا کم دخل تھا ورنہ انہیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ ایک ناکام ہو جانے والے امیدوار کا بار بار ذکر کر کے جلے دل کے پھپھولے پھوڑیں۔ ڈاکٹر گیان چند کا کام ان سے کہیں زیادہ وقیع اور ان کا علمی مرتبہ ان سے کہیں زیادہ ارفع ہے راقم الحروف نہ ڈاکٹر گیان چند سے ذاتی طور پر واقف ہے نہ مسعود حسین خان سے مگر جو کچھ میں نے اخذ کیا وہ ان کی ''ورود مسعود'' سے اخذ کیا ہے جو ان کی خودنوشت ہے اور ان کی شخصیت کی آئینہ دار۔ ان کی جغرافیائی معلومات کا تو یہ حال ہے کہ حسن ابدال کے گوردوارہ پنجہ صاحب کی زیارت کی تو اس جگہ کو ننکانہ صاحب فرمایا۔ ہمارے لئے ان کی ایک بات نئی تھی کہ جنرل رحیم الدین بچپن میں ان سے پڑھتے تھے تو ان سے خوب طمانچے کھایا کرتے تھے (صفحہ ۷۸) پاکستان کے اس دورہ پر آئے تو جنرل ضیاء الحق نے اپنی دعوت میں ان کو ان کی عزیزہ ثاقبہ رحیم الدین اور جنرل رحیم الدین کے درمیان بٹھا دیا (صفحہ ۲۹۲)۔ جنرل ضیا کے بارہ میں اسی صفحہ پر لکھتے ہیں جیسا سنا تھا انہیں ویسا ہی پایا۔ خدا معلوم انہوں نے کیا سنا تھا اور کیا نہیں سنا تھا؟ کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا!

◎

میرے مہ و سال

جاوید شاہین کی یادداشتیں ''میرے مہ و سال'' کے عنوان سے ۱۹۹۷ء میں لاہور سے چھپیں۔ غالب نے لکھنؤ جاتے ہوئے یہ کہا تھا ''لکھنؤ جانے کا مقصد نہیں کھلتا یعنی۔ ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو''۔ یہ یادداشتیں پڑھنے کے بعد پہلا سوال یہ اٹھتا ہے کہ جاوید شاہین کی یادداشتوں کا مقصد کیا ہے؟ اپنی زندگی کے حالات؟ ہمعصر ادیبوں کے رویوں کا بیان؟ رشید امجد کے فلیپ پر لکھے ہوئے سے میں اتفاق نہیں کر سکتا کہ ان یادداشتوں میں '' آس پاس کے ادبی ماحول، فنی رویوں شعری نظریات'' کی عکاسی کی گئی ہے۔ حیف کہ یہ عکاسی پڑھنے والوں کی نظروں سے اوجھل رہتی ہے۔ ہاں ان کے ہاں دوستوں کا احوال ضرور بیان ہوا ہے مگر صرف وہ جس کا ذکر انہیں مرغوب ہے یعنی ان کی زندگی کے منفی پہلو۔ ایک سو ساٹھ صفحات کی ان یادداشتوں میں بیس صفحے تو کشور ناہید کے لئے وقف ہیں۔ اور ان میں بھی کوئی نئی بات نہیں یہ سب کچھ تو کشور اپنی خودنوشت میں بیان کر چکی ہے۔ ایک تردید البتہ اس میں یہ ضرور ہے کہ یوسف کامران کو فوج والوں نے کسی سیاسی مقصد سے گرفتار نہیں کیا تھا مکان کے جھگڑے میں کسی فوجی افسر سے تو تو میں میں ہوگئی تھی یہ گرفتاری اس کا شاخسانہ تھی۔

مجھے اس کتاب نے ایک الجھن سے نکال دیا ہے۔ وہ الجھن یہ تھی کہ ترقی پسند تحریک کے محرکات کیا تھے اور اس تحریک نے اپنے پیرکاروں پر کیا اثرات مرتب کئے تھے؟۔ اب وہ تمام وجوہات سامنے آگئی ہیں جن کی وجہ سے یہ تحریک مضبوط سماجی پلیٹ فارم موجود ہونے کے باوجود ناکامی کا شکار ہوگئی۔ وامق جونپوری کی خودنوشت ان وجوہات کو طشت از بام کرنے کو کافی ہے۔

جوش صاحب کے زمانہ تک ماں باپ کے لئے احترام کی زبان استعمال کرنا شرفا کا وطیرہ تھا اور اب تک بعض لوگ اپنے والدین کے لئے وہ زبان استعمال نہیں کرتے جو جاوید شاہین نے اپنے ماں باپ کے لئے کی ہے۔ جاوید شاہین نے اپنے ماں باپ کو جس لہجہ میں مخاطب کیا وہ بے تکلفی کا لہجہ

سہی مگر والدین کے مرتبہ کے منافی ہے۔ جاوید شاہین اسی کو ترقی پسندی سمجھتے ہیں تو انہیں مبارک ہو۔
پچھلے برس وہ ٹورنٹو آئے تھے ان کا بیٹا ساتھ تھا وہ ان کے ساتھ پورے احترام کے ساتھ پیش آ رہا
تھا۔ اس سے بات ہوئی تو اس نے اسی طرح سے بات کی کہ والد صاحب یہ کرتے ہیں یا والد صاحب
وہ کرتے ہیں۔ جاوید شاہین کی کتاب غالباً اس کی نظر سے نہیں گذری تھی ورنہ وہ باپ کے بارہ میں
یہی کہتا ''میرا باپ یہ کرتا تھا۔ وہ کرتا تھا'' وغیرہ۔ اور اگر کہیں وہ باپ سے یہ پوچھ بیٹھتا کہ ''میں نے
اپنے گھر میں بھی ایسی ہی بات ہوتے دیکھی تھی مگر اس کو بیان کرنے کا حوصلہ مجھ میں نہیں'' کا کیا مطلب
ہے؟ تو باپ کیا جواب دیتا؟

یہ یادداشتیں بیسویں صدی میں ترقی پسند ذہنوں کے اخلاقی انحطاط کی آئینہ دار ہیں۔ منٹو پر
ایک گالی لکھ دینے کے الزام میں مقدمہ چلا تو ساری دنیا میں شور پڑ گیا۔ جاوید شاہین نے وہی گالی
شروع ہی میں دے کر اپنی ترقی پسندی کا ثبوت دے دیا۔ اور عبداللہ حسین نے اداس نسلیں میں وہ گالی
کم از کم سو مرتبہ دہرائی ہے۔ کیا گالی بکنا ہی ترقی پسندی ہے؟ جاوید شاہین کی یادداشتیں ایک ایسے شخص
کی یادداشتیں ہیں جو اچھا شاعر ہونے کے باوجود برا نثر نگار ہے اور زبان کی تھتھلاہٹ نے اس احساس
کو اور زیادہ سان پر چڑھا دیا ہے۔ کشور ناہید کا دوست تو ہے مگر اس کے مقابلہ میں جتنا کمتری کا احساس
اسے ہے کشور کے دوسرے دوستوں کو شاید نہیں ہوگا۔

یہ یادداشتیں جاوید شاہین کے احساس کمتری کا اعلان نامہ اور اس کی نگاہ میں کشور ناہید کی بالا
دستی کا اقرار بالجبر ہے۔ اس کے علاوہ ان یادداشتوں کے لکھنے اور چھاپنے کی اور کوئی وجہ سمجھ میں نہیں
آتی۔

◎

حیاتِ مستعار

جلیل قدوائی کی ''حیاتِ مستعار'' مکتبہ اسلوب کراچی نے چھاپی۔ اس میں ۱۹۰۴ء سے
۱۹۲۲ء تک کے حالات ہیں۔ اپنے بیان میں ندرت پیدا کرنے کی کوشش میں جلیل قدوائی صاحب
بڑی دور نکل گئے ہیں ''میں کب پیدا ہؤا اور کیوں پیدا ہؤا؟ کہاں سے آیا اور کہاں جاؤں گا؟'' ان امور
کے بارہ میں براہ راست کچھ معلوم نہیں'' (صفحہ ۱۱) یہاں تک تو غنیمت تھا آگے فرماتے ہیں ''اپنے
خاندان کے بارہ میں کچھ بتانے میں کچھ اسی قسم کی قباحتیں ہیں مگر اس معاملہ میں میری سب سے بڑی
رہنمائی اور شہادت میری امی سے ملی جن کی ہر بات پر آنکھ بند کر کے ایمان لانا اپنے مذہب (سنی حنفی)
پر ایمان لانے کے برابر سمجھتا ہوں اور جنہوں نے ساری عمر مجھے میرے عزیز و محترم ترین بزرگ جناب
شیخ ممتاز احمد قدوائی کو میرا باپ بتایا اور اپنا شوہر مانا'' (صفحہ ۱۳)۔ ولدیت بتانے کا یہ طریق جلیل
صاحب کو مناسب نظر آتا ہوگا مگر ہمارے ہاں شرفا اس طریق کو غیر مستحسن سمجھتے ہیں۔ بات دور نکل
جائے گی مگر کہہ دینے میں کوئی حرج نہیں۔ میر ناصر علی صاحبِ صلائے عام کے بارہ میں شاہد احمد دہلوی
نے لکھا ہے کہ عجیب سنکی طبیعت رکھتے تھے ایک بار اپنے بیٹے کی سفارش کے لئے کسی انگریز افسر کے
پاس گئے اس نے پوچھا یہ آپ کا بیٹا ہے؟ فرمایا ''یہ تو اس کی ماں ہی بتا سکتی ہے'' (گنجینۂ گوہر صفحہ ۲۹)
جلیل قدوائی صاحب بھی غالباً صاحبِ صلائے عام کے متبعین میں سے ہیں۔

یہ ساری خودنوشت غیر متعلق تفاصیل سے بھری پڑی ہے انداز بیان یادداشتی ادب والا کہ بات
سے بات نکلتی چلی جاتی ہے اور زمانہ کا لحاظ رکھے بغیر بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس میں قباحت یہ در
آئی ہے کہ بعض ایسے سیاسی واقعات و حالات کو درج کر دیتے ہیں جن کے یہ عینی گواہ نہیں محض سنی سنائی
باتوں کو اس وثوق سے بیان کرتے ہیں گویا یہ واقعات ان کی آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہوئے
ہیں۔ مثلاً جلیانوالہ باغ کا حادثہ۔ ان کی عمر اس وقت کوئی پندرہ برس کی ہوگی اخبارات میں جو کچھ

دیکھا پڑھا ہے اسے یوں بیان کیا ہے گویا خود اس رنگتی گلی میں موجود تھے۔ اسی طرح اپنے گوشت خور ہونے اور گوشت شناس ہونے کی بڑی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ اچھا گوشت حاصل کرنے کے گر تک بیان کر دئے ہیں کہ قارئین کے کام آئیں۔ کم از کم ''ادلے'' کے معنیٰ راقم الحروف کو ان کی خودنوشت پڑھ کر معلوم ہوئے۔

ساری کتاب کا انداز بیان پھیکا ہے زبان وہی اناؤ والوں کی جس میں چٹخارا ہے نہ شیرینی۔ اس کے بعد ان کی سرگزشت کا کوئی اور حصہ چھپا ہے تو وہ مجھ تک نہیں پہنچا۔

◎

ہمسفر

حمیدہ اختر حسین رائے پوری کی خودنوشت ''ہمسفر'' ۱۹۹۹ء میں کراچی سے چھپی۔ اس خودنوشت کو ''گرد راہ'' کا تتمہ کہنا چاہئے۔ بہت سی باتیں جو ڈاکٹر اختر حسین نے نہ لکھیں حمیدہ اختر حسین نے بڑی خوبصورتی سے بیان کر دیں اس لئے یہ حقیقتاً ایک ایسے ہمسفر کی داستانِ حیات ہے جو اپنے شریک سفر کی زندگی کی اونچ نیچ سے پوری واقفیت رکھتا تھا۔ خود کہتی ہیں ''میں نے جب ''گرد راہ'' کا مسودہ پڑھا تو جگہ جگہ بے اختیار میرا جی چاہا کہ بہت کچھ جو یہ ان کہا چھوڑتے چلے گئے ہیں میں اس کو پر کردوں مگر میری کیا مجال تھی کہ اشارتاً بھی کچھ کہہ سکتی'' (صفحہ ۱۶۸)۔ اس کی ایک وجہ تو یہ بھی تھی کہ اختر حسین نے انہیں منع کر دیا تھا کہ ان کے ماضی کے بارہ میں ان سے کوئی سوال نہ کیا جائے۔ حمیدہ نے ان سے کچھ نہیں پوچھا مگر آخر ایک پولیس والے کی اور ''نیلی چھتری'' کے مصنف کی بیٹی تھیں جاسوسی تو ان کے خون میں تھی۔ سروجنی نائیڈو سے سب کچھ سن لیا اور آفرین ہے کہ عورت ہونے کے باوجود اختر حسین رائے پوری کے کان میں بھنک تک نہیں پڑنے دی کہ یہ ان کے ماضی کی غواصی کر چکی ہیں۔ انہیں حمیدہ کے اس کمال کا اسی دن علم ہوا ہوگا جس روز پہلے ان کے ماموں اور پھر ان کے والد صاحب بھولی بسری یادوں کی طرح اختر حسین رائے پوری سے ملنے ان کے گھر آئے ہوں گے۔

اس خودنوشت میں صرف ڈاکٹر اختر حسین کا احوال ہی نہیں بابائے اردو مولوی عبدالحق کی شخصیت کا ''پدرانہ شفقت'' کا پہلو بھی بیان ہوا ہے اور اردو ادب کی تاریخ میں شاید بابائے اردو کی شخصیت کے اس پہلو پر پہلے کبھی کچھ نہیں لکھا گیا۔ انہوں نے اختر حسین رائے پوری کو اپنا بیٹا بنا کر اپنے پاس رکھا' ہنستے کھیلتے بہو بیاہ کر لائے' اس گھر میں جہاں عورت کے نام پر کوئی چڑیا پر نہیں مار سکتی تھی اپنی بہو کو چاؤ چونچلے سے رکھا۔ خاطر داریاں کیں' بہو کی دلدہی کی خاطر اپنے عادات و اطوار میں تبدیلی لانے پر راضی ہو گئے۔ جب اختر حسین انہیں چھوڑ کر دہلی سدھارے تو حمیدہ اختر حسین نے وہ

دردناک منظر بڑی چابک دستی سے بیان کیا ہے۔ مولوی صاحب کا دل توڑ کر جانے کا بدلہ انہیں اس صورت میں ملا کہ جب وہ ڈکشنری چھپی جس میں اختر حسین رائے پوری نے راتیں کھپادی تھیں اور سَحرَ اللّیالی کا نمونہ پیش کیا تھا، مولوی صاحب نے ان کی خدمات کا سرسری ذکر تک بھی نہ کیا۔ مگر اس کے باوجود ان دونوں کی نیازمندی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ حمیدہ انہیں اپنے باپ کی جگہ دیتی رہیں اور مولوی صاحب بھی اختر حسین رائے پوری کو اپنا بیٹا ہی جانتے رہے۔ اگرچہ بعض لوگوں نے اس پر بہت حاشیہ آرائی بھی کی ہے کہ یہ مولانا عبدالحق کی پرانی عادت ہے کہ وہ لوگوں کو ان کی محنت کی داد نہیں دیتے جیسے لغات کبیر کے سلسلہ میں مولوی احتشام الدین حقی کے ساتھ ہوا مگر اب یہ سارا معاملہ تاریخ کا حصہ ہے۔ حمیدہ اختر حسین رائے پوری نے مولوی احتشام الدین حقی صاحب کا خوب نقشہ کھینچا ہے کہ ''سامنے سے کوئی بزرگوار کمر اتنی جھکی ہوئی جیسے یہ دوہرے ہوئے جارہے ہیں بہت ہی گوراچٹا رنگ ہاتھ میں باریک سی چھڑی لئے میری طرف بڑھ کے قریب آکر کہتے ہیں۔۔۔'' (صفحہ ۷۶)

ہم سفر میں حمیدہ اختر حسین نے مشرقی بہو بیٹیوں کا روایتی لب ولہجہ قائم رکھا ہے اب یہ سب باتیں خیال ہوتی جارہی ہیں۔ کم سنی میں بیاہ کر ''ایک بوڑھے بچے اور ایک جوان بچے'' کے ساتھ پردیس سدھاریں مگر غربت میں سروجنی نائیڈو، بیگم قاضی عبدالغفار، بیگم نواب منظور یار جنگ یا ان کی بیٹی منیرہ بانو شجرہائے سایہ دار کی طرح ان پر سایہ کئے رہے۔ حیدرآباد ان کا گھر بن گیا اور یہ وہاں اپنا گھر سمجھ کر رہیں۔ ہمسفر کی زبان بڑی شستہ اور رفتہ زبان ہے۔ حمیدہ اختر حسین نے ماں سے لکھنؤ کی زبان کی شیرینی ضرور لی ہے مگر تکلف اور تصنع نہیں لیا۔ علی گڑھ نے ان کی زبان کو اور زیادہ رواں دواں بنادیا ہے۔ ''گردِراہ'' کی زبان ''ہمسفر'' کی گرد کو بھی نہیں پہنچتی۔ طبیعت کے لحاظ سے بھی حمیدہ بڑی نڈر بہادر اور دھن کی پکی ہیں۔ جس طرح پنڈت پنت سے جا کر پاسپورٹ کے معاملہ پر بھڑ اور اڑ گئیں اور کوئی ایسا نہ کرسکتا۔ بابائے اردو نے تو انہیں ''چٹ پٹی لڑکی'' کہا تھا۔ گاندھی جی کے سامنے بھی یہ اپنی ''ٹرٹر'' سے باز نہ آئیں اور انہیں خوب کھری کھری سنادیں کہ یہ آشرم محض ڈھونگ ہیں ''آپ برا نہ مانئے گا سچ بات یہ ہے کہ مجھے تو یہ سب تماشا لگا کہ لوگ جھاڑو دے رہے ہیں پانی بھر کر لا رہے ہیں گوبر اٹھارہے ہیں جب کہ یہی لوگ اپنے اپنے گھروں میں واپس جا کر صاحب بہادر اور میم

صاحب بن جاتے ہیں۔ آج صبح میں نے سروجنی جی کو جھاڑو دیتے دیکھا یہ تو اپنے گھر میں کبھی خود ایک گلاس پانی بھی اٹھ کر نہیں پیتیں۔ یہ بیٹھی تو ہیں آپ ان سے پوچھ لیں'' (صفحہ ۲۰۸) چلئے اس ڈھونگ پر تو گاندھی جی سے جو کہا، سو کہا، وجے لکشمی پنڈت اور سید حسین کی شادی کے بارہ میں بھی ٹوکنے سے باز نہ آئیں: ''آپ کی نظر میں جب ہندو مسلمان ایک ہے تو آپ کو سب سے بڑھ کر اعتراض کیوں ہو۔ بیچاری لکشمی پنڈت نے جب سید حسین صاحب سے شادی کرلی تو آپ ہی نے بہانے سے سید حسین صاحب کو ولایت بھیج کر لکشمی جی کو کئی ماہ نظر بند رکھا جب تک ان کے پھیرے نہ ڈلوا لئے۔ میں ٹھیک بات کہہ رہی ہوں نا؟ اس کا کیا جواب ہے آپ کے پاس؟ عینک کو اور نیچا ناک پر کرکے ذرا تھم کر بولے'' بات یہ ہے کہ مسلمان اور ہندو بہن بھائی تو پھر بہن بھائی کی شادی کیسے ہو؟ اس جواب پر مجھے ہنسی تو بڑے زور کی آئی'' (صفحہ ۲۰۹)

احوال الرجال کے سلسلہ میں خالدہ ادیب خانم کا ذکر فکر انگیز ہے: ''درمیانہ قد، چھریرا جسم سنہرے بال کشادہ ماتھا بڑی بڑی آنکھیں جن میں چمک دمک کے ساتھ گہرائی کا احساس ہوا'' (صفحہ ۲۲۳)۔ خالدہ ادیب ترکی سے مجبوراً جلاوطن ہوکر پیرس میں رہ رہی تھیں کیونکہ انہیں مصطفی کمال پاشا سے سیاسی اختلاف تھا ''مصطفی کمال کے لئے میری زبان سے جب بھی کوئی ایسا ویسا لفظ نکل جاتا تو خالدہ خانم میری اس جسارت پر اپنی بڑی ہی ناگواری کا اظہار کرتیں میرے ذہن نشین کراتیں کہ کسی فرد کی ملک کے آگے کوئی حقیقت نہیں۔ اپنے ملک کا محسن کوئی کمزوری دکھا بیٹھے تو وہ بھی تو ایک انسان ہی ہے دیکھنا یہ چاہئے کہ اس نے ملک کے لئے کیا کیا عظیم کارنامے انجام دئے'' (صفحہ ۲۳۰)۔ اس کے ساتھ ان کی حب الوطنی کا عالم یہ تھا ''ہم واپس آرہے تھے تو میں نے دیکھا کہ زمین پر جھک کر انہوں نے سگرٹ کا ٹکڑا اٹھالیا اپنے بٹوے میں سے ایک کاغذ نکال کر اس کو لپیٹ لیا اور ہاتھ میں پکڑے رہیں۔ جب ہم سڑک کے کنارے لگے ہوئے کوڑے کے ڈبے کے پاس سے گذرنے کو تھے تو ہاتھ بڑھا کر وہ کاغذ اس میں ڈال دیا۔ اب میں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا آخر انہوں نے زمین پر سے اس سگریٹ کی لڑی کو کیوں اٹھالیا تھا؟ مسکرا کر کہا یہ ٹرکش سگریٹ تھی اس پر ہمارے ملک کے پرچم کا چاند بنا ہوا تھا۔ کسی کا پیر اس پر پڑ جاتا تو بے حرمتی ہوتی'' (صفحہ ۲۲۶)۔

حمیدہ اختر حسین نے ہماری بیوروکریسی کے رویوں پر بھی اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی ہے۔ چودھری محمد علی کہ بڑے نیک نام افسر اور وزیرِ اعظم سمجھے جاتے تھے یہاں تک اقربا پروری کے مرتکب ہوئے کہ:

''اختر حسین رائے پوری کو تعلیمی محکمہ کا انچارج بنانے کا فیصلہ کیا گیا کیونکہ سب سے سینئر یہی تھے چند ہی دن بعد چودھری محمد علی نے اپنے خالو خلیفہ اسد اللہ صاحب کو جو ساری عمر کلکتہ لائبریری کے لائبریرین رہ چکے تھے ان کو یہ عہدہ عطا فرما دیا۔ اختر کو بڑا ملال ہوا مگر منہ سے کچھ نہ کہا۔ میں سوچتی کہ آخر لوگ ان کے ساتھ ناانصافیاں اور حق تلفیاں کیوں کرتے ہیں؟ کیا ایک نئے ملک کی بنیاد کی پہلی اینٹ آڑی ترچھی رکھنا ستم نہیں۔ تعلیم جیسی سب سے ضروری چیز کو ان جانے ہاتھوں میں تھما دینا کہاں کی عقلمندی ہے؟'' (صفحہ ۲۶۶)

حمیدہ اختر حسین کو یہ ناانصافی تو نظر آ گئی وہ ناانصافی نظر نہ آئی جو ہاشم رضا صاحب نے متروکہ جائیدادوں کے بانٹنے میں مچا رکھی تھی ''میں ہاشم رضا صاحب کے پاس گئی۔ وہ اس وقت کراچی کے کمشنر لگے ہوئے تھے ان کے خاندان سے ہمارے خاندانی تعلقات تھے میں نے جا کر ان کو بتایا کہ ایک چھوٹے بچوں کا سکول گھر میں کھول لیا ہے اگر وہ کوئی ڈھنگ کی جگہ الاٹ کر دیں تو انشاءاللہ جلد ہی یہ ننھا سا سکول بڑے اسکول کی شکل اختیار کر لے گا۔ انہوں نے اسی وقت اپنی دراز سے ایک گچھا بڑی چابیوں کا نکال کر ایک سپاہی کو بلا کر اس کے ہاتھ میں تھما کر کہا ''بیگم صاحب کو جمشید روڈ کی کوٹھیاں لے جا کر دکھاؤ جو یہ اسکول کے لئے مناسب سمجھیں اس کی الاٹمنٹ کر دی جائے'' (صفحہ ۲۷) گویا وہ سب جائیداد ان کی ذاتی ملکیت تھی اور وہ جسے چاہتے تھے الاٹ کر سکتے تھے اور کرتے تھے۔ وہ سارے ضابطے وہ سارے قوانین جن کی پاسداری کے لئے ہاشم رضا صاحب کو کمشنر لگایا گیا تھا دھواں بن کر اڑ گئے؟ حمیدہ اختر حسین اس پر پھولے نہ سمائیں۔ کوٹھی پر قبضہ کیا وہ تو اختر حسین رائے پوری کے اندر کا منصف مزاج انسان جاگ اٹھا انہوں نے اس غلط بخشی پر پانی پھیر دیا۔ ''کیا ہم پاکستان اس لئے آئے ہیں کہ لوگوں کی جائیداد پر قبضہ کریں؟ الاٹمنٹ کے ٹکڑے کر کے پھینک دئے کنجی دور اچھال دی ۔۔۔ دفتر جاتے وقت کہا آپ ابھی یہ کنجی اور یہ الاٹمنٹ کے ٹکڑے ہاشم رضا صاحب کو دے کر آئیں۔ ۔۔۔ ہاشم رضا صاحب ہنسنے لگے کہ ''دیکھ لیجئے گا پاکستان کی ہسٹری میں یہ واحد واقعہ رہے گا کہ کسی نے

اتنی بڑی جائیداد کی چابی اور الاٹمنٹ واپس کیا ہو'' (صفحہ ۲۷)۔

ہم سفر ایسے فکر انگیز واقعات سے معمور خودنوشت ہے۔ جس نے جہاں ان کے اندر سوئے ہوئے ادیب کو جگا دیا ہے وہاں اختر حسین رائے پوری کی شخصیت کے بعض روشن گوشوں کو اور نمایاں کر دیا ہے اور غالباً ان کا منتہائے مقصود بھی یہی تھا۔ یہ خودنوشت اردو کی چند زندہ رہنے والی خودنوشتوں میں شمار ہوگی اور زندہ رہے گی۔ اس کے اندر جو خدمت گذار بیٹی، پرخلوص بیوی اور محبت کرنے والی ماں ہے وہ اپنے اوصاف حمیدہ کی وجہ سے پائندہ رہے گی۔

ڈگر سے ہٹ کر

ہندوستان سے چارنئی خودنوشت سوانح عمریاں چھپی ہیں۔ ندا فاضلی کی ''دیواروں کے باہر''، سعیدہ بانو احمد کی ''ڈگر سے ہٹ کر'' زبیر رضوی کی ''گردش پا'' اور کلیم الدین احمد کی ''اپنی تلاش میں'' کا تیسرا حصہ۔ سعیدہ بانو احمد، کی خودنوشت واقعی اسم بامسمّیٰ خودنوشت ہے کیوں کہ اس میں انہوں نے ہماری عام مشرقی بلکہ جنوبی ایشیائی عورت کی روایتی پردہ داری سے کام نہیں لیا اور اپنے حالات کو بڑی جرأت سے بیان کر دیا ہے۔ وہ لکھنو کے ایک شریف گھرانے کی چشم و چراغ ہیں۔ پاکستان میں بھی یہ خاندان، سید آل رضا کا خاندان، جانا پہچانا معروف خاندان ہے کیونکہ پاکستان کے ابتدائی زمانہ میں یہ خاندان پاکستان کی سول سروس کے مقتدر عہدوں پر فائز رہا۔ سعیدہ بانو اسی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ اپنے میاں عباس رضا سے نباہ نہ ہوا تو علیحدگی اختیار کر کے پامردی سے حالات کا مقابلہ کرتی رہیں۔ آل انڈیا ریڈیو کی معروف نیوز ریڈر تھیں اپنی آواز کے ناتے سے دور دور تک پہچانی جاتی تھیں۔ دلی کے مسلمان میئر اور دلی کی اسمبلی کے سپیکر نور الدین احمد سے دوستی رہی پھر نکاح کر لیا۔ ہمارے معاشرہ میں بے سہارا عورت جن حالات سے گذرتی ہے وہ انہیں بھی پیش آئے مگر ثابت قدمی سے انہیں جھیل گئیں۔

ایک تقابل بڑا دلچسپ ہے کہ اختری بائی فیض آبادی نے جب اشتیاق صاحب سے ۱۹۴۳ء میں نکاح کیا تو سعیدہ بانو اور ان کے پہلے میاں عباس رضا اس نکاح میں پیش پیش تھے۔ سعیدہ بانو پروگرام کرنے آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ جاتی تھیں وہاں اختری بائی نے ان سے کہا کہ وہ اشتیاق صاحب سے نکاح کرنا چاہتی ہیں۔ دونوں میاں بیوی نے ان کی مدد کی نکاح ہو گیا اور اختری بائی، بیگم اختر بن گئیں۔: ''میں نے اختری کے اعزاز میں ایک پردہ پارٹی کر کے انہیں لکھنؤ کی بیگمات اور رانی مہارانیوں سے متعارف بھی کروا دیا اب ان کے لئے گویا سوسائٹی کے دروازے کھل گئے۔''

(صفحہ ۱۰۶) مگر ستم ظریفی یہ ہوئی کہ جب سعیدہ اپنے میاں سے علیحدہ ہوئیں تو اعتراض کرنے اور ٹوکنے والوں میں اختری ہی سب سے آگے تھیں۔ بیگم اختر نے انہیں خط لکھا: ''آپ نے ابن بھائی (یعنی عباس رضا) کو چھوڑ کر بڑی بدنامی کا کام کیا۔ اسی موضوع پر دو صفحے بھر دیے۔ ختم اس شعر پر کیا 'سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا۔ کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا'۔ (مجھے) یہ بھی خیال آیا کہ اللہ اللہ یوں بھی ہوتا ہے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ اختری شرافت کا چغہ پہننے کے لئے میرے گھر کی چوکھٹ لے رہی تھیں اور آج انہوں نے مجھے اپنی جگہ پہنچانے کا تصور باندھا''۔ (صفحہ ۱۹۲۔۱۹۳)

''ڈگر سے ہٹ کر'' واقعی ڈگر سے ہٹ کر لکھی گئی داستان حیات ہے جس کا دیباچہ قرۃ العین حیدر نے لکھا ہے اور بہ قول مصنفہ کے ان کی خودنوشت کو 'پڑھی جا سکتی ہے' کی سند دی ہے۔

◎

دیواروں کے باہر

ندا فاضلی کی خودنوشت کا پہلا حصہ ''دیواروں کے بیچ'' پہلے چھپ چکا ہے۔ اس کا جائزہ لیتے ہوئے میرا اپنا خیال تھا کہ اس میں ندا صاحب نے بہت کچھ افسانوی باتیں بھی حقائق کے روپ میں بیان کر کے اپنی انا کی تسکین کرنا چاہی ہے مگر میرے پاس اس کے جواز میں کوئی دلیل موجود نہیں تھی اس لئے میں اس کے اظہار سے باز رہا۔ اب اپنی خودنوشت کے دوسرے حصہ ''دیواروں کے باہر'' میں ندا فاضلی نے خود اعتراف کیا ہے کہ پہلے حصہ میں بہت کچھ افسانوی تھا۔ انہوں نے اس خودنوشت کے تعارف میں اپنی پہلی خودنوشت کو ''سوانحی ناول'' کہا ہے۔ گویا ''دیواروں کے باہر'' ان کا دوسرا سوانحی ناول ہے۔ اپنے احوال کے بیان میں انہیں افسانہ نگاری کا سہارا کیوں لینا پڑا اس کی لم انہیں معلوم ہوگی۔ پڑھنے والے کو قدم قدم پر تشنگی کا احساس ہوتا ہے یوں لگتا ہے کہ مصنف قاری سے کچھ کہتے ہوئے جھینپ رہا ہے۔

''دیواروں کے باہر'' درحقیقت ندا فاضلی صاحب سے زیادہ بھارت کے ادیبوں شاعروں کی سرگزشت لگتی ہے۔ پاکستان کے قارئین کو اس لئے بھی اس میں دلچسپی محسوس ہوتی ہے کہ وہ ان لوگوں کے احوال سے باخبر نہیں ہیں۔ کچھ اس لئے بھی یہ سرگزشت پڑھنے والی لگتی ہے کہ اس میں ممبئی کی فلمی دنیا کا ذکر ہے۔ کمال امروہوی اور مینا کماری کا احوال مذکور ہے۔ کمال امروہوی کی حسن پرستی اور مدھوبالا کی حسن آفرینی کا بیان ہے۔ اس شہر ناپرساں کے شب و روز کا تذکرہ ہے جہاں ساحر لدھیانوی اور کرشن چندر رہتے ہیں۔ جہاں عصمت چغتائی کی لاش سپرد آتش ہوتی ہے۔ جہاں ندا فاضلی کو شاعروں کے ناموں کے ساتھ شاعری کرنے کی آزادی ہے: ''مخدوم اللہ کو پیارے ہو گئے۔ سردار جعفری اپنی لمبی تیراکی کے بعد کنارے ہو گئے، ساحر فلمی آسمان کے ستارے ہو گئے، جذبی دور کے نظارے ہو گئے، مجروح تھوڑا لکھ کر بہت سارے ہو گئے، ظ۔ انصاری کئی شادیاں کر کے پھر سے

کنوارے ہو گئے، کیفی سٹیج کے دلارے ہو گئے''۔ (صفحہ ۴۴)۔ اس اقتباس سے جہاں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ندا فاضلی اپنی خوردی کے باوصف اپنے سے بڑوں پر فقرہ چست کرنے میں کتنے دلیر ہیں وہاں یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اگر کوئی اپنے احوال کو بیان نہ کرنا اور اپنے احساس کمتری کو چھپانا چاہے تو اسے کیا کیا پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔

اس سرگزشت کو پڑھ کر یوں لگتا ہے جیسے بھارت کی سرزمین پر بسنے والا ہر شاعر اپنے سامنے کسی اور کو کچھ نہیں گردانتا۔ ''حسن نعیم محفل میں اپنی غزل سنا رہے ہیں۔ غزل کا ہر مصرعہ ہونٹوں سے باہر آنے سے پہلے اعلان کرتا ہے پہلا خدائے غزل میر تقی میر، دوسرا بابائے غزل مرزا غالب، تیسرا دانائے غزل حسن نعیم، باقی سب عین نون میم۔ انہیں اپنی غزل سے دیوانگی کی حد تک عشق ہے'' (صفحہ ۸۸) اختر الایمان کے بارہ میں ان کی رائے ہے: ''اردو کی سات سو ساڑھے سات سو سالہ تاریخ میں اختر الایمان اپنے علاوہ صرف غالب سے عقیدت رکھتے ہیں لیکن اس عقیدت میں بھی ان کا رویہ مریدانہ سے زیادہ ناقدانہ ہے۔ وہ اپنی شاعری میں ہی صرف غزل کے مخالف نہیں غالب کی عظمت میں جو تھوڑی بہت کسر انہیں محسوس ہوتی ہے اس کا قصوروار بھی وہ اسی کو ٹھہراتے ہیں ان کا خیال ہے مرزا غالب نے غزل کو غزل بنایا لیکن غزل نے وہ جتنے تھے اس سے بہت کم کر کے انہیں دکھایا ......اپنی شاعری کے مسلسل مطالعہ کے بعد وہ خود اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے کہ انہوں نے جو شاعری کی ہے وہ نہ صرف اہم ہے بلکہ یہی شعری پیمانہ دوسروں کی شاعری کو جانچنے پرکھنے کا پیمانہ بھی ہے۔ اختر صاحب کی اس کسوٹی پر کوئی دوسرا پورے طور پر پورا نہیں اترتا۔ نہ ماضی میں نہ حال میں۔'' (صفحہ ۱۶۶۔ ۱۶۷) خود اپنے بارہ میں ندا کا کہنا ہے کہ: ''فن کی تخلیق کی طرح فن کی پہچان کا مسئلہ بھی دو اور دو چار کی طرح سیدھا سادہ نہیں ہے کافی پیچیدہ ہے۔ ایک ہی عہد میں اس کی پہچان کے زاویے بھی الگ الگ ہوتے ہیں اور عہد بہ عہد بھی ان میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اسی لئے ادب میں تنقید کی ہر سرپرستی فنکار کے لئے گمراہ کن ہوتی ہے۔ یہاں تخلیق کار کے اپنے اعتبار اور معیار سے ہی روشنی پھوٹتی ہے۔ کبیر اور نظیر کی مثالیں ادبی تاریخ کی زندہ شہادتیں ہیں۔ نظیر برسوں بااعتباروں میں بے اعتبار رہے اور کبیر صدیوں تک ناقدین کی بے توجہی کا شکار رہے...... میں نے بھی اپنے طور پر جیسی بھی مجھ سے

بن پڑی شاعری کی ہے۔ یہ کیسی ہونی چاہئے یا کس طرح کرنی چاہئے اس کے بارہ میں نہ رائج قواعد کی پیروی کی نہ کبھی اس کی ضرورت محسوس کی۔ میرے خیال میں تنقید جب تخلیق کی روشنی میں تخلیق کو سمجھنے سمجھانے کی جائز حدوں کو پھلانگ کرنا جائز فتوے صادر کرنے لگتی ہے تو ادبی عبادتوں کو بھٹکانے لگتی ہے۔'' (صفحہ ۱۹۷) یہ محاکمہ اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ ندا فاضلی کے ادبی مرتبہ کو رائج الوقت تنقیدی رویوں یا بہ الفاظ دیگر نقادوں نے نہیں پہچانا! اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے وہ جابجا اپنی نظموں کی تشریح وتوضیح وتفسیر کرتے اور ان کے حوالے دیتے چلے جاتے ہیں۔

اس خودنوشت میں بعض شاعروں کے بارہ میں چونکا دینے والی باتیں بھی ملتی ہیں۔ جون ایلیا، امروہے جاتے ہیں تو اپنے وطن سے محبت کے اظہار کے لئے کیا کچھ کرتے ہیں وہ دلچسپ بھی ہے عبرت انگیز بھی۔ ''گاڑی سے اترتے ہی پلیٹ فارم پر لیٹ کر زمین سے ماتھا ٹکرانے لگے۔ انہیں اس حالت میں دیکھ کر اچھی خاصی بھیڑ ہو گئی اور جون اپنی دھن میں ہاتھوں سے زمین سے دھول سمیٹ اپنے بالوں میں ڈالتے رہے اور ہائے امروہہ، ہائے امروہہ کہہ کر آنسو بہاتے رہے۔۔۔۔۔ جیسے ہی سٹیشن سے باہر آئے فوراً آزاد ہو کر کسی درخت سے لپٹ کر زار زار روتے تھے کبھی کسی مکان کو دیکھ کر بے اختیار روتے تھے'' (صفحہ ۱۱۹)۔ ندا بعض ہندو شرفاء کو ان سے ملانے کے لئے ایک کلب میں مدعو کرتے ہیں وہاں: ''جب شراب شباب پر آتی ہے تو وہ صوفہ سے اتر کر فرش پر بیٹھ جاتے ہیں اور پھر پاؤں پھیلا کر لیٹ جاتے ہیں۔ کچھ دیر خاموشی سے چھت کو دیکھتے ہیں پھر اچانک زور سے چلاّتے ہیں ''ہندوؤ تم پر لعنت ہے تم نے مجھے پاکستان مرنے کے لئے بھیج دیا اور خود یہاں عیش کی زندگی بتا رہے ہو۔ جانی یہ تم نے میرے ساتھ بڑی بے انصافی کی ہے اسے میں معاف نہیں کروں گا'' اتنا کہہ کر ان کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں اور وہ پھر سے گویا ہوتے ہیں جانی مجھے یہاں بلا لو بلا لو اور وہاں کے جہنم سے بچا لو بچا لو! اپنی جذباتیت میں وہ بھول جاتے ہیں جہنم ایک نہیں دونوں ہیں''۔ (صفحہ ۱۱۹ تا ۱۲۱ جستہ جستہ)۔ علی سردار جعفری کے بارہ میں: ''سردار جعفری مسلم پرسنل لاء کی رجعت پسندی کے خلاف اپنی مخالفت درج کرتے ہیں اور حیدر آباد کے ایک مشاعرہ میں کچھ جالی دار ٹوپیاں پہنے نوجوان سب کے سامنے انہیں جوتوں کے ہار سے نوازتے ہیں۔'' (صفحہ ۱۹۱)

کمال امروہوی اور اس دور کی خوب صورت اور حسین اداکارہ مدھو بالا کا ذکر سنئے: ''مدھو بالا بہت حسین خاتون تھیں خدا نے انہیں بڑی احتیاط سے بنایا تھا۔۔۔۔ تو صاحب ایک دن میں نے انہیں گھر پر بلایا اور لگاتار دو تین گھنٹے انہیں دیکھتا رہا۔ مسکراتے ہوئے، چلتے ہوئے، آنکھوں سے بولتے ہوئے، ہاتھوں سے سوچتے ہوئے، پیروں سے زمین پر کچھ کھوجتے ہوئے۔ ان کے جانے کے بعد جب سویا تو بڑی اچھی نیند آئی۔ حسن کا بھی نشہ ہوتا ہے'' (صفحہ ۱۱۶۔۱۱۷)

عصمت چغتائی کے 'ارزل العمر' کی باتیں: ''ترشے ہوئے بنا چوٹی کے بہت سارے کالے بال، پان سے رنگی ہوئی بڑھاپے کی کم عمر مسکراہٹ، بوڑھے چشمے سے جھانکتی ہوئی جوان آنکھیں اور تیز دھار میرٹھ کی قینچی کی طرح چلتی تیز زبان جس میں عورت مرد کی بات چیت کے دائرے ہمیشہ ایک دوسرے کو لانگتے پھلانگتے رہتے ہیں، ان کی نمایاں خصوصیت ہیں۔ وہ جس جگہ ہوتی ہیں بولنے کا حق صرف انہیں کو ہوتا ہے جو اس معاہدہ کو توڑنے کی جسارت کرتا ہے تو اس بری طرح ان کے کسی جملے کا شکار ہوتا ہے کہ وہ کئی دنوں تک اپنی مردانگی پر شک کرتا رہتا ہے۔۔۔۔۔ اس وقت ان میں وہ چغتائیت غائب ہو چکی تھی جو محفلوں میں دھاڑتی تھی اور بڑے بڑے جواں مردوں کو تیکھے فقروں سے پچھاڑتی تھی۔ ان کی لمبی عمر سمٹ کر پھر سے ایک کمسن بچی میں تبدیل ہو گئی تھی۔۔ (ندا ان سے ٹی وی کے لئے انٹرویو کرنے گئے تو) وہ اب اگلا پچھلا سب بھول چکی تھیں ان کی گفتگو بھی اب بے ربط اور سرریلسٹک ہو چکی تھی۔۔۔ سوال کچھ ہوتے تھے ان کے جواب کچھ ہوتے تھے۔۔۔۔ کچھ عرصہ بعد ہی عصمت آپا پھر بچی سے بوڑھی ہو کر انتقال کر جاتی ہیں اور ان کی وصیت کے مطابق انہیں ممبئی کے چندن واڑی کے برقی شمشان میں نذر آتش کر دیا جاتا ہے۔ آن کی آن میں سب کچھ راکھ ہو جاتا ہے''۔
(صفحہ ۱۴۸۔۱۴۹)

ندا فاضلی کا یہ سوانحی ناول بھی ان کے پہلے سوانحی ناول کی طرح ادب کے عام قاری کے لئے دلچسپ تو ہے مگر اس کی ساری دلچسپی دوسروں کے احوال کی رہین منت ہے۔ ندا کے اپنے حالات قاری پر کوئی دیرپا اثر نہیں چھوڑتے اثر رہتا ہے تو اس بات کا کہ وہ ایسی باتوں کے باب میں بھی تحکم کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کر جاتے ہیں جن کے بارہ میں انہیں خود علم نہیں ہوتا مثلاً صفحہ ۳۹ پر ''چین کے

کلاسیکی شاعر باشو کے ایک ہائیکو'' کا حوالہ دے کر اپنے شاعرانہ مبالغہ کا جواز مہیا کرتے ہیں حالانکہ چین میں باشو نام کا کوئی شاعر موجود نہیں تھا چہ جائیکہ وہ ہائیکو بھی کہتا ہو! جاپانی شاعر باشو کا نام ہمارے ہاں ادب کے ہر قاری کی زبان پر متحضر ہے ندا صاحب اس کے نام سے تو واقف ہیں اور ہائیکو کے نام سے بھی آشنا ہیں مگر وہی سخن گسترانہ بات کہ کیا یہ حوالہ دینا ضروری تھا؟ ندا فاضلی کا یہ سوانحی ناول اپنے پہلے حصہ سے کوئی زیادہ مختلف نہیں جس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ ان کے ہاں مزید کہنے کو کچھ نہیں تھا۔

◎

گردشِ پا

زبیر رضوی کی خودنوشت کا پہلا حصہ ''گردش پا'' ذہن جدید دہلی کی طرف سے جون ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا ہے۔ زبیر رضوی کا تعلق امروہہ کے ایک متدین گھرانے سے ہے۔ بچپن میں انہیں دینی مدرسہ میں درس نظامی کی تکمیل کے لئے داخل کیا گیا مگر اس بندھن کو توڑ کر بھاگ نکلے آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ رہے ریٹائر ہونے کے بعد خودنوشت کا پہلا حصہ لکھا۔ کتاب کے اختتامی سرورق پر خوب بات لکھی ہے کہ: ''میں امروہہ میں ایک پرانے گھر کے بڑے سے پھاٹک سے ٹیک لگائے باجے تاشے والی ایک زرق برق بارات دیکھ رہا تھا کچھ ہی دیر بعد اس پھاٹک سے جھانکتی ہوئی آنکھوں نے بڑے اشتیاق سے مجھے سر سے پیر تک دیکھا اور بے تابانہ لہجہ میں پوچھ ہی لیا 'تم فہمیدہ ملانی کے پوت تو نہیں؟'۔ میں نے ہلکے سے جی کہا تو مجھے پھاٹک کے اندر آنے کو کہا گیا۔ میں جھجکا تو وہ آنکھیں بول اٹھیں 'ارے پوت! بڑے ہو گئے ہو تو کیا؟ میں نے انہی آنکھوں سے تمہارا ننگ دھڑنگ بچپن دیکھا ہے'۔ اپنی سوانحی یادیں ''گردش پا'' میں کافی کچھ میں نے انہی آنکھوں کے ڈر سے سچ سچ لکھا ہے جن آنکھوں نے آپ کا ماضی دیکھا ہو'' زبیر رضوی صاحب نے واقعی سچ سچ لکھا ہے یا نہیں مگر جوش اور فراق کی امرد پرستی کے بارہ میں جو کچھ آپ نے بیان کیا ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا ہے کہ ان واقعات کے سارے گواہ اس دنیا سے گذر چکے ہیں۔

زبیر صاحب کے قول کے مطابق وہ لڑکپن کی عمر تک بڑے حسین ''امرد'' تھے اور اپنے ترنم کے ناتے سے ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے تھے۔ بڑے بڑے اساتذہ ان پر نظر رکھتے تھے۔ امروہہ کے ایک شاعر کوثر صاحب ان کے والدین سے اجازت لے کر انہیں رام پور کے ایک مشاعرہ میں لے گئے۔ اس مشاعرہ میں جوش جگر اور فراق بھی شریک تھے آگے خود ''امرد'' کی زبانی سنئے: ''میں کسی ریسٹ ہاؤس کے لاؤنج میں استاد کے ساتھ بیٹھا تھا کہ اتنے میں استاد کسی کام سے ادھر ادھر ہو گئے اور مجھے جگہ

نہ چھوڑنے کی ہدایت کر گئے۔ اسی بیچ بے حد شائستہ سے ایک صاحب بہلا کے مجھے ایک کمرے میں لے گئے۔ دیکھا تو جوش طلوع ہو رہے تھے۔ مجھے ان کے مقابل بٹھا دیا تھا اور جو الفاظ میرے کانوں میں پڑے وہ اس طرح تھے: ''صاحبزادے خدا نے تمہیں آواز دی ہے جوش صاحب تمہیں کلام دیں گے جب تم کمرہ سے نکلو گے تو یہ تمہیں ہندوستان کا بڑا شاعر بنا چکے ہوں گے''۔ اب وہ صاحب باہر تھے اور دروازہ بند تھا میں جوش صاحب کی باہوں کے حصار میں تھا۔ میں رو رہا تھا اور رہائی کی منت کر رہا تھا اتنے میں زور زور سے دروازہ پیٹنے کی آواز آئی جوش سنجیدہ ہو گئے اور بولے 'جاؤ چلے جاؤ بڑے بد بخت ہو'۔ واقف مرادآبادی اور استاد کوثر نے میرے آنسو پونچھے۔ میں پھر لاؤنج میں کسی قدر ڈرا ہوا بیٹھا تھا اتنے میں محشر رامپوری آئے اور استاد کوثر کو کسی کام سے لے گئے۔ واقف مرادآبادی دراصل امروہہ کے تھے میرے خاندان سے اچھی طرح واقف تھے مجھ پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ نہ جانے کس لمحہ وہ بھی کرسی پر نہیں تھے۔ ایک خوب صورت سا لڑکا مجھ سے عمر میں کسی قدر بڑا میرے پاس آیا۔ مجھے راہی معصوم رضا کہتے ہیں میں بھی شعر کہتا ہوں ادھر اس کمرے میں فراق قبلہ ٹھہرے ہیں چلئے ان سے ملتے ہیں۔ میں فراق کو مشاعرے میں سن چکا تھا اور ان کی شخصیت مجھ کو جوش سے زیادہ پرکشش لگی تھی۔ جگر اس مشاعرے کے کامیاب ترین شاعر تھے لیکن مشاعرے کے بعد میں نے انہیں ادھر ادھر آس پاس نہیں دیکھا۔ ہم دونوں نے آہستہ سے فراق کا کمرہ کھولا سلیقے سے جھک کر آداب کیا فراق بھی جام بکف تھے ہم دونوں کو دیکھ کر ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اپنی جگہ سے اٹھے اور ہمیں اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ خالی جام بھرا اور ہم دونوں کے 'سراپے' پر للچائی نظر ڈالی سگریٹ کا ڈھیر سا دھواں منہ سے نکالا پھر کچھ گنگنانے لگے۔ ہمارا اتا پتہ پوچھا بولے ''تم دونوں خوبصورت ہو ہم تمہیں شاعری سکھائیں گے''۔ فراق کھڑے ہوئے اور دروازہ کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ ہی رہے تھے کہ استاد اور محشر رامپوری داخل ہوئے۔ فراق نے دونوں کو اپنی خلوت میں مخل ہونے پر ٹوکا تو محشر نے میری طرف انگلی اٹھائی' فراق صاحب یہ میرا بھتیجا ہے' اور یہ کہہ کر ہم دونوں کو باہر گھسیٹ لائے۔ اسی بیچ واقف مرادآبادی لاؤنج میں لوٹ آئے تھے استاد پر جھلائے: ''ارے ان آفتی لونڈوں کو ادھر سے دفع کرو ورنہ ان کی ۔۔۔'' واقف مرادآبادی یہ واقعہ یاد دلا کر کبھی مجھ سے پوچھتے زبیر اگر اس روز دونوں دروازے نہ

پیٹے جاتے تو کیا ہوتا؟ میں جواب دیتا 'اردو کا بڑا شاعر بن جاتا'۔ اس واقعہ کے سارے عینی گواہ بجز راوی سب اللہ کو پیارے ہو گئے''۔ (صفحہ ۹۔۱۰) زبیر رضوی صاحب نے اپنے 'آفتی لونڈے' ہونے کا ذکر خود کیا ہے دو بڑے شاعروں کی امرد پرستی کی شہرت کا ثبوت مہیا کیا ہے حالانکہ خود ان کے کہے کے مطابق اس واقعہ کے عینی گواہ اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ وہ چاہتے تو اپنے اس 'آفتی لونڈے پن' کا ذکر چھپا بھی سکتے تھے۔ اس صاف گوئی کے پیچھے کیا کیا نفسیاتی عوامل پوشیدہ ہیں ان کا تجزیہ کرنا میرا کام نہیں مصنف تو فخر کرتے ہیں کہ: ''نویں کلاس تک آتے آتے میری شکل وصورت اور ملاحتوں کے چرچے ہونے لگے تھے اور بستی والوں کی زبان میں لوگ مجھ پر ''مرنے'' اور میرے عشق میں ''بیمار'' ہونے لگے تھے'' (صفحہ ۲۵)

ندا فاضلی کی ''دیواروں کے باہر'' میں ہندوستان کے اکثر شعراء کا ذکر ایسے انداز میں ہوا ہے گویا وہ اپنے سامنے کسی اور کو گردانتے ہی نہیں۔ زبیر رضوی نے فراق صاحب کی ایک تقریر کا حوالہ دیا ہے۔ اختر الایمان کے بارہ میں تقریر کرتے کرتے فرمایا: ''ادب کا معاملہ بڑا عجیب ہے۔ سیاست میں تو یہ ہوتا ہے کہ صدر اور وزیر اعظم کی کرسی ایک پل کے لئے خالی نہیں رکھی جاسکتی کہ پھر آئینی بحران کے پیدا ہونے کا ڈر ہوتا ہے اس لئے اسے بلا تاخیر فوری پر کر لیا جاتا ہے لیکن جناب ادب میں کرسیاں دنوں، مہینوں، سالوں نہیں صدیوں خالی رہتی ہیں۔ اور دیکھ لیجے غالب کے بعد فراق کو اردو کی کرسی پر صدر نشیں ہونے میں کتنے سال لگ گئے!'' (صفحہ ۱۱۴۔۱۱۵) یعنی چھوٹے تو چھوٹے بڑے بھی اپنے کو غالب سے کمتر قرار دینے کے لئے رضا مند نہیں۔ گویا بھارت میں جو شاعر بیٹھا ہے وہ باون گزا ہے۔

◎

اپنی تلاش میں

کلیم الدین احمد کی خودنوشت ''اپنی تلاش میں'' کا تیسرا حصہ میرے سامنے ہے۔ پہلے دوحصوں کے تجزیہ میں میں نے کہا تھا کہ اس خودنوشت میں کوئی ایسی چونکا دینے والی چیز نہیں جو قاری کو اپنی جانب کھینچ سکے۔ تیسرا حصہ بھی انہی خیالات کی تصدیق کرتا ہے۔ خدا معلوم ہمارے انگریزی داں ادیب دنیا بھر کی خودنوشتیں پڑھے ہوئے ہونے کے باوجود خود لکھنے بیٹھتے ہیں تو تمام اسالیب کو طاق نسیاں پر رکھ دیتے ہیں۔ آل احمد سرور صاحب کی خودنوشت روکھی پھیکی ہے اسی طرح کلیم الدین احمد خود نوشت نہیں لکھتے اپنی ملازمت اور اپنے مشاغل کا روزنامچہ لکھتے ہیں۔ تیسرا حصہ بھی نرا پرا روزنامچہ ہے۔ قاری کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں کہ کلیم الدین احمد ڈی پی آئی تھے تو ان کے مشاغل کیا تھے یا وہ پرنسپل تھے تو انہیں کیا کیا مسائل درپیش تھے۔ اپنے عہد کے ادبی رویوں سے کلیم الدین احمد کی یہ بے اعتنائی پڑھنے والے کو بہت کھلتی ہے۔

کلیم الدین احمد پٹنہ یونیورسٹی کے ریسرچ سکالرز کے کام اور معیار سے مطمئن نہیں تھے۔ انہوں نے متعدد مثالیں ایسی دی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس یونیورسٹی کے سکالرز کا معیار کیسا تھا۔ ایک سکالر مطیع الرحمٰن کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''مجھے دیکھ کر حیرت ہوئی کہ مطیع الرحمٰن کو موزوں اور ناموزوں کی یک قلم تمیز نہیں ان کی طبع ناموزوں، شعر موزوں کو بھی ناموزوں بنا دیتی ہے۔ میں نے انہیں موزوں ناموزوں کا فرق بتایا شعروں کو پڑھ کر بتایا لیکن میں نے دیکھا کہ فطرت نے جوان کے ساتھ یہ مذاق کیا ہے اس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں۔ چنانچہ میں نے مزید کوشش نہ کی۔۔۔ انہوں نے اپنے مقالے کو ترتیب دینے میں سلیقے سے کام لیا۔ پراگندگی یا انتشار پیدا نہ ہونے دیا۔ لیکن مقدمہ کا تنقیدی حصہ جو انہوں نے لکھا اس سے مجھ پر یہ اثر ہوا کہ مطیع الرحمٰن کو ادبی ذوق نہیں۔ انہیں کتابی علم ہے لیکن جسے ادبی ذوق کہتے ہیں نکتہ رسی کہتے ہیں تنقیدی نظر کہتے ہیں ان چیزوں کی نمایاں کمی ہے۔'' مقالہ پیش ہو گیا'' زبانی امتحان ہوا مجھے ڈر تھا کہ اگر کسی ممتحن نے کہا کہ محسن یا فرحت کے آپ کی نظر میں جو

بہت اچھے اشعار ہوں سنایئے۔ تو کیا ہوگا؟ کیونکہ میں جانتا تھا کہ مطیع الرحمٰن بھی نہ سہی کچھ شعروں کو ضرور ناموزوں بنادیں گے پھر کیا ہوگا؟ لوگ کہیں گے نہ کہا تو دل میں سوچیں گے کہ کلیم صاحب نے کیسے ناموزوں طبع شخص کی نگرانی اپنے ذمہ لے لی۔ لیکن کسی نے مطیع الرحمٰن سے شعر پڑھنے کو نہ کہا اور نہ انہوں نے جواب میں کوئی شعر پڑھا۔۔۔ اور مطیع الرحمٰن بھی پی ایچ ڈی ہو گئے'' (صفحہ ۲۱۹)

ایک اور صاحب کا ذکر بھی ہے: ''ظہیر احسن کی صلاحیت بہت محدود قسم کی تھی۔ ذوق ادب کی بھی کمی تھی میں نے دیکھا اور کہا بھی کہ یہ مقالہ ڈی لٹ کے لائق نہیں لیکن وہ مزید کاوش کی زحمت گوارا نہیں کرنا چاہتے تھے کچھ دنوں تک آتے رہے مقالے کی کسی صورت سے ترتیب ہو گئی میرا خیال تھا کہ شاید پی ایچ ڈی مل جائے۔ مجھے معلوم نہیں ان کے ممتحن کون تھے میں نہیں تھا۔ وہی ہوا جو میں سمجھتا تھا انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری مل گئی'' (صفحہ ۲۲۲)۔ یہ صورت حال صرف پٹنہ یونیورسٹی ہی میں نہیں برصغیر کی دوسری یونیورسٹیوں میں بھی بعینہ موجود ہے۔ راقم الحروف کو ایک پی ایچ ڈی کے مقالہ کا ممتحن بنایا گیا۔ میں نے مقالہ کی بعض بنیادی خامیوں کی جانب اشارہ کیا اور چاہا کہ ان اسقام کو دور کر کے مقالہ پھر پیش ہو۔ جب زبانی امتحان کے لئے وہ امیدوار پیش ہوا تو وہی حال تھا جو کلیم الدین احمد نے بیان کیا ہے نہ ذوق ادب کی کوئی رمق تھی نہ تنقیدی صلاحیت کا کوئی شائبہ نظر آتا تھا۔ مقالہ کے نگران میرے جانے پہچانے تھے میں نے ان سے کہا بھی کہ آپ کس بنا پر انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری دینا چاہتے ہیں؟ کہنے لگے اس امیدوار نے تین چار سال کام کیا ہے اور امیدوار سے زیادہ محنت مجھے کرنا پڑی ہے آپ مہربانی کیجئے کوئی روک کھڑی نہ کیجئے۔ امیدوار کو ڈگری دے دی گئی مگر آئندہ کے لئے اس یونیورسٹی سے راقم الحروف کو پی ایچ ڈی کے ممتحن کے طور پر مقرر نہیں کیا گیا۔ برصغیر سے باہر راقم الحروف کو کئی بار کئی مقالوں کا ممتحن بنایا گیا اور میری رائے کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھا گیا۔ ہمارے ہاں ریسرچ کے لئے جو تنقیدی نظر اور بصیرت ضروری ہوتی ہے اس کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ کلیم الدین احمد کی خودنوشت میں سے یہی ایک بات اس قابل ہے کہ اس پر عمل کیا جائے اور ریسرچ کی کمیت کی بجائے ریسرچ کی کیفیت پر زیادہ زور دیا جائے۔ اردو کی ریسرچ میں اس بات کا لحاظ بہت ضروری ہے ورنہ اس ڈگری کی قدر و قیمت اور اہمیت دوسری یونیورسٹیوں کے مقابلہ میں کمتر ہو کر رہ جائے گی۔

◎

شورش دوراں

حمیدہ سالم کی سرگزشت ''شورشِ دوراں'' ۱۹۹۵ء میں دہلی سے ادب پبلیکیشنز والوں کی جانب سے شائع ہوئی۔ حمیدہ سالم، اسرار الحق مجاز اور صفیہ اختر کی چھوٹی بہن ہیں۔ کتاب کا عنوان بھی مجاز کے ایک تحریف شدہ مصرعہ کا ایک حصہ ہے 'کیا تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا، اے گردشِ دوراں بھول گئے'۔ کتاب معنون بھی مجاز کے نام ہی کی گئی ہے۔ ''اپنے بھائی اسرار الحق مجاز کے نام جنہوں نے مجھے پڑھنا لکھنا سکھایا''۔ ان کے اپنے کہنے کے مطابق ''عشق اور محبت پر کس کا زور ہے۔ ہمارے خاندان کے ساتھ بھی کچھ رنگین کہانیاں وابستہ ہیں'' (صفحہ ۸۲) ان رنگین کہانیوں کی حقیقت یہ ہے کہ مجاز اپنی ناکام محبت کا داغ لے کر آپ اپنی آگ کا خس وخاشاک ہو گئے، صفیہ اختر جاں نثار اختر کی محبت میں گھل گھل کر مر گئیں مگر ان کا محبوب دور سے دور تر ہوتا چلا گیا۔ اور خود انہوں نے اپنی مرضی سے شادی کی۔ یہ عام سی باتیں ہیں مگر ہمارے برصغیر کے معاشرتی پس منظر میں بڑی رنگین لگتی ہیں۔ یہ خودنوشت اس لئے دلچسپ نہیں کہ حمیدہ سالم کی سرگزشت ہے، اس لئے دلچسپ ہے کہ اس میں مجاز اور صفیہ اختر کے خاندان کی اور ان دونابغوں کی ان کہی کہانی بیان ہوئی ہے۔

اسرار الحق مجاز باپ کا اتنا ادب کرتے تھے کہ ''ان کے سامنے سگرٹ نہیں پیتے تھے یہاں تک کہ ترنم کے ساتھ کلام سنانے سے بھی گریز کرتے تھے'' (صفحہ ۹۲) ''بچپن سے شوخ وشریر اور ذہین تھے کھیل کود میں ممتاز شرارت اور شوخی کے ساتھ طبیعت میں ایک طرح کی سادگی اور معصومیت بھی تھی ساتھ ہی ساتھ لاابالی پن بھی۔۔۔ کسے معلوم تھا کہ زندگی کے سب سے اہم کھیل میں جہاں دل کی بازی لگتی ہے ایسی مات کھائیں گے ایسی چوٹ کھائیں گے کہ چکنا چور ہو کر رہ جائیں گے۔ قسمت کو کیا کہئے محبت کے میدان میں قدم بڑھایا تو اس میدان کی طرف جہاں داخلہ ممنوع نظر اٹھائی تو ایسی ہستی کی طرف جس کو پانا ناممکن'' (صفحہ ۹۳)۔ ''۱۹۴۵ء میں بھائی پر نروس بریک ڈاؤن کا دوسرا دورہ پڑا۔

شاعروں کے نام کی فہرست تیار کرتے تو غالب و اقبال کے نام کے بعد اپنا نام لکھ کر شجرہ ختم کرتے'' (صفحہ ۱۰۶) ''تیسرا اور آخری نروس بریک ڈاؤن کا دورہ پڑا ایسا شدید ایسی اضطرابی کیفیت کہ خدا کی پناہ دلی کے گلی کوچوں میں خاک چھانتے پھرتے تھے گھر والے ہر لمحہ اس خبر کے منتظر کہ مجاز موٹر سے کچل گیا۔ ٹھٹھرا ہوا سڑک پر پایا گیا انجام یہی ہونا تھا پر کچھ ٹھہر کر اور محبوب کی گلیوں سے دور۔'' (۱۰۷)

صفیہ اختر کی کہانی کہ ''انہیں اپنے استادوں کی شفقت ساتھیوں کی محبت اور اپنے چھوٹوں کی عقیدت حاصل تھی وہ ایک بردبار خوش گفتار اسکول کی مقبول ترین طالبہ تھیں ان کا رجحان ہمیشہ سے ادبی تھا اردو انگریزی ان کے محبوب ترین مضامین تھے اسکول کے تمثیلی مشاعروں اور نظم خوانیوں کے مقابلوں میں حصہ لیتی تھیں انٹرمیڈیٹ تک ان کا راستہ صاف رہا تیز گامی سے آگے بڑھتی گئیں لیکن ان کا راستہ یوں صاف کیوں کر رہتا۔ آگے چل کر تو انہیں راستہ کی کتنی خاردار جھاڑیوں اور نکیلے پتھروں کو بھگتنا تھا۔ عادت بگڑ جاتی پریکٹس چھوٹ جاتی (صفحہ ۱۲۸)۔۔۔ جان نثار اختر کے ساتھ شادی ہوگئی'' صفیہ آپا کے لئے تو یہ موڑ کچھ ایسا ثابت ہوا کہ سطحی طور پر نظر ڈالنے والوں کے لئے جیسے ان کی شخصیت کے خدوخال بالکل بدل گئے ہوں۔ ان کی ذات نے ایک نیا روپ اختیار کر لیا ہو اب وہ لڑکی سے عورت میں تبدیل ہو گئی تھیں ایک ایسی عورت جس کو اپنے شوہر سے دیوانگی کی حد تک محبت ہو۔ جو شوہر کو دیوتا بنا کر پوج رہی ہو۔ جس کے لئے خدائے مجازی اور خدائے حقیقی کی درمیانی لکیر مٹ گئی ہو ساتھ ساتھ شوہر کو وہ تحفظ دینے کی کوشش کر رہی ہو جو ایک ماں اپنے معصوم اور کمزور بچے کو دیتی ہے اس ہستی کا جس کے سامنے ترقی کا دامن پھیلا ہوا تھا آگے بڑھنے کا ایک وسیع میدان تھا اب زندگی کا صرف ایک مقصد رہ جاتا ہے شوہر کی نازبرداری' شوہر کی خوشنودی' شوہر کا تحفظ۔ محبت کے کئی روپ ہوتے ہیں ماں کی محبت بے غرض بے لوث' بہن کی محبت پیار دیتی ہے اور پیار کے لئے تڑپتی ہے بیوی کی محبت جو سب کچھ دے دیتی ہے لیکن بہت کچھ پانے کی خواہشمند ہوتی ہے۔۔۔ بھائی اختر کے ساتھ صفیہ آپا کی محبت میں سارے رنگ ہی یکجا تھے اس امتزاج سے ایک انوکھا رنگ پیدا ہو گیا تھا'' (صفحہ ۱۳۴)

ان باتوں کے علاوہ جو کچھ ہے وہ ایک عام لڑکی کی داستان ہے جو ردولی کے زمیندارانہ ماحول میں پلی بڑھی، روشن خیال ماں باپ نے اعلیٰ تعلیم دلائی، بڑی بہن کا اسوہ سامنے تھا اس لئے ان کے

نقشِ قدم پر چلتی ہوئی یونیورسٹی کی تعلیم تک پہنچیں اور لوگوں کے کہے سنے کے علی الرغم ملازمت کو اپنا شعار بنایا۔

ابتدا میں کچھ بیان اودھ کے جاگیردارانہ ماحول اور رہن سہن کا بھی ہے کیونکہ ان کی اماں ردولی کے اسی جاگیردارانہ ماحول کی پیداوار تھیں مگر ابا مولوی سراج الحق شہری ماحول کے تھے۔ حمیدہ سالم کو لیکچر دینے کا بڑا شوق ہے ایک بات کہتی اور پھر اس کی انگلی پکڑ کر قاری کو اپنے لیکچر میں لئے چلتی ہیں۔ مثلاً کہیں گی ''مذہب ہی کو لیجئے'' (صفحہ ۵۵) اور پھر اس مذہب کے ناتے سے لمبا درس مساوات اور حقوق العباد پر دیں گی۔ یکا یک خیال آئے گا تو چونک کر کہیں گی ''بات کہاں سے کہاں پہنچی'' (صفحہ ۶۴) یوں دیکھنے میں سیدھی سادہ باتیں کرتی ہیں اور شائستگی کا دامن نہیں چھوڑتیں مگر ایک جگہ خود استاد ہوتے ہوئے اپنے سکول کی ایک استاد کو ''خبیث'' (صفحہ ۶۷) کہہ گئی ہیں۔

''شورشِ دوراں'' کی زبان بھی سیدھی سادہ زبان ہے لکھنؤ والوں کے نخرے اس میں نہیں۔ مگر یوں محسوس ہوتا ہے حمیدہ سالم نے کتاب میں شعروں کا حوالہ دینے میں بڑی لاپروائی سے کام لیا ہے اور اکثر شعر غلط لکھے ہیں اس پر مستزاد کتابت کی غلطیاں! حیرت اس بات پر ہے کہ کتابت کی ساری غلطیاں شعری حوالوں تک کیوں محدود ہیں؟

اوپر میں لکھ آیا ہوں کہ اس کتاب کی دلچسپی اس سادہ زبان کی وجہ سے نہیں احوالِ دیگراں کی وجہ سے ہے۔ ایک بہن نے اپنے روشن خیال بھائی اور بہن کا ذکر بڑی محبت سے کیا ہے جس کی وجہ سے صفیہ اختر کے خطوط کے مجموعوں زیرِ لب اور حرفِ آشنا میں نئی معنویت پیدا ہوگئی ہے۔ ان میں سے کی اکثر باتیں وہ پہلے بھی حرفِ آشنا کے دیباچہ میں لکھ چکی ہیں مگر صفیہ کے آخری خطوط کا پس منظر دیکھئے:

''آخری خط کے یہ جملے ہیں۔ اختر مجھے مرنے نہ دو میں مرنا نہیں چاہتی البتہ تھک گئی ہوں ساتھی آؤ تمہارے زانو پر سر رکھ کر ایک طویل نیند لے لوں پھر تمہارا ساتھ دینے ضرور اٹھ کھڑی ہوں گی۔ یہ تمنا تمنا ہی رہی۔ وہ زانو نصیب نہ ہوسکا جس کے بل پر سکت کی آس لگا رہی تھیں۔ البتہ موت قریب تر آتی گئی بائیس دسمبر کو انہیں انگلیوں سے جو مڑنے سے انکاری تھیں کسی صورت یہ چند سطریں لکھیں جنوری میں ضرور ہی آجاؤ اس سے زیادہ مجھ میں انتظار کی گنجائش نہیں۔۔۔۔ آخر کو آنکھیں انتظار کرتے کرتے

تھک گئیں اور اٹھارہ جنوری کو بند ہوگئیں۔ آخری وقت ان کا سر میری گود میں تھا۔ میں ان نگاہوں کو کیسے بھول سکتی ہوں جو دروازہ پر محبوب کے انتظار میں لگی ہوئی تھیں۔ میرے کانوں میں اب تک ان کا یہ جملہ گونجتا ہے جادو تو تمہارا ہے، ہی اویس اتنا سیدھا ہے اسے کوئی بھی سنبھال لے گا اختر کا کیا بنے گا، محبت جیسی محبت، عشق جیسا عشق!'' (صفحہ ۱۳۸) مگر حمیدہ سالم صفیہ اختر کے ساتھ شوہر کی بے اعتنائی کے باوصف اس کو اس کا حق دینا نہیں بھولتیں ''انہوں نے کفارہ ادا کیا تو زیرِ لب اور حرفِ آشنا اور انداز نظر کو شائع کر کے۔ اب میری بہن محض جاں نثار اختر کی بیوی، مجاز کی بہن، جاوید اختر و سلمان اختر کی ماں نہ رہی اب اس کی اپنی پہچان ہے اپنی شناخت ہے۔ اردو ادب میں اس کا اپنا مقام ہے'' (صفحہ ۱۴۰)۔

شورشِ دوراں ان لوگوں کے لئے دلچسپی کا موجب ہوگی جو مجاز اور صفیہ اختر کو جانتے اور ان کے خاندان کے کرب مسلسل سے آشنا ہیں۔ کتاب کے آخری چند باب تو محض سفرنامہ ہیں۔ جہاں جہاں گئیں جہاں جہاں رہیں، افریقہ امریکہ برطانیہ کا سفرنامہ جس کا اسلوب بھی خودنوشت کے اسلوب سے مختلف ہے اور مختلف نظر آتا ہے۔ ہمارے ہاں خودنوشتوں میں سفرناموں کے پیوند لگانے کا رواج بڑھ رہا ہے اور اکثر جگہ تو یہ سفرنامے مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگتے ہیں۔

کوچۂ قاتل

اردو کے مشہور افسانہ نگار رام لعل کی خودنوشت کا پہلا حصہ ''کوچہء قاتل'' کے عنوان سے نو کی دہائی میں لکھنؤ سے شائع ہوا۔ دیباچہ میں ان کا کہنا ہے کہ ''یہ ایک بہت ہی معمولی آدمی کی خودنوشت داستان ہے جس نے کافی غربت دیکھی ہے اور وہ محرومیوں کا بھی شکار ہوا ہے قومی اور سماجی سطح پر اس نے بے شمار مصائب کا خاموشی سے مشاہدہ کیا ہے اور دربدری اس کے خون میں ہمیشہ سے موجود رہی ہے'' میں اس شخص کو بہت قریب سے جانتا ہوں کیونکہ وہ میں ہی ہوں۔ میں نے ۱۹۴۳ء سے اب تک جتنے افسانے ناول ڈرامے سفرنامے مضامین لکھے ہیں ان میں میری ذاتی کیفیتیں مختلف شکلوں اور رویوں کا روپ دھار کر ہمیشہ موجود رہی ہیں۔ میرے نزدیک خودنوشت بھی ایک طرح کا تخلیقی اظہار ہے لیکن اس میں بیان کی گئی سچائیاں دوسری اصناف کے مقابلہ میں کچھ زیادہ ہی کھردری اور تکلیف دہ ہیں۔

رام لعل کو سچائیوں کے کھردرے ہونے کا احساس اس لئے بھی ہو رہا ہے کہ یہ ان کی زندگی کے حقائق ہیں کوئی افسانوی کیفیتیں نہیں ہیں۔ افسانوں میں افسانہ نگار حقائق میں تخیل کی رنگ آمیزی کر کے نت نئے رنگ پیدا کر لیتا ہے خودنوشت سوانح حیات میں اس کا ضمیر حقائق میں افسانوی رنگ آمیزی سے اِبا کرتا ہے یا کم از کم اسے اِبا کرنی چاہئے۔ ہمارے ہاں بہت سے خودنوشت سوانح نگاروں نے اپنی زندگی کے حقائق میں افسانوی رنگ آمیزی سے گریز نہیں کیا۔

کوچہء قاتل میں تقسیم ملک اور ہجرت تک کے حالات بیان ہوئے ہیں۔ سیل حوادث میں بہنے والا یہ تنکا میانوالی سے چلا اور لاہور سے دہلی ہوتا ہوا لکھنؤ میں کنارے جا لگا تھا۔ جس جگہ جا کر لگے وہ ہی کنارا ہو گیا۔ رام لعل لاہور چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ ریاض لطیف بن کر رہ جانا چاہتے تھے۔ ریاض لطیف اس لئے کہ ان کے بدن پر کھدے ہوئے حروف آر ایل کا یہ مخفف بھی بن سکتا تھا مگر ہجرت کر جانے والے ماں باپ کی خبر لینے سرحد پار گئے تو واپس آنا ممکن نہیں ہوا۔ وہاں بھی ریلوے کے سفر

کے دوران وحشی اور خون کے پیاسے لوگوں کے ہاتھوں انہیں اور ان کے ساتھی ملک وزیر چند کو راچیورہ سٹیشن پر اس ذلت کا سامنا کرنا پڑا جس کا ذکر بڑے کرب سے انہوں نے کیا ہے کہ ''میں تو اپنے ڈبہ میں واپس آ گیا ملک وزیر چند نے بہت ہی گھبرائے ہوئے لہجہ میں کھڑکی میں سے مجھے پکارا رام لعل ذرا باہر آنا۔ باہر جا کر میں نے دیکھا انہیں سکھوں اور ہندوؤں کے ایک گروہ نے گھیر رکھا ہے ملک صاحب نے کہا یہ لوگ کہتے ہیں میں مسلمان ہوں۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے مجھے بھی بازو سے پکڑ کر درمیان میں گھسیٹ لیا اور کئی لوگ بیک زبان ہو کر بولے ہاں ہاں تم دونوں مسلمان ہو پاکستان جانے کا راستہ نہیں ملا تو دہلی کی طرف بھاگ رہے ہو۔ ہم دونوں نے شلواریں قیصیں پہن رکھی تھیں۔ ملک وزیر چند کے بڑے بڑے گل مچھے تھے ہمارے سروں کے بال عین بیچوں بیچ تقسیم ہوتے تھے اور بکھرے ہوئے تھے ہماری بھوری بھوری آنکھیں ان لوگوں کی آنکھوں کی رنگت سے بالکل جدا تھیں میں سمجھ گیا وہی کہانی پھر دہرانی پڑے گی ہمارا تعلق مغربی پنجاب کی آب و ہوا اور بود و باش سے ہے ہمارے لہجے اسی وجہ سے مختلف ہیں اور پھر اچانک میری زبان سے یہ بھی نکل گیا قران ساں (قرآن کی قسم) ہم ہندو ہیں۔ دیکھا دیکھا سالے مسلے ہیں۔ قرآن کی قسم کھاتے ہیں میں نہ کہتا تھا۔ میں نے انہیں سمجھایا یہ ہمارا رویہ ہے اس علاقے کا ہم وہاں قرآن ہی کی قسم کھاتے ہیں لیکن ہم مسلمان نہیں ہیں ہمارا یقین کرو۔ انہیں تب تک یقین نہیں ہوا جب (تک) انہوں نے ہماری شلواریں کھلوا کر اطمینان نہیں کر لیا'' (صفحہ ۱۶۰)۔ یہ مثال انسان کے اسفل السافلین بن جانے کی نادر مثال ہے۔

رام لعل نے اس خودنوشت کے آغاز میں اپنے آبا و اجداد کے بارہ میں ''کسی قدر قیاس'' (صفحہ ۲۰) اور دوسروں کے حوالے دے کر تاریخ کھنگالنے کی کوشش کی ہے حالانکہ ایسا نہ بھی کرتے تو کوئی فرق نہ پڑتا۔ بلکہ ان حوالوں نے کتاب کو بوجھل بنا دیا ہے۔ پھر رام لعل نے جگہ بجگہ اپنے بیان کی سند میں اپنے بعض افسانوں کے لمبے لمبے اقتباسات درج کئے ہیں جس سے کتاب کی روانی متاثر ہوئی ہے۔ رام لعل کی خودنوشت سوانح کا پہلا حصہ کوچہء قاتل ان کی زندگی سے زیادہ تقسیم ملک کے بحرانی دور کی تاریخ لگتی ہے۔ باقی حصے چھپے ہوں تو وہ میری نگاہ سے نہیں گزرے۔

ہماری منزل

میں اردو کی خودنوشت سوانح عمریوں میں ایک ایسی خودنوشت کو شامل کر رہا ہوں جو انگریزی میں لکھی گئی ہے مگر اس کا عنوان اردو میں ہے۔ یہ سید ہاشم رضا کی انگریزی میں لکھی ہوئی خودنوشت سوانح عمری ہے جس کا عنوان ہے ''ہماری منزل''۔ تقریباً پونے سات سو صفحات پر مشتمل اس خودنوشت میں پڑھنے والوں کے لئے دلچسپی کا بہت سامان ہونا چاہئے تھا مگر حیف کہ 'بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل' ! سید ہاشم رضا صاحب قیامِ پاکستان کے ابتدائی سالوں میں حکومت کے مقتدر عہدوں پر فائز رہے اس لئے پاکستان کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والا قاری ان سے کہیں زیادہ کی توقع رکھتا تھا جو پوری نہیں ہوئی۔ یہ خودنوشت ایک آئی سی ایس افسر کی سرگزشت ہے اور اس کی افسرانہ تربیت ہر مقام پر اس کا راستہ روک کر کھڑی ہوگئی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مصنف اپنے قاری کو کسی بھی موقع پر اپنی رائے سے مستفیض ہونے کا موقعہ نہیں دیتا اخباری خبروں، تراشوں، رپورٹوں یا ذاتی خطوں کا حجاب درمیان میں حائل کر لیتا ہے۔ ہاں اپنے تعصّبات کے اظہار میں بے باک ہے۔

سید ہاشم رضا اناؤ میں پیدا ہوئے، ان کے والد گرامی جسٹس محمد رضا اودھ ہائی کورٹ کے پہلے پانچ ججوں میں سے تھے، ان کے بڑے بھائی سید کاظم رضا انڈین امپیریل پولیس سروس کے رکن تھے، ان کا خاندان لکھنؤ کا معزز اور نامور خاندان تھا۔ ہاشم رضا نے اپنی خاندانی روایات کے پیشِ نظر سرکاری خدمت میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا اور اس فیصلہ میں اس بات کا بھی بڑا دخل تھا کہ آپ نے ''لکھنؤ کے ادیبوں اور شاعروں کو بھوکوں مرتے یا تنگدستی سے زندگی کرتے دیکھا ہوا تھا'' (صفحہ ۴) اس لئے ادب و شعر کو پیشہ بنانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ سیاسی میدان ان کے مزاج کی افتاد کے خلاف تھا، اب رہ گئی صحافت سو اس میدان میں مولانا محمد علی جوہر اور حسرت موہانی موجود تھے ان کے ہوتے بھلا کس کا چراغ جلتا! اور مولانا جوہر بھی تو آئی سی ایس میں ناکام ہونے کے بعد صحافی بنے تھے، آئی سی

ایس ہو جاتے تو زیادہ سے زیادہ سرکاری عہدہ دار بن جاتے کامریڈ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے انہیں جو شہرت اور مسلمانوں کی رہنمائی کی جو توفیق ملی وہ تو نہ ملتی؟ ایچ جی ویلز جیسا ادیب ان کے مرنے پر یہ تو نہ کہہ سکتا کہ ''محمد علی کا دل نپولین کا، زبان برق کی اور قلم میکالے کا تھا''۔ بعض 'ناکامیوں' میں بھی کتنی کامیابیاں پوشیدہ ہوتی ہیں۔

ہاشم رضا ۱۹۳۴ء میں آئی سی ایس کے رکن بنے اور بمبئی کے صوبہ سے اپنی خدمت کا آغاز کیا۔ بعد میں سندھ بمبئی سے علیحدہ ہوا تو ان کا تقرر سندھ میں ہوا اور مختلف ضلعوں میں خدمت کرتے رہے اس لحاظ سے سندھ کے تمام نمایاں سیاسی رہنماؤں سے متعارف رہے۔ پاکستان بنا تو سندھ واحد صوبہ تھا جس نے بہ رضا و رغبت اپنا دارالحکومت، کراچی، حکومت پاکستان کو پیش کیا کہ وہ اسے اپنا دارالحکومت بنا لے۔ پنجاب کو کہاں توفیق ملتی وہاں تو اگست ۱۹۴۷ء میں گورنر راج تھا، سرحد میں کانگریس کی حکومت تھی، بلوچستان مرکز کے اختیار میں تھا، مشرقی پاکستان دور تھا، ہاشم رضا نے پاکستان میں خدمت کرنے کا فیصلہ کیا اور اس طرح قیام پاکستان کے وقت یہ پہلے سے کراچی میں موجود تھے۔ یہ دور، ان کی خدمت کا سنہری دور تھا۔ آپ کراچی کے ایڈمنسٹریٹر، آبادکاری اور بحالیات کے محکمہ کے کمشنر اور بعدازاں سکرٹری کے عہدہ پر متمکن رہے، محکمہ اطلاعات ونشریات کے سربراہ بھی رہے، مشرقی پاکستان کے چیف سکرٹری اور کچھ عرصہ کے لئے گورنر کے مرتبہ پر فائز رہے، دارالحکومت کے اسلام آباد منتقل ہونے کا زمانہ انہیں کا زمانہ ہے، بالآخر محکمہ لیبر کے سکرٹری ہوئے اور وہیں سے آئی ایل او یعنی انٹرنیشنل لیبر آرگینائزیشن کی صدارت پر سرفراز ہوئے۔

بھلا جو شخص اتنے مقتدر عہدوں پر اور ایوانِ اقتدار کے اتنے قریب رہا ہو اس سے پڑھنے والے بہت سی توقعات کیوں وابستہ نہ کریں؟ غلام محمد نے اسمبلی برطرف کی تو یہ محکمہ اطلاعات میں تھے بھلا صرف اتنی بات کہہ کر یہ کیسے سبک دوش ہو سکتے ہیں کہ ''دستور ساز اسمبلی کے رکن احمد ای ایچ جعفر نے بتایا کہ اسمبلی توڑنے کا عمل ناگہانی طور پر وقوع میں آیا'' (صفحہ ۲۷۱)۔ ''۲۳ اور ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کی درمیانی شب گورنر جنرل کے شب خوابی کے کمرہ میں چھ گھنٹے کے اجلاس میں جو کچھ کہا سنا گیا اور جس میں محمد علی بوگرا، کرنل اسکندر مرزا، جنرل ایوب خاں اور عزیز احمد موجود تھے، اس کے بارہ میں شرکا میں

سے کسی نے کچھ کہہ کے نہیں دیا'' (صفحہ ۲۷۰)۔ جنرل ایوب خاں کی خودنوشت 'جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی' میں اس کی روداد موجود ہے۔ محکمہ اطلاعات کے سربراہ کا یہ کہنا کتنا پوچ معلوم دیتا ہے کہ ''۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو عزیز احمد نے مجھے اور مجید ملک کو فون کر کے کہا کہ ہم انہیں ان کے دفتر میں ملیں۔ انہوں نے بتایا کہ گورنر جنرل نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ دستور ساز اسمبلی کو توڑ رہے ہیں، اس لئے اس بارہ میں غیر معمولی گزٹ شائع کرنا مقصود ہے۔ ریڈیو پاکستان سے ایک بجے سہ پہر کی خبروں میں اس کا اعلان ہوگا۔ ہم نے پریس کو جاری ہونے والے بیان کا مسودہ تیار کیا'' (صفحہ ۲۶۹) یا تو محکمہ اطلاعات کا سربراہ اتنا بے خبر تھا؟ یا وہ کچھ چھپانا چاہتا ہے؟ جب ڈان کے ایڈیٹر الطاف حسین نے پچھلی رات وزیراعظم ہاؤس سے فون کر کے ان سے بیگم عالیہ محمد علی کی جانب سے یہ پوچھا تھا کہ وزیراعظم خیریت سے تو ہیں ابھی تک واپس گھر کیوں نہیں پہنچے؟ (صفحہ ۲۶۸) تو کیا تب بھی ان کے ذہن میں کسی خطرہ کی گھنٹی نہیں بجی تھی؟ یا انہیں کسی 'ناشدنی انہونی' کا احساس نہیں ہوا تھا؟ اگر ہوا تھا تو اس کا اظہار کم از کم اس خودنوشت میں نہیں ہے۔

اسمبلی توڑنے کے بعد قدرت اللہ شہاب کے لفظوں میں بعض جگادھری خوشامدیوں نے غلام محمد کو محافظ ملت کا خطاب دیا تھا۔ ہاشم رضا نے ان کے سرگروہ کا نام لکھ دیا ہے کہ وہ ''مسلم لیگ کراچی کے خزانچی اور کراچی مسلم لیگ کے (چٹے ان پڑھ) صدر اے ایم قریشی تھے'' (صفحہ ۲۷۴) ساتھ ہی ایک باب میں غلام محمد کے اس اقدام کی نامناسبت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ غلام محمد کے بارہ میں کہا ہے کہ ''مسٹر غلام محمد کا طرزِ عمل وائسرائے یا گورنر جنرل جیسا تھا گویا وہ اپنی مرضی سے کسی بھی رکن کو برطرف یا سبک دوش کر سکتے تھے۔ ان کا مزاج شاہانہ اور دل منتقمانہ تھا'' (صفحہ ۲۷۳) اگر دستور ساز اسمبلی کے اراکین خواجہ ناظم الدین کی برطرفی کے خلاف ڈٹ گئے ہوتے تو ہماری دستوری تاریخ کا رخ بالکل اور ہوتا'' (صفحہ ایضاً) ہاشم رضا نے یہاں بھی حسبِ عادت رئیس امروہوی کا سہارا لیا ہے۔ ''شاہی کا ہو طریق کہ جمہوریت کی راہ۔ سرکار صدر قوم و وطن ہوں کہ بادشاہ۔ ہم بندگانِ خاص کے لب پر جہاں پناہ۔ ایسے بھی واہ واہ ہے ویسے بھی واہ واہ!''

البتہ سید ہاشم رضا نے اپنی سلامت جوئی سے ذرا سا انحراف ضیاء الحق کے بارہ میں یہ کہہ کر

ضرور کیا ہے کہ ''ضیا کا دور ظالمانہ اور فتنہ انگیز دور تھا'' (صفحہ ۲۷۸) وہ بھی شاید اس لئے کہ ان کے دل میں بھٹو اور بھٹو کی بیٹی بے نظیر کے لئے نرم گوشہ موجود ہے۔

سید ہاشم رضا کی جوانی لکھنؤ میں گذری۔ ادب کا اعلیٰ ذوق آپ نے ورثہ میں پایا۔ اس خود نوشت میں بھی ادبی ذوق اور ادبی سرگرمیوں میں دلچسپی کا مظاہرہ کیا گیا ہے اور جابجا اچھے شعروں کا حوالہ بھی دیا گیا ہے مگر حیرت ہوتی ہے کہ راغب مراد آبادی کی 'رغبت' و مروت کے باوجود ایسی فاش غلطیاں ان سے سرزد ہوئی ہیں کہ بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست! مثلاً غالب کے شعر وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد، ہزار بار برو صد ہزار بار بیا، میں برو کی جگہ 'برد' لکھا ہے اگر اس کو کتابت کی غلطی تسلیم کر لیا جائے تو اس کے ترجمہ میں ہزار بار برو کا ترجمہ ہزار بار کی ملاقات اور صد ہزار بار بیا کا ترجمہ لاکھوں بار کی جدائی درج ہے حالانکہ اس شعر کی ساری معنویت ہی ہزار بار کے جانے اور لاکھ بار کے آنے پر منحصر ہے (صفحہ ۶۹)۔ ترجمہ کرنے والے بزرگ کوئی اور ہیں۔ حالانکہ سید صاحب خود ترجمہ کرتے تو کہیں بہتر کرتے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ لکھنؤ کا رہنے والا کوئی شخص انیس کا شعر غلط لکھے؟ مگر سید صاحب نے لکھا اور شعر کو بالکل بے معنیٰ بنا دیا ''غبارِ خاطرِ احباب چاہئے اے دوست۔ انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو'' (صفحہ ۶۴۳)۔ پہلا مصرعہ چہ معنیٰ دارد؟ یہاں تک تو خیر راغب مراد آبادی صاحب کی ذمہ داری تھی سید صاحب نے قرآنِ پاک کی آیت غلط لکھ دی اس کا ذمہ دار کون ہے؟ ''انما یخشیٰ من عبادہ العلوم'' (صفحہ ۵۲۷)۔ یہ تو کوئی آیت نہیں۔ ہاں آپ جس آیہ کریمہ کا حوالہ دینا چاہتے ہیں وہ قرآنِ پاک کے بائیسویں پارہ کے پندرھویں رکوع کی دوسری آیت کا حصہ ہے جو یوں ہے: ''اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا''۔ یعنی اللہ کے جو بندے زیادہ جانتے ہیں وہی اللہ کی خشیت اختیار کیا کرتے ہیں۔

سید ہاشم رضا نے اپنی شخصیت پر غیر جانب داری اور ''لئے دئے رہنے'' کا جو خول چڑھا رکھا تھا وہ ایک موقعہ پر اتر بھی گیا اور ان کے اندر بیٹھا ہوا ''متعصب'' آدمی نکل کر باہر آ گیا ہے۔ آپ نے کراچی کے ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے اپنے ''اختیارات'' سے تجاوز کرتے ہوئے بھارت سے پاکستان آنے والوں کو پاکستان آنے کے پرمٹ جاری کرنا شروع کر دئے۔ اس پر وزارتِ خارجہ نے احتجاج

کیا کہ کسی دوسرے ملک کے شہری کو پاکستان آنے کا پرمٹ دینا صرف وزارت خارجہ کے اختیار میں ہوتا ہے کراچی ایڈمنسٹریشن ایسا کیوں کر رہی ہے؟ وزارت داخلہ نے ان سے جواب طلبی کی اور آپ کو اس بات سے روک دیا۔ بس یوں سمجھئے کہ یہ بات سید صاحب کے تلوے سے لگی تالو سے نکل گئی۔ آپ وزیر خارجہ کے درپے ہو گئے ان کے بارہ میں جو کچھ فرمایا انہی کے الفاظ میں یوں ہے: ''جہاں تک سر ظفر اللہ خاں کے مرتبہ کا تعلق ہے، میں ان کے عقائد سے آگاہی رکھنے کے باوصف، پاکستان کے ابتدائی مراحل میں یہ سمجھتا تھا کہ ان کا وزیر خارجہ کی حیثیت سے چناؤ ممکن ہے نوزائیدہ پاکستان کے لئے مفید ہو۔ مگر قائداعظم کی وفات کے فوراً بعد حالات نے جو رخ اختیار کیا ان کے پیشِ نظر سر ظفر اللہ خاں کی وفاداری اور اخلاص کے بارہ میں میری رائے تبدیل ہونا شروع ہوئی۔ تب میں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ سر ظفر اللہ خاں کو امور خارجہ کے معاملہ میں قابل ترین آدمی قرار دینا، محض پراپیگنڈا تھا اور یہ کہنا کہ وہ اقوام متحدہ میں مسحور کن اثر رکھتے تھے ان کی غلط تصویر کشی کے مترادف تھا۔ میں وزارت خارجہ کے پھڈے میں اپنی ٹانگ اڑانا نہیں چاہتا تھا مگر سر ظفر اللہ خاں کا رویہ ہی اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ نہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کے دشمن تھے بلکہ قیام پاکستان کے ہی خلاف تھے۔ ہر مرحلہ پر مجھے ان کے اسی مخالفانہ اور مخاصمانہ رویہ کا سامنا تھا۔ کشمیر کا مسئلہ ہو یا مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ، سر ظفر اللہ خاں کو دونوں میں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ حتیٰ کہ ریڈکلف ایوارڈ کے سلسلہ میں بھی ان کا کردار مشکوک نظر آتا ہے۔ ان تمام برسوں کے بعد جب میں ماضی کے واقعات کو یاد کرتا ہوں تو مجھے اور زیادہ مایوسی کا سامنا ہوتا ہے۔ مگر جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ سر ظفر اللہ خاں جیسے لوگوں کے باوجود پاکستان قائم ہے تو مجھے بہت اطمینان ہوتا ہے''۔ (صفحہ ۱۱۴)۔

یہ رائے ایک ایسے شخص کی ہے جسے وزارت خارجہ نے من مانی کرنے سے رکوا دیا تھا۔ میرا یہ مرتبہ نہیں کہ میں سر ظفر اللہ کے مرتبہ کے بارہ میں سید صاحب کے تعصبات کا جواب دوں۔ گر نہ بیند ازاں راشپرہ چشم۔ چشمہء آفتاب راچہ گناہ۔ ان سوالات کا جواب بارہا دیا جا چکا ہے۔ جسٹس منیر اپنی رپورٹ میں ریڈکلف ایوارڈ کے باب میں سر ظفر اللہ پر دھول اچھالنے کو ''شرمناک ناشکرے پن کا ثبوت دینا'' کہہ چکے ہیں۔ قائداعظم کا سر ظفر اللہ کو اپنا وزیر خارجہ بنانا ہی ان کی قابلیت کو تسلیم کرنے کا

ناقابل تردید ثبوت ہے اور اقوام متحدہ کا ریکارڈ ان کی ''پراپیگنڈہ کے زور پر مسحور کن قرار دی گئی'' تقریروں سے بھرا پڑا ہے۔ جنہیں ہر کوئی پڑھ سکتا ہے۔ اس لئے سید صاحب کی باتوں کی صرف اتنی سی حقیقت رہ جاتی ہے کہ '' باہر نکل پڑا ہے وہ اندر کا آدمی''! آسمان کا تھوکا منہ پر!!

ریڈکلف ایوارڈ کے بارہ میں ہاشم رضا صاحب نے پورا ایک باب باندھا ہے اور خود اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ۹ راگست کو ریڈکلف نے ایوارڈ ماؤنٹ بیٹن کو دے دیا تھا اس ایوارڈ میں فیروز پور زیرہ گورداسپور پاکستان میں شامل تھے۔ ماؤنٹ بیٹن نے ایوارڈ روک کر ان میں نہرو کی مرضی کے مطابق تبدیلیاں کیں'' (صفحہ ۳۷۳)۔ اب ان کے اپنے کہے کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے کہ ریڈکلف ایوارڈ کے باب میں سر ظفر اللہ خاں کا کردار مشکوک تھا؟ سر ظفر اللہ تو کامیابی سے مسلم لیگ کا کیس پیش کر کے زیرہ، گورداسپور اور فیروز پور کو پاکستان میں شامل کروا چکے تھے۔ ماؤنٹ بیٹن نے ایوارڈ میں تبدیلیاں کیں اس میں سر ظفر اللہ خاں کا کردار کیسے مشکوک ہو گیا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہاشم رضا اپنے کہے کی تردید خود کر رہے ہیں؟ دروغ گورا حافظہ نہ باشد۔ اسی طرح آپ کا کہنا ہے کہ وائسرائے کے پرائیویٹ سکرٹری نے حد بندی کی جو اطلاع سر ایون جنکنز کو دی وہ ''یقیناً غیر سرکاری تھی'' (صفحہ ۳۷۴)۔ حالانکہ سر فرانسس مودی کو جو نقشہ سر ایون جنکنز کے خفیہ کاغذات میں ملا تھا وہ جارج ایبل کے خط کے ساتھ منسلک ہو کر آیا تھا اس لئے یہ اطلاع غیر سرکاری نہیں تھی۔

ہاشم رضا صاحب نے سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ماؤنٹ بیٹن سے خط و کتابت کی اور اس خط و کتابت کی بنیاد پر اخبار 'ڈان' میں مضامین کا ایک سلسلہ بھی شروع کیا۔ حیرت ہے کہ آپ نے اس کتاب میں ہر وہ غیر اہم خط شائع کر دیا ہے جس سے ان کی ''توصیف و ثنا'' کا پہلو نکلتا تھا مگر ماؤنٹ بیٹن کی خط و کتابت کو خدا معلوم آپ نے اس کتاب کے لئے کیوں درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ اس خط و کتابت کی وجہ سے بھٹو صاحب نے ''موت کی کال کوٹھڑی'' سے انہیں خط لکھا تھا جو ان کی زندگی میں ان تک نہیں پہنچا۔ بیٹی نے وزیراعظم بننے کے بعد وہ خط مکتوب الیہ تک پہنچایا۔ بھٹو صاحب کا وہ خط اس کتاب کا اہم جزو ہے کیونکہ اس میں ذوالفقار علی بھٹو نے ''انتقالِ اقتدار'' کے فلسفہ پر روشنی ڈالی ہے کہ اقتدار کو کوئی شخص برضا و رغبت منتقل نہیں کیا کرتا۔ بھٹو کا کہنا ہے کہ: ''میرا خیال ہے

کہ اگر یحییٰ خاں کی مطلق العنان حکومت ۱۹۷۰ء۔۱۹۷۱ء میں انتقال اقتدار کے معاملہ میں میرے اور مجیب الرحمٰن کے ساتھ سیاست نہ کھیلتی تو مشرقی اور مغربی پاکستان کو مزید کچھ عرصہ تک یکجا رکھنے کے امکانات زیادہ ہوتے۔ یحییٰ خاں اپنے اور اپنے ساتھی جرنیلوں کے لئے اقتدار میں جگہ تلاش کرنے کی کوشش میں لگا رہا'' (صفحہ ۲۱۳) اب تو حمود الرحمٰن رپورٹ الم نشرح ہوگئی ہے اس لئے بھٹو صاحب کی اس بات کی تائید یا تردید بے معنیٰ ہے۔ مگر 'مزید کچھ عرصہ تک' کے الفاظ قابلِ غور ہیں۔ بھٹو صاحب بھی اقتدار سے بے طرح چمٹے نہ رہتے تو شاید دار تک نہ پہنچتے۔ مگر انہیں پہنچنا ہی تھا۔

مصنف نے اپنے بہاولپور کا کمشنر ہونے کے زمانہ کو اپنی سروس کا بہترین زمانہ قرار دیا ہے۔ سر صادق محمد خاں عباسی نواب بہاولپور کی شفقتوں کو یاد کیا ہے۔ بہاولپور کے علاقہ چولستان پر نظمیں بھی لکھی ہیں۔ سرائیکی سے بابا فرید کی کافیوں کا ترجمہ بھی اپنی نیم پختہ شاعری میں کیا ہے۔ مگر ان کی نظر محلات ہی میں الجھی رہی ان کے باہر کی دنیا میں دیکھنے کا انہیں موقع نہیں ملا۔ بہاولپور کے ایک اور کمشنر منظور الٰہی نے بھی نواب صاحب کی شفقتوں اور بہاولپور کی روہی کا تذکرہ کیا ہے مگر ساتھ ہی وہ بات بھی کہہ دی ہے جو ہاشم رضا نے نہیں کہی کہ ''قصرِ وارسائی طرز کا یہ محل پرشکوہ تھا مگر فصیل کے اس پار غربت کی گہری چھاپ تھی۔ جمود اور ٹھہراؤ تھا۔ ہمسائیگی میں بھی صحرائی ریاستیں تھیں مگر وہاں ترقی کے تیور اور تھے یہاں کچھ بدروئیں اور محرومی تھی، کھجوروں کے جھنڈ تھے اور آموں کے باغ جہاں موسم گرما میں باسی روٹی کھانے اور چھاچھ پینے کے بعد چارپائیاں ڈال کر لیٹ جاتے تھے۔ اٹھ کے آم کھا لیتے پھر سو جاتے۔ سہ پہر کو رقص کناں بگولے افلاک کی خبر لاتے تپش سے انسان کیا چرند پرند العطش العطش پکار اٹھتے۔ لوگ صدیوں سے عسرت و واماندگی کی چکی میں پس رہے تھے'' (سلسلہ روز و شب صفحہ ٦٦)۔ ہاشم رضا حاکم بن کر وہاں مقیم رہے منظور الٰہی نے کمشنری کرنے کے علاوہ اپنے انسانی احساس کو کند نہیں ہونے دیا۔ ہاں وہ بات جس کا ذکر منظور الٰہی نے بطور کنایہ کے کیا تھا ہاشم رضا نے علی الاعلان کہہ دی کہ: ''۱۹۴۷ء میں ڈگلس فیل Fell قلات کے وزیر اعظم تھے۔۔۔۔ میں نے ان سے پوچھا قلات پاکستان سے الحاق کا اعلان کب کر رہا ہے؟۔ کہنے لگا تمہیں پوچھنا چاہئے تھا کہ قلات پاکستان سے الحاق کر بھی رہا ہے یا نہیں؟ میں سکتے میں آ گیا میں نے کہا ''تمہارا یہ مطلب تو نہیں ہے نا کہ قلات ہندوستان سے الحاق کرنا چاہتا ہے''۔ کہنے لگا ''نہیں میرا یہ مطلب نہیں مگر قلات کے پاس

یہ فیصلہ کرنے کا اختیار تو ہے کہ وہ دونوں میں سے کسی ریاست کے ساتھ الحاق نہ کرے اور خود مختار ریاست قلات بن جائے''۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ ماؤنٹ بیٹن سے اس معاملہ پر بات چیت کرنے کے لئے دہلی جا رہا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ یہ سب سعیء رائیگاں ہوگی۔۔ کچھ عرصہ کے بعد مسٹر فیل Fell چلے گئے اور خان قلات نے پاکستان کے ساتھ الحاق کر لیا۔۔۔ معلوم ہوتا ہے مسٹر فیل اور بھٹو کے زمانہ میں بلوچستان کے گورنر بننے والے نواب اکبر بگٹی ایک ہی نہج پر سوچتے تھے۔۔ بھٹو صاحب صدر تھے تو سو آدمیوں کا قافلہ لے کر روس کے دورہ پر گئے۔ اس میں بگٹی صاحب بھی تھے اور احمد ای ایچ جعفر بھی تھے۔۔۔ بھٹو صاحب واپس ہوئے تو بگٹی ان کے ساتھ واپس نہیں ہوئے، احمد ای ایچ جعفر نے ماسکوائر پورٹ پر ان سے پوچھا آپ کیوں واپس ساتھ نہیں چلتے؟ بگٹی صاحب نے جو جواب دیا اس نے ان کو ہلا دیا جواب یہ تھا ''سوشلسٹ ریپبلک آف بلوچستان کا قیام آپ کے نزدیک کیسا رہے گا''؟ اس جواب سے احمد جعفر کو اتنا ہی صدمہ پہنچا جتنا مجھے مسٹر فیل کا جواب سن کر پہنچا تھا'' (صفحہ ۲۹۲۔۲۹۳ جستہ جستہ)۔ اس اقتباس سے بھٹو صاحب کی مردم شناسی کے جوہر کی قلعی بھی کھل گئی۔

اس کتاب میں جتنی خوش طبعی کی باتیں ہیں وہ دوسروں کی ہیں خود ہاشم رضا صاحب کا ذوقِ سلیم محض دوسروں کی غلط انگریزی سے حظ اٹھانے تک محدود ہے۔ اپنے اطلاعات کے محکمہ کی سربراہی کے دوران انہیں بخاری برادران کے ساتھ قریبی میل جول کا موقعہ ملا۔ آپ نے بڑے بخاری اور چھوٹے بخاری کے گھسے پٹے لطائف بڑے مزے لے کر بیان کئے ہیں۔ پطرس کا یہ قول درج کر کے بڑے خوش ہوئے ہیں کہ جب انہیں ذوق کا یہ شعر سنایا گیا کہ پل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا تو پطرس نے کہا میں سمجھا یہ کسی ایگزیکٹو انجینئر کا شعر ہے۔ یا جسٹس ایم آر کیانی صاحب کی باتوں سے متن میں شگفتگی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ البتہ ایس ایم اکرام کی واردات اردو کے قارئین کے لئے شاید نئی ہو کہ وہ لکھنؤ گئے تو وہاں ایک تانگہ میں بیٹھ کر اپنے ہوٹل تک پہنچے، تانگے والے سے کہا میاں میں لکھنؤ کی سیر کرنا چاہتا ہوں اس لئے لمبے رستے سے لے کر چلو۔ جب بھی انہیں کوئی نئی یا اہم عمارت نظر آتی وہ تانگہ والے سے اس کی بابت پوچھتے تو وہ مختصر سا جواب دے کر چپ ہو جاتا اس سے اکرام صاحب نے اندازہ لگایا کہ اسے ان کا سوال کرنا اچھا نہیں لگا۔ آپ منزل مقصود پر پہنچے تو تانگہ والے سے کہا کہ وہ اس سے زیادہ خوش اخلاقی اور مروت کی توقع رکھتے تھے۔ ٹانگہ والے نے جواب دیا

جناب میں کوئی پیشہ ور گائیڈ نہیں ہوں۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں نے کس قدر ضبط و تحمل کا ثبوت دیا ہے۔ آج کی رات ایک مشاعرہ ہو رہا ہے میں اس مشاعرہ کے لئے غزل کہہ رہا تھا۔ میں مشکلوں سے ایک مصرعہ کہتا تو آپ سوال کر دیتے، میں جواب دے کر فارغ ہوتا تو وہ مصرعہ ذہن سے نکل چکا ہوتا''۔ اکرام صاحب کہنے لگے واقعی یہ تو بڑی زیادتی ہوئی۔ میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا۔
(صفحہ ۲۴۱ سے اپنے لفظوں میں خلاصہ)

جب یہ اطلاعات کے محکمہ کے سربراہ کا جائزہ لے چکے تو انہیں معلوم ہوا کہ اکبرالہٰ آبادی کا کلام ریڈیو پاکستان سے نشر کرنے پر پابندی ہے اور وہ پابندی بنگالی وزیر خواجہ شہاب الدین نے لگائی ہے کہ اکبر سر سید کا بہت مذاق اڑاتے اور تعلیم نسواں کے بہت خلاف ہیں۔ میں اس وقت کے وزیر شعیب قریشی کے پاس گیا اور بخاری صاحب کی موجودگی میں یہ مسئلہ اٹھایا اور پابندی اٹھوائی۔

اسی زمانہ میں قومی ترانہ کا انتخاب ہوا۔ شاید یہ بات کچھ قارئین کے لئے نئی ہو کہ قومی ترانے کے مقابلے میں حفیظ جالندھری اور ذوالفقار بخاری کے ترانے منتخب ہوئے تھے۔ وزیراعظم نے کہا کہ دونوں ترانوں میں سے حفیظ کے ترانہ کا پہلا اور آخری حصہ لے لیا جائے اور بخاری کے ترانے کا درمیانی حصہ لے لیا جائے اس طرح یہ ترانہ دونوں کا مشترکہ ترانہ ہو۔ جب ہاشم رضا صاحب نے یہ تجویز دونوں شعراء کے سامنے پیش کی تو دونوں نے اسے رد کر دیا۔ اس طرح حفیظ کا ترانہ منتخب کر لیا گیا۔ حفیظ جالندھری نے اس موقعہ پر بھی ''جلندھری'' دکھائی یعنی یہ الزام لگایا کہ بخاری نے اپنا ترانہ بہترین گلوکاروں سے گوا کر پیش کیا ہے جب کہ ان کا ترانہ کسی اناڑی سے گوایا گیا ہے اس لئے وہ خود اپنی آواز میں ترانہ کا ریکارڈ بنوانا چاہتے ہیں مگر کابینہ نے دونوں ترانے سن کر ان کا الزام مسترد کر دیا۔ (صفحہ ۲۶۳)

مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح کے خطاب کا قضیہ بھی انہی کے زمانہ کا ہے کہ ان کے خطاب میں بعض ایسے مقامات تھے جنہیں نشر کرنا اس وقت کی حکومت کے مفاد میں نہیں تھا اس لئے بخاری صاحب کو ہدایت کی گئی کہ وہ اس موقع پر ''گڑبڑ'' کر دیں۔ جب آپ خطاب کے بعد واپس تشریف لائیں تو ان کے مداحوں نے انہیں بتایا کہ ان کے خطاب کے بعض حصے ٹھیک طرح سے سنے نہیں گئے اس پر وہ بہت ناراض ہوئیں اور آئندہ ریڈیو سے براڈکاسٹ کرنے سے انکار کر دیا۔ ہاشم رضا صاحب نے انہیں بڑی

مشکل سے راضی کیا اور انہیں یقین دلایا کہ آئندہ ان کے خطاب میں کوئی گڑبڑ نہیں کی جائے گی۔

اس کتاب میں یہ واقعہ بھی درج ہے کہ '' جب میں قومی اسمبلی کے اگلے اجلاس میں شرکت کے لئے گیا تو ۱۹۶۱ء میں ڈھاکہ میڈیکل کالج بھی گیا وہاں قومی اسمبلی کے سابق سپیکر عبدالوہاب خاں کو دیکھا کہ جنرل وارڈ میں پڑے ہیں میں نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ انہیں تو وی آئی پی وارڈ میں ہونا چاہئے تھا۔ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ نہیں میں عوام کا آدمی ہوں اس لئے یہاں مجھے وی آئی پی روم سے زیادہ آرام میسر ہے۔ اس پر میں نے انہیں میر انیس کا ایک شعر ترجمہ کر کے سنایا تو وہ بہت خوش ہوئے کہ ' زمیں کے تلے جن کو جانا ہے اک دن۔ وہ کیوں سر کو تا آسماں کھینچتے ہیں'' (صفحہ ۳۶۹)۔

اس خودنوشت کے لکھنے کا محرک یہ ہوا کہ برطانیہ کے محکمہ خارجہ اور کامن ویلتھ والوں نے ان سے خواہش کی کہ یہ برطانوی دور کے اواخر میں ضلعی کلکٹر کے طور پر کام کر رہے تھے اس لئے اپنی یادیں لکھ کر انہیں بھیجیں کیونکہ وہ اس حیثیت میں کام کرنے والے آئی سی ایس افسروں کی یادوں کو یکجا کر کے چھاپنا چاہتے ہیں۔ وہ یادیں آپ نے لکھ دیں۔ بعد کو ان کے بعض خیر خواہوں نے خواہش کی کہ وہ اپنی باقی ملازمت کی یادیں بھی قلم بند کریں چنانچہ یہ خودنوشت وجود میں آئی۔ سید صاحب اپنی سروس کی ترتیب سے باتیں لکھتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ اپنے یورپ کے سفر کی روداد بھی خودنوشت میں شامل کر دی ہے۔

یہ کتاب مکمل ہونے کے بعد ان کے ایک دوست کو خیال آیا کہ اس میں بہت سے سوالات جواب طلب ہیں اس لئے انہوں نے ایک سوالنامہ انہیں لکھ کر بھیج دیا۔ کتاب کے اختتام پر وہ سوالنامہ اور اس کے جوابات درج ہیں۔ اس سوالنامہ سے جہاں بہت سے سوالوں کا جواب مل گیا ہے وہاں بہت سے مزید سوال بھی پیدا ہو گئے ہین اور اسی وجہ سے یہ خودنوشت اس دور سے آگاہی حاصل کرنے کے خواہشمند قاری کی تشنگی بجھا نہیں پاتی۔

اے کاش سید صاحب یہ خودنوشت اردو میں لکھتے خواہ انہیں اس کا نام انگریزی ہی میں رکھنا پڑتا!

◎

گیان سنگھ شاطر

ہندوستان میں چھپنے والے ایک سوانحی ناول نے کافی ہلچل پیدا کی۔ یہ سوانحی ناول گیان سنگھ شاطر کا ''گیان سنگھ شاطر'' ہے۔ اس ناول کے بارہ میں ایک رائے تو علی گڑھ اور عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر سید ہاشم علی کی ہے کہ ''اس کی نثر میں حیران کن موسیقی کا احساس ہوتا ہے'' حالانکہ اس ناول کی زبان موسیقی سے معرا سیدھی سادی اور سپاٹ زبان ہے جس میں زبان و بیان کی باریکیاں یا اظہار و ابلاغ کی نغمگی چراغ لے کر ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ یہ زبان ناول کی یا افسانوی ادب کی زبان نہیں کسی علمی مضمون یا مقالہ کی زبان محسوس ہوتی ہے جس میں مصنف نے جہاں تہاں رنگینیء بیان پیدا کرنے کی سعی میں لفظوں کے جوڑ توڑ کا سہارا لیا ہے۔ دوسری اسی حد تک مبالغہ آمیز رائے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی ہے کہ ''اس نوع کی کتاب اس سے پہلے اردو میں نہیں لکھی گئی''۔ خدا معلوم ڈاکٹر نارنگ نے یہ بات از رہِ تعریض کہی ہے یا واقعی ان کی نگاہ سے اردو کا کوئی سوانحی ناول نہیں گذرا۔ اس کے اسلوب کے بارہ میں وہ رطب اللسان ہیں کہ ''جس طاقتور اور مضبوط اسلوب اور کھلے ڈلے بے محابا اور پرقوت اظہاری پیرائے سے بیانیہ کو قائم کیا ہے اور جمالیاتی کیف و کم، لطف و نشاط، رنج و الم، اور عزم و اعتماد کی جو تہ در تہ اور ہمہ گیر فضا متشکل ہوگئی ہے اس کے بیان کے لئے رسمی الفاظ ادھورے اور نامکمل لگتے ہیں'' (کتاب کا بیک ٹائٹل)۔ کتاب پڑھنے والا مجھ سا ہیچ مدان، ڈاکٹر نارنگ کے اس بیان کو پڑھتا ہے تو غالب کے اس شعر پر سر دھنتا رہ جاتا ہے خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے۔ ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہئے۔

اس سوانحی ناول کا موضوع لکھنے والا خود ہے اس لئے اسے اپنی زندگی کی کیفیات کو بیان کرنے کی پوری آزادی ہے۔ وہ اپنے باپ کی حیوانیت کو حیوانیت کہنے کی جرات رکھتا ہے اپنے لڑکپن کے معاشقوں کو اپنی جنسی کجروی اور جنسی بیماریوں کو چھپاتا نہیں الم نشرح کرتا ہے۔ اپنی جنسی واردات کو

جزئیات کے ساتھ مزے لے لے کر بیان کرتا ہے۔ دیہی سکھ معاشرہ کی اونچ نیچ کو جسے دوسروں نے بیان کرنے میں تذبذب سے کام لیا ہے اس نے کھل کر ڈنکے کی چوٹ بیان کیا ہے۔ حکمت کی باتیں بیان کرنے کے لئے اس نے ''تایا'' کے روپ میں ودوان، گرنتھی اور عالم کا کردار تخلیق کر رکھا ہے جہاں اسے کوئی فلسفیانہ بات کہنا ہوتی ہے وہ ''تایا'' کو سامنے لے آتا ہے۔ اس طرح اس ناول کی فکری سطح بلند ہو جاتی ہے۔ میرے خیال میں اس ناول کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی زبان نہیں اس کی صاف گوئی ہے۔ اس صاف گوئی کی وجہ سے اس کے کردار حقیقی لگتے ہیں۔ باپ کی کھردری اور بے رحم شخصیت کی وجہ سے ماں کی کسمپرسی اور بے بسی واضح ہو جاتی ہے اس طرح معاشرہ کی ناہموار کیفیتیں اجاگر ہوتی ہیں۔ کہیں کہیں ایک آدھ فقرہ کوندے کی طرح لپکتا ہے ''میری نیت اس سناٹے کی طرح ٹوٹی جس میں کوئی چیخ مار دے'' (صفحہ ۴۱۴)۔

مصنف نے ہوشیار پور کے ایک غریب بڑھئی کے ہاں آنکھ کھولی۔ غربت میں لوٹ پیٹ کر بڑھا، گھر بار چھوڑ کر دلی کا رخ کیا۔ محنت مزدوری کرنے کے ساتھ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ آخر عالمی ادارہ ڈبلیو ایچ او WHO میں ملازمت کی اور پھر حیدر آباد جا آباد ہوا تا کہ زبان سیکھ کر اپنا احوال قلمبند کر سکے۔ گیان سنگھ شاطر نے ایک کم ذوقی یہ کی ہے کہ ہر باب کے سرعنوان کے طور اپنا کوئی شعر درج کیا ہے۔ شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کی شاعری تیسرے درجہ کی تک بندی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ اس سوانحی ناول میں سے اس کے ذاتی شعر منہا کر دئے جائیں تو ناول کی عمومی سطح بلند ہو جائے گی اور قاری دلجمعی کے ساتھ دلچسپی لے سکے گا۔

میں نے جب تک خوشونت سنگھ کی انگریزی میں لکھی ہوئی خودنوشت نہیں پڑھی تھی میرا خیال تھا یہ سوانحی ناول سکھ سائیکی کا واحد نمائندہ ہے اور جس طرح امراؤ جان ادا کو اودھ کے مسلم معاشرہ کے انحطاط کا آئینہ دار سمجھا جاتا ہے گیان سنگھ شاطر سکھ معاشرہ کی ہمہ گیر کھردری اور بے رحم جنسی جارحیت کا نمائندہ ہے۔ اب شاید گیان سنگھ شاطر تنہا نہیں رہا۔ خوشونت سنگھ اس کے دوش بدوش کھڑا اپنی انگریزی بگھار رہا ہے۔

◎

گرداب کی شناوری

کامریڈ زہرا داؤدی کی خودنوشت ''گرداب کی شناوری'' جاوداں والوں نے ۱۹۹۶ء میں کراچی سے چھاپی۔ ۲۱۵ صفحوں کی اس خودنوشت میں کامریڈ زہرا کے حالات کے بیس پچیس صفحے ہیں باقی سب کچھ ان کے مارکسی نظریات کے پرچار کی باتیں ہیں یا ان کے مختلف ملکوں کے اسفار کی روداد۔ پٹنہ میں پیدا ہوئیں۔ غریب اور قدامت پسند گھرانے سے تعلق تھا۔ سکول کی تعلیم بڑی مشکل سے حاصل کر پائیں۔ بڑے بھائی کے تتبع میں مارکسی نظریات اپنائے۔ باقاعدہ کارڈ ہولڈر کمیونسٹ رہیں۔ جلوسوں میں آگے آگے رہنے، جیل کی ہوا کھانے اور زیر زمین رہ کر کام کرنے کے تجربات حاصل ہوئے۔ شادی، مولانا شفیع داؤدی کے کٹر مذہبی گھرانے میں ہوگئی مگر خوش نصیب تھیں کہ میاں بھی کمیونسٹوں کے ہمدرد نکلے۔ ۱۹۶۵ء میں پاکستان آگئیں کراچی میں کچھ لیکچراری کی کچھ وکالت کی پریکٹس، مایوسیوں کا سامان رہا مگر جنوبی ایشیا کی روایتی عورت کی طرح صبر شکر کے کلمات کے سوا کوئی کلمہ اس ''دہریہ اور کافر'' کے منہ سے نہیں نکلا۔ اشتراکی نظریات نے ان کے ذہن میں کشادگی پیدا کردی ہے اور بہ قول خود ان کے مستقبل کا پروگرام بھی یہی ہے ''فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا''۔ یہیں کہیں کینیڈا میں ہیں اور اپنے بچوں میں مگن۔ اس خودنوشت میں کوئی ایسا مواد موجود نہیں جو قاری کو اپنی طرف کھینچے۔ ہاں 'باشام' کا بنایا ہوا ٹائیٹل بڑا اچھا ہے اور عنوان بھی چونکا دینے والا ہے اور بس۔

خودنوشت

مولانا ابوالکلام آزاد کی اردو کی خودنوشت ۲۰۰۲ میں دلی سے اسی عنوان سے شائع ہوئی ہے۔

ان کی انگریزی خودنوشت INDIA WINS FREEDOM برسوں پہلے شائع ہوئی تھی۔ یہ ان کی سیاسی خودنوشت تھی جس نے اس وجہ سے بھی بہت شہرت حاصل کی تھی کہ مولانا نے اس کے بعض حصوں کی اشاعت کو تیس سال کے لئے ملتوی رکھنے کی وصیت کردی تھی۔ تیس سالوں کے بعد وہ حصے شائع ہوئے تو معلوم ہوا کہ ان حصوں کی حقیقت صرف اتنی تھی کہ مولانا اپنے کانگریسی رفقاء کے بارہ میں اپنے ناقدانہ خیالات کو ان کی یا اپنی زندگی میں الم نشرح نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اردو کی خود نوشت مولانا نے ۱۹۲۱ء میں نظر بندی کے دوران اپنے رفیق زنداں، ملیح آبادی صاحب کو لکھوائی۔ ابھی اپنے آباؤ اجداد اور والد گرامی کا ذکر ہی کر پائے تھے کہ رہا ہو گئے اور یہ سرگزشت بھی ''قید قلمبندی'' سے رہا ہو گئی۔ خدا معلوم کیا مکروہات پیش آئے کہ اسے شائع نہ کیا جاسکا۔ اب ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس والوں نے اسے ''خودنوشت'' کے عنوان سے چھاپ دیا ہے۔ ملیح آبادی نے اس کا نام ''آزاد کی کہانی'' رکھا تھا۔ یہ رفیقِ زنداں عبدالرزاق ملیح آبادی تھے یا کوئی اور؟ چھاپنے والے اور دیباچہ نگار اس باب میں خاموش ہیں اور میرے پاس اس بات کی تحقیق کا کوئی ذریعہ نہیں کہ کیا عبدالرزاق ملیح آبادی بھی ان کے ساتھ قید و بند میں شریک تھے یا نہیں؟

انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''عجائباتِ روزگار میں سے یہ کتاب بھی اس لحاظ سے ایک عجوبہ ہے کہ مولانا اپنی پوری زندگی میں شاید کوئی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی نہیں بھولے مگر لکھا دینے کے بعد اس کتاب کو بالکل ہی بھول گئے مجھے حق الیقین ہے کہ کتاب یاد آجاتی تو ''نظر ثانی'' کے بہانے ضرور چھین لیتے اور کتاب ان کے بے شمار مسودوں کی طرح غائب ہو جاتی'' (صفحہ ۳۲) اس خودنوشت کا اسلوب مولانا کے عام اسلوب سے بالکل مختلف ہے جناب ملیح آبادی لکھتے ہیں۔'' اس کتاب کو یہ امتیاز

بھی حاصل ہے کہ مولانا کی روزمرہ کی بات چیت قلمبند ہوئی ہے۔ مولانا کے قلم کی گلکاریاں تو بہت کچھ محفوظ ہوچکی ہیں۔ مولانا کی معجز بیانیاں بھی ہماری موجودہ نسل کے کانوں میں برابر گونجتی رہیں گی اور کوئی کوئی تقریر بھی قلم بند ہوچکی ہوگی مگر مولانا گھر میں نج میں بیٹھ کر کس طرح گفتگو کرتے تھے، ان کی یہ گفتگو ہو بہو اس کتاب میں محفوظ ہوچکی ہے میں نے اس میں کسی قسم کی بھی تصرف یا تغیر تبدل کرنا خلاف دیانت سمجھا ہے'' (صفحہ ۳۲)۔

مولانا آزاد کے باب میں ہر شخص نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ وہ بہت صغرسنی میں ہی تحصیل علم سے فارغ ہونے کے بعد مسند وعظ پر بیٹھ گئے تھے۔ خود ان کے والد گرامی کا کہنا تھا کہ ''میں اس کی ذہانت سے ڈرتا ہوں'' (صفحہ ۲۷۰)۔ مگر انہیں اس بات کی داد دینا چاہئے کہ انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں یعنی ابونصر غلام یٰسین آہ اور محی الدین فیروز بخت ابوالکلام کو اپنی ذاتی نگرانی میں اور توجہ سے اسلامی علوم مروجہ سے پوری طرح کماحقہ، بہرہ ور کیا اور معقولات و منقولات کو ان کے لئے پانی کر دیا۔

ساتھ میں مولانا کا کہنا ہے کہ ''بچپن ہی سے میں اپنے اندر گویائی کا ایک سخت جوش پاتا تھا حتیٰ کہ جب کوئی مخاطب نہ ملتا تو جو آدمی مل جاتا تو اسی کے آگے لمبی تقریریں شروع کر دیتا۔ گھر میں مریدوں معتقدوں کی کمی نہ تھی جن میں اہلِ علم کم عوام زیادہ تھے لیکن دونوں ہم کو پیرزادہ سمجھ کر ہماری ہر بات پر آمنا و صدقنا کہتے تھے۔ اس وقت میری عمر دس گیارہ برس سے زیادہ نہ تھی عام طور پر لوگوں کو استغراب ہوتا اور ہمارے معتقدین اس کو اس خاندان کی ایک خارق عادت کرامت قرار دیتے چنانچہ عام طور پر کلکتہ میں شہرت تھی اور ان کو منجملہ والد مرحوم کے خوارق کے قرار دیا جاتا کہ دس برس کی عمر میں ان کے لڑکے وعظ کرتے ہیں'' (صفحہ ۱۵۰)۔ ادھر مولانا کی عمر کے بارہ میں لوگوں کا استغراب قائم تھا ''مولانا شبلی نعمانی سے میں ۱۹۰۴ء میں سب سے پہلے بمبئی میں ملا جب میں نے اپنا نام ظاہر کیا تو اس کے بعد آدھے گھنٹے تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اور چلتے وقت انہوں نے مجھ سے کہا ''تو ابوالکلام آپ کے والد ہیں؟'' میں نے کہا ''نہیں میں خود ہوں''۔ ۱۹۰۴ء میں جب یہ دقت پیش آتی تھی تو ۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۱ء تک اس بارے میں میری پریشانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے'' (صفحہ ۱۵۱۔۱۵۲)۔ مگر اس عمر میں بھی ان کی شخصیت میں ایک خاص قسم کی سنجیدگی پیدا ہوگئی تھی جس کا سبب ان کے نزدیک یہ تھا

کہ ان کی والدہ فوت ہوچکی تھیں اور گھر میں صرف والد مرحوم ہی کا حکم چلتا تھا'' والد مرحوم کی ہیبت ان کی شفقت پر غالب تھی مجموعی طور پر ان کی زندگی چونکہ بزرگی، عظمت اور عوام کے اثر سے مرکب تھی اور گھر ماں سے خالی تھا اس لئے قدرتی طور پر ہم لوگوں کو گھر میں بھی ان کا وہی اثر غالب نظر آتا تھا اور قلب اس قدر مرعوب ہوگیا تھا کہ ان کی آواز سے ہم سب لوگ کانپا کرتے تھے۔ ان کو مجلسی آداب کا بہت خیال تھا اس بارے میں وہ اپنا بچپن جس طرح گذار چکے تھے پچاس ساٹھ برس بعد اپنی اولاد کو بھی اسی رنگ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ کھانے پینے، چلنے پھرنے، لباس، نشست و برخاست، ان ساری باتوں کے اس عمر میں بھی آداب و قواعد تھے اور ہم مجبور تھے کہ ان سے سرِ مو انحراف نہ کریں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ہم دونوں بھائیوں کی عمر دس برس سے زیادہ نہ تھی لیکن ہم اس زندگی کے عادی ہوگئے تھے طبعی طور پر کھیل کود کے جذبات فنا تو نہیں ہو سکتے مگر حد درجہ تشدد، معیت و ہم صحبتی کے فقدان اور صرف ایک والد ہی کے نمونہ کی موجودگی سے تمام اس طرح کے جذبات افسردہ ضرور ہوگئے تھے اور ان کی جگہ ایک قبل از وقت سنجیدگی پیدا ہوگئی تھی'' (صفحہ ۱۴۳)

مولانا آزاد کی یادداشت بھی غیر معمولی تھی کہتے ہیں ''مجھے اپنی زندگی کے ابتدائی واقعات ابتدائے طفولیت سے یاد ہیں۔ مجھے بارہا خیال ہوا ہے کہ میں اپنی چار برس کی عمر کے چند نمایاں واقعات اچھی طرح یاد رکھتا ہوں'' (صفحہ ۱۳۷) ایسی یادداشت بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ ہمارے خودنوشت سوانح نگاروں میں سے صاحبِ مرقاۃ الیقین حکیم نورالدین صاحب کو بھی ایسی ہی غیر معمولی یادداشت قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئی تھی۔ انہیں دوڈھائی سال کی عمر میں اپنی ماں کا دودھ چھڑانا بھی یاد تھا۔ مولانا آزاد کی یادداشت نے ان کے لئے حصول تعلیم کے مراحل بہت آسان کر دئے ''مجھے یاد نہیں کہ تعلیم کے زمانے میں ابتدا سے لے کر آخر تک کبھی بھی میں نے سبق کے رٹنے میں یا اس کو بار بار دہرانے میں عام طالب علمانہ طریق اختیار کیا ہو۔ عموماً یا تو سبق لیتے وقت کی یادداشت کفایت کرتی تھی اور یا آئندہ سبق کو اساتذہ کی ہدایت کے مطابق تیار کرنے میں جو کچھ بھی ذہن کام کر لیتا تھا اسی پر میں قناعت کر لیتا تھا'' (صفحہ ۱۴۸)۔ اس طرح اگر وہ صغرسنی ہی میں علمی لحاظ سے نمایاں ہوگئے تو تعجب کی بات نہیں۔ ان کے اساتذہ نے کہنا شروع کر دیا کہ ''اب تمہیں پڑھانا

چاہئے پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں'' (صفحہ ۱۴۸)۔

اس تیز فہمی کا ایک شاخسانہ یہ بھی ہوا کہ جلد ہی انہیں شکوک وشبہات کا سامنا کرنا پڑا۔ سرسید کے اثر میں رہنے کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ مذہبی عقائد واعمال کے خلاف شدید ردعمل شروع ہوا ''چند دنوں کے بعد شک واضراب (اضطراب؟) نے انکار تک رسائی پیدا کر لی تو اب ذہن نے پوری جدوجہد طبیعت کے مقابلے میں شروع کر دی صاف نظر آنے لگا کہ نہ صرف فعل عبث ہے بلکہ ایک سخت فریب وریا ہے ایک عمل جس پر ہمیں ایک لمحے کے لئے بھی یقین نہیں اسے اہلِ یقین کی طرح کرنا خود اپنے ساتھ فریب کھیلنا ہے۔ یہ نہیں ہوا جیسا کہ معمولی حالات میں ہوتا ہے کہ تدریجی رفتار کے ساتھ ترک عمل تک پہنچے ہوں بلکہ چند دنوں کی فکر وکشمکش کے بعد ایک دن شب کو آخری فیصلہ کر لیا اور صبح سے نماز ترک کر دی'' (صفحہ ۲۹۰) ''باوجودیکہ طبیعت مذہب کی طرف سے بالکل مایوس ہو چکی تھی لیکن پھر بھی کئی بار ایسا ہوا کہ طبیعت میں کسی کے آگے گر کر رونے اور التجا کرنے کا جوش اٹھا کہ اگر سچ مچ کوئی حقیقت وروشنی ہے تو وہ کیوں نہیں میری راہ کی تاریکی دور کر دیتا اور اس سے میں نے بار بار دعائیں بھی مانگیں، گھنٹوں سجدے میں بھی پڑا رہا۔ میری غذا بالکل کم ہو گئی تھی بھوک جاتی رہی تھی سولہ سترہ برس کی عمر میں نیند اچاٹ تھی اور اگر آتی تھی تو نہایت وحشت انگیز خوابوں میں کٹتی تھی۔ میں نے اس زمانے میں جو خواب دیکھے وہ میرے دماغی التہاب کا ٹھیک ٹھیک عکس تھے'' (صفحہ ۲۹۵)۔ ''یہ میری زندگی کا سب سے تاریک وقت تھا اس سے بھی بہر حال کاوش وجدوجہد تھی اقتناع نہ تھا اس لئے نزع تھی موت طاری نہیں ہوئی تھی مگر اب وہ طاری ہو گئی اور الحاد وانکار جو بسا اوقات سوفسطائیت کا بھی عنصر اپنے اندر رکھتا تھا ایک مصنوعی طبیعت بن کر افکار وعقائد پر غالب آ گیا'' (صفحہ ۲۹۶)۔ یہ اس خودنوشت کے آخری فقرات ہیں۔ اس کے بعد کاتب کا کہنا ہے کہ ''مولانا یہاں تک لکھا چکے تھے کہ جیل سے رہا ہو گئے اور یہ دلفریب داستان افسوس یہیں پر رک گئی رہے نام اللہ کا''۔

یہ خودنوشت ۱۹۲۱ء میں لکھوائی گئی مگر اس کا انجام جہاں ہوا ہے وہ ۱۹۲۱ء سے بہت پہلے تک کے زمانے کے حالات ہیں۔ ۱۹۲۱ء تک تو مولانا بہت سی وادیوں کو پے بہ پے طے کرتے ہوئے مستقبل کے ''امام الہند'' کے مرتبہ کی طرف گامزن ہو چکے تھے۔ ان کی صحافت اور ان کی تصنیفات ان

کے لئے ادب وسیاست میں منفرد مقام کا تعین کر چکی تھیں۔ ان کی صحافت کا آغاز بھی بہت کم سنی میں ہوا۔ ادب میں وہ منجملہ دیگر رسائل کے احسن الاخبار، الندوہ اور مخزن کے ذریعہ متعارف ہوئے اور جلد ہی اپنے منفرد اسلوب کا لوہا منوالیا۔ کلکتہ سے نکلے تو الندوہ کی ادارت چھوڑ کر امرتسر کے اخبار وکیل سے وابستہ ہو گئے کہ یہ اخبار اپنے زمانہ کا بڑا وقیع اخبار تھا۔ اس کے مالک شیخ غلام محمد نے انہیں لکھا تھا کہ ''اگر آپ آ جائیں تو میں اخبار بالکل آپ کے سپرد کر دوں۔ اردو اخبارات میں وکیل کا حلقہ مطالعہ جتنا وسیع اور اونچا ہے ویسا اور کسی اخبار کا نہیں ہے۔'' مولانا نے اس پر، ایزاد کیا ہے کہ ''یہ آخری بات صحیح بھی تھی'' (صفحہ ۳۲۲)۔

''غرضیکہ ان اسباب سے مجھے ''وکیل'' میں دلچسپی پیدا ہو گئی اور چند ہفتوں کے بعد اس کی ایڈیٹری کی پوری ذمہ داری قبول کر لی'' (صفحہ ۲۲۴) طبیعت میں تجسس کا جو عنصر پیدا ہو چکا تھا وہ انہیں قادیان لے گیا۔ ''سفرِ پنجاب میں قادیان بھی گیا مرزا غلام احمد قادیانی مرحوم کے دعاوی اور بعض رسالے دیکھ چکا تھا۔ طبیعت میں ہر نئی بات کے تجسس اور واقفیت کا شوق تھا ہی، خیال ہوا کہ انہیں بھی دیکھنا چاہئے۔ چنانچہ بٹالا گیا اور وہاں سے قادیان روانہ ہوا۔ سخت گرمی شروع ہو چکی تھی اور سڑک بالکل کچی تھی بڑی تکلیف ہوئی۔ وہاں پہنچا تو قصبے کے باہر ایک باغ میں اتارا گیا۔ معلوم ہوا کہ مرزا صاحب اور ان کے وابستہ اشخاص یہیں مقیم ہیں۔ اس سال کانگڑے کا مشہور زلزلہ آیا تھا اور اس کے بعد عرصہ تک کچھ کچھ وقفے کے بعد زلزلوں کا ظہور ہوتا رہا۔ یہ زیادہ نقصان رساں نہ تھے لیکن آئندہ کے لئے کھٹکا پیدا ہو گیا تھا۔ زلزلے ہی کی وجہ سے مرزا صاحب عمارات کو چھوڑ کر باغ میں آ گئے تھے۔ شام کو مغرب کے بعد پہنچا۔ یکے والا مرزا صاحب کا مرید تھا اس لئے وہ ٹھیک منزل مقصود پر لے گیا۔ انجمن (انجمن حمایت اسلام۔ ناقل) کے جلسے میں قادیان کے کئی شخصوں سے ملاقات ہو گئی تھی۔ انہی میں مولوی یعقوب علی ایڈیٹر الحکم بھی تھے انہوں نے بھی حسبِ عادت اصرار کیا تھا کہ میں قادیان جاؤں اور وعدہ لیا تھا کہ روانگی سے پہلے اطلاع دے دینا لیکن میں نے کوئی اطلاع نہیں دی تھی۔

ایک درخت کے نیچے چارپائی پر مولوی عبدالکریم مرحوم بیٹھے تھے میں نے ان کی بیساکھی سے جو پاس پڑی تھی پہچان لیا کہ مولوی عبدالکریم یہی ہیں کیونکہ میں پہلے سن چکا تھا۔ ان کے بعض عزیز والد

مرحوم کے مرید تھے اور کلکتے میں ذکر کیا کرتے تھے میں ان سے ملا اور آنے کا مقصد مرزا صاحب کی ملاقات بتایا۔ وہ بڑے تپاک سے ملے اور فوراً لوگوں سے کہا کہ میرے لئے کھانا لے آئیں اور کہا اکرام ضیف تو ہمارا فرض ہے۔

میں یکے کے سفر اور کچی سڑک کی وجہ سے ہچکولوں سے بالکل چور ہو رہا تھا۔ عشاء کی نماز مولوی عبدالکریم کے پیچھے پڑھ کر ایک درخت کے نیچے لیٹ گیا اور صبح کو چار بجے اٹھا، تو نماز کے چبوترے پر لوگوں کو نمازِ صبح کے لئے تیار پایا۔ اور اس سے طبیعت متاثر ہوئی۔ نماز کے بعد مرزا صاحب باہر نکلے اور ایک چارپائی پر بیٹھ گئے معتقدین نے ہر طرف سے ہجوم کیا بعض لوگ پاؤں دبانے لگے انہوں نے مولوی نورالدین مرحوم کو بلایا۔ میں ان کا نام مرزا صاحب کی جماعت کے ایک خاص رکن کی حیثیت سے سن چکا تھا۔ وہ خضاب کی وجہ سے ڈھاٹا باندھے آئے اور مرزا صاحب نے گذشتہ شب کے الہامات سنانا شروع کئے۔ ایک الہام یہ تھا کہ ''اِیاکَ نعبدُ و اِیاکَ نَستعِین''، مولوی نورالدین مرحوم سے پوچھتے تھے کہ اس کا مقصود کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس پر یاد نہیں کہ مولوی صاحب نے کیا جواب دیا، پھر میری طرف متوجہ ہوئے اور میرے حالات پوچھتے رہے اور کہا کہ جب آپ آئے ہیں تو کم سے کم چالیس دن تک ضرور رہئے اس طرح آنے اور جلد چلے جانے سے تو کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد مرزا صاحب اندر چلے گئے اور مولوی عبدالکریم مرحوم نے مجھے پھر مولانا نورالدین مرحوم اور جماعت کے بڑے بڑے لوگوں سے ملایا۔ نواب محمد علی مالیر کوٹلہ کے بھی وہیں تھے۔ جمعہ کی نماز وہیں ایک میدان میں ہوئی۔ میں گیا تو لوگوں نے مجھے پہلی صف میں جگہ دی۔ اتنے میں مرزا صاحب آئے اور منبر کے جنب میں امام کے مصلے پر بیٹھ گئے اس وقت مولوی عبدالکریم نے خطبہ دیا۔ خطبے کا موضوع یہ تھا کہ بہت سی برکتیں جو انبیائے سلف کے حصہ میں نہیں آئیں ان سے خدا نے مرزا صاحب کو سرفراز فرمایا، از انجملہ یہ کہ اعلان و تبلیغِ رسالت کے یہ وسائل ان انبیا کے زمانے میں کہاں تھے؟ ریل، تار، ڈاک، گریموفون، اخبارات، پریس وغیرہ۔ ان وسائل سے کس طرح ہر صدا شرق و مغرب میں پھیلائی جاسکتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

نماز بھی مولوی عبدالکریم نے پڑھائی اور مرزا صاحب صف سے آگے، مگر ان سے دو انچ پیچھے تنہا کھڑے رہے۔ نماز کے بعد پھر میری طرف ملتفت ہوئے اور اصرار کیا کہ میں چندے قیام کروں

میں نے معذرت کی اور اسی دن روانگی کا ارادہ ظاہر کیا۔ میرا مقصود اس سفر سے صرف وہاں کے طور طریقے دیکھ لینے کا تھا تاکہ معلومات سے باہر یہ معاملہ باقی نہ رہے۔ اس سے زیادہ کوئی خواہش نہ تھی۔ وہاں کوشش یہ تھی کہ میں کوئی معین خیال بھی ظاہر کروں۔ مرزا صاحب نے کئی باتیں اپنے دعاوی اور منصب کی نسبت ایسی کہیں جو سامع کو نفیاً اور اثباتاً کسی جواب پر مجبور کرنے والی تھیں لیکن میں خاموش رہا۔ انہوں نے مجھے پوچھا کہ میری تمام کتابیں تم نے دیکھی ہیں؟ جو رسائل میں نے دیکھے تھے ان کا ذکر کیا اس پر انہوں نے چند کتابیں مجھے دینے کے لئے مولوی (مفتی) محمد (صادق) ایڈیٹر ''بدر'' سے کہا، جو اس صحبت کے نوٹ لے رہے تھے۔ انہوں نے وفاتِ مسیح کا بھی ذکر کیا اور کہا یہی مسئلہ ہے جس کے اعلان نے کسرِ صلیب کی خبر پوری کر دی۔ اس پر میں نے کہا کہ اگر ایسا ہے تو میں سمجھتا ہوں آپ سے پہلے بعض مفسرین مثلاً صاحبِ ''اسرار الغیب'' اور اس عہد میں مولوی چراغ علی اور سرسید اس کا بڑے زور شور سے اعلان کر چکے ہیں۔ یہ بات ان پر گراں گذری انہوں نے کہا چراغ علی اور سرسید نے جو کچھ کہا وہ محض مادی رنگ میں تھا اور میں نے اسے روحانی رنگ میں ثابت کیا ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی لیکن میں بحث کا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہتا تھا اور نہ کوئی اس طرح کا جذبہ اپنے اندر رکھتا تھا۔ میرے خیالات اس وقت سرسید کی تقلید پر مبنی تھے اس لئے ان کے مشن سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کے بعد کچھ دیر تک مولوی نورالدین مرحوم اور بعض دیگر وہاں کے اعیان سے ملا۔ واپسی میں نواب محمد علی نے اپنی رتھ بٹالے تک کے لئے دے دی جو کچی سڑک پر بہت آرام دیتی ہے اور واپسی میں مجھے اس پر بہت آرام رہا'' (صفحہ ۲۳۸۔۲۴۱)

مرزا صاحب بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ سے یہ مولانا کی پہلی اور آخری ملاقات تھی مگر مرزا صاحب کی وفات پر مولانا نے اخبار وکیل میں جو تعزیتی شذرہ لکھا وہ اس بات کا گواہ ہے کہ مولانا مرزا صاحب کے علمِ کلام سے کس درجہ متاثر ہوئے تھے اور ۱۹۱۴ء میں حکیم نورالدین کی وفات پر جو شذرہ البلاغ میں لکھا وہ مولانا آزاد کے اسلوب کا نادر نمونہ ہے۔ اس کا عنوان تھا ''الوداع نورالدین''۔ لکھتے ہیں ''مجھے افسوس ہے کہ میں تحریکِ احمدیہ کے کارواں سالار اور حقائق معنوی کے نباضِ حکیم نورالدین کی قلمی تعزیت میں سب سے پیچھے ہوں۔ ایک ایسی شخصیت جو وسعتِ علمی کے ساتھ زہد و تورع کے عملی مظاہر

کا گنجینہ تھی اب ہم میں نہیں ہے۔ معارف دینیہ اور حقائق طیبہ کے ساتھ ایک پر وسعت مطالعہ کے امتزاج نے جو صحفِ آسمانی سے لے کر عام افسانوں پر محیط تھا نورالدین کو ایک ایسی اوجِ نظر پر فائز کر دیا تھا جہاں نوعِ انسانی کے جذبات کا طلسم کا بھید سرِ آشکار ہو جاتا ہے۔ یہی باعث تھا کہ اس کے معانی پرور تکلم کا ایک ہلکا سا تموج کسی مخالف کی فسوں پرور بلند آہنگیوں پر ایک مہرِ سکوت بن جاتا تھا۔ اس کی تمام آب وگل جوشِ دینی اور اور وسعتِ علمی کا ایک پرندرت مجموعہ تھی اور اس کی جہاں پیما تارِ نظر ایک پر جذب کمندِ حکمت تھی۔ اس کے حکیمانہ تجسس نے کمالِ تورع کے ساتھ مل کر لطائف سپہری کی آغوش اس کے لئے کھول دی تھی اور حکمت ازل کی کارسازیوں پر اس کا اعتماد سطحِ علمیت پر فائز ہو گیا تھا۔ اس کی آخری زندگی کا بیشتر حصہ تحریک احمدیہ کے ساتھ وابستہ رہا ہے اور اس کے لیل ونہار اسی جہدِ دینی کے پر مشقت مظاہر میں وقف ہوئے ہیں' بہ شبہ جس پر خلوص ایثار اور شیفتہ پیوستگی کے ساتھ اس نے اپنے ہادی کا ساتھ دیا اس کی نظیر قدمائے اسلام کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتی۔ مسیحائے گردوں نشیں سے شائبہء مرگ کی وابستگی اور مہدی وعیسی کے خصائص کا ایک ذات میں اجتماع ہندی اربابِ اسلام کے لئے آشوبِ شوریدگی اور اجتماع کا ایک تلخ پیام دیا تھا اور جس پر خروش شدت کے ساتھ اہلِ اسلام کی جانب سے اس پر غرابت نکتہ آفرینی کا تخالف ہوا وہ ایک آتش آفریں ادائے رعد کی طرح تھا لیکن نورالدین کا پیمانِ عقیدت ہجومِ مخالفت کی طوفان انگیزیوں کے باوجود بہ پیوستگی استوار تھا۔ اور وہ ایک کوہِ گراں کی طرح برق جہندہ اور ابر فروشندہ (کڑکتی بجلیوں اور گرجتے بادلوں) کے سامنے یکساں پائے ثبات پر قائم تھا۔ اس کی پر خلوص استقامت سے بعید تھا کہ وہ پایانِ عمر تک اس سنگِ آستاں سے جدا ہو جہاں اس کی پر محنت کاوشوں کو بالینِ آسائش ملی تھی۔ اگرچہ میں اپنے ادراک کو تحریک احمدیہ کی بعض نکتہ آفرینیوں کا ہم وفاق نہیں دیکھتا لیکن اس پر گداز سوزش روحانی پر محوِ حیرت ہوں جس کے پرتپش غلغلے میرے متحجر جذبات کو گریہء محبت سے آشنا کر گئے ہیں۔ نورالدین کی ذاتِ گرامی ہماری مادی نگاہوں سے مستور ہے لیکن مساحتِ گیتی پر اس کے نقشِ پا بدستور ثبت ہیں اور منزلِ استقامت کی جانب ہماری رہبری کر رہے ہیں۔ لطفِ ازل اس کی خاک پر عنبر بار ہو۔" (رسالہ البلاغ جولائی ۱۹۱۴۔ جلد ا نمبر ۲)

◎

اپنا گریباں چاک

جسٹس ریٹائرڈ ڈاکٹر جاوید اقبال کی خودنوشت "اپنا گریباں چاک" جنوری ۲۰۰۳ میں سنگ میل والوں نے لاہور سے چھاپی ہے گویا یہ ۲۰۰۳ء کی پہلی خودنوشت ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال فرزندِ اقبال ہونے کے ناتے سے ہر ایک کے جانے پہچانے ہیں اس لئے انہوں نے اپنی خودنوشت کے عنوان کے لئے اپنے والد مرحوم کے ایک شعر کا ایک حصہ چنا ہے۔ فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا، یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک۔ اسی طرح ہر باب کا آغاز اقبال کے اشعار سے کرتے ہیں اگرچہ اس باب کے مندرجات کے ساتھ ان شعروں کی معنوی مطابقت کم ہی سمجھ میں آتی ہے۔

جاوید اقبال کا ذکر کرتے ہوئے ان کے والد کا ذکر کیا جائے تو وہ چڑتے ہیں کیوں کہ مجید نظامی کے قول کے مطابق "انہیں علامہ اقبال کے گھر پیدا ہونے پر بڑا غصہ ہے نیز وہ علامہ اقبال سے آگے نکل جانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں" (صفحہ ۲۶۶) مگر قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ انہیں جو کچھ بھی ملا وہ اسی "حادثہء پدری" کی وجہ سے ملا ہے۔ جہاں کہیں ان کا تعارف کروانے کا موقعہ پیش آیا انہیں فرزندِ اقبال کہہ کر ہی متعارف کروایا گیا۔ ڈاکٹر ہنری کسنجر سے، ڈاکٹر سوئیکارنو سے، سابق صدر نکسن سے، بلکہ ہنری کسنجر تو ایسے بوجھ بجھکڑ ثابت ہوئے کہ انہیں علامہ اقبال ہی سمجھ لیا۔ (صفحہ ۱۷۸)۔

جج صاحب کو شکوہ ہے کہ "مجھے علامہ اقبال کے حوالہ سے "میوزیم پیس" کی طرح پاکستان کے اکثر حکمران بیرونی مہمان شخصیات سے متعارف کرواتے رہے" (صفحہ ۱۹۳) مگر جج صاحب نے اس باب میں انصاف سے کام لیتے ہوئے کوئی ایسی بات بیان نہیں کی جس سے ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کا اظہار ہوتا ہو۔ سکول میں فیل ہو ہو کر تعلیمی منزلیں طے کرنا، ایم اے میں بھی فیل ہو جانا، بار کے امتحان میں بھی دوسری کوشش پر کامیاب ہونا۔ یہ سب باتیں ان کی اوسط درجہ کی ذہانت کی آئینہ دار ہیں۔ تس پر انہیں جو بلند مراتب ملے وہ ان کی ذہانت کا نہیں ان کی وراثت کا عطیہ ہی تو ہیں۔ اس لئے خدا معلوم جج صاحب اس پہلو پر انصاف کی نظر کیوں نہیں ڈالتے؟ کیا یہ بھی جسٹس کرم الہیٰ چوہان کی

بتائی ہوئی ''ٹرکس آف ٹریڈ'' میں سے کوئی بات ہے؟ (صفحہ ۱۶۲) کہ باپ کی بڑائی کے صدقہ میں ملی ہوئی عزت پر خدا کا شکر ادانہ کیا جائے بلکہ اس پر چڑا جائے۔ دوسری طرف ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کو یہ شکوہ بھی ہے اور انہوں نے اس کا اظہار دیباچہ میں کر بھی دیا ہے کہ ''ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو مجھے پہچانتے ہی نہیں یعنی انہیں معلوم ہی نہیں کہ میں کون ہوں۔ مجھے ان پر غصہ آتا ہے اور اس غصہ کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہ لوگ خواہ انگلش میڈیم سکولوں کے تعلیم یافتہ ہوں، خواہ علاقائی یا نسلی تعصب کا شکار ہوں، خواہ حالات کو بدستور رکھنے والے پیشہ ور سیاستدان ہوں، خواہ سطحی تعلیم سے آراستہ فوجی افسران ہوں سب بانیان پاکستان کو فراموش کر چکے ہیں'' (صفحہ ۹)۔ قاری حیران ہے کہ جاؤں کدھر کو میں؟ اگر لوگ انہیں پہچانیں تو وہ ناراض ہوتے ہیں نہ پہچانیں تو لوگ بانیان پاکستان کو فراموش کر بیٹھنے کے ملزم قرار پاتے ہیں۔ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ گستاخی معاف کیا ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال بانیانِ پاکستان میں سے ہیں؟ تھے تو آبا ہی تمہارے وہ مگر تم کیا ہو؟۔ (اور اس بات کے وافر ثبوت موجود ہیں کہ اقبال خود بھی بانیان پاکستان میں سے نہیں تھے اور نہ انہیں اس قسم کا کوئی دعویٰ تھا)۔ ہماری اردو کی خودنوشت سوانح عمریوں میں ایک اور شخص کا ذکر انتظار حسین نے کیا ہے جو اپنے باپ کے نام سے بدکتا تھا۔ وہ سر شیخ عبدالقادر کے صاحبزادے ریاض قادر تھے۔

یہ خودنوشت ایک ایسے شخص کی داستانِ حیات ہے جسے کمسنی میں ایک بڑے باپ کے سایہء عاطفت سے محروم ہو جانے کے باوجود باپ کے ایسے رفقاء کی سرپرستی حاصل رہی جنہوں نے انہیں ''درِ یتیم'' جان کر دل و جان سے ان کی پرورش اپنے دوست کی یادگار اور امانت سمجھ کر کی اور اس کی ''بے راہ رویوں'' (خود ڈاکٹر صاحب نے اپنے جوانی کے مشاغل کے لئے بے راہروی کا لفظ استعمال کیا ہے) کے باوجود اس کا ساتھ نہیں چھوڑ دیا۔ والد کے احباب کے باب میں جاوید اقبال نے اپنے والد کے بہت سے دوستوں اور اپنے سرپرستوں کا ذکر تو بہت کیا ہے مگر عبدالمجید سالک کا نام بالالتزام کہیں نہیں لکھا اور یہ بات پڑھنے والوں کو بہت کھٹکتی ہے کیونکہ واقفانِ راز جانتے ہیں کہ سالک صاحب کا ان کے والد گرامی سے کیسا اور کتنا تعلق تھا اور سالک صاحب ان کے سرپرستوں میں سے ایک تھے۔ اسی طرح اپنے تایا شیخ عطا محمد کی جو تصویر آپ نے کھینچی ہے وہ ایک نامہربان شخص کی تصویر بنتی ہے کہ ''وہ غصیلے مزاج کے تھے اور ان کے ہاتھ میں چابک رہتا تھا'' (صفحہ ۱۶) جاوید اقبال صاحب

نے ان کو ولی نہ بنائے جانے کی وجہ بھی ان کے غصہ کو قرار دیا ہے جو حقیقت سے بعید بات ہے۔ انہی شیخ عطا محمد کے صاحبزادے شیخ اعجاز احمد (صاحبِ مظلوم اقبال) ان کے ولیوں میں شامل تھے۔ دونوں باپ بیٹا مخلص احمدی تھے مگر جاوید اقبال صاحب یہ کہنے سے نہیں چوکے کہ اقبال کو شیخ اعجاز احمد کا احمدی ہونا اچھا نہیں لگا تھا حالانکہ جس زمانہ کا ذکر وہ کر رہے ہیں وہ ان کی طفولیت کا زمانہ ہے۔ لاہور کے محقق، شیخ عبدالماجد صاحب ان کی زندہ رود کے حوالہ سے اس مسئلہ پر بہت تفصیل سے روشنی ڈال چکے ہیں۔ اور ڈاکٹر جاوید اقبال سے ان کا کوئی جواب بن نہیں پڑا تھا۔

باپ کا سایہ سر سے اٹھتے ہی نوجوان جاوید اقبال پر ہر طرف سے الطاف و عنایات کی بارش ہوئی تو انہیں بے راہ روی اور ''عیش و عشرت'' (صفحہ ۵۰) کی سوجھی۔ بازارِ حسن کے پھیرے بھی ہونے لگے (صفحہ ۶۵) ''رقص'' میں دلچسپی (صفحہ ۸۲) انتہا کو پہنچی۔ موٹروں سے ان کا عشق تو ایک خارجی اظہار بنا جو کسر رہ گئی وہ اس ''جوانِ رعنا'' نے کیمبرج میں ''پرنس ڈیوڈ'' (صفحہ ۸۴) بن کر پوری کر دی اور اس کا بیان بڑے مزے لے لے کر اپنی خودنوشت میں کیا اور قاری سے پوچھا ہے کہ کیمبرج میں عیش و عشرت کی ''تین'' ''مہمات'' میں سے دو مہمات تو میں نے سر کر لیں'' بھلا کون سی؟'' (صفحہ ۷۲)۔ جب جاوید اقبال صاحب کو محسوس ہوا کہ ان کے حسنِ بیان سے شاید قاری کو ان کی مہمات کیمبرج کا پورا اندازہ نہ ہو سکے انہوں نے اس دور کی تصویریں شامل کر دیں۔ اقبال نے ان کے بارہ میں خوب کہا تھا کہ ''تمہاری طبیعت میں امارت کی بو ہے'' (صفحہ ۳۷)۔ کیمبرج میں ان کا داخلہ پروفیسر قاضی محمد اسلم نے پروفیسر آربری سے سفارش کر کے کروایا تھا۔ وہاں ڈاکٹر سلام جیسا نابغہ روزگار وجود اور داؤد رہبر جیسا سکالر بھی تھا مگر ان کے اپنے قول کے مطابق ''یہ میرے ڈھب کے لوگ نہ تھے'' (صفحہ ۸۰) بہر حال سات سال میں آپ کیمبرج سے پی ایچ ڈی اور لندن سے بار کی ڈگری لے کر مراجعت فرما ہوئے اور خواجہ عبدالرحیم کے ساتھ قانونی پریکٹس شروع کی۔

''آگاہی کے تکبر'' (صفحہ ۵۸) سے اتنی دور چلے گئے کہ ایک دفعہ اس کی وجہ سے فیل ہو جانے کے بعد ''آگاہی'' ہی کو قریب نہیں پھٹکنے دیا۔ ان کا سارا علمی سفر اس بات کا گواہ ہے کہ انہیں تعلیمی سے زیادہ زائد از تعلیمی سرگرمیوں سے شغف رہا اور آپ فارغ نہیں بیٹھے۔

ان کی پبلک زندگی کا آغاز بھی اوپر سے ہوا۔ سکندر مرزا نے انہیں کہا ''تمہیں میں ملک کی خاطر استعمال کرنا چاہتا ہوں'' (صفحہ ۹۳) مگر انہیں ملک سے باہر انقرہ جانا پسند نہ ہوا۔ سکندر مرزا نے ان سے یہ وعدہ بھی لینا چاہا کہ آپ اگلے انتخاب میں حصہ لیں گے وہ بھی انہیں منظور نہ ہوا۔ اس لئے جسٹس شریف کے ساتھ لاحاصل اسلامی دستوری کمیشن میں شامل کردئے گئے۔ یہ دستوری کمیشن کاغذ پر ہی رہا کہ اس کے بعد آئین ہی منسوخ ہو گیا۔ سکندر مرزا خود بھی نہ رہے۔ یہاں ان کی ملاقات شہاب صاحب سے ہوئی۔ شہاب صاحب کی روحانیت انہیں عجیب وغریب لگی انہوں نے ان سے بیان کیا کہ ''انہوں نے ایک خاتون کا ذکر کیا جو مرکزی سکرٹریٹ کے کسی سپرنٹنڈنٹ کی بیوی تھی۔ اس کے ہاں سکندر مرزا بھی خفیہ طور پر جایا کرتے تھے۔ جب مارشل لا لگا تو سکندر مرزا کا مستقبل معلوم کرنے کے لئے وہ اس خاتون کے پاس گئے اور ان سے سوال کیا سکندر مرزا کا کیا بنے گا؟ وہ خاتون بے ہوشی کے عالم میں چلی گئیں اور ان کی آنکھوں کے سامنے آنے والے واقعات ایک فلم کی طرح چلنے لگے وہ بولتی گئیں'' جیپ میں چند فوجی افسر بیٹھے ایوان صدر میں داخل ہوئے (وقفہ) ان میں ایک جرنیل ہے جس کے ماتھے پر سرخ رنگ کی لاٹ ہے (وقفہ) وہ ہال کے اندر کھڑا ہے (وقفہ) ایک معتبر شخص ڈریسنگ گاؤن پہنے سیڑھیوں سے اتر رہا ہے (وقفہ) اس کی جیب میں پستول ہے (وقفہ) وہ آدمی اور ایک خاتون فوجی گاڑی میں سوار ہو کر رخصت ہو گئے۔ شہاب نے ساری کہانی ایسے مؤثر انداز میں بیان کی کہ میری نگاہوں کے سامنے بھی فلم چل گئی'' (صفحہ ۹۵)۔ حیرت ہے شہاب صاحب نے اپنی زندگی کے مافوق الفطری واقعات کو بڑی تفصیل سے شہاب نامہ میں جگہ دی ہے مگر اس بات کا ذکر گول کر گئے ہیں؟ شاید اس لئے گول کر گئے ہوں کہ وہ اس واقعہ کو بعد میں ظاہر کرنے کے لئے کسی معمول کی تلاش میں ہوں! جاوید اقبال کی ذات میں انہیں وہ معمول مل گیا ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

جاوید اقبال صاحب کی پبلک زندگی بھی بھٹو صاحب کی طرح ایوانِ صدر کی راہداریوں سے شروع ہوئی۔ بھٹو صاحب کے بارہ میں انہوں نے لکھ دیا کہ '' سکندر مرزا اور بیگم ناہید یو این تشریف لائے۔ میں نے انہیں وفد لاؤنج میں دیکھا اور ان کا استقبال کیا۔ دونوں کی کافی کی پیالیوں سے تواضع کی۔ تھوڑی دیر بعد بھٹو وہاں سے گذرے مگر آنکھیں چرا کر دوسری طرف نکل گئے'' (صفحہ ۱۰۵)۔ مگر یہ بیان نہیں کیا کہ بعد کو جب ان کی ملاقات سکندر مرزا یا بیگم ناہید سے ہوئی تو ان کا رویہ کیا تھا؟ صدر

ایوب کے ان پر پیہم احسانات ہوئے کیا یہ ان کی معزولی کے بعد ان سے ملنے گئے؟ یا کبھی ان کے بارہ میں کوئی کلمہء خیر ارشاد فرمایا؟ ہمارے ہاں احسان ناشناسی لوگوں کی رگ وپے میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ اس خودنوشت میں صدر ایوب کے بارہ میں ان کا کوئی ایسا فقرہ میری نگاہ سے نہیں گذرا جس سے ان کی ممنونیت کا اظہار ہوتا ہو۔ یحییٰ خاں نے انہیں ججی کے منصب پر فائز کردیا۔ بھٹو نے انہیں مستقل بنایا پھر ان کے لئے اوپر جانے کے راستے کشادہ ہوتے گئے۔ سپریم کورٹ تک پہنچ کر ریٹائر ہوئے۔ سینیٹ میں چنے گئے۔ شریعت بل کی حمایت کرتے رہے اگرچہ اپنا کوئی ترمیمی مسودہ بھی پیش کیا مگر نواز شریف نے اسے مسترد کردیا مگر ان کا ووٹ ''مجبوری'' کے طور پر پرانے شریعت بل کے حق ہی میں ڈالا گیا۔ وہ تو اللہ نے بچالیا ورنہ وہ طالبان کی طرز کی شریعت ہمارے ہاں بھی نافذ ہوتی اور جسٹس جاوید اقبال ''اسلام کو طوائف کے طور پر استعمال کرنے والوں'' (صفحہ ۲۰۷) کی حمایت میں مجبوراً تقریریں کررہے ہوتے۔

جولوگ نواب کالا باغ یا صدر ایوب کے ذریعہ کابینہ تک پہنچے ان کے لئے جج صاحب نے صدر ایوب کے منہ سے بڑے سخت الفاظ نکلوائے ہیں۔ ان کے دوست اور سینئر شیخ خورشید ان کے پاس نواب کالا باغ کا پیغام لائے کہ وہ انہیں کابینہ میں لینا چاہتے ہیں۔ جاوید اقبال نے صدر ایوب سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ ''ہم تو راسکلز (بدمعاشوں) کی تلاش میں رہتے ہیں لیکن آپ تو ماشاءاللہ اپ رائٹ آدمی ہیں۔ نواب کالا باغ نے آپ کے بارہ میں ایسا کیوں سوچا؟'' (صفحہ ۱۲۵)۔ آپ نے اپنے لئے اپ رائٹ کا سرٹیفکیٹ لینے کے لئے اپنے کئی دوستوں کو راسکلز کہلوادیا۔ این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔

با ایں ہمہ اس خودنوشت میں رجال کے حصہ میں بعض چونکا دینے والی باتیں بھی ہیں۔ ''جسٹس مشتاق حسین دشمن کا قبر تک پیچھا کرنے والے تھے'' (صفحہ ۱۴۶)۔ جسٹس ظلہ شیزوفرینیا کا شکار تھے (صفحہ ۱۵۱) جسٹس کیکاؤس ''۱۹۷۳ کے آئین کو کفریات پر مبنی سمجھتے تھے'' (صفحہ ۱۵۱)۔ جسٹس یعقوب علی خان'' قابلِ اعتماد چیف جسٹس آف پاکستان تھے اور حکومت ان سے جو چاہے فیصلے کرواسکتی تھی'' (صفحہ ۱۵۲)۔ ہائی کورٹ میں ججوں کے دو واضح گروپ تھے۔ یحییٰ بختیار نے چیف جسٹس سردار اقبال سے کسی کو جج بنانے کی سفارش کی تو جسٹس سردار اقبال نے صاف کہہ دیا کہ ''ابھی وہ وقت نہیں آیا

کہ ''دلے'' ہائی کورٹ کے جج مقرر کردیئے جائیں'' (صفحہ ۱۵۲)۔ بھٹو صاحب کی جانب سے جسٹس مولوی مشتاق حسین کے چیف جسٹس نہ بنائے جانیکی بات لکھ کر جج صاحب نے ریمارک ''پاس'' کیا ہے ''لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آسمانوں میں بھٹو کی اپنی تقدیر کا فیصلہ کرنے کے لئے تانا بانا بنا جارہا تھا اور ہم سب بے بس تھے'' (صفحہ ۱۵۴)۔

جاوید اقبال کو یو این میں پاکستانی وفد کی رکنیت بھی اس زمانہ میں حاصل رہی جب سرظفر اللہ خان پاکستان کے مستقل نمائندے تھے۔ جہاں ان کے بارہ میں یہ لکھا ہے کہ ''سفیر اور دیگر حضرات کام کے بعد شراب وشباب کے کھیل میں مصروف ہوجاتے سرظفر اللہ خان واحد شخصیت تھے جوایسی محفلوں میں نظر نہ آتے بلکہ یو این کے میڈی ٹیشن روم کو اپنی عبادت کے لئے استعمال کرتے شاید اس عبادت کے کمرہ کو ان کے سوا کوئی استعمال نہ کرتا تھا'' (صفحہ ۱۰۵) وہاں ایک خود ساختہ شوشہ بھی چھوڑا ہے کہ ''ان کی تیسری اور غالباً آخری بیوی انہیں ملنے کے لئے نیویارک آئی ہوئی تھیں۔ سرظفر اللہ خان نے ان کے ساتھ معاہدہ کے مطابق انہیں طلاق دے کر آزاد کردیا۔ انہوں نے اپنی نجی زندگی کے اس پہلو کے متعلق نہایت افسردگی کے ساتھ خود ہی مجھے بتایا'' جب میں پاکستان کا وزیر خارجہ تھا تو بیروت (لبنان) جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ہمارے سفارت خانہ کا ایک کوریئر (چپڑاسی) فلسطینی تھا۔ اس نے ایک روز جرأت کرکے مجھے کہا کہ اسرائیل بننے سے پیشتر اس کا خاندان آسودہ حال تھا مگر اب اس کی بہن اعلیٰ تعلیم کی خاطر آکسفورڈ میں داخلہ لینا چاہتی ہے مگر ان کے لئے ایسا ممکن نہیں۔ کیا آپ ان کے ساتھ شادی کرکے ان کی خواہش پوری کرسکتے ہیں؟ میں نے ان سے اس بارے میں سوچنے کی مہلت مانگی۔ سال بھر بعد میں پھر بیروت گیا تو کوریئر نے پوچھا کہ آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ بہر حال دو ایک سال پس وپیش کرنے کے بعد میں نے اس لڑکی سے شادی کرلی اور ہم میں طے پایا کہ میں اسکے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم نہ کروں گا بلکہ صرف آکسفورڈ میں اس کی خواہش کے مطابق اس کی تعلیم کے اخراجات پورے کردوں گا اور پھر جب اس کی تعلیم مکمل ہوجائے گی تو اسے طلاق دے کر آزاد کردوں گا تاکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق اپنے مستقبل کی زندگی کا فیصلہ کرلے۔ سو آج ہمارا معاہدہ ختم ہوگیا اور میں مطمئن ہوں کہ میں نے اسے بخوشی رخصت کردیا ہے'' (صفحہ ۱۲۴)

اس بات پر میرا پہلا ردعمل تو یہ ہے کہ سرِ ازل کہ عارف وسالک بہ کس نہ گفت۔ در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید؟ ۔ سرظفر اللہ خان نے اپنی زندگی کا وہ راز جو انہوں نے اپنے عزیزوں دوستوں سے چھپا چھپا کر رکھا وہ جاوید اقبال صاحب سے کیسے کہہ دیا جو ان کے خوردوں میں سے ہیں اور ان کے قریب ترین لوگوں میں سے نہیں۔ اگر سرظفر اللہ کو یہ راز کسی کو بتانا ہی تھا تو جج صاحب کے گارڈین شیخ اعجاز احمد صاحب سے کہتے جو ان کے قریبی دوستوں میں سے تھے اور جنہیں انہوں نے اپنے ٹرسٹ کا رکن بنایا ہوا تھا۔ یہ بات کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ سرظفر اللہ خان نے تیسری شادی دمشق میں کی اور وہاں کے ایک مخلص احمدی خاندان کی ایک لڑکی بشریٰ ربانی سے نکاح کیا۔ کچھ عرصہ تک دونوں خوش و خرم رہے مگر پھر جب محسوس ہوا کہ دونوں میں نباہ ممکن نہیں تو سرظفر اللہ نے انہیں ارشادِ الٰہی کی تعمیل میں پوری عزت اور احترام یعنی سراحاً جمیلا سے طلاق دے دی۔ ربوہ میں تعمیر کردہ ظفر منزل انہی بشریٰ ربانی کے لئے تعمیر کی گئی تھی اور ہم نے دونوں میاں بیوی کو ربوہ میں گھڑ سواری کرتے دیکھا ہوا ہے ۔جاوید اقبال صاحب نے جو ڈرامائی روداد بیان کی ہے اس کی حقیقت ان کی ڈرامہ نگاری کی پرانی عادت کے سوا اور کچھ نہیں۔ اگر سرظفر اللہ کسی فلسطینی مستحق لڑکی کو آکسفورڈ میں پڑھائی کے لئے وظیفہ دینا چاہتے تو ان کے لئے کوئی مشکل بات نہ تھی کہ ان کی آمدنی کا معتدبہ حصہ ایسے ہی کارِ خیر میں صرف ہوتا تھا اور اب تک ان کی موت کے بعد بھی صرف ہورہا ہے۔ وظیفہ دینے کے لئے نکاح کرنے کا ڈرامہ کرنے کی انہیں ضرورت نہ تھی وہ بڑے سچے اور کھرے آدمی تھے۔ ان کے قول وفعل میں یکسانیت تھی اور ان کے قولِ سدید کا ایک عالم گواہ ہے۔ پاک بھارت جنگ کے زمانہ میں کسی نے بے پرکی اڑانے کو ''درفنطنی'' کے نام سے موسوم کیا تھا۔ یہ بات جسٹس جاوید اقبال صاحب کی درفنطنی ہے۔

جج صاحب نے ناروے میں سردار عبدالقیوم خان صاحب کے قول کو ''جھوٹ'' ثابت کیا ہے اور ساتھ میں کہا ہے کہ ''پاکستان میں جھوٹ بولنا خصوصی قسم کے سیاست دانوں کا شیوہ ہے اور وہ جھوٹ بول کر بغیر ڈکار مارے اسے ہضم بھی کرسکتے ہیں'' (صفحہ ۲۰۱)۔ مزید برآں ان کی دوستی شہاب صاحب کے ساتھ تھی دوست کی طرح آپ نے بھی سوچا ہوگا کہ اپنی خودنوشت میں ایک آدھ بے پرکی بھی اڑا دیں تو کیا حرج ہے شہاب صاحب نے تو بہت اڑائی ہیں۔

باایں ہمہ انہیں اس بات پر داد ضرور دینی چاہئے کہ ایک آدھ مقام پر انہوں نے سچ بھی بولا ہے۔ جنیوا میں اپنی حکومت کے احمدیوں کے انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے قوانین کی حمایت کرنے گئے ہیں تو صاف کہہ دیا کہ ''بین الاقوامی برادری نے میرے دلائل مسترد کر دیئے اور اس مسئلہ پر جو قراردادیں پاس ہوئیں وہ سب پاکستان کے خلاف تھیں'' (صفحہ ۱۹۲)۔ سیلاب کی تحقیقات کی تو کہہ دیا کہ ''سب سے زیادہ غلط بیانی جمعیت علمائے اسلام نے کی اور مردوں کے نام پر امداد حاصل کی'' (صفحہ ۱۴۹) چلئے اس بات کا اندازہ بھی ہوگیا کہ جج صاحب سچ بولنا چاہیں تو سچ بول بھی سکتے ہیں۔

جج صاحب جیسے باخبر آدمی سے واقعاتی غلطیاں تو بہر حال نہیں ہونا چاہئے تھیں مگر ہوئیں۔ اگر تلا سازش کے لوگ بھی یحییٰ کے زمانہ میں نہیں ایوب خان کے زمانہ میں رہا ہوئے تھے (صفحہ ۱۳۹)۔ بھٹو صاحب نے مسلمانان پاکستان کے سامنے ہیرو بننے کے لئے الیکشن سے قبل ہی احمدیوں کو نا مسلم قرار دیا تھا الیکشن کے بعد کی مہم کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا، (صفحہ ۱۶۲)۔ اگر وہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو کسی دوسرے سے پوچھ لیتے تو کتاب کی علمی حیثیت پر کوئی اعتراض وارد نہ ہوتا اگر چہ اقبال کے نظریات کے بارہ میں ان کے بعض فرمودات محلِ نظر رہیں گے۔

جسٹس نسیم حسن شاہ صاحب نے ضیاء الحق کے پی سی او کے تحت حلف لینے کو محض اس لئے جائز جانا کہ ابھی ان کی سروس کے بہت سے سال باقی تھے۔ جسٹس جاوید اقبال صاحب نے اسکو فقہی مسئلہ بنا دیا اور اس کی توجیہہ یوں کی ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہ کے نزدیک اگر اہل لوگ منصب پر فائز نہیں ہوں گے تو نا اہل لوگ مناصب پر فائز ہو جائیں گے اس لئے ''جن جج صاحبان نے اصولاً حلف نہ اٹھایا وہ بھی اپنی جگہ درست تھے اور جنہوں نے آمر کے حکم پر حلف اٹھا لیا وہ بھی غلط نہ تھے'' (صفحہ ۲۱۶)۔

جنابِ شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی!

اور اب آخری بات! جسٹس جاوید اقبال نے اپنی خودنوشت کے سرِ ورق پر اپنی جو گریباں چاک تصویر شائع کی ہے اس میں ان کا دامن سوئے اتفاق سے سامنے سے پھٹا ہوا ہے۔ وَكَانَ قَمِيصُه قُدَّ مِن قُبُلٍ!

دردر ٹھوکر کھائے

ڈاکٹر مبارک علی کی خودنوشت ''دردر ٹھوکر کھائے'' فکشن ہاؤس لاہور والوں نے ۱۹۹۶ء میں چھاپی۔ اس خودنوشت کا مزاج ڈاکٹر مبارک علی کے مزاج کی طرح بے اطمینانی کا مزاج ہے۔ ہجرت کرتے اور جگہ بجگہ پھرتے رہنا۔ او بہ صحرا رفت من در کوچہ ہا رسوا شدم کا مزاج۔ آغاز بھی ان کی ہجرت کے بیان سے ہوا ہے ٹونک سے پاکستان آنے، اور پھر کس مپرسی کے عالم میں در بدر پھرنے، غربت و افلاس کے جلو میں تعلیم حاصل کرنے اور ادنیٰ نوکری کی مشقتیں جھیلنے کے باوجود ان کے اندر کی عزیمت نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ یہ خودنوشت ایک صاحب عزم فرد کی سرگزشت ہے اور یہی ان کی شخصیت کا پس منظر بنتا ہے مگر جو شخص ایسے حالات سے دوچار رہے اس کے قلب کی بے اطمینانی سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی کے ساتھ ہونے والی بے انصافیاں ہمارے ہاں انہونی باتوں میں شمار نہیں ہوتیں ہر صاحبِ صلاحیت ان سے دوچار ہوتا ہے کہیں مذہبی تعصب کی بنا پر کہیں علاقائی عصبیت کی بنیاد پر کہیں صاحبِ اقتدار لوگوں کے احساس کمتری کے نتیجہ میں۔ ہمارے ہاں صاحبِ صلاحیت افراد کے ملک چھوڑ جانے پر بہت واویلا کیا جاتا ہے مگر ان اسباب کا تدارک کرنے کی کسی کو نہیں سوجھتی۔ یہ ناانصافیاں روزمرہ کا حصہ بنی ہوئی ہیں جن کی وجہ سے ذہین افراد کو ناقدری کا احساس ہوتا ہے۔ اور یہ ناقدری تو ہماری روایت ہے۔ اس کو ناقدریء عالم کا صلہ کہتے ہیں۔ مر گئے ہم تو زمانے نے بہت یاد کیا۔ جیتے جی کسی کی قدر کرنا ہماری گھٹی ہی میں نہیں اور اب تو مرنے کے بعد بھی ناقدری کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے ہر نئی قوت مقتدرہ اپنی نئی تاریخ بنانے کی سعی لاحاصل کرتی ہے۔ یہ سلسلہ کب تک چلے گا کچھ کہنا مشکل ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی کی خودنوشت ایک غیر مطمئن، مؤرخ کی خودنوشت ہے جسے انصاف ملا نہ چین۔ اسی لئے انہوں نے اس کا سر عنوان ہی ''دردر ٹھوکر کھائے'' رکھا ہے۔

اس سرگزشت کا کچھ حصہ تو انگلستان اور جرمنی کے اسفار کے حالات پر مشتمل ہے جہاں وہ

تعلیم حاصل کرنے گئے اور محنت مزدوری کر کے تعلیم حاصل کرتے رہے۔ یہ ان کی حب الوطنی تھی کہ وہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد واپس آئے اور پھر پڑھے لکھے ان پڑھوں کے طعن وتعریض اور تعصب کا شکار ہوتے رہے۔ اہلِ علم کی ناقدری کا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور خوشامدیوں کو ترقی کے زینے طے کرتے دیکھتے اور کڑھتے رہے۔ یہ بھی ان کی آنکھوں دیکھی بات ہے کہ وہ لوگ یونیورسٹیوں میں علمی مناصب پر فائز ہو گئے جنہیں علم سے دور کی نسبت بھی نہیں تھی۔ اس قسم کا ایک نظارہ تو ہم نے بھی دیکھا (آخر ہم بھی تو ان کے ہمعصر اور ہم عمر ہیں) کہ ایک انڈر گریجوایٹ یونیورسٹی کا چانسلر بن گیا اور لوگوں کی اعلیٰ علمی اسناد پر اس شخص کی مہرِ توثیق ثبت ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی کی خودنوشت کی زبان سیدھی سادہ زبان ہے کوئی ادبی چاشنی بھی اس میں نہیں پڑھنے میں رواں ہے مگر کسی بدذوقی یا بے ذوقی کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ اس خودنوشت کا اختتام تنہائی اور افسردگی پر ہوتا ہے۔ اگر وہ مجھے پوچھتے کہ اس خودنوشت کا کیا عنوان ہو تو میں انہیں ''تیز ہوا اور تنہا پھول'' کا عنوان تجویز کرتا مگر یہ تو ایک شعری مجموعہ کا عنوان ہے اور باسی ہو چکا ہے۔ مبارک علی جیسا تازہ ذہن رکھنے والا مورخ اسے کیوں قبول کرتا؟

اس خودنوشت میں ایک سبق بھی ہے۔ وہی قرآن کا بیان کردہ سبق کہ **اِنَّ اللّٰہَ لا یُغَیِّرُ ما بِقومٍ حتّیٰ یُغَیِّرُ ما بانفُسِہِم** ۔ یقیناً خدا کسی قوم کی حالت کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنے مزاج کو تبدیل نہ کرے۔

◎

غبارِ زندگی

حسن نواز گردیزی کی آپ بیتی ''غبارِ زندگی'' بھی ایک ماہر تعلیم کی خودنوشت ہے۔ ان کا تعلق ملتان کے ایک پرانے گھرانے سے ہے اس لئے انہیں کسی مہاجرت اور کس مپرسی کا شکار نہیں ہونا پڑا۔ سیدھے سبھاؤ تعلیم حاصل کرتے چلے گئے۔ راوی میں لکھتے رہے اس کے ایڈیٹر بھی رہے مگر حیرت ہے کہ گردیزی صاحب نے اپنے زمانے کے ترقی پسند شعرا کا نام تو لیا ہے کہیں کہیں فیض اور قاسمی کا حوالہ بھی دیا ہے مگر ان کے اسلوب بیان سے کہیں یہ بات مترشح نہیں ہوتی کہ انہیں ادب سے بھی کوئی لگاؤ رہا ہے۔ ان کی ساری توجہ اپنی محکمانہ آویزشوں پر صرف ہو گئی ہے۔ ان کا خاندان کشادہ دل اور کشادہ ذہن خاندان ہے کیونکہ اس نے تین غیر ملکی بہوؤں کو فراخدلی سے خوش آمدید کہا ہے اور ملتان جیسے قدامت پسند شہر میں ایسے گردیزیوں کا ہونا واقعی بڑی قابلِ قدر بات ہے۔ حسن نواز گردیزی ملک چھوڑ کر پہلے اپنے سسرال امریکہ میں اور اب شاید کینیڈا میں مقیم ہیں۔ میرے لئے تو اس ساری خودنوشت میں ایک جگہ چونکنے کا موقعہ آیا جہاں انہوں نے خاندانی سہرا نگار کشفی ملتانی کا ذکر کیا ہے۔ کشفی ملتانی محض سہرا نویس نہیں تھے اپنی شہرہء آفاق غزل کی وجہ سے ادب میں زندہ ہیں۔ رند بخشے گئے قیامت میں۔ شیخ کہتا رہا حساب حساب!

◎

آئینۂ ایام

کرنل غلام سرور کی خودنوشت ''آئینۂ ایام'' ایک فوجی سے زیادہ کسی سکول ماسٹر کی خودنوشت لگتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ سکولوں میں گذرا اور وہیں سے یہ پرائیویٹ امتحان پاس کر کر کے کالج اور پھر فوج میں پہنچے۔ یہ بھی ایک صاحبِ حوصلہ شخص کی خودنوشت ہے جس کی ترقی میں اس کی اپنی کوششوں سے زیادہ اس کے والد صاحب کی سعی و کاوش اور دعاؤں کا اثر زیادہ نظر آتا ہے۔ والد محترم نے اپنی ساری پونجی بچے کی تعلیم پر صرف کر دی اور بچے نے بھی ہمت ہارنے کی بجائے نامساعد اور کٹھن حالات میں تعلیم جاری رکھی۔ ایف اے کر کے سکول میں آگئے اور سکول ٹیچر ہونے کے ناتے پرائیویٹ امتحان کا استحقاق انہیں حاصل ہو گیا۔ ان کی زبان میں کوئی ادبی چاشنی نہیں سیدھے سادے واقعات کا بیان ہے جیسے بس اپنا حال لکھ رہے ہوں ہاں کہیں کہیں ان کے اندر کا مولوی اور مصلح ضرور اپنا لیکچر بگھارنے لگتا ہے مگر وہ حصہ قاری چھوڑ بھی دے تو واقعات کے تسلسل میں کوئی رخنہ واقعہ نہیں ہوتا۔ احوال الرجال میں چاہتے تو علی عباس جلالپوری جیسے نابغہ کا رفیق کار ہونے کے تعلق میں کچھ کہہ سکتے تھے مگر علی عباس کی دہریت انہیں راس نہیں آئی یہاں بھی ان کا اندر ان کے باہر پر حاوی ہو گیا۔ اور اندر ایک کٹر متشدد سکول ماسٹر بیٹھا ہوا ہے۔

کرنل صاحب نے کتاب کے شروع میں چند مشاہیر کی آراء درج کی ہیں جو کتاب کو پڑھے بغیر لکھی گئی ہیں۔ محمد علی صدیقی نے انہیں صاحبِ اسلوب سوانح نگار کہا ہے۔ فرمان فتحپوری صاحب نے لکھا ہے ''یہ خودنوشت پرکار لہجہ کی ایسی غزل کا ساز بن جاتی ہے کہ عمر رفتہ کو آواز دینے کو جی چاہتا ہے۔'' استاذی وحید قریشی صاحب نے اسے سختی اور نرمی کا امتزاج قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے ''ان کا یہ دھیما اور کھردرا اسلوب اپنی الگ شان رکھتا ہے''۔ حد تو جمیل جالبی صاحب نے کی کہ مصنف نے ''آئینہ ایام میں اپنی زندگی کو موضوع بنا کر ایک ایسا ناول لکھا ہے جو دلچسپ بھی ہے اور رنگا رنگ بھی۔ اس کی

عبارت ایسی رواں دواں ہے جیسے اونچے پہاڑ کی ڈھلوان سے بہنے والا چشمہ''۔ جالبی صاحب یا تو ناول کے اسلوب سے آشنا نہیں ورنہ اس سادہ سی خودنوشت کو ناول نہ کہتے اور نہ ہی جالبی صاحب نے اونچے پہاڑ کی ڈھلوان سے بہنے والا کوئی چشمہ دیکھا ہے ورنہ اس کی نثر کو رواں دواں نہ کہتے۔ بہر حال اگر کتاب کو پڑھے بغیر محض کچھ حصے دیکھ کر رائے لکھی جائے تو یہی ہوتا ہے جو یہاں ہوا۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔

جست بھر زندگی

اکبر حمیدی کی ''جست بھر زندگی'' رابطہ ہاؤس اسلام آباد والوں نے شائع کی ہے۔ یہ بھی ایک صاحبِ عزم انسان کی سرگزشت ہے جس نے زندگی کا سفر ایک گاؤں سے شروع کیا۔ ادنیٰ میونسپل خدمت کرتے اور اپنی تعلیمی قابلیت بڑھاتے رہے۔ شعر سے انہیں ابتدا سے ہی دلچسپی رہی اس لئے ادبی حلقوں میں پہچانے گئے۔ ترقی کرتے کرتے اسلام آباد کے کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر تک پہنچے اور وہیں سے وظیفہ یاب ہوئے۔ حمیدی صاحب کی یہ خودنوشت بھی قدم بہ قدم ان کے زندگی کے سفر کی روداد ہے مگر انہوں نے اپنی محرومیوں کو آشکارا کرنے کی بجائے انہیں زندگی کا معمول سمجھ کر قبول کیا ہے۔ یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے کسی گوشہ کو اخفا میں رکھنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ ادب کی بہت سی اصناف میں طبع آزمائی کر کے انہوں نے ادبی حلقوں میں اپنی پہچان بنائی ہے اور انہیں اس پہچان پر فخر ہے۔

احوال الرجال میں انہوں نے اپنے تاثرات کو اپنے اجمالی خیالات تک محدود رکھا ہے کھل کر بات کہنے سے گریز کیا ہے۔ اس کا ایک سبب شاید یہ بھی ہو کہ پنجاب کے دو بڑے ادبی گروہوں کی آویزش میں اپنے کو غیر جانب دار رکھنا چاہتے ہوں۔ اس میں انہیں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔

متاعِ کارواں

سردار محمد چوہدری کی خودنوشت ''متاعِ کارواں'' بھی ایک داستان عزیمت واستقلال ہے۔ لکھنے والے کی جرات کی داد دینا پڑتی ہے کہ اس نے اپنی غربت کو چھپانے یا اس کی کوئی توجیح پیش کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ تقسیم ملک کے بعد ان کے والد ٹوبہ ٹیک سنگھ میں آ کر بیٹھے اور کچہری میں چپڑاسی کی ملازمت کر کے بچوں کا پیٹ پالنے لگے۔ بچہ ذہین اور محنتی تھا دل لگا کر محنت مزدوری کرتا رہا اور پڑھتا رہا وظیفہ پر وظیفہ لیا۔ حتیٰ کہ ملک کی اعلیٰ پولیس سروس میں لیا گیا اور ایک وقت ایسا آیا کہ پنجاب کا انسپکٹر جنرل پولیس بن گیا۔ سردار محمد چوہدری نے اتنے اعلیٰ عہدے پر پہنچ جانے کے باوجود اپنے باپ کے چپڑاسی ہونے پر کسی ندامت کا اظہار نہیں کیا نہ ہی انہیں اس بات کی وجہ سے کوئی احساس کمتری ہے۔ اتفاق سے انہیں ایک نیک دل افسر کی سرپرستی میسر آ گئی جن سے اس کی ملاقات اسٹیشن پر مزدوری کے سلسلہ میں ہوئی۔ وہ میاں محمد شفیع تھے جو ٹوبہ ٹیک سنگھ میں حاکم بن کر آئے تھے۔ اس مزدور بچہ سے مجسٹریٹ کے گھر کا پتہ پوچھا۔ اس نے بتا دیا باپ کا پوچھا تو کہہ دیا کہ اسی کچہری میں چپڑاسی ہیں۔ بس اس دن سے میاں صاحب ان کے گرویدہ ہو گئے۔ اعلیٰ تعلیم کے دوران لاہور میں ان سے میل ملاقات رہی۔ حتیٰ کہ ان کے محسن کو ایسا صدمہ پیش آیا جس نے انہیں ہلا کر رکھ دیا یعنی ان کی بیٹی جواں عمری میں بیوہ ہو گئی۔ سردار محمد چوہدری نے اس بیوہ لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور بڑی وفاداری کے ساتھ اس کا ساتھ دیا اس طرح اپنے محسن کے غم کو ایک حد تک ہلکا کر دیا۔ یہ خودنوشت ایک دردمند دل کی وفاداری کی داستان بن گئی ہے اور مصنف نے اپنے محسن کی بیٹی اور اپنی بیوی کا جس رومانوی پیار سے ذکر کیا ہے اس نے اس خودنوشت میں عجیب دل آویزی پیدا کر دی ہے۔

سردار محمد چوہدری نے خودنوشت میں اپنی سروس کے واقعات کو جگہ نہیں دی ان کے لئے علیحدہ سے کتاب لکھی ہے۔ خودنوشت میں صرف اپنی زندگی کی تگ وتاز کا ذکر ہے۔ یہ خودنوشت تو ایک ایسے

ہم عصر کی داستانِ حیات ہے جو ہمارے ہی یونیورسٹی کی طالب علمی کے زمانہ کا ہم عصر ہے ہم ایک دوسرے کو جانتے نہیں تھے مگر ایسے دوستوں اور ہمعصروں کا ذکر موجود ہے جو مشترکہ دوست تھے مثلاً ناصر شمسی کا ذکر ہے جو ہمارا بڑا گہرا دوست تھا اور اس دوستی کی قدرِ مشترک یہ تھی کہ ہم لوگ اَیچیسن کالج میں شام کو ٹیوشن پڑھانے اکٹھے جایا کرتے تھے۔ ناصر شمسی ٹیکسیشن سروس میں چنا گیا مگر شومیِ قسمت کہ جلد ہی ایک آمرو غاصب حکمران کے غیظ وغضب کا شکار ہوکر ملازمت سے سبک دوش کر دیا گیا۔ مدتوں بعد اس خودنوشت میں اس دوست کا ذکر پڑھا تو گورنمنٹ کالج سے سائیکل پر آنے والا ساتھی یاد آیا مگر اس کے بعد ملاقات نہ ہوئی۔ ہم عصروں کی خودنوشتوں کو ناقدانہ نظر سے دیکھنا نسبتاً آسان ہوتا ہے کہ آدمی ویسے ہی واقعات کا عینی گواہ ہوتا ہے اس لئے جہاں ہمعصر خودنوشت نگار کہیں راہ سے بھٹکتا ہے تاڑنے والا اس کی بے راہ روی کو بھانپ لیتا ہے۔ سردار محمد چوہدری نے پولیس والا ہونے کے باوجود اپنے اندر کے آدمی کو مرنے نہیں دیا۔ یہ خودنوشت کھرے دل اور کھرے دماغ والے کی خود نوشت ہے جو مختصر ہے۔ جی چاہتا ہے اے کاش لکھنے والا اور بھی لکھتا۔ مگر یہ خدشہ بھی موجود رہتا ہے کہ اگر لکھنے والا اپنی ملازمت کی روداد لکھنے بیٹھ گیا تو اس کا قلم کون پکڑے گا؟ اس لئے اس خودنوشت کا اختصار ہی اس کی خوبی ہے۔

عشرت فانی

عشرت رحمانی صاحب کی خودنوشت ''عشرتِ فانی'' بھی ایک ریڈیو والے کی بے رنگ سر گزشت ہے حالانکہ ان کے پاس وافر مواقع اپنی ادبی صلاحیتوں کے ظاہر کرنے کے موجود تھے مگر ان کی بسیار نویسی ان کے لئے سدراہ بن گئی۔ گھر سے خوش حال تھے اس لئے لکھنے کو محض ایک شغل کے طور پر اختیار کیا مگر وہ خوش حالی عارضی ثابت ہوئی اور جب روزی کمانے دھانے کی ضرورت پیش آئی تو ریڈیو کی ملازمت میں آ گئے۔ کسی ریڈیو والے نے طنزاً انہیں لکھنؤ کے اس بازار کی ''دائی'' لکھا تھا کہ یہ تمام گانے بجانے والیوں کے احوال سے واقف تھے۔ تقسیم کے بعد ڈھاکہ اور پھر لاہور آ گئے۔ لاہور اور پنڈی میں ان کا بڑا کارنامہ ان کا ''نکاحِ ثانی'' ثابت ہوا جو انہوں نے ایک عزیز بے سہارا بیوہ عورت سے کر لیا تا کہ لوگوں کے منہ بند ہو جائیں اور وہ لاہور میں ان عزیزہ کے ہاں ان کے بار بار کے قیام پذیر ہونے پر معترض نہ ہوں۔

عشرت رحمانی صاحب کا نام ریڈیو کی نسبت سے جس طرح مشہور تھا ان کی خودنوشت پڑھنے والوں کو ان سے بہت سی توقعات تھیں مگر عشرت صاحب کے اکتا دینے والے سٹائل نے ان کی خود نوشت میں ادبی رنگ پیدا ہونے دیا نہ قاری کی دلچسپی کا سامان۔ اور یہ خاصی ضخیم خودنوشت بازیچۂ اطفال بن کر رہ گئی۔ ان سے کم از کم اس بات کی توقع ضرور تھی کہ ان کی خودنوشت میں لکھنوی ثقافت کی کچھ تصویر کشی ہو گی مگر نہیں ہے۔ ان سے زیادہ تو لکھنؤ کی ثقافت کا ذکر عبادت بریلوی صاحب کے یہاں ہے۔ عشرت صاحب کی عشرت فانی ہی ثابت ہوئی اور اب ڈھونڈے سے بھی اس کا سراغ نہیں ملتا۔

انوکھا لاڈلا

ڈاکٹر محسن مگھیانہ کی خودنوشت ''انوکھا لاڈلا'' لاہور سے چھپی۔ اس نام سے ٹی وی والوں نے ایک سیریل بھی بنایا تھا خدا معلوم یہ عنوان محسن صاحب نے وہاں سے لیا ہے یا ٹی وی والوں نے حسب عادت بغیر ذکر کئے اپنے سیریل کے لئے یہ عنوان اپنا لیا ہے۔ یہ خودنوشت ایک نوجوان ڈاکٹر کی خود نوشت ہے جو عام نوجوانوں کی طرح ادب میں جلد از جلد اپنا مقام بنا لینے کا خواہش مند ہے۔ اس خود نوشت کی حیثیت بھی کاتا اور لے دوڑی کی ہے۔ یہ عزیز میڈیکل کالج کے طالب علمی کے زمانہ میں یونین کے صدر تھے لوگ باگ ان کی باتوں پر کان دھرتے تھے اس لئے انہوں نے تابڑ توڑ کئی کتابیں تصنیف فرمادیں اور مزاح کے رویہ میں لکھنے کی کوشش کی۔ ہم نے انہیں سمجھایا کہ میاں مزاح تو پہاڑ کی اونچی چوٹی کی طرح ہوتا ہے کسی نے بھاگ کر چوٹیاں سر نہیں کیں۔ اس لئے آہستہ خرامی اختیار کرو اور سہج سہج چلو۔ شاید اس عزیز کو یہ بات سمجھ آ گئی۔ کچھ عرصہ سے ان کی کوئی کتاب نظر سے نہیں گذری۔ اگر تو یہ توقف وقفہء تامل ہے تو بڑی خوش کن بات ہے توقع ہے کہ ان سے کسی وقت اچھا مزاح سرزد ہوگا۔ ان کی خودنوشت تو تیز روی میں لکھی ہوئی ڈائری ہے جس میں انہوں نے اپنے ساتھ کے طلبا و طالبات کے اسماء گرامی کی ایک فہرست بھی مرتب کردی ہے۔

چراغوں کا دھواں

انتظار حسین کی پچاس برس کی یادیں ''چراغوں کا دھواں'' کے عنوان سے سنگ میل والوں نے لاہور سے شائع کی ہیں۔ انتظار حسین نے پاکستان میں ورود کے پچھلے پچاس برسوں کی یادوں کو کریدا ہے۔ ان کا بات کرنے کا اپنا ڈھنگ ہے اور وہ ڈھنگ یہاں بھی نمایاں ہے۔ ''ہمعصر ادب میں جو زبان چالو ہے میں اس سے انحراف کر رہا ہوں اور یہ کہ یہ انحراف آگے چل کر مجھے بہت رسوا کرے گا'' (صفحہ ۳۱)۔ انتظار حسین کا زبان کے مروجہ رویوں سے انحراف ان کی پہچان ہے اور یہ پہچان اس کتاب میں بھی نمایاں ہے۔

پاکستان کے ابتدائی برسوں میں ادیبوں کی ملک سے وفاداری کا موضوع بہت دلپسند موضوع تھا۔ ترقی پسندوں اور رجعت پسندوں میں ٹھنی ہوئی تھی۔ ترقی پسندی کی لے یہاں تک بڑھی ہوئی تھی کہ وہ لوگ رجعت پسندوں کو اپنے رسالوں میں چھاپنے کے بھی روادار نہیں تھے اور اس باب میں ''پارٹی'' کے فیصلوں پر عمل درآمد کیا جاتا تھا۔ ''عارف عبدالمتین کیا ہیرا آدمی تھے امرتسر کی مٹی مگر رکھ رکھاؤ میں لکھنویوں سے بڑھ کر لکھنوی۔ انتہا پسند قسم کے انقلابی۔۔۔ وقتاً فوقتاً مجھے محبت سے نوٹس دیتے ''انتظار صاحب اگلے مہینے انجمن میں آپ کو افسانہ پڑھنا ہے'' اور میں خوشی خوشی انجمن میں جا کر اپنا خالص رجعت پسندانہ افسانہ پڑھتا۔۔۔ ایک شام انہوں نے کہا کہ آؤ چل کر کہیں بیٹھتے ہیں اور چائے پیتے ہیں۔ ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پی پیار محبت کی باتیں کیں دیر بعد جھجکتے جھجکتے بولے ''انتظار صاحب وہ جو میں نے انجمن کے لئے آپ کا افسانہ بک کیا تھا وہ پروگرام بدل گیا میں آپ سے شرمندہ ہوں''۔۔۔ ''پھر رکتے رکتے بولے وہ جو'' جاوید'' کے لئے میں نے آپ سے افسانہ لیا تھا وہ بھی اب وہاں نہیں چھپ سکے گا برا نہ مانئے گا پارٹی کا فیصلہ ہے'' (صفحہ ۶۰۔۶۱)۔ یہ اس زمانہ کی باتیں ہیں جب اشتراکی ادیب یہ سمجھتے تھے کہ چین میں انقلاب آ گیا ہے اب پاکستان میں بھی انقلاب آیا کہ آیا اور اس سوچ کے کارن ترقی پسندوں کا دماغ آسمان پر تھا سبط حسن کا قول تھا'' دیکھئے اس زمانہ میں تو

ہم شمشیر برہنہ تھے انتہا پسند بنے ہوئے تھے اور انتہا پسندی نقصان تو پہنچاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں وہ کام ہم نے غلط کیا تھا آخر ہم انسان تھے فرشتے تو نہیں تھے'' اس پر انتظار حسین کی گرہ ''انتہا پسندی کی وجہ انہوں نے یہ بتائی تھی کہ اصل میں چین میں انقلاب آ جانے کے بعد ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ پاکستان میں بھی انقلاب آیا کہ آیا'' (صفحہ ۶۲) احمد ندیم قاسمی اس زمانہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے سکرٹری تھے بعد کو انہوں نے اس انتہا پسندی سے لاتعلقی کا اظہار کرنا شروع کر دیا مگر وہ اس ذمہ داری سے کیسے سبک دوش ہو سکتے تھے؟ منٹو کے ساتھ ان کی چل گئی تو منٹو کے نام انہوں نے ایک کھلا خط لکھا جس کا منٹو نے بھی دو بدو جواب دیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ترقی پسندوں میں اس زمانہ میں ہی جوتیوں میں دال بٹنے لگی تھی انتظار حسین اس دور کے چشم دید گواہ ہیں اور یہ گواہی معتبر ہے۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین اور حلقہء ارباب ذوق دونوں میں برابر جاتے تھے اور دونوں کی کارروائی میں باقاعدہ حصہ لیتے تھے۔ بلکہ ان کے زیادہ تر افسانے انجمن کے جلسوں ہی میں پڑھے گئے۔

ان پچاس برسوں میں کتنے ہی انقلاب آئے۔ ملک مارشل لاء کی گرفت میں آیا۔ رائٹرز گلڈ بنا۔ یار لوگ گلڈ کی رکنیت کے لئے بیتاب ہونے لگے۔ سوائے مولانا صلاح الدین احمد کے جنہوں نے صاف کہہ دیا کہ ''ادیب تو پیغمبر ہوتے ہیں بھلا پیغمبروں نے بھی کبھی گلڈ بنائے ہیں'' (صفحہ ۱۵۴)۔ ناصر کاظمی اور انتظار حسین بھی دوسروں کی دیکھا دیکھی کراچی پہنچے۔ محمد حسن عسکری نے ان سے کہا ''میں سمجھ رہا تھا تم اور ناصر نہیں آؤ گے۔۔۔ بولے ہاں وہ تمہارے ابن الحسن میرے پاس آئے تھے میں نے کہا آ جاؤں گا۔ پولیس بھیج کے بلوا لینا'' (صفحہ ۱۵۱)۔ مگر بات یہیں تک نہیں رہی ضیاء الحق نے ادیبوں کو بلوا بھیجا تو سب وہاں پہنچے۔ کیا ترقی پسند کیا غیر ترقی پسند۔ سکہ بند ترقی پسندوں نے مقالے بھی پڑھے اور صدر کی ضیافت سے بہرہ اندوز بھی ہوئے مگر صاحب لوگوں لوگوں میں فرق بھی تو ہوتا ہے ضیاء الحق کی افطاری کی دعوت تھی ''افطار کرتے کرتے جنرل صاحب نے اذان کی آواز سنی تو فوراً اس سمت چلے جہاں نماز کا اہتمام تھا۔ ان کے پیچھے پیچھے پورا ہجوم گیا کیا صحافی کیا غیر صحافی۔ میں نے دیکھا کہ ایک میں ہی پیچھے رہ گیا ہوں ۔۔۔ اگلی شام وہی مقام اسی طرح افطاری کا اہتمام اسی طور اذان مگر ہوا یہ کہ جونیجو صاحب جب نماز کے لئے چلے تو بس گنے چنے تنگ ان کی معیت میں تھے باقی سب افطاری میں مشغول نظر آئے'' (صفحہ ۲۱۴)

''یادوں کا دھواں'' لاہور کی ادبی زندگی کا مرقع ہے۔ کافی ہاؤس اور کافی ہاؤس کا دلی ہجرت کر

جانے والا بیرا اشرافت'' انتظار صاحب بات یہ ہے کہ لوگ تو اچھے ہیں مگر یہاں ہمارا کلچر نہیں ہے''۔ (صفحہ ۸۶)۔ ریاض قادر کہ ''اس کی چڑ دو چیزیں تھیں ایک ان کا گنجا سر اور دوسرے ان کے والد گرامی شیخ سر عبد القادر'' (صفحہ ۸۱) پھر سراج صاحب کا پاک ٹی ہاؤس۔ لاہور کی ادبی زندگی کا مرکز۔ ناصر کاظمی، احمد مشتاق، قیوم نظر، انجم رومانی حلقہ ارباب ذوق کے سارے اراکین یہاں موجود اور براجمان۔ بلکہ حلقہ دولخت ہؤا تو سیاسی اور ادبی حلقوں کو ٹی ہاؤس سے مفر ممکن نہ ہؤا۔ مصوری کی نئی تحریک بھی اٹھی تو اسی ٹی ہاؤس سے چل کر کافی ہاؤس تک گئی۔ (صفحہ ۱۱۳)۔

احوال الرجال کا حصہ بھی اس لحاظ سے منفرد اور نمایاں ہے کہ انتظار صاحب نے ہر بات دوسروں کا سہارا لے کر کہی ہے اور جرأت سے کہہ دی ہے۔ محمد حسن عسکری'' کی طبیعت سیمابی تھی۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں ذہن ابھی یہاں ابھی زقند بھر کے وہاں سو نقاد بے اعتبارے تھے'' (صفحہ ۵۰) ''رنجھتے بھی جلدی تھے بدکتے بھی جلدی تھے'' (صفحہ ۵۱) '' گھڑی میں رن میں گھڑی میں بن میں'' (صفحہ ۳۸)۔ چراغ حسن حسرت'' مولانا امروز کے دفتر میں ابوالہول بنے بیٹھے رہتے۔ سوال کا جواب جس نے ناں میں دیا وہ بھی مارا گیا جس نے ہاں میں دیا وہ بھی سرخرو ہوتے نہیں دیکھا گیا'' ۔۔۔ ''لمبے تڑنگے، بھاری بھرکم اسی تناسب سے آواز بھاری تھی۔۔ منہ میں ہر دم سگریٹ بات کرنے سے پہلے لمبا کش لیتے، ہر ادنیٰ اعلیٰ سے ایک ہی انداز میں مخاطب ہوتے '' مولانا''۔ فقرہ باز غضب کے تھے۔۔ حسرت صاحب کے کمرے میں آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا صحافی ادیب ناشر کتب فروش، کاغذوں کے تاجر، عرب ہوٹل کا کوئی بچا کھچا ہمنشیں، شرابی کبابی تماش بین، شاعر شطرنج باز گانے بجانے کا کوئی رسیا کوئی خوش شکل نوخیز صحافی'' (صفحہ ۶۸) ''روز دن ڈھلے ایک تانگہ میکلوڈ روڈ کی طرف سے آتا دکھائی دیتا کافی ہاؤس کے سامنے آ کر رکتا حسرت صاحب ہاتھ میں چھڑی رکھنے لگے تھے چھڑی ٹیکتے تانگے سے اترتے اور کافی ہاؤس میں داخل ہو جاتے۔ ایک شام کافی کا آرڈر دیا مگر بیرا آرڈر لے کر ایسا غائب ہوا کہ دیر تک صورت نہ دکھائی۔ پرانا بیرا منشی قریب سے گذرا تو اس سے شکایت کی کہ آرڈر دئے کتنی دیر ہو گئی کافی نہیں آئی۔ منشی نے پوچھا کس بیرے کو آرڈر دیا تھا سوچ کر بولا'' وہ تو نہیں جس کے سر کے سارے بال سفید ہیں؟''۔ حسرت صاحب نے سگریٹ کا لمبا کش لیا

اور بولے ''مولانا جب وہ آرڈر لے کر گیا تھا اس وقت تک تو اس کے سر کے سارے بال کالے تھے'' (صفحہ ۷۸۔۷۹) ناصر کاظمی ''گھنا آدمی ہے بہت سا علم اپنے اندر چھپائے بیٹھا ہے'' (۶۳) ''ناصر صرف شاعری کر نہیں رہا تھا اپنی شاعری کو بسر بھی کر رہا تھا'' (صفحہ ۱۰۴) ''ناصر نے اپنی شب بیداری کے جواز میں ایک فلسفہ بھی تراش رکھا تھا کہ تخلیق کا درد اصل میں رات کی امانت ہے تخلیق کا ہر جادو رات کے سناٹے میں جاگتا ہے'' (صفحہ ۱۱۳) صفدر میر ''اقبال کے مردِ مومن والی شان کہ اس کی نفرت بھی عمیق اس کی محبت بھی عمیق'' (صفحہ ۱۴۹)

اشفاق احمد ''تحریر و تقریر دونوں کے بادشاہ ہیں قلم بھی خوب چلتا ہے زبان بھی خوب جوہر دکھاتی ہے۔ جب وہ محفل میں بیٹھ کر یا سٹیج پر کھڑے ہو کر جاری ہوتے ہیں تو انہیں سنتے جاؤ اور سر دھنتے جاؤ۔ میں جب انہیں سنتا ہوں تو میری ایک آنکھ ہنستی ہے دوسری آنکھ روتی ہے۔ سوچتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں کہ وہ جو ایک بات لچر سی بزبان ملا تھی اس شخص نے اپنی طلاقتِ لسانی سے کیا بنا دیا۔ جب وہ کسی بابے کو تلاش کر کے لاتے ہیں تو میری ایک آنکھ ہنستی ہے جب مسجد کے ملا کو بانس پر چڑھاتے ہیں تو میری دوسری آنکھ روتی ہے'' (صفحہ ۱۵۹)۔

پروفیسر وزیر الحسن عابدی ''غالب پر تقریر کر رہے تھے بیچ بیچ میں مختلف شعروں کا حوالہ دیتے تھے مگر شعر نہیں پڑھتے۔ کیا انہیں غالب کے شعر یاد نہیں تھے؟ نہیں۔ آخر انہوں نے معذرت کی اور کہا افسوس ہے میں اس وقت غالب کے شعر پیش کرنے سے قاصر ہوں وجہ یہ ہے کہ میں روزے سے ہوں'' (صفحہ ۲۰۰)

انتظار صاحب نے ان پچاس برسوں کی صورت حال کا خلاصہ یوں نکالا ہے کہ ''پاکستان میں زندگی کس مقام سے شروع ہوئی تھی اور اب کس مقام پر ہے۔۔۔ بس اتنا سن لو کہ عید بقر عید جب میں نماز پڑھنے مسجد میں جاتا ہوں تو پہرے میں یہ فریضہ ادا ہوتا ہے۔۔۔ مملکت اسلامیہ میں اب سب سے غیر محفوظ مقام مسجد ہے۔ کس پاکستان میں ہم نے صبح کی تھی کس پاکستان میں اب شام کرتے ہیں'' (صفحہ ۳۶۰)۔ یہی اس خودنوشت کا لب لباب ہے۔ کمبخت زمانہ تو کالا پڑتا ہی چلا جا رہا ہے سفیدی تو بس مرغی کے انڈے جتنی رہ گئی ہے۔

◎

پاکستان: قیادت کا بحران

''پاکستان: قیادت کا بحران''۔ یہ عنوان کسی سیاسی تجزیہ کا نہیں بلکہ ریٹائرڈ لفٹیننٹ جنرل جہان داد خان کی خودنوشت سوانح عمری کا ہے جو جنگ والوں نے اگست ۲۰۰۲ء میں شائع کی ہے۔ جہانداد خان صاحب فوج کے اہم عہدوں پر فائز رہے۔ مارشل لا کے فرائض بھی سرانجام دیتے رہے اور سندھ کے پہلے فوجی اور بعد کو غیر فوجی گورنر بھی رہے اس لئے انہوں نے سوچا ہوگا کہ ان کی خود نوشت پاکستان کے سیاسی بحرانوں کی مستند دستاویز سمجھی جاسکتی ہے تو کیوں نہ اسے ایسا نام دے دیا جائے۔ دے دیا مگر اس کا کیا کیا جائے کہ ہمارے ہاں کا ہر جرنیل اپنے آپ کو سیاست کا ماہر اور سیاسیات کے دریا کا شناور سمجھتا ہے یا سمجھنے لگتا ہے حالانکہ یہ وہ میدان ہے جس میں کسی فوجی کی رائے کو پرِ کاہ کی اہمیت بھی حاصل نہیں ہونی چاہئے۔ ملک کی بدقسمتی کہ اسے سیاست دانوں کی نااہلی کی وجہ سے نوکر شاہی کا دست نگر ہونا پڑا جن کی بنیادی تربیت ہی انتظامیہ کی ہوتی ہے۔ ان کا فرض اولیں حکومت کے احکام کی بجا آوری ہوتا ہے۔ پاکستان کے ابتدائی سالوں میں تقسیم ملک کی افراتفری کے نتیجہ میں ملک کے سیاسی نظام کو چلانے کے لئے بہت کم تجربہ کار سیاست دان میسر تھے اس لئے مجبوراً انتظامیہ کے افسروں سے سیاسی انتظام چلانے کا کام لینا پڑا۔ چوہدری محمد علی، غلام محمد، سکندر مرزا، سب لوگ انتظامیہ کے قابل افسر تھے انہیں سیاسی عہدوں پر متمکن ہونے کا موقع ملا تو ان کا خیال ہوا کہ شاید ان کے بغیر ملک کا نظم و نسق نہیں چل سکتا اور ان کا وجود ملک کی سلامتی کے لئے ناگزیر ہے۔ جب ان لوگوں کے عروج کا چرچا ہوا تو فوج کے موقع پرست سامنے آ گئے اور ایسے سامنے آئے کہ ملک کی تاریخ میں زیادہ تر انہی کا اقتدار قائم رہا۔ ایسے میں اگر کوئی فوجی جرنیل ریٹائر ہونے کے بعد اپنی خودنوشت سوانح حیات کا عنوان سیاسی رکھتا ہے تو یہ ساری فوج کے سیاسی ذہن کی آئینہ داری کرتا ہے۔ فوج ملک کے دفاع کے لئے ہوتی ہے خود اپنے ہی ملک پر حکومت کرنے کے لئے نہیں ہوتی۔

جنرل جہان داد خان کی اس خودنوشت میں بہت سی خامیاں ہیں جو محض اس وجہ سے در آئی ہیں کہ یہ جنرل صاحب کا میدان نہیں۔ انہوں نے خودنوشت لکھنے کی طرح تو ڈال دی مگر اس بارہ میں کسی سے کچھ سیکھ کے نہیں دیا اگر وہ اس فن کے بارہ میں کچھ پڑھ لکھ لیتے تو وہ بنیادی اور ابتدائی خامیاں نہ رہ جاتیں جن کی وجہ سے اس خودنوشت کا مرتبہ فروتر ہو گیا ہے۔ مثلاً آپ نے ایوب خان کے دور کی جو تصویر کھینچی ہے اس کا سارا دارومدار کتابی یا سماعی ہے حتیٰ کہ بعض مقامات پر انہوں نے ایسے واقعات لکھ دیئے ہیں جن کی بارہا تردید ہو چکی ہے اور جنہیں کوئی سچ نہیں سمجھتا۔ مثلاً صفحہ ۴۹ پر اسکندر مرزا کی برطرفی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "۲۷ اور ۲۸ اکتوبر (۱۹۵۸) کی درمیانی شب میں ایوب خان نے برکی، اعظم خان اور شیخ تینوں جنرلوں کو صدر مرزا سے استعفیٰ لینے کے لئے بھیجا۔ وہ لوگ ٹائپ شدہ استعفیٰ ساتھ لے گئے جس پر صدر کو دستخط کرنے کو کہا گیا۔ جب انہوں نے انکار کیا تو اعظم خان نے پستول نکال لیا جس پر صدر سکندر مرزا نے اپنی بیوی سے مشورہ کے بعد دستخط کر دئے"۔ یہ بات جنرل صاحب یوں لکھ رہے ہیں گویا اس وقت وہ بھی اس وفد میں موجود تھے پہلا سقم تو یہ ہے بیگم سکندر مرزا کا اس موقعہ پر اس میٹنگ میں موجود ہونا یا صدر کو ان سے مشورہ کا موقع دیا جانا ہی قرینِ قیاس نہیں جس میں فوج کے چند جرنیل صدر سے استعفیٰ کا مطالبہ کرنے آئے ہوں۔ دوسرے آج تک اس واقعہ کی جتنی تفصیلات سامنے آئی ہیں کسی میں جنرل اعظم خان کے پستول نکالنے کا ذکر نہیں صرف اتنا ذکر ہے کہ اس وفد کے ساتھ ایک بریگیڈیر بھی تھا جس نے جارحانہ انداز میں پستول لٹکا رکھا تھا۔ حتیٰ کہ سابق سکندر مرزا کا اپنا انٹرویو بھی یہی کہتا ہے۔ ان کے صاحبزادے ہمایوں مرزا کی کتاب بھی میں نے دیکھی ہے اس میں بھی جنرل اعظم کی اس "کج خلقی" کا کوئی ذکر نہیں۔ خدا جانے جہانداد خان صاحب نے یہ بات کہاں سے سن لی۔ در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید؟ اس طرح یہ تاثر پیدا ہو جاتا ہے کہ جنرل صاحب نے اکثر باتیں محض شنید کی بنا پر لکھ دی ہیں اور یہ بات خودنوشت سوانح عمری کے بنیادی اصول کے خلاف ہے۔ پھر طرہ یہ کہ جنرل صاحب نے ایک دو موقعوں پر شہاب نامہ کا حوالہ دے کر اپنی بات کو اور زیادہ بے وزن کر دیا ہے کیونکہ شہاب نامہ کو حالات سے آگاہی رکھنے والا کوئی شخص بھی افسانہ طرازی سے زیادہ حیثیت دینے کو تیار نہیں۔

جہاں جنرل صاحب نے خود آنکھوں دیکھی کہی ہے وہاں ان کی بات دل کو لگتی ہے۔ ضیا دور کے ریفرینڈم کے بارہ میں لکھا "ریفرینڈم کے روز میں صبح کراچی ویسٹ ضلع کے پولنگ کا جائزہ لینے گیا تو میں نے دیکھا کہ تمام مراکز پر ہو کا عالم تھا"۔ اور یہاں تک تو بات درست تھی۔ مگر جنرل صاحب نے اس عدم دلچسپی کی تشخیص فرمائی اور اس کا جو علاج تجویز کیا وہ محلِ نظر ہے۔ لکھتے ہیں "میں نے چند لوگوں سے ریفرنڈم میں اس عدم دلچسپی کا سبب دریافت کیا ایک باریش شخص نے جواب دیا "بھلا کون ضیا کو ووٹ دینے آئے گا ان کا ٹیلی ویژن مقبول گانے والوں کے پروگرام پیش کر رہا ہے"۔ میں دفتر واپس آ گیا اور جنرل ضیا کو فون پر بتایا بوتھ خالی پڑے ہیں کیونکہ ٹیلی ویژن پر مقبول موسیقاروں کے نغمات زور شور سے نشر ہو رہے ہیں جسے لوگ دیکھ رہے ہیں"۔ انہوں نے پوچھا اس کا کیا علاج ہے؟ میں نے کہا "آپ موسیقاروں کی بجائے اپنے پسندیدہ مولویوں کو ٹی وی پر بٹھا دیجئے"۔ انہوں نے فوراً میری رائے پر عمل کیا اور سہ پہر میں رائے دہندگان کی اچھی خاصی تعداد بوتھ پر موجود تھی" (صفحہ ۱۶۵) وہی بات جو غالب نے کہی تھی اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا۔ جنرل صاحب کو یہ کہنے کی جرات نہ ہوئی کہ پچھلے پہر سارے "جوانانِ صف شکن" اس جمود کو "توڑنے" کے لئے وردیاں اتار کر بوتھ پر پہنچ گئے تھے۔ مولویوں کا کیا ہے وہ تو ضیا کے سارے دور میں ٹی وی سے نہیں نکلے۔ یہ بات جنرل مجیب الرحمٰن سے منسوب ہے اور ان کے ایک ندیم سے ہم نے سنی ہے کہ انہوں نے کہا کہ مجھے ٹی وی کے ایک صارف نے شکایت کی کہ اس کے ٹی وی میں ایک نقص پیدا ہو گیا ہے جو کسی طور سے دور نہیں ہوتا۔ مجیب الرحمٰن کہنے لگے جناب میں ٹی وی مکینک نہیں آپ کسی مکینک سے رجوع کیجئے۔ اس نے کہا "جناب یہ کام صرف آپ سے ہی ہو سکتا ہے کیونکہ اس کے سکرین سے مولوی اس طرح چپکے ہوئے ہیں کہ چھڑائے نہیں چھٹتے۔ خدارا کچھ کریں"۔ اس لئے جنرل جہانداد کی بات خدا لگتی بات نہیں۔

یہ باتیں تو گھر کی سیاست کی باتیں ہیں۔ جنرل صاحب بین الاقوامی سیاست سے بھی آگاہ نہیں۔ لکھتے ہیں "نہرو کشمیر میں استصواب رائے کے اس وعدہ سے مکر گئے جو انہوں نے اگست ۱۹۵۲ء میں محمد علی بوگرہ سے دہلی میں کیا تھا" (صفحہ ۴۸) کشمیر میں استصواب رائے کی ذمہ داری یو این کے ریزولیشنز کے تحت یو این کی جانب سے عاید کی گئی تھی نہرو اور بوگرہ صاحب کے مابین کسی بات چیت

میں طے نہیں ہوئی تھی۔ نہرو کا مکرنا بین الاقوامی ذمہ داری سے مکرنا تھا۔ جنرل صاحب اس مسئلہ کے پس منظر سے اتنے بھی آگاہ نہیں تس پر اپنے کو پاکستان کی سیاسی قیادت کے بحران پر رائے زنی کا اہل جانتے ہیں۔ جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے۔

جنرل صاحب نے ایوب' یحییٰ' بھٹو اور جنرل ضیاء الحق کے بارہ میں اپنی کھلی رائے کا اظہار کیا ہے۔ مگر اس کتاب میں جس شخص کا تذکرہ بڑی محبت اور خلوص سے کیا گیا ہے وہ نواب امیر محمد خان آف کالا باغ ہیں۔ غالباً ہمارے ہاں کی تاریخ میں اور سیاسی سوانح عمری لکھنے والوں میں یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے نواب کالا باغ کی شخصیت کے بارہ میں بہت سا مستند مواد مہیا کر دیا ہے۔ جرنیل صاحب کرنیلی کے زمانہ میں نواب کالا باغ گورنر مغربی پاکستان کے ملٹری سکرٹری رہے اور نواب صاحب کے ساتھ قریبی تعلق کی بنا پر ان کی ذات کے بارہ میں جو رائے قائم کی وہ بڑی اہم ہے۔ نواب صاحب کی ذات کے ساتھ ایک پراسراریت اور بے رحمی کا جو تصور وابستہ ہے جہان داد خان نے اس کی تردید نہیں کی بلکہ اس کے اسباب دریافت کرنے کی کوشش کی ہے آپ نے اس باب کا عنوان بھی ''نواب کالا باغ: حقیقت اور افسانہ'' رکھا ہے۔ راؤ رشید صاحب نے اپنی کتاب ''جو میں نے دیکھا'' میں نواب صاحب اور چودھری ظہور الٰہی کی دشمنی کا ذکر کرتے ہوئے پولیس کے ایک ایسے افسر کا ذکر کیا ہے جس کے بارہ میں نواب کالا باغ نے صدر ایوب کی موجودگی میں کہا کہ ''اب میں اپنا کتا اس پر چھوڑنے والا ہوں'' اور اس افسر نے سرِ تسلیم خم کرنے کے انداز میں سر ہلایا۔ جہانداد خان صاحب نے بھی نواب کالا باغ اور چودھری ظہور الٰہی کی سیاسی رقابت کا ذکر ضرور کیا ہے مگر ایسی کسی انتہا پسندانہ بات کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ حالانکہ یہ زمانہ انہی کی ملٹری سکرٹری شپ کا زمانہ ہے۔ یہ ضرور لکھا ہے کہ ''نواب صاحب نے ان کے (چودھری ظہور الٰہی) تمام روٹ پرمٹ' سینما کے اجازت نامے' اور ایجنسیاں منسوخ کر دیں اور گجرات کا بیچارہ چودھری پیسے کے بغیر اپنے سیاسی کام جاری نہیں رکھ سکا'' (صفحہ ۸۷)۔ اے کاش نواب کالا باغ زندہ ہوتے اور دیکھتے کہ انہی چودھری ظہور الٰہی کی اولاد اب پاکستان کی سیاست میں کتنی مقتدر حیثیت رکھتی ہے۔ **تلک الایام نداولھا بین الناس .**

یحییٰ کے بارہ میں نواب کالا باغ کے اس فقرے کے راوی جنرل جہان داد ہیں کہ نواب

صاحب نے ان کے سامنے کہا کہ ''ایوب نے زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے انہوں نے ایک عیاش اور شرابی کو فوج کا سربراہ مقرر کیا ہے دیکھنا ایک دن وہ اس پر پچھتائیں گے'' (صفحہ ۱۰۸) پھر وہ نواب صاحب کے منہ سے بھٹو کے خلاف بھی جو کچھ کہلوانا چاہتے ہیں کہلواتے چلے جاتے ہیں۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے وہ خلاف تھے اور اس کی ساری ذمہ داری وہ بھٹو اور اس کے ساتھیوں پر ڈالتے تھے۔ مگر اس بات کی داد دینی چاہیئے کہ جنرل صاحب اپنے سینئر فوجی افسروں کی کارکردگی پر رائے زنی نہیں کرتے نہ ان میں خامیاں تلاش کرتے ہیں۔ جنرل اختر ملک کے بارہ میں لکھتے ہیں لاہور میں ان کا تقرر ہوا تو اس وقت ''ایک اور قابلِ ذکر شخصیت بریگیڈئر اختر ملک کی تھی بریگیڈئر اختر پیشہ ورانہ سرگرمیوں میں غیر معمولی طور پر اختراعی ذہن کے مالک تھے اور وہ اپنی بے پناہ مہارت اور قائدانہ صلاحیتوں کی وجہ سے عزت واحترام سے دیکھے جاتے تھے بریگیڈئر اختر نے (بعدازاں لفٹیننٹ جنرل) ''آپریشن جبرالٹر'' کو نہ صرف تخلیق کیا بلکہ عملی جامہ بھی پہنایا'' (صفحہ ۳۲)۔ تیسرے باب میں لکھا ہے ''وادیٔ کشمیر میں بغاوت کی تصدیق کا انتظار کئے بغیر چھمب جوڑیاں محاذ پر پاکستانی فوج نے حملہ کر دیا ہندوستانی فوج اس اچانک حملہ کے لئے تیار نہ تھی اور دریائے توی پار کر کے جنرل اختر ملک چھمب جوڑیاں پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے اس حملے سے ہندوستانی فوج میں بھگدڑ مچ گئی اور بیشتر مقامات پر وہ اپنا بھاری اسلحہ توپیں وغیرہ چھوڑ کر پچھلے مورچوں پر چلی گئی۔ اس معرکہ میں اسلحہ اور بارود کی صورت میں جو مالِ غنیمت ہاتھ آیا اس سے پاکستان نے توپ خانے کی ایک رجمنٹ کھڑی کر لی۔ چند وجوہ کی بنا پر فوج کے سربراہ جنرل موسیٰ خاں نے اس موقع پر اس محاذ کی کمانڈ میجر جنرل محمد یحییٰ خان کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا جن کا اس سے قبل آپریشن جبرالٹر سے کوئی تعلق نہیں تھا کیونکہ وہ پشاور میں ساتویں ڈویژن کی کمان کر رہے تھے۔ جنرل اختر حسین اکھنور پر حملے کے لئے تیار تھے کہ انہیں اس اہم اور نازک موقع پر تبدیل کر دیا گیا اور نئے کمانڈر کو جزئیات سمجھنے میں وقت لگا یہ تبادلہ بڑا ہی بے موقع تھا آپریشن گرینڈ سلام میں دیر ہو جانے کے سبب ہندوستان کو اکھنور کے دفاع مضبوط بنانے کا وقت اور موقع مل گیا اور ہندوستان کے لاہور پر حملہ کی وجہ سے اس محاذ پر دباؤ میں کمی آ گئی۔ ہم اکھنور کی فتح سے محروم ہو گئے جو جموں اور کشمیر میں داخلے کا فوجی لحاظ سے ایک اہم مقام تھا اور ناقص منصوبہ بندی اور

غلط عمل درآمد سے مسئلہ کشمیر کے حل کا یہ نادر موقع ہاتھ سے نکل گیا'' (صفحہ ۶۱)

بھٹو صاحب کی شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے جہان داد خان صاحب نے پھر دوسروں کی (بلکہ انٹیلی جنس کی) کہی ہوئی باتوں پر اپنی بات کی بنیاد رکھ دی ہے کہ ''امرا سے ان کا سلوک ان کے ابتدائی تجربات کا عکاس ہے ان کے ساتھ جو سلوک ہوا تھا وہ ان کے دو بڑے بھائیوں کے مساوی نہیں تھا کیونکہ ان دو بھائیوں کی والدہ بھٹو خاندان سے تھیں اور خاندان میں وہ عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں'' (صفحہ ۱۴۲) جہان داد خان صاحب یہ تو کہنا نہیں چاہتے کہ بھٹو کی والدہ خاندان سے باہر کی تھیں' اس لئے خاندان والے انہیں قبول نہیں کرتے تھے۔ نہ ہی وہ انٹیلی جنس کی اس رپورٹ کو دہرانا چاہتے ہیں جس کی بنا پر بھٹو صاحب کی موت کے بعد ان کے جسم کے نچلے حصہ کے قریبی فوٹو لئے گئے تھے کہ ان کے مسلمان ہونے یا نہ ہونے کی تصدیق کی جاسکے (حوالہ کے لئے کرنل رفیع الدین کی کتاب دیکھئے) مگر ان کا نفسیاتی تجزیہ کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ فوجی لوگوں کا یہی تو المیہ ہوتا ہے کہ آدھی بات کو لے اڑتے ہیں اور جرنیل صاحب اس کتاب میں کئی مقامات پر اس بات کے مرتکب ہوئے ہیں۔

بھٹو صاحب کی غلطیوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کے قلم سے یہ حقیقت بھی رقم ہوئی ہے کہ ان کا احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا اقدام بہت ضرر رساں تھا اور ''اس کی تمام مغربی دنیا میں مخالفت کی گئی۔ مزید برآں متعدد لائق اور باصلاحیت قادیانی ملک چھوڑ گئے اور امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ اس طرح ہم متعدد معروف و مشہور سائنسدانوں اور انجینئروں اور وطن کی خدمت کا جذبہ رکھنے والوں سے محروم ہو گئے'' (صفحہ ۱۴۶)۔

نکل جاتی ہو سچی بات جس کے منہ سے مستی میں
فقیہہ مصلحت بیں سے وہ رندِ بادہ خوار اچھا

جنرل ضیا کے ساتھ ان کے تعلقات کا سلسلہ ۱۹۷۳ء کے اس سازش کیس سے شروع ہوا جو بھٹو کے خلاف ہوئی تھی اور جس میں ملوث فوجی افسران پر اٹک کے قلعہ میں فوجی عدالت میں مقدمہ چل رہا تھا۔ جنرل ضیا اس کورٹ مارشل کے سربراہ تھے اور بریگیڈیر جہان داد خان اس کے سینئر رکن تھے۔ بریگیڈیر صاحب نے یہاں تک تو لکھ دیا ہے کہ ''یہی دور تھا جب ضیا کو بھٹو سے قریب ہونے کا

موقع ملا اور وہ براہ راست بھٹو کو اس سازش کیس کی پیش رفت سے آگاہ رکھتے تھے'' (صفحہ ۲۱۱)۔ ضیا کی شخصیت کے بارہ میں ایس ایم ظفر نے اپنے دیباچہ میں کہا ہے کہ کورٹ مارشل شروع ہوا تو ''ضیا نے ملزموں کے وکیلوں کو اپنی بے دست و پا کر دینے والی مسکراہٹ سے خوش آمدید کہا'' (صفحہ ۱۰) بریگیڈیر جہان داد خان نے لکھا کہ ضیا نے ''ان افسروں کی ہمدردی بھی حاصل کر لی جن پر سازش کیس میں مقدمہ چل رہا تھا'' (صفحہ ۲۱۱)۔ ضیا کی اس بے دست و پا کر دینے والی مسکراہٹ کا خمیازہ قوم کو تیرہ سال تک بھگتنا پڑا۔ ایس ایم ظفر کی بات کے راوی بھی جنرل صاحب ہی ہیں کہ ''ایس ایم ظفر سینئر ڈیفنس کونسل (وکیل صفائی) تھے انہوں نے حال ہی میں مجھے بتایا کہ ایک بار انہوں نے اپنی بیگم سے کہا کہ وہ بھی اس مقدمہ کی کارروائی دیکھنے کے لئے ان کے ساتھ چلیں جہاں وہ مہمانوں کی گیلری میں بیٹھ سکیں گی اور مستقبل میں پاکستان کے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کو بھی دیکھ سکیں گی۔ ظفر صاحب نے مزید کہا کہ جس طرح جنرل ضیا نے اس مقدمے کو آگے بڑھایا اور جس طرح انہوں نے سینئر وکلا کے ہتھیاروں کو بیکار کرنے کے لئے اپنی عاجزی اور انکساری کو استعمال کیا اس سے انہیں اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک نہ ایک دن اس ملک کے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر ضرور بنیں گے'' (صفحہ ۲۱۱)

مارشل لا اور نوکر شاہی والے باب میں آپ نے سندھ کے سکرٹری داخلہ کنور ادریس کا ایک سوال درج کیا ہے جس میں نے انہوں نے جنرل صاحب سے پوچھا ہے ''حضور عالی اگر مارشل لا کی مدت صرف نوے روز ہی کی ہے تو اس کے عواقب سے ہمیں کون تحفظ فراہم کرے گا؟'' اس کے جواب میں میرا پہلا سوال جنرل صاحب سے یہ ہے کہ یہ گفتگو لامحالہ انگریزی میں ہوئی ہوگی کیونکہ ہماری افسر شاہی کے لوگ اردو میں بات کرنا کسر شان سمجھتے ہیں اور اکثر موقعوں پر اردو میں بات چیت نہیں کرتے۔ کنور ادریس صاحب نے وہ کون سا لفظ استعمال کیا ہوگا جس کا ترجمہ جرنیل صاحب نے ''حضور عالی'' فرمایا ہے؟ جہاں تک میں کنور ادریس صاحب کو جانتا ہوں اور تقریباً پینتالیس سال سے جانتا ہوں وہ ''حضور عالی'' وغیرہ کے تعظیمی الفاظ استعمال کرنے کے عادی نہیں۔ انہوں نے زیادہ سے زیادہ ''سر'' کہا ہوگا یا ''موسٹ ریسپیکٹڈ سر'' کہا ہوگا ان دونوں کا ترجمہ حضور عالی نہیں بن سکتا۔ اس ردوقدح کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فوجی افسران مارشل لا کے افسر مقرر ہونے کے بعد یہ توقع رکھتے ہیں کہ

سول کے اعلیٰ سے اعلیٰ افسران بھی انہیں نہ صرف حضور کہیں بلکہ حضور عالی کہیں اور اس طرح جی حضوری کے مرتکب ہوں۔ مجھے یقین واثق ہے میرے محترم استاد نے جو حفظِ مراتب سے پوری آگاہی رکھتے ہیں ایک ایسے شخص کو جو مرتبہ میں ان کے برابر ہی ہوگا حضور عالی جیسے چاپلوسی کے الفاظ سے نہیں پکارا ہوگا۔ یہ محض جرنیل صاحب کے مزاج کی داخلی کیفیت ہے جو اس فقرہ سے ٹپک پڑی ہے اور اس میں جرنیل صاحب کا قصور نہیں ان سب جی حضوریوں کا قصور ہے جو مارشل لا کے منتظر رہتے اور ہر طالع آزما کو خوش آمدید کہنے پر مستعد رہتے ہیں۔

ایم کیو ایم کے بارہ میں بھی ان کی باتیں غور کے قابل ہیں۔ یہ پہلی بار ہوا ہے کہ کسی فوجی اور غیر فوجی گورنر نے پرانے سینئر سول افسروں اور معزز لوگوں کو نام لے کر اس تحریک میں ملوث کیا ہو۔ رئیس امروہوی، ہاشم رضا، ایس ایس جعفری۔ ایسے نام نہیں جنہیں یونہی نظر انداز کر دیا جائے۔ رئیس صاحب تو اسی تفرقہ میں اپنی جان گنوا بیٹھے، ہاشم رضا محبانِ وطن کو غیر محب وطن کہنے کے پرانے مریض ہیں اب تو وہ شاید عمر کے اس مقام پر ہیں کہ "لا یعلم بعد علم شیئا" اس لئے ان پر انگشت نمائی کرنا بھی زیب نہیں دیتا۔ مگر جی ایم سید کے ساتھ ضیاء الحق، جہان داد خان صاحب کی سندھ کی گورنری کے زمانہ میں پینگیں بڑھاتے رہے جہان داد خان اس ذمہ داری سے کیسے سبک دوش ہو سکتے ہیں؟ اگر وہ جانتے تھے کہ جی ایم سید محب وطن نہیں تو انہیں اپنے ردعمل کا اظہار کرنا چاہئے تھا۔ اگر وہ دسویں کور کی کمان سے اس لئے مستعفی ہونے کا سوچ سکتے ہیں کہ "ضیاء الحق ان سے کھچے کھچے رہتے ہیں" (صفحہ ۲۱۲) تو اتنے بڑے سبب کی موجودگی میں ان کا کسی ردعمل کا اظہار نہ کرنا پڑھنے والوں کو بہت کھلتا ہے۔

جنرل جہان داد خان کی اس خودنوشت کی دو چیزیں قابلِ غور اور قابلِ قدر ہیں۔ دیباچہ جو ایس ایم ظفر نے لکھا ہے اور الشفا ٹرسٹ کی کارگذاری کی تفصیلات۔ اور یہ خودنوشت انہی کی وجہ سے پڑھی بھی جائے گی۔ پاکستان کی قیادت کے بحران کے موضوع پر اس خودنوشت کو شاید استناد کا درجہ اور اہمیت حاصل نہ ہوسکے۔

خبر گیر

قیصر تمکین کی خودنوشت "خبر گیر" مجھے اس حال میں پہنچی کہ یہ معلوم کرنا ممکن نہ ہوا کہ کب چھپی ہے اور کہاں سے چھپی ہے۔ سعید انجم مرحوم نے اوسلو سے بھجوائی تھی۔ قیصر تمکین، صحافی ہیں اس لئے انہوں نے اپنی خودنوشت کا عنوان بھی صحافیانہ رکھا ہے۔ ان کا تعلق، کاکورہ کے ایک معزز علمی گھرانے سے ہے مگر بچپن میں عسرت کا شکار رہے۔ فاقوں تک نوبت پہنچی اسی فاقہ زدگی کا شاخسانہ یہ رہا کہ مقامی صحافت میں پیر ٹکانے کا موقع ملا تو اس کا اصل محرک یہ تھا کہ صحافیوں کو کھانے پینے کے وافر مواقع میسر آتے ہیں اور اس سے قیصر صاحب نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ پیٹ کی آگ کسی طریق سے تو بجھانا ہی تھی۔ ہر دعوت میں بن بلائے پہنچ جانا اور پیٹ بھر کر کھانا کھانا۔ دفتر سے غیر فروخت شدہ اخباروں کو "چرانا" اور ردی میں بیچ دینا بھی ان کا مشغلہ رہا۔ قیصر صاحب نے لگی لپٹی رکھے بغیر سب کچھ کہہ دیا ہے بچپن کی بے راہ روی بھی جوانی کی بھوک پیاس بھی۔

انگلستان میں ان کی ساری زندگی صحافت کی گلیوں میں گذری۔ مفصلات کے پرچے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیتے رہے۔ قلم میں زور تھا اس لئے روزی کمانے کی فکر سے آزاد ہو گئے اور کھانے پینے کا سامان بھی وافر میسر آ گیا۔ قسمت ان کا اس حد تک ساتھ دیتی رہی کہ ایک جگہ سے ملازمت کو خیر باد کہتے دوسری جگہ ملازمت مل جاتی۔ کچھ برس مشہور زمانہ اخبار دی ٹائمز میں بھی گذرے۔

صحافت میں آگے بڑھنے اور بڑے اخباروں میں کام کرنے کا شوق تھا اس لئے جہاں مناسب اشتہار نظر آتا درخواست داغ دیتے۔ ٹائمز میں انٹرویو کے لئے بلائے گئے تو انہوں نے ان کو ان کے نام کے ہجوں یعنی KAISER TAMKIN سے کوئی سفید فام انگریز "کائزر ٹامکن" جانا۔ جب ایک کالا انٹرویو کے لئے پہنچا تو اول تو دربان نے روک دیا پھر ایڈیٹر صاحب نے بڑی رکھائی سے انہیں صاف جواب دے دیا۔

قیصر تمکین کی خودنوشت کی زبان صحافیانہ کیا منشیانہ زبان ہے۔ ادبی چاشنی بھی کوئی نہیں مگر ان کی زندگی کے واقعات دلچسپ ہیں اور یہی دلچسپی قاری کے لئے کافی ہے۔ غربت سے ابھر کر غیر معاشرہ میں اپنا مقام بنانا ہر ایک کے بس میں نہیں ہوتا۔ قیصر تمکین کی خودنوشت ایک صاحبِ عزم صحافی کی داستان حیات ہے اردو میں ان کا نام ان کے افسانوں کی وجہ سے جانا جاتا ہے ایک حد تک ان کی خود نوشت بھی ان کے اردو کے کام میں وقعت کی نظر سے دیکھی جائے گی۔

◎

داستانِ غدر

''داستانِ غدر'' راقم الدولہ سید ظہیر الدین ظہیر دہلوی، شاگرد ذوق، داروغہ ماہی مراتب بہادر شاہ ظفر کی خودنوشت سوانح حیات ہے اور غالباً اردو کی پہلی پہلی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ انیسویں صدی میں تین خودنوشتیں چھپیں، عبدالغفور نساخ کی خودنوشت، مولانا جعفر تھانیسری کی خودنوشت کالا پانی اور ظہیر دہلوی کی داستانِ غدر۔ زمانی لحاظ سے ظہیر دہلوی کی داستانِ غدر کو تقدیم حاصل ہے کیونکہ اس میں ۱۸۵۷ء کے چشم دید حالات بیان ہوئے ہیں اور ظہیر نے ان کو اپنی آنکھوں کے سامنے رونما ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کتاب کو کوئی پچاس برس قبل آغا محمد طاہر نبیرہ ء آزاد نے چھاپا تھا اس وقت تک مولانا جعفر تھانیسری کی کالا پانی چھپ چکی تھی اس لئے اسے ہی اردو کی پہلی خودنوشت سوانح حیات قرار دیا جاتا تھا پھر ظہیر دہلوی کی کتاب چھپی اور عبدالغفور نساخ کی خودنوشت تو کہیں آٹھویں دہائی میں جاکر چھپی ہے۔

اس کتاب کے بارہ میں استاذی المحترم ڈاکٹر سید عبداللہ کا قول ہے کہ ''ظہیر دہلوی کی داستانِ غدر کو ان کی خودنوشت قرار دیا جاسکتا ہے'' حالانکہ حقیقت میں یہ ان کی خودنوشت سوانح حیات ہی ہے داستانِ غدر کا عنوان تو آغا محمد طاہر نے تجویز کیا تھا اب مکی پبلشرز نے اس کا نام سرے سے تبدیل کر کے ۱۸۵۷ء کے چشم دید حالات رکھ دیا ہے مگر عنوانات کے تبدیل ہو جانے کے باوجود اس کی خود نوشت سوانح حیات ہونے کی بنیادی حیثیت قائم ہے۔

راقم الدولہ سید ظہیر دہلوی نے اپنے خاندانی حالات اور بہادر شاہ ظفر کے دربار سے اپنے توسل کے حالات بڑی تفصیل سے لکھے ہیں۔ اپنے استاد ذوق کا ذکر کیا ہے غالب کا ذکر ہے دربار کے دوسرے متوسلین خاص طور سے حکیم احسن اللہ خان کے اقتدار کا ذکر ہے۔ جب تلنگوں نے بادشاہ کو گھیرے میں لے کر ان سے استمداد کیا ہے اس وقت بھی یہ بادشاہ کے مواجہ میں حاضر تھے۔ غرض یہ خود

نوشت غدر دہلی کی مستند تاریخ ہے اسی لئے اسے خودنوشت کے زمرہ سے اٹھا کر تاریخ کے زمرہ میں شمار کرلیا گیا ہے۔

دربار کیساتھ دلی وابستگی کا ایک اور مظاہرہ یوں ہوا ہے کہ ان کے چھوٹے بھائی کا تخلص سید ہونے کے باوجود امراؤ مرزا تھا خود انہوں نے اپنے بیٹے کا نام سجاد مرزا رکھا۔ دو شعر اس کتاب میں ایسے ہیں جو مشہور عالم ہیں ایک ان کے چھوٹے بھائی امراؤ مرزا کا ہے کہ ''نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے۔ پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے''۔ دوسرا شعر خود ان کا ہے کہ ''چاہت کا تب مزا ہے کہ دونوں ہوں بیقرار۔ دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی''۔ یہ ذوق کی زمین ہے چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔

دہلی سے بے گھر ہوئے تو پھر انہیں واپس دہلی آکر بسنا نصیب نہ ہوا۔ مکان جائیداد مہاجن کے مقدمہ کی نذر ہوگئی۔ شہر سے پریشان حالی میں نکلے تو پانی پت میں مخبر سمجھ کر دھر لئے گئے قریب تھا کہ توپ دم کردئے جاتے کہ ان کا کوئی جاننے والا آ گیا اس نے ان کی جان بچائی کہ یہ تو بادشاہ کے قدیمی نمک خوار ہیں۔ غریب الوطنی کا زمانہ جے پور اور ٹونک میں ملازمت میں گذرا۔ زندگی کے اواخر میں داغ دہلوی کے تتبع میں حیدرآباد کا سفر اختیار کیا لیکن سخت ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ مایوس ہوکر لوٹے اور حیدرآباد کی ناقدر دانی کے نوحہ کناں رہے۔

اس خودنوشت کی زبان دہلی کی ٹھیٹھ زبان ہے مگر روزمرہ کی زبان نہیں اس لئے پڑھنے میں ذرا سی دقت ہوتی ہے۔ کچھ پبلشر نے کسی ان پڑھ کاتب سے لکھوا کر رہی سہی کسر پوری کردی ہے۔ بایں ہمہ اس کتاب کی تاریخی اہمیت اپنی جگہ قائم رہے گی۔

دلی یاد آتی ہے

''دلی یاد آتی ہے'' محترمہ روح افزا حیدر کی دلی کی یادوں پر مشتمل ہے۔ اس کو ان کی مکمل خود نوشت سوانح حیات قرار نہیں دیا جاسکتا مگر ان کی زندگی کے دیگر ادوار کا ذکر بھی جہاں تہاں آجاتا ہے۔ ان کے میاں جناب سجاد حیدر برٹش آرمی سے فارن سروس میں منتقل ہوئے اور اتفاق سے یہ وہ گروپ تھا جسے پاکستان کی فارن سروس کا پیش رو بننا تھا۔ ان کی پہلی پوسٹنگ ہی دہلی میں ہوئی۔ روح افزا حیدر اپنے ننھے منے بیٹے کے ساتھ میاں کے پاس پہنچ گئیں اور اس طرح دلی کے ساتھ ان کی وابستگی کا آغاز ہوا۔ تقسیم ملک کے بعد تو ان کی لاہور امرتسر کی سہیلیاں دہلی میں جمع ہوگئیں اس لئے ان کے لئے دہلی کی اجنبیت اجنبیت نہ رہی انہیں وہ شہر بھی اپنا گھر ہی محسوس ہونے لگا۔ پھر ان کے میاں اس نازک دور میں دہلی میں پاکستان کے ہائی کمشنر تھے جب بنگلہ دیش بن رہا تھا فارن سروس کے لوگ دھڑا دھڑ پاکستان کے ساتھ اپنی وفاداریاں توڑ کر نئے ملک کے ساتھ اپنی وفاداریاں قائم کررہے تھے چنانچہ ان کے ہائی کمشن کے سینئر افسر بھی اس زد میں آئے اور ہائی کمشنر کو بڑی خفت اٹھانا پڑی۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد چودہ ماہ کے جبری قیام کے بعد واپس پاکستان آنا نصیب ہوا۔

مسز روح افزا حیدر کی زبان نہایت صاف ستھری با محاورہ اور شستہ زبان ہے۔ جگہ جگہ غالب اقبال اور فیض کے اشعار کے برمحل حوالے ہیں۔ اپنی دوستوں کا ذکر ہے، لاہور میں اپنے کالج کے زمانہ کی سرگرمیوں کا بیان ہے غرض یہ کتاب واقعی ''سوادِ رومتہ الکبریٰ میں دلی یاد آتی ہے'' کی تصویر بن جاتی ہے جا بجا مناسب تصاویر بھی موجود ہیں۔

ہاں ایک واقعہ جس کا ذکر سر فیروز خان نون وزیراعظم پاکستان نے اپنی انگریزی خودنوشت From Memory میں کیا ہے اس کی چشم دید گواہی روح افزا حیدر کے ہاں مل گئی ہے۔ جب سر فیروز پاکستان کے وزیراعظم کی حیثیت سے انڈیا کے سرکاری دورہ پر گئے اس وقت سجاد حیدر صاحب

ہائی کمشنر تھے۔ ہوائی اڈہ پر پنڈت نہرو اپنے ہمسایہ ملک کے وزیر اعظم کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ جب ہوائی جہاز رکا دروازہ کھلا تو سب سے پہلے مسز وقار النسا نون سامنے آئیں۔ جب وہ سیڑھیاں اتر رہی تھیں ان کے پاؤں میں سے چپل پھسلا اور سیدھا پنڈت نہرو کے پاؤں میں آ کر رکا۔ مسز نون خفت اور شرمندگی سے ننگے پاؤں ہی نیچے آئیں۔ جونہی نیچے پہنچیں پنڈت نہرو نے جھک کر ان کا چپل اٹھایا اور ان کے سامنے سیدھا کر کے رکھ دیا۔ یہ ان کی بڑائی تھی۔ وہ اپنے کسی اے ڈی سی سے بھی یہ کام کرنے کو کہہ سکتے تھے مگر واہ رے ہماری پرانی ثقافت کی وضع داری۔ سر فیروز نے اپنی خود نوشت میں اس واقعہ کا ذکر کے پنڈت جی کی اخلاقی بڑائی کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ روح افزا حیدر نے بھی اس واقعہ پر بڑی خوشنودی کا اظہار کیا ہے۔

روح افزا حیدر کی کتاب کا اس سے زیادہ مناسب اور موزوں نام نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کتاب کو پڑھ کر ان لوگوں کو واقعی دلی یاد آتی ہے جنہوں نے بھلے وقتوں میں دلی کو دیکھ رکھا ہے۔ دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے۔ جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی۔

◎

میرا کوئی ماضی نہیں

دلی ہی کی خاک سے پیدا ہونے والی آل انڈیا ریڈیو کے دور کی ایک ''نورس کلی'' سحاب قزلباش کی یادوں کی کتاب ''میرا کوئی ماضی نہیں'' چھپی ہے۔ آغا شاعر قزلباش کی بیٹی اور آغا سرخوش قزلباش کی بہن کا یہ کہنا کہ میرا کوئی ماضی نہیں بانگ دہل اس بات کا اعلان ہے کہ میرا ماضی ماضی نہیں تھا اب بھی میرے حال کی طرح میرے ساتھ ہے اور میرے مستقبل کی طرح میرے ساتھ رہے گا۔ یہ کتاب احوال الرجال کے پیرایہء بیان میں ہونے کے باوجود سحاب قزلباش کی خودنوشت سوانح عمری نہیں بلکہ بعض یادوں کی بازآفرینی کی ایک کوشش ہے۔ اس کتاب میں بزرگوں اور دوستوں کے خاکہ نما مضامین ہیں۔ ''جوش چا'' تو فقط ایک ملاقات کے احوال پر مشتمل ہے جو جوش صاحب کے آخری دنوں میں مصنفہ کو نصیب ہوئی ورنہ عمر بھر جوش صاحب کے ساتھ بزرگی اور خوردی کا تعلق نبھانے کے باوجود اس مضمون میں جوش صاحب کی شخصیت کے ساتھ کسی خوردانہ بے تکلفی کا سراغ نہیں ملتا۔ جوش صاحب آغا شاعر کو اپنے اچھے دوستوں میں شمار کرتے تھے مگر ان کی ''کمسن'' بیٹی کا یوں مشاعروں میں شریک ہونا اور ترنم سے کلام سنانا انہیں بہت کھلتا تھا۔ جب بھی ملتے سحاب کے سر پر بزرگوں کی طرح ہاتھ رکھتے۔ مگر اخلاق احمد دہلوی کے کہنے کے مطابق ایک مشاعرہ میں سحاب قزلباش کی باری آئی تو جوش صاحب اٹھ کر باہر چلے گئے۔ ''جب ان سے پوچھا گیا کہ یہ آپ نے کیا کیا؟ تو کہا کہ بھائی ہم روحوں کے قائل نہیں۔ اگر مرنے کے بعد یہ بات غلط ثابت ہوئی تو کیا آغا شاعر قزلباش کی روح ہم سے یہ نہیں پوچھے گی کہ ہماری بیٹی مجرا کر رہی تھی اور آپ وہاں بیٹھے ہوئے تھے''۔ (''میرا بیان'' صفحہ ۱۶۴)۔ مگر سحاب قزلباش نے جوش صاحب کی بزرگی کا پورا لحاظ رکھ کر آخری ملاقات کو صفحہء قرطاس پر منتقل کیا ہے۔

ن۔م۔ راشد والا مضمون تو ان کے جلا دینے کے خلاف ایک نوحہ ہے جس میں سحاب نے

راشد صاحب کی بیگم کے ساتھ ساتھ ان کے بیٹے شہریار اور لندن کے شاعروں کے سرخیل ساقی فاروقی اور عبداللہ حسین تک کو معاف نہیں کیا۔ حالانکہ ساقی فاروقی نے اپنے وضاحت نامہ میں راشد صاحب کی وصیت اور شہریار کی جانب سے اس کی ایک حد تک تصدیق کا جواز پیش کیا تھا۔ راشد صاحب نے حمید نسیم کے قول کے مطابق سحر کو ''نورس کلی'' کہا تھا اور اپنی نظم میں اس کے طعنہ کو موضوع بنایا تھا۔ آل انڈیا ریڈیو کے زمانہ کے وہ تعلقات اس خاکے کا محرک ہوئے ہیں۔ اس خاکہ میں سحاب اور راشد صاحب کی ''محکمانہ دل لگی'' کا ذکر بھی ساتھ ساتھ چلتا ہے۔

چھوٹے بخاری یعنی ذوالفقار علی بخاری کا خاکہ تو اس شخص کی بے پناہ صلاحیتوں کو شاندار خراج تحسین کا حکم رکھتا ہے۔ باتیں وہی گھسی پٹی جن کا تذکرہ بہتیروں نے کیا ہے۔ استاد بندو خان سے معافی مانگنے والے واقعہ میں اتنا اضافہ نیا ہے کہ اس موٹر میں سحاب بھی سفر کرنے کی امیدوار تھیں۔

ابنِ انشاوالا خاکہ تو ان کی آخری علالت اور لندن میں ان کے قیام کا احوال ہے۔ البتہ نخشب جارچوی والے خاکہ میں کچھ جذباتی وابستگی کا سراغ ملتا ہے اور یہی خاکہ ان کا اس کتاب کا سب سے کامیاب خاکہ ہے۔ جمیلہ ہاشمی کے ناول ''چہرہ بہ چہرہ'' پر جو مضمون کہیں کبھی سحاب نے لکھا اور پڑھا ہوگا اسے اس خاکوں کی کتاب میں شامل کر دیا ہے اور یہ مضمون مخمل میں ٹاٹ کا پیوند بن کر رہ گیا ہے۔

ان تمام باتوں کا تذکرہ اس لئے ضروری ہوگیا کہ بہت سے دوستوں نے کہا کہ سحاب قزلباش کی خودنوشت ''میرا کوئی ماضی نہیں'' دیکھے بغیر خودنوشتوں والے مطالعے کو مکمل نہ سمجھنا۔ دیکھا تو یہ کتاب خودنوشت سوانح عمری نہ نکلی محض ماضی کی چند شخصیتوں سے وابستگی کا بیان نامہ نکلی اور خودنوشت احوال الرجال ہونے کے باوجود اتنی محدود نہیں ہوتی کہ بعض شخصیات کے بیان کو لکھنے والے کی خودنوشت مان لیا جائے۔

◎

چہرے

سحاب کی خاکوں کی دوسری کتاب ''چہرے'' ۲۰۰۲ میں کراچی سے چھپی تھی۔ اس میں بھی بعض خاکے شامل ہیں لیکن سب سے ممتاز خاکہ ممتاز حسن کا ہے کیونکہ وہ ایک لحاظ سے سحاب کے لئے ''فادر فگر'' کا حکم رکھتے تھے۔ قرۃ العین حیدر کے خاکہ میں ذاتی وابستگی کا تصور ملتا ہے۔ ساحر کے خاکہ میں جو جذباتی عنصر ہے اسکو سحاب نے بچپن سے ادھیڑ عمر تک کی جذباتی وابستگی کا آئینہ دار بنا دیا ہے۔

نخشب کے خاکہ میں محبت کی جو آنچ سلگتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اس کی جھلک اس خاکہ میں بھی ہے مگر وہ آگ سلگتی ہے بھڑکتی نہیں۔ اگر سحاب انہی خاکوں کو بنیاد بنا کر اپنی خودنوشت لکھنا چاہیں گی تو انہیں ان خاکوں کو دوبارہ لکھنا پڑے گا تا کہ ان میں سحاب کا ذاتی لمس محسوس ہونے لگے۔

◎

میرا بیان

اخلاق احمد دہلوی کی خودنوشت ''یادوں کا سفر'' تلاشِ بسیار کے باوجود دستیاب نہ ہوئی۔ یادوں کی بازآفرینی کے سلسلہ میں ان کی تین کتابیں موجود ہیں۔ ''اور پھر بیاں اپنا''، ''پھروہی بیاں اپنا'' اور ''میرا بیان''۔ ان کتابوں کے وجود میں آنے کی وجہ خود اخلاق صاحب کے نزدیک یہ ہے کہ یادوں کے سفر کا مسودہ مکتبہ عالیہ کے جمیل النبی صاحب سے گم ہوگیا ہے مگر وہ بوجوہ اس کا اعتراف نہیں کرتے اس لئے یکے بعد دیگرے اپنی مختلف یادوں کو انہوں نے صفحہ قرطاس پر منتقل کر دیا۔ کیونکہ بقول ان کے ان کا حافظہ بھی جوش صاحب کے لفظوں میں دروغ گو والا ہوتا جارہا تھا۔ ان میں سے بھی صرف ''میرا بیان'' میرے سامنے ہے۔ یہ کتاب اخلاق صاحب کی ریڈیو کی وابستگی کی داستان ہے اور ایک لحاظ سے آل انڈیا ریڈیو اور پھر ریڈیو پاکستان کی نشری تاریخ۔ بعض باتیں جو شاید کہیں اور نہ ملیں انہیں اخلاق صاحب نے ریکارڈ کر دیا ہے۔ مثلاً آل انڈیا ریڈیو سے پہلے یوم آزادی ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جو مشاعرہ ہوا اور جس میں جوش جگر اور حفیظ جالندھری سب ہی شریک ہوئے۔ اس میں اس وقت کے وزیر اطلاعات پٹیل صاحب موجود تھے۔ ''خوش بس پٹیل صاحب ابوالاثر حفیظ جالندھری صاحب کے کلام سے ہوئے۔ اسرار الحق مجاز اور جاں نثار اختر کی نظمیں انہیں سمجھ ہی میں نہ آئیں۔ اور میں نے جب حفیظ جالندھری سے پوچھا کہ حضور آپ کو تو پاکستان میں ہونا چاہئے تھا تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے اپنا کلام وہاں پر ریکارڈ کرا کے بھیج دیا ہے'' (میرا بیان صفحہ ۱۱۰)۔ جب وہاں دال نہ گلی تو حفیظ صاحب بادلِ ناخواستہ مہاجر بن کر پاکستان آگئے اور مہاجرت کے فوائد سے بھرپور تمتع حاصل کیا ماڈل ٹاؤن لاہور میں ایک چھوڑ دو دو کوٹھیوں کے الاٹی بنے۔ ثابت قدمی تو جگر نے دکھائی کہ مرتے مر گئے مگر ترکِ وطن کا ارادہ نہ کیا۔ مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو۔

دوسرا واقعہ مولانا صلاح الدین احمد کی جرات مندی کا ہے۔ ''ڈاکٹر خان صاحب کی تقریر ہونی

تھی۔ ون یونٹ کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے۔ اور ڈاکٹر خان صاحب کی اس تقریر کا اناؤنسمنٹ خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر بخاری صاحب (ڈائریکٹر جنرل) نے دیا تھا۔ لیکن وہ تقریر بوجوہ نہ ہو سکی کیونکہ 'ادبی دنیا'' کے ایڈیٹر مولانا صلاح الدین احمد جنہیں یہ تقریر ڈاکٹر خان صاحب کے لئے لکھنی تھی انہوں نے یہ معرضِ تحریر میں لانے سے انکار کر دیا تھا'' (میرا بیان صفحہ ۱۶۲)۔ کیا زمانہ تھا اور کیا لوگ تھے۔ مولانا کے ہاتھ قلم ہوئے نہ اہلِ اقتدار کی آن بان پر کوئی حرف آیا۔ اب تو وہ وقت آگیا ہے کہ ''ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ قلم نکلے'' اہلِ اقتدار کو لکھنے والوں کی کیا کمی؟ ضمیر فروش بھی بہت مافی الضمیر فروش ان سے بھی زیادہ!

اخلاق احمد دہلوی کی اس کتاب میں دہلی کے نامور حکماء شعرا اور علماء کا ذکر از کار مذکور ہے۔ زبان دہلی والے اخلاق احمد کی ہو اور ذکر دہلی والوں اور ریڈیو والوں کا ہو تو ''پھر دیکھئے اندازِ گل افشانیءِ گفتار''۔ سوائے قمر یورش یزدانی جالندھری اور قمر اجنالوی والے مضمونوں کے باقی ساری یادیں دہلیءمرحوم کی ہیں یا ریڈیو کے وابستگان کی ہیں۔ جوش صاحب کے ساتھ ان کی وابستگی بھی ریڈیو کے حوالہ سے زیادہ ہے یہ علیحدہ بات ہے کہ اخلاق احمد دہلوی ان کی شاعری کو زمانہ مستقبل کی شاعری سمجھتے ہیں جسے سمجھنے پر کھنے والی نسل کہیں بعد میں جا کر پیدا ہوگی۔ جوش صاحب کا اپنا بھی یہی خیال تھا ''سوسال بعد آئے گی جس کی زمیں پہ فصل۔ میں بدنصیب وہ ثمرِ نورسیدہ ہوں''۔

میری کہانی

ہندوستان سے ۱۹۹۹ء میں دہلی سے اویس احمد دوراں کی خودنوشت ''میری کہانی'' چھپی، اویس صاحب بہار کے علاقہ کے شاعر ہیں پٹنہ یونیورسٹی کے پروفیسر اختر اورینوی نے کسی موقعہ پر ان کو بہار کا نمائندہ شاعر قرار دیا تھا۔ ان کی خودنوشت بے رنگ پھیکی سیٹھی اور عام سی خودنوشت ہے جس کے بارہ میں مصنف نے کہا کہ ''میری خودنوشت کے بارہ میں فراق نے کہا ہے کہ دوراں اس لحاظ سے مجھ سے بڑھ گیا کہ جو میں نہ لکھ سکا وہ دوراں نے لکھ دیا''۔ اس اجمال کی تفصیل صرف اتنی ہے کہ دوراں نے اپنی بیوی کی بدصورتی بدسیرتی اور پھوہڑ پن کا بے رحمانہ انداز میں تذکرہ کیا ہے اور فراق صاحب سے داد وصول کی ہے کہ فراق صاحب قلم کے ذریعہ اپنی شریک حیات کا خاکہ نہ اڑا سکے دوراں نے کسر پوری کردی۔

اس خودنوشت میں سب سے دردناک وہ حصہ ہے جہاں یہ پروفیسر اختر اورینوی کے مرض الموت کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ اختر صاحب کے بھائی نے ان سے کہا بھی کہ آپ ان سے اس حالت میں نہیں مل سکتے مگر یہ اڑ گئے کہ میں انہیں ملے بغیر نہیں جاؤں گا حالانکہ لوگ ایسے موقعوں پر مروتاً اور اخلاقاً پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ دوراں صاحب کی خودنوشت ان کی ہٹ دھرمی اور ضد کے واقعات سے بھری پڑی ہے اور ان کے مرتبہ کے شخص سے اس سے زیادہ کی توقع رکھنا ہی فضول وبے جا ہے۔

◎

مشتِ غبار

''مشتِ غبار'' چوہدری اقبال احمد گوندل کی خودنوشت ہے جسے جنگ پبلشرز نے ۱۹۹۳ء میں لاہور سے شائع کیا تھا۔ گوندل صاحب کوہستانِ نمک کے بے آب وگیاہ علاقہ سے اٹھ کر تلاشِ روزگار میں سنگاپور پہنچے، محنت مزدوری کرتے اور رشتۂ جاں کو برقرار رکھتے رہے۔ ہوٹلوں میں کام کیا بوٹ پالش کئے مگر کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہ کیا۔ جنگِ عظیم میں انگریزوں کی ہزیمت کے بعد آئی این اے میں شامل ہوگئے، جاپان سے آئی این اے کی نشریات کے کام میں منہمک رہے۔ جنگ کے خاتمہ پر واپس ہندوستان آئے۔ اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر انڈونیشیا کی جنگ آزادی کے بارہ میں انگریزی میں کتاب لکھی جو پاکستان کے قیام کے بعد ان کے انفرمیشن سروس سے منسلک ہونے کا باعث بنی۔ فارن سروس کی انفرمیشن برانچ میں چنے گئے، انڈونیشیا میں تقرر ہوا۔ باقی عمر ڈپلومیٹک حیثیت میں گذری۔ انڈونیشیا، ٹوکیو بیروت اور پیرس میں رہے۔ حکومت پاکستان کے پرنسپل انفرمیشن افسر کے عہدہ سے ریٹائر ہو کر اپنے آبائی وطن میں آ، آباد ہوئے۔ اس خودنوشت کے آخری ابواب ان کی ان کوششوں کے بیان پر مشتمل ہیں جو انہوں نے اس بارانی علاقہ کی بہبودی کے لئے سرانجام دیں۔

لکھنے پڑھنے کا شوق تھا مگر حالات نے میٹرک سے زیادہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہ دیا۔ بیروت میں تھے تو اپنا انگریزی ناول ''راکھ اور انگارے'' فیض کے سامنے لا ڈالا کہ ملاحظہ فرمایئے۔ فیض صاحب نے کمال کی بات کہی فرمایا ''آپ نے facts اور fiction کا قیمہ بناتے وقت تکنیکی لاعلمی کی ہڈیوں کا چورہ بھی ملا ڈالا۔ بھائی فکشن اور وہ بھی اس ملک اور قوم کی زبان میں جسے آپ نے دیکھا تک نہیں جس کے کلچر اور جذبات سے آپ بالکل بے بہرہ ہیں۔ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ضرور ہے اردو میں لکھو جو آپ کی قومی زبان ہے ورنہ پنجابی میں لکھو جو آپ کی مادری زبان ہے'' (صفحہ ۱۴) ان کی خودنوشت بھی تکنیکی ہڈیوں کے ''چورہ'' سے بھری پڑی ہے۔ زبان زبانِ غیر کی طرح،

واقعات میں تکرار، کتابت کی یا صاحب کتاب کی عدم واقفیت کی وجہ سے بہت سی غلطیوں کا مجموعہ۔ مثلاً کچھ نہیں تو دس جگہ آپ نے ''منقار'' کھولنے کا محاورہ استعمال کیا اور ہر جگہ منقار کش والے کاف سے کھولی ہے یعنی منکار لکھا ہے۔ جنگ پبلشرز والے عام طور سے ایسی کتابت کی غلطیاں روا نہیں رکھتے۔ کتابت اتنی باریک کہ پڑھنے والا زچ آجائے۔ خدا معلوم آپ ہماری اس تنقید کو برداشت کر پائیں گے یا نہیں کیونکہ خود کہتے ہیں ''انسان ہر صعوبت کا سامنا کر لیتا ہے کڑی سے کڑی آزمائش سے گذر جاتا ہے لیکن طنز و تنقید کی کاٹ برداشت نہیں کر سکتا'' (صفحہ ۱۲) خالد حسن کو جب آپ نے چارج دیا تو ''ذہن کی الجھنوں سے ایک گھسا پٹا شعر اچھل پڑا۔ اڑ گئی بلبل یہ کہہ کر شاخ سے۔ جائے بھاڑ میں یہ سامانِ بہار''۔ (صفحہ ۲۵۸) خدا معلوم اس شعر کا دوسرا مصرعہ کس بحر میں ہے؟ اس قسم کے تکنیکی ''چورے'' اس کتاب میں بہت ہیں۔

◎

پسِ پس نوشت

دل بھٹکے گا

''دل بھٹکے گا'' ناول کے مہین پردہ میں لکھی ہوئی احمد بشیر کی سرگزشت ہے۔ وہ ایمن آباد میں پیدا ہوئے، سرینگر میں تعلیم پائی۔ ساری عمر ریڈیو' تعلقات عامہ' اخبارات' فلم سازی میں بسر ہوئی۔ صحافت میں انہیں چراغ حسن حسرت جیسے کہنہ مشق صحافی کی سرپرستی اور ان کا ''میاں غنچہ'' ہونے کی سعادت میسر رہی (صفحہ ۴۰۲)۔ ابو الاثر حفیظ جالندھری کی ''ولیج ایڈ'' کی پناہ میں بھی رہے۔ امریکہ میں فلم سازی کی تربیت حاصل کی۔ ناکام فلم سازی کی وجہ سے بہت صعوبتیں اٹھائیں۔ بائیں بازو کی صحافت میں ثابت قدمی دکھائی مگر بہت خوار ہوئے۔ امروز سے جو کچھ سیکھا مساوات میں ان کے کام نہ آیا۔ مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ نے نوازی۔ اپنی ناکام زندگی کا سارا الزام انہوں نے اپنے ''جینیٹک کوڈ'' پر دھرا ہے مگر اپنی ناکامیوں پر انہیں کوئی پشیمانی بھی نہیں۔ ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنم پر ان کا پختہ ایمان ہے۔ تقریباً ۸۹۰ صفحات کی اس طویل سرگزشت میں بیسویں صدی کی سیاسی اور سماجی اتھل پتھل کی کہانی بڑی چابک دستی سے بیان ہوئی ہے۔ تحریکِ پاکستان کے عوامل' ۱۹۴۷ کا قیامت خیز قتلِ عام' قیام پاکستان کے بعد بنیاد پرستوں کی اسے اسلامی ریاست بنانے کی سازشیں' کمیونزم اور سوشلزم کی باتیں' قیام پاکستان کے ابتدائی دور سے لے کر مشرقی پاکستان کی علیحدگی تک کے سیاسی حالات' بھٹو کی سوشلزم کی ناکامی اور پھر ضیاء الحق کے دور کا لمبا ابتلا۔ احمد بشیر نے یہ سب کچھ بڑی خوبی سے کہہ دیا ہے۔ پڑھنے والے کی دلچسپی بھی بدستور قائم رہتی ہے مگر احمد بشیر کے نام کے ساتھ جس بے خوفی اور برملا گوئی کا تصور وابستہ ہے وہ سامنے نہیں آتی۔ دراصل اس سرگزشت سے پہلے احمد بشیر نے اپنے سوانحی ارادوں کا اظہار اپنی خاکوں کی کتاب ''جو ملے تھے راستے میں'' کیا تھا اس سے یہ امید بندھی تھی کہ وہ جس بے خوفی اور ظالمانہ صاف گوئی سے اپنے دوستوں یاروں عزیزوں کے بارہ میں لکھ رہے ہیں ان کی اپنی خودنوشت اس اسلوب کا معرکہ کا نمونہ ہوگی مگر ایک تو یہ سرگزشت ''سرگزشتِ اسیرِ انا''

نکلی تس پر ''رخِ زیبا پر'' افسانوی ادب کا پردہ تنا ہوا املا۔ ''جمال'' کے پردہ میں ''قیس تصویر کے پردہ میں بھی عریاں'' ''نہیں'' ''نکلا''۔ دونوں باتیں احمد بشیر کے قاری کے لئے غیر متوقع تھیں اور اس لئے ردعمل بھی غیر متوقع ہے۔

احمد بشیر کو اچھوں کو اچھا کہنا بھی آتا ہے اور اچھوں کو برا کہنا بھی اس لئے اچھے اچھے اس سے خوف زدہ رہتے ہیں اور یہی کہتے ہیں نہ اس کی دوستی اچھی نہ اس کی دشمنی اچھی۔ اس نے صنفِ نازک کو کبھی نازک نہیں سمجھا اس لئے انہیں کسی رو رعایت کا مستحق نہیں گردانا۔ اس کے بے باک قلم نے دوستوں کی بیویوں تک کو اپنی بے رحم صاف گوئی سے مجروح کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کیا اور ایسے بہت سارے کارنامے اس نے بہانگِ دہل ڈنکے کی چوٹ انجام دئے اور کبھی کوئی شرمندگی محسوس نہیں کی۔ صحافت میں بھی اس کے نظریاتی بندھن کبھی اس کی صحافت میں حائل نہیں ہوئے۔ اس نے زہر ہلاہل کو کبھی قند نہ کہا مگر قند کو زہر ہلاہل کہنے کا حوصلہ اس میں ہمیشہ رہا۔ اب اس کی خودنوشت کا چرچا ہوا تو لوگ منتظر تھے کہ دیکھیں یہ بے باک شخص اپنا حساب کیسے بے باق کرتا ہے؟ مگر حیف کہ اس نے اپنی مردانگی کا ثبوت دینے اور کھلے دل سے اپنی سرگزشت عام کرنے کی بجائے ''ناول'' کا گھونگھٹ نکال لیا بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست! اس کی مثال احمد بشیر کی ڈکشن میں یہی دی جاسکتی ہے کہ احمد بشیر نے اپنی عمر دوسروں کے لنگر لنگوٹ کھول کر انہیں عریاں کرنے میں صرف کردی مگر اب اس نے اپنا لنگوٹ کھولا ہے تو لوگوں نے دیکھا ہے کہ اس نے اپنے ننگ پر افسانوی ادب کا مہین پردہ ڈال رکھا ہے۔

پنجاب کے صحافتی بڑوں میں عبدالمجید سالک کا نام نامی بہت نمایاں ہے مگر احمد بشیر نے ان سے انصاف نہیں کیا اور اپنے بغض کا اظہار کرنے کے لئے سالک صاحب کو سازشی اور نہ جانے کیا کیا کہہ گذرا ہے ''ملک عبدالمجید مولانا چراغ حسن حسرت کے نہایت محترم دوست تھے وہ صحافت میں ان سے سینئر تھے اور ان کا کمال یہ تھا کہ صحافت میں مزاحیہ کالم کی ابتدا انہوں نے کی تھی اس لئے مولانا ان کا از حد احترام کرتے تھے۔۔۔ ملک عبدالمجید کا لاہور کے ادیبوں شاعروں پر بڑا اثر تھا راج دربار میں بھی ان کی بڑی آؤ بھگت ہوتی تھی وہ مشرقی علوم میں کسی قدر دسترس رکھتے تھے مگر کوئی گہری بات ان

سے کبھی سرزد نہ ہوئی۔۔۔ملک عبدالمجید صحافت سے ریٹائر ہو چکے تھے اور گذارے کے لئے حکومت کے خفیہ فنڈ پر بھروسہ رکھتے تھے۔۔پنجاب کے گورنر سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی اور افسر بھی ان کی بات مان لیتے تھے۔۔۔شروع شروع میں تو کسی نے خیال نہ کیا مگر آہستہ آہستہ جمال کو شبہ ہوا کہ ملک عبدالمجید کسی خفیہ مشن پر ہیں اور وہ مشن ہے اخبار کا خاتمہ۔۔۔پنجاب کے گورنر نے ملک عبدالمجید کو جاسوس مقرر کر رکھا تھا اور ان کے ذریعہ وہ مولانا کو غلط سلط پیغامات دیتے تھے'' (صفحہ ۴۵۰)۔

ان کی یہ بے تکی اور طفلانہ باتیں نقل کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ احمد بشیر کی دیدہ دلیری واضح کی جائے۔اپنے مرشد کے ایک محترم دوست اور قابلِ احترام سینئر صحافی ساتھی جس کی لیاقت کی سارے جہان میں دھوم تھی، یہ سارے الزام انہوں نے محض اپنے ''شبہ'' کی وجہ سے لگائے ہیں۔امروز کا بند ہونا کسی کی سازش کی وجہ سے نہیں تھا خود ان لوگوں کی وجہ سے تھا جن کے باب میں احمد بشیر کا کہنا ہے کہ ''اخبار میں جمال کے (یعنی احمد بشیر) کے علاوہ سب اہلِ زبان ہیں یا سفارشی'' (صفحہ ۴۲۷)۔ سالک صاحب کی علمی قابلیت پر احمد بشیر جیسے ''مبتدی'' کا محاکمہ کہ ان سے کوئی گہری بات سرزد نہ ہوئی خود کہنے والے کی اتھلی طبیعت کی گواہی دیتا ہے۔سالک صاحب سے تو اقبال پر کتابیں سرزد ہوئیں، ان کی ''سرگزشت'' اور ان کے فارسی دیوان ''راہ و رسمِ منزلہا'' کی چار دانگِ عالم میں دھوم رہی مگر احمد بشیر کو کچھ بجھائی نہ دیا؟ گر نہ بیند از اں راشپرہ چشم۔چشمۂ آفتاب را چہ گناہ؟ جمال کو تو صرف یہ تکلیف ہے کہ اس کی نوکری جاتی رہی۔اس نے یہ بات کہتے ہوئے یہ نہ سوچا کہ اردو کی صحافتی تاریخ میں اس کے معتوب ملک عبدالمجید کا کیا مقام ہے؟ اور اس کا دامن کسی خفیہ فنڈ سے داغدار نہیں۔اور یہ کہ خود یہ باتیں لکھنے والے کا دامن آگے سے دریدہ ہے۔قدرت اللہ کی نوازشوں کو تو لکھنے والے نے بڑے فخر سے بیان کیا ہے۔ڈپٹی سکرٹری صاحب کی بات تو انہوں نے خود روایت کی ہے ''یہ فلمی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں انہیں قدرت اللہ صاحب نے دوستی کی بنا پر اچانک فلم ایڈوائزر مقرر کر دیا ہے۔باہر کے آدمی ہیں'' (صفحہ ۸۲۳) اور باہر کا یہ سفارشی آدمی بیسویں گریڈ کی کرسی پر بیٹھا رہا اس میں اسے کوئی خفیہ فنڈ یا اقربا پروری نظر نہ آئی؟۔تمہاری زلف میں آئی تو حسن کہلائی۔وہ تیرگی جو مرے نامۂ سیاہ میں ہے۔

اس کتاب کا سب سے دلچسپ حصہ وہ ہے جہاں ''ابوالاثر'' حفیظ جالندھری کی ''ابوالاثریوں''

کا ذکر ہے۔''انہوں نے جمال کو جاتے ہی بتا دیا کہ قائداعظم اہم سیاسی امور میں ان سے مشورہ کیا کرتے تھے''۔اور یہ کہ ''فسادات میں میرے انتالیس رشتہ دار تہِ تیغ ہوئے میری دادی رانی رحیم بی بی کی حویلی لٹی میرے رانگڑ راجپوت کے خاندانی آثار، نوادرات، منقش طمنچے، کھانڈے اور برچھے جن پر سورماؤں کے نام کندہ تھے لوٹ لئے گئے'' (صفحہ ۵۱۲) پھر بیدل صحرائی (ابنِ انشا) نے ساری بات کھول دی ''فسادات کے زمانہ میں تو وہ شملہ میں مقیم تھے۔جالندھر میں ان کا کوئی رشتہ دار تھا بھی تو بھی اس کو آنچ نہ آئی کیونکہ مشرقی پنجاب میں جالندھر واحد شہر ہے جہاں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ہی نہیں۔'' وہاں ابوالاثر کے ''بزرگوں کا ترکی ٹوپیاں دھونے کا ایک اڈا خلافت کے زمانہ سے چلا آتا تھا مگر پھر جناح کیپ کا رواج ہو گیا۔لال ٹوپی کوئی پہنتا ہی نہیں تھا ان کی مہارانی دادی کی کون سی حویلی لٹی؟ اور وہ ہاتھی گھوڑے کون لے گیا جو اس بڑھیا دھوبن کے محل کے آگے جھولتے تھے؟۔۔۔ابوالاثر نے جھوٹ بولنے میں کمال پایا ہے وہ بڑے دھڑلے سے گپ مارتے ہیں اور کبھی کبھی وہ خود اس پر یقین کر لیتے ہیں'' (صفحہ ۵۳۷) کہتے تھے انہیں پاکستان میں سوائے اردو بازار کی ایک دکان کے اور کچھ نہیں ملا؟ ''اردو بازار میں جو دکان انہیں ملی تھی وہ سامان سے بھری ہوئی تھی اور پھر لاہور میں ان کی دو کوٹھیاں پہلے سے موجود تھیں ماڈل ٹاؤن میں۔حکومت مغربی پاکستان نے ان کی تاعمر پنشن لگا دی ہے۔ان کا بینک کبھی خالی نہیں رہا۔۔۔''غرض ابوالاثر صاحب کی شخصیت کا کوئی پہلو انہوں نے تشنہ نہیں رہنے دیا۔اور یہ سب ایک محرمِ رازِ درونِ میخانہ کی باتیں ہیں۔

ممتاز مفتی سے ان کا تعارف جوانی ہی میں ہو گیا۔اس لئے بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ ان کی ساری جنسی علتوں کا سرچشمہ ممتاز مفتی کی نفسیات دانی تھی۔جیسی گندی سیتلا ویسے پوجن ہار۔جمال نے جوش صاحب کی طرح بار بار مختلف عورتوں پر رکھ کر اپنے جمالِ دلنشیں کا تذکرہ کیا ہے اور یہی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ساری عورتیں انہیں دیکھتے ہی ان پر فریفتہ ہو جاتی تھیں اور اس میں انہوں نے کسی ایک کو بھی معاف نہیں کیا بقول شخصے جس نے بھی ان کی راہ کاٹی وہ اسے اس کے ''کیفرِ بدکردار'' تک پہنچا کر رہے۔اور ان لڑکیوں کی اس خفیف الحرکتی کی توجیہات کا فریضہ ممتاز مفتی کو سونپ دیا۔ممتاز مفتی پیرِ تسمہ پا کی طرح ان کے سر پر سوار رہا۔اس کتاب میں سب سے حیرت کی بات یہ ہے

کہ اشفاق احمد کہیں نظر نہیں آتا۔ اگر وہ کہیں موجود بھی ہے تو اس پر افسانوی ادب کا اتنا دبیز پردہ ڈال دیا گیا ہے کہ وہ پہچانا نہیں جاتا۔ کرشن چندر، میرا جی، صاف نظر آتے ہیں اور انہیں احمد بشیر نے افسانوی نام نہیں دیا۔ ممتاز مفتی محض مفتی ہے اور قدرت اللہ شہاب محض قدرت اللہ ہے۔ اسی طرح چراغ حسن حسرت محض چراغ حسن ہیں۔ خدا معلوم امروز کو 'آجکل' کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ حمید اختر وحید بن گیا ہے اور سید سبط حسن محض سید حسن۔ سجاد ظہیر صرف سید صاحب بن کر سامنے آئے ہیں۔ فیض صاحب کو انہوں نے ازرہ کرم معاف کر دیا ہے۔

غرض ''دل بھٹکے گا'' احمد بشیر کی افسانوی خودنوشت ہی نہیں اس کی شخصیت کی بہت سی پرتوں کا انکشاف کرنے والی کتاب بھی ہے۔ یہ کتاب اس بات کا بین ثبوت ہے کہ دوسروں کے بارہ میں بے رحم صاف گوئی کو اپنی جینیٹک مجبوری بتانے والا جینیٹک طور پر اتنا مجبور نہیں محض اس بگڑے ہوئے بچے کی طرح ہے جو دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے اپنی صورت کو بگاڑ بگاڑ لیتا ہے۔ احمد بشیر کو تصویر بنانا نہیں آتی محض صورت بگاڑنا آتا ہے۔

◎

میری داستان

اردو کے صاحبِ طرز ادیب مرزا فرحت اللہ بیگ کی خودنوشت ''میری داستان'' ۱۹۷۰ء میں پہلی بار حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی۔ اس داستان کے بارہ میں ان کا کہنا ہے کہ یہ ''چونتیس برس کی قید بامشقت کے کچھ حالات و واقعات'' ہیں۔ تمہید میں لکھتے ہیں ''جب سے یہ دنیا قائم ہوئی ہے سب ہی کہتے آئے ہیں کہ یہ ایک جیل خانہ ہے اور کہتے بھی سچ ہیں۔ پہلے ہر آنے والا ماں کے پیٹ میں قید رہتا ہے پھر بڑے بوڑھوں کی قید میں رہتا ہے اس کے بعد مدرسہ کی قید میں رہتا ہے بعد ازاں نوکری کی قید میں رہتا ہے اور آخر چل چلا کر ہمیشہ کے لئے قبر میں قید ہو جاتا ہے۔ میں بھی سوائے اس آخری قید کے بقیہ ساری قیدیں بھگت چکا ہوں اور اب اللہ کے فضل سے اس آخری قید کا زمانہ بھی قریب آ گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ اس آخری قید کی میعاد شروع ہو جائے میں چاہتا ہوں کہ اپنی ''جنم ٹائم'' کے کچھ حالات لکھ دوں تا کہ ''داشتہ آید بکار'' ہوسکیں''۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کی یہ داستان ان کی داستانِ حیات نہیں داستانِ ملازمت ہے کیونکہ اپنے بچپن کی ''قید'' کے حالات وہ ''یادِ ایامِ عشرتِ فانی'' کے عنوان سے علیحدہ مضمون میں لکھ چکے ہیں۔ کچھ حالات و واقعات وہ مضامینِ فرحت کے مختلف حصوں میں بیان کر چکے ہیں اس لئے لے دے کے یہی حصہ باقی رہ گیا تھا وہ بھی مرزا صاحب نے لکھ دیا۔ اک دسترس سے تیری حالی بچا ہوا تھا۔ اس کے بھی دل پہ تو نے چرکا لگا کے چھوڑا۔ اگر مرزا صاحب اپنی خودنوشت مرتب کرنے کی نیت رکھتے تو باقی حالات کو بھی اس میں شامل کر کے اپنی داستانِ حیات مرتب کر دیتے اور یہ خودنوشت ان کی مکمل سوانح حیات ہوتی۔

فرحت اللہ بیگ کا نام آتے ہی تحریر کی جس شگفتگی اور خوش ذوقی کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے وہ اس کتاب میں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔ ان کا اپنا اعتراف ہے کہ ''یہ ہم ہیں اور یہ ہماری گذری

ہوئی کہانی ۔ اچھی ہے یا بری اس کے متعلق تو میں کچھ کہتا نہیں ہاں یہ دعویٰ ضرور کرتا ہوں کہ سچی اور بالکل سچی ہے ۔'' جو کچھ اپنی آنکھوں دیکھا میں نے لکھا اس کے متعلق یقین مانئے کہ اس کا ایک ایک حرف صحیح ہے اور اللہ میاں کے سامنے بھی ان واقعات کی حد تک اس مضمون کو سنانے کے لئے میں بالکل تیار ہوں اور میں 'باور کرنے کی وجہ رکھتا ہوں' کہ اگر میرے کرامن کاتبین کی تحریر بھی میرے جیسی ہے تو یقیناً ان حالات میں میری اس تحریر اور میرے نامہء اعمال کی تحریر میں رتی برابر فرق نہ ہوگا'' (صفحہ ۴)'' اب رہا یہ امر کہ اس کہانی میں خوش مذاقی کا پہلو کم ہے تو یہ ہونا بھی چاہئے کیونکہ دنیا میں رونا زیادہ ہے اور ہنسنا کم'' (صفحہ ۳۲۰) ۔ دلیل تو اپنی جگہ درست ہے مگر ایک صاحبِ طرز ادیب کا یہ عذر قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔

در اصل مرزا صاحب کی ساری عمر حیدر آباد جیسی ریاست میں گذری جہاں جوڑ توڑ اور سازشوں کے بغیر زندگی کرنا ہی ممکن نہیں تھا۔ یہ یہاں سے ''اپنی منگیتر'' کو دیکھنے کی ہوس میں اپنی ڈپٹی کلکٹری کو دھتا بتا کر گئے تھے وہاں جوڑ توڑ کی پھکی میں پھنس گئے اور عمر بھر رہا نہ ہوئے ۔ جاتے ہی پہلا تجربہ یہ ہوا کہ اپنے عزیز عزیز مرزا صاحب کا خط لے کر مسٹر لال سے ملے ۔ مسٹر لال کہنے لگے '' آج خدا خدا کر کے مولوی عزیز مرزا کے احسانوں کا بدلہ دینے کے قابل ہوا ہوں'' مگر انہی مسٹر لال نے ہی مداہنت سے کام لیتے ہوئے وہ 'جائیداد' کسی اور کو دلا دی ۔ یہ جائیداد کا لفظ بھی حیدر آباد کی خاص اصطلاح ہے جو '' خالی جگہ'' یا '' خالی اسامی'' کے معنی میں وہاں مستعمل تھی ۔ ہاں ان کے بہنوئی نواب سربلند جنگ چیف جسٹس نے کھری بات کہی '' میاں فرحت تم حیدر آباد کی نوکری کے جھگڑوں میں نہ پڑو یہ بڑی خطرناک جگہ ہے ۔۔۔ اگر یہاں رہنے کا ارادہ کیا تو یاد رکھنا تمہاری زندگی برباد ہو جائے گی اور جینا اجیرن ہو جائے گا'' ۔ مگر ان کی کھری باتیں تیر بن کر ان کے دل پر لگیں اور یہ انہیں گستاخانہ جواب دے کر اپنے گھر آ گئے کہ '' میں جس روز آپ سے کوئی نوکری مانگوں اسی روز اور اسی وقت مجھے کھڑے کھڑے نکلوا دیجئے گا'' ۔

حیدر آباد جانے سے پہلے نواب لوہارو کی سفارش پر ان کی ملاقات لفٹیننٹ گورنر سے ہو چکی تھی اور یہ اپنی چرب زبانی سے انہیں متاثر کر چکے تھے ۔ اس نے ان کو ڈپٹی کلکٹری کی آفر دی تھی مگر حیدر آباد

میں سب اعزاء کی موجودگی انہیں بہت خوش آئی اور انہوں نے اعلیٰ ملازمت کی آس میں معمولی سکول ماسٹری کی ملازمت قبول کر لی اور ملازمت کے ''جیل خانہ'' میں داخل ہو گئے اور سمجھ لیا کہ ''اب سوائے عہدیدار (افسر) کے دین اور دنیا میں کہیں بھی کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے ۔ ہمارے رزق کا تعلق اللہ میاں سے منقطع ہو کر ''جیل کے داروغہ بالقابہم'' سے ہو گیا ہے'' (صفحہ ۵) ۔ چار مہینے کے بعد ان کے انہی بہنوئی نے جس نے انہیں حیدر آباد سے چلے جانے کو کہا تھا انہیں دو سو روپے کی ملازمت ہائی کورٹ میں دے دی اور یہ اس کولہو میں جت گئے ۔ اور ڈپٹی کلکٹری کا پروانہ آیا بھی تو اسے رد کر دیا۔

فرحت اللہ بیگ صاحب نے اس داستان میں یہ اہتمام کیا ہے ہر واقعہ کے ساتھ تاریخ اور دو دو سنین درج کئے ہیں عیسوی اور حیدر آباد کے فصلی سنین ۔ اس سے کتاب پڑھنے والے کو دقت ہوتی ہے مگر ان کی ٹریننگ تنقیح کرنے کی ہے اس لئے تاریخیں درج کئے بغیر ان کا قلم آگے نہیں چلتا۔ عیسوی سن لکھنے سے ان کی ہوس پوری نہیں ہوتی حیدر آباد کا فصلی سن پوری تفصیل سے لکھتے ہیں تو ان کی تسلی ہوتی ہے ۔ یہ داستان حیدر آباد کی زندگی کی عبرت آموز تصویر کشی ہے کہ کس طرح ریاستی اہلکار کھلم کھلا اقربا پروری کرتے اور اسے اپنا حق جانتے ہیں۔ ملکی اور غیر ملکی کا امتیاز ملازمتوں میں روا رکھا جاتا ہے اور کوئی غیر ملکی مشکل ہی سے ریاست میں اونچے عہدے تک پہنچتا ہے جاگیریں اور پائیگاہیں اپنی جگہ اپنی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لئے سازشوں میں مصروف ہیں۔

فرحت اللہ بیگ صاحب بھی اس ماحول میں پوری طرح جذب ہو گئے ۔ ہر چیز کہ در کانِ نمک رفت نمک شد۔ اپنے کام پر شیخی بگھارنے کا مرض انہیں بھی لگ گیا۔ شیخی بگھارتے ہیں تو ساتھ ہی کہتے ہیں '' خدا میری شیخی کو معاف کرے'' (صفحہ ۱۴۲) مگر فوراً انہیں خیال آتا ہے کہ ''میرا ستارا بلندی پر ہے'' (صفحہ ۲۰۲) اس لئے میں جس کام میں ہاتھ ڈالتا ہوں وہ سدھ ہو جاتا ہے ۔'' اپنے منہ میاں مٹھو بھی بنتے ہیں'' (صفحہ ۲۵۹) اور بطور سیشن جج اپنے فیصلوں کے باب میں کہتے ہیں کہ ان میں سے کوئی ٹوٹ نہیں سکتا نہ ٹوٹا ۔ اس ریاست میں سفارشوں کا یہ عالم ہے کہ قتل کے مقدمہ میں دلہن پاشا یعنی نظام کی بیگم صاحبہ سفارش کرتی ہیں اور ڈنکے کی چوٹ کرتی ہیں ۔ (صفحہ ۲۵۵) اور سیشن جج کو اپنے مواجہ میں طلب کر کے کرتی ہیں ۔ شخصی ریاستوں میں جو کچھ ہوتا تھا مرزا فرحت اللہ بیگ کی تحریر حیدر آباد کی

حد تک اس کی تصدیق کرتی ہے۔

شہاب نامہ میں شہاب صاحب نے اپنے ڈائریکٹر صنعت ہونے کے زمانہ کا جو واقعہ لکھا ہے کہ ایک بزرگ صورت صاحب ان کے پاس آتے اور ان پر پڑھ پڑھ کر پھونکتے رہے اور انہیں داتا دربار لے گئے بعد کو عقدہ کھلا کہ وہ محض ایک شخص کی ناجائز سفارش کے لئے یہ سارا ڈھونگ رچائے بیٹھے تھے۔ فرحت اللہ بیگ صاحب کو بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ ''میں روز دیکھتا تھا کہ ایک مولوی صاحب اول وقت سے آتے ہیں اور میری میز کے ایک کونہ پر کرسی پر بیٹھے وظیفہ پڑھا کرتے ہیں کبھی وہ میری طرف چھو چھو بھی کر دیتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر یہ کیوں آتے ہیں اور اگر آتے بھی ہیں تو منہ سے کیوں نہیں بولتے آخر ایک دن میں پوچھ ہی بیٹھا'' (صفحہ ۱۱۰) اور مولوی صاحب نے ایک کام کرنے کو کہا اور اس کے عوض ''خدمت'' کرنے کی پیش کش کر دی۔ یعنی وہی ہتھکنڈے جن کا ذکر اقبال نے کیا کہ ''یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے۔ گلیم بوذر و دلقِ اویس و چادرِ زہرا''۔ یہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری۔ رشوت ستانی کا دور دورہ تھا خود لکھتے ہیں ''میں جانتا تھا اس فیصلہ کی قیمت چھ ہزار روپے ہے'' (صفحہ ۱۴۴)

اس داستان میں عبداللہ یوسف علی صاحب کا بھی ذکر ہے مگر فرحت اللہ بیگ ان کی قابلیت سے تو بہت متاثر ہیں ان کی شخصیت سے متاثر نہیں۔ نظام حیدر آباد کے بارہ میں بہت لوگوں نے استعجاب سے لکھا ہے کہ وہ بے حد سادہ زندگی کرتے تھے۔ جو مثال فرحت اللہ بیگ نے لکھی وہ اپنی ذات میں بڑی اہم ہے۔ سر راش بہاری ایک کمشن کے سلسلہ میں آئے ہوئے تھے۔ فرحت اللہ بیگ ان کے کمشن کے سکرٹری تھے کہ ایک روز سادہ کاغذ پر بہاری صاحب کو ایک دعوت نامہ کسی عثمان علی کی طرف سے ملا کہ میرے ساتھ چائے پیو۔ راش بہاری صاحب اپنی جگہ پریشان کہ یہ عثمان علی کون ہیں اور چائے کی دعوت کیوں دی ہے۔ سکرٹری صاحب نے بتایا کہ یہ عثمان علی اعلیٰ حضرت ہز ایکز الٹڈ ہائی نس میر عثمان علی خان ہیں۔ راش بہاری کو چلنے میں دقت تھی، گئے۔ اب باقی روداد ان سے سنئے ''جب میری موٹر دروازہ پر پہنچی تو کیا دیکھتا ہوں ایک ہوادار رکھا ہوا ہے اور نواب صاحب کے سکرٹری میرے انتظار میں کھڑے ہوئے ہیں۔ وہ مجھ سے کہنے لگے کہ سرکار کو معلوم ہے کہ آپ کو چلنے میں دقت ہوتی ہے اس

لئے یہ ہوادار بھیجا ہے آپ اس میں سوار ہو جائیے میں سوار ہو گیا۔ پردہ کی دوسری طرف تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں ایک جوان سا شخص بہت سادہ لباس پہنے کھڑا ہے' اس نے آتے ہی میرے ہوادار کا پایہ پکڑ لیا اور مجھ سے باتیں کرنے لگا' میں نے پوچھا ہز ایکز الٹڈ ہائینس کہاں ہیں؟ اس نے نہایت نیچی آواز میں کہا میں ہی ہوں'' (صفحہ ۱۷۷)۔ نظام کی سادگی کے بارہ میں اگر فرحت اللہ بیگ خود کچھ کہتے تو وہ اتنا قابلِ اعتنا نہ ہوتا۔ یہ گواہی ایک ''غیر ملکی'' کی ہے جو حیدر آباد کا رہنے والا نہیں تھا۔

حیدر آباد اور دیگر شخصی ریاستوں میں لوگوں کا تقرر کس طرح ہوتا تھا اس کی مثال مولوی خدا بخش کا تقرر ہے۔ ۱۸۹۵ میں مولوی خدا بخش صاحب یہاں آئے اور سید علی بلگرامی کے پاس ٹھہرے۔ مولوی صاحب بنگال میں درجہ دوم کے وکیل تھے۔ درخواست ہوئی کہ انہیں درجہ اول کے وکیل کی سند دی جائے۔ چیف جسٹس نے نامنظور کر دی کہ ان کی اردو قابلِ اطمینان نہیں۔ سید علی بلگرامی کو بہت تاؤ آیا۔ ان کے تعلقات نواب سرور الملک سے تھے اور ان کا بہت زور تھا۔ سید علی بلگرامی نے ان سے کہا۔ انہوں نے چیف جسٹس صاحب کو سبق سکھانے کی سوچ لی۔ ''ہفتہ کی صبح کو مولوی خدا بخش خان صاحب کو بلایا اور ایک خط دیا۔ یہ خط ایک فرمان تھا کہ مولوی افضل حسین کی جگہ مولوی خدا بخش کو چیف جسٹس بنایا جاتا ہے چنانچہ انہوں نے فوری طور پر چیف جسٹس کا جائزہ لے لیا۔ اور ''جن کو وکالت کی سند نہیں مل سکتی تھی ان کو میر مجلسی (چیف جسٹس شپ) مل گئی''۔ (صفحہ ۴۴) جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ عدالت کے سررشتہ سے شروع ہوئے اور اپنی ملازمت کے اخیر میں ہائی کورٹ کے جج کے مرتبہ تک پہنچے اگرچہ ان کا کام فیصلہ دینا نہیں عدالتوں کا معائنہ کرنا تھا اور اس کام میں انہیں اتنے دورے کرنا پڑتے تھے کہ گویا ''پاؤں میں بلی بندھی ہوئی تھی'' (صفحہ ۳۰۸)۔

سیشن جج کے طور پر اضلاع میں رہے تو لوگوں کو ''رعایا'' ہی لکھتے اور سمجھتے رہے۔ (صفحہ ۲۷۷) وہ جو خدمت کا تصور تھا وہ ان کے ہاں آیا ہی نہیں اور یہی تصور ریاستوں میں مروج تھا اس میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ اگر رئیس ریاست کو اعلیٰ حضرت بندگانِ عالی اور ان کے فرمان کو فرمانِ مبارک کہا جائے گا تو یہی صورت حال ہوگی۔

حیدر آباد کے ساتھ سر اکبر حیدری کا نام لازم و ملزوم ہے۔ ان کے بارہ میں کسی شاعر نے کیا

خوب کہا تھا'' ہے شانِ حیدری، شانِ سرا کبر۔ سرا کبر حیدری، اللہ اکبر''!۔ یہی سرا کبر حیدری گول میز کانفرنس میں حیدر آباد کے نمائندہ بن کر گئے۔ وائسرائے کی کابینہ میں لئے گئے اور پھر وہاں چند ہی مہینوں میں ذہنی مریض بن کر رہگزائے قضا ہوئے (صفحہ ۲۹۹)۔ فرحت اللہ بیگ صاحب نے رجال کے باب میں ایک ہی رویہ رکھا ہے کہ جو اپنا ہے وہ اپنا ہے جو پرایا ہے وہ پرایا اور اپنے پرائے کی یہ تمیز ہر جگہ قائم رہی۔ یہ داستان ان کے وظیفہ یاب ہونے پر ختم ہو گئی۔ قیدِ ملازمت سے رہا ہوئے۔ کتاب کے اختتام کی تاریخ کہہ کر فارغ ہو گئے۔ '' آ کے ہاتف نے ادب سے یہ کہا۔ داستاں ہے فرحت اللہ بیگ کی'' اس میں چوتھے مصرعہ میں ادب کے سات اعداد جوڑ دیئے جائیں تو تاریخ تصنیف بنتی ہے۔ ۱۳۵۴ف۔ اور یہ ''ف'' فصلی کا مخفف ہے۔

◎

خاطرات

جناب ظفر حسن آئیبک کی خودنوشت '' خاطرات'' سنگِ میل پبلیکیشنز کی جانب سے ۱۹۹۰ میں شائع کی گئی ہے۔ اسے ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے مرتب کیا ہے۔ فارسی زبان میں خاطرات یادداشتوں کو کہتے ہیں۔ حال ہی میں ملکہ فرح پہلوی کی یادداشتیں اسی عنوان سے فارسی میں شائع ہوئی ہیں۔

ظفر حسن آئیبک کرنال میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں زیرِ تعلیم تھے کہ ترکی کے خلیفۃ المسلمین نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیا۔ کچھ دوسرے سرفروش مجاہدین کے ساتھ مل کر انہوں نے بھی جہاد میں شرکت کا فیصلہ کر لیا اور دریائے راوی کے عین درمیان میں ایک کشتی پر بیٹھ کر بڑی رازداری کے ساتھ قرآن پاک پر حلف اٹھایا اور عملاً ۵ فروری 1915 کو لاہور سے افغانستان روانہ ہو گئے تاکہ ایک آزاد مسلمان ملک میں بیٹھ کر آزادی کی جدوجہد جاری رکھ سکیں۔ کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کا ایسی بہ ظاہر ناممکن مہم پر کمر بستہ ہو جانا اپنے وطن کے ساتھ ان کی انتہائی جذباتی وابستگی کی دلیل ہے۔ مسلمان بہ حیثیت مجموعی جذباتی قوم ہیں اور اپنے علماء کے کہنے پر بعض اوقات لایعنی مقاصد کو اپنی زندگی کا منتہائے مقصود قرار دے لیتے ہیں۔ خلافت ترکیہ کے ساتھ مسلمانوں کا محض جذباتی تعلق تھا وہ مسلمانوں کی یکجہتی و یکجائی کی سزاوار تھی نہ مستحق نہ دعویدار مگر نوجوان سرفروش اپنے مستقبل کو داؤ پر لگا کر اس مہم پر نکل کھڑے ہوئے۔ خاطرات اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ جاں فروشی جاں سپاری اور جاں بازی ایک طرف ارضی حقائق کو نظرانداز کر کے خیالی منصوبہ بندی تو کی جا سکتی ہے عملاً کوئی کامیابی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اسی جیش کے سردار مولانا عبیداللہ سندھی جب ۱۹۳۹ میں مراجعت فرمائے وطن ہوئے تو انہوں نے برملا اس حقیقت کا اعتراف کیا اور اہلِ وطن سے بہت مایوس ہوئے۔ خاطرات اس جیش کی ناکامیوں نامرادیوں کی داستان ہے۔ البتہ اس بات کی داد دینا ضروری ہے کہ یہ لوگ اپنے مقصد سے

تمام تر ناکامیوں کے باوجود روگرداں نہ ہوئے اور نامساعدت کے باوجود اپنی جدوجہد جاری رکھی۔

برصغیر میں انگریزوں کا اقتدار مستحکم ہوتے ہی مسلمانوں کی جانب سے ان کے خلاف عملی جہاد کے بہت سے دعوے کئے گئے۔ ان سب دعووں میں اس بات کو نظر انداز کر دیا گیا کہ مسلمانوں کے پاس نہ وہ فوجی قوت باقی ہے کہ وہ اس کے بل پر غاصبوں کا مقابلہ کر سکیں نہ ان میں وہ جمعیت قائم ہے جو انہیں ایک ہاتھ پر جمع کر سکے۔ سرسید کی تحریک کی مخالفت بھی جذباتی مسلمانوں کی جانب سے اسی بنیاد پر کی گئی کہ وہ انگریزوں کے ساتھ تعاون کے علمبردار تھے۔ جماعت احمدیہ کے بانی پر تو کفر کے فتوے لگائے گئے کہ وہ جہاد کو قتال سے علیحدہ کر کے دیکھتے تھے اور فی زمانہ جہاد بالسیف کو ممنوع قرار دیتے تھے۔ خاطرات اس بات کا محکم ثبوت مہیا کرتی ہے کہ مسلمانوں میں جہاد بالسیف کی قابلیت تھی نہ قوت۔ ان کا جہاد بالسیف کا نعرہ کھوکھلی جذباتیت پر استوار تھا۔ خود ان کا کہنا ہے کہ ''جماعت مجاہدین جو ایک مقصد کے لئے بنائی گئی تھی اس کے ارکان بہت مخلص اور جاں نثار تھے سراپا تحمل اور ہر قسم کی مصیبتوں کے سامنے سینہ سپر ہونے کو تیار تھے ان کی نہ مال دولت کی آرزو تھی نہ دنیوی جاہ وجلال کی تمنا تھی وہ تو صرف جہاد فی سبیل اللہ کے لئے اپنی جانیں وقف کر چکے تھے اور اس امید پر کہ ان کو ایک دن کفار سے لڑنے جہاد کرنے اور میدانِ جنگ میں جامِ شہادت پینے کا موقع ملے گا وہ اپنی ساری زندگی کو ایسی ہی مشکلات میں گزارنے اور ہر قسم کے آرام سے محروم رہنے پر تیار تھے۔ لیکن افسوس کہ ان کو دنیا کے تبدیل شدہ حالات کے مطابق کوئی تعلیم وتربیت دینے والا اور ان کو نئی فوجی قواعد سکھانے والا نہ تھا ۔۔۔ آتشیں ہتھیاروں اور بارود کی ایجاد کے بعد تلوار اور ڈھال سے لڑائی کا دور ختم ہو چکا تھا لیکن وہ بچارے ابھی تک تلوار سے حملہ کرنے کے قواعد سیکھا کرتے تھے'' (صفحہ ۴۸) نتیجہ معلوم کہ یہ ساری جدوجہد وقت کے سیلاب میں خس وخاشاک کی طرح بہہ گئی۔

بعد کو جب ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک نے زور پکڑا اور لوگ جوق در جوق افغانستان کی طرف ہجرت کرنے لگے تو اس سعیءلاحاصل پر ایک صاحب نے بڑا دلگداز تبصرہ کیا: ''یوپی کے مولانا عبد الباری آسی نے ہندوستان کو علمائے دیوبند کی طرح دار الحرب قرار دے کر فتویٰ دیا کہ مسلمانوں پر فرض ہے کہ یہاں سے ہجرت کر کے کسی دار الاسلام میں چلے جائیں۔ اس پر پنجاب اور سرحد کے مسلمانوں

میں ہجرت کی تیاریاں ہونے لگیں لیکن ہجرت کر کے کہاں جائیں اور کس ملک میں پناہ لیں۔ اس بارے میں انہیں تردد تھا۔ اس پر امیر افغانستان اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں نے اس وقت ایک تقریر کی جس کے یہ الفاظ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ''افغانستان بہ ہمہ وسعتِ خود آمادہ است کہ مہاجرین ہندی را پناہ بدہد''۔۔۔ ہجرت کے فتوے پر سادہ لوح مسلمانوں نے اپنے گھر اور کھیت آدھے مول پر بیچ دئے اور نتیجہ اور عاقبت کو سوچے بغیر افغانستان کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان بچاروں کے اس جوش میں نہ صرف ان کی مذہب دوستی کا دخل تھا بلکہ ایک حد تک ان کی مالی خرابی کا بھی اثر تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ افغانستان میں ان کے لئے سرکاری خزانہ کا منہ کھلا ہوا ہے جہاں وہ جاتے ہی مالدار ہو جائیں گے۔۔۔ انگریزوں نے جن کو افغانستان کی مالی کمزوری اور ہندوستانی تحریک ہجرت کی بے سروسامانی کا خوب علم تھا اس تحریک کو ناکام بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ان کے کارندوں نے ہندوستان میں لوگوں کو سبز باغ دکھائے اور کہا کہ وہ کابل پہنچتے ہی مالدار ہو جائیں گے۔ گورنمنٹ کے بعض ایجنٹوں نے ان کے مذہبی جذبات کو بھڑکا کر ان کو ہجرت کی ترغیب دی اور اس طرح پر اس تحریک کو افغانستان اور پنجابی اور سرحدی مسلمانوں کے لئے ایک رحمت کی بجائے ایک آفت بنا دیا'' (صفحہ ۱۸۵۔۱۸۶)۔

''نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں سادہ لوح مسلمان اپنے گھر بار سے محروم ہوئے افغانستان پر مالی بوجھ پڑا ہندوستانی مسلمان افغانوں سے اور افغان ہندوستانی مسلمانوں سے کبیدہ خاطر ہوئے۔ اگر کسی نے اس سے فائدہ اٹھایا تو وہ صرف انگریز تھے'' (صفحہ ۱۸۶)۔

اس تمام اعتراف کے باوجود ایک صاحب ایک جذباتی مسلمان کی طرح نتیجہ یہ نکالتے ہیں کہ ''ہجرت کی تحریک گو بذاتِ خود ایک اچھی تحریک تھی لیکن بد انتظامی بے سروسامانی اور بغیر سوجھے بوجھے چلائے جانے کی وجہ سے مفید ہونے کی بجائے بہت مضر ثابت ہوئی۔ اگر مسلمان مکے کی ہجرت سے سبق لیتے تو یہ مفید ہوتی''۔ سوال یہ ہے کہ جب مسلمانوں کی کوئی اجتماعی جمعیت ہی موجود نہ تھی جو انہیں منظم کر سکتی تو ایسی ہجرت کو مضر ہونا ہی تھا کیونکہ کسی مرکزی تنظیم کی عدم موجودگی میں مسلمانوں کی حیثیت بھیڑوں بکریوں کے ایک غیر منظم گلہ کی تھی مولوی جدھر چاہتے ایک فتوے سے اسے ہانک لے جاتے تھے اور عام مسلمان اپنی جہالت کی وجہ سے مولویوں کے فتووں پر کان بھی دھرتے تھے۔ اصل

قصور ان فتویٰ فروشوں کا تھا جنہوں نے غریب مسلمانوں کو غریب تر کر دیا۔ خود ایک صاحب ایک ایسے ہی جہاد کے فتویٰ کا نشانہ بنے۔ تعلیم ادھوری چھوڑ دی اور در بدر کی ٹھوکریں کھاتے پھرے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی خلش اور خواہش عمر بھر انہیں رہی اور جہاں تہاں وہ اپنے محسنوں سے اس خواہش کا اظہار بھی کرتے رہے۔ یعنی اپنی تعلیمی محرومی کے احساس نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ ''میرے تعلقات سردار محمد نادر خان سپہ سالار مرحوم اور ان کے خاندان سے بہت بڑھ گئے جس کا اثر میری آئندہ زندگی پر بہت زیادہ پڑا۔ انہی تعلقات کی وجہ سے میں نے ایک روز ان سے وعدہ لیا کہ وہ مجھے جب کبھی موقع ملے تو یورپ کو تعلیم پوری کرنے کے لئے ضرور بھیج دیں گے'' (صفحہ ۱۲۳)۔

ان مجاہدین کے رہنما مولانا عبیداللہ سندھی تھے۔ آپ نے کابل پہنچ کر اپنے مقصد کا اظہار یوں فرمایا تھا کہ وہ: ''مسلمانانِ ہند کے نمائندہ کے طور پر افغانستان آئے ہیں تا کہ شاہِ افغانستان کو انگریزوں کے برخلاف ہندوستان پر حملہ کرنے کی ترغیب دلائیں'' (صفحہ ۹۹) ظاہر ہے یہ سیاسی مقصد پورا کرنا افغانستان جیسے غریب کمزور اور پابندِ حدودِ زمینی ملک کے لئے ممکن نہیں تھا۔ اس ملک کی غربت، جہالت، بے سروسامانی، اور امیر کی عیش کوشی کا جو نقشہ صاحبِ خاطرات نے کھینچا ہے وہ حد درجہ عبرت انگیز ہے۔ امیر حبیب اللہ خان: ''ایک غیر ذمہ دار بادشاہ ہونے کی وجہ سے امورِ سلطنت کو بالکل اپنی مرضی کے مطابق چلایا کرتے تھے۔۔۔۔ امیر صاحب کی چار منکوحہ بیگمات کے سوا روایت کے مطابق ۱۰۰ کنیزیں باندیاں بے نکاح ان کے حرم سرائے میں رہتی تھیں۔ ہر سال مختلف قبیلوں سے خوب صورت نوجوان لڑکیاں چنی جاتی تھیں اور امیر کے محل میں بھیجی جایا کرتی تھیں۔ ان رنگ رلیوں کی وجہ سے امیر صاحب کو سرکاری امور پر توجہ کرنے کا موقعہ ہی نہ ملتا تھا۔۔۔ امیر صاحب کی بیگمات میں سے علیا حضرت کا رسوخ اگرچہ کافی تھا لیکن وہ خوب صورت باندیوں کی وجہ سے ذرا نظر سے گر گئی تھیں۔ وہ امیر صاحب کے شہوانی افعال کی وجہ سے اور ان کی بعض شریف خاندان کی لڑکیوں اور بہوؤں پر دست درازی کی وجہ سے ان سے بالکل دل برداشتہ ہو چکی تھیں'' (صفحہ ۹۰) تس پر یہ لوگ امیر کابل سے یہ توقع لگائے بیٹھے تھے کہ وہ ان کے ساتھ عملی طور پر جہاد میں شریک ہوں گے؟ ادھر ان کے فوجیوں کا یہ حال تھا کہ ایک معرکہ میں ایک کماندار کا پاؤں زخمی ہو گیا تو وہ ''پائے ما شہید شد'' کا نعرہ لگا کر میدان سے

بھاگ گیا (صفحہ ۲۵۰)۔

اپنے جہاد کے سلسلہ میں ان لوگوں نے روس سے بھی استمداد کیا اور وہاں کا سفر بھی اختیار کیا۔ مالی امداد بھی لیتے رہے'' سفر خرچ کے لئے مولانا نے تیسری اور آخری مرتبہ عزیز احمد کے ذریعہ روسی قونصل خانہ سے روپیہ لیا'' (صفحہ ۳۱۴) مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ بعض اوقات تو یوں لگتا ہے یہ لوگ کسی خیالی دنیا میں بس رہے تھے ایسے ایسے منصوبے باندھتے تھے جن پر عمل کرنا ممکن نہیں تھا۔ ''جنود اللہ'' نام کی تنظیم قائم کرنے کا سوچا اور اس کے عہدیداروں کو حسبِ مراتب جنرل، لفٹیننٹ جنرل، میجر جنرل، بریگیڈئر اور کرنل لفٹیننٹ کرنل کے عہدے'' دئے (صفحہ ۱۱۲)۔ اس کے سپہ سالار اعظم مولانا محمود الحسن شیخ الہند تھے۔ مالی امور کے لئے رقوم کی فراہمی کا منصوبہ کوئی کم نہیں تھا '' میں اور محمد حسن حجاز جا کر آہستہ آہستہ ایک ایسی تنظیم بنائیں جو حج کے موقع پر ذبح شدہ بھیڑ اور بکریوں اور اونٹوں کی کھالوں کو جمع کر کے ان سے دباغت خانہ میں مختلف قسم کے چمڑے بنائے اور ان کو اسلامی ممالک کو برآمد کرے۔ اس کے لئے حجاز میں بین الاسلامی کمپنی قائم کی جائے جو کھالوں کو صاف کر کے ان سے چمڑا بنائے۔ اس کام کے لئے مالی ذرائع بہم پہنچانے والے ایک بین الاسلامی بنک کی بنیاد ڈالی جائے جو ان کاموں کے لئے سرمایہ بہم پہنچائے'' (صفحہ ۱۱۳) ان تمام منصوبوں کی حقیقت سوائے خیالی پلاؤ کے اور کچھ نہ تھی اور ہمارے آزادی کے متوالے ان منصوبوں پر غور و فکر کرتے رہتے تھے۔ نشستند و گفتند و برخاستند۔

غرض خاطرات، اسلامی جوش و جذبہ رکھنے والے بعض سر پھرے مجاہدین کی داستان ہے جو پڑھنے والوں کے لئے عبرت انگیز بھی ہو سکتی ہے اور معلومات افزا بھی۔ اس کتاب سے دورِ جدید کے افغانستان میں ہونے والی جہادی سرگرمیوں کے پس منظر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ ان پڑھ مسلمانوں کا یہ ملک اندھی تقلید کرنے والوں کے لئے اب بھی کشش کیوں رکھتا ہے؟

ایک صاحب کے والد حصولِ تعلیم کے لئے بھوپال چلے گئے اور اتنا عرصہ اپنے والدین سے دور رہے کہ ماں باپ ان کی زندگی سے مایوس ہو گئے۔ واپس آئے تو ماں نے بددعا دی ''خدا کرے تم بھی اپنی اولاد کی وجہ سے اسی طرح بلکتے رہو''۔ خدا کی شان کہ یہ بددعا حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ ان

کے صاحبزادے ظفر حسن لاہور سے ہی اپنے جہادی سفر پر روانہ ہو گئے اور پھر ان کے والد کو جیتے جی اپنے بیٹے کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ وہ ''اپنے بیٹے کی جدائی میں تڑپتے ہوئے فوت ہوئے۔'' (صفحہ ۲۴)۔ تلک الایام نداولہا بین الناس۔

خاطرات کی زبان صاف ستھری شستہ رفتہ زبان ہے۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے اس کتاب کو مرتب کر کے شائع کیا ہے اور اس کی شستہ و رفتہ زبان میں دخل اندازی نہیں کی۔ شریف الحسن صاحب کا دیباچہ خاصے کی چیز ہے اس نے اس کتاب کی افادیت میں اضافہ کیا ہے۔

◎

مسعود کھدر پوش

محمد مسعود، آئی سی ایس اور بعد ازاں سی ایس پی سروس کے بڑے نیک نام اور دیانت دار افسر تھے۔ انگریزوں کے زمانہ میں آئی سی ایس میں گنے چنے ذہین افراد ہی جگہ پاتے تھے۔ مسعود انہی ذہین لوگوں میں سے تھے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے گریجوایشن کے بعد ایل ایل بی میں سارے صوبہ میں اول رہے اور سرکاری ملازمت میں چلے گئے اسی دوران آئی سی ایس کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں تربیت اور تعلیم حاصل کی۔ بمبئی میں متعین ہوئے اور بھیل قبائل کی بہبودی کے لئے انتھک کام کرنے کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ خاندیش کے جنگلوں میں آدم خور چیتے کا شکار کرنے کی وجہ سے بھیلوں میں بھگوان کے نام سے جانے جانے لگے کیونکہ ان کے نزدیک چیتے کو مارنا انسانوں کا نہیں بھگوانوں کا کام تھا۔ بھیل قبائل کے لوک گیتوں میں انہیں بھگوان کے نام سے ہی یاد کیا جاتا ہے۔

لاہور میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے۔ گھر سے خوشحال تھے اس لئے بے فکری میں پرورش میں پائی۔ طبیعت میں آزادی بھی اسی لئے تھی کہ کوئی انہیں روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔ ان کے والد بزرگوار سرکاری ملازمت کے خلاف تھے مگر انہوں نے اپنی جدت پسندی اور کہے سنے کو رد کرنے کی عادت کی وجہ سے سرکاری ملازمت اختیار کر لی اور جہاں بھی رہے جس حال میں بھی رہے نیک نام رہے۔ ورزش کا نہ صرف شوق تھا بلکہ رستم زماں گاما پہلوان کے نہ صرف چیلے تھے بلکہ ان کی طرح مضبوط کسرتی جسم بھی رکھتے تھے۔ آکسفورڈ میں باکسنگ کا مقابلہ جیتا تو چرچل کے بڑوں میں سے ڈیوک آف مارلبرو بھی دیکھنے والوں میں موجود تھے۔ مقابلہ جیتنے کے بعد کسی نے ان سے پوچھا کیا آپ انڈیا کے نوابین میں سے ہیں؟ مسعود کہنے لگے نہیں میں تو انڈیا کے لاکھوں بھوکے ننگے عوام میں سے ہوں۔ اس پر ان کے استاد نے طنز سے ان کے کمائے ہوئے توانا جسم کی طرف اشارہ کر کے کہا ''لو

بھئی دیکھ لو یہ ہے انڈیا کے فاقہ مستوں میں سے ایک'' (صفحہ ۳۲)۔ جب ان کے خلاف محکمانہ تحقیقات کا اعلان ہوا (اور ایسا اکثر ہوتا رہتا تھا) تو تفنن کے طور پر کہا کرتے تھے کہ ''آٹھ دس کمشنروں اور ڈپٹی کمشنروں کو تو میں ایک مکہ میں ڈھیر کر سکتا ہوں''۔

مسعود صاحب نے ساری عمر گاندھی کے تتبع میں نہیں اپنی مرضی اور صوابدید سے کھدر پہنا اور دوسروں کو بھی کھدر پوشی کی تحریک کرتے رہتے تھے اس لئے دیگر ناموں کے علاوہ انہیں مسعود کھدر پوش کے نام سے بھی پہچانا جاتا ہے۔ ان کی سوانح حیات اسی عنوان سے مسعود کھدر پوش ٹرسٹ لاہور سے شائع کی ہے۔ ان کی شخصیت کا ایک خاص پہلو یہ تھا کہ انہیں نت نئی سوجھتی رہتی تھی اور جو جی میں آئے وہ کر گذرتے تھے۔ خوش قسمتی سے اپنے وقت کی مقتدر ترین سول سروس آئی سی ایس کے رکن تھے۔ آئی سی ایس کے بارہ میں کہا جاتا تھا کہ یہ سروس رومن سلطنت کے مطلق العنان مضبوط نظام کی بنا پر وضع کی گئی تھی اس لئے اس کے اراکین گویا زمین پر خدا کے بعد سب سے زیادہ مقتدر گنے جاتے تھے ۔اگرچہ اہلِ دل یہ بھی کہتے تھے ''آئی سی ایس یعنی انڈین سول سروس نہ انڈین ہے نہ سول ہے اور نہ ہی سروس!'' بس اس کا لب لباب یہ تھا بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر! قیام پاکستان سے قبل متحدہ ہندوستان میں اور قیام پاکستان کے بعد پاکستان میں اس سروس کے لوگوں کا سکہ چلتا تھا۔ الطاف گوہر صاحب نے گوہر گزشت میں کراچی کے کمشنر کے طمطراق کا حال لکھا ہے کہ کمشنر تو کجا ان کی بیگم کے طنطنہ کا یہ عالم تھا کہ ان کے سامنے پیش ہونے والی خواتین اپنے جوتے اپنے سروں پر رکھ کر پیش ہوتی تھیں۔ ہمارے مسعود کھدر پوش اسی مقتدر سروس کے رکن تھے مگر ان کے طور طریق نرالے تھے۔ غریبوں سے محبت اور پامالوں سے وابستگی ان کا شیوہ تھی۔ جب نواب شاہ میں ڈپٹی کمشنر تھے تو اکثر دیہات کا دورہ کرتے رہتے تھے۔ ''ایک گاؤں کا دورہ کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ایک ہاری اپنے بچے کو کندھے پر اٹھائے ہل چلا رہا ہے۔ میں اس کے قریب گیا اور اس سے پوچھا اس کی بیوی کہاں ہے؟ ہاری نے کہا اسے وڈیرا اٹھا کر لے گیا ہے اور پولیس والے ایف آئی آر درج کرنے کے لئے روپے مانگتے ہیں جو وہ نہیں دے سکتا۔ مجھے ایک ترکیب سوجھی اور میں اپنا بھیس بدل کر پرانے پھٹے کپڑوں میں تھانے چلا گیا اور ایس ایچ او سے شکایت کی کہ وڈیرا اس کی بیوی کو اٹھا کر لے گیا ہے اس

کے خلاف پرچہ درج کیا جائے۔ ایس ایچ او نے پہلے تو انکار کیا اور بعد میں کہا محرر سے بات کر لو۔ محرر نے مجھ سے پوچھا ''بابا جی روپے ہیں؟''۔ میں نے کچھ پیسے نکال کر محرر کو دئے جنہیں وصول کرتے ہی محرر نے ایف آئی آر درج کر دی اور پوچھا ''آپ دستخط کر سکتے ہیں؟'' میں نے کہا ہاں اور دستخط کر دئے اور نیچے لکھا ''ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ'' (نواب شاہ)۔ یہ دیکھتے ہی محرر اور تھانیدار دونوں کے ہوش اڑ گئے'' (صفحہ ۱۲۷) کراچی میں ڈپٹی ایڈمنسٹریٹر تھے۔ صبح سیر کے لئے نکلے تو دیکھا دو پولیس والے ایک قلفی والے سے قلفیاں کھا رہے ہیں۔ یہ رک کر دیکھنے لگے۔ پولیس والے قلفیاں کھا کر بغیر پیسے دئے چل پڑے اور اپنی ڈیوٹی پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ یہ بھی قلفی والے کے پاس پہنچے اور قلفیاں کھا کر بغیر پیسے دئے چل پڑے۔ قلفی والے نے کہا پیسے تو دیتے جاؤ۔ انہوں نے کہا پولیس والوں نے بھی تو پیسے نہیں دئے تھے میں سمجھا تم مفت قلفیاں بانٹ رہے ہو اگر وہ پولیس والے پیسے دے دیں تو میں بھی گھر سے لا کر پیسے دے دوں گا۔ قلفی والے نے پولیس والوں کو اپنی کمک پر بلا لیا کہ یہ باؤ پیسے نہیں دیتا اور کہتا ہے اگر پولیس والے پیسے دیں گے تو میں دوں گا۔ پولیس والوں نے انہیں کہا تھانے چلو وہاں چل کر تمہیں بتائیں گے کہ مفت قلفیاں کس طرح کھائی جاتی ہیں۔ یہ ان کے ساتھ ہو لئے۔ تھانہ پہنچ کر انہوں نے انہیں تھانیدار کے سامنے پیش کیا۔ آگے خود ان کی زبانی ''تھانیدار نے میرے ساتھ بدتمیزی کی اور کہا ''ابھی ٹھیک کرتا ہوں''۔ اسی اثنا میں تھانیدار کا کوئی ملنے والا آ گیا۔ وہ اپنے ملاقاتی کے ساتھ باہر گیا تو میں نے اندر سے کمرے کی کنڈی لگائی اور ڈی آئی جی کو فون کر کے فوراً تھانے پہنچنے کے لئے کہا۔ دس منٹ بعد ڈی آئی جی اور ایس ایس پی تھانے پہنچ گئے اور تھانیدار سے میرے بارہ میں پوچھا۔ تھانیدار نے کہا وہ تو یہاں نہیں آئے۔ حیران ڈی آئی جی جب کمرے میں آیا تو مجھے وہاں دیکھ کر تھانیدار کی سمجھ میں ساری بات آ گئی اور وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ ساری بات کی حقیقت معلوم ہونے پر ڈی آئی جی نے پورے تھانے کو معطل کر دیا اور ساتھ ہی یہ بھی ہدایت جاری کر دی کہ جب مسعود صاحب اپنے دفتر جائیں تو پولیس کے لوگ انہیں جا کر دیکھ لیں کیونکہ ان پر بھی ایسا برا وقت آ سکتا ہے۔ اس بات کا تصور ہی مضحکہ خیز ہے کہ ایک افسر کو پولیس کا عملہ اس لئے دیکھنے جا رہا ہے کہ اگر کوئی غلط حرکت کرتے ہوئے آمنا سامنا ہو جائے تو انہیں پہچانا جا سکے'' (صفحہ ۱۳۸)۔

مگر مسعود صاحب کی سادگی صرف دکھاوے کی نہیں تھی۔ انگریز گورنر سر فرانسس مودی بڑے دبدبہ کا گورنر تھا اس کی دعوت میں شراب پیش کرنے سے انکار کر دیا اور کہہ دیا چونکہ میں شراب نہیں پیتا اس لئے شراب دعوت میں پیش نہیں ہوسکتی۔ اس پر گورنر صاحب نے ان کے سکرٹری کے ذریعہ یہ پیغام بھجوایا کہ اگر ''گورنر صاحب اپنے طور پر شراب کا کوئی انتظام کرلیں تو مجھے کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا'' (صفحہ ۸۳)۔ یہ تو ان کی غریب پروری کا حال تھا ان کے نظریات بھی انوکھے اور نرالے ہوتے تھے۔ جوانی ہی میں انہیں اپنی زبان میں نماز پڑھنے کا خیال آیا اور اس پر عمل بھی کرنے لگے۔ سلیس اردو میں نماز کا ترجمہ چھاپا اور لوگوں کو تلقین کرنے لگے کہ عربی نماز تو تمہاری سمجھ آتی نہیں اس لئے اس کا تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا اس لئے اپنی زبان میں نماز ادا کیا کرو۔ ذرا ''سیانے'' ہوئے تو بھیلوں کی ترقی اور تربیت کے لئے ان کے طور طریقے اپنا کر ان کی خوشی غمی میں انہی کی طرح ننگ دھڑنگ رہ کر شریک ہونے لگے۔ بھیلوں میں مقبول ہوئے اور ان کے بھگوان کہلائے مگر ہندو اور مسلمان زمینداروں اور استحصالی قوتوں کو اپنے خلاف کرلیا۔ آئی سی ایس کی ڈھال ان کی حفاظت کرتی رہی کیونکہ انگریز گورنر خود آئی سی ایس کے لوگ تھے اور ان کی انوکھی مگر مخلصانہ کوششوں کو سراہتے تھے۔ سندھ میں آئے تو ہاری رپورٹ کی وجہ سے مشہور ہوئے مگر مولوی ملانوں سے کمیونسٹ اور کافر ہونے کے فتوے کھاتے میں پائے۔ اوقاف کے ایڈمنسٹریٹر ہوئے تو مزاروں اور مجاوروں پر طبع آزمائی کی۔ اسلام پسندوں کی زد پر رہے۔ اواخر عمر میں پنجابی کا پرچم اٹھالیا اور ماں بولی میں تعلیم کے رواج کے داعی ہوئے۔ غرض ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں۔ اس بات کی داد دینا پڑتی ہے کہ مسعود ہمیشہ اپنی باتوں پر ثابت قدم رہے اور دوسرے لوگوں کی طرح مرغِ بادنما نہیں بنے کہ چلو تم ادھر کو جدھر کی ہوا ہو۔ ان کا رستہ ہمیشہ ہوا کے خلاف ہی رہا۔ زمانہ با تو نہ سازد تو باز مانہ ستیز۔

ہاری رپورٹ ان کی زندگی کا سرمایہ ہے۔ خود انہوں نے اپنی ملازمت کے دورِ اقتدار میں چالیس ہزار سے زائد بے زمین ہاریوں میں زمین تقسیم کی اور یہی ان کی بخشش کو کافی ہے۔ توقع ہے کہ مولویوں کی نگاہ میں کھٹکنے والے اس کافر کی روح اگلے جہان میں مفتخر اور مسرور و مطمئن ہوگی۔ شادم از زندگیءِ خویش کہ کارے کردم۔

مسعود کھدر پوش کی یہ داستان خودنوشت تو نہیں مگر اس میں کچھ حصہ ان کا اپنا لکھا ہوا ہے اور عبداللہ ملک اور احمد سلیم نے اور ان کی صاحبزادی نے ان خودنوشت حالات کے گرداگرد ان کی سوانح کا تانا بانا بنا ہے۔ اگرچہ ابتدا میں احساس ہوتا ہے کہ مرتب کرنے والوں کو خود بھی یقین نہیں کہ انہیں مسعود صاحب کی خودنوشت پر اپنی کتاب کی نیو اٹھانی ہے یا خود سے ان کی سوانح مرتب کرنی ہے۔ رفتہ رفتہ یہ احساس کم ہوتا چلا جاتا ہے مگر دوئی کا حساس ختم نہیں ہوتا۔ اے کاش مرتب کرنے والی صاحبزادی اس باب میں ذرا سی محنت اور کرلیتیں اور بیان کو یکسو کرلیتیں۔ با ایں ہمہ یہ داستان ایک مخلص شخص کی مخلصانہ اور بے لوث بے خوف زندگی کی لگی لپٹی سے مبرا داستان ہے اور اسی وجہ سے لوگوں میں قبولیت کا شرف بھی پائے گی۔ مسعود کھدر پوش جیسے مخلص انسان شاذ ہی پیدا ہوتے ہیں اور اس زمانہ میں تو الشاذ کالمعدوم کا زیادہ ہی احساس ہوتا ہے۔

◎

جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی

بہار کے شاعر کلیم عاجز کی خودنوشت ''جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی'' ۱۹۸۱ میں دہلی سے شائع ہوئی۔ کلیم عاجز کا بچپن بہار کے ایک چھوٹے سے قصبہ میں گذرا۔ تعلیم کے لئے کلکتہ اور پٹنہ میں مقیم رہے۔ یہ خودنوشت تقسیم ملک تک کے واقعات تک محیط ہے مگر بے حد ذاتی اور خاندانی حالات تک محدود ہے۔ کوئی ادبی، سیاسی یا تہذیبی پہلو اس سے نمایاں نہیں ہوتا۔ اپنے بچپن اور بچپن کی یادوں کے ساتھ ان کی وابستگی اس قدر شدید ہے کہ ان کی باتوں میں بھی بچپنا راہ پانے لگتا ہے۔ الجھاؤ اور بے ربطی اس کتاب کا جوہر اول ہے۔ لکھنے والا خود بھی اپنی بچپن کی یادوں میں یوں الجھتا ہے کہ اس کا پاؤں اس الجھاوے سے نکل ہی نہیں سکتا۔ کتاب کیا ہے بھول بھلیوں کا نہ ٹوٹنے والا سلسلہ ہے۔ شاید ان لوگوں کے لئے اس میں دلچسپی ہو جو ان لوگوں کو جانتے ہوں ورنہ عام قاری کے لئے یہ خودنوشت محض لکھے ہوئے صفحات کا مجموعہ ہے اور کچھ نہیں۔ یہ ''عظیم آباد کے ایک دیہی علاقہ کے لونڈے کلیم'' (صفحہ ۵) کی داستانِ حیات ہے جس کا بچپن گذر گیا مگر اس کے بچپنے نے بڑھاپے کی عمر تک اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

اس خودنوشت کی زبان بھی ان کے اپنے لفظوں میں ''دہلی کی قلعہ معلیٰ کی زبان ہو نہ ہو، لکھنؤ کی واجد علی شاہی زبان ہو نہ ہو عہدِ جدید کی ترقی یافتہ زبان ہو نہ ہو یہ دریائے گنگا اور دریائے سون کے پوربی دکھنی سنگم کی زبان ہے'' (صفحہ د) اس لئے اس خودنوشت کی افادیت کا دائرہ اور بھی محدود ہو جاتا ہے۔

کلکتہ میں تھے تو تھیٹر دیکھنے کی عادت پڑ گئی۔ تھیٹر کے ہی ایک گیٹ کیپر نے پہلے انہیں ٹوکا کہ یہ اچھی عادت نہیں۔ جب یہ باز نہ آئے تو انہیں ایک طرف لے جا کر بری طرح پیٹا پھر لے جا کر ان کے باپ کے حوالے کیا۔ انہوں نے سرزنش کی تو انہیں بہت بری لگی اور اپنی آوارگی کی ترنگ میں گھر سے بھاگ لئے۔ ماں باپ کو تکلیف تو ضرور ہوئی مگر انہوں نے ان کی خبر ضرور رکھی ان کو واپس نہیں بلایا۔ جب پیسے ختم ہو گئے تو ماں کا بھیجا ہوا تعویذ کھولا جس کے بارہ میں تاکید تھی کہ صرف اس وقت اس تعویذ سے رجوع کیا جائے جب دیگر تمام راستے بند ہو گئے ہوں۔ چنانچہ مفلسی اور اپنی ''غیرت'' کی

وجہ سے خودکشی کا فیصلہ کر لیا تو ماں کے بھیجے ہوئے تعویذ کی طرف رجوع ہوئے اس تعویذ میں دعا وغیرہ تو کوئی تھی نہیں ہاں ایک سو روپیہ کا نوٹ بندھا ہوا تھا۔ اس اچانک یافت نے ان کے حوصلے بلند کر دئے۔ خودکشی کا ارادہ ترک کر دیا اور حیلے بہانے سے گھر واپس چلے گئے۔ اس عرصہ میں پیٹ کی فکر انہیں نہ تھی البتہ ظاہری ٹیپ ٹاپ اور لباس کی فکر انہیں ضرور رہتی تھی۔ ''دلی کی دل والی۔ منہ چکنا پیٹ خالی'' والی مثل ان پر صادق آتی تھی۔ بھوک مٹانے کے لئے بھنے ہوئے چنے یا ستو مگر کپڑوں پر استری اور جوتوں پر پالش کے لئے ان کے پاس پیسے موجود ہونا چاہئیں۔ یہی ظاہری ٹیپ ٹاپ ان کی خود نوشت میں ہر جگہ ہر مقام پر ہر شخصیت کے باب میں ملتی ہے۔ جس شخصیت کا ذکر کرتے ہیں پہلے اس کے لباس کی تراش خراش کا بیان ہوتا ہے۔ ظاہری ٹیپ ٹاپ ہی ان کی اپنی شخصیت کا لب لباب ہے۔

لباس کے بارہ میں ان کا شوق غلو کی حد تک پہنچا ہوا ہے۔ حتیٰ کہ اچھا لباس پہن کر مانگے تانگے کی ''بیوک'' میں ''نواب صاحب'' بن کر نظام حیدر آباد کو دیکھنے مسجد میں پہنچتے ہیں تو ان کا سامنا ایک نہایت سادہ لباس میں ملبوس نظام سے ہوتا ہے۔ اس کے باوجود انہیں اپنے انتظامِ لباس پر کوئی کوفت نہیں ہوتی۔

اپنی شاعری اور نثر کے بارہ میں بھی انہیں ایسی ہی غلط فہمی ہے۔ آغا حشر کا ایک ڈرامہ دیکھنے کے بعد اسے حرف بہ حرف نقل کر لیتے ہیں اور لکھتے ہیں ''وہ کتاب رہتی تو ڈرامہ میں ایسا اضافہ ہوتا جو اس صنف کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا'' (صفحہ ۵۷) مگر قدرت نے اردو دان طبقہ کو بچا لیا۔ کوئی نہ کی تھی دلِ نابکار نے۔ مجھ کو بچا لیا مرے پروردگار نے۔ اپنے شعروں کا حوالہ جا بجا دیتے ہیں اور اپنے کلام کو سند مانتے ہیں یہ ایسی کم ذوقی ہے جس کا مظاہرہ اعلیٰ ذوق والے لوگ نہیں کرتے۔ اسی طرح اپنے کلام کا دیباچہ ''وہ جو شاعری کا سبب ہوا'' انہوں نے لکھا ہے۔ لکھتے ہیں ''بیشتر حلقوں سے تقاضا ہے کہ نثری دیباچے کو علیحدہ شائع کرو۔ جلدی لکھا تھا خود مجھے بھی سیری نہیں تھی'' (صفحہ ۱۴۳) اس لئے جہاں تہاں اس کا حوالہ دیتے ہیں کہ میں نے یہ لکھا تھا اور وہ لکھا تھا مگر کیا لکھا تھا اس کا تذکرہ نہیں ملتا۔ خود پسندی میں بھی کتنی قباحتیں ہوتی ہیں۔

دراصل اس کتاب کی بے ربطی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ''ان کے لکھنے میں وقفہ طویل رہا ہے کسی

دن بیٹھ کر آٹھ دس صفحات لکھے پھر درمیان میں دو ہفتوں کا وقفہ ہو گیا'' (صفحہ ۱۹۳)۔ اگر وقفے کے بعد لکھنا شروع کرنے سے پہلے پچھلے لکھے کو پڑھ ہی لیتے تو یہ حال نہ ہوتا کوئی تھوڑا بہت ربط ان کی خود نوشت میں رہ جاتا مگر معلوم یوں ہوتا ہے کہ قلم پکڑ کے لکھنا شروع کر دیتے ہیں یہ تک نہیں سوچتے کہ پہلے کیا لکھ چکے ہیں اور اب انہیں کیا لکھنا ہے۔ محض لکھنا تو کوئی کام نہیں۔ عبادت بریلوی صاحب کے بارہ میں نقادوں کا یہی کہنا ہے کہ ان کی تحریر میں جو طوالتِ بے جا ہوتی ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ ایک موضوع پر جو کچھ لکھتے ہیں وہ وقفوں سے لکھتے ہیں اور دوبارہ شروع کرنے سے قبل پچھلے لکھے کو نہیں پڑھتے۔ عاجز صاحب کی اس عادت سے پڑھنے والا عاجز آ جاتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''پونے دو سو صفحات لکھ چکا ہوں اب تک نہ میری تصویر واضح ہوئی ہے نہ اس واقعہ کی طرف قلم مڑا ہے'' (صفحہ ۱۴۳) اس واقعہ سے مراد وہی واقعہ جس کے ذکرِ متواتر سے قاری اکتا چکا ہے' کیا ہے کیا نہیں ہے یہ پردہ میں ہے۔ اور قاری یہی سوچتا رہ جاتا ہے کون معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں۔

رجال کے حصہ میں اپنے ننھیال کا بہت ذکر ہے فلاں نانا اور فلاں نانا۔ یا اس درخت کا جو اس گاؤں کی سماجی زندگی کا محور تھا مگر کہیں وہ چیز جسے شخصیت نویسی کہتے ہیں سامنے نہیں آپاتی۔ جس کسی کا ذکر ہے اس کے لباس کی تفصیل پوری موجود ہے مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ البتہ ایک گھسو خلیفہ کے بارہ میں انہوں نے کچھ ذرا سا لکھا ہے کہ وہ لکڑی کے فن کے ماہر تھے اور انہیں اور ان کے بزرگوں کو لکڑی کے داؤ پیچ سکھانے کے لئے بلوائے گئے تھے ان کی شخصیت میں ان کی ہیئت کذائی کی وجہ سے ذرا سی دلچسپی قاری کو ضرور پیدا ہوتی ہے مگر وہ بھی ان کی ژولیدہ نویسی میں گم ہو جاتی ہے۔

غالب کے تتبع میں عاجز صاحب نے اپنا ایک شعر درج کیا اور اس سے سند پکڑی ہے کہ ''بکنے بھی دو عاجز کو جو بولے بکے ہے۔ دیوانہ ہے دیوانے کی کیا بات کرو ہو''۔ اب میں یہ گستاخی کیوں کروں کہ کہوں سچ فرمایا بجا فرمایا۔ ان کی خودنوشت پڑھنے والے سے خود ہی کچھ کہلوا لے گی۔ اور ملحوظِ خاطر رہے کہ یہ بکنا دلی یا لکھنؤ کی زبان کا بکنا نہیں گنگا اور سون کے پوربی دکھنی سنگم کے علاقہ کا بکنا ہے جہاں لوگ مشاعروں میں مکرر ارشاد کی بجائے دوبارہ بکیئے کہہ کر تحسینِ سخن شناس کا اظہار کرتے ہیں۔

◎

یہ لاہور ہے

ابوالحسن نغمی کی یادوں کی کتاب ''یہ لاہور ہے'' سنگ میل والوں نے چھاپی ہے۔ یہ ان کی ریڈیو پاکستان لاہور سے سولہ سالہ وابستگی کی داستان ہے۔ نغمی صاحب نے اپنی ابتدائی ''ریڈیائی'' زندگی کا بیشتر عرصہ لاہور میں گذارا اور پھر صدائے امریکہ کی ہم نوائی کرنے لگے۔ اب امریکہ میں ہی مقیم ہیں مگر لاہور کی یادوں کے رنگ ان کے دامن پر اتنے گہرے ہیں کہ کسی طرح چھٹائے نہیں چھٹتے۔ انہوں نے ''نشریات کے چمن میں سبزہ ء بیگانہ'' (صفحہ ۱۴۶) ہونے سے لے کر پختہ سکرپٹ رائٹر ہونے تک کا عرصہ لاہور میں گزارا ہے اور ان کے پختہ سکرپٹ رائٹر ہونے کا نتیجہ ہے کہ ان کی یہ کتاب بھی ریڈیو سکرپٹ ہی لگتی ہے اور خود ان کے لفظوں میں ان کے ریڈیو کے لکھے کی ''کوئی ادبی حیثیت نہیں'' (صفحہ ۱۷۲)۔ ہر چیز کہ در کانِ نمک رفت نمک شد۔ حمید نسیم نے بھی اپنی ریڈیائی تحریروں کے باب میں یہی کہا تھا کہ یہ تیسرے درجے کی چیزیں ہیں اور انہوں نے اپنی زندگی تیسرے درجہ کی چیزیں لکھنے میں صرف کر دی۔ بہ قول شخصے ریڈیو والے ہمیشہ ''ہوائی'' باتیں کرتے اور لکھتے ہیں حقی صاحب نے کہا تھا کہ یہ لوگ ہمیشہ ''برباد'' ہوتے رہتے ہیں یعنی ''آن دی ایر'' رہتے ہیں۔ ''یہ لاہور ہے'' نغمی صاحب کی ''بربادی'' کا نمونہ ہے۔

ہم نے پچاس کی دہائی میں ادبی رسالوں میں لکھنا پڑھنا شروع کیا۔ اس زمانہ میں کبھی کبھار نغمی صاحب کے مضامین نظر سے گذرتے رہے مگر ان کا کوئی دیرپا اثر ذہن پر مترتب نہیں ہوا۔ پھر ادھر ادھر کے رسالوں میں ان کی کچھ تحریریں سامنے آئیں۔ ان کی شاعری (اب خود یہ کہتے ہیں وہ طنزیہ شاعری تھی۔ ہو گی۔ آپ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے) کے کچھ نمونے بھی اخبارات کی زینت بنتے رہے مگر ہمارے دامن کو اپنی جانب کھینچ نہ سکے۔ انہیں خود بھی تو اپنی طنزیہ شاعری کا ایک نمونہ یاد ہے کہ ''پریس میں پڑی ہے کتابِ محبت'' اس طنزیہ شاعری کی بے اثری کی لم اب آ کے معلوم ہوئی کہ یہ طنزیہ

شاعری میں شوکت تھانوی کے شاگرد تھے اور شاعری ہی شوکت صاحب کی ادبی شخصیت کا سب سے کمزور پہلو تھا۔ ہاں اتنا محسوس ہوتا ہے کہ یہ باوجود خورد ہونے کے ''بڑوں'' پر طنز وتعریض سے باز نہیں آتے اور اپنے ریجنل ڈائریکٹروں کی یا اسسٹنٹ ریجنل ڈائریکٹروں کی تو با قاعدہ ''کانفیڈنشل رپورٹیں'' لکھنے سے بھی نہیں چوکتے۔ ''علم وفضل شعر وسخن اور ادبیات یا کسی بھی تخلیقی عمل سے ان کا کوئی تعلق ظاہر نہ ہو سکا یا اگر زیادہ محتاط گفتگو کی جائے تو یہ کہنا درست ہوگا کہ میرے علم میں کبھی ایسی بات نہ آ سکی۔ میں نے کسی محفل میں انہیں گفتگو کے دوران میں کسی شاعر کا شعر پڑھتے نہیں سنا۔ ان کی زبان سے کوئی لطیفہ یا کوئی تبسم خیز واقعہ بھی نہیں سنا کسی بات پر کبھی بلند آواز سے قہقہہ لگاتے نہیں دیکھا۔ میری ناچیز رائے یہ ہے کہ اپنے پروگرام پروڈیوسروں کو کسی اچھوتے پروگرام کا نادر خیال سجھانے سے قاصر ہیں'' (صفحہ ۳۶۷) یہ ایک جونیئر سکرپٹ رائٹر کی لکھی باتیں ہیں۔ لگتا ہے وہ اپنے افسر کے افسرِ اعلیٰ ہیں اور اس کی کانفیڈنشل رپورٹ لکھ رہے ہیں۔ ایسی باتیں وہی لوگ کیا کرتے ہیں جو خود اپنے آپ کو ہمہ دان سمجھتے ہوں اور احساسِ کمتری میں مبتلا ہوں۔ قدرت اللہ شہاب بھی کئی جگہ اس ''جرمِ ضعیفی'' کے مرتکب ہوئے ہیں اور اپنے شہاب نامہ کو خودنوشتوں کے زمرہ میں کمزور خودنوشت بنا دیا ہے۔

نغمی صاحب سیتا پور کے ہیں یعنی پکے پوربیے ہیں۔ پنجاب میں لمبا عرصہ رہے اس لئے پنجابی بھی ہو گئے مگر ان کا ''امروہہ پن'' یعنی ان کا پوربی ہونا ان سے نہ چھٹ سکا۔ جہاں تہاں پنجاب والوں پر طنز وتعریض کے نشتر چلاتے رہتے ہیں مگر اس ''امروہے پن'' میں اخلاق احمد دہلوی جیسے سینئر اور منجھے ہوئے براڈ کاسٹر پر جو فقرہ انہوں نے چست کر دیا وہ ہمارے حلق سے تو نہیں اترا کہ ''علمیت کی سطح پر ان کی اس طرح تربیت نہ ہو سکی جیسی کہ ہونا چاہئے تھی'' (صفحہ ۸۳)۔ ایک سینئر اور مانے ہوئے زبان دان براڈ کاسٹر پر یوں فقرہ چست کر دینا خود ان کی ''عدم تربیت'' پر دال ہے۔ اخلاق احمد دہلوی ریڈیو کے ان زبان دانوں میں سے تھے جن پر ریڈیو بجا طور پر فخر کر سکتا ہے اور ان کے کمالات کا اعتراف بھی نجمی صاحب کو ہے لیکن ان کے اندر کہیں جو زہر پرورش پا رہا تھا وہ آخر کے تئیں نکل کر کاغذ پر آ گیا۔ یہی حال ان کے محسن سید ہاشم رضا کا بھی تھا وہ بھی اندر ہی اندر کینہ پالتے رہتے تھے ان کی اردو عنوان ''ہماری منزل'' والی انگریزی سرگزشت ان کی کینہ توزیوں کا ''گنجِ یاد

آورد'' ہے۔

یادوں کی بازگشت میں صرف وہی باتیں مستند ہوتی ہیں جو خود لکھنے والے پر بیتی ہوں یا لکھنے والا ان کا شاہد ہو مگر بعض مقامات پر نغمی صاحب نے ایسی باتیں بیان کی ہیں جو محض سنی سنائی ہیں۔ مثلاً صوفی تبسم صاحب کے پوتے کا نام smile یعنی اسماعیل رکھنے کا واقعہ اخلاق صاحب نے شوکت تھانوی سے منسوب کیا ہے کہ انہوں نے یہ کہا تھا کہ اس طرح آپ کی امریکن بہو کو بچے کا نام لینے میں آسانی رہے گی۔ نغمی صاحب نے اس بات کو حمید اعظمی صاحب سے منسوب کر کے بیان کیا ہے۔ ہم نے خود صوفی صاحب سے یہی بات یوں سنی ہوئی ہے کہ '' اسماعیل کا نام رکھ کر ہم نے اپنے نام کا سجع کہا ہے''۔ خیر یہ تو معمولی بات ہے نغمی صاحب نے جس سے یہ بات سنی اس کے نام سے منسوب کر دی مگر مصطفیٰ علی ہمدانی سے منسوب کر کے جو بات نغمی صاحب نے کہی ہے وہ ان کی بے خبری پر دلالت کرتی ہے۔ لکھتے ہیں ''دوسری عالمی جنگ چھڑی ہوئی تھی اور حکومت برطانیہ کو ایسے مشہور لوگوں کی تلاش تھی جو انگریزوں کی حکومت کے حق میں تقریر کر سکیں۔ چنانچہ مرزا البشیر الدین محمود صاحب کو ریڈیو سٹیشن آنے اور تقریر کرنے کی دعوت دی گئی۔ تقریر کا کل وقت پانچ منٹ تھا لیکن ہمدانی صاحب نے اندازہ کر لیا کہ تقریر قدرے طویل ہے اس لئے انہوں نے مرزا صاحب سے کہا کہ آپ کی تقریر کچھ طویل ہے قدرے تیزی سے پڑھئے گا۔ مقرر نے ہمدانی صاحب کی بات کا زیادہ ہی اثر قبول کر لیا اور تین منٹ میں تقریر ختم کر کے کھلے ہوئے مائیکروفون پر کہا ''لو جی ہمدانی صاحب میں نے تو تین ہی منٹ میں بھگتا دی'' (صفحہ ۱۲۸) انہوں نے ہمدانی صاحب پر رکھ کر ایک بے سروپا بات کہہ دی ہے۔ جماعت احمدیہ کے سربراہ صرف ایک بار ریڈیو پر آئے اور وہ تحریکِ خلافت کے زمانہ کی بات ہے۔ دوسرے وہ ایسے بے خبر نہ تھے کہ کھلے مائیکروفون پر ایسی بات کہہ دیں جو نہیں کہنی چاہئے۔ تیسرے یہ لہجہ ہرگز مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب کا نہیں تھا۔ انہوں نے دہلی کی ماں کی گود میں پرورش پائی تھی اس لئے وہ ایسی سبک زبان نہیں بولتے تھے کہ '' لو جی فلاں صاحب میں نے۔۔'' ان کی زبان بڑی ثقہ ہوتی تھی۔

قصہ مختصر یادوں کی اس کتاب میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جو ان کی یادیں نہیں ہیں دوسروں کی کہی ہوئی باتیں ہیں جنہیں نغمی صاحب نے ''ضعیف راوی'' کے طور پر بیان کر دیا ہے۔

نغمی صاحب اپنی ہر بات کی سند دوسروں سے لینا چاہتے ہیں۔ پروفیسر عبدالبشیر آذری صاحب کے ہمراہ مولانا مودودی صاحب کے پاس موسیقی کے باب میں استفسار کے لئے جانا چاہا لیکن ایسے وقت میں گئے جب یہ بات کہنے کا موقع نہیں تھا۔ حیات احمد خان صاحب کا خط انتظار حسین نے ''چراغوں کا دھواں'' میں درج کیا ہے اس سے نغمی صاحب کی تشفی ہو جانی چاہئے ''تھوڑے عرصہ کی بات ہے کہ مغربی پاکستان میں موسیقی کو دفنانے کا حکم ہوا تھا۔ یہ حکم اسلام کے نام پر جاری کیا گیا تھا میں نے سوچا کہ مولانا مودودی عالم دین ہیں اس معاملہ میں ان کی رائے معلوم کی جائے۔ چنانچہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا انہوں نے فرمایا کہ دف کے ساتھ گانا جائز ہے میرے استفسار پر کہ اگر طبلے پر گایا جائے تو اس صورت میں کیا احکام ہوں گے مولانا نے کہا کہ طبلے کی سنگت میں گانا جائز نہیں۔ میں نے وضاحت چاہی تو انہوں نے فرمایا کہ دف ایک طرف سے بند اور دوسری طرف سے کھلی ہوتی ہے۔ طبلہ چونکہ دونوں طرف سے بند ہوتا ہے اس لئے اس کے ساتھ گانا جائز نہیں'' (صفحہ ۲۲۵۔۲۲۶)۔ لیجئے جس مسئلہ کو یہ مودودی صاحب سے پوچھنا چاہتے تھے وہ حیات احمد خاں نے پوچھ لیا۔ اب کیا نغمی صاحب اس استفسار کو اپنی یادوں کی کتاب میں درج کرنا چاہیں گے۔ نہیں۔ اس لئے کہ یادوں کی کتاب ہر شخص کی اپنی ذاتی ذہنی ملکیت ہوتی ہے اس میں دوسروں کی کہی ہوئی یا سنی ہوئی باتوں کو درج کر دینے سے کتاب کی وحدت مجروح ہوتی ہے۔

اس کتاب کا سب سے کمزور پہلو یہ ہے کہ نغمی صاحب لطیفہ یا کوئی اور ہلکی پھلکی بات کہتے ہیں تو اپنے ''کند ذہن'' قارئین کے لئے اس کی تشریح کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ آپ نے ایسی حرکت متعدد بار کی ہے بھائی میرے آپ نے لطیفہ کہہ دیا جس کو سمجھ آئے گی وہ اس سے لطف اندوز ہوگا نہیں آئے گی تو آپ کا کیا جائے گا؟ مثلاً ناصر قریشی نے ایک بات کہی کہ ''میں کیوں ماروں گا کارپوریشن والے خود ہی ماریں گے''۔ اب انہیں خیال آیا کہ ''یہ انتہائی قہقہہ آور فقرہ بعض لوگوں کے سر کے اوپر سے گذر جائے گا'' (صفحہ ۱۰۵) تو اس کی تشریح فرماتے ہیں کہ اس کا پس منظر کیا ہے۔ اسی طرح شوکت تھانوی صاحب نے کسی سے کہا ''آپ کو دیکھ کر ہز ماسٹرز وائس کا ٹریڈ مارک یاد آتا ہے جس میں گراموفون کے بھونپو کے سامنے کوئی بیٹھا ہوا ہے'' (صفحہ ۲۲۲)۔ نغمی صاحب اس کی تشریح فرماتے ہیں کہ شوکت

صاحب نے کتے کا لفظ بالکل نہیں کہا صرف یہ کہا کوئی بیٹھا ہوا ہے۔ اس قسم کی باتیں اس بات کا ثبوت ہوتی ہیں کہ لکھنے والا اپنے قارئین کو اپنے سے کمتر یا فروتر سمجھتا ہے اور ان کی کہی ہوئی لطیف باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ ارباب نفسیات اس کو بھی احساسِ کمتری کی ایک قسم قرار دیا کرتے ہیں۔ خدا نخواستہ نغمی صاحب ایسے کیوں ہونے لگے بس رواروی میں ایسی باتیں لکھ گئے ہیں۔

پھر ایک موقعہ ایسا آیا کہ انہیں سودیشی ریل کے بارہ میں کچھ کہنا تھا۔ آپ نے اس کا خلاصہ اپنے لفظوں میں بیان کرنا شروع کر دیا (صفحہ ۲۱۸)۔ کہاں شوکت تھانوی کا بیان کہاں نغمی صاحب کی ''نغمہ سرائی'' پھر یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ خود نغمی صاحب کو سودیشی ریل کی ایمائیت سمجھ نہیں آئی۔ من چہ سرائم و طنبورۂ من چہ سرائد۔ ایسا کرنا بڑی غیر ادبی حرکت ہے یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی غالب کے شعر کا حوالہ دینا چاہے تو شعر سنانے کی بجائے اس کا خلاصہ اپنے لفظوں میں بیان کر کے سرخ رو ہو جائے۔ جس نے سودیشی ریل نہیں پڑھی وہ تو ادب کے ایک بہت بڑے شاہکار سے محروم ہے آپ کا خلاصہ تو اسے سودیشی ریل کے ادبی مرتبہ کے بارہ میں سوئے ظن میں مبتلا کر دے گا۔

اشفاق احمد کے بارہ میں یہ واقعہ بھی ان کا سنا سنایا ہے کہ سکھ یاتری تلقین شاہ کو ملنے آئے تو اشفاق احمد کو مل کر ان کی تشفی نہ ہوئی وہ تلقین شاہ کی زیارت پر اصرار کرتے رہے تو اشفاق احمد نے ان سے یہ کہہ کر پیچھا چھڑایا کہ ''تایا جان تے پنڈ گئے نیں'' (صفحہ ۲۶۳) اس بات کے سنے سنائے ہونے کا داخلی ثبوت یہ ہے کہ پنجاب میں لوگ تایا جان نہیں تایا جی کہتے ہیں۔

خیر ان باتوں کو چھوڑئے۔ یہ لاہور ہے ابوالحسن نغمی کی یادوں کا مرقع ہے اور ایک لحاظ سے ریڈیو پاکستان کی تاریخ ہے اس لئے اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جانا چاہئے باقی رہے ان کے تعصّبات تو وہ کس میں نہیں ہوتے؟ مگر یادداشتی ادب میں ذاتی تعصّبات کو راہ دینا مستحسن نہیں سمجھا جاتا۔ کتاب دلچسپ ہے اس کی زبان رواں دواں ہے بے سر و پا سفرناموں اور انگریزی میں سوچ کر اردو میں لکھی ہوئی یادداشتوں کے اس دور میں ایسی کتاب کا ہونا غنیمت ہے'' اور اس دور کے انسان سے کیا چاہتے ہو''؟

◎

میرے ہمسفر

جناب احمد ندیم قاسمی نے ایک بار بڑے درد سے فرمایا تھا کہ ہمارے ہاں اردو کی خودنوشت سوانح عمریوں کے موضوع پر کام نہیں ہوا اور یہ بڑی تشویش کی بات ہے۔ جب اس موضوع پر میری کتاب ''پس نوشت'' لاہور سے ۲۰۰۳ میں شائع ہوئی تو مجھے یہ لکھتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ پہلا خط جناب احمد ندیم قاسمی کا تھا جس میں انہوں نے اس موضوع پر کام کرنے کی محنت کو سراہا تھا۔ اب کی ان کی خودنوشت تو نہیں، خودنوشت کی پیشرو کتاب ''میرے ہمسفر'' اساطیر کی جانب سے چھپی ہے اور میں ان کے خاکوں کا جائزہ لینے بیٹھا ہوں۔ ان خاکوں کے لکھے جانے کی وجہ تسمیہ خود قاسمی صاحب کے لفظوں میں یہ ہے کہ '' بہت مدت تک مجھے اس محبت بھرے مطالبہ کا سامنا رہا کہ میں اپنے سوانح لکھوں۔ دراصل میرے طبقہ کے دیگر افراد کی طرح میری زندگی بھی نشیب وفراز سے اٹی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کا مفصل بیان نہ صرف دلچسپ ہوتا بلکہ تحریکِ خلافت، تحریکِ آزادی، تحریکِ پاکستان اور قیامِ پاکستان کے بعد بیشتر سیاست دانوں کی سیاست بازیوں اور پھر ہماری افواج کے بعض سربراہوں کی یلغاروں کی تاریخ بھی مرتبہ ہو جاتی۔۔۔'' مگر قاسمی صاحب کے ''معمولاتِ حیات میں سے اس کام کے لئے وقت ہی نہ نکل سکا''۔ اس کی ایک وجہ آپ نے یہ بیان کی ہے ''کہ مجھے انفرادی اور اجتماعی سطح پر سچ بولنا بھی آتا ہے''۔ ان کے اس بیان سے قاری کے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ قبلہ قاسمی صاحب کو سچ بولنا آتا تو ہے مگر وہ بولنا نہیں چاہتے اور اسے کسی اور وقت پر اٹھا رکھنا چاہتے ہیں؟ یا یہ کہ ان میں وہ جرات نہیں ہے جو سچ بولنے کے لئے درکار ہوتی ہے؟۔

قاسمی صاحب کو منصورہ احمد کا یہ مشورہ بڑا خوش آیا کہ '' آپ نے اپنی طویل زندگی میں علم و ادب اور شعر و فن کی اہم شخصیات کے ساتھ خاصا طویل وقت گذارا ہے جب آپ ان شخصیات کے متعلق اپنی یادوں کو سمیٹیں گے تو بالواسطہ طور پر خود اپنے سوانح کے بعض حصوں کا بھی ذکر کرتے چلے

جائیں گے اور یوں عصرِ حاضر کے ادب کو دوگونہ فوائد حاصل ہوں گے''۔ یہ خاکے دراصل قاسمی صاحب کی خودنوشت سوانح عمری کا حصہ ہیں وہ سوانح عمری جس کے لکھنے کا انہیں وقت نہیں مل سکا اور منصورہ احمد کے لفظوں میں '' تقریباً تین چوتھائی صدی پر پھیلا ہوا یادوں کا تسلسل ہمیشہ ملاقاتیوں کے ہجوم، فلیپ، دیباچوں اور صدارتوں کے دباؤ سے شکست کھاجاتا'' رہا۔

فیض صاحب کے بارہ میں ان کے لکھے ہوئے خاکہ پر بہت لے دے ہوئی۔ یار لوگ سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے بعض باتوں کو لے اڑے اور قاسمی صاحب کے لئے اچھی خاصی آزمائش کھڑی کر دی۔ میں اس بارہ میں کچھ کہنے سے اس لئے گریز کر رہا ہوں کہ یہ ''ایک بڑے آدمی کی دوسرے بڑے آدمی کے بارہ میں رائے ہے''۔ اس لئے چھوٹے لوگوں کو اس میں دخل نہیں دینا چاہئے۔ اگر فیض صاحب نے قاسمی صاحب کا تعارف ایک صحافی کی حیثیت ہی سے کروایا ہے تو فیض صاحب انہیں محض صحافی ہی سمجھتے ہوں گے اس میں ہمیں آپ کو دخل دینے کا کیا حق ہے؟ قاسمی صاحب کو بھی فراخ حوصلگی کا مظاہرہ کرنا چاہئے تھا کیونکہ شعروادب میں ان کی بزرگی اور بڑائی کسی کے کہے سنے سے متاثر نہیں ہو سکتی نہ ہی ایسی بیساکھیوں کی محتاج ہے۔ قاسمی صاحب فیض صاحب کی بات مان لیتے تو کیا حرج تھا کہ ''شعروادب کی بڑی شخصیتوں کی مثبت کارکردگی کے اعتراف کے بعد ان کی منفی سرگرمیوں کو نظر انداز کر دینا ہی مناسب ہوتا ہے'' (صفحہ ۱۰۹)۔ قاسمی صاحب اس سخن گسترانہ موقع پر بھی ''تخلیق کے دودھ میں موضوع کو کھانڈ کی طرح گھول دیتے'' (صفحہ ۱۷) تو کیا اچھا ہوتا۔ اس معاملہ میں ''ترقی پسندوں'' نے جو غیر ترقی پسندانہ رویہ اختیار کیا وہ بھی قابلِ افسوس ہے۔ اوپر میں نے قاسمی صاحب کے ایک خط کا ذکر کیا ہے اس خط میں قاسمی صاحب نے مجھ سے سوال کیا تھا کہ ''جاوید شاہین کہاں کے ترقی پسند ہیں؟'' مجھے اس سوال کے پس منظر کا علم نہیں تھا اب یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ قاسمی صاحب کی سالگرہ کی دعوت کے حوالہ سے جس شخص نے اپنی خودنوشت ''میرے ماہ وسال'' میں قاسمی صاحب کو موردِ طعن بنایا تھا وہ جاوید شاہین صاحب تھے۔ گویا جو شخص کسی کو موردِ طعن بنائے وہ ترقی پسندی کے رتبہ بلند سے گر جاتا ہے؟ اور دوسروں کو موردِ طعن و تشنیع بنانا تو ترقی پسندوں کا دل پسند مشغلہ رہا ہے۔ مولوی لوگ تو '' آگ تکفیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں'' اور ترقی پسند؟ وہ تو اپنی ترقی پسندی کی ترنگ میں ہر شخص کو رجعت پسند کہنے پر ادھار کھائے بیٹھے تھے اور حال یہ تھا کہ ہر شخص جو ''حرفے چند'' لکھ لیتا تھا وہ

ترقی پسند کہلانے لگتا تھا اور پطرس کے قول کے مطابق ''پڑھے نہ لکھے نام محمد ترقی پسند!'' (اخلاق احمد دہلوی۔ ''پھر وہی بیاں اپنا'' صفحہ ۱۴۷) بن جاتا تھا۔ سکہ بند ترقی پسند وامق جونپوری کی خودنوشت ''گفتنی ناگفتنی'' ترقی پسندوں کی انہی ناگفتنیوں کے ''نشیب وفراز سے اٹی پڑی ہے''۔ قاسمی صاحب نے کئی ادیبوں کو اپنی ترقی پسندی کے زمانہ میں بائیکاٹ کا نشانہ بنایا تھا اور اس کی گواہی انتظار حسین کی خودنوشت ''چراغوں کا دھؤاں'' میں بہت ملتی ہے۔ کیا وہ سب لوگ رجعت پسند تھے؟ وقت نے اس سوال کا کافی وشافی جواب دے دیا ہے اس لئے اس موضوع پر لے دے کرنا محض گڑے مردے اکھاڑنے کے مترادف ہوگا۔ آں قدح بشکست وآں ساقی نماند۔

سالک صاحب والے خاکہ میں واقعی عقیدت اور احترام ہی غالب عنصر ہے مگر اس کے ساتھ ہی قاسمی صاحب نے سالک صاحب کے ساتھ اپنے نظریاتی بعد کا ذکر بھی کر دیا ہے۔ اس نظریاتی بعد کے باوجود سالک صاحب نے قاسمی صاحب کو اپنی بزرگانہ شفقت سے محروم نہیں رکھا۔ خوردنوازی سالک صاحب کی شخصیت کا ایسا پہلو ہے جس کے دوست دشمن سب معترف ہیں سوائے احمد بشیر کے جنہوں نے اپنے سوانحی ناول میں سالک صاحب کو 'سازشی' اور 'حکومت کا ایجنٹ' (دل بھٹکے گا۔ صفحہ ۴۵۰) کہہ کر خدا جانے سالک صاحب کی کس نیکی کا بدلہ دیا ہے۔ ان کے مرشد چراغ حسن حسرت تو سالک صاحب کو اپنا مرشد مانتے تھے۔ سالک صاحب کی امروز کے ساتھ کوئی نظریاتی دشمنی نہیں تھی کیونکہ وہ ایسی چیزوں کے قائل ہی نہیں تھے۔ قاسمی صاحب کی گواہی احمد بشیر کے مفروضہ کو جھٹلانے کو کافی ہونی چاہئے کیونکہ انہوں نے سالک صاحب کو برتا ہے۔ احمد بشیر صاحب تو انہیں دور سے دیکھنے کے گنہگار ہوئے ہیں۔ تس پر وہ بزرگوں پر زبان درازی پر دلیری دکھاتے ہیں۔ اے کاش انہیں اس باغ وبہار اور علم مجلسی میں رچے بسے شخص کے ساتھ چندے رہنے اور اسے دیکھنے سمجھنے کا موقع ملا ہوتا ''جس کی شخصیت میں مشرق مجسم ہوگیا تھا''۔ (صفحہ ۱۷)

سالک صاحب محض فکاہیہ لکھتے ہی نہیں تھے بولتے بھی تھے اور ایسا کرنا اسی شخص کو سزاوار ہے جس کو زبان وبیان پر مہارتِ تامہ حاصل ہو۔ جو شخص سالک صاحب کے مزاح پر یہ کہہ کر انگلی رکھتا ہے کہ ''اگر آدمی عام گفتگو میں مزاحیہ انداز رکھتا ہے تو اس کے لئے بہت سے بند دروازے اپنے آپ کھل جاتے ہیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ اس کا مزاح اعلیٰ درجے کا ہو'' (دل بھٹکے گا صفحہ ۴۵۰) تو اس کے بارہ

میں یا اس کی حسِ مزاح کے بارہ میں اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے؟ کہ ''اس کے منہ کا ذائقہ خراب ہے'' (صفحہ ۲۹)۔ اس قبیل کی ایک مثال سالک صاحب ہی کے حوالہ سے قاسمی صاحب نے حکیم دینا ناتھ کوہلی کی بیان کی ہے جنہیں ہری چند اختر والی پھبتی کی سمجھ نہیں آئی تھی اور وہ دانت نکوس کر رہ گئے تھے۔ یہ دل بھٹکے گا والے بھی اسی پائے کے حکیم ''دانت نکوس'' لگتے ہیں۔

منٹو والا خاکہ بڑا جاندار خاکہ ہے اور اس کتاب کے تمام خاکوں سے فنی لحاظ سے بہت بہتر خاکہ ہے اس میں منٹو کی شخصیت سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ بے لوث نڈر بے باک اور ضدی۔ یہ بات منٹو ہی کہہ سکتا تھا کہ ''احمد ندیم قاسمی میں نے تمہیں دوست بنایا ہے اپنے ضمیر کی مسجد کا امام مقرر نہیں کیا''۔ اس خاکہ میں قاسمی صاحب نے دہلی کے ایک مشاعرہ کی روداد بیان کی ہے جس کے بعد منٹو جہاں بیٹھتے تھے یہی کہتے تھے ''ندیم کی نظم سب سے بہتر تھی'' (صفحہ ۵۶) حالانکہ وہ نظم ان کی ابتدائی نظم تھی ''نیا ساز نئی تان'' اور اس مشاعرہ میں اپنے وقت کے بڑے بڑے شاعر موجود تھے۔ فیض، راشد، میرا جی، تاثیر، حفیظ، تصدق حسین خالد، اسرار الحق مجاز، روش صدیقی''۔ منٹو کی زبان سے اس قسم کی توصیف انہونی بات نہیں کہ وہ دوستوں کا دوست تھا مگر اس بات کے بیان کرنے کا یہاں کیا محل تھا؟ اور فیض صاحب والے خاکہ میں قاسمی صاحب نے ان سے شکوہ کیا ہے کہ وہ ان کی شاعرانہ حیثیت کو کمتر کر کے دیکھتے تھے اب منٹو کے منہ میں اپنی توصیف کا فقرہ انہوں نے ڈال دیا ہے؟ یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے؟ خدانہ کردہ، کہیں اس کی تہ میں کوئی احساسِ محرومی تو نہیں؟ دراصل خاکوں کی اس کتاب میں یہ دو باتیں تھوڑے سے تفاوت سے دو جگہ بیان ہوئی ہیں اس لئے پڑھنے والے پر یہ اثر مرتب ہوتا ہے کہ قاسمی صاحب کو اپنی توصیف خوش آتی ہے اور عدم توصیف پر وہ پہلو بدلنے لگتے ہیں۔

سوانحی ادب میں خاکوں کا اپنا مرتبہ ہے مگر خودنوشت کے نعم البدل کے طور پر جو خاکے لکھے جائیں ان کا تعلق براہ راست لکھنے والے کی ذات سے ہونا چاہئے۔ مجھے توقع ہے کہ قاسمی صاحب خاکوں کے دوسرے حصہ میں ایسے خاکوں کا انتخاب شامل کریں گے جن کا تعلق براہ راست قاسمی صاحب کی شخصیت سے ہوگا۔

جہانِ حیرت

کچھ عرصہ ہوا' سردار محمد چوہدری' سابق انسپکٹر جنرل پولیس پنجاب کی اردو میں لکھی ہوئی خود نوشت ''متاعِ فقیر'' لاہور سے شائع ہوئی۔ یہ خودنوشت کچھ لکھنے والے کے خلوص و جذبہ کی وجہ سے اور کچھ اپنے اجمال و اختصار کی وجہ سے خاصے کی چیز سمجھی گئی۔ قاری نے ٹوبہ ٹیک سنگھ کے سٹیشن پر محنت مزدوری کرنے والے' اور اسی قصبہ کی کچہری کے چپڑاسی کے بیٹے کو قدم بہ قدم پنجاب کا انسپکٹر جنرل پولیس بنتے دیکھا تو اسے یک گونہ خوشی ہوئی کہ لکھنے والے کے اندر کوئی احساسِ کمتری نہیں ہے اور وہ برملا اپنی غربت کا چرچا کرسکتا ہے۔ پھر اسی مخلص لڑکے نے اعلیٰ پولیس سروس میں آجانے کے باوجود اپنے محسن ایس ڈی ایم کی نوجوان بیوہ بیٹی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے انتہائی محبت اور گرویدگی کے ساتھ بیاہ کر گھر لے آیا تو قاری اس پر صدقے قربان ہونے لگے کہ کیسا اچھا آدمی ہے کہ بڑے مرتبہ پر پہنچ جانے کے تمام امکانات کے سامنے اس نے اپنے محسن کی دکھی بیٹی کا ہاتھ پکڑنا زیادہ پسند کیا ہے۔ متاعِ فقیر میں ابتدا سے انتہا تک ان کی طبیعت کی سادگی اور محبت کا خلوص قاری کو ساتھ لئے چلتا ہے اور ساری کتاب میں ایک عجیب وارفتگی کا احساس موجود رہتا ہے۔ اس کتاب کا لبِ لباب محبت خلوص طبیعت کی غریبی اور مزاج کی سادگی ہے۔ گر بہ نکبت برسی پست نہ گردی مردی۔ گر بہ دولت برسی مست نہ گردی مردی! یہ ساری باتیں ایجاز و اختصار سے بیان ہوئیں اور ان میں بے پناہ کشش پیدا ہوگئی۔ جس نے اس کتاب کو پڑھا اس نے دوبارہ پڑھنے کی خواہش کی!

یہاں تک تو بات مختصر تھی آگے کی داستان طویل بھی ہے بیرنگ بھی اور بعض مقامات پر بیزار کن بھی۔ ہوا یہ کہ انہی سردار محمد چوہدری نے اس خودنوشت کو محدب عدسہ کے نیچے رکھ لیا اور اسے بڑھانے کی سعی کی۔ اور آپ جانتے ہیں کہ ''منی ایچر'' تصویر میں جو حسن ہوتا ہے وہ اس کے ''پیرا فریز'' میں پیدا نہیں ہوسکتا۔ اس لئے خود انہوں نے اپنی اس طول طویل انگریزی خودنوشت The

Ultimate Crime کا اردو ترجمہ ''جہانِ حیرت'' کیا ہے۔ قاری بھی حیران ہے کہ وہ مخلص غریب الطبع شریف النفس آدمی اس کتاب کی گرد میں کہاں کھو گیا ہے؟ اب اسے ڈھونڈھ چراغِ رخِ زیبا لے کر۔

سردار محمد چوہدری ملک میں اہم سیاسی اتھل پتھل کے زمانہ میں بعض اہم ریاستی عہدوں پر متعین رہے۔ پولیس افسر کا کام اپنے حاکموں کو صحیح حالات سے باخبر رکھنا ہوتا ہے اور اس میں کسی کو کلام نہیں مگر جب وہ حاکموں کو باخبر رکھتے ہوئے ''ایک سیلز مین کی سی مہارت و چرب زبانی سے کام لینے لگیں جو خوشامد کی حد تک پہنچ جائے'' (صفحہ ۳۷۶) تو قاری کو حیرت ہوتی ہے کہ یہ کون شخص ہے جو اپنے افسر کو خوش رکھنے کے لئے اس حد تک جھک گیا ہے؟ انہیں تو نواز شریف ''ایک معصوم فاختہ کی طرح لگتے تھے جن پر بھوکے باز اپنے تیز پنجوں کے ساتھ جھپٹنے کے لئے پر تول رہے تھے'' (۳۸۸) یہ بھوکے باز پرویز الٰہی تھے جنہیں ان کے حریف ''کیا پدی کیا پدی کا شوربہ'' کہا کرتے تھے۔ سپیشل پولیس کے آدمی کی حیثیت سے انہیں نواز شریف کو مطلع کرنے کا تو پورا حق تھا مگر ایک پولیس افسر کو زیبا نہیں کہ وہ قولاً فعلاً عملاً سیاسی جوڑ توڑ کا حصہ دار بن جائے۔ سردار محمد چوہدری نواز شریف کی اچھی کتابوں میں آگئے مگر قاری کی ہمدردیاں کھو بیٹھے۔ آگے چل کر جو بات بھی انہوں نے کی قاری نے ان کی بات کو نواز شریف کے پالتو افسر کی بات جانا۔ انہیں شاید اندازہ نہیں ہوا کہ انہوں نے اپنے اعتبار و انحصار کو ضائع کر کے کتنی بڑی قیمت ادا کی ہے۔ چیزے فروختند و چہ ارزاں فروختند!

کبھی ''وہ اپنے ڈی آئی جی وکیل خان کی دم پر پاؤں رکھ لیتے ہیں'' (صفحہ ۲۲۷) کبھی ایوانِ صدر کو ''کنجر خانہ' جی ایچ کیو کو ڈنگر خانہ اور پولیس لائنوں کو لنگر خانہ کہتے ہیں'' (صفحہ ۱۲۷) ''ایک بار جنرل ٹکا خان نے مجھے (جنرل) نیازی کے خلاف نہایت کراہت آمیز شکایت کی تفتیش کا حکم دیا لیکن میں اپنی جان کے خوف سے باز رہا'' (صفحہ ۱۲۱) قاری سوچتا ہے کہ یہ کیسے نڈر پولیس افسر ہیں کہ زبان سے اپنے صدر تک کو معاف نہیں کرتے اور جب کسی جنرل کے خلاف تحقیقات کا حکم ہوتا ہے تو جان کا خوف آڑے آجاتا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ سب باتیں خود ان کے خوف نے ان سے جھوٹ سچ وضع کروادی ہیں؟

۱۹۷۱ کی جنگ میں ان کے دوست بریگیڈئر عطا محمد دسمبر میں ان کے پاس آئے اور انہیں بتایا کہ ''مشرقی پنجاب پر قبضہ ہوا ہی چاہتا ہے اور یہ کہ انہیں مشرقی پنجاب کا فوجی گورنر بنایا جا رہا ہے آپ امرتسر کا ایس پی بننے کو تیار رہیں'' (صفحہ ۱۴۷)۔ یہ نیم رضامند سے ہو گئے اور کہا میرے ڈی آئی جی سے بات کر لیں۔ بریگیڈئر عطا محمد کو اتنا وثوق تھا انہوں نے سیکرٹ فون پر ان کے ڈی آئی جی سے بھی بات کی۔ یہ سب باتیں کسی افسانے کا حصہ لگتی ہیں کیا ہمارے فوجی اور سپیشل پولیس والے اسی خام خیالی میں رہ رہے تھے۔ اور اب ان باتوں کو الم نشرح کرنے کا کیا فائدہ ہے اگر کرنا ہی تھا تو حمود الرحمن کمیشن کے سامنے یہ سب کچھ کہا ہوتا! کیا سردار محمد چوہدری میں اتنی جرات نہ تھی کہ وہ یہ سب باتیں اپنے عہد افسری میں کر سکتے؟

ان کی افسری کا دور بھی دوسروں سے کسی طور سے کوئی ممیز دور نہیں۔ طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی۔ ان کا دعویٰ تو یہ ہے کہ ''ولن کو ولن ہی کہا جائے گا خواہ اس نے بھینس چرائی ہو یا آئین کو منسوخ کیا ہو'' (صفحہ ۵۹۵) حیف کہ ایسا نہ ہو سکا۔ اور تو اور ''کار چوروں کے گینگ پکڑے تو اکوڑہ خٹک والے مولانا سمیع الحق کی چٹ نکل آئی۔ کار میں اسلحہ اور بم تھے'' (صفحہ ۵۸۶) سردار محمد چوہدری نے یہ نہیں لکھا کہ مولانا سمیع الحق کے خلاف ان کی پولیس حرکت میں کیوں نہ آئی؟ انہی کے دور اقتدار میں فیصل آباد میں قرآن جلانے والے مولوی پکڑے گئے (صفحہ ۶۱۰) ان کے خلاف پتہ تک نہیں ہلا۔ یہ کیسے پولیس افسر ہیں؟ نجومیوں پر بے حد اعتقاد رکھتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ اپنی تفتیش میں نجومیوں سے استمداد کرتے ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اپنے نفس ناطقہ اے حمید کے بغیر ان کا ایک قدم بھی نہیں اٹھتا۔ آخر آخر تو انہیں اپنی سپیشل برانچ میں ملازم رکھوا لیتے ہیں تاکہ وقت بے وقت انہیں ادھر ادھر سفر کرنے کی زحمت نہ دینی پڑے۔ نصف سے زیادہ کتاب تو اے حمید صاحب کے ملفوظات و نظریات سے مملو ہے۔ سردار محمد چوہدری نے سوچنے کا کام ان کے سپرد کر رکھا ہے۔

متاع کارواں میں ان کے جن دوستوں نے مجھ جیسے ہم عصر کے ذہن میں یادوں کے دیے روشن کر دیے تھے جہانِ حیرت میں ایک ایک کر کے وہ سارے دیے بجھ جاتے ہیں۔ ایک آدھ بار

کہیں ناصر شمسی کا نام کوندے کی طرح لپکتا ہے ورنہ ہر بات پر اے حمید کی دھند غالب آ گئی ہے۔ غالباً پولیس افسر کے پیشہ ورانہ روزنامچے کو سردار محمد چوہدری کی سرگزشت میں مبدل کرنے کا سہرا بھی انہی کے سر ہے۔ کہ یہ بلا بھی ترے عاشقوں کے سر آئی۔

سردار محمد چوہدری نے اپنی انصاف پسندی کا چرچا بھی خوب کیا ہے۔ بہت سے بے گناہوں کے کیس ختم کیے ہیں اور انہیں اذیت سے نجات دلائی ہے۔ یہ نیک اعمال ان کے کام ضرور آئیں گے۔ آپ نے حاکموں کے کہنے کے باوجود نااہلوں کو ترقی نہ دینے پر بھی ثابت قدمی دکھائی ہے۔ یہ بڑی اچھی بات ہے۔ مگر ضیا کے مارشل لا کے زمانہ میں پیدا ہو جانے والے مذہبی تعصب کا تدارک یہ بھی نہ کر سکے۔ اور اس سنت پر عمل پیرا رہے کہ جس چیز کو قوت سے بدل نہ سکو کم از کم دل میں اس کا برا مناؤ۔

ایک بین مثال ان کے ایف آئی اے کے زمانہ کی ہے ''بعض اوقات دیانت دار سرکاری ملازمین کے غلط مذہبی تعصبات بھی بہت بڑی بے انصافی کا سبب بن جاتے ہیں۔ اس طرح کے ایک کیس میں قومی تحویل میں لی گئی ایک فیکٹری کا مینیجر جو خاصا پڑھا لکھا اور بڑا لائق فائق تھا ملوث پایا گیا۔ اس پر الزام تھا کہ اس نے کچھ فولاد بازاری قیمت سے کم نرخ پر فروخت کر دیا جس سے حکومت کو تیرہ ہزار روپے کا نقصان پہنچا۔ دورانِ تفتیش ایف آئی اے کے ایک انسپکٹر نے اسے مارا پیٹا۔ وہ مینیجر اگلے دن ہانپتا کانپتا اور غصہ میں بھرا ہوا میرے پاس آیا اور کہنے لگا ''میں بڑی مشکل سے آپ تک پہنچا ہوں انسپکٹر مجھے جان سے مارنے پر تلا ہوا ہے میں نے اس کی منت سماجت خوشامد کر کے جان بچائی ہے''۔ میں نے اپنے ڈپٹی ڈائریکٹر جعفر خاں کو جو بڑا قابل اور ایماندار افسر تھا بلایا اور کیس کی تفصیلات کا مطالعہ کرنے لگا۔ وہ فولاد ۱۹۸۰ میں بیچا گیا تھا جب کہ قیمتوں کا موازنہ ۱۹۸۴ کی قیمت سے کیا گیا تھا۔ میں نے یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ ملزم بالکل بے گناہ ہے انسپکٹر کے بارہ میں معلومات حاصل کیں وہ بھی بڑا دیانت دار اور متقی افسر نکلا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟ چھان بین کرنے پر پتہ چلا کہ وہ شکایت مارشل لا ہیڈ کوارٹر کی طرف سے آئی تھی کہ ''ایک بھٹو نواز مرزائی بلاخوف وخطر اربوں روپے لوٹ رہا ہے''۔ میرا خیال تھا اس میں لازماً کسی مذہبی دیوانے کا غیظ و غضب شامل ہے۔ میرا قیاس درست نکلا کارپوریشن کے سربراہ کا تعلق احمدیہ جماعت سے تھا جب کہ انسپکٹر شیعہ تھا

انسپکٹر تفتیش کے دوران مذہبی جنون میں مبتلا ہوگیا اور احمدی کو دہشت زدہ کرنے پر تل گیا اس نے احمدی کو اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک وہ انسپکٹر کے مرشد کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو گیا۔ انسپکٹر کو اس بات پر بڑا ناز تھا کہ اس نے ایک غیر مسلم کو اپنے سرکاری اختیارات استعمال کر کے دائرہ اسلام میں شامل کرلیا ہے۔ اس مقدمہ کے خارج کرنے کے لئے ضروری اقدامات کئے گئے مجھے معلوم نہیں آیا وہ احمدی مستقل طور پر مسلمان ہوا تھا یا وقتی طور پر'' (صفحہ ۳۰۹۔۳۱۰)۔

اس کتاب کی بنیاد مصنف نے اپنے اس کارنامہ پر رکھی ہے جو موجودہ زمانہ میں ڈپلومیسی کا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ سردار محمد چوہدری ہنری کسنجر کے دورہ ءچین کے موقع پر محکمانہ طور پر ان کی سیکیوریٹی اور اس سارے منصوبہ کے اخفا کے ذمہ دار تھے اور آپ نے یہ ذمہ داری بخیر وخوبی نبھائی اور اسی کو حاصل عمر سمجھتے ہیں۔ امریکی سفیر نے ان کی خدمات کے اعتراف میں انہیں جو خط لکھا یا صدر نکسن نے صدر یحییٰ کو جو ذاتی خط لکھا وہ مصنف کے لئے وجہِ افتخار ہے حالانکہ اس میں اتنے تفاخر کی کون سی بات ہے؟ آپ نے اپنا فرض ادا کیا اور سرخرو ہوگئے آپ خوش آپ کا خدا خوش۔ مگر معلوم ہوتا ہے سردار محمد چوہدری کو امریکہ کے خوش ہونے کی زیادہ خوشی ہے اسی لئے انہوں نے کتاب کے بیک ٹائیٹل پر خط کا عکس مکرر شائع کر کے اپنے آپ کو دین و دنیا میں سرخرو گردان لیا ہے۔ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند؟ جہانِ حیرت پڑھنے والوں کو اس لئے بھی حیرت میں مبتلا کرتی ہے کہ مصنف نے واقعات واوقات میں کوئی تطبیق روا نہیں رکھی۔ یحییٰ خاں کے مارشل لا کے بعد بھٹو کے عوامی مارشل لا کے باب میں سرسری سی بات کر کے ضیا اور ضیا کی باقیات پر پہنچ جاتے ہیں۔ میاں نواز شریف کے ساتھ تو ان کی ہمدردیاں نواز شریف کے معصوم چہرے کی وجہ سے ہیں جسے وہ پیار سے معصوم کبوتر کہتے ہیں۔ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ بھٹو کے زمانہ میں جب یہ سپیشل پولیس میں تھے سیاسی مخالفین کو ہراساں کرنے کے روح فرسا واقعات ہوئے اور یہ صرف دیکھنے اور نصیحت کرنے پر مطمئن رہے۔ ۱۹۵۳ کے بعد ۱۹۷۴ میں احمدیوں کے خلاف جو فسادات ہوئے ان کا ذکر اذکار ہی سردار محمد چوہدری کے ہاں نہیں ہے حالانکہ یہ پنجاب میں تھے سپیشل پولیس میں تھے اور بھٹو کے ساتھ براہِ راست رابطہ میں تھے اور عین مئی میں اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل ٹریفک بنائے گئے تھے جب اس ہنگامے کی شروعات ہو رہی

تھیں۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ ۵۳ کی طرح یہ ۷۴ کے واقعات میں بھی جسمانی طور پر ملوث تھے۔ اب تو یہ بات اظہر من الشمس ہو چکی ہے کہ یہ سارا ڈرامہ سپیشل پولیس کا رچایا ہوا تھا۔ کیا سردار محمد چوہدری اس ذمہ داری سے بری الذمہ ہو سکتے ہیں؟ ۷۴ کے ہنگاموں کے بارہ میں ان کی خاموشی نے انہیں نمایاں کردیا ہے۔ یہ خاموشی ایسے شخص کی خاموشی ہے جو سارا کچھ کرنے کے بعد اطمینان سے ایک طرف ٹریفک والوں میں بیٹھ کر مسکراتا رہے اور لوگوں کو قیاس آرائیاں کرنے دے۔ بعض اوقات نہ بولنا بھی انسان کے خلاف بولتا ہے۔ مذہب کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کے موضوع پر سردار محمد چوہدری نے ایک لفظ نہیں لکھا۔ قاری بجا طور پر سوچتا ہے کیوں نہیں لکھا؟

لاڑکانے چلو ورنہ تھانے چلو کے مسئلہ کا حل بھی چوہدری صاحب نے خوب نکالا ہے۔ اگر پولیس میں چند اور ایسے ''پیر'' بھرتی کر لئے جائیں تو حاکموں کو رامش و رقص و رنگ کی محفلیں سجانے میں اور سردار محمد چوہدری جیسے تابعدار افسروں کو مسائل سلجھانے میں آسانی رہے۔ پولیس سروس نہ ہوئی حاکموں کی پمپ سروس ہوگئی۔ سردار محمد چوہدری کے بلند بانگ دعوے کہ وہ غلط کام کرنے پر آمادہ نہیں کئے جاسکتے کہاں گئے؟ کیا یہاں بھی انہیں جان کا خوف تھا؟ دکھ اس بات کا ہوا کہ سردار محمد چوہدری نے حبیب جالب جیسے عوام کے مقبول و محبوب شاعر کو دوسروں پر رکھ کر گالی بھی دے دی ہے یہ بات ان کے مرتبہ کے صریحاً منافی ہے۔ زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا۔

جہانِ حیرت ایک ایسا محدب عدسہ ہے جس نے لکھنے والے کی شکل کو دھندلایا تو تھا ہی واقعات اور حالات کی شکل بھی دھندلا گئی ہے۔ یہ کتاب صرف ایک مقصد پورا کرتی ہے کہ سردار محمد چوہدری سے ایک ایسا جرم سرزد ہوا جسے وہ The Ultimate Crime کہتے ہیں اور وہ اس سے بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔ کیا عجب کہ نواز شریف کے زوال کے بعد وہ ان کی جلاوطنی پر اور وطنِ عزیز کے نئے مسائل پر وہ اپنے انداز میں نئی روشنی ڈالنے کی سوچ رہے ہوں۔

◎

آپ بیتی

میر ولایت حسین، ایم اے او کالج علی گڑھ کے استاد اور ہاسٹل کے پراکٹر تھے۔ آپ کو یہ فخر بھی حاصل تھا کہ آپ نے سرسید کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ محسن الملک، وقار الملک اور دیگر زعماء کے ساتھ کام کیا تھا ایم اے او کالج کے انگریز پرنسپلوں کا زمانہ دیکھا تھا۔ سرسید کے صاحبزادے سید محمود کے ساتھ ان کی دوستی تھی۔ غرض وہ دلی والوں کے محاورہ کے مطابق ایم اے او کالج کی دائی تھے۔ اسی لئے انہوں نے اپنی خودنوشت سوانح حیات کا نام ''آپ بیتی یا ایم اے او کالج علی گڑھ کی کہانی'' رکھا ہے۔ میں اپنی کتاب اردو کی اہم خودنوشتوں کے جائزے میں اس کتاب کا حوالہ پروفیسر آل احمد سرور کی کتاب کے حوالے سے دے چکا ہوں لیکن اب حسنِ اتفاق سے وہ آپ بیتی دستیاب ہو گئی ہے اس لئے اس کا تفصیلی تجزیہ پیش کر رہا ہوں۔

علی گڑھ کے دو افراد ایسے ہیں جنہیں علی گڑھ کی چلتی پھرتی تاریخ کہا جاتا تھا ایک تو یہی میر ولایت حسین تھے اور دوسرے پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ صدیقی صاحب کے ہاں بھی علی گڑھ جہاں تہاں در آتا تھا مگر وہ علی گڑھ کالج اور اس کالج کے یونیورسٹی بن جانے کے راوی تھے، میر ولایت حسین نے اپنی تعلیم علی گڑھ کالج میں ۱۸۸۲ سے شروع کی تھی اس لئے وہ اس کے بہت ابتدائی لوگوں میں سے تھے اس لئے میر صاحب نے سب اکابر علی گڑھ کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اس آپ بیتی میں میر صاحب کے اپنے حالات کم اور علی گڑھ اور اکابر علی گڑھ کے حالات زیادہ ہیں اور ان اکابر کے خلوص و محبت اور جذبہ قربانی کو جس طرح یہ کتاب بیان کرتی ہے کوئی اور کتاب بیان نہیں کرتی۔ نواب وقار الملک (یعنی مولوی مشتاق حسین) کالج کے اعزازی سکرٹری تھے۔ ان کے بارہ میں مولوی عبدالباقی صاحب کی روایت اسی کتاب میں مذکور ہے کہ مولوی صاحب کا بیٹا بیمار تھا وہ اپنے کام میں منہمک رہتے اور جب کبھی وقت ملتا اپنے بیٹے کی عیادت کے کے لئے اس کے کمرہ میں چلے جاتے تھے جوان

کے دفتر کے ساتھ ملحق تھا ''ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ مشتاق احمد سلمہ، (بیٹے کا نام) کے پاس پہنچنے میں دیر ہو گئی اور وہ بوجہ علالت کے بے چین ہو رہے تھے جب کام سے فارغ ہو کر پہنچے تو مشتاق احمد کہنے لگے کہ ابا جان بیمار کو دیکھنا اور اس کی دلجوئی کرنا تو نہایت ثواب کا کام ہے اور جب کہ بیمار خود بیٹا ہو تو اور بھی ثواب کا کام ہے''۔ فرمانے لگے ''بالکل ٹھیک کہتے ہو مگر بیٹا میں تو دوسری جگہ کا نوکر ہوں اور وہاں کے فرائض بھی انجام دینا پڑتے ہیں۔ اس پر مشتاق احمد نے کہا آپ کیسے نوکر ہیں تنخواہ تو ملتی نہیں۔ فرمانے لگے ایسے نوکر بھی ہوتے ہیں جنہیں تنخواہ نہیں ملتی وہ مفت کام کیا کرتے ہیں اور ان کو نوکر نہیں بلکہ غلام کہتے ہیں مجھے بھی اسی طرح سمجھو'' (صفحہ ۳۵)۔ علی گڑھ کے اکابر نے اس ادارہ کو اسی روحِ قربانی کے ساتھ قائم کیا اور چلایا تھا۔

سرسید کے صاحبزادے آنریبل جسٹس سید محمود کا ذکر جس طرح میر صاحب نے کیا ہے وہ کوئی اور نہ کر سکتا ''آنریبل جسٹس سید محمود کو قبل از وقت پنشن دے دی گئی اور وہ علی گڑھ آکر سرسید کے پاس رہنے لگے۔ یہاں شراب میں کمی کر دی گئی مگر بالکل ترک نہیں ہوئی تھی ان کا جسم بہت بھاری ہو گیا تھا مگر رنگ پیلا تھا۔ ایک روز شام کے وقت سید صاحب اور سید محمود بیٹھے ہوئے تھے اور میں بھی ان کی خدمت میں حاضر تھا۔ میں نے سید محمود سے کہا آپ کسی قسم کی ورزش نہیں کرتے اس لئے خونِ صالح پیدا نہیں ہوتا آپ کا جسم بھاری ہو گیا ہے مگر رنگ پیلا ہے اگر فی الحال کوئی ورزش نہیں کر سکتے تو کم سے کم گاڑی میں سوار ہو کر ہوا خوری ہی کر لیا کیجئے۔ چونکہ میں نے یہ بات سید صاحب کے مزاج کے موافق کہی تھی سید محمود نے کچھ جواب نہیں دیا۔ سید صاحب نے سنتے ہی فرمایا ''محمود سنتے ہو میر صاحب کیا کہتے ہیں'' انہوں نے کہا ہاں میں سنتا ہوں اور میں ہوا خوری کے لئے جایا کروں گا بشرطیکہ میر صاحب میرے ہمراہ چلا کریں'' (صفحہ ۱۱۴)

مولانا شبلی نعمانی اور سید محمود کی کشیدگی کی روداد ''سید محمود جب پنشن لے کر علی گڑھ تشریف لائے اور سید صاحب کے پاس مقیم ہو گئے تو اول دن مولوی شبلی صاحب کے بنگلے پر جو سید صاحب کی کوٹھی کے احاطہ میں تھا ملاقات کو گئے اور تقریباً دو گھنٹے تک بیٹھے باتیں کرتے رہے، دوسرے دن پھر آئے اور حسبِ معمول بیٹھے رہے تیسرے دن پھر آئے تو مولانا ناخوش ہو کر بیٹھ گئے۔ سید محمود نے

دریافت کیا کہ ''کیوں مولانا کیسا مزاج ہے؟'' انہوں نے کہا مزاج تو اچھا ہے مگر صبح کے وقت ہی میں گھنٹہ دو گھنٹے کے لئے تصنیف وتالیف کا کام کرلیتا ہوں آپ کے تشریف لانے سے اس کام میں ہرج ہو جاتا ہے اس لئے مجھ کو افسوس ہوتا ہے۔ سید محمود یہ سن کر اسی وقت اٹھ کر چل دیئے اور پھر ان کے ہاں نہیں گئے اور باہمی تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ مولانا شبلی صاحب چونکہ پورب (اعظم گڑھ) کے رہنے والے تھے اس لئے علی گڑھ کی گرم اور خشک آب وہوا کے شاکی رہتے تھے۔ بیک صاحب (پرنسپل) نے ان کو خوش کرنے کے لئے یہ تجویز کی کہ جیسا کہ ولایت میں ہوتا ہے کہ بعض پروفیسر خاص موسم میں آکر یونیورسٹی میں لیکچر دیتے ہیں اور باقی سال ان کے قائم مقام کام کرتے ہیں اسی طرح علیگڑھ میں مولانا شبلی جاڑے کے موسم میں آکر تعلیم دیں اور گرمی کے موسم میں ان کا قائم مقام کام کرے۔ سید محمود نے اس کی مخالفت کی مگر سید صاحب نے اس کو منظور کرلیا۔ سید صاحب کے انتقال کے بعد مولانا شبلی علی گڑھ سے ملازمت چھوڑ کر چلے گئے'' (صفحہ ۱۱۵۔۱۱۶)

سرسید کو آخری عمر میں جو صدمات اٹھانے پڑے ان کی مستند تفصیل بھی اسی خودنوشت میں ہے: ''۱۸۹۵ میں کالج کا غبن معلوم ہوا اور تعطیل کے زمانہ میں اس غبن کی جانچ کے لئے مجھ کو عابد علی بیگ کے ساتھ مامور کیا اور ہم نے ایک لاکھ ستر ہزار کا غبن ثابت کیا۔ سرسید نے کالج کا تمام سرمایہ بینک میں جمع کردیا تھا انگریزی دفتر کا ہیڈ کلرک شام بہاری لال تھا وہ اپنے ہاتھ سے انگریزی میں چک لکھ کر سید صاحب کے سامنے پیش کرتا اور ان سے دستخط کرالیتا تھا چونکہ سید صاحب انگریزی نہیں جانتے تھے اور اس پر اعتماد رکھتے تھے اس لئے انہوں نے کبھی آمد خرچ کا مقابلہ نہیں کیا۔ اس نے ہر چیک پر سرسید سے دستخط نہیں کرائے بلکہ ان سے چابی لے کر چیک بک نکالتا اور خود دستخط کرلیا کرتا تھا۔ شام بہاری لال نے سات ٹرسٹیوں کی طرف سے ایک جعلی مختار نامہ بھی بنایا جس میں بینک کو اختیار دیا گیا تھا کہ وقتاً فوقتاً جس قدر روپیہ کالج کو ضرورت ہو پرامیسری نوٹوں کی کفالت پر سودی قرض دیتا رہے۔ غرض اس نے سرسید کے اعتماد سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ایک لاکھ ستر ہزار روپیہ بنک سے لیا اتفاق سے وہ اچانک فالج میں مبتلا ہو گیا اور بنک سے خطوط آئے تب غبن کے متعلق معلوم ہوا۔ شام بہاری لال پر مقدمہ چلا اور وہ حوالات میں فوت ہو گیا۔ بعض کا خیال ہے کہ اس نے خودکشی کی اور بعض کہتے

ہیں کہ فالج کے دورہ کی وجہ سے موت واقع ہوئی۔ اس واقعہ سے سرسید کو اس قدر صدمہ پہنچا کہ آخر دم تک فراموش نہیں ہوا'' (صفحہ ۱۱۶۔۱۱۷)

اس کے ساتھ ''ایک اور صدمہ پیش آیا جو سید محمود کا دماغی مرض تھا۔ سید محمود کی ناگفتہ بہ حالت سید صاحب کے واسطے بہت تکلیف دہ تھی ان کو نہ رات کو چین تھا اور نہ دن کو۔ رات رات بھر سید محمود کی کنسلٹیشن لیگ (جلسہء مشاورتی) ہوتی رہتی تھی۔ سید صاحب اپنے سونے کے کمرہ سے اٹھ کر آتے اور کہتے ''محمود سوؤ گے بھی؟'' سید محمود خفا ہو کر کہتے کہ ''ان کی محبت مجھے کچھ کام نہیں کرنے دے گی۔ صاحب میں کام کررہا ہوں آپ آرام فرمائیے'' اس طرح سے ساری ساری رات گذر جاتی۔ ایک رات مجھ کو بھی انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے متعلق کمیٹی میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ ساری رات بیکار باتوں میں گذری اور نماز کے وقت گھر آیا'' (صفحہ ۱۱۷)

''چونکہ نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین نے قانون ٹرسٹیاں میں سید محمود کی جانشینی کی بابت اعتراض کیا تھا اور بعد ازاں سید محمد احمد کے اسسٹنٹ سکرٹری ہونے پر معترض ہوئے تھے اس لئے سید محمود ان سے ناخوش تھے اور سید صاحب کو مجبور کرتے تھے کہ وہ نواب وقار الملک کو جماعت ٹرسٹیاں سے حسب دفعہ ۱۴۰ نکال دیں'' (صفحہ ۱۱۸) پھر ان کو اصرار تھا کہ ''میری کوٹھی میں اسسٹنٹ سکرٹری کا دفتر ہے اس کا کرایہ مجھ کو نہیں ملتا میں چاہتا ہوں کہ اس کے کرایہ کا حساب کر کے میری جانب سے کالج کے چندہ میں جمع کردیا جائے۔'' (۱۱۹)

آخر میں سید محمود کی یہ حالت ہو گئی کہ (جو) وہ چاہتے سید صاحب کو اس کے کرنے پر مجبور کرتے چنانچہ ٹرسٹیوں کی جو جگہیں خالی تھیں ان کو (سرسید نے) سید محمود کے اصرار سے باختیار خود پر کر دیا۔'' خدا کی شان ہے کہ انہی صاحبوں نے سید صاحب کے بعد جب ان کو علم ہوا کہ لفٹیننٹ گورنر چاہتے ہیں کہ سید محمود پریسیڈنٹ ہوں اور نواب محسن الملک آنریری سکرٹری تو سب نے سید محمود کے خلاف رائے دی'' (صفحہ ۱۱۹)۔

''آخر کو سید صاحب کو اپنی کوٹھی میں رہنے میں اتنی ناگواری پیش آئی کہ انہوں نے مجھ کو بلا کر فرمایا کہ میرے واسطے بورڈنگ ہاؤس میں ایک چھوٹا بنگلہ خالی کرادو۔ میں نے کہا بہت اچھا جس بنگلہ

میں مولانا حالی آکر مقیم ہوئے تھے وہ بنگلہ خالی ہے اس کو صاف کرادوں گا آپ اس میں تشریف لے آیئے۔ سید صاحب ۱۸۹۸ میں اس بنگلہ میں اپنی کوٹھی چھوڑ کر تشریف لے آئے'' (صفحہ ۱۲۰) ''چند روز سید صاحب کالج کے بنگلہ میں رہے تھے کہ محمود بیگم آئیں اور سید صاحب کو یہ کہہ کر کہ کوٹھی میری ملکیت ہے سید محمود کی نہیں۔ سید صاحب کو کوٹھی پر واپس لے گئیں'' (صفحہ ۱۲۰) ''سید صاحب چند روز کوٹھی میں رہے تھے کہ سید صاحب نے پھر مجھ کو بلایا اور کہا کہ میں پھر بورڈنگ ہاؤس جانا چاہتا ہوں میرے لئے جگہ کا بندوبست ہوسکتا ہے بشرطیکہ طلبہ کو میری وجہ سے تکلیف نہ ہو۔ میں نے کہا نہیں آپ کی وجہ سے کسی کو تکلیف نہیں ہوگی پھر وہی جگہ آپ کے لئے خالی کرادوں گا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ میں کل صبح تم کو کہلا بھیجوں گا اس وقت خالی کرادینا دوسرے دن میں انتظار کرتا رہا مگر سید صاحب کا کوئی حکم میرے پاس نہیں آیا۔ آخر کار معلوم ہوا کہ حاجی اسمٰعیل خاں صاحب سید صاحب کو اپنی چھوٹی کوٹھی میں لے گئے ہیں۔ سید صاحب کو بے گھر ہونے کی سخت تکلیف ہوئی منشی ناظر خاں اور نجم الدین جو سید صاحب کی خدمت میں حاضر رہا کرتے تھے اس وقت موجود تھے۔ ان کا بیان ہے کہ جس وقت سید صاحب کوٹھی پر پہنچے تو سید صاحب نے ایک آہ کھینچی اور کہا ہائے افسوس ہم کو کیا معلوم تھا کہ سید محمود اس عمر میں ہم کو گھر سے نکال دیں گے۔ ورنہ ہم کیا اس قابل نہ تھے کہ اپنے لئے ایک جھونپڑا بنالیتے'' (صفحہ ۱۲۱)۔

سرسید کا انتقال وہیں ہوا۔ ۲۸ مارچ ۱۸۹۸ کی شب گیارہ بجے۔۔۔ سید صاحب کی کوٹھی کا چوکیدار آیا اور کہا تم کو سرکار نے یاد کیا ہے؟ میں نے پوچھا چھوٹے سرکار نے یاد کیا ہے یا بڑے سرکار نے۔ اس نے کہا بڑے سرکار کال (انتقال) کر گئے ہیں میں نے پوچھا کہ کب کال کر گئے ہیں اس نے کہا نو بجے کے قریب۔۔۔ میں فوراً کوٹھی پر پہنچا۔ وہ شخص جس کا احترام چند گھنٹے پہلے بڑے سے بڑا آدمی کرتا تھا اب وہ ایک تودہ خاک بنا ہوا ہے اور اس پر ایک چادر پڑی ہوئی ہے اور بورڈنگ کا حافظ بیٹھا ہوا کلام مجید پڑھ رہا ہے پس ماندہ لوگوں میں آپس میں اس بات پر بحث ہے کہ کاغذات اور الماریوں کی کنجیاں کس کے پاس رہیں۔ حاجی اسمٰعیل خاں کہتے تھے کہ یہ قوم کی ملکیت ہے یہ ہمارے پاس رہیں اور سید محمد احمد (سرسید کے بھتیجے) کہتے تھے کہ ہمارے پاس رہنی چاہئیں۔ آخر کار یہ تصفیہ ہوا کہ نہ ہمارے پاس رہیں نہ تمہارے پاس بلکہ بیگ صاحب کے سپرد کردی جائیں۔ بیگ صاحب اور

پٹنگ صاحب وہاں موجود تھے اور چھوٹے صندوقچے اپنی گاڑی میں رکھوا رہے تھے اور الماریوں کو مقفل کرکے ان کی کنجیاں اپنی جیب میں رکھ لی تھیں۔۔ بعد ازاں بیگ صاحب مجھے اپنے ہمراہ گاڑی میں لے کر کالج میں آئے۔۔۔ میں حاجی اسمٰعیل خاں صاحب کی کوٹھی پر گیا وہاں میں نے دیکھا کہ حافظ صاحب تو سید صاحب کے جنازہ کے پاس بیٹھے قرآن مجید پڑھ رہے ہیں اور ان کے عزیز سو رہے ہیں یہ کیفیت دیکھ کر میں بورڈنگ ہاؤس چلا آیا اور سو رہا۔۔۔ دو تین بجے کے درمیان میں نے سید عبد الباقی سے کہا کہ کچھ رقم اپنی جیب میں لیتے چلو تاکہ تجہیز و تکفین کا کچھ بندوبست نہ ہوا تو ہم کردیں گے۔ میں اور سید عبدالباقی اس وقت ظہور حسین وارڈ میں رہتے تھے سید صاحب کے جنازے پر جانے کے لئے ظہور وارڈ سے نکلے ہی تھے کہ مولوی زین الدین صاحب ملے انہوں نے مجھ سے کہا کہ سید صاحب کا نوکر عظیم میرے پاس آیا تھا اور سید صاحب کی تجہیز و تکفین کے لئے کچھ روپیہ مانگتا تھا۔ میرے پاس تو کچھ تھا نہیں میں نے اس کو نواب محسن الملک کے پاس بھیج دیا ہے تم وہاں جاؤ اور نواب محسن الملک کے ہاں سے عظیم کو کچھ مل گیا تو خیر ورنہ تم کچھ بندوبست کردینا۔ ہم دونوں نواب محسن الملک کی کوٹھی پر گئے وہاں دلی سے آئے ہوئے مولوی ذکاء اللہ صاحب اور مولوی نذیر احمد صاحب موجود تھے۔ نواب محسن الملک ہم کو دیکھ کر خوش ہوئے اور کہا کہ سید صاحب کا نوکر عظیم کہتا ہے کہ محمد احمد کے ملازم سے دس روپیہ قرض لے کر وہ سامان لینے آیا ہے مگر محمد احمد اپنے نوکر پر خفا ہوئے۔ میں نے کہا ہم تو یوں چپ تھے کہ سید صاحب کے عزیز اور دوست سب موجود ہیں اگر ہم ان کی تجہیز و تکفین کے بارہ میں کچھ پیش قدمی کریں گے تو آپ لوگ ناخوش ہوں گے ورنہ آرنلڈ جو ہمارا ہم مذہب و ہم وطن نہیں ہے صرف چند سال اس نے ہمارے ساتھ اس کالج میں کام کیا تھا جب وہ کالج چھوڑ کر لاہور جانے لگا تو اس کی رخصت کے لئے ہم نے کئی سو روپیہ چندہ جمع کر کے اس کو رخصت کیا۔ سید صاحب تو ہمارے اور ہم سید صاحب کے سید صاحب کی تجہیز و تکفین کے لئے روپیہ جمع کرنا کون مشکل تھا اگر آپ اجازت دیں تو ہم ان کی تجہیز و تکفین کا انتظام کریں گے۔ نواب صاحب نے فرمایا کہ نہیں تم کو انتظام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ عظیم سے دریافت کیا کہ کس قدر روپیہ کی ضرورت ہوگی؟ عظیم نے پچاس روپیہ بتائے اور نواب صاحب نے فرمایا کہ ''یہ سید صاحب کا آخری چندہ ہے پھر کب چندہ مانگنے آویں گے'' پچاس روپیہ عظیم کو دے دئے۔ اس کے بعد سید صاحب کی تجہیز و تکفین ہوگئی'' (صفحہ ۱۲۲-۱۲۴)

ان تفصیلات کے بعد نواب محسن الملک کی جانشینی کا تذکرہ ہے مگر اسے صاحبِ ''اعمال نامہ'' سر رضا علی بیان کر چکے ہیں۔ میں اس آپ بیتی کے سلسلہ میں اس کو دہرانا نہیں چاہتا۔

میر صاحب نے اپنی خودنوشت کے آخر میں اپنے چند نمایاں شاگردوں کی فہرست بھی شامل کی ہے وہ بھی یادگار ہے۔ ان شاگردوں کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔ سید سجاد حیدر یلدرم، بابائے اردو مولوی عبدالحق، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، راجہ مہندر پرتاپ، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد وائس چانسلر علیگڑھ یونیورسٹی، سیٹھ یعقوب حسن، سر راس مسعود، خواجہ ناظم الدین سابق گورنر جنرل اور وزیر اعظم پاکستان، سید محمود مشہور سیاسی رہنما، لالہ سوہن لال، تصدق احمد خاں شیروانی، رشید الظفر خاں، نواب احمد سعید خان چھتاری، نواب حمید اللہ خان بھوپال، پروفیسر محمد حبیب، نوابزادہ لیاقت علی خان سابق وزیر اعظم پاکستان، سر سکندر حیات خان سابق وزیر اعظم پنجاب، اور مشہور سائنسدان بابر مرزا۔ ان کے علاوہ ایک شاگرد ایسے بھی ہیں جن کا ذکر میر صاحب نے اپنی کتاب میں نہیں کیا مگر اس شاگرد نے اپنی خودنوشت میں کیا ہے لکھتے ہیں۔ ایک شرارت کی وجہ سے'' صبح سید ولایت حسین صاحب پراکٹر کے سامنے ہماری پیشی ہوئی پراکٹر صاحب نے خشونت کے ساتھ بید اٹھا کر پوچھا صاف صاف بتاؤ یہ حرکت تم نے کی تھی؟ یا کسی اور نے اگر جھوٹ بولے تو کھال کھینچ لوں گا''۔۔۔ اس کے بعد ایک اور ناگفتہ بہ شرارت کی وجہ سے ''آگے چل کر حضرت جوش ملیح آبادی بننے والے شبیر حسن خان کو بھی سکول سے نکال دیا گیا۔ بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے'' (یادوں کی بارات صفحہ ۱۴۲-۱۴۳)۔

خودنوشت سوانح حیات تاریخ نہیں ہوتی مگر اس میں تاریخ موجود رہتی ہے۔ میر ولایت حسین کی آپ بیتی نے بھی علی گڑھ اور اکابر علی گڑھ کی کتنی مستند تاریخی باتیں بیان کردی ہیں جو بہ صورت دیگر حجابات مصلحت میں مستور تھیں۔ میر صاحب کی یہ خودنوشت جون ۱۹۴۶ میں چھپی تھی۔ ۱۹۴۹ میں میر صاحب کا انتقال ہو گیا اگر وہ انہیں بیان نہ کرتے تو یہ باتیں ان کے ساتھ ہی دفن ہو جاتیں۔ یہ آپ بیتی اپنی صاف گوئی اور سادہ بیانی کی وجہ سے اردو کی خودنوشتوں میں نمایاں رہے گی۔

◎

کتاب زندگی

مولوی نذیر احمد دہلوی کی نواسی محترمہ قیصری بیگم کی ''دلفریب رنگا رنگ خودنوشت سوانح'' کتابِ زندگی کے عنوان سے فضلی سنز کراچی نے ۲۰۰۳ میں شائع کی ہے۔ یہ سرگزشت ترقی اردو بورڈ کے جریدہ ''اردو نامہ'' میں قسط وار چھپتی رہی اور اب ۶۶۱ صفحات کی کتاب کی شکل میں ان کی عزیزہ زہرا مسرور احمد نے اسے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ ''چاند صاحب'' یعنی جناب ڈاکٹر شان الحق حقی صاحب نے لکھا ہے۔ ساڑھے چھ سو صفحے کی یہ کتاب دلی اور حیدر آباد کے زنانہ کلچر کی منہ بولتی تصویر ہے۔ زبان مولانا نذیر احمد کے گھر کی زبان ہے اور ان کی زبان سے زیادہ محاورہ کا رچاؤ اور بھلا کس کی زبان میں ہوگا؟ کس کے منہ میں اتنے دانت ہیں کہ ان کی زبان کو نام رکھے؟ کون ہے جو ان کی زبان پر حرف گیری کرے؟ حقی صاحب کا کہنا ہے اس کتاب میں ''محاورہ منہ سے بول رہا ہے کہ کتنا کھرا اور سچا ہے''۔ (جوش صاحب نے نذیر احمد کی زبان پر منہ کھولا تھا تو منہ کی کھائی تھی)۔

محترمہ قیصری بیگم مولانا نذیر احمد کی اس بیٹی کی اولاد ہیں جس کی تعلیم کے لئے مراۃ العروس لکھی گئی تھی۔ اس لئے مراۃ العروس کی اصغری بیگم جیسا سگھڑاپا ان میں نہ ہوگا تو کس میں ہوگا۔ قیصری بیگم دلی کی ماں کی کوکھ سے پیدا ہوئیں اور دلی کی زبان ماں کے دودھ کے ساتھ پی۔ بچپن کچھ دلی میں کچھ حیدر آباد میں گذرا۔ ان کے ابا حیدر آباد میں ملازم تھے اس لئے ان کی عمر کا بیشتر حصہ حیدر آباد میں گذرا۔ شادی اپنے ددھیال یعنی حقی خاندان میں ہوئی مگر ان کے شوہر ان کے ساتھ حیدر آباد چلے گئے اور وہیں کسی خدمت پر فائز رہے۔ اس لئے قیصری بیگم کے ہاں دونوں جگہ کی ثقافت بولتی ہے۔ رسم و رواج کا ذکر کرتی ہیں تو ساتھ کے ساتھ دلی اور حیدر آباد کے کلچر کا موازنہ بھی کرتی جاتی ہیں۔ سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ ان کی زبان دکنی بولی کی چغلی نہیں کھاتی حالانکہ مرزا فرحت اللہ بیگ جیسے دلی کے روڑے کی زبان دکن میں رہ کر ''دکھنا'' گئی تھی اور ان کی خودنوشت ''میری داستان'' پر ان کی دکھنی بولی

کی چھاپ نمایاں ہے۔ اس ساری خودنوشت میں بھولے سے بھی ان کے نانا کے شاگرد مرزا فرحت اللہ بیگ کا ذکر درمیان میں نہیں آیا حالانکہ ان کے یارِ غار میاں دانی یعنی ڈاکٹر غلام یزدانی صاحب ڈائیریکٹر محکمہ آثار قدیمہ کا ذکر جہاں تہاں موجود ہے۔ شاید قیصری بیگم بھی فرحت اللہ بیگ کی ''نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی'' سے خوش نہیں رہیں۔

''کتابِ زندگی'' عورتوں کی دلچسپی کی کتاب ہے۔ لباس و آرائش، رسم و رواج، زیورات، پکوان، تلن، لین دین، کوئی چھوٹی سی تفصیل بھی ان کے قلم سے نظر انداز نہیں ہوئی۔ جب زیورات اور کپڑوں کی جزئیات بیان کرنے پر آتی ہیں تو میر باقر علی داستان گو بن جاتی ہیں۔ لباس کا ذکر ہے تو رنگا رنگ کپڑوں کا طومار باندھ کے رکھ دیتی ہیں۔ ''زنانہ لباس، بڑے پانچوں کے پاجامے، جن میں گوٹ، پٹھے، بیلیں، جھالر، موزونیت سے لگے ہوئے، گلبدن، پھلام، قناویز، ٹسر، کمخواب، زربفت ایکرنگا، بھاگل پوری، اطلس زری، دریائی کے پاجامے، پائنچہ کبھی اتنا لمبا ہوتا کہ پہننے والی صحن میں کھڑی ہیں تو پائنچے فرش پر ہیں''۔ رنگوں کے بیان پر آتی ہیں تو لگتا ہے رنگریز کی دکان پر کھڑے ہیں ''سردی کے رنگ الگ گرمی کے الگ۔ گہرے گہرے رنگ سردی کے ہلکے نفیس گرمی کے گلِ انار گلِ شفتالو، گلِ شبو، کسمی، کشمشی، عنابی، جوگیا، صندلی، سرمئی، بینجنی، سنہری، زعفرانی، سردئی، کاکریزی، نافرمانی، ملاگیری، سرخ، سبز، گلابی، کاہی، فالسائی، اودا، قوسِ قزح کے رنگکا، نارنجی، انگوری، پستئی، آبی، آسمانی، دودھیا، کاسنی، بادامی، شربتی، پیازی، دھانی''۔ مٹھائیوں کا ذکر کرتی ہیں تو حلوائی کی دکان سجا کر بیٹھ جاتی ہیں ''قلاقند، پیڑے، گلاب جامن، خرمے، خرمیاں، موتی پاک، میسو پاک، ملائی کے لڈو، موتی چور کے لڈو، امرتیاں، جلیبیاں، اندرسے، کی گولیاں، میٹھی اور پھیکی پھینیاں، کھجلے، بالوشاہی، نکتیاں، کھجوریں، سستی مٹھائیاں سہال، بہادر شاہی سیو، اولے بتاشے ریوڑیاں، میٹھی کھیلیں نان خطائیاں، دال سیو نمک پارے مٹھریاں، تلی ہوئی مونگ کی دال وغیرہ'' (صفحہ ۸) سب کچھ سامنے آموجود ہوتا ہے۔ گھر میں آئی ہوئی بیویوں کی خاطر تواضع پر آتی ہیں تو پان زردے سے تواضع کے علاوہ رنگارنگ چیزیں مہمان کے سامنے چن دیتی ہیں ''علی گڑھ کے بسکٹ، گزک اور آگرے کی دال بیجی، دہی بڑے، قلمی بڑے، تلے ہوئے پالک کے پتے، نان خطائیاں، چھوٹی چھوٹی خرمیاں، گری کا پپڑی کا حلوہ سوہن، جوزی حلوہ سوہن، یا حبشی

حلوہ سوہن، مٹھریاں، نمک پارے، تلی ہوئی مونگ کی دال، تئی کے کباب، گولے کے کباب، مچھلی کے کباب'' غرض پڑھنے والے کی رال ٹپکنے لگتی ہے۔ شادی بیاہ کی تیاریوں کا ذکر ہے تو سارے جہیز اور زیورات کی تفصیل ایک ایک کر کے گنواتی ہیں۔ ''سوزنیاں، چاندنیاں، دسترخوان، غلاف تکیہ پیچ، جانماز، جزدان، مسند تکیہ، رضائیاں دولائیاں، چادرے، تورے پوش، خوان پوش، پٹاری کی گردی، پاندان کا غلاف، پانوں کی صافیاں، تلے دانیاں، تاگوں کی پیچکیں، ڈولی کا پردہ، ڈولی کی سوزنیاں'' کوئی چیز ان کی جزبیں نظر سے اوجھل نہیں رہتی۔ زیورات پر آتی ہیں تو علی جان والوں کی دکان سجا دیتی ہیں۔ ''کانوں میں طلائی پتے بالیاں، بجلیاں، سہارے اور مرصع قابلِ دید جھلیاں، گلے (کا) جڑاؤ زیور الگ، طلائی الگ، مالا، گلوبند، چمپا کلی، جوشن، نونگے، انگشتریاں، کڑے، کنگن، چوہے دتیاں، مرصع پہنچیاں، پاؤں میں چوڑیاں وہ بھی طلائی اور انگوٹھیوں کے چھلے''۔ کسیرا آیا ہے تو سارے ''وزنی برتن خرید لیتی ہیں کہ لوگ نام نہ رکھیں''۔ ''لگن سینیاں دیگ دیگچہ بھیر اسلابچی آفتابے، موٹے پٹاری، مقابلہء حسن دانی، سینیوں کے اوپر کے سرپوش، صراحی گلاس کٹورے، غوریاں، قلفیاں، بادیئے، پانی پینے کے کٹورے، تھالی جوڑ، بگونے، گلاس تانبا کیٹ، پھولوں کا چنگیر دان، ناگردان، دیگچیاں، ڈونگا، کفگیر، چمچے، ڈورا، نگیریاں، اناج کے ڈبے، چھولہے، پھنکنیاں، دست پناہ، طباق''! دراصل قیصری بیگم گھر سے خوشحال تھیں اور اپنے گھر میں یہی کچھ انہوں نے دیکھا تھا۔ اس لئے بے تکلف بیان کرتی چلی جاتی ہیں انہیں خیال تک نہیں ہوتا کہ ہر کہہ و مہہ ایسی خوش حالی سے دوچار نہیں تھا۔ ان کے اپنے گھر کا تمدن تو یہ تھا کہ ''حویلی میں دادی اماں کے قدم کی برکت تھی۔ دالانوں میں سب جگہ صاف دریوں چاندنیوں کا فرش کیا ہوا۔ اپنی اولاد در اولاد اس میں آباد ان کے نوکر چاکر، ماما بو سب میں دینداری کا چرچا صوم وصلوٰۃ کی پابندی۔ دادی اماں نماز و وظائف سے فارغ ہوئیں اور چاروں طرف سے بہوئیں خراماں خراماں سلام کے واسطے حاضر ہوئیں، جب تک دادی اماں نہ دیکھیں وہ اپنی جگہوں پر ادب سے کھڑی رہتیں۔ جب سلام کر چکتیں تو ان کے پاس بیٹھ جاتیں، ماما آئی اور بولی ''بیگم صاحب لایئے پیسے دیجئے ناشتہ لے آؤں'' دادی اماں نے کہا ہاں بوا لو۔ پورے گھر کے واسطے خستہ کچوریاں، بیوڑیاں، پوری حلوہ، اچار ترکاری آ گئی۔ بڑوں کو چار چار کچوریاں بچوں کو دو دو تقسیم کر دیں سب ناشتے سے فارغ ہوئے۔ کھانے کا سوال آیا تو دادی اماں نے

ماما کو گھر کے کھانے کا بتا دیا اور خود چولھے کے پاس منڈھیا پر جا بیٹھیں، گھی کا کنستر اپنے پاس رکھ لیا اور پانی کی طرح گھی بہنے لگا''۔ دلی کے سب گھروں میں یوں گھی پانی کی طرح تو نہیں بہتا ہوگا مگر تہذیب کا رکھ رکھاؤ یہی تھا۔ ناشتہ باہر ہی سے آتا تھا۔ اشرف صبوحی اور شاہد احمد دہلوی نے کہ اسی خانوادے سے تھے دلی والوں کی فاقہ مستی کا خوب نقشہ کھینچا ہے۔ قیصری بیگم کے ہاں فاقہ مستی نہیں۔ ''دلی کی دل والی منہ چکنا پیٹ خالی'' کا نقشہ ان کے ہاں نہیں ہے۔

قیصری بیگم ساتھ کے ساتھ اپنی داستانِ حیات قلم بند کرتی رہیں۔ جس کسی نے پوچھا کیا کر رہی ہیں یہی جواب ملا اپنی زندگی کے حالات لکھ رہی ہوں۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ خوشی غمی ہر موقع کی تفصیلات حیطہء تحریر میں آ گئیں۔ کچھ ان کا ذہن ایسا ہے کہ رشتے خوب پہچانتی ہیں۔ اس داستان میں در آنے والے ہر فرد کا پورا شجرہ انہیں یاد ہے۔ کون کون ہے کس کا بیٹا ہے کس کی بیٹی ہے کس سے بیاہ ہوا اولاد کون کون ہوئی کون کہاں جا بسا؟ نانا ابا کے ورثہ میں جائیداد بنانے کا انہیں بھی چسکا ہے۔ ایک بار بیوہ ہوئیں تو دور پار کے ایک عزیز سے عقد ثانی کر لیا اور گھر باہر والوں کی تلخ ترش باتیں بھی سننا پڑیں مگر آخر ''ایامیٰ'' والے کی نواسی تھیں۔ کسی کی پروا نہیں کی۔

وہ چیز جسے احوال الرجال کہتے ہیں ان کے ہاں نہیں ہے البتہ افراد بہت ہیں۔ افراد کا حال احوال بھی لکھتی ہیں مگر ایک حد تک جا کر رک جاتی ہیں۔ نانا، نانی اور کسی حد تک اپنے والد محترم کی شخصیت پر روشنی ڈالتی ہیں مگر کسی اور فرد کی شخصیت کا پورا پرتو کہیں نہیں ابھرتا۔ ابا کے دوستوں کا ذکر ہے تو ان کے ناموں کی ایک فہرست گنوا دیتی ہیں۔ اپنی والدہ کا ذکر کرتی ہیں تو یہ لکھنا نہیں بھولتیں کہ ''یہ ہیں مراۃ العروس اور بنات النعش کی ہیروئن اصغری بیگم'' اور اس کے ساتھ اصغری بیگم کی ساری خصوصیات بیان کرتی ہیں ''بچپن ہی سے وہ با اقبال رہیں۔ سلیقہ مندی، صفائی پسندی، اوقات کی پابندی، ملنساری، ہمدردی، صاف گوئی، صاف باطنی، خوش خلقی، صادق القول، پابندِ صوم وصلوٰۃ، مخیر، فہمیدہ، سنجیدہ، پاکیزہ خیالات، اعلیٰ جذبات، خانہ داری میں ماہر، سینے پرونے میں مشاق، پاکیزہ خط، علم دوست، پکی مؤحد، والدین اور بزرگوں کی اطاعت گذار، غیرت وحمیت کا مجسمہ، مادری زبان اردو مگر فارسی میں دستگاہ رکھنے والی، خدا ترس رحمدل، پابندِ وضع انسان تھیں'' (صفحہ ۷۸) غرض کوئی ایسی خصوصیت باقی

نہیں رہی جو انہوں نے بیان نہ کر دی ہو۔ ان کی نانی اماں اور اپنی دادی اماں کا سنا سنایا حال شاہد احمد دہلوی نے اپنے خاص انداز میں لکھا ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب مولوی نذیر احمد مسجد کے مُلا کے پاس پڑھتے تھے۔ ''اس زمانہ کے طالب علموں کی طرح انہیں بھی محلے کے گھروں سے روٹی مانگ کر لانا پڑتی تھی۔ دن اور گھر بندھے ہوئے تھے انہیں گھروں میں سے ایک گھر مولوی عبدالقادر صاحب کا بھی تھا۔ روٹی کے سلسلے میں جب ان کے ہاں آنا جانا ہو گیا تو نذیر احمد سے اوپر کے کام بھی لئے جانے لگے۔ مثلاً بازار سے سودا سلف لانا، مسالہ پیسنا، لڑکی کو بہلانا، لڑکی بڑی ضدن تھی ان کا کولہا توڑتی اور انہیں مارتی پیٹتی رہتی۔ ایک دفعہ مسالہ پیستے میں مرچوں کا بھرا ہوا ڈبہ چھین کر ان کے ہاتھ کچل ڈالے۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ یہی لڑکی آگے چل کر مولانا کی بیوی بنی'' (گنجینہء گوہر صفحہ ۱۴)۔ اب ان کا آنکھوں دیکھا حال قیصری بیگم سے سنئے اور شنیدہ کے بود مانند دیدہ کی داد دیجئے۔ ''نانی اماں صفیہ بیگم نیک والدین کی اولاد ہونے کے علاوہ خود بھی بڑی نیک بیوی تھیں۔ طبیعت کی خاموش، غصے کا نام نہیں، منکسر المزاج، صابر، غریبوں کی ہر طرح مدد کرنے والی، اگرچہ وہ اتنے بڑے آدمی کی اہلیہ تھیں لیکن نہایت سادہ زندگی گذارتی تھیں۔ نہ اچھا کھانا نہ اچھا پہننا۔ رنگین لباس تک ہم نے ان کا نہیں دیکھا۔ بالکل سفید لباس نہ گوٹا نہ کناری۔۔۔ وہ نانا ابا کے واسطے خود سالن پکاتی تھیں اسی میں سے تھوڑا سا بچا کر خود نوش کرتیں۔ شب کو ہمیشہ چوبی تخت پر بغیر بستر لیٹ جاتیں۔ عشا کی نماز پڑھی اور وہیں لیٹ رہیں۔ میں نے کبھی نانا ابا اور نانی اماں کو آپس میں بات چیت کرتے نہیں دیکھا۔۔۔ سب میں بی صاحب مشہور تھیں۔ نانا ابا بھی بی صاحب ہی کہتے تھے۔۔۔۔ مجھے نہیں معلوم نانا ابا ان کو اخراجات کے واسطے کیا ماہوار دیا کرتے تھے لیکن وہ بہت فارغ البال آدمی تھے اور ان کے پورے خاندان میں جو مختصر سا تھا جمع کرنے کی عادت تھی۔ کروفر نہ ٹھاٹ۔ سلامت روی کی چال۔ خیر خیرات اور جمع'' (صفحہ ۷۴۔۷۵)۔

''کتابِ زندگی'' کی یہ خصوصیت منفرد ہے کہ دہلی اور حیدر آباد دونوں جگہوں کے میلوں ٹھیلوں، عرسوں، درگاہوں مندروں سب کا بیان یکساں اپنائیت سے کرتی ہیں۔ شیعہ نہیں مگر محرم کا احترام اور مجلسوں کا ذکر پورے احترام سے روا رکھتی ہیں۔ سیر سپاٹے کا انہیں شوق رہا ہے اس لئے جہاں جہاں

گئی ہیں وہاں کا پورا سفر نامہ لکھ دیا ہے۔ منظر کشی کرنا بھی انہیں خوب آتا ہے۔ میلوں ٹھیلوں کی شوقین
تھیں اس لئے جہاں جاتی ہیں ان کا تلن کا اور جھولوں کا سامان ساتھ میں رہتا ہے۔ حج پر بھی گئی ہیں تو
حج کا سفر نامہ بڑی خوبی سے قلمبند کر دیا ہے۔ نام و نمود کی خواہش نہیں تھی نہ کوئی کام نمود کے لئے کرتی
ہیں البتہ دینے دلانے اور لین دین میں انہیں اس بات کا خیال رہتا ہے کہ ایسی چیز دی جائے کہ کوئی نام
نہ رکھے۔ جادو ٹونے اور جنات کی بہت قائل ہیں اور عملیات میں خاصہ شغف رکھتی ہیں۔ بلکہ کسی حد
تک توہم پرست ہیں شگون لینے میں ان کی طبیعت بہت بڑھی ہوئی ہے۔

غرض کتاب زندگی اپنی نوعیت کی انوکھی سرگزشت ہے۔ ثقافتی تاریخ میں دلچسپی رکھنے والوں
کے لئے بہت مفید کتاب ہے۔ دلی کے محاورے اور روزمرے سے بھری ہوئی اس کتاب میں دلی کی
ضرب الامثال اور عورتوں کی بولی ٹھولی پر، سودا سلف بیچنے والوں کی آوازوں پر، کئی صفحات موجود ہیں۔
شادی بیاہ اور تہواروں پر گائے جانے والے گیت بھی قیصری بیگم نے خاص توجہ سے محفوظ کر دئے ہیں
اب ان کے بعد کون ایسی باتوں کو آئندہ آنے والوں کے لئے مرتب کرے گا؟ یہ باب تو ان کے ساتھ
ہی ختم ہو گیا۔ اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے۔

◎

اور بستی نہیں یہ دلی ہے

جناب رفعت سروش کی خودنوشت ''اور بستی نہیں یہ دلی ہے'' ۱۹۹۳ میں دلی سے شائع ہوئی۔
اس سے قبل ان کی سوانح کا کچھ حصہ بمبئی کی بزم آرائیاں ۱۹۸۶ میں اور ان کی ابتدائی زندگی کے
حالات نقوشِ رفتہ کے عنوان سے ۱۹۸۳ میں شائع ہو چکے ہیں۔ اور بستی نہیں یہ دلی ہے ان کی دہلی کے
قیام اور ملازمت کی داستان ہے۔

ذوالفقار علی بخاری نے اپنی سرگزشت میں رفعت سروش اور حبیب تنویر کے بارہ میں لکھا ہے
کہ ''حبیب اور رفعت سروش نے بچوں کے پروگرام میں بہت کام کیا۔ بچوں کے لئے یہ دو صاحب
کچھ لکھنے لگے تو ان کو پتہ چلا کہ سیدھا فقرہ کیوں کر لکھنا چاہئے۔ بچوں کے لئے لکھنا بڑوں کے لئے
لکھنے سے کہیں زیادہ مشکل کام ہوتا ہے''۔ (سرگزشت صفحہ ۲۱۵)۔ جب رفعت سروش کی یہ کتاب
مجھے ملی تو میں نے اشتیاق کے ہاتھوں سے اسے لیا اور شوق کی آنکھوں سے پڑھنا شروع کیا مگر حیف
کہ یہ کتاب بھی بچوں کے لئے لکھی ہوئی کتاب نکلی۔ رفعت سروش صاحب کو خیال نہ رہا کہ ان کی خود
نوشت کے قاری بچے نہیں ہیں اور ان کو ان کے حالات جاننے میں دلچسپی تو ہے ان کی ملازمت کے خم
و پیچ میں کوئی دلچسپی نہیں وہ ان سے خوش ذوقی اور خوش گفتاری کی توقع رکھتے ہیں۔ اور کچھ نہیں تو زبان
کی شستگی ہی قائم رہتی تو کوئی بات بھی تھی۔ اس کتاب کی زبان تو بجنور کی زبان بھی نہیں لگتی۔ رفعت
صاحب قلم برداشتہ لکھنے کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ انہوں نے یہ خودنوشت بھی اپنی ریڈیائی زبان
میں دھر کھینچی ہے۔

یہ خودنوشت ۲۹ اگست ۱۹۵۸ کی ایک گرم مرطوب صبح سے شروع ہوتی ہے جب وہ اپنے بے
ڈھنگے سامان کے ساتھ دہلی اسٹیشن پر دہرہ دون ایکسپریس سے اترتے ہیں۔ اس کے بعد وودھ بھارتی
ریڈیو پروگرام کی ملازمت اور ان کی ڈائری شروع ہو جاتی ہے کہاں گئے کس کس سے ملے پرانے

دوستوں میں کون کنوارا رہ گیا کس نے بیاہ رچالیا اور یہ دودھ بھارتی کیا ہے کیوں ہے؟ غرض لاطائل تفصیلات سامنے آتی چلی جاتی ہیں اور پڑھنے والا سوچتا ہی رہ جاتا ہے کہ لکھنے والا تو انہیں یہ کہہ کر لے چلا تھا کہ اور بستی نہیں یہ دلی ہے' اس سارے قضیہ میں دلی کہاں ہے؟ دلی کی تہذیب کدھر گئی؟ دلی کی زبان کہاں غائب ہوگئی؟ دلی کے وہ روڑے کیا ہوئے جن کی زبان کی دنیا بھر میں دھوم ہے؟ اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ۔ سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے!

رفعت صاحب ریڈیو کی اردو سروس سے کوئی بیس برس منسلک رہے۔ اس سلسلہ میں شعرا کے ساتھ ان کا رابطہ رہا۔ ساغر نظامی تو ان کے باس رہے اس لئے ان کے بارہ میں ان کی رائے اتنی اچھی نہیں کیونکہ وہ ڈپٹی چیف پروڈیوسر ہونے کی وجہ سے ان کی اردو مجلس کے پروگرام کو بند کر دینے کی سفارشیں کرتے رہتے تھے (صفحہ ۲۶۹) مگر بعض شعرا کے بارہ میں ان کی باتیں شاید پاکستان کے قارئین کے لئے نئی ہوں۔ وسیم بریلوی اور بشیر بدر صاحب کو انہوں نے ریڈیو کے ذریعہ روشناسِ خلق کیا۔ ڈاکٹر بشیر بدر صاحب کے بارہ میں لکھتے ہیں ''ڈاکٹر بشیر بدر کا ذکر ایک ایسے شاعر کا ذکر ہے جس نے اپنے احساسِ برتری کا خود بار بار اظہار کر کے اہلِ نظر کو محوِ حیرت کر دیا ہے کہ کیا اس قدر خوداعتادی بھی پیدا ہوسکتی ہے آج کے شاعر میں؟'' (صفحہ ۲۷۳)۔

اس بات کو آگے بڑھانے میں شاید مشفق خواجہ صاحب ہماری دستگیری کریں۔ لکھتے ہیں ''۱۹۴۷ کے بعد کی غزل کے بارہ میں ان کی ایک ضخیم تنقیدی اور تحقیقی کتاب شائع ہو چکی ہے۔ اس میں کثرت سے ایسے شعر درج کئے گئے ہیں جو جدید رجحانات کی عکاسی کرتے ہیں ان میں زیادہ تعداد خود بشیر بدر کے شعروں کی ہے اور کتاب کے ضخیم ہونے کا سبب بھی یہی ہے''۔۔۔ ''بشیر بدر اپنے آپ کو موجودہ زمانہ کا ہی نہیں آنے والے زمانوں کا بھی بہت بڑا شاعر سمجھتے ہیں اس وجہ سے بعض لوگ انہیں خود پرستی کا مریض قرار دیتے ہیں ہمیں اس رائے سے اتفاق نہیں۔۔۔ بشیر بدر نے اپنی تعریف میں اتنا کچھ لکھا ہے کہ شاعری کی طرح نثر میں بھی وہ اپنے آپ کو دہرانے لگے ہیں نیز منکسر المزاج ہونے کی وجہ سے وہ اس موضوع کا حق ادا نہیں کر پاتے'' (خامہ بگوش کے قلم سے صفحہ ۱۵)۔ '' حال ہی میں کراچی کے ایک اخبار میں ان کا ایک انٹرویو ہندوستان کے کسی اخبار سے نقل ہوا ہے اس میں انہوں نے حق

گوئی و بے باکی کا ایسا مظاہرہ کیا ہے جس کی کسی دوسرے سے توقع نہیں کی جاسکتی۔ ان سے پوچھا گیا 'سردار جعفری مجروح سلطان پوری اور کیفی اعظمی کے بارہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟' فرمایا ''میرا معاملہ میر اور غالب سے ہے وہی میرے حریف ہیں اور میں انہیں اپنا حریف سمجھتا ہوں'' (ایضاً صفحہ ۱۸)۔ رفعت سروش صاحب نے بقولِ خود بشیر بدر صاحب کو ریڈیو پر روشناس کروایا تھا گویا ''اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست! ڈاکٹر بشیر بدر کی بات تو ایک طرف رہی رفعت سروش صاحب نے جدیدیت کے بال و پر والے باب میں اپنے بارہ میں بھی دون کی لی ہے اور اس بات پر بہت مفتخر ہیں کہ انہیں سوویٹ نہرو ایوارڈ ملا ہے۔ ان نقادوں سے انہیں بہت گلہ ہے جو ان کی قدر و قیمت نہیں پہچانتے۔ اور ان کے نزدیک'' ناقدین ہر جگہ ایک ہی جیسے ہیں چاہے ترقی پسندی کا ڈھول پیٹنے والے ہوں یا جدیدیت کے بانس پر چڑھانے والے'' (صفحہ ۲۵۸)۔ چونکہ انہیں اپنی جدیدیت کا بڑا زعم ہے مگر ''ایک عرصہ تک مجھ میں یہ اخلاقی جرات نہ تھی کہ اپنے دل کی اس اندرونی آواز کی روشنی میں اپنا سفر طے کرنا شروع کروں'' (صفحہ ۲۶۱)۔ اس کے بعد سے وہ صرف دل کی آواز سنتے ہیں۔

اسی پروگرام کے سلسلہ میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے بارہ میں ایک نئی بات سامنے آ گئی۔ لکھتے ہیں ''ایک بار سکندر علی وجد کو نظم پڑھنے کے لئے بک کیا گیا اور خصوصی نقاد کے طور پر زحمت دی پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کو۔ وجد نے اپنی کوئی تازہ نظم پڑھی مگر جب خواجہ صاحب سے اظہار خیال کے لئے کہا گیا تو وہ بجائے وجد کی تازہ نظم کے بارہ میں کچھ کہنے کے اپنی ایک تحریر بولنے کے انداز میں پڑھنے لگے جس میں وجد کی شاعری کا عام تذکرہ تھا۔ اب میں حیران۔ خواجہ احمد فاروقی جیسا جید عالم جس نے اپنے علم و فراست کے جھنڈے گاڑ رکھے تھے اور اپنی یونیورسٹی کو اردو کا مرکز بنا دیا تھا۔ آج جو بڑے بڑے نقاد اور پروفیسر ہیں ان میں سے کئی خواجہ صاحب کے آگے پیچھے پھرتے تھے' درصاحب (یعنی ان کے افسر نے) مجھے تیز نظروں سے دیکھا جس کا مطلب تھا 'کسے پکڑ لائے؟'۔ آخر میں نے دخل در معقولات کیا اور عرض کیا کہ خواجہ صاحب آپ نے یہ سب کچھ تو وجد صاحب کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں فرمایا مگر اس وقت اس نظم کے بارہ میں کچھ فرمائیے جو زیر بحث ہے۔ کیا کہوں؟ خواجہ صاحب کی فصاحتِ زبان غائب ہوگئی وہ مشکل سے چند جملے کہہ سکے۔'' (صفحہ ۲۶۷)۔

قطع نظر اس بات کے کہ رفعت سروش خواجہ احمد فاروقی جیسے جید عالم کے بارہ میں ایسی بات کہنے کا حق رکھتے ہیں یا نہیں یہ بات کہنا ضروری ہے کہ ضروری نہیں ہوتا کہ جو شخص لکھنے کا دھنی ہو وہ بولنے کا مردِ میدان بھی ہو۔ خود راقم الحروف کے تجربہ میں بھی ایسی ہی بات آ چکی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی جو تاریخ ادب اردو پر کئی ضخیم جلدیں تصنیف کر چکے ہیں، مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشیں اور کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں، فیصل آباد گورنمنٹ کالج کے پوسٹ گریجوایٹ طلبا کی دعوت پر خواجہ میر درد کے بارہ میں لیکچر دینے کو تشریف لائے۔ بن ٹھن کے پورے افسرانہ طمطراق سے تشریف لائے کہ اس وقت مقتدرہ کے صدر نشیں اور حکومت کے گریڈ بائیس کے افسر تھے اور گفتگو اور حرکات و سکنات سے اپنے میزبانوں کو بار بار یاد دلاتے تھے کہ وہ بائیسویں گریڈ کے افسر ہیں۔ بھری مجلس میں لیکچر دینے کھڑے ہوئے تو ان کی سٹی گم ہوگئی۔ موضوع پر بات کرنا تو کجا ادھر ادھر کی ہانکنے لگے۔ ہر تیسرے فقرے پر طلبا سے پوچھتے تھے کیوں بھائی بات بنی کہ نہیں اور طلبا بیک زبان کہہ دیتے جی نہیں کچھ پلے نہیں پڑا۔ طلبا نے وہی بات مجھ سے پوچھی جو در صاحب نے رفعت سروش سے پوچھی تھی کہ یہ آپ کسے پکڑ لائے ہیں؟ جمیل جالبی صاحب کی شخصیت کا سارا سحر ٹوٹ گیا! آپ اتنے سراسیمہ ہوئے کہ تمام وعدے وعید بھلا کر اگلے روز ہونے والی علمی تقریبات میں شامل ہونے سے انکار کر دیا اور بہانہ یہ کیا کہ ان کا اسلام آباد واپس پہنچنا ضروری ہو گیا ہے۔ جمیل جالبی کوئی چھوٹا نام نہیں مگر خلقِ خدا کی زبان کس نے پکڑی ہے؟ اگلے روز کالج کے طلبا میں ''نام بڑے درشن چھوٹے'' کا بڑا چرچا رہا۔ جالبی صاحب مقالہ لکھ کر لے آتے تو کچھ بھی نہ ہوتا!!

رفعت سروش صاحب کی اور بستی نہیں یہ دلی ہے ان کی ریڈیو بیتی کے سوا اور کچھ نہیں جہاں انہوں نے ادب کے بارہ میں بات کرنے یا کہنے کی کوشش کی ہے وہیں خودستائی ان کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی ہے اس لئے یہ خودنوشت وودھ بھارتی کی تو شاید مستند داستان ہو رفعت سروش کے ادبی مقام یا ان کی ادبی فتوحات کی آئینہ دار ہرگز نہیں۔ اے کاش وہ زبان و بیان ہی پر توجہ دیتے تو دلی کے نام کی لاج رہ جاتی۔

◎

گوہر گزشت

جناب الطاف گوہر کا نام نامی ہمارے ملک کی نوکر شاہی کا بڑا نمایاں نام ہے اس لئے ان کی سرگزشت کا ذکر آتے ہی ان کے کارہائے نمایاں آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتے ہیں اور قاری یہ سوچنے لگتا ہے کہ اتنے اہم عہد میں اتنے اہم عہدوں پر اور لوگوں کے ساتھ رہنے والے شخص نے ہماری تاریخ کے کیسے کیسے رازہائے سربستہ وا کئے ہوں گے مگر اے وائے بدنصیبی کہ ان کی مختصر سرگزشت ان کے انتقال کے بعد چھپی ہے تو اس نے پڑھنے والوں کو بے انتہا مایوس کیا ہے۔ گوہر گزشت محض ایک داستانِ ناسفتہ ہے۔ غیر مربوط غیر مسلسل غیر مکمل اور تشنہ۔ کہنے والے نے نہ صرف کچھ کہہ کے نہیں دیا بلکہ بہت سی باتوں کو اور زیادہ پراسرار بنا دیا ہے۔ ہر شخص کے سینہ میں دفن شدہ تاریخ ایک امانت ہوتی ہے جس کے حقدار اگلی نسل کے لوگ ہوتے ہیں مگر الطاف گوہر نے اس امانت کی امانت داری کا فرض ادا نہیں کیا۔ اگر میں ان کی شخصی دیانت سے ذاتی طور پر آگاہ نہ ہوتا تو میں کہتا الطاف گوہر نے نہ صرف اپنی ذات کے ساتھ ناانصافی کی ہے بلکہ قوم کو بھی اپنی امانتِ محرمانہ سے محروم رکھا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ گوہر گزشت میں ''مجھ پر جو کچھ گذری ہے اس کا تذکرہ بھی ہوگا اور جن بزرگوں، سیاست دانوں، حکمرانوں سے ذاتی تعلقات رہے ان کے خاکے بھی ہوں گے۔ مجھے امید ہے کہ گوہر گزشت پاکستان کی سیاست کی ایک تصویر ہوگی جس کے خدوخال اور رنگ میرے مشاہدات اور تجربات کے آئینہ دار ہوں گے'' (صفحہ ۸) مگر ان کی علالت آڑے آ گئی اور انہیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہ مل سکا۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ اس تشنگی کی اصل وجہ یہ ہے ان کی عمر اور صحت نے وفا نہ کی مگر جتنا کچھ انہوں نے لکھدیا ہے وہ برنارڈ شاء کے قول کے مطابق اس گھونٹ کی طرح ہے جو پانی کے ذائقہ کی نشان دہی کر دیتا ہے۔ گوہر گزشت کا مزاج شفاف اور میٹھے پانی کا مزاج نہیں۔

گوہر گزشت' کا بیشتر حصہ صدر ایوب کے بارہ میں صفائیاں پیش کرنے پر مشتمل ہے

(صفحات ۱۳۰ تا ۱۵۳) مگر یہ کام تو وہ اپنی کتاب صدر ایوب کے دس سال لکھ کر پہلے ہی کر چکے تھے۔
اس وقت بھی اس کتاب کا تجزیہ کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا کہ اگر الطاف گوہر کا مقصد اپنی بریت
پیش کرنا ہے تو وہ اس میں ناکام رہے ہیں اور اگر صدر ایوب کی صفائی پیش کرنا ہے تو وہ ان کے اچھے
برے کاموں میں برابر کے شریک رہے ہیں اس لئے وہ ان کے عواقب سے بری الزمہ نہیں ہو سکتے۔
گوہر گزشت میں بھی الطاف گوہر نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے دوسروں کے بارہ میں بے رحم سچائی
سے کام لیا ہے اگر وہ اپنے باب میں بھی ایسی ہی سچائی لکھ دیتے تو ان کا قد کہیں زیادہ بڑھ جاتا۔ گوہر
صاحب نے یہ تو لکھ دیا کہ انہوں نے ''دعائے قنوت نہ سنانے پر مشرقی پاکستان کے ایک صنعت کار کی
مکوں اور تھپڑوں سے تواضع کر دی'' اور اپنی حیثیت کو بھول گئے (صفحہ ۱۱۶) مگر جب جرأت سے حق
بات کہنے کا موقعہ آیا تو وہ کنی کترا گئے حالانکہ ساری قوم کو نہ صرف دعائے قنوت یاد ہے بلکہ وہ جانے
کب سے اس کا ورد بھی کر رہی ہے۔

منظور قادر کے ذکر میں الطاف گوہر نے ان کا ایک مقولہ درج کیا ہے کہ ''کسی کے گریبان پر
ہاتھ ڈالنے سے پہلے اطمینان کر لیجئے کہ آپ کے پاؤں ہوا میں تو نہیں لہرانے لگیں گے'' (صفحہ ۱۴)
گوہر گزشت میں الطاف گوہر کے ہاتھ بہت لوگوں کے گریبان پر ہیں مگر خود ان کے پاؤں ہوا میں معلق
ہیں۔ مثلاً گوہر صاحب نے منظور قادر صاحب کے خدا کے وجود کے باب میں شکوک و شبہات کا بیان کیا
ہے حالانکہ جس محل پر یہ ذکر کیا گیا ہے وہاں اس بات کا کوئی محل نہیں تھا۔ خدا اور بندے کے تعلقات کا
معاملہ بندے اور خدا کے مابین ہوتا ہے۔ اسی طرح جسٹس منیر کے ذہن میں خدا کے وجود کے بارہ میں
جو شکوک تھے ان کا ذکر بھی نہایت بے محل طور پر ہوا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جناب الطاف گوہر اپنی
تشکیک کا بار دوسروں پر ڈال کر خود اپنے ذہن کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں؟

منظور قادر اور جسٹس منیر کے علاوہ اس کتاب میں بھٹو صاحب کا ذکر بھی ہے۔ بھٹو گوہر ''دشمنی''
تو ایک رازِ سربستہ نہیں ''راز سر راہ'' ہے اس لئے ان کی رائے یک طرفہ اور غیر جانبدار تو ہو نہیں سکتی
البتہ یہ ضرور ہے کہ انہوں نے بھٹو صاحب کی کینہ توزی کے ایسے ثبوت مہیا کئے ہیں جو ان کے سوا کسی
اور کے علم میں نہیں تھے۔ مثلاً انہیں وزارت تجارت میں چارج تاخیر سے ملا۔ جب ان کا ٹاکرا' وزیر

تجارت یعنی بھٹو صاحب سے ہوا تو انہوں نے انہیں جتا دیا کہ تاخیر اس لئے ہوئی ہے کہ انہوں نے کئی
برس پہلے بہ حیثیت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بھٹو صاحب کو لائسنس نہ دے کر بھٹو خاندان کی توہین کی تھی
(صفحہ ۵۱) اور پھر ہنس کر کہنے لگے ''میں نے تمہیں معاف کیا آج سے تمہاری ہماری دوستی ہوئی''۔ مگر
دوستی تو بھٹو صاحب اپنے ساتھ نہیں کرتے تھے الطاف گوہر کے ساتھ کیا کرتے؟ اور معاف کرنا تو ان
لوگوں کی سرشت میں ہوتا ہے جو والعافین عن الناس کا مطلب جانتے ہوں۔ ''بھٹو صاحب سے
دوستی کی پہلی شرط یہ تھی کہ آپ ان کی ہر سازش میں شامل ہو جائیں دیدہ دانستہ طور پر یا بے خبری کے عالم
میں'' چنانچہ الطاف گوہر ان کے دوست بن گئے اور بیگم بھٹو کو بھٹو صاحب کی ''غیر پسندیدہ'' عائلی
سرگرمیوں سے ''بے خبر'' رکھنے میں ان کے شریک ہو گئے۔ این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند؟

اپنے کراچی کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہونے کا ذکر اس لئے بھی انہیں مرغوب ہے کہ ''یہ عہدہ
بڑے رعب کا عہدہ تھا'' اس سے پہلے شہر پر ابوطالب نقوی، ہاشم رضا اور کاظم رضا کا راج تھا۔
ابوطالب نقوی چیف کمشنر تھے اور درخواست گذار ہاتھ باندھ کر ان کے سامنے کھڑے رہتے تھے ان کی
بیگم صاحبہ کے حضور جو سائل خواتین پیش ہوتیں وہ سر پر جوتے رکھے رہتی تھیں'' (صفحہ ۵۱)۔ الطاف
گوہر صاحب نے عوامی انداز اختیار کیا اور امراء اور سیاست دان یہ سمجھ کر انہیں انگیز کرتے رہے کہ
''پنجابی افسر ہے اور اہلِ زبان کے کلچر سے ناآشنا ہے''۔ یہ بات بڑی سخن گسترانہ بات ہے۔ حمید نسیم
نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ بہ طور سکرٹری اطلاعات الطاف گوہر ''ایک فوجی گورنر سے اس رعب
داب سے بات کر رہے تھے گویا ان کا مخاطب کوئی فوجی گورنر نہیں چپراسی ہے۔'' معلوم ہوتا ہے الطاف
گوہر بہت جلد اہلِ زبان کے کلچر سے کچھ زیادہ ہی آشنا ہو گئے تھے۔ جو شخص گورنروں سے یوں تخاطب
کا اہل ہے وہ عوام الناس سے بھلا کس کس طرح پیش نہ آتا ہوگا۔ ہم نے تو یہ بھی سنا ہے کہ استاد قمر
جلالوی کا جو شعر الطاف گوہر نے ابوطالب نقوی صاحب کی مدح میں کہا گیا بیان کیا ہے کہ ''خدا نے
چیف کمشنر بنا دیا تم کو۔ دعائیں ہم نے تو مانگی تھیں بادشاہی کی''۔ یہ شعر الطاف گوہر صاحب کی مدح میں
کہا گیا تھا کہ ''خدا نے ڈپٹی کمشنر بنا دیا تم کو''۔ واللہ اعلم بالصواب۔ لکھنے والے اور اہدافِ مدح کا
معاملہ اب اللہ کے ساتھ ہے۔ شاعر کا بھی ممدوحین کا بھی۔

ایوب خان کے بارہ میں الطاف گوہر نے صفائیاں ہی پیش نہیں کیں ان کے بارہ میں ایسی باتیں بھی لکھ دی ہیں جو کسی اور نے نہیں لکھیں۔ مثلاً یہ کہ ایوب، جنرل ریس کی باؤنڈری فورس میں تھے جس کے فرائض میں شامل تھا کہ یہ فورس قتل وغارت کو روکے مگر ایوب پر الزام تھا کہ وہ ''مہاراجہ پٹیالہ کی کسی محبوبہ پر ایسے عاشق ہوئے کہ اپنے فوجی فرائض بھول گئے'' (صفحہ ۴۱) اور ''ایوب کو ڈھاکہ میں (اسی الزام کی) سزا کے طور پر متعین کیا گیا تھا''۔ اور پھر یہ بھی کہ ''ایوب خان ان دنوں سگریٹ بہت پیتے تھے ان کا بیٹ مین صبح سویرے چائے کے ساتھ سگرٹوں کا ایک ڈبہ بھی پیش کیا کرتا تھا۔ ایک روز اس نے چائے کی پیالی تو حاضر کر دی مگر یہ خبر بھی دی کہ ''آج سگرٹ نہیں ملا'' ایوب خاں بہت برہم ہوئے اور انہوں نے بیٹ مین کو دو چار گالیاں دے دیں۔ بیٹ مین ایک خوددار پٹھان تھا اور عمر میں ایوب خان سے بہت بڑا تھا اس نے کہا ''جناب آپ میرے افسر ہیں مگر میں آپ کو بدکلامی کی اجازت نہیں دے سکتا۔ آپ پوری ڈویژن کو کمانڈ کر رہے ہیں اور آپ میں اتنا بھی صبر نہیں کہ آپ ایک دن سگریٹ نہ پینے کا دکھ برداشت کر سکیں'' ایوب خان پر اس بات کا ایسا اثر ہوا کہ اس دن سے انہوں نے سگریٹ پینا بند کر دیا'' (صفحہ ۴۱)۔

اور اب علمائے کرام کے باب میں ان کے ارشادات کی ایک جھلک۔ ''منیر صاحب کی شہرت منیر کمیٹی رپورٹ سے بھی ہوئی۔ ہر چند علما کرام اس رپورٹ کو ناقابلِ قبول سمجھتے تھے کمیٹی میں جسٹس کیانی منیر صاحب کے ساتھ تھے اور دونوں نے ان تمام علما کو بطور گواہ طلب کیا اسلامی معاملات میں جن کی رائے حرفِ آخر سمجھی جاتی۔ کمیٹی نے علما سے پوچھا کہ مسلمان کی تعریف کیا ہے ہر عالم نے مسلمان کی تعریف پیش کی جو دوسرے علماء سے مختلف تھی۔ جسٹس منیر اور کیانی نے کہا اس صورت حال میں ہم نے اپنی طرف سے مسلمان کی کوئی تعریف پیش کی تو علما کی طرف سے ہمیں کافر قرار دیا جائے گا'' (صفحہ ۱۰)

نواب کالاباغ کی ''کالاباغیوں'' کے ضمن میں لکھتے ہیں ''ایک دفعہ کہنے لگے کہ میں تو کالاباغ میں کھیتی باڑی کیا کرتا تھا مگر علاقے کے دشمنوں نے میرے ظلم وستم کے قصے بنانے شروع کر دئے۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ لوگ کالاباغ کے علاقہ میں داخل ہونے سے گھبرانے لگے۔ ایک روز خبر آئی کہ

عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب نے میاں والی میں ایک بہت بڑے جلسے میں میرے خلاف بڑی دھواں دھار تقریر کی اور حاضرین سے حلف لیا کہ اگلے روز سب لوگ سر سے کفن باندھ کر کالاباغ جائیں گے اور ظالم نواب کی خبر لیں گے۔ علاقے میں خوف پھیل گیا۔ بخاری صاحب کا ایک ساتھی میرے پاس یہ پیغام لے کر آیا کہ ''ہزاروں لوگ سر پر کفن باندھے کل یہاں آئیں گے بہتر یہی ہے کہ آپ ان کے سامنے حاضر ہو کر معافی مانگئے اور خداوند کریم سے توبہ کی التجا کیجئے''۔ میں نے اسی پیغام بر سے کہا کہ بخاری صاحب سے میرا اسلام کہنا اور میری طرف سے انہیں یہ بتا دینا کہ اگر وہ سر پر کفن پہنے ہوئے یہاں آئیں گے تو میں انشاءاللہ انہیں وہی کفن پہنا کر یہاں سے روانہ کر دوں گا'' بخاری صاحب کو میرا پیغام مل گیا ہو گا اس لئے دوسرے دن میانوالی سے کوئی جلوس کالاباغ کی طرف نہ آیا'' (صفحہ ۹۲)۔ بخاری صاحب حلف اٹھوانے کے پرانے عادی تھے۔ استاذی المحترم ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ دلی میں بخاری صاحب نے جامع مسجد میں مسلمانوں پر پاکستان بننے کے نقصانات واضح فرمائے تھے اور ان سے حلف لیا تھا کہ وہ پاکستان کی حمایت نہیں کریں گے۔

الطاف گوہر صاحب کا ارشاد ہے کہ ''مسلمانوں کی تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے جب ہمارے فتویٰ فروش علما نے حاکمیت کے نظریئے کو ہر ظالم اور سفاک حکمران کے اقتدار پر غاصبانہ قبضے کو جائز ثابت کرنے کے لئے بلاخوف اور بار بار استعمال کیا ہے۔ پاکستان میں آئینی تنازعات کے معاملے میں ہمارے علما کا اکثر و بیشتر منفی کردار رہا اور ان مباحث میں ان کا موقف کبھی ان کی کم سوادی کی نشاندہی کرتا کبھی ان کے مخصوص مفادات کی ترجمانی'' (صفحہ ۱۶۸)۔

''احمدیوں کے خلاف تحریک ایک سیاسی تحریک تھی جو بہت جلد پنجاب کے مختلف شہروں میں پھیل گئی اور ہر طرف آتش زنی قتل وغارت گری اور لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا۔۔۔۔ علماء کا مطالبہ یہ تھا احمدیوں کو مسلمانوں سے الگ ایک فرقہ قرار دے کر ان کے ووٹوں کا اندراج ملک کی دیگر اقلیتوں کے ساتھ کیا جائے علماء نے اس پر ابھی اصرار کیا کہ احمدیوں کو نہ ملکی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق دیا جائے اور نہ ہی انہیں اہم سرکاری عہدوں پر فائز کیا جائے۔۔۔ جہاں تک احمدیوں کو کاروبار مملکت سے الگ رکھنے کے مطالبے کا تعلق تھا تو یہ مطالبہ شہریوں کے لئے یکساں اور مساوی حقوق

کے تصور سے انحراف کے مترادف تھا۔ کمشن نے اس ضمن میں قائداعظم کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ کی تقریر کا
حوالہ دیا تھا کہ ہم اس بنیادی اصول کے ساتھ سفر کا آغاز کر رہے ہیں کہ ہم سب ایک مملکت کے برابر
کے شہری ہیں'' علماء نے قائداعظم کے پیش کردہ اس نظریہ ریاست کو مسترد کر دیا اور جماعت اسلامی
کے ایک کارکن نے بیان دیا کہ ''اس نظریہ پر قائم ہونے والی ریاست شیطان کا کارنامہ ہوگا''
(صفحہ ۱۲۲) جناب الطاف گوہر یہاں تک تو آ گئے اور آ کر رک گئے' کاش وہ یہ بھی بیان کر دیتے کہ
انہی علماء کی شہ پر ایک ظالم اور جابر ڈکٹیٹر نے احمدیوں پر کاروبارِ مملکت میں شرکت تو محال کی ہی تھی
اس نے ان کے عقائد پر بھی ضربِ کاری لگائی اور تاریخ میں اپنا نام سیاہ کاروں کی فہرست میں لکھوا کر
انجامِ مکذبین کو پہنچا اور ابھی ہمارا ملک خدا معلوم کتنے اور مواقع پر علماء کی تکذیب و تکفیر کا مورد و مستلزم
ٹھہرے گا۔

پراگندہ طبع لوگ

ڈاکٹر داؤد رہبر، لاہور کے ایک علمی خانوادہ کے چشم و چراغ ہیں۔ ان کے والدِ گرامی،
پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال، اورینٹل کالج لاہور کے نامور اساتذہ میں سے تھے۔ داؤد رہبر کی تعلیم بھی
گورنمنٹ کالج اور اورینٹل کالج لاہور میں ہوئی۔ کیمبرج یونیورسٹی سے آپ نے ''تنزیہہ کا مسئلہ قرآن
کی روشنی میں'' پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ کچھ دیر لاہور میں ریسرچ کا کام کیا پھر ترکی
میں ان کا تقرر انقرہ یونیورسٹی میں پاکستانی تاریخ پڑھانے پر ہوا۔ وہاں سے فارغ ہوئے تو امریکہ
آ گئے۔ کئی برس تک ہارٹفورڈ کے مدرسہ الٰہیات میں تدریس کی، پھر بوسٹن یونیورسٹی میں علم الادیان
کے پروفیسر کی حیثیت سے پڑھانے کے بعد ریٹائر ہوئے اور اب فلوریڈا میں مقیم ہیں اور ''شامِ
غریباں کی آہیں سُر میں لا کر'' (صفحہ ۱۲) بھرتے رہتے ہیں۔ موسیقی کے اس شوق نے جو غالباً ان کے
تایا پروفیسر خادم محی الدین کی دین ہے، ان کی تنہائیوں کو شاد و آباد رکھا۔

ڈاکٹر داؤد رہبر نے اپنے ملک اور کلچر سے دور رہنے کے باوجود اردو سے اپنا ناطہ نہیں توڑا۔
اپنے دوست احباب کو اردو میں جو خط لکھتے رہے ان کی نقلیں محفوظ رکھتے رہے جو عام حالات میں
اچنبھے کی بات ہے مگر اپنے کلچر سے دور رہنے والے 'مہاجرت' کی کسمپرسی کو اپنی زبان میں لکھی ہوئی
تحریروں کی (خواہ وہ اپنی لکھی ہوئی ہی کیوں نہ ہوں) مہک سے آباد رکھنے کی اس ادا کو سمجھ سکتے ہیں۔
مدتوں بعد وہی تحریریں ''نامہ و پیام'' کے عنوان سے چھپ کر دوسروں کو بھی فیض پہنچانے کا موجب
بنیں۔ میرا داؤد رہبر سے پہلا تعارف اسی ''نامہ و پیام'' کے مطالعہ سے ہوا۔

''پراگندہ طبع لوگ'' کے دیباچہ میں خود ان کا کہنا ہے کہ ''پردیس میں اردو نویسی کے لئے
فراغت بندہ کو ریٹائر ہو کر ملی۔ کچھ قصے دیس کے یاد آئے کچھ پردیس کے''۔ داؤد رہبر نے 'راوی' بن
کر ان قصوں کو بیان کر دیا۔ روایت کا راستہ پل صراط سے زیادہ کٹھن ہوتا ہے مگر کتاب پڑھتے ہوئے

محسوس ہوتا ہے کہ راوی اس کٹھن منزل سے بخیر وخوبی گذر گیا ہے۔ اگر چہ انہیں کرداروں کے ناموں اور مقاموں کی تلبیس کرنا پڑی مگر ایسا کرنا بہت ضروری تھا ورنہ اہلِ وطن یہی کہتے ''باہر رہ کر رہبر گمراہ نے کیا جھک مارا'' ہے۔ کرداروں کے نام بدلنے سے ان کا کردار تبدیل نہیں ہوا اور دیس کے ان کرداروں کو جاننے اور پہچاننے والے بخوبی پہچان لیتے ہیں کہ کون معشوق ہے اس پردہ ءزنگاری میں۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ جو کردار بدیسی ہیں ان کے بیان میں بھی راوی نے کوئی لگی لپٹی روا نہیں رکھی ہوگی۔

راوی نے ان کہانیوں کو لکھنے کا سبب یہ بیان کیا کہ ''بندہ اگر خود پراگندہ نہ ہوتا تو یہ کہانیاں نہ لکھتا۔ پراگندہ کے لفظی معنی ہیں بکھرا ہوا آدمی، حواس باختہ، کھویا کھویا، میں نے اپنے ایک دوست سے کہا ممکن ہے دیگر پراگندہ لوگ یاد آئیں اور میں ان کی کہانیاں بھی لکھوں، اس عزیز نے کہا دنیا پراگندہ لوگوں سے بھری پڑی ہے، کس کس کی کہانی لکھو گے؟''۔ یہ کہانیاں پراگندہ لوگوں کی کہانیاں نہیں ہیں پراگندہ طبع لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ میر نے پراگندہ طبع کے لفظ کو جو معنویت دے دی ہے وہ محض بکھرے ہوئے ہونے، حواس باختہ ہونے اور کھوئے کھوئے سے ہونے سے کہیں زیادہ عمیق اور متنوع ہے۔ ''
پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ۔ افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی!''

انتظار حسین نے اپنے دیباچہ میں کہا: ''کیا رنگا رنگ کردار ہیں، بھانت بھانت کی مخلوق۔ اسی سے مجھے شک ہوتا ہے کہ داؤد رہبر اگر عالم فاضل نہ ہوتے تو افسانہ نگار ہوتے''۔ اگر عالم فاضل نہ ہوتے تو افسانہ نگار ہوتے والی بات بھی انتظار حسین ہی کہہ سکتا تھا۔ مجھے یاد ہے کچھ عرصہ پہلے پی ٹی وی پر انتظار حسین کے ساتھ گفتگو کا پروگرام ہو رہا تھا جس میں غالب احمد کے علاوہ مسعود اشعر بھی تھے۔ جب مسعود اشعر نے اپنی روایتی ''دانشوری'' کا ثبوت دیتے ہوئے انتظار حسین کے اسلوب افسانہ نگاری میں کوئی تاریخی عمق پیدا کرنے کی کوشش کی تو انتظار حسین نے صاف کہہ دیا جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں وہ میرے ذہن کے کسی گوشہ میں بھی نہیں تھا محض آپ کی دانشوری کا شاخسانہ ہے۔ داؤد رہبر نے بھی جو کچھ لکھا ہے وہ کسی تاریخی عمق یا زاویہ سے نہیں لکھا محض اس لئے لکھا ہے کہ ''وطن کے احباب انہیں بھولے ہی نہ رہیں''۔۔۔۔ اپنی ایک دوست سے کہتے ہیں: ''چند مہینے قلمکاری میں

گذرے۔ سب کچھ اردو میں لکھ رہا ہوں میری یہ تحریریں پاکستان کے رسالوں میں چھپ رہی ہیں، اس سے تعلقات کی تجدید ہو رہی ہے، پرانے دوستوں کو بھلا دینے سے مر جانا اچھا ہے۔'' (صفحہ ۴۵)

یہ کتاب سوانح کے زمرہ میں شمار کی گئی ہے مگر یہ نری پری سوانح بھی نہیں ہے۔ خاکے، افسانے، سوانح اور فیکٹ اور فکشن کے ملغوبے ''فیکشن'' کے بین بین کی کوئی چیز ہے جسے میں اپنی سہولت کے لئے ''احوال نامہ'' کا نام دوں گا۔ اس میں داؤد رہبر کی اپنی سوانح بھی بین السطور بیان ہوتی چلی گئی ہے۔ ان کے خاندان کا، اعزہ و اقارب کا، بچپن کے ہمجولیوں کا، طلباء کا، اساتذہ کا سب کا مذکور ہے اس کے مطالعہ سے ''آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد'' کا مضمون بھی عیاں ہوتا ہے: ''اس رنگیلے خاندان میں تمتع کے جو امکانات تھے ان کے شعور سے نہ جانے میں کیوں کر بے بہرہ رہا'' (صفحہ ۱۶۹)۔ اس لئے یہ کتاب ایک حد تک داؤد رہبر کی خودنوشت سوانح عمری ہے اور بہت سے لوگ اپنی سوانح عمری کو ''احوال الرجال'' کے پیرائے میں لکھنا پسند کرتے ہیں۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں صرف وہ افراد موضوع سخن بنے ہیں جن کا راوی سے براہ راست رابطہ رہا۔ اس میں دوسروں کی بیان کی ہوئی باتوں کی پذیرائی نہیں ہوئی۔ جن باتوں کا راوی کو علم نہیں ان کے بارہ میں راوی نے صاف کہہ دیا ہے کہ اسے ان باتوں کا علم نہیں۔ گویا راوی کی روایتیں سماعی یا شنیدہ نہیں اس لئے مستند ہیں۔ شنیدنی میں مبالغہ کا قوی احتمال رہتا ہے۔ داؤد رہبر نے شنیدہ کو رد کر کے دیدہ پر انحصار کیا ہے کہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ!

اس کتاب میں دو مکمل خاکے بھی ہیں جن میں راوی نے ناموں کی تلبیس نہیں کی۔ ''ن۔م۔ اور نیاز مند'' ن۔م۔ راشد کا خاکہ ہے اور ''دھیان بیٹھک'' ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ کا۔ ن۔م۔ راشد ان کے والد گرامی کے شاگرد رہے اس لئے ان کے دل میں راوی کے لئے ایک گوشہ نرمی کا تھا، راوی نے بھی انہیں اپنا بزرگ ہی جانا اس لئے اپنے کو نیاز مند کہہ کر متعارف کروایا ہے۔ اس خاکہ سے راشد صاحب کی شخصیت کے دو عقدے وا ہو کر سامنے آتے ہیں۔ ایک تو ریڈیو کی سروس کے دوران ان کی خشونت اور اپنے ماتحت کام کرنے والوں سے ان کی درشت کلامی۔
حمید نسیم نے اپنی خودنوشت میں راشد صاحب کی خشونت کو ان کی کپتانی کا شاخسانہ قرار دیا

ہے۔راشد صاحب نے ان سے خود کہا: پطرس بخاری ''مجھ پر خاص مہربان تھے'' ایک روز انہوں نے
'' چند لفظوں میں فہمائش کی کہ اگر تمہارے ساتھیوں یا ماتحت (کام کرنے والوں) میں سے کوئی ایسا
نالائق یا غیر ذمہ دار ہے کہ محکمہ کے کام اس سے چوپٹ ہو رہے ہیں تو اسے نوکری سے برخاست کرنے
کی تجویز لکھ بھیجو، اور اگر کوتاہیاں چھوٹی چھوٹی ہیں تو انہیں معاف کر دو اور تحمل سے تعلقات خوشگوار رکھو۔
ایسی نصیحت کی توقع مجھے ہرگز نہ تھی۔ ایک محسن کی فہمائش کا مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ جلد ہی میری مشتعل مزاجی
دور ہوگئی اور ہمکاروں شناساؤں اور دوستوں سے خندہ پیشانی اور ملنساری کا سلوک کرنے لگا'' (صفحہ
۲۵۰)۔ داؤد رہبر کا کہنا ہے کہ: '' راشد صاحب کے چہرے پر مجھے خشونت محسوس ہوا کرتی تھی، ایک
روز بستر پر گاؤ تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھے اپنی ایک تقریر کے مسودے پر نظر ثانی کر رہے تھے، دم لینے کو
انہوں نے اپنی عینک اتار کر میز پر رکھ دی، میں نے ان کے چہرے کی تبدیلی محسوس کی، عینک اتری تو
چہرے کی خشونت جاتی رہی، چشم میں خشم کا نام تک نہ تھا'' (صفحہ ایضاً)۔

راقم الحروف کا اپنا تجربہ بھی اس سے ملتا جلتا ہے۔ راشد صاحب سرگودھا آئے ہوئے تھے۔
سرگودھا اکادمی نے ان کے اعزاز میں خاص شام کا اہتمام کیا تھا ۔آپ وزیر آغا کے ہاں قیام فرما
تھے۔ میں ربوہ سے سیدھا وزیر آغا کے ہاں پہنچا تھا۔ چند قریبی دوستوں کو انہوں نے خاص طور سے
راشد صاحب سے ملوانے کے لئے کھانے پر مدعو کر رکھا تھا۔ ان سے گفتگو کیا رہتی ہم لوگ دم بخود
بیٹھے اتنے بڑے شاعر کی باتیں سنتے رہے، جن میں بڑی اپنائیت اور ملائمت تھی۔ جب وہاں سے اٹھ کر
اکادمی کے اجلاس میں پہنچے۔ راشد صاحب نے کلام سنانا شروع کیا تو محسوس ہوا کہ شعرخوانی شروع
کرتے ہی راشد صاحب کے چہرے پر عجیب سی خشونت پیدا ہوگئی ہے۔ ایک تو نظم معریٰ پھر راشد
صاحب کا پڑھنے کا انداز، جہاں ہم لوگ ان کی سحر طراز نظم خوانی سے متاثر تھے وہیں یہ بھی احساس ہو رہا
تھا کہ شاید راشد صاحب کسی بات پر ناراض ہوگئے ہیں۔ نظم تھی ''حسن کوزہ گر'' اور کتاب تھی لا مساوی
انسان۔ راشد صاحب بڑے ولولہ سے پڑھ رہے تھے سامعین ہمہ تن گوش تھے۔ راشد صاحب کی چاند
پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے ناک پر موٹے فریم کی کالی عینک تھی۔ یکا یک راشد صاحب نے
عینک اتاری اور ماتھے سے پسینہ پونچھا۔ معلوم ہوا راشد صاحب کے چہرے پر محبت اور ملاطفت نے

سایہ کر لیا ہے۔ یہ تبدیلی بہت سے دوستوں نے محسوس کی۔ اب مدتوں بعد داؤد رہبر کی بات پڑھ کر
سرگودھا اکیڈمی کا وہ اجلاس آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ میری راشد صاحب سے بس وہی ایک
ملاقات ہوئی۔ میں نے کسی کو ان سے بہتر نظم معریٰ کی نظم خوانی کرنے والا کوئی اور نہ دیکھا۔ ان سے سن
کر معلوم ہوا کہ نظم معریٰ میں کتنی معنویت ہوتی ہے۔

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ، جو تقسیم ہند کے بعد پنجاب یونیورسٹی چندی گڑھ کے پنجابی کے صدر
شعبہ اور نامور استاد ہوئے، انگریزی زبان وادب میں ایم۔اے ہونے کے باوجود اورینٹل کالج لاہور
میں پنجابی کے استاد تھے۔ اورینٹل کالج کا چھوٹا سا لان (جسے ہم نے بھی بہت برتا اور چاہا ہے)، اس
کے بارہ میں داؤد رہبر نے لکھا ہے: '' جاڑوں میں اس لان پر دھوپ سینکنے اور سگریٹ پینے کو حافظ محمود
خاں شیرانی اکثر آ کھڑے ہوتے، یہی معمول ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ کا بھی تھا۔ پہلی بار میں نے ڈاکٹر
موہن سنگھ دیوانہ کو سگریٹ پیتے دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ مسلمان کو شراب پیتے دیکھ کر حیرت نہیں ہوتی لیکن
سکھ کے منہ میں سگریٹ؟'' ---------'' ملک تقسیم ہوا اور تیس برس گذر چکے تو آپ بوسٹن تشریف
لائے میرے گھر میں بیٹھے تھے، یکا یک انہوں نے پگڑی اتار کر صوفے پر رکھ دی، ان کا گھٹا ہوا سر
دیکھ کر مجھے یقین نہ آیا۔'' (صفحہ ۱۷۲) ۔'' پیری مریدی کی پریکٹس یہ صرف مغربی ملکوں میں کرتے
ہیں۔--- بوسٹن کے ایک بازار میں ایک روز میں نے انہیں دیکھا، ایک کمسن چیلی ان کے ہاتھ میں
ہاتھ دیئے ان کے ساتھ تھی۔ عمر کا تفاوت دیکھنے والے چونک چونک اٹھے لیکن یہ دونوں ایسی ترنگ میں
تھے گویا کلیلیں کرنے کو تیار ہیں، اس وقت آپ کی عمر پچھتر نہیں تو ستر تو ضرور ہوگی'' ۔ (صفحہ ۲۲۲)۔

'' پراگندہ طبع لوگ'' اس لحاظ سے بھی دلچسپ کتاب ہے کہ راوی کو جو بات جیسے جیسے یاد آتی
گئی وہ روایت کرتا گیا۔ زمانی اور مکانی ترتیب کا خیال نہیں کیا۔'' تذکرہ غوثیہ اور دیوان سنگھ مفتون کی
آپ بیتی اسی لئے مزے کی کتابیں ہیں کہ ان میں قصے انگل انگل ہیں۔--- اگر تاریخ وار بیان ہوتے تو
ڈائری کے اندراج ہو کر رہ جاتے اور ان میں بادِ صبا کے جھونکوں والی بات نہ ہوتی'' (صفحہ ۲۶۷)
قاری کو جو چیز سب سے زیادہ اپنی جانب کھینچتی ہے وہ داؤد رہبر کی بے تکلفی اور نرم روی ہے'' جہاں ہم
پیدا ہوئے (یعنی لاہور) وہاں سمندر کا ساحل کہاں، ہم تو راوی کے کنارے پیدا ہوئے، ہمارے تحت

الشعور میں ندی بہہ رہی ہے''(صفحہ ۱۳۷) امریکہ میں ساری زندگی گذار دینے کے بعد بھی انہیں لاہور اور لاہور کی بے تکلفیاں نہیں بھولیں ''ڈبی بازار، گمٹی بازار، قلعہ گوجر سنگھ، مزنگ اور اچھرہ کے ہمسایوں کے درمیان جو قرب اور بے تکلفیاں ہیں وہ ماڈل ٹاؤن کے ہمسایوں کے درمیان ہو ہی نہیں سکتیں۔ میں نے اپنا بچپن ماڈل ٹاؤن میں گذارا، اس بستی کے باشندوں میں گرمجوشی ہرگز نہ تھی ہمسایوں کے بچے البتہ مل کر کھیل لیتے تھے پھر اس بنگلستان کو بیگانستان کیوں نہ کہیں؟۔۔۔۔۔بنگلستان کے پروردگان میں وہ حوصلہ ہو ہی نہیں سکتا جو گلیوں کے رہنے والوں میں ہوتا ہے، اقبال گلیوں میں پل کر جس طرح حوصلہ مند ہوئے سول لائنز میں پل کر کبھی نہ ہو پاتے، وہ شاعر جو بھاٹی دروازہ کا مکین نہیں رہا شکوہ جیسی نظم نہیں کہہ سکتا۔''(صفحہ ۱۲۴) لاہور نے جو حوصلہ 'راوی' کو دیا یہ اسی حوصلہ کی دین ہے کہ اسنے مظلوموں، کمزوروں، بدحالوں اور بے حالوں کے قصے کہے ہیں اور ان کے احوال کے بیان سے توانائی پائی ہے: ''غصیلے لوگ کمزوروں کی تاک میں رہتے ہیں اور ان پر جھپٹ کر اپنا غصہ نکالتے ہیں، افسردہ لوگ بشاش لوگوں کی صحبت ڈھونڈتے پھرتے ہیں یا دُکھی دُکھی کے پاس جا بیٹھتا ہے کہ دُکھ سکھ کرے۔ کھاتے پیتے آدمی پر مصیبت آئے تو وہ بے گھروں بھکاریوں اور فاقہ مستوں کا حال دیکھ کر اپنے آپ کو تسلی دیتا ہے۔ غرض سکت اور حوصلہ کا تکیہ بڑی حد تک ہم جنسوں اور ہم نفسوں کے احوال پر ہوتا ہے۔ زندگی قوت کے لین دین کا بازار ہے۔''(صفحہ ۸۹) مگر ''تقدیر ایک ندی ہے، اسباب سے نتیجے نکلتے ہیں اور نتیجے اسباب بن جاتے ہیں، اسباب اور نتائج کا یہ تعاقب اسی طرح ہے جس طرح ندی میں پانی اور پانی کا تعاقب۔ آگے بھی پانی پیچھے بھی پانی!''(صفحہ ۶۴)

یہ تعاقب اس کتاب میں بھی جاری ہے۔ دور دیس امریکہ میں رہنے والے دو بھائیوں کی گفتگو: ''عیدالفطر کے روز مختار نے پچھلے پہر دوسرے شہر سے بڑے بھائی کو فون کیا۔ عید مبارک کہہ کر پوچھا کیا ہو رہا ہے۔ بھائی جی نے کہا ہم عید پارٹی سے واپس آئے ہیں وہاں میں نے اردو میں تقریر کی مجھے اردو میں تقریر کر کے بہت مزا آتا ہے۔ مختار نے پوچھا تقریر کا مضمون کیا تھا، بھائی نے کہا 'اپنی تہذیب'۔ میں ان لوگوں سے کہتا ہوں اخلاق اسلام ہی سے درست رہتا ہے، امریکی کردار کی تقلید میں تباہی ہے۔ یہ سارا معاشرہ روحانی اور جسمانی امراض میں مبتلا ہے، اپنے بچوں کو ارکانِ دین کا احترام

سکھایئے، پاکستانیوں کی کوئی پارٹی ہوتی ہے تو میں ضرور اس میں شریک ہوتا ہوں اور اپنے آپ اٹھ کر اردو میں اس مضمون کی تقریر کر دیتا ہوں، ساری برادری میری ممنون ہے''(صفحہ ۸۹)

پراگندہ طبع لوگ میں جو غیر ملکی کردار زیر بیان آئے ہیں وہ کم وبیش سب مہاجر ہیں کوئی کہاں کا کوئی کہیں کا مگر ان لوگوں پر بھان متی کے کنبہ کا گمان نہیں ہوتا۔ سب کا دکھ درد مشترکہ ہے اور روایت کرنے والے نے بڑی چابک دستی سے اس دکھ کو لفظوں کی لڑی میں پرو دیا ہے۔ دواؤد رہبر کے ہاں چھوٹے چھوٹے خوب صورت فقرے بھی بہت ہیں جو قاری کو اکتاہٹ کا شکار نہیں ہونے دیتے اور راوی انہی کے سہارے قاری کو ساتھ لئے لئے چلتا ہے۔ ''میں جہاں بھی رہا ہوں ستم کو ستم ظریفی سمجھ کر ہنسا ہوں''(صفحہ ۱۰۱) ''لمبے سکوت کی بجائے مجھے سکوت کا وہ چھوٹا سا وقفہ پسند ہے جو اچھی گفتگو کے جملوں کے درمیان ہوتا ہے''(صفحہ ۲۱۹)۔

داؤد رہبر کی کتاب میں جو جمعیت ہے اس سے ہرگز یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ وہ ''پراگندہ'' ہیں البتہ ''پراگندہ طبع'' ضرور ہیں اور ان لوگوں میں سے ہیں جن کے بارہ میں میرؔ کا کہا پہلے روایت ہو چکا کہ 'افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی'۔

◎

زندگی زنداں دلی کا نام ہے

"زندگی زنداں دلی کا نام ہے" ظفر اللہ پوشنی کی خودنوشت ہے۔ کیپٹن ظفر اللہ پوشنی کا نام ۱۹۵۱ کی پنڈی سازش کیس کے دنوں کا بڑا معروف نام تھا کیونکہ یہ نوجوان سازش کیس کے ملزموں میں اغلباً سب سے کم عمر ملزم تھا۔ ان کا تعلق سگنلز سے تھا۔ اس سازش میں جنرل اکبر خاں (بعد کو بھٹو کی کابینہ میں وزیرِ مملکت رہے) ان کی بیگم نسیم اکبر خاں (دختر بیگم شاہنواز) جنرل نذیر احمد، ائر کموڈور جنجوعہ، بریگیڈئر صادق خان، بریگیڈئر عبداللطیف، لفٹیننٹ کرنل ضیاء الدین، لفٹیننٹ کرنل نیاز محمد ارباب، (ضیاء الحق کے دور میں وفاقی وزیر بنے)، کیپٹن خضر حیات، میجر حسن خان، میجر محمد اسحٰق، اور کیپٹن ظفر اللہ پوشنی شامل تھے۔ فوجیوں کے علاوہ عام لوگوں میں سے فیض احمد فیض، سید سجاد ظہیر اور محمد حسین عطا بھی ملوث تھے۔ ان لوگوں پر سپیشل ٹریبونل میں مقدمہ چلا۔ بیگم نسیم اکبر خان بری ہوگئیں، میجر جنرل نذیر احمد کو تابرخواست عدالت قید اور ملازمت سے برطرفی کی سزا دی گئی۔ جنرل اکبر خان کو بارہ برس قید تنہائی اور باقی مجرموں کو مختلف میعاد کی سزائیں دی گئیں۔ فیض اور سجاد ظہیر کو چار سال قید کی سزا دی گئی۔ ظفر اللہ پوشنی کو چار سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ بعد کو یہ لوگ مختلف عدالتی چارہ جوئیوں کے بعد رہا کردیے گئے۔

پاکستان کے سابق کیبنٹ سکرٹری اور سی ایس پی حسن ظہیر نے پنڈی سازش کے بارہ میں مفصل تحقیقی کتاب لکھی ہے اور مختلف مجرموں سے انٹرویو بھی کیے ہیں۔ ظفر اللہ پوشنی کے بارہ میں ان کا کہنا ہے کہ "ظفر اللہ پوشنی جو کراچی کی ایک پھیلتی پھولتی اشتہاری فرم میں ملازم ہیں مجھ سے ملاقات کے دوران خوشدلی سے اور کھل کر باتیں کرتے رہے۔ ان میں تلخی نہیں ہے اور وہ زندگی کی تکالیف اور آزمائشیں بآسانی سہہ گئے ہیں۔ وہ سازش میں شمولیت کو اپنی جوانی کی 'حماقت' سے تعبیر کرتے ہیں"
(راولپنڈی سازش ۱۹۵۱ پاکستان میں فوجی انقلاب کی پہلی کوشش از حسن ظہیر صفحہ ۳۱۳)

"زندگی 'زنداں دلی' کا نام ہے" ان کے ایامِ اسیری کی داستان ہے۔ فیض صاحب نے اس کتاب کے فلیپ پر لکھا ہے "پوشنی کے لکھے ہوئے اس منظرنامے میں آپ کو سارے کردار پردۂ تصویر پر نظر آئیں گے اور جیل خانے کے وہ سارے ڈراپ سین بھی جس سے ان کی زندگی عبارت تھی۔ پوشنی نے یہ سب کچھ چٹخارے لے کر لکھا ہے اور مجھے ڈر لگتا ہے کہ اسے پڑھ کر لوگ یہ نہ سوچنے لگیں کہ اگر سازش اتنی ہی لایعنی اور جیل خانہ ایسی ہی لطف کی چیز ہے تو یہ تفریح ہم بھی کیوں نہ کر دیکھیں"۔

یہ کتاب پوشنی نے ۵۴-۱۹۵۳ میں حیدر آباد جیل کے قیام کے دوران لکھی تھی اس کا اندازِ بیان وہی کھلنڈرے لڑکوں کا سا اندازِ بیان ہے جن کے نزدیک زندگی لمحۂ موجود کا نام ہوتا ہے۔ گرفتاری اور جیل کا اثر ان کی طبیعت پر اتنا سا تھا کہ اپنے سینئر لوگوں سے چھیڑ چھاڑ جاری رکھتے تھے اور ان کے رینک سے خوف زدہ نہیں تھے۔ حالانکہ فوج کی تربیت میں سینئر کا نام ہی جونئر کو لرزہ براندام کر دینے کو کافی ہوتا ہے۔ اس بے خوفی نے ان کے اندازِ بیان کو بڑا دلچسپ بنا دیا ہے۔ جنرل نذیر احمد کی جزرسی پر بہت جز بز ہیں "جنرل نذیر خاطر داری سے بہت گریز کرتے تھے اور جنرل نذیر کی یہ لاتعلقی (جسے بعض گستاخ لوگ ان کے بخل سے تعبیر کرتے تھے) سب نوجوانوں کی طبیعت پر گراں گذرتی تھی اور کیپٹن خضر حیات نے تو دو ایک مرتبہ ان کے کمرے سے بہ طور شرارت پھل اور مٹھائی کی چوری بھی کی جس پر جنرل صاحب سخت چیں بجبیں ہوئے" (صفحہ ۱۵۷)۔

"فیض صاحب چھپکلیوں سے بہت ڈرتے تھے" (صفحہ ۱۸۸)۔ "کھانے کی میز پر بیٹھ کر ان کے ساتھی بلیوں کو کھانا دیتے تو فیض صاحب بہت ناپسندیدگی کا اظہار کرتے تھے" (صفحہ ۱۵۶)۔ سب لوگ ایک دوسرے پر پانی اچھالتے پھرتے تھے "البتہ ایک شخص اس سارے ہنگامے سے لاتعلق اپنی چارپائی پر بیٹھا بڑے مزے سے سگرٹ پی رہا تھا۔ یہ تھے فیض احمد فیض جو کمال بے نیازی سے اپنے ساتھیوں کی سرگرمیاں ملاحظہ فرما رہے تھے لیکن خود شمولیت کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ میجر اسحٰق جو کافی بدلحاظ واقع ہوئے ہیں سے فیض کی یہ بے نیازی برداشت نہیں ہوئی اس نے فوراً ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس فیض کے منہ پر چھڑک دیا جس سے نہ صرف ان کا چہرہ ڈھل گیا بلکہ ہونٹوں میں پھنسا ہوا سگرٹ بھی سوں سوں کر کے کشت ہوگیا۔ شاعر کا یہ حال دیکھ کر "قوم" کا ہر فرد خوشی سے نعرے لگانے لگا۔ خیال تھا کہ اس پرسکون انسان میں بھی اب کچھ حرارت پیدا ہوگی لیکن فیض نے اطمینان سے جیب

سے رومال نکالا چہرے کو پونچھا اور ایک نیا سگرٹ سلگا کر چارپائی پر لیٹ گئے۔ میں نے میجر اسحٰق سے کہا "بحرالکاہل میں طوفان نہیں آسکتا" (صفحہ ۱۸۱)۔ اسحٰق نے مایوس ہو کر پانی کی بالٹی اور گلاس اٹھایا اور رخ بدل کر کرنل ضیاء الدین پر جھپٹ پڑے، اسحٰق جونہی ضیا کے پیچھے لپکے فیض نہایت وقار کے ساتھ چارپائی سے اٹھے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے برآمدے میں رکھے ہوئے پانی کے قریب پہنچے، وہاں سے انہوں نے گھڑا اٹھایا اور صحن کی طرف واپس ہوئے سب حیران تھے کہ یہ شخص اب کیا کرنا چاہتا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ فیض چوہدری اسحٰق کی چارپائی کے قریب ٹھہرے اور نہایت سنجیدگی سے سارا پانی چوہدری کے بستر پر الٹ دیا" (صفحہ ۱۸۲)۔

"جنرل نذیر سر اور پاؤں میں مہندی لگا کر برآمدے میں دراز اخبار بینی میں مصروف رہتے" (صفحہ ۱۵۶) انہیں جیل میں ہونے والے مشاعروں کا مستقل پریزیڈنٹ بنایا گیا تھا قوم نے انہیں "سارس" کا تخلص بھی عطا کیا تھا۔ جنرل اکبر خاں کو فتوری، اور فیض صاحب کو کاہل تخلص عطا کیا گیا تھا۔ فیض جب کوئی شعر کہہ لیتے تو دوستوں کو بلا کر سناتے تھے۔ غرض یہ خودنوشت بڑی رواں دواں شگفتہ نثر کا نمونہ ہے اور پوشنی داد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے جیل کی سنگین حقیقتوں کو بھی سنگین سمجھنے کی بجائے ہلکا پھلکا تصور کیا اور اپنے انداز بیان سے قاری کو اس کی شگفتگی میں شریک کر لیا۔

کتاب میں بعض مقامات پر لایعنی اور لاطائل بحثیں بھی در آئی ہیں صفحہ ۱۲۱ سے ۱۴۹ تک کمیونزم کے مالہٗ اور ماعلیہ پر بیکار کی بحث ہے جس نے اس کتاب کی وحدت کو بہت مجروح کیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ خودنوشت خاصے کی چیز ہے۔ ظفر اللہ پوشنی بعد کی زندگی میں تعلقات عامہ کی کسی کمپنی سے وابستہ رہنے کے باوجود لکھنے پڑھنے سے مجتنب رہے اور کوئی چیز لکھ کے نہیں دی ورنہ ان میں ادیب بننے کے جراثیم تو وافر مقدار میں موجود تھے۔ قید سے رہائی کے بعد یونیورسٹی کی طالب علمی کے دوران وہ بین الکلیاتی مباحثوں میں بڑے نمایاں مقرر شمار کئے جاتے تھے۔ ندرت الطاف اور ظفر اللہ پوشنی کی جوڑی بڑی زوردار جوڑی تھی اور ان کی تیز تیکھی باتیں لوگوں کو یاد تھیں۔ اب تو وہ لوگ ہی نہیں رہے سب کچھ نقش و نگار طاقِ نسیاں ہو گیا۔

◎

جہانِ دگر

"جہانِ دگر" جناب احسان دانش کی خودنوشت جہانِ دانش کا دوسرا حصہ ہے جو احوال الرجال پر مشتمل ہے۔ دانش صاحب نے اس حصہ میں کوئی ڈیڑھ ہزار کے قریب افراد کا ذکر کیا ہے۔ زندگی میں جس موقع پر جس موڑ پر کسی سے ان کی ملاقات ہوئی انہوں نے اس کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا اور اب اپنی خودنوشت میں ان کا اسم وار جائزہ لکھ دیا۔ ان لوگوں میں ادیب شاعر بھی ہیں۔ رہنما بھی حاکم بھی محکوم بھی۔ مشائخ عظام اور علما بھی۔ خدا کے ماننے والے بھی ہیں نہ ماننے والے بھی۔ اس فہرست اسماء الرجال میں شمولیت کے لئے صرف اتنا ہی کافی ٹھہرا ہے کہ انہیں دانش صاحب سے روشناسی کا شرف حاصل رہا۔ شخصیت نگاری کی طرف وہ نہیں آئے کہ اس میں دو چار بڑے سخت مقام آتے ہیں۔ شاعروں کے کلام کے بارہ میں رائے دیتے ہوئے بھی احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا مبادا کوئی ناراض ہو جائے۔ وہ بڑی خوش سلیقگی سے اس مرحلہ سے گزر گئے ہیں۔ کسی کے اچھے میں نہ برے میں۔ ہاں جس شخص میں انہیں کوئی خامی نظر آئی ہے اس کا شکوہ انہوں نے دبے لفظوں میں کر دیا ہے۔ جہانِ دانش میں بعض نادار اور مفلوک الحال لوگوں کی اعانت کا ذکر تھا اس حصہ میں احمد ہمیش کی کس مپرسی یا سلطان آرٹسٹ کی دلجوئی کا ذکر ہے۔ احمد ہمیش نے ہمیشہ کی طرح ان کے ساتھ بھی وہی سلوک روا رکھا ہے جو وہ اپنے محسنوں کے ساتھ روا رکھا کرتے ہیں یا تھے۔ حبیب اللہ سعدی جیسے خاکسار درویش کو یا احسان دانش جیسے نیکی کر دریا میں ڈال کا مسلک رکھنے والے کو کیا فرق پڑتا ہے۔ حکیم نیر واسطی کے ذکر میں ایک مفلوک الحال نواب زادی کا ذکر بھی آ گیا ہے۔ دانش صاحب نظم و نثر میں ایسی دردناک صورت حال کی تصویر کشی کرنے میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔

جہانِ دگر کے آغاز میں دانش صاحب کے بعض نظریات و واقعات کا چرچا بھی ہے مگر جلد ہی وہ اس مخمصے سے نکل کر احوال الرجال کی طرف رجوع ہو گئے ہیں۔ انہیں خیال ہو گا کہ مختلف افراد کا ذکر مختلف عنوانات کے تحت کریں مثلاً اساتذہ کا ذکر اساتذہ کے زمرہ میں علما کا تذکرہ علما کے ساتھ مگر

پھر انہیں خیال آیا ہوگا کہ اس طرح تو ڈھیر سارے لوگوں کا ذکر مشکل ہو جائے گا چنانچہ وہ اس ''طبقاتی امتیاز'' سے دست بردار ہو گئے اور اسم وار جائزہ شروع کر دیا اس کا ذرا سا نقصان یہ ضرور ہوا کہ بعض لوگوں کا ذکر دو دو بار بلکہ مولانا تاجور نجیب آبادی کے سلسلہ میں تین تین بار ہو گیا۔ اچھے لوگوں کا ذکر بلکہ ذکرِ مکرر کھلتا نہیں۔ میں نے ایسے ذکر اذکار کے مقامات کو خاص طور سے غور سے دیکھا کہ کہیں ایسا ہؤا ہو کہ ایک جگہ احسان دانش کسی کی تعریف کریں اور دوسری جگہ تنقیص کر رہے ہوں مگر ایسا تناقض ان کے ہاں نہیں ہے ان کے نظریات وخیالات میں استواری ہے یعنی جس کے بارہ میں جو رائے رکھتے ہیں وہ رائے مستقیم اور پختہ ہے۔

بڑے لوگوں سے شناسائی اور تعلق کا مطلب احسان دانش کے ہاں یہ نہیں رہا کہ وہ ان کی رضا جوئی کی خاطر اپنے اصول چھوڑ دیں۔ نیاز احمد ہمارے بڑے ٹھسے کے سرکاری افسر تھے۔ حیدر آباد کے کمشنر تھے تو اپنے ہاں زوردار مشاعرہ کیا کرتے تھے۔ عوامی مشاعرہ کے بعد ان کے گھر پر ایک مخصوص نشست بھی ہؤا کرتی تھی۔ آگے احسان دانش کی زبانی ''مشاعرے کا غالباً تیسرا سال تھا اور چند شاعروں کو دوسرے روز بورے والا کے مشاعرے میں شریک ہونا تھا جن میں راقم الحروف بھی تھا۔ ہم نے پبلک مشاعرہ میں غزل پڑھ کر ان سے اجازت چاہی تو نیاز صاحب اس پر جز بز ہو گئے اور مشاعرے کے سکرٹری سے کہلوا دیا کہ نجی نشست کے بعد مصارف سفر ملیں گے۔ میں نے کہا ''جناب ہم مصارف سفر کے لئے وعدہ غلط نہیں کر سکتے'' چنانچہ فیض احمد فیض شورعلیگ اور راقم الحروف اسی وقت اٹھ کر اسٹیشن چلے آئے اور دوسرے دن بورے والا مشاعرہ میں شامل ہوئے۔ میں نے گھر آ کر نیاز احمد صاحب کو ایک تلخ لہجے میں خط لکھا جس میں ان کی کمشنری کو خوب گھسیٹا۔ انہوں نے میرے خط کا جواب تو نہیں دیا لیکن بیگم سمیت غریب خانے پر آئے اور مجھ سے معافی چاہی۔ میں نے انہیں سینے سے لپٹا لیا اور کہا ہم تو اس نیاز احمد کے جاں نثار ہیں کمشنر کے نہیں'' (صفحہ ۸۱)۔

نیاز احمد کے ذکرِ مکرر میں آپ نے اس تلخ خط کے مندرجات بھی درج کر دئے ہیں کہ ''آپ کی کمشنری کی میری نظر میں کوئی قیمت نہیں میں تو صرف نیاز احمد کو جانتا ہوں اور اگر نیاز احمد وہی ہے جو گزشتہ ملاقات میں تھے تو میں اپنی حماقت اور بدنصیبی پر افسوس کرتا ہوں اب سے میرا کوئی خط آپ کو نہیں ملے گا'' (صفحہ ۸۴۷) آج کے زمانہ میں تو ایسا ہونا محالات میں سے نظر آتا ہے۔ وہ لوگ اہلِ

ذوق تھے اور دوسروں کا احترام کرنا جانتے تھے۔ ہمیں یاد ہے احسان دانش جب بھی ہمارے کالج یعنی تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں تشریف لاتے ہمارے پرنسپل صاحبزادہ مرزا ناصر احمد ہمیں خاص تاکید کرتے کہ ان کی دلجوئی کا خاص خیال رکھا جائے۔ احسان دانش نے ان کے بارہ میں مختصر مگر جامع نوٹ بھی لکھا ہے ''مرزا ناصر احمد جب لاہور میں کالج کے پرنسپل تھے تو ان سے ملاقات ہو جاتی تھی جب سے وہ ربوہ گئے ہیں صرف ایک دو بار ملاقات ہوئی۔ وہ نہایت خوش تدبیر لوگوں میں سے ہیں۔ ان کی اخلاقی بلندی سے ان کی زبان میں بھی تاثیر آ گئی ہے۔۔۔۔شاید ان کی جماعتی مصروفیات بڑھ گئی ہیں اور اب تو وہ خلیفہ ہیں ان کا تسخیر قلوب کا عمل اب تو معراج پر ہوگا'' (صفحہ ۸۴۹)۔ احسان دانش طبعاً بڑے حساس تھے مگر ایسا بھی نہیں کہ حد سے سوا نازک مزاج ہوں اور غصہ ناک پر دھرا رکھا ہو۔ لئے دئے رہنا ان کی طبیعت کا خاصہ تھا بے تکلف بہت کم ہوتے تھے ہاں اچھے شعروں پر داد دینا ان کا شیوہ تھا اور اس میں کسی بڑے چھوٹے کی تخصیص نہیں تھی۔ ہم نے انہیں بعض طالب علموں کو کھل کر داد دیتے دیکھا ہے۔ اسی طرح مشاعروں میں معاوضہ کے باب میں بھی انہیں بے نیاز پایا۔ ہمارے ہاں تو شعرا کو ویسے بھی کوئی معاوضہ نہیں دیا جاتا تھا ہاں انہیں لاہور سے لانے لے جانے کے لئے گاڑی کا انتظام کر دیا جاتا تھا قیام وطعام کا وی آئی پی اہتمام ہوتا تھا شعرا ہمارے ہاں آنا اپنے لئے باعثِ عزت جانتے تھے۔ جب تک ہمارے مہمان رہتے ان کی مہمان داری ہوتی دریا پر کشتی میں سیریں ہوتیں۔ ایک نجی نشست پرنسپل صاحب کے ہاں بھی ہوتی جس میں شرکت کرنا شعرا اپنے لئے باعثِ فخر خیال کرتے۔ ایسا کبھی نہیں ہؤا کہ وہ صورت حال پیدا ہوئی ہو جو نیاز صاحب کے کہے سے حیدر آباد میں پیدا ہو گئی۔ ہمارے ہاں تو کمشنر کالج میں آ کر مشاعرے سنتے تھے۔

اسی سفر ربوہ کی ایک بات۔ ہمارے ہاں کے قبرستان ''بہشتی مقبرہ'' میں فوت شدہ احمدیوں کے جنازے وقت بے وقت تدفین کے لئے آتے رہتے ہیں۔ اس قبرستان کے بارہ میں مولویوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ ربوہ میں ان لوگوں نے جنت دوزخ بنا رکھی ہے اور اچھے پڑھے لکھے لوگ بھی مولویوں کی اس خرافات پر یقین کر لیتے ہیں۔ میں شعرا کو شہر کی سیر کروا رہا تھا کہ ان میں کے ایک شاعر نے کہا سنا ہے آپ لوگوں نے جنت دوزخ یہاں بنا رکھی ہے؟ اس گاڑی میں احسان دانش بھی سوار تھے اور قافلہ سالار کی حیثیت رکھتے تھے۔ میں نے ان کی طرف اجازت طلب نگاہوں سے دیکھا کہ اگر وہ

اجازت دیں تو ان صاحب کی غلط فہمی بھی دور کردوں۔ احسان صاحب نے اجازت دے دی۔ ہم نے گاڑی کا رخ بہشتی مقبرہ کی طرف موڑ دیا۔ وقت بے وقت میتوں کی آمدورفت کے پیشِ نظر ایک قبر ہمیشہ کھدی رہتی ہے اس پر ایک لکڑی کا چوکھٹا رکھا رہتا ہے کہ بارش سے محفوظ رہے۔ جب ہم لوگ وہاں پہنچے احسان دانش کی نظر اس چوکھٹے کی طرف اٹھی۔ رک گئے۔ خاموش نگاہوں سے اس چوکھٹے کو دیکھا اور مجھ سے کہا ''میاں شعر سنو: ''قبر کا چوکھٹا خالی ہے اسے مت بھولو۔ جانے کب کون سی تصویر لگا دی جائے''۔ میں وثوق سے تو نہیں کہہ سکتا کہ احسان دانش کا یہ شعر بہشتی مقبرہ ربوہ میں کہا گیا ہے مگر اس وقت جو لوگ موجود تھے وہ گواہی دیں گے کہ اس وقت اس شعر نے جو لطف دیا اس کو کوئی حاضر الوقت شاعر فراموش نہیں کر سکا۔ بہت بعد تک لوگ اس موقعہ اور اس شعر کو یاد کرتے رہے۔

سر ظفر اللہ خاں کے بارہ میں جو کچھ لکھا وہ بھی پڑھنے کے قابل ہے۔ یہ واقعہ دونوں کی شخصیت کا روشن پہلو اجاگر کرتا ہے: ''جہاں تک ملک کی عظمت کا سوال ہے چوہدری ظفر اللہ خاں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ عالمی عدالت کے معروف جج رہ چکے ہیں۔ اور آج بھی ایک بلند منصب پر ہیں اور پاکستانی کہلاتے ہیں۔ انہوں نے میری کتاب جہانِ دانش پڑھ کر مجھے اپنے ہاں چائے پر مدعو کیا۔ میں عبدالرشید تبسم کی معیت میں ان کے یہاں گیا اس طویل ملاقات میں انہیں میں نے پاکستان کا خیر خواہ پایا اور انسانیت کا اعلیٰ مربی۔ انہوں نے اپنی کتاب تحدیثِ نعمت عنایت فرمائی جو مہینوں میری مطالعہ کی میز پر رہی۔۔۔۔ تین چار روز گذرے ہوں گے کہ میں ایک مذاکرے میں انجینئرنگ یونیورسٹی گیا ہوا تھا رات کو واپس آیا تو معلوم ہوا کہ چوہدری ظفر اللہ صاحب تشریف لائے تھے وہ ایک کتاب دے گئے ہیں اس کتاب کا نام ہے ''میری والدہ'' جو انہوں نے اپنی والدہ کے متعلق لکھی تھی کیا بتاؤں کس قدر افسوس ہوا اور ایسا محسوس ہوا کہ جیسے محبوب کواڑوں پر دستک دے کر گذر جائے اور ہاتھ کے نشان روشنی اور خوشبو دیتے رہیں۔ ایسے مخلص بزرگ اب کہاں؟'' (صفحہ ۷۸)۔

اس ضخیم سلسلہء رجالیات میں صرف ایک شخص کا ذکر اس انداز سے ہے جسے ''ذم'' کا انداز کہا جا سکتا ہے وہ ہیں ساغر نظامی۔ ان کے بارہ میں جہانِ دانش میں احسان دانش لکھ چکے ہیں کہ کس طرح ساغر نے انہیں مشاعرے میں مدعو کیا اور پھر بڑے اوچھے انداز میں مشاعرہ کے بعد ان سے نامناسب

سلوک روا رکھا۔ اس پر احسان صاحب نے لکھا کہ ''رفتہ رفتہ یہ راز بھی کھل گیا کہ جن کی شہرت نشیب کی نم آلود فضا میں جنم لیتی ہے وہ ذاتی تخلیقات اور شرافت کے معاملہ میں ہمیشہ مشکوک ہی رہتے ہیں۔ الا ماشاءاللہ'' (جہانِ دانش صفحہ ۱۸۳)۔ جہانِ دگر میں لکھتے ہیں ''شروع شروع کے زمانے میں جب یہ ساغر سیمابی تھے ترنم کے علاوہ بھی اشعار میں جان موجود تھی لیکن ان کے بعد یہ پہلے ساغر نہ رہے۔۔۔ جب کہیں ساغر کا نام آتا ہے تو سیماب مرحوم کا نام خود بخود زبان پر آ جاتا ہے اور اس غلط شہرت سے دونوں طرف بڑا نقصان پہنچا ہے لیکن کیا ہو سکتا ہے؟ خود کردہ را علاجے نیست'' (صفحہ ۶۳۲۔۶۳۳)

سیماب اکبرآبادی کے ذکر میں لکھتے ہیں'' جناب سیماب اردو فارسی اور انگریزی میں مہارت رکھتے تھے اور شاعری ان کا آبائی ورثہ تھا۔ بیسیوں مشاعروں میں ان کا میرا ساتھ رہا اور میں نے ان کو کبھی کم درجے کا شاعر محسوس نہیں کیا وہ مسلم الثبوت قسم کے اساتذہ میں سے تھے۔۔۔۔ میں سیماب کے عقیدت مندوں میں ہوں اور ہر استاد کا مقام میرے یہاں استاد کا مقام ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ساغر کی وجہ سے سیماب صاحب کی شہرت میں تقدس اور وقار پیدا نہ ہو سکا اور یہی سبب ہے کہ ان کے کلام اور کام کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ کاش ساغر ان کا شاگرد نہ کہلاتا'' (صفحہ ۶۱۲)۔

احسان دانش خود بھی ترنم سے پڑھنے والے شاعر تھے اور ان کی آواز میں ایک بے مثل غنائیت تھی جو سننے والے کے دل میں اتر جاتی تھی۔ اپنے ہمعصروں میں سے بیشتر مترنم شاعروں کے ترنم کی آپ نے تعریف کی ہے۔ جگر ہوں یا ثاقب زیروی ہوں، ساغر صدیقی ہوں یا نشور واحدی ہوں انہیں ترنم کی موجودگی پر کبھی اعتراض نہیں ہوا مگر وہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ ترنم کے علاوہ بھی شاعر کے کلام میں جان ہونی چاہئے۔ نشور واحدی کے ذکر میں لکھتے ہیں ''نشور کے ہاں ہیئت کے تجربے تو نہیں لیکن ان کی غزل سن کر نئی شاعری سننے کو دل نہیں مانتا اور جدید ادب کا تانا بانا بے تار معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ ان کا ترنم بھی جان لیوا ہے لیکن میں تو اس شاعری کو شاعری کہتا ہوں جو کاغذ پر بولے'' (صفحہ ۸۲۹)۔ ہمارا المیہ یہی ہے کہ ہمارے بیشتر مترنم شاعروں کا کلام کاغذ پر آ کر گونگا ہو کر رہ جاتا ہے۔

جہانِ دگر احسان دانش کی مردم پرور اور مردم شناس شخصیت کا بڑی خوبی سے احاطہ کرتی ہے اور مستقبل میں ادب پر تحقیقات کرنے والوں کے لئے روشنی مہیا کرنے کا کام کرتی رہے گی۔

پھر وہی بیاں اپنا

اخلاق احمد دہلوی کی خودنوشت ''یادوں کا سفر'' ہنوز میری دسترس سے باہر ہے جس کی دو وجوہات ہیں ایک تو یہ کہ کتاب خود چھاپنے والے کے ہاں بھی دستیاب نہیں اور دوسرے یہ کہ ملک سے باہر کتابوں کی دستیابی محض اتفاقاً ہوتی ہے اور ابھی تک یہ حسنِ اتفاق وقوع میں نہیں آیا۔ مجھے اخلاق احمد دہلوی کا اسلوب یادنگاری پسند ہے اس لئے ان کی اس زمرہ کی کوئی سی چیز بھی مجھے کشش کرتی ہے۔ ان کے یادداشتی خاکوں کا مجموعہ ''پھر وہی بیاں اپنا'' اس وقت پیشِ نظر ہے۔ یہ مجموعہ ۱۹۷۹ میں چھپا تھا۔ پہلا مجموعہ میرا بیان ہے جس کا ذکر میں پس نوشت میں کر چکا ہوں۔

''پھر وہی بیاں اپنا'' میں بھی مختلف لوگوں کے بارہ میں اخلاق صاحب کی یادداشتیں معرضِ بیان میں آئی ہیں۔ اخلاق صاحب اس مجموعہ کا نام ''گیاہِ بندش'' غالب کی ایک ترکیب سے مستعار لینا چاہتے تھے'' تھا میں گل دستہء احباب کی بندش کی گیاہ۔ متفرق ہوئے میرے رفقاء میرے بعد'' (صفحہ ۶) مگر ان کے ناشر اس میں حارج ہوئے کہ اس نام کے ساتھ ''پرچہ ترکیبِ استعمال'' بھی بیان کرنا پڑے گا اس لئے اس ''گویم مشکل'' سے احتراز ہی مناسب ہے۔ سو یہ گیاہ بندش ناشر کی نذر ہو گئی مگر متفرق ہوئے میرے رفقاء میرے بعد والا حادثہ نہ ہوا۔

اخلاق احمد دہلوی' بقولِ خود عمر بھر ''فکرِ معاش' عشقِ بتاں اور یادِ رفتگاں'' میں گرفتار رہے (صفحہ ۱۳۲) اس لئے ان کے ہاں یادوں کا ایک جہاں آباد ہے۔ اس کتاب میں بھی میراجی' مجاز' عصمت اور شاہد لطیف' ساغر صدیقی' کے علاوہ ان کی ریڈیو کی زندگی کی جھلکیاں نمایاں ہیں اگرچہ اس کتاب کو ان کی خاکوں کی کتاب کہا جا سکتا ہے مگر انہوں نے خاکہ نگاری کم کی ہے یادِ رفتگاں کی جوت زیادہ جگائی ہے۔ اور ان کی زبان پر ''ابوالخیر کی والدہ کا اور قیصری بیگم کی زبان کا اثر ہے جو بات کرتی ہیں تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں''۔ اور شاہد احمد دہلوی کے قول کے مطابق ''یہ ابوالخیر کی والدہ کا دم قدم ہے اور مولوی عبدالسلام کی تعلیم و تربیت کہ آج ابوالاعلیٰ اور ابوالخیر صاحب مذہب اور ادب میں اپنا

جواب نہیں رکھتے۔ ورنہ ان کے والد میرٹھ کے وکیل تھے اور ان کی وکالت حیدر آباد دکن جا کر چمکی۔ اس کے باوجود دیکھ لو کہ نہ ابوالخیر صاحب کی زبان پر نہ ابوالاعلیٰ صاحب کی زبان پر دکنی بولی کا اثر ہے نہ میرٹھ کے پانی کا۔ وہی حکیم اجمل خان صاحب کے گھرانے کی سکہ بند شریف خانی زبان ہے جو ان کی والدہ بولتی تھیں'' (صفحہ ۱۵۶)۔ شریف خانی خاندان کی سکہ بند زبان اخلاق احمد دہلوی کے ہاں بھی بولتی ہے کہ خیر سے ابوالخیر اور ابوالاعلیٰ کی والدہ ہجرت کے بعد انہی کے ہاں مقیم رہیں کیونکہ بوجوہ اپنے بیٹوں کے ہاں رہنا انہیں پسند نہیں تھا۔

ان کی یادداشت بھی بہت اچھی ہے مگر ایک جگہ تو یوں محسوس ہوا کہ ان کا حافظہ دروغ گو والا ہو کر رہ گیا ہے سر سلطان احمد کا ذکر ہے جو لارڈ ویول کے زمانہ میں نشریات کے وزیر تھے۔ ان کے بارہ میں لکھتے ہیں ''سر سلطان احمد مرزا غلام احمد قادیانی کے بڑے صاحبزادے تھے'' (صفحہ ۲۳۴)۔ لاحول ولاقوۃ۔ سر سلطان احمد مدراس کے رہنے والے تھے ان کو قادیان سے کیا نسبت؟ اخلاق احمد دہلوی محض نام کی رعایت سے دھوکا کھا گئے۔ اگر وثوق نہیں تھا تو انہیں ایسی بات کہنی ہی نہیں چاہئے تھی اور ان کی زندگی بھر کی ریڈیو کی تربیت کا بھی یہی تقاضا تھا مگر معلوم ہوتا ہے یہ لکھتے وقت وہ ''عالمِ دیگر'' میں تھے۔ مرزا سلطان احمد لارڈ ویول کے زمانہ سے بہت پہلے یعنی ۲ جولائی ۱۹۳۱ کو وفات پا چکے تھے۔ وہ اپنے وقت کے مانے ہوئے ادیب اور مفکر تھے۔ خان بہادر کا خطاب پایا تھا اور سول سروس میں ڈپٹی کمشنر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ اپنے والد صاحب کی بیعت میں نہیں تھے۔ وفات سے کچھ عرصہ قبل اپنے چھوٹے بھائی اور والدِ محترم کے دوسرے خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ اقبال کے ہمنشینوں میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ ''گاہ با سلطان باشی گاہ باشی بافقیر'' والے مصرعے میں سلطان سے مراد یہی مرزا سلطان احمد ہیں فقیر کے مشارالیہ فقیر سید وحیدالدین کے والد بزرگوار ہیں اور فقیر سید وحید الدین نے اپنی کتاب ''انجمن'' میں اس کا ذکر کیا ہے۔

اخلاق صاحب نے اس کتاب کو ''ماضی کی یادوں اور مستقبل کی امیدوں کے نام'' معنون کیا ہے۔ ان یادوں میں نئی باتیں تو صرف دو ہی ہیں۔ میراجی کا عشق میرا سین اور ''بادلی بیگم'' یعنی سحاب قزلباش سے اور میراجی کی کرسی پر اکڑوں بیٹھنے یعنی ''اردو میں بیٹھنے'' کی عادت۔ باقی باتیں جہاں تہاں ان کی یادوں میں پہلے بیان ہو چکی ہیں مگر مولانا صلاح الدین کی بات باون تولے پاؤ رتی کی ہے کہ ''ان کے ہاں موہنی ہے''۔ یہ موہنی قاری کو موہ کر اپنے ہمراہ لئے چلتی ہے۔

◎

سفر آدھی صدی کا

معروف صحافی جناب عبدالکریم عابد کی خودنوشت ''سفر آدھی صدی کا'' ادارہ معارف اسلامی کراچی نے ۲۰۰۲ میں شائع کی۔ عبدالکریم عابد، ممبئی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد میمن برادری کے اچھے خوش حال تاجر تھے۔ اس لئے بچے کو بچپن ہی سے حیدرآباد دکن میں اپنے کاروبار میں شامل کر لیا۔ اس لئے ان کی روایتی تعلیم نہ ہو سکی مگر عابد صاحب نے اپنی خداداد ذہانت اور سوجھ بوجھ کی وجہ سے سیاست اور مذہب میں اپنا مطالعہ جاری رکھ کر بیش بہا معلومات کا ذخیرہ اپنے ذہن میں جمع کر لیا۔ نظریاتی طور پر جماعت اسلامی سے وابستہ رہے۔ سقوطِ دکن کے بعد ۱۹۵۴ میں پاکستان آ گئے اور دربدر کی ٹھوکریں کھاتے رہے۔ اس غریب الوطنی اور کس مپرسی کے حال میں بھی اپنے خوش حال رشتہ داروں کا احسان نہیں اٹھایا۔

آپ نے کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے کہ ''ہماری نئی نسل قیام پاکستان سے قبل اور بعد کے حالات کے بارہ میں وہ کچھ نہیں جانتی جو اسے معلوم ہونا چاہئے اور جو نسل اب پروان چڑھ رہی ہے اس کی عدم واقفیت تو اور بھی زیادہ ہوگی۔۔۔۔ اس لئے میں نے ''جگ بیتی میں آپ بیتی'' کے عنوان سے ایک خاص پیرایۂ بیان اختیار کیا اور اب یہ مضامین ''سفر آدھی صدی کا'' کے عنوان سے کتابی شکل میں آپ کے سامنے ہیں'' (صفحہ ۸)۔ اس خودنوشت کا مقصد ''نئی نسل کو وہ کچھ بتانا ہے جو انہیں معلوم نہیں''۔ لکھنے والے کا تعلق جماعت اسلامی سے ہے اس لئے ان کے نظریات مودودی صاحب کی تعلیمات سے مملو ہیں مگر اچھی بات یہ ہے کہ ان کے ہاں وہ غلو نہیں جو عام طور سے مذہبی رجحانات رکھنے والوں میں پایا جاتا ہے۔ جماعت اسلامی کی نظریاتی سیاست اور صحافت سے وابستہ رہنے کے باوجود ان کے ہاں خاص حد تک کشادہ دلی اور وسعت نظری نظر آتی ہے جو ان کی رگوں میں دوڑتے ہوئے میمن خون کی دین ہے۔ اگرچہ احمدیوں کو قادیانی کہنا انہیں کھلتا نہیں حالانکہ احمدی احمدی کہلانا

پسند کرتے ہیں۔ عابد صاحب تمام تر وسعت قلبی کے باوجود ''قادیانی'' کہنے کی بدعت سے اپنے کو آزاد نہیں رکھ سکے حالانکہ کوئی جماعت اسلامی کو مودودیت کہتا تو وہ ناراض ہوتے لکھتے ہیں۔ حیدرآباد میں ''ہمارے گھر کے قریب ایک گرجا تھا۔ حیدرآباد میں جمعہ کو تعطیل ہوا کرتی تھی شام کے وقت اس گرجے میں مجلس مناظرہ لگتی۔ مختلف مذاہب کے نمائندے جمع ہو کر آپس میں دنگل کا اہتمام کرتے۔۔۔ قادیانیوں کے مشہور مبلغ عبدالمالک بھی ہر جمعہ کو آتے تھے ان سے بعد میں پاکستان میں بھی ملاقات ہوتی رہی'' (صفحہ ۱۰۵)۔ (یہ مولانا عبدالمالک، علی برادران میں سب سے بڑے بھائی ذوالفقار علی خاں گوہر کے صاحبزادے تھے۔ جن کی رعایت سے مولانا شوکت علی کا وہ لطیفہ مشہور ہے کہ کسی نے پوچھ لیا کہ آپ کے بڑے بھائی گوہر تخلص کرتے ہیں اور چھوٹے جوہر۔ آپ کا تخلص کیا ہے؟ برجستہ کہا ''شوہر''۔ چار نکاح کرنے کا کوئی تو فائدہ ہو!)

ان کا دعویٰ ہے کہ ''یہ کتاب میری پوری علمی صحافتی سیاسی زندگی کا نچوڑ ہے اور میں نے پوری دیانت داری کے ساتھ حالات و واقعات کو بالکل اسی طرح بیان کیا ہے جس طرح میں نے انہیں دیکھا سنا اور محسوس کیا ہے اور الحمدللہ کہیں بھی نہ تو اپنے قلم کو جھکایا نہ اسے سیاسی محاذ آرائی ذاتی حمایت یا مخالفت کے لئے استعمال کیا'' (صفحہ ۹)۔ یہ بہت بڑا دعویٰ لگتا ہے مگر ساری کتاب پڑھنے کے بعد یہی تاثر بنتا ہے کہ عابد صاحب کا یہ دعویٰ بہت سے دوسرے دعوے داروں کی طرح کا کھوکھلا دعویٰ نہیں ہے۔

حیرت تو مجیب الرحمٰن شامی کے دیباچہ پر ہوتی ہے جس میں انہوں نے مصنف کے سفر ''کو روشنی کا سفر'' قرار دیا ہے مگر تین جگہوں پر جن تشبیہات کا سہارا لیا ہے ان کا روشنی کے استعارے سے کوئی تعلق نہیں ان کا تعلق بھوک سے ہے۔ ''ان کی تحریر پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ جیسے آپ مکئی کے تازہ بھنے ہوئے مرمروں سے لطف اندوز ہو رہے ہوں یا ختہ چنے ہیں کہ آپ سے آپ منہ میں گھلتے اور توانائی بخشتے چلے جا رہے ہیں''۔۔۔ مزید ارشاد ہوتا ہے ''سفر آدھی صدی کا'' کے مختلف موضوعات اور عنوانات کا جائزہ لینے اور ان کے بارہ میں کچھ کہنے کی ضرورت یوں محسوس نہیں ہوتی کہ پڈنگ کا مزا اس کے کھانے میں ہے'' (صفحہ ۱۰-۱۱) مکئی کے بھنے ہوئے دانے ہوں یا چنے یا پڈنگ تینوں مجیب الرحمٰن شامی کی ''بھوک'' پر دال ہیں ''ولیکن از شکم نزدیک تر ہست'' یا نظیر اکبرآبادی کی

لفظیات میں ''بابا مجھے تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں''۔ اور پاکستان کی صحافت کا ذرا سا ادراک رکھنے والا بھی جانتا ہے کہ مجیب الرحمٰن شامی اپنی بھوک کا علاج کرنا جانتے ہیں۔ عابد صاحب نے تو وقت پڑنے پر چنے بھی چبائے ہیں مگر ان کے دیباچہ نگار میں یہ حوصلہ کبھی نہیں رہا۔ وہ تو کلمہء حق کی بجائے کلمہء ضیاء الحق بھی کہنے سے نہیں چوکے! بھوک کی سہار ان میں نہیں ہے۔ اور پیٹ کی خاطر وہ سب کچھ کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ ہماری صحافت میں ''مافی الضمیر فروشوں'' کی کمی نہیں عابد صاحب کو داد دینی چاہیے کہ وہ ضیاء الحق کے سامنے بھی اپنے موقف کا اظہار کر سکتے ہیں بلکہ ان کی بات ماننے سے انکار بھی کرنے کی جرات رکھتے ہیں۔ ''ایک دن جب میں شام کو پنڈی میں حسان کلیمی صاحب کے گھر بیٹھا تھا تو انصاری (مولانا ظفر احمد انصاری) صاحب کا فون آیا کہ میں آپ کے لئے گاڑی بھیج رہا ہوں آپ آ جائیے۔ میں سمجھا انصاری صاحب اپنے گھر بلا رہے ہیں۔ لیکن گاڑی آئی اور وہ مجھے پنڈی میں صدر ضیاء الحق کے دولت کدے پر لے گئی۔ صدر صاحب کے سامنے انصاری صاحب اپنی ٹانگ پھیلائے بیٹھے تھے۔۔۔ صدر صاحب نے کہا کہ غیر جماعتی سیاست کے نظریے کو عام کرنے کی ضرورت ہے لوگوں کو بتانا چاہئے کہ یہ اسلام کے خلاف ہے پاکستان کے حق میں نقصان دہ ہے اس کام کو سرکاری سطح سے ہٹ کر علمی سیاسی اور ابلاغی انداز سے کرنے کی ضرورت ہے اگر آپ اس کام کی ذمہ داری سنبھال لیں تو بڑا اچھا ہوگا ہم ہر طرح تعاون اور خدمت کے لئے حاضر ہیں'' (صفحہ ۲۸۰۔۲۸۱) مگر عابد صاحب نے بلطایف الحیل نہیں صاف طور سے یہ ذمہ داری اٹھانے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ جماعتی سیاست کے حق میں تھے اور اس کام کے لئے اسلام کا نام درمیان میں لانے کے خلاف تھے۔ حنیف رامے بھی جماعتی سیاست کو اسلام کے خلاف سمجھتے تھے (صفحہ ۲۶۹) اور ضیاء الحق کے ساتھ کام کرنے کو تیار ہو گئے تھے (صفحہ ۲۷۱)۔ جناب شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی! اپنے دیباچہ نگار مجیب الرحمٰن شامی کے بارہ میں عابد صاحب نے اشارۃً بات کہہ دی کہ ''اس زمانہ میں وہ سوشلسٹوں کی شدت سے مخالفت کرتے تھے'' (صفحہ ۲۳۱) مگر ''اس سلسلہ کے اکثر صحافی دوست اپنی پیپلز پارٹی کی دشمنی کے جذبے سے مغلوب ہو کر یا نفاذِ اسلام کی توقع میں ضیاء آمریت کے آلہء کار ہو گئے تھے'' (صفحہ ۲۲۴) اور اس طرح عابد صاحب کی وہ پیشگوئی پوری ہوگئی جو انہوں نے مجیب الرحمٰن شامی کا ہاتھ

دیکھ کر کی تھی کہ ''وہ غیر معمولی شہرت حاصل کریں گے'' (صفحہ ۱۰۶)۔ بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا!

عابد صاحب اخبارِ جہاں میں محض اٹکل سے ''ستارے کیا کہتے ہیں'' کے عنوان سے مشہور و مقبول کالم بھی لکھتے رہے مگر میر خلیل الرحمٰن نے جنگ میں ایسا ہی کالم لکھنے کی دعوت دی تو دیانتداری سے فرمایا'' جو بیہودگی اخبارِ جہاں میں کر رہا ہوں وہی کافی ہے''۔ (صفحہ ۱۰۴)۔ اسی طرح اسلامی جمعیت طلبہ نے تشدد کی جو سیاست روا رکھی اس کے بارہ میں بڑا جامع اور سادہ سا پر معنی فقرہ بڑی خوش اسلوبی سے لکھ گئے ہیں'' اس زمانے تک اسلامی جمعیت طلبہ تشدد کا جواب تشدد سے دینے سے گریز کرتی تھی'' (صفحہ ۲۴۳)

اس خودنوشت کا انداز بھی عام خودنوشتوں سے مختلف ہے۔ مصنف نے اپنی سوانح کو اس طور سے ترتیب دیا ہے کہ ان کے نظریات کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی کے حالات بھی بیان ہوتے چلے جائیں اس لئے ان کے مضامین ہی دراصل ان کی سوانح کا اسلوب ٹھہرے ہیں۔ احوال الرجال کا سلسلہ بھی یک فقری دو فقری سلسلہ ہے کسی کے بارہ میں تفصیل سے کچھ کہہ کے نہیں دیا البتہ اپنے بیان کی رو میں لوگوں کے بارہ میں اپنی بات کہہ گئے ہیں۔ ان کا تعلق صحافت سے رہا اس لئے ان کی خود نوشت دائیں بازو کی پاکستانی صحافت کی تاریخ ہے۔

بہر طور سفر آدھی صدی کا ایک اچھی سرگزشت ہے۔ اور اس وجہ سے ممتاز سمجھی جائے گی کہ اس کا لکھنے والا اپنے اسلامی نظریات کے باوجود دوسروں کو برداشت کرنے میں عدم برداشت کا مظاہرہ نہیں کرتا اور جماعت اسلامی سے مستعفی ہونے کے باوجود ان کے نظریاتی پرچوں میں عمر بھر کام کرتا رہا۔

مرے بت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو۔

لمحات

''لمحات'' جناب خرم مراد کی خودنوشت ہے جو منشورات کی جانب سے ۲۰۰۰ میں لاہور سے شائع ہوئی۔ خرم مراد تحریکِ اسلامی کے ایک ممتاز رہنما تھے' اسلامی جمعیت طلبا کے ناظم' مشرقی پاکستان کی جماعت اسلامی کے امیر جماعت کے مرکزی عہدیدار اور نوجوانوں کی اہم تربیتی اور سیاسی ذمہ داریوں کے ذمہ دار رہے۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے وقت ڈھاکہ ہی میں تھے اور وہیں سے جنگی قیدی بن کر بھارت گئے اور دیگر جنگی قیدیوں کے ہمراہ رہا ہو کر واپس آئے۔ جوانی ہی میں دل کے مریض ہو گئے تھے مگر لمبی عمر پائی اور لسٹر میں دل کے تیسرے اپریشن کے دوران جاں بحق تسلیم کی۔ ان کی یہ ساڑھے پانچ سو صفحے کی خودنوشت جماعت اسلامی کی انتظامی' تبلیغی' تربیتی اور سیاسی سرگرمیوں کی مستند روداد ہے اور غالباً پہلی ایسی سرگزشت ہے جس میں کسی فعال رکن جماعت نے جماعت کے ان امور کو موضوعِ سخن بنایا ہو۔ جماعت اسلامی کی صحافتی تاریخ کا چرچا تو جناب عبدالکریم عابد صاحب کی خود نوشت میں ہو چکا ہے۔ یہ روداد اس جماعت کا دوسرا رخ دکھاتی ہے۔

خرم مراد' بھوپال میں پیدا ہوئے ان کے گھر والے امیر جماعت اسلامی مولانا مودودی کے معتقدین میں سے تھے خاص طور سے ان کی والدہ اور بہن تو ان کی بہت ہی گرویدہ تھیں۔ اس لئے تحریک اسلامی کے ساتھ وابستگی ایک لحاظ سے ان کی گھٹی میں پڑی۔ مزاجاً دین سے شغف رکھنے والے تھے اس لئے اسلامی اقدار سے وابستگی رہی۔ اس خودنوشت سے بھی ان کی دینداری کے رجحان پر روشنی پڑتی ہے مگر جماعت کے ساتھ پوری پوری وابستگی رکھنے کی وجہ سے کہیں کہیں یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ اے کاش یہ جماعت کے سہل اور عام الورود اصول کے تحت اسلامی اقدار کی مصلحت پسندانہ تاویل کرنے اور اپنے غلط اعمال کو بھی دینی لحاظ سے جائز سمجھ کر اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کی کوشش نہ کرتے! ان کے گہرے جماعتی تعصبات کے باوجود اس خودنوشت کا مجموعی مزاج صاف گوئی اور اصول پسندی کا

مزاج ہے۔

خرم صاحب جب کراچی جمعیت کے ناظم منتخب ہوئے تو جماعت کے بہت سے اکابر کو (جن میں ڈاکٹر اسرار احمد بھی شامل تھے) ان کے نکتہء نظر سے اختلاف تھا وہ یہ سمجھتے تھے کہ ''کراچی جمعیت کا مزاج جماعت اسلامی کا مزاج نہیں بلکہ یہ اخوان المسلمون اور تبلیغی جماعت کا مزاج ہے۔۔۔(اسی طرح) خرم کا مزاج جماعت اسلامی کا مزاج نہیں۔ یہ ذہنی اور عملی طور پر جماعت اسلامی کے آدمی نہیں'' (صفحہ ۱۸۳)۔ خرم مراد نے اپنی خودنوشت میں اس نکتے کو فراموش نہیں ہونے دیا اور جہاں موقع ملا ہے یہ ثابت کیا ہے کہ ان کا مزاج بعض امور میں اختلاف رکھنے کے باوجود جماعت اسلامی کا مزاج ہے اور ان کے رفقاء ان پر جو الزام لگا رہے ہیں وہ درست نہیں۔ مگر یہ بات درست ہے کہ انہیں مصر میں اخوان المسلمون پر ہونے والے ظلم پر بہت رنج تھا اور انوار السادات کے کراچی میں ورود کے موقع پر انہوں نے ہی مسلم یوتھ کانفرنس کے جلسہ میں ان کے منہ پر یہ کہہ دینے کی جرات کی تھی کہ ''ہم تمہاری بات نہیں سنیں گے تمہارے ہاتھ اخوان المسلمون کے خون سے رنگے ہوئے ہیں'' (صفحہ ۲۰۷)۔ اور اخوان کے تتبع میں ان کی تنظیم ''اسرہ'' کی طرح کی ایک تنظیم اپنے ہاں بھی بنانے کی کوشش کی تھی اور پھر اسے دوسروں کی مخالفت کی وجہ سے بخیر وخوبی ختم بھی کر دیا تھا۔ (صفحہ ۲۱۹)۔

ان کا کہنا ہے کہ ''حق پسندی اور انصاف دوستی میرے مزاج میں رچی بسی ہے (صفحہ ۳۸۳) مگر بعض موقعوں پر وہ حق پسندی کا ساتھ دیتے ہیں نہ انصاف دوستی کا ثبوت۔ خدا جانے ان کے مزاج میں رچی بسی انصاف دوستی ایسے موقعوں پر کہاں رہ جاتی ہے؟ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی وجوہات کے بیان میں لکھتے ہیں ''بیوروکریسی کے اعلیٰ حلقوں اور ان کی غلام گردشوں میں ہونے والی پر اسرار سرگوشیوں کا کچھ نہ کچھ علم ہمیں بھی ہو رہا تھا۔ جس سے پتا چل رہا تھا کہ مغربی پاکستانی بیوروکریسی کے طاقت ور حلقے کیا سوچ رہے ہیں۔ ان میں خاص طور پر پاکستان پلاننگ کمیشن کے ڈپٹی چیئرمین مسٹر ایم ایم احمد قابلِ ذکر ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ 'مشرقی پاکستان کے لوگ بھک منگے ہیں ایک بوجھ اور خوامخواہ کی ذمہ داری ہیں اس لئے ان سے پیچھا چھوٹ ہی جائے تو اچھا ہی ہے۔'' (صفحہ ۴۹۲) خرم صاحب نے اپنی دیانت داری اور حق گوئی کی تعلّی تو بگھار دی مگر جہاں بے بنیاد الزام تراشی کا موقع آیا وہاں قرآنی

ارشاد کو نظر انداز کر گئے کہ فَاجتَنِبُو قولَ الزُّور. اور ان بعض الظَّنِّ اِثم. ایم ایم احمد نے یہ بات کہاں کہی؟ کس کے سامنے کہی؟ حمود الرحمٰن کمیشن کے سامنے بھی کسی نے ایسی خطرناک بات کا انکشاف نہیں کیا۔ درحیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید؟ اتنے بڑے الزام کا کوئی حوالہ؟ اتنے بڑے جھوٹ کی کوئی سند؟ کچھ بھی تو نہیں؟ پڑھنے والا ان کی بات کو کس طرح درست مان لے؟ صرف اس لئے کہ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ اندر کی بات جانتے ہیں؟ وہ تو اتنا بھی نہیں جانتے کہ ایم ایم احمد کسی قادیانی ''خلیفہ'' کے بیٹے نہیں! البتہ وہ بھی اسی طرح ''غالی قادیانی'' تھے جس طرح خرم صاحب غالی جماعت اسلامی والے ہیں اور مودودی صاحب کے قول کے مطابق نو مسلموں کی طرح ''نو بنگالی ہیں'' (صفحہ ۳۸۲)۔

خرم صاحب اپنی تمام تر دیانت داری کے باوجود الزام تراشی کی رو میں اس لئے بہہ گئے کہ پاکستان میں احمدیوں پر ہر قسم کا الزام لگا دینے کا دستور ہے اور وہ وہاں کے ''دستور'' کے مطابق اس کا جواب بھی نہیں دے سکتے۔ کم از کم خرم مراد جیسے پڑھے لکھے صاف گو آدمی سے آدمی اس طرح کی بے اصولی کی توقع نہیں رکھتا کہ وہ حکومت کے کسی عہدیدار کے منہ میں معین الفاظ ڈال دے اور پھر کسی سند کے بغیر انہیں دلیل کے طور پر پیش کرتا پھرے۔ مشرقی پاکستان کے معاشی استحصال کی باتیں تو سب نے کی ہیں مگر کسی نے اس ڈھٹائی کے ساتھ ایسے نامناسب الفاظ کسی کے ساتھ منسوب نہیں کئے۔ یہ ''سعادت'' خرم مراد جیسے ''دیندار'' کے حصہ میں آئی۔ اب تو ان کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے۔

بات دور نکل جائے گی مگر ان کی طبیعت کے اس پہلو کا تجزیہ کرنا ضروری ہے جس کے تحت وہ نامناسب باتیں کر جاتے ہیں اور پھر ان کا شرعی جواز ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ کراچی میں ایک عمارت کے حصول کے لئے پگڑی دینے کا سوال تھا ان کا ضمیر مطمئن نہیں تھا یہ اسے غیر شرعی سمجھتے تھے۔ مولانا مودودی سے استفسار کیا تو آپ نے فرمایا ''میں اس سے غضِ بصر کروں گا آپ مجھ سے نہ پوچھیں'' (صفحہ ۱۰۱) اسی طرح پریس کے ڈیکلریشن میں غیر ضروری رکاوٹ پیدا ہو رہی تھی جس کا حل تھا کہ رشوت دے کر اس مسئلہ کو حل کر لیا جائے چنانچہ آپ نے اپنے رفیق کو اجازت دے دی کہ ''راستہ نکال کر ڈیکلریشن لے لیجئے'' اور پھر فقہا کے ہاں اس کا جواز بھی تلاش کر لیا ''اپنا جائز حق لینے کے لئے اگر ضرورت پڑ جائے اور کوئی فرد اس کی راہ میں بے جا رکاوٹ پیدا کرے تو اسے دور کرنے کی اجازت

ہے لیکن کسی کا حق مارنے کی اجازت نہیں (صفحہ ۳۹۶) شاید اپنے ساتھ عقیدہ کا اختلاف رکھنے والوں کے خلاف اس قسم کی الزام تراشی کا کوئی فقہی جواز بھی ان کے پاس ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ گئے تو وہاں عیسائیوں کے ساتھ ایک مکالمہ کے دوران انہوں نے فرمایا کہ ''ہم جو لوگ یہاں بیٹھے ہیں ان سب کا اسلام پر مکمل اتفاق ہے۔ ہم سب اس امر پر متفق ہیں کہ اللہ، رسولوں، آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم قرآن اور آخرت پر ایمان رکھنے اور عمل صالح کرنے والا مسلمان ہی جنت میں جائے گا چاہے اس کا کسی بھی فرقہ سے تعلق ہو یہ بات مسلمانوں کے تمام مسلکوں سے تعلق رکھنے والے علما اور ماہرین کے ہاں متفق علیہ ہے مگر دوسری جانب عیسائیوں کا ہر فرقہ دوسرے کو پکا جہنمی سمجھتا اور اسے جہنمی قرار دیتا ہے'' (صفحہ ۲۴۶)۔ اے کاش خرم صاحب کی یہ بات درست ہوتی۔ ہمارے ہاں تو ہمارے علماء مسلمان کی کوئی متفق علیہ تعریف تک وضع نہیں کر سکے اور منیر انکوائری رپورٹ اس کی گواہ ہے۔ خرم صاحب کس اتفاق پر ''متفق علیہ'' ہونے کی بات کر رہے ہیں ''سوئے اتفاق'' پر یا ''عدم اتفاق پر؟'' ایک مولوی دوسرے مسلک کے امام کے پیچھے نماز تو پڑھتا نہیں!! یہ علماء کرام کھانا تو رغبت سے اکٹھے بیٹھ کر کھا سکتے ہیں ایک دوسرے کی اقتداء میں نماز بہ اکراہ بھی نہیں پڑھ سکتے!

ایک اور اچھی بات خرم صاحب نے کہی کہ ''لوگوں سے انسانی اور سماجی بنیادوں پر اچھے تعلقات رہ سکتے ہیں اور رکھنے بھی چاہئیں۔ یہ چیز دعوت دین کے نقطہ نظر سے بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے کسی گروہ سے مکمل مقاطعہ کرنا یا اس کا ہمیشہ کے لئے سوشل بائیکاٹ کرنا کوئی کارنامہ نہیں بلکہ ایک نوعیت کی پسپائی ہے'' (صفحہ ۲۵۳۔۲۵۴)۔ مگر متعدد مواقع پر ان کی جماعت کے اراکین یا متفقین نے ان کی اس دانشمندانہ بات پر کان نہ دھرے اور ''پسپائی'' کا راستہ اختیار کیا، انہیں اپنے اسلوب کی اس کمزوری کا احساس ہے ''ہم جیسے خشک اور غیر ادبی آدمی کی کمزوری اور خامی ہے کہ وہ واقعہ نگاری اور واقعہ بیانی کی طرف توجہ نہیں دے پاتے یا اس کے فن سے بے خبر ہوتے ہیں اس وجہ سے قاری کے لئے تحریر عموماً پرکشش نہیں بنتی'' (صفحہ ۳۱۹) یہ بات آپ نے اپنی کتاب ''لمعات زندان'' کے اسلوب کے باب میں کہی ہے مگر متفقین کے قول اور عمل میں تضاد کی صورت ہو تو کہنے والے کی تحریر میں کشش کہاں

سے آئے گی؟

خرم مراد نے جماعت کے کارکنوں کے ایثار اور بہت کم معاوضہ پر کام کرنے کے جذبے کو بہت سراہا ہے اور یہ بات قابلِ قدر ہے ''مولانا مودودی نے یہ ادارہ قائم کیا کہ چند ہمہ وقتی لوگ بیت المال سے اعزازیہ لیں اور تحریک کا کام کریں۔ہم سب جانتے ہیں کہ ان تنظیمی ذمہ داریوں پر فائز لوگ بڑے قلیل معاوضوں پر بڑی قربانی دے کر جماعت اسلامی کے اندر کام کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں'' (صفحہ ۲۳۳) مگر انہیں اس بات کا شاید علم نہیں کہ ایسے ایثار کی بنیاد جماعت احمدیہ نے ۱۸۸۹ میں ڈالی تھی اور جماعت کے کارکن ادنیٰ ادنیٰ معاوضوں پر اپنی ساری زندگی جماعت کے کاموں کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔اس نظام کو جماعت احمدیہ کی اصطلاح میں ''وقفِ زندگی'' کا نظام کہا جاتا ہے۔واقفین یعنی جماعت کے وقف کرنے والے اراکین اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد بہ طور خود اپنی زندگی وقف کرتے ہیں اور نظام قبول کر لے تو ساری عمر ایک معمولی گذارے پر جماعت کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔جماعت کے سارے تعلیمی دعوتی اشاعتی ادارے اسی وقف کے نظام کے تحت چل رہے ہیں۔

کچھ برس پیشتر ایک عالم نے جو پنجاب اسمبلی کے رکن بن گئے تھے اسمبلی میں واویلا کیا کہ جماعت احمدیہ کے مرکزی شہر ربوہ کے ہسپتال میں جس کی آبادی پچاس ہزار سے زیادہ نہیں انگلستان کے اور دنیا بھر کے اداروں کے اعلیٰ ترین تعلیم یافتہ ڈاکٹر موجود ہیں۔اس طرح لوگ علاج کے لالچ میں ربوہ جاتے ہیں اور ''غیر مسلموں کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں'' اس کا تدارک کیا جائے۔اس پر وزیر صحت نے جواب دیا تھا کہ حکومت اپنے قوانین اور وسائل سے بڑے بڑے ہسپتالوں میں ویسے اعلیٰ تعلیم یافتہ ڈاکٹر مہیا نہیں کر سکتی آپ جماعت احمدیہ جیسی قربانی کی مثالیں پیش کرنے والے رضا کار ڈاکٹر مہیا کریں۔مولانا کے منہ پر مہر لگ گئی۔اب تو اس ہسپتال کا عالم یہ ہے کہ دنیا بھر سے مختلف میدانوں کے احمدی سپیشلسٹ ڈاکٹر عارضی طور پر کچھ عرصہ کے لئے ''وقف عارضی'' کر کے جاتے اور بیماروں کا مفت علاج کرتے ہیں۔ایسے لوگوں کا مقابلہ مولویوں کا ''دلِ ناتواں'' بھلا کیا کرے گا؟ وہ تو شہر کا نام بدل سکتے ہیں اور انہوں نے بدل بھی دیا ہے مگر دلوں کو تو وہ ''مقلب القلوب'' ہی بدل سکتا ہے۔

خرم مراد جماعت اسلامی پر پابندی لگنے کے بعد گرفتار ہوئے۔جیل سے لکھے ہوئے ایک خط میں مولانا جعفر تھانیسری کا ایک واقعہ کا لکھا ہے کہ مولانا کو انگریزوں نے کالے پانی کی سزا دی تھی ''جمعہ کا دن آیا تو انہوں نے غسل کیا لوگوں نے کہا آپ کہاں چلے؟ جواب دیا جمعہ پڑھنے۔لوگوں نے کہا آپ تو قیدی ہیں انہوں نے فرمایا میرا کام تو یہ ہے تیاری کرلوں کیونکہ یہ کرنا میرے بس میں ہے۔اس کے بعد دروازے تک گئے تو پہرے دار نے انہیں روک دیا آپ آگے نہیں جاسکتے۔وہ واپس آگئے اور کہنے لگے جو میرے بس میں تھا میں نے کر دیا باہر جانا میرے بس میں نہیں تھا اللہ تعالیٰ اس کا اجر وثواب مجھے دے گا۔جب ان کی داڑھی مونڈی گئی تو وہ داڑھی کے کٹے ہوئے بالوں کو ہاتھ میں لے کر کہتے تھے کہ غم نہ کر تو خدا کی راہ میں مونڈی جا رہی ہے'' (صفحہ ۳۲۳)۔

یہ واقعی ایمان افروز واقعہ ہے مگر میں سوچ رہا ہوں کہ آج اللہ کی راہ میں اسیر ہونے والے احمدی جب نماز کی تیاری کر کے بھی نماز پڑھنے سے روک دئے جاتے ہیں کہ وہ تو مسلمان ہی نہیں وہ نماز کیوں پڑھتے ہیں تو ان کے دلوں پر کیا گذر جاتی ہوگی؟ ضیاء الحق کے اس ظالمانہ قانون کو تحفظ دینے والے ادارے میں خرم مراد کی جماعت کے نمائندے بھی موجود تھے اور وہ اس ناانصافی میں برابر کے حصہ دار ہیں۔وقت آئے گا کہ کوئی خرم مراد جیسا شخص ہی مذہب کے نام پر روا رہنے والی ایسی ظالمانہ بے انصافی کے خلاف اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک ضرور کہے گا۔آپ نے مشرقی پاکستان کی البدر کی تنظیم کی ملٹری ٹریننگ حاصل کرنے کی پوری ذمہ داری قبول کی ہے۔انتخابات میں حصہ نہ لینے کی رائے رکھنے کے باوجود حصہ لیا ہے۔انجام کار عوامی لیگ کے بزرگ رہنما ابوالمنصور صاحب کی پناہ میں رہ کر قیدیوں کے کیمپ میں پہنچے ہیں۔ابوالمنصور صاحب کے ساتھ انہوں نے بھلے وقت میں نیکی کی تھی اس لئے ان لوگوں نے انہیں پناہ دی حالانکہ ان کے ''بیٹے مکتی باہنی کے مسلح گوریلے تھے'' (صفحہ ۵۲۴)۔یہ هل جزاء الاحسان الا الاحسان کی عمدہ مثال ہے۔یہ خودنوشت نیک خوئی کی عمدہ مثال ہے۔اے کاش خرم مراد میں حق کو حق کہنے کی زیادہ جرات ہوتی!

◎

میرا افسانہ

مفکر احرار چوہدری افضل حق کی خودنوشت سوانح عمری ''میرا افسانہ'' 1991 میں پہلی بار یکجا طور سے شائع ہوئی ہے۔ اس کا دیباچہ شورش کاشمیری نے لکھا ہے اور اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ''وہ بعض مقامات پر رک سے گئے ہیں۔ یعنی ایک طرح کی افسردگی سی پائی جاتی ہے اور غالباً اس کی وجہ ان کی بیماری ہے''۔۔۔۔ ''اپنے آخری ایام میں وہ چراغِ مفلس کی طرح بجھ سے گئے تھے اور مسلمانوں کے سیاسی جمود نے ان کے احساس وتفکر کو آزردہ کر دیا تھا''۔

چوہدری افضل حق، نے برطانوی دور میں پولیس کے سب انسپکٹر کے عہدے سے استعفیٰ دے کر سیاسی میدان میں قدم رکھا تھا۔ ابتدا سے ہی کانگریس کے ہمنوا رہے پھر اسی کی کوکھ سے پیدا ہونے والی قوم پرست مجلس احرار اسلام کی بنیاد رکھنے والوں میں شامل رہے۔ اپنی سیاسی جدو جہد کی وجہ سے تحریکِ ترکِ موالات کے دوران قید وبند کی مصیبتیں بھی جھیلیں۔ میرا افسانہ میں زیادہ تر حصہ جیلوں کی حالت اور بعد میں ان کے جیلوں کی اصلاحی کمیٹی کے رکن ہونے کے بعد جیلوں کی اصلاحات کے بیان پر مشتمل ہے۔ اندازِ بیان ادیبانہ ہے بلکہ بعض مقامات پر ان کے اسلوب پر ابوالکلام آزاد کی چھاپ واضح طور پر نظر آنے لگتی ہے۔ مجلس احرار میں یہی ایک مفکر ذہن رکھنے والے تھے، اس لئے انہیں مفکر احرار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ صرف ۴۹ برس کی عمر پائی۔

ان کا اپنا بیان یہ ہے کہ ''میرے بچپن کی کہانی استاد کی مار پیٹ سے شروع ہوتی ہے''۔ اس کے بعد آپ نے اپنے استادوں کے ''مشفقانہ'' بلکہ بہیمانہ سلوک کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ زیادہ تر تفصیلات جیلوں اور جیلوں کے اندرونی حالات سے متعلق ہیں۔ سیاسی بصیرت والے واقعات الشاذ کالمعدوم کے حکم میں ہیں۔

میرا افسانہ میں ۱۹۰۵ میں کانگڑہ کے مقام پر آنے والے زلزلے کی تفصیلات بھی بیان ہوئی ہیں جن کا بیان اس سے پہلے کسی خودنوشت میں میری نظر سے نہیں گذرا۔ لکھتے ہیں: ''صبح کے وقت

کانگڑہ کا قیامت خیز زلزلہ آیا جس نے پنجاب بھر کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دیا۔ کچھ عرصہ تو سب نے سمجھا کہ قیامت آ گئی۔ مائیں بچوں کو گھروں میں چھوڑ کر جان بچانے کے لئے کھلی جگہوں کی طرف بھاگیں تاکہ عمارتوں میں دب کر نہ رہ جائیں۔ نفسا نفسی کا وہ عالم تھا کہ بجز اپنی ذات کے کسی کو کسی کا خیال نہ رہا۔ پہلے ہی جھٹکے اس بلا کے تھے کہ کوئی شخص چارپائی پر لیٹا نہ رہا مجھے گھبراہٹ میں والدہ کی آواز سنائی دی کہ چوک میں چلے جاؤ۔ میں اور میرا بڑا بھائی فضل حق مرحوم دونوں سر پر پاؤں رکھ کر گلی کے چوک کی طرف بھاگے۔ ہمارے پہنچتے پہنچتے وہاں اچھا خاصہ ہجوم ہو چکا تھا سب کے چہروں پر ہوائیاں چھوٹ رہی تھیں سب خدا کا رحم مانگتے تھے ناگاہ محلّہ کی مسجد کا ملا بھاگا بھاگا آیا اس نے آتے ہی اذان کہنا شروع کر دی۔ پھر کیا تھا خورد اور بزرگ انگلیاں کانوں میں دے کر اذانیں دیتے تھے اور خوف سے ادھر ادھر دوڑتے تھے کسی کو زندگی کا یقین نہ تھا۔ ان میں ایک مادر زاد برہنہ حسین عورت با حالِ پریشاں کانوں میں انگلیاں دے کر ''وے لوکو اللہ اکبر وے لوکو اللہ اکبر'' کہتی سراسیمہ ہو کر ادھر ادھر بھاگتی پھرتی تھی۔ برہنگی کی طرف تو میں اب اشارہ کر رہا ہوں اس پریشانی میں کسی کو کچھ ہوش نہ تھا ننگے اور لباس والے سب برابر تھے۔ چند منٹ کے بعد لوگوں نے محسوس کیا کہ جھٹکے بند ہو گئے تب جان میں جان اور دماغ میں عقل آئی۔ مردوں نے تعجب سے برہنہ بی بی کو دیکھا عورت کو اچانک اپنی برہنگی کا احساس ہوا وہ ہائے ہائے ہائے ہائے کہتی پس وپیش ہاتھ رکھ کر بھاگی۔'' (صفحہ ۳۰۔۳۱)

اس زلزلہ کی پیش خبری ایک مامور من اللہ نے انہیں الفاظ میں دی تھی کہ وہ زلزلہ ایسا خوف ناک ہوگا کہ ''اک برہنہ سے نہ یہ ہوگا کہ تا باندھے ازار'' اور ستم ظریفی یہ ہوئی کہ انہیں کی مجلس احرار والے اپنی دشمنی کی ترنگ میں اس مصرعہ پر انگشت نمائی کرتے مر گئے کہ یہ بھی کیا مصرعہ ہے کہ برہنہ کو ازار باندھنے کا ہوش بھی نہیں رہے گا۔ اے کاش وہ اپنے مفکر احرار کی اس خودنوشت کے اس حوالہ سے ہی عبرت حاصل کرتے کہ اس نے اس حالتِ خوف کی چشم دید گواہی دے کر پیشگوئی کی صداقت پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ چوہدری افضل حق کی یہ خودنوشت بعض مقامات پر آزاد کے تتبع کے باوجود اندازِ بیان میں معمولی اور واقعات وحالات ونظریات کے بیان میں اس سے بھی زیادہ معمولی ہے۔ غالباً اسی لئے خود احرار بھی اس کے قدر دان نظر نہیں آتے۔ اپنی ناقدری کا احساس افضل حق صاحب کو اپنی زندگی ہی میں ہو گیا تھا مگر لایعنی مقاصد کی خاطر سلامت جوئی کو تج دینا ایسی ہی مایوسیوں کو جنم دیا کرتا ہے۔

گمشدہ لوگ

آغا ناصر کی کتاب ''گمشدہ لوگ'' ان رفتگاں کی یادوں پر مشتمل ہے جو اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ان میں ایک مضمون تو ان کی والدہ محترمہ کے ذکرِ خیر پر مشتمل ہے باقی مضامین 'فیض احمد فیض' ذوالفقار علی بخاری' خواجہ معین الدین' صادقین' مصلح الدین' سلیم احمد ریاض فرشوری اطہر علی کی شخصیتوں کے بارہ میں ہیں۔ مطلب یہ کہ اس کتاب میں کچھ بزرگوں کا ذکر ہے کچھ دوستوں کا۔ کچھ مشہور لوگ ہیں کچھ ذاتی دوست ہیں۔ موضوع کے لحاظ سے یہ خاکے ہیں مگر انہیں خاکے کہنا مشکل ہے کیونکہ ان میں خاکوں والی بے تکلفی موجود نہیں۔ جہاں بزرگوں کا ذکر ہے وہاں احترام حائل ہے جہاں دوستوں کا ذکر ہے وہاں کچھ اور عوامل ان کی راہ روک لیتے ہیں۔ ایک مضمون جو ان کی والدہ کے ذکرِ خیر پر مشتمل ہے وہ مکمل وفیاتی اور شخصیاتی مضمون ہے اور یہی اس کتاب کا سب سے اہم مضمون بلکہ خاکہ بن جاتا ہے۔

آغا ناصر ریڈیو پاکستان کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو قیامِ پاکستان کے بعد ریڈیو سے وابستہ ہوئی اور پھر ریڈیو سے ترقی کرتی ہوئی ٹی وی تک پہنچی۔ مواصلات کا وہ سلسلہ جس کی ابتدا صوتی رابطہ سے ہوئی تھی تصویر کے ذریعہ ''شوبز'' کا سلسلہ بن گیا حالانکہ ہمارے ہاں ریڈیو کو کبھی شوبز کا حصہ نہیں سمجھا گیا تھا۔ ذوالفقار علی بخاری کے باب میں لکھتے ہوئے جو لطیفہ آغا ناصر نے بیان کیا ہے کہ بخاری صاحب ٹی وی کے ساتھ وابستگی کے ساتھ ہی بیمار ہو گئے ان کا اپریشن کرنا پڑا تو ان کے ہی ایک رفیق کار نے پھبتی کہی کہ ''بخاری صاحب ریڈیو کا سسٹم نکلوا کر ٹی وی کا سسٹم ڈلوا رہے ہیں''۔ یہی بات آغا ناصر کے مضامین کے بارہ میں کہی جا سکتی ہے کہ وہ ریڈیو سے محض ''برباد'' ہونے کی بجائے اب ٹی وی سے ''باتصویر'' برباد ہو رہے ہیں۔ اسی لئے تو آغا صاحب کو اس کتاب میں بھی اپنی باتیں کہنے کے لئے دوسروں کی باتوں کا سہارا لینا پڑ رہا ہے۔ نشریات میں یہی کچھ تو ہوتا ہے بھان متی کا کنبہ جوڑنا پڑتا ہے۔

یہ کتاب ہمارے ایک ہمعصر کی کتاب ہے اس لئے جہاں بزرگوں کے ذکرِ خیر سے دلوں کو

مسرت ملتی ہے وہاں بعض بھولے بسرے دوستوں کا ذکر بھی یوں درمیان میں آ جاتا ہے جیسے اچانک ٹھنڈی پھوار سی پڑنے لگی ہو۔ فیض کے ذکر خیر میں یوسف جمال کا ذکر آ گیا۔ مدتوں سے اس دوست کا ذکر اذکار سننے میں نہ آیا تھا۔ فیض کی طرح اٹھنے بیٹھنے بولنے گفتگو کرنے کا انہیں اس زمانہ میں بھی شوق تھا۔ کراچی کے ایک کالج کے بین الکلیاتی مباحثہ میں اسی ''اندازِ فیض'' میں دھیمی دھیمی تقریر کر کے سٹیج سے اترے تو ہماری باری تھی ہم نے ان کے بارہ میں اور کچھ کہنے کی بجائے صرف یہ شعر پڑھا ''خدا کے فضل سے یوسف جمال کہلائے۔ اب اور چاہتے کیا ہو پیمبری مل جائے''؟ سارا ہال لوٹ پوٹ ہو گیا۔ اب جو پچاس برسوں کے بعد اس یارِ طرحدار کا ذکر پڑھا ہے تو وہ مباحثے نظروں میں گھومنے لگے ہیں اور یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ وہ جانِ ملاحت کس کانِ ملاحت میں گم ہو گیا ہے۔ بھلا کون بیگم یوسف جمال کی اس بات کی داد نہ دے گا جس نے فیض کو کھانے پر بلایا اور پھر اپنے شوہر سے کہنے لگیں کہ ''یوسف دیکھو یہ بڑے میاں تمہاری نقل اتارنے کی کوشش کر رہے ہیں''۔

یوسف جمال اگر کہیں سننے میں نہیں آئے تو اس میں ان کا کوئی قصور معلوم نہیں دیتا۔ ان کی نئی روشنی کی بیگم انہیں کسی گوشہء عافیت میں بالکل ہی لے بیٹھی ہیں۔

فیض احمد فیض کی شخصیت کے ساتھ ان کا رابطہ بزرگ اور خورد کا رابطہ ہے مگر ان کے نشریات کے ساتھ وابستہ ہونے کی وجہ سے اس رشتہ میں استواری آ گئی ہے کہ ان کا بیٹا انہیں ''فیض انکل فیض'' کہہ سکتا ہے۔ مگر فیض کی شخصیت کے جو پہلو نئے ہیں وہ دوسروں کے بیان کے محتاج ہیں۔ فیض صاحب کی پھبتی کی پہلی مثال ہم نے انہی کے ہاں دیکھی ہے۔ پطرس بخاری کے بیٹے ہارون بخاری نے ہاتھی اور چوہے والا لطیفہ سنا کر کہ'' چوہے نے کہا عمر تو میری بھی تین سال ہے مگر میری صحت کچھ کمزور رہتی ہے'' اپنے بذلہ سنج ہونے کا ثبوت دیا تو فیض صاحب نے ذرا مسکرا کر پھبتی کہی ''ہاں بھئی ہیں تو یہ بھی بخاری مگر ان کی صحت ذرا کمزور ہے''۔

ذوالفقار علی بخاری صاحب کے ذکر میں جتنی باتیں ہیں وہ پرانی ہیں' سگ باش برادرِ سگ مباش' والی بات تو سالک صاحب کہہ چکے ہیں۔ استاد بندو خاں سے معافی مانگنے والی بات بخاری نے خود بہتر طریق سے کہی ہوئی ہے۔ اس سارے ذکرِ طویل میں کوئی نئی بات نہیں ہے مضمون میں دلچسپی

دوسروں کی باتوں کے سہارے قائم رہتی ہے آغا ناصر کے اپنے زبان و بیان میں بے پناہ غلطیاں موجود ہیں اگر انہیں محض کتابت کی غلطیاں ہی تسلیم کیا جائے تو بھی بعض باتیں ایسی ہیں جو پڑھنے والوں کے حلق سے نہیں اترتیں۔ مثلاً حظ اٹھانے کو حذ اٹھانا (صفحہ ۱۷) لکھنا یا اسرار و رموز کو اصرار و رموز کہنا (صفحہ ۷۶)۔ اور عجیب بات ہے کہ ریڈیو ٹی وی والوں کے ہاں ایسی غلطیاں ہوں جن کے اپنے محکمہ میں تلفظ اور املا درست کروانے والے ملازم رکھے جاتے ہوں۔ طمطراق کو تمتراق (صفحہ ۱۱۲) تو کتابت کی غلطی ہوئی مگر یہ حفظِ مراتب کی جگہ حسبِ مراتب (صفحہ ۱۱۸) کی ترکیب لکھنا یا حلال کی کمائی کو ہلال کی کمائی (صفحہ ۲۲۹) لکھنا کتابت کی غلطی تو نہیں خود لکھنے والے کی ''صحت کی کمزوری'' کی دلیل ہے۔

صادقین والا مضمون البتہ کچھ نئے پہلو لئے ہوئے ہے۔ وہ بھی شاید اس لئے کہ صادقین پر زیادہ لکھا نہیں گیا، مصلح الدین ان کے ریڈیو ٹی وی کے ساتھی تھے ان کے بارہ میں جو کچھ ہے وہ اپنے ذاتی علم کی بنا پر آپ نے لکھا ہے اس لئے اس میں ایک حد تک خاکہ والی بے تکلفی آ گئی ہے۔ ریاض فرشوری ایک معروف ریڈیو مسودہ نویس ہیں مگر عام پڑھنے والے کے لئے ان کی شخصیت میں کوئی دلچسپی نہیں اس لئے آغا ناصر نے انہیں موضوع بنایا تھا تو اس میں خلوص برتتے کہ پڑھنے والوں کی دلچسپی کا کوئی پہلو بھی پیدا ہو جاتا۔ نہیں ہوا۔ سلیم احمد اور اطہر علی کے بارہ میں یہی باتیں کوئی بھی لکھ سکتا تھا آغا ناصر نے لکھا ہے تو ان شخصیتوں کے ساتھ اپنے تعلق اور ان کی ذات کے بارہ میں اپنے خاص زاویہء نگاہ سے کچھ لکھتے۔ دراصل یہ خاکے اس لئے خاکے نہیں کہ لکھنے والے کی نیت خاکہ لکھنے کی نہیں تھی۔ شخصیت نگاری کے لئے جس بے تکلف خلوص کی ضرورت ہوتی ہے وہ انہیں میسر نہیں تھا کہا جہاں یہ ماتحت ہیں وہاں احترام آڑے آ گیا ہے جہاں افسر ہیں وہاں دوسروں کی ماتحتی سدِ راہ بن گئی ہے۔ جو اجنبی ہیں وہ ان کے لئے بھی اجنبی ہی رہے ہیں۔ انتظار حسین کی بات باون تولے پاؤ رتی کی ہے کہ ''پی ٹی وی کے ابتدائی دور میں ڈرامہ پروڈیوسر کے طور پر نمایاں ہوئے وہیں سے میں ان کا قائل ہوا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کئی زقندیں لگا چکے تھے افسانہ نگار کی حیثیت سے شروع ہوئے تھے پھر ڈرامے سے دلچسپی پیدا ہوئی سو ڈرامے لکھے بس اسی زور پر انہیں ریڈیو پاکستان میں ملازمت مل گئی مگر ملازمت

ملتے ہی ان کا یہ زور ختم ہو گیا۔۔۔۔ اس زور پر انہوں نے یہاں بھی زقند لگائی اور ٹی وی میں آ گئے ۔۔۔ لیکن پھر ان کی ترقی ہو گئی۔'' جہاں آغا ناصر کی ترقی ہوتی ہے وہیں ان کا قلم پسپا ہو جاتا ہے۔ اب لکھنے کی جانب رجوع ہوئے ہیں تو انہیں یہ بھی علم نہیں کہ جو کچھ لکھا ہے وہ ہے کیا؟ خاکے ہیں یا فکاہیے ہیں؟ نہ یہ نہ وہ۔ گومگو کی کیفیت والے یہ مضامین وفیات کے باب میں ان کی پہلی پہلی کوشش ہیں۔ پی ٹی وی والے ہیں اس لئے ممتاز مفتی بھی شاباش دینے والوں میں موجود ہیں۔ البتہ غفاری بیگم والے مضمون کی داد نہ دینا بے انصافی ہو گی۔ ماں کسے عزیز نہیں ہوتی مگر ماں کی مامتا کا حق ادا کرنا ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔ آغا ناصر اس بارہ میں سرخرو ہوئے ہیں اور یہی ایک مضمون اس کتاب کو ادب میں لئے چلے گا۔

خواجہ معین الدین ہمارے ہاں تھیٹر کے سب سے نامور آدمی ہوئے۔ میں نے اس مضمون کو بڑی امنگوں سے شروع کیا تھا کہ شاید ان کی شخصیت کی کچھ پرتیں منکشف ہوں۔ ان کے ڈرامے لال قلعہ سے لالوکھیت نے یا مرزا غالب بندر روڈ پر نے بڑی شہرت حاصل کی۔ خدا معلوم ٹی وی کی پروڈکشن کے بعد ان ڈراموں کا کوئی تاثر باقی رہا یا نہیں مگر ہم نے ایک غیر ملکی جوڑے کو خواجہ معین الدین کی صلاحیتوں کے بارہ میں رطب اللسان پایا۔ اپسالا سویڈن میں ہماری ایک دوست ہیں ڈاکٹر سگرید کالہے، سویڈن کی بڑی مشہور ادیب ہیں اپسالا یونیورسٹی نے ان کی علمی خدمات کی بنا پر انہیں اعزازی ڈاکٹریٹ دے رکھی ہے۔ یہ اور ان کے میاں ایمبیسیڈر کالہے کسی زمانہ میں کراچی بھی رہے ہیں۔ ایک روز سگرید کہنے لگیں خواجہ معین الدین پاکستان کا واحد آدمی تھا جسے تھیٹر کا آدمی کہا جا سکتا ہے۔ ان کے میاں ایمبیسیڈر کالہے اٹھ کر اندر گئے اور ایک کاپی اٹھا لائے۔ کہنے لگے یہ قیمتی مسودہ جانتے ہو کیا ہے؟ خواجہ معین الدین کے ڈرامے لال قلعہ سے لالوکھیت تک کا مسودہ ہے خواجہ معین الدین کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا۔ مجھے انہوں نے اتنے ادب سے وہ مسودہ دکھایا جیسے کوئی مقدس صحیفہ دکھا رہے ہوں۔ کہنے لگے ہم دونوں میاں بیوی اردو نہ جاننے کے باجود ان کے ڈراموں کی ری ہرسل اور پھر انہیں سٹیج کرنے میں ان کے ساتھ شامل ہوا کرتے تھے۔ اب مدت کے بعد آغا ناصر کے مضمون میں ان کا ذکر پڑھ کر خوشی بھی ہوئی تھی کہ ایسے فنکاروں کو کوئی یاد کرنے والا بھی ہمارے ہاں ہے ورنہ

ہمارے ہاں تو آج مرے کل دوسرا دن کی روایت چل پڑی ہے' کفن بھی میلا نہیں ہو پاتا کہ لوگ بھول بھال جاتے ہیں۔ اور اگر ٹی وی پر کسی کے مرنے پر ذرا ڈھنگ کا تعزیتی پروگرام نشر ہو جائے تو اوپر والوں کی جانب سے جواب طلبی ہو جاتی ہے۔ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔

آغا ناصر کے یہ مضامین سنگِ میل والوں نے چھاپے ہیں اور اس لئے چھاپ دئے ہیں کہ وہ بڑے سرکاری افسر ہیں۔ اب وہ سرکاری افسر نہیں رہے تو انہیں اپنے قلم کے زور پر اپنے آپ کو منوانا ہو گا آزمائش شرط ہے۔

آغا ناصر کی یادوں یا داشتوں پر مشتمل ایک اور کتاب ''گلشنِ یاد'' کے عنوان سے سنگ میل والوں نے ۲۰۰۵ میں چھاپی ہے۔ تین سو صفحے کی اس کتاب میں ان کے جاپان اور امریکہ کے سفر ناموں کے علاوہ الیکشن ۷۰، کی روداد، لاہور میں ہونے والی اسلامی سربراہی کانفرنس کے دوران ان کی کارکردگی، فلسطین کی جدوجہد آزادی پر ایک نہ بن سکنے والی فلم کا تذکرہ ہے۔ اواخر کتاب میں چند نامور لوگوں کا ذکر خیر ہے۔ کچھ لوگوں کا ذکر کرنے کے بعد انہیں احساس ہوا کہ کچھ لوگ رہ گئے ہیں تو ان کا ذکر کچھ اور نامور لوگ کے عنوان سے کر دیا ہے۔ امتیاز علی تاج، صوفی تبسم، عبدالرحمٰن چغتائی، سے ان کی سرسری ملاقات ہے۔ انہی سرسری ملاقاتوں کا ذکر انہوں نے کیا ہے اور پڑھنے والوں کو کوئی نئی بات نہیں بتائی۔ عام قاری تک کو معلوم ہے کہ چغتائی صاحب نے پی ٹی وی کا 'لوگو' بنایا تھا یہ خبر البتہ نئی ہے کہ چغتائی صاحب کے راوی روڈ والے گھر میں انہیں لوگو بنانے کی دعوت دینے کے لئے یہ بھی آغا بشیر صاحب کے ہمراہ گئے تھے۔ صوفی تبسم کی ہمہ جہت شخصیت سے واقف نہیں ہیں۔ دوسروں کی بیان کردہ باتوں سے انہیں پہچانتے ہیں۔ باقی لوگوں کا تعلق ٹی وی اور میڈیا سے ہے۔ ضیا محی الدین، حسینہ معین، احمد فراز منو بھائی وغیرہم۔ ٹی وی کے مقبول پروگرام الف نون کی ملکیت کے باب میں باقاعدہ بیان حلفی جاری کیا ہے۔ کہ یہ الف نون آغا ناصر کا مخفف ہے۔

اس کتاب میں بھی یادوں کی جوت جگانے کی بجائے آغا صاحب نے اپنے نشریاتی کارہائے نمایاں بیان کرنے پر ہی زور دیا ہے۔

◎

چند یاداشتیں

حیدر آباد دکن کے پروفیسر حبیب الرحمٰن کی ''چند یاداشتیں'' ''حیدر آباد میں اردو کے عروج و زوال کی داستان'' کے ضمنی عنوان سے بہادر یار جنگ اکادمی کراچی کی جانب سے شائع کی گئی ہیں۔ پروفیسر حبیب الرحمٰن جامعہ عثمانیہ میں معاشیات کے استاد تھے پھر حضور نظام نے انہیں حکومت آصفیہ میں ڈائریکٹر تعلقات عامہ اور بعد کو ڈائریکٹر صنعت و حرفت مقرر کیا اور ''پولیس ایکشن'' کے بعد اسی محکمہ کے سکرٹری کے عہدہ ء جلیلہ سے ۱۹۴۹ میں وظیفہ یاب ہونے پر مجبور کئے گئے۔ سقوطِ مملکتِ آصفیہ حیدر آباد کے بعد بعض دوستوں نے انہیں پاکستان آنے کی دعوت بھی دی کہ آپ پاکستان آ جائیں تو مرکزی حکومت میں کوئی اچھا عہدہ مل سکتا ہے مگر آپ نے انکار کر دیا کہ ''جس مقام پر اور جس سوسائٹی میں عمر کے باون سال آرام و راحت اور عزت و آبرو کے ساتھ گذارے ہیں مصیبت پڑ نے پر اسے چھوڑ کر چلے جانا بڑی خود غرضی اور بزدلی کی بات ہے''۔ (صفحہ ۲۳) وظیفہ یاب ہونے کے بعد یکسو ہوئے تو آپ نے اردو کی خدمت کا بیڑا اٹھایا اور ایسے اداروں کی خدمت پر مستعد رہے جو اردو کے ساتھ کسی نہ کسی طور سے متعلق تھے۔ چنانچہ ان کی مصروفیت کا حیلہ بھی ہو گیا اور اردو کی خدمت بھی ہوتی رہی۔ ہم خرما و ہم ثواب۔

دکن کے بارہ میں مرزا ظفر الحسن نے ''ذکر یار چلے'' کے عنوان سے اپنی یاداشتوں کو اس خوبی سے لکھ دیا ہے کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اگر کوئی اور کتاب دکن کے بارہ میں نظر سے گذرے تو معاً مرزا ظفر الحسن کا اسلوب یاد آتا ہے۔ یہ بزرگ مرزا صاحب کے استاد رہے ہوں گے مگر ان کے اسلوب میں نہ دکن نظر آتا ہے نہ دکن والے۔ یہ داستان سیدھے سبھاؤ بعض اداروں کی داستان بن کے رہ گئی ہے کہ کون ادارہ کس مشکل سے دوچار ہوا اور اس مشکل سے اسے کیسے رہائی نصیب ہوئی۔ میرے لئے تو پروفیسر حبیب الرحمٰن صاحب کی کتاب سے صرف ایک کام کی بات نکلی ہے اور وہ مسعود

علی محوی صاحب کی سقوط حیدرآباد کی تاریخ ہے: ''اس سانحہ کا حال سنو بھر کے ایک 'آہ'۔ اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔'' دوسرے مصرعہ میں آہ کے اعداد شامل کردیے جائیں تو ۱۹۴۸ کا سن نکلتا ہے۔ سقوط مملکت آصفیہ کے بارہ میں پروفیسر صاحب نے اپنے مقدمہء کتاب کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ ''اس واقعہ کو عام طور پر ''پولیس ایکشن'' کہا جاتا ہے جس سے اس کی سنگینی اور مسلمانوں کے حق میں اس کے ہولناک نتائج پر پردہ پڑ جاتا ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک اچھی خاصی فوج کشی تھی جو مہینوں کی تیاری اور منصوبہ بندی کے بعد عمل میں آئی تھی اس کا مقابلہ کئی سال بعد دو اور واقعات گووا اور مشرقی پاکستان پر فوج کشی سے کیا جاسکتا ہے۔'' (صفحہ ۲۹)

سقوطِ حیدرآباد کا سانحہ ایسا سانحہ نہ تھا کہ اسے یوں نظر انداز کردیا جاتا۔ حبیب الرحمن صاحب نے خیال ظاہر کیا ہے کہ ''کوئی تاریخ نویس ضروری چھان بین کے بعد دیانت داری کے ساتھ اس دور کے صحیح واقعات قلم بند کرکے'' شائع کرے تو اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہئے کیونکہ تاریخ بہر حال تاریخ ہے'' (حاشیہ صفحہ ۳۰)۔

سر مرزا اسمعیل نے جو کسی وقت حیدرآباد کے صدر اعظم رہ چکے تھے نے اپنی کتاب ''مائی پبلک لائف'' میں لکھا ''جب میں نے حکومت ہند کے عہدیداروں سے حیدرآباد کے معاملے کے متعلق گفتگو کی تو انہوں نے کہا ''اب معاہدے کے مسودے پر غور کرنے کا وقت گذر گیا اب تو نظام کو بھی دوسری ریاستوں کی طرح شرکت کی دستاویز پر دستخط کرنے چاہئیں''۔ سر مرزا اسمعیل نے نظام کو لکھا کہ ''اگر آپ معاہدہ کو قبول کرنے پر آمادہ ہوں تو میں حکومت ہند کو اس بات پر راضی کرنے کی کوشش کروں کہ گفت وشنید کو منقطع نہ کیا جائے۔ چونکہ نظام کی حیثیت اپنے محل میں اتحاد المسلمین کے بے بس قیدی کی سی تھی اس لئے وہ کوئی معقول تجویز نہیں کرسکتے تھے''۔ (مائی پبلک لائف صفحہ ۱۲۵) اس لئے بات آگے نہ بڑھی اور حیدرآباد کا مسئلہ اور زیادہ گمبھیر ہوگیا۔

اسی طرح اپنی خودنوشت ''یادوں کی دنیا'' میں جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں ''ڈاکٹر رضی الدین وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی میرے مکان پر تشریف لائے اور کہنے لگے کہ عنقریب حیدرآباد پر فوج کشی ہونے والی ہے جسے روکنے کے لئے حکومت حیدرآباد اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں اپنا

مقدمہ پیش کرنے کے لئے ایک وفد بھیجنا چاہتی ہے چونکہ سلامتی کونسل کا اجلاس پیرس میں ہورہا ہے اور وفد میں کوئی شخص فرانسیسی جاننے والا نہیں اس لئے آپ ان کے ساتھ چلے جایئے۔ میں نے معذرت کی کہ یہ سیاسی معاملہ ہے جس میں میرا پڑنا مناسب نہیں ہے۔ میں سمجھا بات آئی گئی ہوئی۔ لیکن دوسرے روز ڈاکٹر رضی الدین پھر میرے یہاں تشریف لائے اور اصرار کیا کہ اگر ترجمان کی حیثیت سے وفد کے ساتھ جاؤں تو اس میں کوئی ہرج نہیں ہے اس سے وفد کو بڑی مدد ملے گی۔ ڈاکٹر رضی الدین نے مجھ سے اپیل کی کہ حیدرآباد پر یہ بڑا سخت وقت پڑا ہے اس وقت جو بھی مدد ہو سکے اس سے دریغ نہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ ان کی اپیل پر میں جانے کے لئے آمادہ ہوگیا۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۴۸ کو وفد کے دو ارکان معین نواز جنگ اور پست اقوام کے لیڈر شیام سندر روانہ ہوئے میں وفد کا رکن نہیں تھا لیکن ترجمان کی حیثیت سے ان کے ہمراہ کراچی روانہ ہوگیا۔ دوسرے روز قائداعظم محمد علی جناح نے رحلت فرمائی اس لئے کراچی سے روانگی نہ ہوسکی۔ ۱۳ ستمبر کو ہم پیرس روانہ ہوئے۔ راستہ ہی میں خبر سنی کہ ہندوستانی فوجیں حیدرآباد کی سرحدوں میں داخل ہوگئیں۔ ظہیر الدین احمد اور معین نواز جنگ پہلے سے پیرس میں موجود تھے اور سلامتی کونسل میں حیدرآباد کا مقدمہ پیش کرچکے تھے۔ حیدرآبادی وفد نے سلامتی کونسل سے مقدمے پر بحث کی تاریخ مقرر کرنے کی درخواست کی۔ چنانچہ ۱۶ ستمبر سماعت کی تاریخ مقرر ہوئی معین نواز جنگ نے حیدرآباد کا مقدمہ پیش کیا اور فوجی حملہ کی جتنی تفصیل اس وقت مل سکتی تھی بیان کی اور درخواست کی کہ سلامتی کونسل حیدرآباد کی مدد کرے۔ ہندوستان کی طرف سے سر راما سوامی مدلیار نے حیدرآباد کی آزادانہ حیثیت کو چیلنج کرتے ہوئے بتایا کہ حیدرآباد کا معاملہ گھریلو نوعیت کا ہے اسے سلامتی کونسل میں پیش نہ ہونا چاہئے۔ ۱۸ ستمبر کو ہندوستانی افواج کا حیدرآباد پر قبضہ ہوگیا اور وہاں ملٹری گورنمنٹ قائم ہوگئی۔ اسی روز نظام کی طرف سے سلامتی کونسل کے سکرٹری کو تار ملا کہ حیدرآباد کا مقدمہ واپس لیا جاتا ہے۔ ہندوستانی وفد نے نمائندگی کی کہ حیدرآباد کا مقدمہ ایجنڈے پر سے خارج کردیا جائے ہندوستان نے ۱۶ اکتوبر کو اپنا وفد پیرس سے واپس بلالیا۔ حیدرآباد کا مقدمہ اگرچہ سلامتی کونسل کے ایجنڈے پر باقی رہا لیکن اس کی عملی حیثیت ختم ہوگئی (یادوں کی دنیا صفحہ ۳۰۹ ۔ ۳۱۰)۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا ۱۴۵واں اجلاس پیرس میں ہورہا تھا۔ جب پاکستان کے پہلے

وزیر خارجہ اور جنرل اسمبلی میں پاکستانی وفد کے قائد سر محمد ظفر اللہ خاں کی باری آئی تو آپ نے دیگر معاملات کے علاوہ حیدر آباد کے مسئلہ پر بھی تفصیلی اظہار خیال کیا اور دنیا کو بتا دیا کہ ہندوستان سے کسی معاملہ میں انصاف کی توقع رکھنا کیسا عبث ہے۔ سر ظفر اللہ کی اس تقریر سے دنیا کو علم ہوا کہ حیدر آباد سے کیا ظلم ہوا ہے اور کس طرح یہ مسلم ریاست ہندوستان کی جارحیت کا شکار ہو کر اپنا تشخص کھو بیٹھی ہے۔

آج تقریباً پچپن برس کے بعد پروفیسر حبیب الرحمن کی یادداشتوں کے طفیل سقوطِ حیدر آباد کے مسئلہ پر یو این او میں کی جانے والی ایک تاریخی تقریر کا ذکر ہو رہا ہے۔ سچ ہے تاریخ کسی نہ کسی وقت اپنے آپ کو ظاہر کر کے رہتی ہے۔

خاک کے پردے

معروف ماہرِ تعلیم ڈاکٹر آغا سہیل کی ضخیم اور دانشوری دانش جوئی سے لدی پھندی خودنوشت ''خاک کے پردے'' کے عنوان سے ۲۰۰۴ میں لاہور سے شائع ہوئی ہے۔ آغا سہیل لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے بزرگوں میں سے آغا حسن اصفہان سے ہجرت کر کے الازہر پہنچے تھے اور پھر نجف اشرف سے تفسیر کا علم لے کر پھرتے پھراتے لکھنؤ وارد ہوئے تھے اور معاشرہ میں اپنا مقام بنایا تھا (صفحہ ۲۳)۔ آغا صاحب کے والد کا انتقال ہوا تو ابھی یہ کمسن ہی تھے۔ ان کے گھر کی اقتصادی حالت اودھ کے دوسرے مسلمان اشرافیہ کی طرح پتلی ہو چکی تھی۔ مگر ان کی دادی اماں بڑی منتظم خاتون تھیں ان کی زندگی تک تو لشتم پشتم وضع داری چلتی رہی مگر ان کی وفات کے ساتھ ان کے معاشی حالات دگرگوں ہو گئے ننھیال والے بھی اسی بگڑے ہوئے اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے اس لئے دادی اماں کی وفات کے بعد ان کی زندگی کا طور طریق یکسر بدل گیا۔ تعلیم مکمل ہونے سے پہلے ہی رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دئے گئے اس لئے ''مشقِ سخن'' کے ساتھ ''چکی کی مشقت'' بھی شروع ہو گئی۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد بھی پی ایچ ڈی کا کام مکمل نہ کر پائے تھے کہ اپنے ایک عزیز کے اصرار پر پاکستان آ گئے۔ ساری عمر ایف سی کالج لاہور سے منسلک رہے اب وظیفہ یابی کے بعد لاہور ہی میں رہتے ہیں۔

ہماری عمر بھی اسی دشت کی سیاحی میں گذری ہے اس لئے ہمیں ایک ہم عصر ہم عمر رفیق کار کی خودنوشت کو پڑھنے کا دو وجہ سے بہت اشتیاق تھا ایک تو ان کا ''چالیس سالہ تدریسی تجربہ'' جس کا آغا صاحب بار بار ذکر کرتے ہیں اور دوسرے ان کی لکھنویت! لکھنؤ سے ہمیں اپنے استاد محترم پروفیسر وقار عظیم کے ناطے سے بہت جذباتی تعلق ہے۔ ان کی زبان مبارک سے لکھنؤ والوں کے لسانیاتی تکلف و تصنع کے بارہ میں جو کچھ سن رکھا تھا آغا سہیل صاحب کی نثر نے اس کی تصدیق کر دی

ہے۔ ساڑھے پانچ سو سے زیادہ صفحات کی یہ خودنوشت گنجلک تراکیب، غیر ضروری تکرار، بھاری بھرکم معرب مفرس الفاظ، اور طول طویل فقروں سے پٹی پڑی ہے (مثلاً ''نیز پدری جیسے سے افضل ترمادری جنبہ کم ازکم مشرقی تمدن کی دیرینہ روایات کا جزو لاینجزاء رہا ہے''۔ صفحہ ۲۶) یہ زبان کسی خودنوشت کی رواں دواں شیریں زبان نہیں کسی مادی جدلیاتی مقالہ کی زبان ہے جس میں اشتراکی لفظیات کے پہلو بہ پہلو ''آئی ڈی''۔ ''ایغو''۔ ''سپر ایغو'' کی نفسیاتی اصطلاحات قدم قدم پر پڑھنے والے کا بار بار راستہ روک لیتی ہیں۔ ڈاکٹر آغا سہیل جیسے کہنہ مشق اور منجھے ہوئے استاد سے اس ''غیر محاکاتی'' زبان آفرینی کی توقع نہیں تھی۔ جوش صاحب نے بھی اپنی یادوں کی بارات لکھی ہے مگر ان جیسے زبان کے دھنی قلمکار سے بھی ایسی زبان سرزد نہیں ہوئی جو بیانیہ کی روانی کو مجروح کردے۔ خاک کے پردے کی زبان لکھنے والے کی گراں بار علیت کی آئینہ دار ہے۔

''لکھنؤ دراصل قدیم وجدید تہذیبوں کا سنگم ہے'' (صفحہ ۷۵) مگر اس خودنوشت سے اس قدیم وجدید تہذیب کے سنگم کی کوئی واضح تصویر ابھر کر سامنے نہیں آتی۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آغا سہیل اکثر ''اپنی جبلت کے تقاضے سے مغلوب ہو کر ٹریک سے اتر جاتے ہیں'' (صفحہ ۱)۔ ان کی ''تکرار اور وقتاً فوقتاً اعادے'' سے قاری کو بھی اسی طرح تکدر ہوتا ہے جس طرح ان کو اپنی دادی اماں کے اعادے سے ہوتا تھا (صفحہ ۳) مگر ان کی دادی اماں کے ''بیان میں بامحاورہ زبان کی لذت اور لہجے کی مٹھاس ہر ایک کو مبہوت کئے رہتی'' (صفحہ ۳) تھی مگر اس خودنوشت میں وہ مٹھاس مفقود ہے۔ ''ان کے خون میں بھی موروثی تمرد ہے'' (صفحہ ۶۸) جو ان کی سادہ بیانی میں روک بن جاتا ہے۔ اس طرح ان کی ''خود نوشت میں جھول'' (صفحہ ۸۳) آجاتا ہے۔

تکرار کی مثالیں تو اتنی وافر ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا ہی مشکل ہے۔ مثلاً ''فورٹ ولیم کالج ۱۸۰۰ اور دہلی کالج ۱۸۴۱۔۱۸۴۲ اور بعدہٗ ۱۹۳۰ سے لے کر ۱۹۳۶ تک مسلسل اور متواتر اردو نثر بہمہ وجوہ ارتقاء کے ادوار سے مملو ہیں'' (صفحہ ۹۵) ڈاکٹر صاحب جو کہنا چاہتے ہیں وہ واضح نہیں ہوا۔ پھر یہی دہلی کالج صفحہ (۹۸) پر موجود ہے حتیٰ کہ کتاب کے آخر یعنی صفحہ ۴۵۵ تک اس دہلی کالج نے اور ''مادی جدلیات'' کی اصطلاح نے قاری کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے یہ

خودنوشت قسطوں میں لکھی ہے اور لکھنے کے لئے یہ تکنیک اختیار کی ہے کہ ایک باب لکھ کر ایک طرف ڈال دیا دوسرا باب شروع کرنے سے پہلے پچھلے باب کو کھول کر بھی نہیں دیکھا کہ اس میں کیا کچھ مذکور ہو چکا ہے۔ اس طرح باب پر باب لکھے جاتے رہے اور خودنوشت ضخیم سے ضخیم تر ہوتی رہی اور غالباً چھپنے سے قبل بھی آغا صاحب نے کتاب کو مجموعی حیثیت سے دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔ نتیجہ معلوم کہ خودنوشت خودنوشت نہ رہی مختلف مقالات کا مجموعہ ہو کر رہ گئی ہے اور پڑھنے والا ''غبی الغابلین'' (صفحہ ۳۰) بن کر منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔

اس خودنوشت میں لکھنؤ کی انجمن ترقی پسند مصنفین کا ذکر بھی ہے۔ پروفیسر احتشام حسین کی علیت کا بھی مذکور ہے مگر لکھنؤ پر اس انجمن نے کیا ادبی اثرات مرتب کئے ان کے بیان سے آغا صاحب نے احتراز روا رکھا ہے۔ احتشام صاحب کے ترقی پسندانہ فلسفہ سے معمور لیکچر تو ''درج گزٹ'' ہیں مگر لکھنؤ یونیورسٹی میں جو علمی کام ہوئے ان سے یہ خودنوشت خالی ہے حالانکہ لکھنے والے کی زندگی کا جوانی کا زمانہ وہیں گذرا ہے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کی کانووکیشن کی روداد لکھ دی ہے ڈرامہ سوسائٹی کا ذرا سا ذکر کر دیا ہے اپنے اداکارانہ کارنامے بھی بیان کئے ہیں مگر یہ ساری باتیں ایسی زبان میں بیان میں ہوئی ہیں جو ہرگز ایسی باتوں کے بیان کرنے کی زبان نہیں۔ مشتاق احمد یوسفی صاحب کی مزاح نگاری پر ایک مضمون ڈاکٹر صاحب نے کسی اور موقعہ کے لئے لکھا ہوگا وہ بھی کتاب میں شامل کر دیا ہے (صفحہ ۵۲۷)۔

ہمارے لئے اس خودنوشت میں البتہ (اور یہ البتہ ان کے بار بار کے استعمال شدہ محاورہ والا البتہ نہیں کہ تن پہ نہیں لتہ پان کھاؤں البتہ) ایک چیز بڑی دلچسپی کی نکلی ہے کہ واجد علی شاہ کے والد امجد علی شاہ سے کسی عالم دین نے شکایت کی کہ آپ کے صاحبزادے پری خانے میں رقص کا شغل فرما رہے ہیں۔ باپ نے بیٹے کو طلب کیا کہ وہ جس حالت میں بھی ہوں حاضر ہوں۔ وہ حاضر ہوئے ''دیر تک باپ بیٹوں میں مکالمہ ہوا اور پھر اجازت ملنے پر وہ واپس چلے گئے۔ عالم دین نے کہا آپ نے شہزادے کو تنبیہ نہیں کی۔ امجد علی نے کہا قبلہ آپ نے دیکھا کہ اس کے دونوں پاؤں گھنگھروؤں سے لدے ہوئے تھے لیکن ایک گھنگھرو کی بھی آواز پیدا نہیں ہوئی۔ میں واجد علی کو سزا دوں کہ اس کے فن کو قتل کروں''

(صفحہ ۵۳) اور دلچسپی کی یہ چیز بھی ان کی سنی سنائی اور کسی دوسرے شخص کی روایت کی ہوئی ہے۔

اختری بائی فیض آبادی یعنی بیگم اختر سے گاڑی میں ان کو امرتسر سے لکھنؤ تک ایک ہی کوپے میں ہم سفر ہونے کا موقع ملا یہ روداد ایسی ہے کہ پڑھنے میں رواں بھی ہے اور لکھنوی تہذیب کی آئینہ دار بھی۔ لکھتے ہیں ''نیچے کی برتھوں پر دو خواتین آ بیٹھیں۔ اوپر ایک پر میں تھا اور میرے روبرو ایک سکھ فوجی تھا۔ امرتسر سے لکھنؤ کی ریزرویشن ملتی تھی۔۔۔ ایک لڑکی جو جوان تھی وہ میرے لئے اور میں اس کے لئے اجنبی نہیں تھے یونیورسٹی میں وہ عربی شعبے میں نظر آتی تھی اور میرا شعبہ اردو کا تھا اس نے ادھیڑ عمر کی خاتون کے کان میں کچھ کہا۔ ان کے ہمراہ سرونٹ کمپارٹمنٹ میں جو ملازم سفر کر رہا تھا وہ کھانے کے پشتارے لے کر آیا اور محترم خاتون نے نہایت شفقت اور محبت سے مجھے کھانے پر مدعو کیا اولاً میں تکلفاً جھجکتا رہا لیکن خاتون نے جب کسی قدر تنبیہ سے کہا میاں کیا لکھنؤ تک بھوکے سفر کرو گے میرے پاس وافر سامان ہے۔ خاتون نیک دل ہی نہیں جاذبِ نظر خدو خال اور نستعلیق گفتگو میں یدِ طولیٰ رکھتی تھیں لیکن بے حد محتاط متواضع اور میں یہ تو سمجھ گیا تھا کہ اس لڑکی کی یہ ساری کارستانی ہے۔۔۔ میں اپنی برتھ سے نیچے اترنے میں متامل تھا تو محترم خاتون بولیں آپ نیچے اترتے ہو یا میں خود نوالے بنا بنا کر کھلاؤں تو سردار رشک سے اور بیٹی شوخی سے ہنسنے لگے۔ جس شفقت اور محبت سے میری خاطر تواضع ہو رہی تھی مجھے اپنے گھر کا مزا آ رہا تھا۔ اچار مربے حلوے شیرینی اور پراٹھے اور پراٹھے بھی برہی تھے۔ میرے منہ سے نکلا سبحان اللہ برہی پراٹھے۔ بولیں میاں صاحبزادے میرا باورچی لکھنؤ کا ہے۔ عرض کی آپ کا بن بلایا مہمان بھی لکھنؤ کا ہے۔ اس بہترین ضیافت کے بعد بہترین پان کی گلوریاں کھائیں کہ منہ معطر اور معنبر ہو گیا۔ یہ سمجھ میں آیا کہ یہ خاتون کسی معزز گھرانے کی انتہائی سلیقہ شعار پڑھی لکھی ہنر مند ہیں ہمارے اس چند گھنٹوں کے سفر کو نہایت خوشگوار اور رنگین بنا دیا اور ریل کے کمپارٹمنٹ کو گھریلو ماحول میں تبدیل کر دیا اور اس میں بھی لطافت اور نفاست کی خوشبو نے مشامِ جاں کو معطر کر دیا کہ گفتگو کی نرمی حلیمی اور شیرینی بھی ایک کلچر اور تہذیب کا جادو ہے جو دشمن کے بھی سر چڑھ کر بولتا ہے اور یہ دونوں خواتین تو اپنے ہی خطے اور علاقے کی معلوم ہوتی تھیں بلکہ باتوں کی تہ داری سے خوبی اور خوبصورتی جھلکتی اور ٹپکتی تھی۔ صاحبزادی کی دزدیدہ نگاہوں کی جو کرشمہ سازیاں تھیں وہ اپنائیت سے مملو

اور ممنونیت سے سرشار تھیں کہ سفر ہم سب کا اچھا گذرا۔ (صفحہ ۳۷۳)۔ یہ بیگم اختر تھیں۔ اے کاش زبان کی نرمی اور شیرینی کا یہ جادو ان کی خودنوشت میں بھی قاری کے سر چڑھ کر بولتا۔

اس واقعہ کے دوش بدوش وہ واقعہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ جب یہ لکھنؤ سٹیشن پر اترے تو ''ہماری ہی بوگی سے قریب کے کمپارٹمنٹ سے ایک سادہ سفید پوش شخص اترا جسے آٹھ دس افراد کے ایک گروہ نے پیلے رنگ کے گیندے کے پھول پہنائے جئے ہند کے نعرے لگاتے ہوئے پلیٹ فارم سے دور نکل گئے کسی نے کہا یوپی کا گورنر ہے جو امرتسر سے واپس آ رہا تھا۔ اللہ اللہ یہ سادگی!'' (صفحہ ۳۷۵)

بھٹو صاحب نے اپنی قوم پر جو ظلم کئے ان میں کا ایک ظلم تعلیمی اداروں کو قومیانے کا ظلم تھا اور اس حادثۂ فاجعہ نے ہمارے ملک میں جو ابتری پیدا کی اس کا تدارک آج تک ممکن نہیں ہو سکا۔ آغا سہیل نے ایف سی کالج کا جو نوحہ لکھا ہے وہ دیگر تعلیمی اداروں پر بھی حاوی ہے۔ لکھتے ہیں ''قومیائے جانے کے مرحلے کے بعد معیار میں تیز رفتاری سے انحطاط ہونے لگا۔ سفارشوں اور رشوت خوری کی بنیاد پر اسٹاف اور اسٹف دونوں غیر معیاری ہی نہیں افسوسناک حد تک نااہل تھے۔ قومیائے جانے کے صرف چند سال ہی گذرے ہوں گے کہ ہمیں محسوس ہونے لگا کہ ہم ایک نامی گرامی اور معیاری کالج کے استاد نہیں بلکہ کوئی کریانہ مرچنٹ لوہار موچی یا طوطا فال نکالنے والے یا سموسوں کا کاروبار کرنے والے معمولی دکاندار ہیں۔۔۔ ان طلبہ اور اساتذہ کی چال ڈھال نشست و برخاست ان کے تیور ان کے انداز اور ان کے کینڈے، حلیے اور بشرے، علم و ادب کی خوبو کی بجائے خرابی اور شکستگی کا شدت سے احساس ہوتا تھا'' (صفحہ ۵۲۸) اور یہ بات باون تولے پاؤ رتی کی ہے۔

اس خودنوشت کا حاصل یہ ایک فقرہ ہے جو آغا سہیل نے لاہور کے باب میں لکھا ہے کہ ''آج کا لاہور گونگا اور بہرا ہے''۔ (صفحہ ۵۲۳) جب شہر گونگے اور بہرے ہو جائیں تو ان میں رہنے والوں کی منزل کھوٹی ہو جاتی ہے۔ ہم سب اسی المیہ کا شکار ہیں۔

◎

جائزہ

اردو کی خودنوشتوں میں حال ہی میں جسٹس ریٹائرڈ محمد احمد خاں صمدانی کی مختصر اور خیال انگیز خود نوشت ''جائزہ'' تازہ ہوا کا خوش گوار جھونکا بن کر نمودار ہوئی ہے۔ پچھلے کچھ برسوں میں اردو میں ضخیم اور لایعنی تفصیلات سے مملو، کئی خودنوشتیں منظرِ عام پر آئی ہیں جن میں لکھنے والوں نے اپنی شخصیت کو نت نئے زاویوں سے کرشماتی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنے آپ کو زمانہ سے ماوراء کوئی شے سمجھ لیا ہے۔ کچھ نے یہ جانا ہے کہ وہ اپنی جوانی کی بے راہ رویوں کو بیان کر دیں گے تو لوگ ان کی اس جراتمندانہ سعی پر داد و تحسین کے ڈونگرے برسائیں گے کچھ نے یہ فرض کر لیا کہ وہ جو کچھ لکھیں گے لوگ ان کی باتوں پر بغیر سوچے سمجھے آمنا وصدقنا کہیں گے مگر ایسے لوگ یہ بھول گئے کہ خودنوشت لکھنا اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا انہوں نے جان لیا ہے۔ اپنی شخصیت کو دیانت داری سے خود جانچنا پرکھنا اور پیش کرنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے۔ لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا!

خودنوشت سوانح حیات لکھنے والے کی زندگی کی وہ داستان ہے جو اس پر بیتی ہے اور وہ اسے خود روایت کر رہا ہے۔ وہ ایک زمانہ میں جی رہا ہے اس لئے اپنے وقت کا حصہ ہے اور بہت سے لوگ اسی وقت میں زندہ ہیں اور اسی دورانئے سے گذر رہے ہیں۔ اس کی واردات جسمانی و قلبی دوسروں سے مختلف ہو سکتی ہے مگر وقت کا اشتراک اپنی جگہ قائم رہتا ہے ہماری نسل کے لوگوں نے انگریز کو جاتے اور آزادی کو آتے اور اپنی آنکھوں سے اسے اپنوں کے ہاتھوں سلب ہوتے دیکھا ہے اس لئے ہماری شخصیت کے پس منظر میں یہ انقلاب آفریں زمانہ موجود رہے گا۔ کس نے اس دور کو کس تناظر میں دیکھا ہے وہ اس کا اپنا زاویہ نگاہ ہے مگر اس دور کا اجتماعی اثر اس کے لاشعور پر قائم رہے گا۔ جسٹس صمدانی کی خودنوشت میری نگاہ سے گذرنے والی پہلی خودنوشت ہے جس میں انہوں نے اپنی زندگی کو وقت کے لحاظ سے ادوار میں تقسیم کیا ہے اور اس تقسیم نے ان کے جائزے کو نئی معنویت عطا کر دی ہے۔

ہماری عدلیہ سے وابستہ رہنے والے افراد کی تین خودنوشتیں پچھلے برسوں میں چھپی اور میری نظر

سے گذری ہیں۔ سوائے ایک ''اپنا گریباں چاک'' کے جو جسٹس ریٹائرڈ ڈاکٹر جاوید اقبال کی خود نوشت ہے باقی خودنوشتیں انگریزی میں لکھی گئی ہیں۔ جسٹس سجاد علی شاہ کی اور جسٹس نسیم حسن شاہ کی دونوں انگریزی میں ہیں اور ضخیم ہیں حالانکہ دونوں چاہتے تو اردو میں خامہ فرسائی کر سکتے تھے۔ جسٹس جاوید اقبال کی خودنوشت ضخیم ہونے کے علاوہ ''بھاری'' بھی ہے مگر یہ بوجھ ''علم و آگاہی'' کا نہیں غیر ضروری تصاویر کا بوجھ ہے۔ جسٹس صمدانی اس میدان میں ان سب سے بازی لے گئے کہ اپنی خود نوشت اردو میں لکھی اور وقت کے تقاضوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے لکھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ بھی گئے کم از کم جسٹس جاوید اقبال کی طرح اپنے آپ کو ''جنابِ شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی'' کا مصداق نہیں بنایا! صمدانی صاحب نے ایک کہنہ مشق اور منجھے ہوئے جج کی طرح خودنوشت کیا لکھی ہے ''عدالتی فیصلہ'' لکھا ہے اور وقت کی عدالت میں رکھ دیا ہے۔ یہ فیصلہ مختصر بھی ہے جامع بھی اور دوررس بھی!

ایک بات کھٹکتی ضرور ہے کہ جج صاحب نے اپنے آپ کو ''ناصحِ مشفق'' تصور کر لیا ہے اور قدم قدم پر قارئین کو مفید مطلب مشورے بھی دیتے چلے جاتے ہیں۔ مگر انہیں یہ احساس بھی ہے کہ جس قوم کو وہ مشورے دے رہے ہیں وہ مشوروں پر کان دھرنے کی عادی ہی نہیں! حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ۔ کوئی ہم کو یہ تو سمجھاؤ کہ سمجھائیں گے کیا؟ جج صاحب نے سو صفحے کی اس خودنوشت میں اپنی قوم کو کم از کم تین مرتبہ ''نابالغ'' قوم کہا ہے۔ ہم نے ''اپنی عدم بلوغت کی وجہ سے ہر ادارہ کا ستیاناس کر دیا'' (صفحہ ۲۸) ''کیا ساری قوم نابالغوں پر مشتمل ہے'' (صفحہ ۶۱) اور ہم ''من حیث الکل نابالغ قوم ہیں'' (صفحہ ۸۱)۔ ان کا مطلب ذہنی ناپختگی سے ہے جس کے لئے انہوں نے نابالغ کا لفظ چنا ہے اور کوئی ایسا بے محل بھی نہیں چنا۔ جس قوم کا یہ حال ہو اسے نصیحت کرنا دیوار سے سر پھوڑنے کے مترادف ہے۔ اور جس قوم کی اپنی عدالت عظمیٰ کے ارکان اپنے ہی ایک سابق جج رفیق کے ہاتھوں سے ''مشوروں کے بھرے ہوئے سوٹ کیس'' وصول کرنے کے بعد (جسٹس سجاد علی شاہ کی خودنوشت صفحہ ۵۴۵) اپنے ہی چیف جسٹس کے خلاف فیصلے صادر کرنے لگیں اس قوم کو نابالغ ہی کہنا مناسب ہے۔

اس خودنوشت کا سب سے اہم حصہ میرے نزدیک وہ ہے جس میں جج صاحب نے ایک جج کے مقام و مرتبہ کا ذکر کیا ہے کہ ''جس جج میں دیانت دارانہ فیصلہ دینے کی ہمت نہیں وہ جج ہی نہیں''

(صفحہ ٦٦)۔ اور خود یہ بھی لکھ دیا ہے کہ اپنے ''اردگرد دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ بعض ایڈیشنل جج حکومت کے خلاف فیصلہ دیتے ہوئے اس خیال سے کتراتے ہیں کہ کہیں کنفرم ہونے سے نہ رہ جائیں'' (صفحہ ایضاً)۔ ہم نے تو مستقل ججوں کو بھی فیصلے دیتے وقت حکمرانِ وقت کی خوشنودی کا خیال رکھتے دیکھا ہے۔ جس ملک میں اسلام کے مقدس نام پر حکومت کرنے والے مطلق العنان آمر ججوں کو اپنا ملازم سمجھتے ہوں اور یہ کہتے نہ جھجکتے ہوں کہ ''یہ جج ہم سے ہی تنخواہیں لیتے اور ہمارے ہی خلاف فیصلے دیتے ہیں'' اس ملک کی عدلیہ کیا کرسکتی ہے؟ یہ بات آپ نے درست لکھی کہ ایڈیشنل جج مقرر ہی نہیں ہونا چاہئیں مگر یہ سسٹم تو ہم نے انگریزوں سے ورثہ میں پایا ہے اور خود آپ ہی کے قول کے مطابق ''اس سسٹم کو ججوں نے ہی اندر سے نقصان پہنچایا ہے۔ اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔'' (صفحہ ٦٧) اور مثال تو خود صمدانی صاحب نے دے دی مگر نام نہیں لیا (کیونکہ نام لینے کی ضرورت ہی کیا ہے جج صاحب نے وقت کا دورانیہ بتا دیا ہے) جس سے سب کچھ ظاہر ہو جاتا ہے کہ ایک جج نے ''ملٹری کے سامنے ہتھیار ڈال دئے تو وہ سپریم کورٹ تک پہنچ کر ریٹائر ہوئے''۔ (صفحہ ٧٩) اور جو اس ''فرقہ ءزہاد'' میں شامل نہ ہوئے ان کے ساتھ وہی کچھ ہوا جو آمروں کے دور میں انصاف پسند ججوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ تقسیم سے قبل کی خودمختار ریاستوں کے مطلق العنان حکمرانوں کے دور میں تو ایسا ہونا ممکن تھا کہ جج صاحبان کے فیصلے حکمران کی مرضی کے تابع ہوں مگر ہم نے تو ایک خودنوشت حیات قدسی میں صمدانی صاحب کے سابق وطن مالوف حیدرآباد دکن کے بارہ میں یہ بھی پڑھا ہے کہ نظام ایسے ججوں کو کنفرم کرنے یا توسیع دینے سے نہیں جھجکتے تھے جن کی شہرت دیانت داری سے فیصلے دینے کی تھی خواہ وہ حکومت کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔ حیات قدسی میں لکھا ہے کہ ١٩٣۵ میں نواب اکبر یار جنگ کی ہائی کورٹ کی ججی کی مدت ختم ہو کر اس میں توسیع ہونے والی تھی۔ نواب اکبر یار جنگ کی شہرت نہایت نیک نام جج کی تھی مگر ان کے خلاف لوگ بہت سرگرم تھے اور توسیع کا امکان نظر نہیں آتا تھا۔ ایک بزرگ سے انہوں نے دعا کی درخواست کی اور اس بزرگ نے انہیں بشارت دی کہ ایک سال تو کیا ملازمت میں دو سال کی توسیع ہوگی انشاءاللہ۔ وہی ہوا اتمام تر نامساعدت کے باوجود ''نواب اکبر یار جنگ کی ملازمت میں دو سال کی توسیع ہوگئی''۔ (حیات قدسی حصہ سوم صفحہ ۴٦)۔ اس واقعہ سے اس بزرگ کی قوت قدسی کے علاوہ نظام جیسے مطلق العنان حاکم کی دیانت داری کا ثبوت بھی ملتا

ہے۔ حالانکہ نظام کے بارہ میں جوش صاحب جیسے خودسر نے لکھا ہے کہ ''ان میں اتنا عُجب تھا کہ وہ بندے نہیں خدا معلوم ہوتے تھے'' (یادوں کی بارات صفحہ ۵٨٩)۔ ہمارے ہاں جو ''قادرِ مطلق'' گذرا ہے وہ ہماری نابالغ قوم ہی کو سزاوار تھا۔

جسٹس صمدانی کے بعض نظریات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر ان کے خلوص و دیانت پر انگلی نہیں اٹھائی جاسکتی۔ مثلاً مجھ سے قانونی موشگافیوں سے بے بہرہ شخص کو یہ بات سمجھنے میں دقت پیش آرہی ہے کہ سیشن ججوں کو خواہ وہ سینئر موسٹ ہی کیوں نہ ہوں ہائی کورٹوں کا جج مقرر نہیں کرنا چاہئے کیونکہ ان کی پیشہ ورانہ تربیت اور تقاضے اور ہوتے ہیں (صفحہ ٦٨) سوال یہ ہے کہ جو شخص ابتدا ہی سے منصفی کی کرسی پر بیٹھتا ہے اور ساری عمر اس امید میں گذارتا ہے کہ آخر اسے ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کی ججی تک پہنچنا ہے اس پر اعلیٰ عدالتوں کے دروازے کیوں بند کردئے جائیں؟ یہ درست ہے کہ ہر شخص اس مرتبہ کا اہل نہیں ہوسکتا مگر ان کے اس فرمودہ کو اصول اور قانون تو نہیں بنایا جاسکتا۔ اگر دس سال تک سیشن جج کی کرسی پر بیٹھنے والا شخص قانون کی ترقی پسندانہ توضیح کرنے کی قابلیت حاصل نہیں کرسکتا تو کیا ضروری ہے کہ دس سال تک وکالت کرنے والا شخص ضرور اس قابلیت کا حامل ہو۔ قبلہ صمدانی صاحب کا مشورہ سرآنکھوں پر پر ہماری قوم نے ان کے پہلے مشورے کون سے مانے ہیں کہ یہ مشورہ مان لے گی؟

جسٹس صمدانی کی ایک اور بات قابلِ قدر اور قابلِ غور ہے۔ فرماتے ہیں ''یہ وہ لوگ ہیں جو عدالت ہائے عالیہ اور عدالت عظمیٰ کی ججی کو بھی ملازمت سمجھتے ہیں ایسے لوگوں کا کیا کہنا خود جج صاحبان بھی اپنی ججی کو سرکاری ملازمت سمجھنے لگے ہیں اور خود کو حکومت وقت کا ماتحت۔ پست نظری کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی'' (صفحہ ٧٣)۔ میں اوپر سپریم کورٹ کے دو چیف جسٹسوں اور ایک سپریم کورٹ کے جج کی خودنوشت کا ذکر کر کے آیا ہوں ان میں سے دو اپنی ججی کو ملازمت سمجھتے تھے اور اپنی ملازمت کے تقاضوں کا پاس کرتے ہوئے حکومت وقت کے حق میں فیصلے صادر فرمانے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ جسٹس نسیم حسن شاہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے پی سی او کے تحت محض اس لئے حلف اٹھالیا کہ ابھی ان کی ''سروس'' کے چودہ پندرہ سال باقی تھے اور جن لوگوں نے حلف اٹھانے سے انکار کیا ان کی ''سروس'' ایک یا دو سال میں ختم ہونے والی تھی۔ جسٹس جاوید اقبال نے پی سی او کے تحت حلف اٹھانے کی توجیح یوں کی ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ کے نزدیک اگر اہل لوگ

منصب پر فائز نہیں ہوں گے تو نااہل لوگ منصب پر فائز ہو جائیں گے اس لئے ''جن جج صاحبان نے حلف اٹھایا وہ بھی اپنی جگہ درست تھے اور جن لوگوں نے آمر کے کہنے پر حلف اٹھالیا وہ بھی غلط نہ تھے'' (اپنا گریباں چاک صفحہ ۲۱۶)۔ چت بھی میری پٹ بھی میری! جسٹس جاوید اقبال کی خودنوشت ان کے ایسے ہی ''فقہی جوازوں'' سے بھری پڑی ہے۔

جسٹس صمدانی ان ججوں میں شامل تھے جو حلف اٹھانے کے لئے حاضر آئے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ حلف کی عبارت کو دیکھے بغیر انکار کر دینا انصاف کے منافی ہے۔ جب انہیں حلف دینے سے انکار کر دیا گیا تو چپکے سے صاف ضمیر کے ساتھ گھر آ گئے اگلے روز چیف جسٹس ان کے ہاں آئے اور کہا کہ انہیں حلف نہ دینا کسی غلط فہمی کی وجہ سے ہوا اس لئے اب انہیں حلف دیا جا سکتا ہے اس پر صمدانی صاحب کا جواب آب زر سے لکھنے قابل ہے کہ ''اب تو میں حلف کے الفاظ دیکھ چکا ہوں جس کا لب لباب یہ ہے کہ وفاداری دستور سے نہیں بلکہ فوجی حکومت سے ہوگی اس لئے میں ایسا حلف اٹھانے سے قاصر ہوں'' (صفحہ ۸۰)۔ ان کی ایک اور جرات مندانہ بات پڑھ کر قاری کا خون چلوؤں بڑھ جاتا ہے۔ جب یہ سکرٹری قانون تھے اس وقت ضیاء الحق چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے سکرٹریوں کی ایک کانفرنس بلائی اور اس میں سب کو بے نقط ملاحیاں سنائیں۔ کوئی اور جواب دینے کو نہ اٹھا تو صمدانی صاحب نے منہ توڑ جواب دیا اور ساری باتیں جرنیلوں کا نام لے کر لوٹا دیں کہ لو جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں۔ اس پر لوگوں نے انہیں مشورہ دیا کہ آپ ضیا سے معافی مانگ لیں تو بات رفت گزشت ہو جائے گی۔ ضیاء الحق کا بھی یہی خیال تھا کہ یہ معافی مانگ لیں بات ختم ہو جائے گی مگر جج صاحب کہنے لگے ضیا اپنی باتوں کی معافی مانگ لیں میں اپنی باتوں کی معافی مانگ لوں گا مگر'' اس پر ضیاء الحق راضی نہیں تھے چنانچہ میں بھی اپنے الفاظ واپس لینے یا معافی مانگنے پر آمادہ نہ ہوا'' (صفحہ ۷۸) آفرین ہے! اگر ہماری عدلیہ میں ایسے دو چار لوگ ہی موجود ہوتے تو ملک کا وہ حشر نہ ہوتا جو ہو رہا ہے۔

جسٹس صمدانی کو ۱۹۷۴ میں ربوہ ریلوے سٹیشن پر رونما ہونے والے واقعہ کی تحقیقات کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ جج صاحب نے تحقیق کرنے کے بعد اپنی رپورٹ حکومت کو پیش کر دی مگر اس کا بھی وہی حشر ہوا جو دیگر رپورٹوں کا ہوا کرتا ہے۔ جج صاحب نے اس پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ حکومت نے وہ رپورٹ خدا معلوم کیوں شائع نہیں کی اس سے عوام کی بہت سی غلط فہمیاں رفع ہو جاتیں۔ ایک غلط فہمی

کا ازالہ تو جج صاحب نے کر دیا کہ انہوں نے احمدیوں کے عقائد کے بارہ میں کوئی فیصلہ صادر نہیں کیا تھا نہ ہی یہ بات ان کے حیطہ اختیار میں تھی (صفحہ ۷۰)۔ احمدیوں کے بارہ میں جو فیصلہ کیا گیا وہ پارلیمنٹ نے کیا۔ اے کاش جج صاحب کا ضمیر عدل انہیں اتنا حوصلہ دے دیتا کہ وہ کم از کم اس نکتہ پر اپنی رائے کا اظہار کر دیتے کہ آیا کوئی پارلیمنٹ مملکت کے افراد کے عقائد کے درست یا غلط ہونے (یا ان کے کافر و دیندار ہونے) کے بارہ میں قانون سازی کرنے کی اہل ہوتی ہے یا نہیں؟ کیا دنیا کی دستوری تاریخ میں اور بھی ایسی کوئی نظیر موجود ہے؟ جج صاحب نے سکوتِ مصلحت آمیز کا رویہ اختیار کرنے میں بہتری سمجھی ہے حالانکہ یہ موقعہ تھا کہ انہیں بولنا چاہئے تھا اور ایسے موقعوں پر ہر صاحبِ ضمیر بولتا ہے۔

جسٹس صمدانی نے قتل کے کیس میں پہلی بار گرفتار ہونے پر بھٹو کی ضمانت منظور کی تھی اس پر پی پی پی والے بہت خوش تھے۔ جب آپ بار کا الیکشن لڑ رہے تھے تو پی پی کے ''ایک وکیل نے مجھے یقین دلایا کہ وہ اور ان کا سارا گروپ مجھے اس لئے ووٹ دے گا کہ میں نے بطور جج ان کی پارٹی کے لیڈر (بھٹو) کو ضمانت پر رہا کیا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ میں اس بنا پر ووٹ لینا نہیں چاہوں گا اس لئے کہ وہ فیصلہ تو خالصتاً میرٹ پر ہوا تھا اور ان سے درخواست کی کہ اگر وہ مجھے اچھا انسان سمجھتے ہیں تو ووٹ دیں ورنہ نہ دیں۔ اس پر وہ ناراض ہو گئے اور فرمایا کہ پھر ان کا مجھ سے تعلق ہی کیا ہے'' (صفحہ ۹۰)۔

اس مختصر سی خودنوشت میں چھوٹی چھوٹی کام کی بہت باتیں ہیں جن پر کان دھرنا ضروری ہے۔ ''جس سروس کے ہاتھوں میں اسلحہ ہو اسے ہمیشہ ماتحت رہنا چاہئے'' (صفحہ ۳۹)۔ ''وکالت کے معزز پیشہ میں بعض ایسے افراد بھی داخل ہو جاتے ہیں جو خود معزز نہیں ہوتے'' (صفحہ ۹۱) ''عدلیہ کو انتظامیہ سے علیحدہ نہ کرنا عدم بلوغت پر دال ہے'' (صفحہ ۲۲) ''میں نے امراض کی نشان دہی کی ہے علاج نہیں بتایا علاج تو اسے بتایا جاتا ہے جو علاج کروانا چاہتا ہو'' (صفحہ ۸) ''ہمارے لوگوں کو روٹی تو ضرور ملتی ہے مگر عزت نفس کی قیمت پر'' (صفحہ ۹۹)۔

جج صاحب نے قوم کو نظام دکن میر عثمان علی خاں کا ایک احسان بھی یاد دلایا ہے کہ نظام نے پاکستان کے بالکل ابتدائی زمانے میں اپنی دولت میں سے ایک کثیر حصہ پاکستان منتقل کر دیا تھا جس سے نوزائیدہ مملکت کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں سہولت ہوئی۔'' پاکستان پر نظام حیدر آباد کا یہ ایسا

احسان ہے۔جس سے بہت کم پاکستانی واقف ہیں'' (صفحہ ۴۸) خود جج صاحب نے اپنے ان اعزا و اقربا
کا احسان یاد رکھا ہے جو ان کی عسرت کے زمانہ میں ان کی دستگیری کرتے رہے اور اقرار کیا ہے کہ '' ان
کا احسان چکایا نہیں جا سکتا'' (صفحہ ۱۸)۔ یہ بڑی قابلِ قدر بات ہے۔ان کے عدالت سے فارغ
ہونے کے بعد اہلِ پنجاب نے ان سے جو سلوک روا رکھا اس کے بھی جج صاحب احسان مند ہیں کہ
''اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا'' (صفحہ ۸۱)۔انگلستان میں بھی جن لوگوں نے ان کی دستگیری کی
ان کے لئے سراپا سپاس ہیں۔جو لوگ ان کے لاسکرٹری ہونے کے زمانے میں ان کے آگے پیچھے
پھرتے تھے غریب الوطنی میں انہیں ملنے سے کتراتا دیکھتے ہیں تو ان کی ''مجبوریوں'' کو سمجھتے ہیں۔
ہمارے ہاں احسان ناشناسی کی جو روایت چل پڑی ہے اس کے پیشِ نظر کوئی احسان شناسی کی بات
کرے تو وہ دوسروں سے ممتاز نظر آتا ہے۔ **هل جزاء الاحسان الا الاحسان!**

صمدانی صاحب نے ایک متوسط گھرانے میں آنکھ کھولی بچپن میں یتیم ہو گئے اعزاء اقربا ان کی
خبر گیری کرتے رہے۔دکن سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تو کچھ دیر ہمارے پڑوس میں جھنگی محلہ
راولپنڈی میں بھی رہے۔دو کمروں کے اس مکان کو ہم نے بھی دیکھا ہوا ہے۔صمدانی صاحب کے ہاں
اپنی غربت کی وجہ سے کوئی احساس کمتری بھی نہیں۔حتیٰ کہ جج سے فارغ ہوئے تو بنک میں صرف تین سو
روپے ہونے پر بھی انہیں کوئی ملال یا پچھتاوا نہیں۔رازق اللہ تعالیٰ ہے اور وہی سب کی دستگیری کرتا ہے۔

وفاقی شرعی عدالت کے ایک چیف جسٹس نے ان سے عدالت میں بدتمیزی کی تو ان سے ہاتھ
تک ملانے کے روادار نہ رہے مگر بیٹی نے کسی سلسلہ میں یہ بات کہہ دی کہ زندگی اتنی مختصر ہے کہ اس میں
دشمنیاں پالنے کی گنجائش ہی کہاں ہے؟ بس یہ بات سیدھی دل میں اتر گئی۔قطع تعلق کو ترک کر کے ان
سے اپنا تعلق پھر جوڑ لیا۔یہ خودنوشت ایک سچے اور کھرے شخص کی داستان ہے۔

غرض ان خوبیوں کی وجہ سے میں نے ابتدا ہی میں اس خودنوشت کو اردو کی محدب عدسہ سے
لکھی ہوئی حبس آلود خودنوشتوں کے ہجوم میں تازہ ہوا کے جھونکے سے تعبیر کیا ہے۔

◎

آپ بیتی جگ بیتی

سابق سفیر سعد راشد الخیری کی خودنوشت ''آپ بیتی جگ بیتی'' لاہور کے فکشن ہاؤس کی
جانب سے ۲۰۰۴ء میں شائع ہوئی ہے۔سعد راشد الخیری خیر سے دلی کے اس گھرانے کے چشم و چراغ
ہیں جس کی شہرت کا ڈنکا برصغیر کے ہر صوبے میں بجتا تھا۔ان کے دادا علامہ راشد الخیری ''مصورِ غم'' کے
لقب سے جانے پہچانے جاتے تھے اور لوگ ان کی کتابوں کو دل و جان سے پسند کرتے تھے۔ان کا
موضوع عورت کی بے بسی تھا۔ہمارے ہاں کے مسلمانوں میں عورتوں کے ساتھ جو امتیازی سلوک روا
رکھا جاتا تھا اور ہندوؤں کی دیکھا دیکھی رواج کے نام پر انہیں جائیدادوں سے محروم کر دیا جاتا تھا اس
نے عورتوں کو ایک مظلوم طبقہ بنا دیا تھا اور اس مظلوم طبقہ کی فریاد کوئی سنتا ہی نہیں تھا۔راشد الخیری کی
والدہ بھی اپنے شوہر کی بے اعتنائی اور پھر ان کی وفات کے بعد بیوگی اور بیچارگی کا شکار رہیں۔نتیجہ یہ ہوا
کہ راشد الخیری کی والدہ نے انہیں بڑی محنت مگر غیرت مندی سے دوسروں کا احسان اٹھائے بغیر
پرورش کیا اور ان کے دل میں مظلوم طبقہ نسواں کی حمایت کا ایک جوش پیدا کر دیا۔انہیں ادیب بنانے
میں بھی ان کی ماں کا حصہ ہے جس نے انہیں لکھنے پڑھنے کا حوصلہ دیا اور سلیقہ سکھایا۔سعد راشد الخیری کی
پیدائش اور جوانی تک غربت اور تنگی ترشی کا وہ دور ختم ہو چکا تھا اور علامہ راشد الخیری کی شہرت روز افزوں
تھی۔مولانا کے بڑے فرزند علامہ رازق الخیری عصمت جیسے رسالہ کے مالک بن چکے تھے اور عصمت
بکڈپو دلی کا ممتاز اشاعتی ادارہ بن چکا تھا۔سعد راشد الخیری کی والدہ خاتونِ اکرم اپنے وقت کی مشہور
ادیبہ تھیں عصمت کی مدیرہ کے طور ان کا نام چھپتا تھا۔اس زمانہ کی دو خواتین مدیرات بہت نامی گرامی
ہوئیں تہذیبِ نسواں کی محمدی بیگم اور عصمت کی خاتونِ اکرم اور بدقسمتی سے دونوں ہی جوانی کے عالم
میں رہگزائے قضا ہوئیں۔خاتون اکرم کی وفات کے بعد سعد کی پرورش کا بار ان کی انہی دادی کے
کندھوں پر آ پڑا جنہوں نے ''مولوی عبدالراشد'' کو ''علامہ راشد الخیری'' بنانے میں اہم کردار ادا کیا
تھا۔اسی لئے تو ان کی خودنوشت میں دلی کا محاورہ بولتا ہے! مگر ''اندر عورتوں میں پرورش پانے کی وجہ

سے ''اس صاف ستھری شستہ زبان کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں دلی کی عورتوں والی عیب جوئی اور عیب گیری کی عادت بھی چلی آتی ہے۔ ایں ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگر۔

ادب کا ذوق انہیں ورثہ میں ملا ہے۔ دھدھیال میں دادا اور ابا دونوں ادیب تھے۔ ننھیال والوں کی جانب سے ماں ادیب اور ماموں ملک گیر شہرت کا شاعر تھا معین احسن جذبی! سعد صاحب نے اپنے ماموں کی شہرہ ء آفاق غزل کے حوالے میں صرف اس کا مطلع دیا ہے ہم حوالہ دیتے تو اس شعر کا حوالہ دیتے، جب کشتی ثابت وسالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی؟ اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے؟

سعد راشد الخیری کی تعلیم علی گڑھ میں ہوئی اس لئے ان کی خودنوشت کی ابتدا میں علی گڑھ کا ذکر ہے جس میں اکثر باتیں ان پر بیتی ہوئی نہیں دوسروں سے سنی سنائی ہیں۔ دلی کی تہذیب کے بیان کے بارہ میں بھی یہ دوسروں کی باتوں پر انحصار کرتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی صاحب کے ذکر میں لکھنؤ کے نواب صاحب کا جو واقعہ یہ بیان کر رہے ہیں وہ خود خواجہ حسن نظامی اور ان کے بعد اشرف صبوحی اسے کہیں بہتر طریق پر بیان کر چکے ہیں۔ ان کی زندگی کے حالات اصلاً وہاں سے شروع ہوتے ہیں جہاں سے ان کی فارن سروس شروع ہوتی ہے۔ پبلک سروس کمیشن کی جو روداد یہ بیان کر رہے ہیں وہ پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اس وقت قحط الرجال کا کیا عالم تھا!

سروس میں آتے ہی ان کی مین میخ نکالنے کی عادت نمایاں ہونے لگی۔ ٹریننگ کے لئے گئے تو انہیں اکیڈمی کے ماٹو پر اعتراض ہوا کہ یہ کیوں رکھا ہے ''سبق پڑھ پھر صداقت کا عدالت کا شجاعت کا۔ لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا''۔ بھلا امامت کا کام بھی کوئی کام ہے؟ وزارت خارجہ میں پہنچے تو وہاں کے ''کاروبارِ شوق'' پر اعتراض ہوا۔ انہیں ذرہ بھر بھی اس بات کا احساس نہیں کہ نیا ملک ہے وسائل ناپید ہیں ایک نئے ملک کی تنظیم وحکومت کا ڈھانچہ کھڑا کرنے میں کتنی دشواریاں درپیش ہیں انہیں صرف اپنے اعتراضوں سے کام ہے اور موقعہ بے موقعہ اپنے اعتراض جڑتے چلے جاتے ہیں۔ ایران گئے تو جاتے ہی سفارت والوں کی خرابیاں گننے لگے۔ غرض ساری سروس میں کسی ایک کو بھی معاف نہیں کیا۔ ان کے سارے افسر نااہل نکلے۔ نیویارک گئے تو ''لاری شفیع صاحب سے ان کی بنتی نہیں تھی'' (صفحہ ۱۳۵) فارن سکرٹری ''جے اے رحیم گورے تھے اور مٹی کے مادھو'' (صفحہ ۱۴۱) ''عثمان

علی بیگ خوفناک آدمی تھے'' (صفحہ ۱۳۳) ''آغا شاہی دوست نواز'' (صفحہ ۱۳۴) اور ''تنگ دل، تنگ نظر، کینہ پرور، اور گھٹیا آدمی تھے'' (صفحہ ۲۵۷) آغا ہلالی نے ''ان سے بات کرنے سے انکار کر دیا'' (صفحہ ۲۰۷)۔ لگتا ہے وزارت خارجہ میں سوائے ان کے اور کوئی مردِ کامل تھا ہی نہیں۔

سفیر صاحب نے چھوٹتے ہی وزیر خارجہ چوہدری ظفر اللہ خان پر اقربا پروری کا الزام لگا دیا کہ ''چوہدری ظفر اللہ خان اس سے پہلے والی ملاقات کے دوران آفتاب کو شاید بتا چکے تھے کہ تمہارا تقرر نیویارک میں ہوگا کیونکہ ان کی پہلی بیوی کا کچھ رشتہ تھا آفتاب سے''۔ (صفحہ ۸۹) ستم ظریفی یہ ہے کہ چوہدری صاحب کا بڑے سے بڑا دشمن بھی ایسا الزام ان پر نہیں لگا سکا۔ مگر ان کے ایک نئے نویلے ماتحت نے کس بے تکلفی سے یہ الزام جڑ دیا ہے۔ میں حیران تھا کہ سفیر صاحب کو ایسا کرنے کی کیوں ضرورت پیش آئی۔ مگر غور کیا تو اسی خودنوشت سے اس کا جواب مل گیا۔ سعد صاحب ہاشم رضا صاحب کی خسروانہ داد دہش کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''صدر میں الفنسٹن اسٹریٹ پر بڑی اچھی کونے کی دکان تھی جہاں پہلے شاید سٹیشنری وغیرہ بکتی تھی۔ وہ کچھ دنوں سے بند پڑی تھی میں نے اس کے لئے ہاشم رضا صاحب کے پاس درخواست دی انہوں نے اس پر دستخط کر دئے اور دے دی'' (صفحہ ۷۶) شاید سعد صاحب ہاشم رضا صاحب کے احسانات کا صلہ دینے کی کوشش میں ایسا کر رہے ہوں۔ ہاشم رضا واحد آدمی تھے جنہوں نے اپنی خودنوشت ''ہماری منزل'' میں چوہدری ظفر اللہ خاں کی یو این او کی تقریروں کو ''لاطائل اور لایعنی'' کہا تھا اب آن کے معلوم ہوا کہ ان کی معلومات کا منبع کون تھا یہی سعد صاحب تھے جنہیں وزارت خارجہ میں گئے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے تھے اور وہ اپنے وزیر خارجہ اور منجھے ہوئے ڈپلومیٹ کی تقریروں کو غیر دلچسپ اور بور کہنے چلے تھے کیونکہ ان کا ایک ڈپلومیٹ ساتھی چوہدری صاحب کی ''تقریر کے دوران سو گیا تھا'' (صفحہ ۱۳۰)۔

اب رہی آفتاب صاحب کی بات تو میں آفتاب صاحب کو جانتا ہوں ان کا چوہدری صاحب سے یا ان کی کسی بیوی سے کوئی رشتہ تھا ہی نہیں۔ ان کے اسی بیج کے ایک سفیر مزے لے لے کر یہ سنایا کرتے تھے کہ ایک بار ہمارے ایک اہلِ زبان ساتھی شیروانی کے ساتھ ساٹن کی زنانہ شلوار پہن کر ایک دعوت میں چلے گئے تھے۔ ہمیں تو اس افسر کے بارہ میں جاننے کا تجسس نہ ہوا تھا مگر سعد راشد الخیری صاحب نے ایک واقعہ بیان کیا ہے اس سے ہم چونکے ضرور ہیں۔ لکھتے ہیں ''راجہ صاحب (راجہ غضنفر

علی خان سفیر پاکستان) کا پی اے پہنچا کہ سفیر صاحب نے کہا ہے کہ شیروانی میں جائیں گے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ شیروانی استری کی ہوئی ٹنگی تھی جلدی جلدی کپڑے بدلے پاجامہ پہنا جناح کیپ پہنی اور تیار ہوکر سفارت خانے پہنچ گیا۔ مجھے دیکھتے ہی میجر حسن نے کہا ارے یہ کیا یہ تو پاجامہ پہن کے آ گیا۔ بات یہ تھی کہ راجہ صاحب سمیت سب لوگ شیروانی کے ساتھ شلوار پہنے کھڑے تھے میں نے کہا صاحب میرے پاس شلوار نہیں ہے تو حسن صاحب نے اپنا آدمی بھیجا سفارت کے پیچھے ہمارے ایک سپرنٹنڈنٹ رہتے تھے ان سے کہلوایا جنہوں نے از راہِ کرم اپنی بیگم کی ایک سفید شلوار بھجوائی اس طرح ہم کاخِ گلستاں پہنچے'' (صفحہ ۱۰۳)۔ ہوسکتا ہے ہمارے دوست جس سفید زنانہ شلوار کا ذکر کیا کرتے تھے وہ یہی ساٹن کی شلوار ہو اور وہ ممدوح یہی سعد راشد الخیری ہوں؟

پاکستان کے کئی سفراء نے وظیفہ یاب ہونے کے بعد اپنی خودنوشتیں لکھی ہیں۔ اتفاق یوں ہے کہ سب انگریزی میں ہیں۔ سعد راشد الخیری کی اردو میں لکھی ہوئی خودنوشت سامنے آئی تو میرا اشتیاق دیکھنے کا تھا، شوق کی آنکھوں سے پڑھا تو معلوم ہوا کہ یہ خودنوشت زبان و بیان کے لحاظ سے خاصے کی چیز ہے مگر اس کے مندرجات سے لکھنے والے کی جو تصویر بنتی ہے وہ کسی تجربہ کار، ذہین اور اعلیٰ درجہ کے سفارت کار کی نہیں بنتی ایک نکتہ چیں اور اپنی انا کے اسیر سفارت کار کی بنتی ہے۔ سی آئی اے کے ساتھ ان کا تعلق ان کی مرضی کے خلاف بنانے کی کوشش کی گئی۔ ''خلاف مرضی'' کی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ وزارت خارجہ ایک غیر رضامند افسر کو کسی ملک کے جاسوسی کے ادارے میں تربیت کے لئے کیونکر نامزد کر سکتی ہے؟ سفیر صاحب نے اپنے اس تعلق کا بہت زور شور سے ذکر کیا ہے اور اسے چھوڑ بھاگنے پر قاری سے داد طلب کی ہے۔ اپنے جن سفارتی کارناموں کا ذکر سفیر صاحب کر رہے ہیں وہ بھی ادھورے رہے۔ لیاقت علی خاں کو روس بھجوانے کی ان کی کوششیں کامیاب نہ ہوئیں۔ روسی سفارت کاروں کے ساتھ ان کے تعلقات بارآور نہ ہوئے۔ اور سی آئی اے کا ایجنٹ ہونے کی پھبتی ان پر چپک کر رہ گئی۔

سفارتی سرگرمیوں کے برعکس یہ سیر سیاحت میں چابک دست ہیں اور اپنی سیر و سیاحت کا حال بڑی مہارت سے لکھتے ہیں۔ ان کی خودنوشت کا وہی حصہ قابلِ لحاظ ہے جہاں جہاں ان کے اسفار مذکور ہوئے ہیں باقی برکت ہے!

◎

گئے دنوں کا سراغ

ممتاز ناول نگار محترمہ نثار عزیز بٹ کی ضخیم خودنوشت ''گئے دنوں کا سراغ'' کے عنوان سے سنگ میل والوں کی جانب سے ۲۰۰۴ میں چھپی ہے۔ سات سو چودہ صفحے کی اس خودنوشت میں محترمہ نثار عزیز کی زندگی کا لمحہ لمحہ معرضِ تحریر میں آ گیا ہے کیونکہ وہ عمر بھر اپنی ڈائری لکھتی رہی ہیں۔ اس ڈائری نے قدم قدم پر ان کی راہنمائی کی ہے یا ان کا راستہ روکا ہے۔ قرۃ العین حیدر کی ''کارِ جہاں دراز ہے'' کی طرح یہ خودنوشت بھی یادوں کی مکمل باز آفرینی کا نمونہ ہے مگر یادوں کی مکمل باز آفرینی کا عمل ادب میں مستحسن نہیں سمجھا گیا کیونکہ اس طرح لکھنے والا اپنے ماضی کی واقعاتی گرفت سے اپنے آپ کو آزاد نہیں کر پاتا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ماضی کا صیدِ زبوں بن کر رہ جاتا ہے۔ خودنوشت لکھنا محض ماضی کو گرفت میں لینے کا عمل نہیں ہوتا زندگی کے نشیب و فراز کو ماضی کے تناظر میں دیکھنے کا عمل ہوتا ہے۔ مکمل باز آفرینی کی کوشش ماضی کو صحیح تناظر میں نہ دیکھنے کا سبب بن جاتی ہے۔ ایسی خودنوشتوں کو یادوں کا پلندہ کہا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں گٹھڑی کا لفظ بڑا مناسب لفظ ہے یوں سمجھئے کہ مکمل باز آفرینی والی خودنوشتیں ایسی گٹھڑی کی طرح ہوتی ہیں جس میں مسافر نے گھر کا سارا سامان سمیٹ سمٹا کر باندھ لیا ہو اور اب منزل پر پہنچنے کے بعد اسے کھول کھول کر پھول پھول کر ٹٹول ٹٹول کر الگ کر رہا ہو اور اسے یہ سمجھ نہ آ رہی ہو کہ یہ چیزیں اس نے کیوں گٹھری میں باندھ رکھی ہیں؟ اور اب ان چیزوں کا کیا مصرف ہوسکتا ہے؟ نئے ماحول میں ان چیزوں کی حیثیت ''قدیم سجاوٹی اشیا'' کے علاوہ اور کیا رہ جاتی ہے؟

زندگی میں بعض چیزیں بعض یادیں بعض باتیں انسان کو بڑی ثمین و عزیز ہوتی ہیں مگر وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان کی قدر و قیمت معدوم تو نہیں ہوتی کمتر ضرور ہو جاتی ہے اس لئے زندگی کے دیگر ساز و سامان کی طرح یہ باتوں یادوں کا ذہنی سرمایہ بھی بوسیدہ ہو جاتا ہے اس لئے انسانی ذہن انہیں خود کانٹ چھانٹ کر پھینک دیتا ہے۔ آخر کاٹھ کباڑ کو گھر میں رکھنے سے فائدہ؟ مگر ڈائری کا سہارا

لے کر خودنوشت لکھنے والا اس بے بس شخص کی طرح ہوتا ہے جس کے ذہن نے کئی چیزوں کو بوسیدہ اور ناکارہ سمجھ کر پھینک دیا ہوتا ہے مگر ڈائری کا اندراج اس پھینکی ہوئی چیز کو پھر اٹھا کر سامنے لا رکھتا ہے۔اسی لئے کہا گیا ہے کہ چیزوں کو discard کرنا چیزوں کو بیان کرنے سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔قرۃ العین حیدر سمجھدار نکلیں انہوں نے اپنی خودنوشت کو سوانحی ناول کہہ لیا اور ناول نگار کے وسیع تر اختیارات کو خوب خوب برتا۔محترمہ نثار عزیز ساری عمر ناول لکھتی رہیں اب انہیں ایک نئی صنفِ ادب میں طبع آزمائی کا خیال آیا ہوگا ورنہ ناول کی ہیئت اور وسعت کا انہیں خوب تجربہ تھا۔ان کی یہ خودنوشت خود نوشتوں میں اس لئے کمزور سمجھی جائے گی کہ انہوں نے اس صنف ادب کے بنیادی تقاضے یعنی discard کرنے کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا۔انہوں نے بھرپور زندگی کی ہے اور یہ بھرپور زندگی سوانحی ناول کا ایک شاندار پلاٹ بنتی! نثار عزیز نے ڈائری کا ذکر خود بھی کیا ہے کہ ''گزشتہ اکیس سالوں میں میں نے ڈائری کے یہ صفحات کبھی دوبارہ نہیں پڑھے۔نہ ہی مجھے یاد تھا کہ میں نے کیا لکھا ہے'' (صفحہ ۱۳۶) اب خودنوشت لکھنے بیٹھی ہیں تو اس آسیب نے انہیں گرفت میں لے لیا ہے اور اس سے رہائی کی صورت انہیں نظر نہیں آتی۔

محترمہ نثار عزیز، مشہور ناول نگار عزیز احمد کے لفظوں میں ''سیدھی سادی پٹھان لڑکی ہیں'' اور ''پٹھان لڑکی ایک ایسی جنس ہے جو دنیا میں بے حد موہوم اور نایاب سمجھی جاتی ہے'' اور انہوں نے پشاور میں ''ایک سچ مچ کی پڑھی لکھی اور خود سے کہیں زیادہ ذہین پٹھان لڑکی سچ مچ دیکھی'' (صفحہ ۲۲۴)۔اس پٹھان لڑکی سے ان کی مختصر سی خط و کتابت بھی ہوئی لیکن اس لڑکی نے صاف کہہ دیا کہ ''میری ذاتی زندگی میں آپ کے لئے کوئی جگہ نہیں'' (صفحہ ۲۲۶) ''اور اس خط کا جواب اگر نہ دیں تو احسان ہوگا'' اور عزیز احمد کی جانب سے اس ''خط کا جواب نہ آیا اور کہانی ختم ہوگئی'' (صفحہ ۲۲۷)۔محترمہ نثار عزیز اس وقت پشاور کے گرلز کالج میں حساب کی لیکچرار تھیں۔بعد کے زمانے میں ان کے دوست عزیز بھی نثار عزیز کو دلار سے ''پٹھانی'' کہا کرتے تھے۔

ان کا لڑکپن کا زمانہ بے فکری کا زمانہ نہیں تھا۔ماں کی بے وقت وفات کا خلاء ان کے سامنے رہا۔دوسری والدہ جنہیں یہ ممی کہتی رہیں بہت ہمدرد اور مخلص ماں تھیں اس طرح ان کی محرومیوں کا کچھ

ازالہ ہوا۔نوجوانی کے زمانہ میں جب یہ طالب علمی کے دور سے گزر رہی تھیں انہیں ٹی بی ہوگئی، ڈاڈر کے سینی ٹوریم میں رہیں۔ہمدرد ڈاکٹر میسر آئے تو صحت یاب بھی جلد ہوگئیں۔ایم اے ریاضی کرنے سے پہلے انہیں اسلامیہ کالج کوپر روڈ لاہور میں اور ایم اے کے بعد پشاور کے کالج میں انہیں لیکچرار کی جگہ مل گئی۔فراغت اور بے کاری کا زمانہ انہوں نے نہیں دیکھا۔کالج کی لیکچراری کے دوران ریڈیو پر پشتو پروگرام کرتی رہیں۔اسی ریڈیو کی وجہ سے ریڈیو کے اے ایس ڈی اصغر بٹ سے روشناسی ہوئی اور بعد کو انہی سے ان کی شادی ہوگئی۔بٹ صاحب سے شادی کے بعد مسز بٹ کے نام سے جانی جانے لگیں مگر انہیں اس بات کا دکھ رہا کہ لوگ انہیں ناول نگار رضیہ بٹ سمجھتے ہیں۔بلکہ ایک بار تو کچھ لڑکیوں نے کہہ بھی دیا کہ ''ہم نے آپ کے ناول نہیں پڑھے۔ہم صرف معیاری ناول پڑھتے ہیں'' (صفحہ ۴۲۴)۔

انہوں نے اس عہد میں ہوش سنبھالی جب انگریزی ناول پڑھنا اور پھر سماجی محفلوں میں ان پر بحث کرنا فیشن میں داخل تھا اور پڑھا لکھا ہونے کی علامت۔اردو ادب کی تحریکوں یا رویوں کا ذکر ان کے ہاں موجود ہی نہیں۔اسی طرح اس دور میں ٹیگور کا جادو بھی سرچڑھ کر بول رہا تھا اس لئے ان کی ڈائری میں بہت سے اندراجات ٹیگور کے گیتوں کے ہیں اور یہ گیت انہیں بہت ہانٹ کرتے رہے۔ان کی ڈائری بھی زمانہ کے رواج کے مطابق انگریزی میں لکھی گئی ہے اور اب یہ اپنی خودنوشت میں اس کے مندرجات کو ترجمہ کر کر کے درج کرتی چلی جاتی ہیں۔

اپنے ناولوں اور بعد کو ریڈیو کے ایک آدمی سے شادی ہوجانے کی وجہ سے مخصوص ادبی حلقوں میں معروف رہیں۔انگریزی اخباروں میں کالم بھی لکھتی رہیں اس لئے ان کو استاد، ادیب اور صحافی ہونے کے سہ گونا فوائد حاصل رہے۔ہارورڈ کے اس سمر سیمینار میں شریک ہوئیں جس کا اہتمام ہنری کسنجر نے کیا تھا۔فلپائن اور تھائی لینڈ میں ثقافتی کانفرنسوں میں پاکستان کی نمائندگی میں شرکت کا انہیں موقع ملا۔اس طرح بین الاقوامی حلقوں میں ان کی جان پہچان ہوئی۔ان کے میاں اور ان کے ادبی دوست خصوصاً انور الحسن جعفری حتی المقدور انہیں آگے بڑھانے میں سرگرم رہے۔اور ان کی نوازشات کا ذکر انہوں نے بڑے تپاک اور خلوص سے کیا ہے۔

اپنے بھائی سرتاج عزیز سے تو انہیں عشق کی حدتک پیار ہے۔ تاجی نے بھی بہن کا مان رکھا اور ہر قدم پر اس کا ساتھ دیا۔ ادیبوں میں ممتاز شیریں اور حجاب امتیاز علی سے انہیں گہرا لگاؤ رہا۔ لاہور میں حجاب امتیاز علی کی قائم کردہ تنظیم ''من وسلویٰ'' سے وابستہ رہیں۔ اسلام آباد میں یہ تنظیم حجاب امتیاز علی کی ''بے وفا چڑیا'' ادا جعفری کی سرپرستی میں ''سلسلہ'' کے نام سے چلی مگر لوگ باگ اسے اعلیٰ افسروں کا ''سلسلہ'' ہی سمجھتے رہے کیونکہ اسلام آباد تو شہر ہی افسر شاہی کا ہے۔

ان کی خودنوشت میں جن ہمعصر ادیبوں کا بہت چرچا ہے۔ اتفاق یوں ہے کہ بیشتر ادیب افسری کے سلسلہ عشق میں منسلک ہیں۔ مختار مسعود اور عذرا، منظور الٰہی اور زہرا، نورالحسن جعفری اور ادا، قدرت اللہ شہاب (حیرت ہے عفت شہاب کا ذکر کسی سلسلہ میں نہیں آیا) آغا ناصر اور صفیہ، جمیل نشتر اور ان کی بیگم، اصغر بٹ اور نثار عزیز (اور ان میں سے کوئی بھی جائنٹ سکرٹری کے عہدے سے کم کا آدمی نہیں)۔ لاہور اور کراچی میں ہاجرہ مسرور اور احمد علی یا خدیجہ مستور اور ظہیر بابر کا ذکر سننے میں آجاتا ہے ورنہ عام ادیبوں کا ان کے خاص حلقہ میں گذر نہیں۔ ان کے سارے شناسا اور ملنے جلنے والے وہی ''سلسلہ'' کے افسر ہیں۔

سیاسی نظریات کے لحاظ سے یہ بھٹو صاحب کی بہت مداح رہیں اور ان کی پھانسی پر نوحہ بھی انہوں نے بہت کیا مگر پھر راضی بہ رضا ہو گئیں اور ضیاء الحق کے زمانہ میں بھائی کے وزارت پر فائز ہونے پر خوش بھی بہت ہوئیں۔ ضیاء الحق کے دور میں اور اس کے قلم سے نامزدگی کی وجہ سے فیلو شپ پر امریکہ کی سیاحت بھی کی۔ غرض وقت کے ساتھ ان کے خیالات میں اتار چڑھاؤ آتا رہا مگر اپنی پٹھان والی خودداری اور خودنگری انہوں نے ترک نہیں کی۔

ہم عصر ادیبوں میں انہیں قرۃ العین حیدر کا ہم پلہ کہلانے کا بہت شوق ہے۔ اور اپنا موازنہ اس سے کرتی رہتی ہیں۔ ''میں نے خود دیکھا ہے کہ قرۃ العین حیدر کو کم عمری میں ہی ادبی کامیابی حاصل ہو جانے سے اتنی مخاصمت اور اتنے تباہ کن رشک کا سامنا کرنا پڑا کہ اس کے چھکے چھوٹ گئے اور اس کی پوری شخصیت متاثر ہوگئی'' (صفحہ ۴۵۵)۔ انہیں اتنی شہرت نہ ملی تو ان کے حق میں اچھا ہی ہوا کیونکہ یہ تو ذرا ذرا سی بات پر برافروختہ ہو بیٹھتی ہیں۔ ''میری گمنامی کی وجہ میرا غصہ ہے'' (صفحہ ۵۷۹) ''لالہ' احمد

ندیم قاسمی نے ان کے ناول ''نے چراغے نے گلے'' کو اپنے ریویو میں ''پریم چند کے گئودان، احسن فاروقی کے شامِ اودھ، خدیجہ مستور کے آنگن اور قرۃ العین حیدر کے آگ کا دریا کے ساتھ شمار کیا'' (صفحہ ۴۲۳) تو بہت خورسند ہوئیں۔ اپنے اگلے ناول ''کاروانِ وجود'' کی تقریبِ رونمائی میں شریک ہوئیں اکبر حمیدی نے ان کے ناول کے سلسلہ میں امراؤ جان ادا کا نام لے دیا تو خوش ہوئیں۔ حالانکہ اس ناول کی فضا کا ان کے ناول سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ تعریف انہیں خوش آتی ہے اور ذرا سی بھی عدم توصیف کا شائبہ ہو تو ناراض ہونے لگتی ہیں۔

گئے دنوں کا سراغ ایسی خودنوشت ہے جس کی طوالت کو لباسوں کھانوں اور بناؤ سنگھار کے غیر ضروری ذکر اذکار کو کم کر کے قابو میں رکھا جا سکتا تھا مگر محترمہ نثار عزیز نے ماضی کی بھول بھلیوں سے انہی چیزوں کو برآمد کرنے میں خوشی محسوس کی ہے۔ ان کے پسندیدہ ادبی مباحث جہاں کہیں آئے ہیں کتاب کی فضا کو بوجھل بنانے ہی میں مد ہوئے ہیں۔ اے کاش لکھتے وقت انہیں اس بات کا خیال آتا کہ گذری ہوئی زندگی کی تفصیلات کو بہ تمام وکمال بیان کرنا ان کے قاری پر گراں بھی گذر سکتا ہے!

یوں لگتا ہے قرۃ العین حیدر کے لاہور کے دورے کے بیان کے بعد انہیں اپنی خودنوشت خود ختم ہوتی ہوئی محسوس ہوئی اور انہوں نے اسے اختتام پذیر کر دیا۔ ان کی خودنوشت کا آخری فقرہ ہے کہ ''انہوں نے وقت سے ہار نہیں مانی''۔ اے کاش ان کی یہ آرزو پوری ہو جائے!

میری داستان

حکومت پاکستان کے سکرٹری کے عہدہ سے وظیفہ یاب ہونے والے ایک سی ایس پی افسر کی خودنوشت ''میری داستان'' کے عنوان سے کراچی سے شائع ہوئی ہے۔ جناب محمد منصور کاظم ۱۹۵۵ میں سی ایس پی میں منتخب ہوئے۔ سول سروس اکیڈمی لاہور اور آکسفرڈ میں تعلیم وتربیت مکمل کی۔ پہلی پوسٹنگ مشرقی پاکستان میں ہوئی۔ مختلف مقامات پر ایس ڈی ایم، اے ڈی ایم اور ڈی سی رہے۔ مغربی پاکستان میں بھی متعدد اعلیٰ عہدوں پر کام کیا۔ ۱۹۷۱ کے پرآشوب دور میں مشرقی پاکستان میں ہوم سکرٹری کے طور پر متعین ہوئے اور سقوطِ ڈھاکہ کے بعد دوسال تک بیوی بچوں سمیت بھارت میں رنجِ اسیری کھینچا۔ واپسی کے بعد آزاد کشمیر کے چیف سکرٹری کے عہدہ پر بھی متعین رہے۔ چالیس سال کی ملازمت کے بعد وفاقی محتسب کے سکرٹری کے عہدہ سے وظیفہ یاب ہوئے۔ اپنی خداترسی اور قناعت کی وجہ سے، اپنے کام اور زندگی سے بے حد مطمئن رہے۔ شادم از زندگیءِ خویش کہ کارے کردم!

سی ایس پی کی سروس چونکہ آئی سی ایس کے خطوط پر قائم کی گئی تھی اس لئے اس میں شامل ہونے والوں کو تربیت دیتے وقت اس بات کا یقین دلا دیا جاتا تھا کہ وہ دوسروں سے اعلیٰ وارفع مخلوق ہیں۔ کاظم صاحب نے لکھا ہے کہ انگریز ڈائریکٹر مسٹر برجس نے ابتدا ہی میں ''اپنی تقریروں میں بتایا کہ ہم سب واضح اور نمایاں clearly and demonsterably superior برتری کے حامل ہیں'' (صفحہ ۹۸)۔ آئی سی ایس والے بھی اسی احساسِ برتری کے حامل لوگ ہوتے تھے۔ اس لئے ہمارے ہاں جن سی ایس پی یا آئی سی ایس لوگوں نے مثلاً الطاف گوہر اور قدرت اللہ شہاب یا سید ہاشم رضا نے خودنوشتیں لکھیں انہوں نے اپنے آپ کو عام عوام سے برتر مخلوق ہی جانا۔ ایک خودنوشت البتہ مسعود کھدر پوش کی نظر سے گذری جس کا مزاج امیرانہ نہیں تھا فقیرانہ تھا یا اب یہ خودنوشت سامنے آئی ہے جسے پڑھتے ہوئے لکھنے والے کی خداترسی کا تصور بندھتا ہے۔

کاظم صاحب طبیعت کے حلیم ہیں اس لئے تنقید بھی کرتے ہیں تو ان کا لہجہ بڑا دھیما اور مدھم ہوتا ہے مثلاً ایک ہندو آئی سی ایس افسر بی سی مکرجی کے بارہ میں (جن کے ساتھ ان کے والد محترم نے سول سروس میں کام کیا تھا) شہاب صاحب کی تنقید کا جواب بڑے مہذب طریق سے یوں دیا ہے کہ مکرجی ایک ''مثالی آئی سی ایس افسر تھے ان میں مذہبی تعصب بالکل نہیں تھا وہ ہندو اور مسلمان کی تفریق کو ذرہ برابر بھی گوارا نہیں کرسکتے تھے اس لئے وہ ہر طبقے میں ہر دل عزیز تھے۔ مشہور بیوروکریٹ اور سابق آئی سی ایس قدرت اللہ شہاب نے بھی کسی زمانہ میں ان کے ساتھ اڑیسہ میں کام کیا تھا۔ افسوس یہ رہا کہ شہاب صاحب نے ان کی انتہا درجہ کی مذہبی رواداری اور غیر جانب داری کو خراجِ تحسین پیش کرنے کی بجائے انہیں نیم ہندو اور لامذہب کے نام سے یاد کیا ہے، میرے والد صاحب کا ان کے ساتھ تجربہ اس کے بالکل برعکس ہے''۔ (صفحہ ۶۴) بات صرف زاویہءِ نگاہ کی ہے۔ شہاب صاحب کی نگاہ میں سوائے ان کی اپنی ذات کے اور کوئی نیک پاک وجود تھا ہی نہیں۔ ان کی نیکی کے معیار خودساختہ تھے جن کے حصار میں کسی دوسرے کی اچھائی داخل ہی نہیں ہوسکتی تھی۔

''میری داستان'' میں جو چیز کھٹکتی ہے وہ کاظم صاحب کی وہ مافوق الفطری باتیں ہیں جنہیں وہ شاہ مبارک صاحب کے نام سے منسوب کرتے چلے جاتے ہیں اور بالکل بھول جاتے ہیں کہ ان چیزوں کا روحانیت سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔ بہتیرے ایسے لوگ ہیں جو قیافہ شناسی سے دلوں کی بات جان لیتے ہیں۔ پھر شاہ مبارک صاحب نے ان کے ایک دوست کو کلکتہ سے نئی گھڑی ہاتھ کے ہاتھ منگوا کر پہنا دی (صفحہ ۵۸) اور کاظم صاحب اسے بہت بڑی کرامت جاننے لگے۔ شاہ مبارک صاحب بزرگ ضرور ہوں گے مگر ان کی بزرگی ایسی کرامتوں کی رہین منت نہیں ہوسکتی۔ ان کے والد صاحب کا خیال تھا کہ ''جنات یا کوئی دوسری غیر مرئی طاقتیں ان کے تابع تھیں'' (صفحہ ایضاً) کاظم صاحب تو اپنے والد کی ہر بات کو حرفِ آخر جانتے تھے اس لئے عین ممکن ہے ایسا ہی ظہور میں آتا ہو مگر ایسی کرامتوں کے لئے ہماری زبان میں ''شعبدہ'' کا لفظ موجود ہے جس کا روحانیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

سقوطِ ڈھاکہ کے بعد یہ اپنے اہل وعیال سمیت انٹرکانٹیننٹل میں ریڈکراس کی پناہ میں آگئے۔ ہوم سکرٹری جیسے عہدے کے افسر کا یہ لکھنا کتنا عبرت انگیز ہے ''فوج کے کھانے کے انتظام سے قبل دو

دنوں تک میں اور میرے اہلِ خاندان فاقے سے رہے۔ بچوں نے مجبوری کی حالت میں کوڑے پر پھینکے ہوئے ڈبل روٹی کے ٹکڑوں سے اپنی بھوک رفع کی۔ یہ مقام عبرت تھا جس کا تجربہ ہم سب کی قسمت میں لکھا تھا'' (صفحہ ۲۱۲) تلک الایام ندوالھا بین الناس. فاعتبروا یا اولی الابصار!!

سقوط کے بعد جیسور سے ہوتے ہوئے یہ بریلی پہنچے۔ جیسور میں یہ کسی زمانہ میں ڈپٹی کمشنر ہوا کرتے تھے وہیں سے اسیری کی حالت میں گذرے تو دل پر کیا کیا نہ گذر گئی۔ بریلی میں اسیری کے کیمپ میں بھی سول سروس کے ان لوگوں کو صرف دس روپے الاؤنس ملتا تھا مگر انہوں نے سب کچھ پامردی سے انگیز کرلیا ہے واویلا نہیں کیا۔ کاظم صاحب نے حمود الرحمن کمشن کے روبرو اپنا بیان ریکارڈ کروادیا تھا اس لئے خودنوشت میں اس مضمون کو نظرانداز کر گئے ہیں۔

میرے عزیز دوست کرنل اسلم اپنی اسیری کی داستانیں سناتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ جنرل (بعد کو فیلڈ مارشل) مانک شا ان کے کیمپ میں آئے تو ایک بوسیدہ سی از کاررفتہ گاڑی میں آئے۔ اسی کار میں ان کے ساتھ کئی اور سرخ فیتوں والے افسر ٹھسے ہوئے بیٹھے تھے۔ میں ان کی بات کو مذاق میں ٹال دیا کرتا تھا کہ بھلا فوجی جو شان وشوکت اور زرق برق رنگا رنگ لباسوں وردیوں فیتوں کے شوقین ہوتے ہیں ایسی حرکت کیوں کرنے لگے؟ مگر کاظم صاحب کی خودنوشت سے ان کی باتوں کی تصدیق ہو گئی کہ ان کے کیمپ میں ''کمانڈر انچیف جنرل مانک شا آئے۔ وہ ایک معمولی سی بوسیدہ کار میں آئے جس میں بجائے اسپرے پینٹ کے ہاتھوں سے رنگ سازی کی گئی تھی ان کے آنے میں کوئی طمطراق نہیں تھا بلکہ پوری سادگی نمایاں تھی'' (صفحہ ۲۱۵) ہمارے ہاں کے فوجیوں کا تام جھام اور تبختر دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ یوسفی صاحب کے قول کے مطابق ''ہندوؤں میں اسلامی سادگی پائی جاتی ہے'' مگر مانک شا تو پارسی تھے! شاید ہندوؤں میں رہ کر سادگی پسند ہو گئے ہوں؟

ان کی زندگی کے تجربات بھی متنوع اور فکر انگیز ہیں۔ انگلستان میں تربیت پر تھے کہ بیمار ہو گئے اور ہسپتال میں داخل ہوئے۔ اپنڈیکس کا اپریشن ہوا ہسپتال میں جس کمرہ میں تھے وہ بڑا شاندار کمرہ تھا ''ایک نرس نہایت مستعدی سے میری خدمت کرتی تھی۔ بعد میں دوسرے ہفتے ایک نئی نرس اس کی جگہ آگئی تو میں نے اس سے پوچھا کہ پہلے والی نرس کہاں ہے؟ اس نئی نرس نے جواب دیا کہ پہلے والی نرس ملکہ الزبیتھ کی چچازاد بہن اور شاہزادی تھی اور اس حیثیت سے بکنگھم پیلس میں ملکہ کے اہلِ

خاندان کے ساتھ رہتی تھی وہ یہاں تین مہینے کے لئے ایک نرسنگ سرٹیفکیٹ کورس کرنے کے لئے آئی تھی اور اس کورس کے مکمل ہو جانے کے بعد بکنگھم پیلس واپس چلی گئی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ایک ہفتہ تک میری خدمات کی ادائیگی کے دوران اس نرس نے کبھی اشارۃً بھی اپنے شاہی خاندان سے تعلق کا ذکر نہیں کیا'' (صفحہ ۱۱۳)۔

خواجہ ناظم الدین صاحب سے ان کی خاندانی شناسائی تھی۔ وہ ان کے نام سفارشی خط بھی لکھ دیا کرتے تھے اس کتاب میں ایک دو خطوں کی تصویری نقل بھی شائع کر دی گئی ہے۔ خواجہ صاحب کی سادگی اور سادہ زندگی کے بارہ میں ایسی معلومات پہلی بار میری نگاہ سے گذری ہیں۔ وہ گورنر جنرل رہے تھے مگر سرکاری ریسٹ ہاؤسوں میں ان کا ٹھہرنا نہیں ہوسکتا تھا جب انہوں نے انہیں جیسور کے سرکٹ ہاؤس میں ٹھہرادیا تو وہ ممنون ہوئے کیونکہ دوسرے ان کے مرتبے کو نظرانداز کر جاتے تھے کیونکہ لوگ تو چڑھتے سورج کے پجاری ہوتے ہیں ڈوبتے ہوئے سورج کی طرف کون آنکھ اٹھاتا ہے؟

جاوید شاہین کی خودنوشت پر لکھتے ہوئے میں نے ان کے اس لہجہ پر تنقید کی تھی جو انہوں نے اپنے والد محترم کے بارہ میں اختیار کیا تھا کہ ہمارے ہاں شرفا میں ماں باپ کے لئے تو تکار کی زبان استعمال نہیں کی جاتی۔ ابھی چند روز قبل جاوید شاہین سے یہاں کینیڈا میں ملاقات ہوگئی وہ اپنے بیٹے سے ملنے کے لئے کینیڈا آئے ہوئے ہیں۔ فرمانے لگے میں نے اپنے باپ کے بارہ میں جو لہجہ اختیار کیا ہے اس پر مجھے کوئی ندامت نہیں کیونکہ مجھے اس سے نفرت تھی۔ اس پر میں سوائے خاموش رہنے کے اور کیا کرسکتا تھا۔ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ کاظم صاحب کو اپنے والد صاحب سے عقیدت کی حد تک محبت ہے اور یہی ہمارے شرفا کا طریق تھا۔ باپ کی زندگی تک ڈپٹی کمشنر کے عہدے تک پہنچے تھے مگر باپ کے جوتوں کو پالش کرنا اپنے لئے فخر کی بات سمجھتے تھے ان کے والد صاحب کا یہ کہنا کتنا بھلا لگتا ہے کہ ''ان کو اللہ تعالیٰ نے یہ قسمت بخشی ہے کہ ایک ڈپٹی کمشنر ان کے جوتوں کی پالش کتنے انہاک سے کرتا ہے'' (صفحہ ۳۲۰) ان کی ایسی ہی صاف دلی سادہ دلی کی باتوں نے اس خودنوشت کو دلچسپ بنا دیا ہے اور زبان و بیان میں ادبی چاشنی نہ ہونے کے باوجود یہ خودنوشت لکھنے والے کی صاف گوئی اور خداترسی کا تاثر پیدا کرتی ہے۔ اے کاش ہمارے حاکم طبقے میں ان ایسے نیک دل لوگ زیادہ ہوتے۔

◎

میں باغی ہوں

مخدوم جاوید ہاشمی کی بلند بانگ دعووں سے اٹی پٹی خودنوشت ''ہاں! میں باغی ہوں'' کے عنوان سے ساگر پبلشرز لاہور کی جانب سے ۲۰۰۵ میں شائع ہوئی ہے۔ جاوید ہاشمی صاحب اس وقت بغاوت کے الزام میں لمبی سزا کاٹ رہے ہیں۔

جاوید ہاشمی پاکستان کی خانقاہی وڈیرہ شاہی کے ایک نسبتاً کم معروف خانوادہ کے فرزند ہیں۔ آپ نے اپنی اشتعال انگیز اور ہنگامہ آور سیاسی زندگی کا آغاز اسلامی جمعیت طلبہ کی سرپرستی میں کیا۔ ان کی شوریدہ مزاجی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ پرائمری سکول کی تیسری جماعت میں تھے کہ ایک ساتھی کو پیٹنے کے الزام میں تھانے سے بلاوا آ گیا۔ (صفحہ ۳۶) اسلامی جمعیت طلباء کو ان سے زیادہ شوریدہ سر پلا پلایا آدمی کہاں سے ملتا جو جمعیت کے تشدد پسند مزاج کے عین مین ہو بہو مطابق ہوتا اس لئے جمعیت نے ''اپنی پابندیوں کو نرم کرتے ہوئے براہ راست رکنیت دے دی'' (صفحہ ۶۷) اور کھلے دل سے اپنی صفوں میں انہیں جگہ دی۔ ان کے سر پر اپنا سرپرستانہ ہاتھ رکھا۔ جمعیت میں شمولیت سے ان کے لئے طلباء کی سیاست میں کامیابی کے دروازے کھل گئے۔

اس کتاب میں ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ''میں نے چالیس سال (۱۹۶۴۔۲۰۰۴) تک سول سوسائٹی اور آئین کی بالادستی کے لئے جدوجہد کی۔ کسی فرد یا جماعت نے جب بھی آمریت کے خلاف جنگ لڑنے کا اعلان کیا میں اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا'' (صفحہ ۲۰) مگر ملک پر اس کی تاریخ کی بدترین آمریت مسلط ہوئی تو اس ''آمریت کے خلاف'' ان کی اس جدوجہد کا آغاز اس طرح ہوا کہ یہ ضیاء الحق سے پہلی ہی ملاقات میں ''معاملات پر کنٹرول حاصل کرنے کی غرض سے'' لپک کر اس کی کابینہ میں شامل ہو گئے (صفحہ ۱۴۴) اور ''کابینہ میں شمولیت کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ مجھے فوجی قیادت کے عزائم کو سمجھنے اور اندرونی حالات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا'' (ایضاً)۔ ان کے قول اور فعل کا یہ تضاد ان کی

شخصیت کا جزو لاینفک ہے۔ اور قول و عمل میں ایسے ظاہر و باہر تضاد والا شخص یہ دعویٰ کرے کہ ''ہاں میں باغی ہوں''، تو پڑھنے والا ایک خندہ ءاستہزاء کے علاوہ اور کیا کر سکتا ہے؟

ضیاء الحق کے ساتھ تو ان کی وابستگی محض وزارت تک محدود نہیں رہی۔ وہ تو انہیں پاکستان کا مستقبل گردانتے تھے۔ ایک دعوت میں ضیاء الحق نے سیٹھ داؤد کا ہاتھ پکڑ کر ان سے مصافحہ کروایا اور کہا ''سیٹھ تم پاکستان کے مستقبل سے ہاتھ ملا رہے ہو'' (صفحہ ۱۳۰)۔ ان کے کردار کا یہ تضاد سول حکومتوں کے ساتھ وابستگی کے دوران بھی قائم رہا۔ نواز شریف کی جمہوری حکومت نے جو آئینی دھاندلیاں روا رکھیں اور توہین رسالت اور شریعت بل کی صورت میں ملک پر ملائیت مسلط کر کے اپنی گرفت قائم کرنے کی کوششیں کیں تو مخدوم صاحب تابعداری کے ساتھ ان کا ساتھ دیتے رہے مگر یہ دعویٰ کرنا نہیں بھولے کہ ''تیرھویں ترمیم، توہینِ رسالت اور شریعت بل پر میرا اپنا موقف تھا'' (صفحہ ۱۲۶)۔ اس موقف کے باوجود آپ نے ان بلوں کی توثیق کے لئے ووٹ دیا تو یا آپ کا موقف دیانتدارانہ نہیں تھا یا آپ خود دیانت دار نہیں تھے۔ ہاں آپ کی اس بات میں ضرور وزن ہے کہ ہم ''میں سے ہر ایک باون گزا ہے'' (صفحہ ۱۳۹) اور اپنے سامنے کسی کو کچھ نہیں گردانتا۔

ان کے دعوے کے مطابق ''میاں نواز شریف نے میرے ساتھ مل کر سیاست میں حصہ لینے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں تو حزبِ اختلاف کی سیاست کر رہا ہوں تو انہوں نے کہا کہ میں اس سیاست کے لئے تیار ہوں'' (صفحہ ۱۲۵) نواز شریف کو بھی انہوں نے ''حزبِ اختلاف کی سیاست کی'' اسی راہ پر لگا دیا اور انہیں وزیر بنوا دیا ''کچھ دوسرے دوستوں کی طرح میری خواہش تھی کہ میاں صاحب صوبے میں وزیر بن جائیں۔ یہ کوشش کامیاب رہی۔۔۔ لیکن اسی اثناء میں اقتدار سے الگ ہو گیا'' (ایضاً)۔ ان کا یہ ڈھنگ ضیاء الحق کا سکھایا ہوا ڈھنگ ہے ''جنرل ضیاء الحق ہمیشہ مجھ پر مہربان رہے، مجھے بار بار کہا کہ اس ملک کی سیاست اسٹیبلشمنٹ کے سوا کچھ نہیں آپ کو اقتدار میں رہنا چاہئے۔ انہوں نے مجھے وزیر اعلیٰ پنجاب بنانے کے لئے کوشش کی'' (صفحہ ۱۱۶) معلوم ہوتا ہے کہ ''مخدوم'' جاوید ہاشمی سے چوک ہو گئی تو ان کے ''خادم'' میاں نواز شریف نے لپک کر اس سنہرے اصول کو اپنا لیا اور اقتدار میں رہنے اور زندگی کرنے کا گر سیکھ لیا۔

ضیاء الحق نے غیر جماعتی انتخابات کروائے تو آپ بھی منتخب ہوئے۔ اس انتخاب کے بارہ میں فرماتے ہیں ''اسمبلی کے تمام ممبران کی فائلیں ایجنسیوں نے تیار کر رکھی تھیں۔ پارلیمنٹ میں افراد کی بجائے یہی فائلیں پہنچی تھیں''۔۔۔''یہ شفاف فائلیں قوم کی نمائندگی کر رہی تھیں'' مگر یہ لکھنے کے بعد انہیں خیال ہوا کہ وہ خود بھی تو منتخب ہوئے تھے۔ اس لئے اپنے آپ کو مستثنیٰ کرنے کو رقم طراز ہیں ''ہم جیسے چند اجنبی لوگ حریم ناز میں داخل ہو کر شور وغوغا برپا کر رہے تھے'' (صفحہ ۲۴۳) ''ضیاء الحق اسمبلی میں خطاب کرنے کے لئے آئے تو میں نے فلور پر کھڑے ہو کر کہا آپ پارلیمنٹ کے لئے اجنبی ہیں۔ آپ کو خطاب کرنے کا کوئی حق نہیں''۔ (صفحہ ایضاً) او وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ ونام ہے!۔ خدا معلوم کون اجنبی تھا کون اجنبی نہیں تھا۔ جس شخص کی ایجنسیوں نے انتخابات کروائے تھے اور لوگوں کی فائلوں کے بل بوتے پر انہیں پارلیمنٹ میں لے آیا تھا وہ کیسے اجنبی ہو سکتا ہے؟ جب تک مخدوم صاحب اس کی کابینہ میں وزیر تھے اس وقت تک تو وہ اجنبی نہیں تھے! ان کی سیاست کی بنیاد سید مودودی کے اسی ''فلسفہء مستحب'' پر رکھی ہوئی ہے۔ ہو سکتا ہے اسٹیبلشمنٹ نے انہیں اسی لئے منتخب کروایا ہو کہ اسمبلی میں دکھاوے کا اختلاف کرنے والا کوئی تو ہو۔

مخدوم جاوید ہاشمی صاحب کو اپنے بہت کم عمری میں وزیر بن جانے کا بہت زعم ہے اور آپ نے اس کا بہت چرچا کیا ہے۔ وزارت پر فائز ہوتے وقت میں ''ساڑھے اٹھائیس سال کا تھا۔ مجھ سے پہلے نواب اکبر بگٹی کم عمر ترین وزیر تھے۔ وہ تیس سال کی عمر میں ریپبلکن پارٹی کی حکومت میں دفاع کے وزیر مملکت بنے۔ دوسرے نمبر پر ذوالفقار علی بھٹو تھے جو تیس سال کی عمر میں سکندر مرزا کی حکومت میں بہ طور وزیر شامل ہوئے'' (صفحہ ۱۴۳)۔ جی ہاں کم عمری میں وہی وزیر بنائے جاتے ہیں جن کی وفاداریاں مشکوک نہیں سمجھی جاتیں۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ لوگ بڑے ہو کر وفاداریاں بدل لیا کرتے ہیں۔

مصطفیٰ کھر سے انہیں خدا واسطے کا بیر لگتا ہے۔ انہیں طعنے دیتے ہیں کہ ''مصطفیٰ کھر کی سیاست میں اپنی کوئی بنیاد نہیں تھی'' (صفحہ ۶۲) ''مصطفیٰ کھر ہماری سیاست کا ایسا کردار ہے جو ہمیشہ کسی کندھے کی تلاش میں رہتا ہے جس پر چڑھ کر وہ قد آور نظر آئے'' (صفحہ ۶۵) مگر میں سوچ رہا ہوں کہ اگر مصطفیٰ کھر جاوید ہاشمی کے بارہ میں لکھے گا تو یہی باتیں لکھے گا۔ ہم لوگ اپنی آنکھ کا شہتیر نہیں دیکھتے

دوسروں کی آنکھ کا تنکا ہمیں دکھائی دیتا ہے۔

یوں تو اس کتاب کی ذہنی سطح ملک کی سطحی سیاسی سوچ سے اوپر نہیں اٹھ سکی مگر ایک دو جگہ آپ نے بین الاقوامی سطح کے لوگوں کے حوالے دے کر نواز شریف کا دفاع کرنے کی کوشش کی ہے۔ کارگل کے موقع کا حوالہ دیتے ہوئے ایک تو انہوں نے ترکی کے بلند ایجوت صاحب کے خدشات کا حوالہ دیا ہے ''واپسی تک آپ کی حکومت ہو گی بھی یا نہیں میں کارگل کے حالات دیکھ رہا ہوں'' (صفحہ ۱۳۴) ۔۔۔اور پھر ثبوت دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''کارگل کے سانحے کے بعد ہماری حکومت ختم ہو گئی۔ پرویز مشرف جو اتاترک کے پیروکار ہیں کی حکومت قائم ہو گئی'' (صفحہ ۱۳۵)

جاوید ہاشمی صاحب نے نواز شریف کی پالیسیوں کا دفاع کرتے ہوئے ایک فقرہ بڑے مزے کا لکھا ہے کہ نواز شریف نے ''باوقار طریقہ اختیار کیا اور ہندوستان کے وزیر اعظم کو بس پر بیٹھ کر لاہور آنا پڑا'' (صفحہ ۱۱۹)۔ مگر مخدوم صاحب کے نزدیک فوج نے کارگل کی کارروائی کے ذریعہ نواز شریف کی کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ کیوں کر پانی پھیر دیا اس بات کی کوئی دلیل کتاب میں موجود نہیں نہ ان کی تقریروں میں بیان ہوئی ہے۔ پچھلے دنوں ایک پاکستانی جرنیل یہاں ٹورنٹو تشریف لائے ہوئے تھے ان کے منہ سے ہم کارگل کے بارہ میں وہ کچھ سن چکے ہیں جو خود ''گھوڑے کے منہ'' سے سنا جا سکتا ہے کیونکہ مذکورہ جرنیل اس سارے آپریشن میں اگلی صفوں میں تھے۔ اس لئے ہمیں تو جاوید ہاشمی صاحب کی باتوں کی زیادہ سمجھ نہیں آئی کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں اور کیوں کہہ رہے ہیں۔

آپ نے نواز شریف کی اس ''تاریخی جدوجہد'' کے باب میں جنرل زینی اور ٹام فرینکس کی کتابوں کے حوالے دیئے ہیں جو میری دسترس میں نہیں اس لئے میں ان کے مالہ وماعلیہ کے بارہ میں کچھ کہنے سے قاصر ہوں۔ میرے سامنے تو صدر کلنٹن کی خودنوشت ''میری زندگی'' کھلی پڑی ہے۔ جس میں لکھا ہے ''نواز شریف نے فون کیا کہ وہ ۴ جولائی کو امریکہ کے دورے پر آنا چاہتے ہیں تا کہ جنرل پرویز مشرف کی کمان میں پاکستانی فوج نے کشمیر میں لائن آف کنٹرول کو عبور کر کے ہندوستان کے ساتھ تصادم کی جو خطرناک صورت حال پیدا کر دی ہے اس پر بات چیت کر سکیں'' (صفحہ ۵۳۰)۔ ہمیں تو اس بات کی ہی سمجھ نہیں آئی کہ یہ کیسا ''مقتدر اور لامحدود مینڈیٹ والا وزیر اعظم'' ہے جو امریکہ کے

صدر کو "شکایت کرنے" یا باور کروانے جا رہا ہے کہ میری فوج کے سربراہ نے میری مرضی کے خلاف حد بندی لائن کو عبور کر کے یہ مسئلہ کھڑا کیا ہے؟ کلنٹن صاحب نے اس بات کا بڑا مضحکہ اڑایا ہے اور کہا ہے ممکن ہے "وزیر اعظم نے یہ حملہ کرنے کی اس لئے اجازت دی ہو کہ امریکہ کو اس معاملہ میں شامل کرنے کا موقعہ پیدا کیا جا سکے" یا یہ بھی "عین ممکن ہے وزیر اعظم نے ہمہ مقتدر فوج سے دشمنی مول لینے کی بجائے اسے حملہ کرنے کا اختیار دے دیا ہو" (صفحہ ایضاً)۔ دونوں صورتوں میں نواز شریف کی سیاسی بصیرت کی کوئی اچھی تصویر مرتب نہیں ہوتی۔ جاوید ہاشمی صاحب کس بات کا دفاع کر رہے ہیں؟ اور مرے پر سو درے۔ جب امریکی صدر نے کہا کہ چار جولائی کے تاریخی دن کو آپ کا آنا صرف اس صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ آپ پہلے اس بات کا یقین دلائیں کہ کارگل سے آپ اپنی فوجیں حتمی طور پر واپس بلا لیں گے اور ہمارے وزیر اعظم نے اس بات کا پیشگی یقین دلایا کہ جناب ہماری توبہ! ہم اپنی فوجیں واپس بلا لیں گے۔ اگر نواز شریف صاحب چار جولائی کو نہ جاتے تو کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑتا؟ بات تو انہیں پھر بھی کلنٹن صاحب کی ماننا پڑتی مگر عزت تو رہ جاتی۔

کلنٹن صاحب کی خودنوشت کے مطابق اس دورہ میں جناب نواز شریف کے ساتھ ایک معاہدہ کے مطابق "ساٹھ آدمیوں کی ایک کمانڈو فورس بھی قائم کی گئی جس کا مقصد افغانستان کے اندر جارحانہ کارروائی کر کے اسامہ بن لادن اور اس کے ساتھیوں کو قتل کرنا تھا۔ (صفحہ ۵۳۱) ہمارے ممدوح جاوید ہاشمی صاحب کی اس خودنوشت میں ہی لکھا ہوا ہے کہ "۱۹۹۲ میں نواز شریف نے مکہ مکرمہ میں بیت اللہ کے سامنے نوافل ادا کرنے کے بعد خادمین حرمین شریفین شاہ فہد کی موجودگی میں افغان مجاہدین اور رہنماؤں سے مل کر کام کرنے کا عہد کیا تھا" (صفحہ ۱۵۳)۔ (ارے یہ کیا اتفاق ہے کہ ان صفحات کے ہندسے وہی ہیں صرف ترتیب مختلف ہے)۔ اب جب امریکہ کا قدم درمیان میں آ گیا تو سب وعدے وعید دھرے رہ گئے کیونکہ وہ وعدے تو "نوافل" ادا کرنے کے بعد کئے گئے تھے یہ کمانڈو فورس "فرض" ادا کرنے کے بعد قائم کی گئی۔ کلنٹن صاحب نے اس سے جو نتیجہ نکالا ہے وہ بالکل درست ہے کہ "شریف صاحب اس لئے تشریف لائے تھے کہ امریکہ کا دباؤ استعمال کر کے اپنی فوج کو اس صورت حال میں پیچھے ہٹنے پر آمادہ کر سکیں" (صفحہ ۵۳۱)۔ کلنٹن صاحب نے to provide

himself a cover کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ آپ خود ہی بتائیں کہ جو وزیر اعظم اپنی فوج کے کمانڈر کو کوئی جائز حکم دینے سے قبل بھی امریکی صدر کی پناہ ڈھونڈتا ہے وہ کیسا وزیر اعظم ہے؟ کلنٹن صاحب نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ نواز شریف کے اقتدار سے ہٹائے جانے کا نقصان یہ ہوا کہ یہ کمانڈو منصوبہ ترک کرنا پڑا۔ مگر نواز شریف کو کلنٹن دوستی کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ کلنٹن صاحب نے پاکستان کے مختصر سے دورہ میں نئے حکمران پرویز مشرف سے یہ یقین دہانی حاصل کر لی کہ نواز شریف کی جان نہیں لی جائے گی۔

مخدوم جاوید ہاشمی کی اس سرگزشت میں ان کی کئی پارلیمانی تقریریں بھی شامل ہیں جن کا ان کی سوانح سے کوئی تعلق نہیں۔ اپنی بیٹی کے نام اپنے خطوط بھی انہوں نے شامل کر دئے ہیں مگر ان خطوط میں کہیں نہ کہیں ان کی سرگزشت کے تانے بانے مل جاتے ہیں۔ آخری حصہ تو مقدمہ بغاوت کی کارروائی پر مشتمل ہے اور حرفِ مزید کے طور پر کچھ پارلیمنٹ میں کی گئی تقریروں کے اقتباسات پر کہ انہیں خطابت کا بہت شوق ہے۔ مجموعی طور پر اس سرگزشت سے کسی کھلنڈرے طالب علم رہنما کی سر گزشت کا تاثر تو ضرور ابھرتا ہے کسی بالغ نظر سیاسی رہنما کی سرگزشت کا تاثر پیدا نہیں ہوتا۔

◎

لوحِ ایام

مختار مسعود کی ''لوحِ ایام'' انقلابِ ایران کا منظر نامہ ہی نہیں انقلاب اور فلسفۂ انقلاب کے موضوع پر ایک اہم دستاویز ہے جس میں صرف ایران کا انقلاب ہی موضوع نہیں رہا دیگر انقلاباتِ زمانہ بھی درآئے ہیں اور مختار مسعود کا قلم انہیں بھی سمیٹتا لپیٹتا چلا گیا ہے۔ موضوعی اعتبار سے ''لوحِ ایام'' مختار مسعود کی خودنوشت معلوم دیتی ہے اسی لئے میں اسے اس تجزیہ میں شامل کر رہا ہوں۔ جملہ ہائے معترضہ کی صورت میں پاکستان اور تیسری دنیا کے تمام مسائل بھی جابجا معرضِ اظہار میں آئے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے یہ کتاب عام عوام میں زیادہ پڑھی جا رہی ہے۔ اور اس مضمون کا مقصد بھی انہی زوائد کا جائزہ لینا ہے جن کی موجودگی نے اس کتاب کو نہایت دلچسپ اور دلآویز بنا دیا ہے۔

مختار مسعود اپنے خاندانی پس منظر کے لحاظ سے بھی ایک نہایت سلجھے ہوئے ادیب اور مفکر ہیں۔ ان کے والد قبلہ شیخ عطاء اللہ علی گڑھ کے نامور اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ راقم الحروف کو ان سے نیاز مندی کا شرف اس زمانہ میں حاصل ہوا جس زمانہ میں وہ ہمارے پڑوس میں اسلامیہ کالج چنیوٹ کے پرنسپل کی کرسی کی عزت افزائی کے لئے چنیوٹ میں قیام فرما تھے۔ یہاں چنیوٹ جیسے تاجروں کے شہر میں بیٹھ کر علی گڑھ، سرسید اور شبلی کی یاد تازہ رکھنا انہیں کو سزاوار تھا۔ قبلہ شیخ صاحب چنیوٹ میں بھی اپنے علمی مشاغل سے کنارہ کش نہ ہوئے بالکل اسی طرح جس طرح مختار مسعود آر سی ڈی کے سکرٹری جنرل کی کرسی پر بیٹھ کر بھی اپنی ادبی سرگرمیوں میں غرق رہے۔ یہ علمی ذوق مختار مسعود کو ورثہ میں ملا ہے۔ قبلہ شیخ عطاء اللہ کی حب رسول کا عالم مختار مسعود نے سفر نصیب میں بیان کیا کہ ان کی خواہش تھی کہ مرنے کے بعد ان کی قبر غازی علم الدین شہید کے مزار کے قرب میں بنے۔ الحمد للہ کہ ان کی یہ خواہش پوری ہوئی۔ مختار مسعود علی گڑھ کی پیداوار ہیں اور علی گڑھ نے ان کے علمی ذوق کے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔ ملازمت کے لحاظ سے بھی مختار مسعود اس سروس کے رکن ہیں جس کے بعض

ارکان کا شمار دنیا کے نامور علما اور مستشرقین میں ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو ملازمت کے سلسلہ میں جہاں جاتے وہاں کے گزیٹر لکھتے اور تاریخ کو محفوظ کرنے کا کام کیا کرتے تھے۔ مختار مسعود نے انقلاب ایران کے زمانہ کا گزیٹر ہی مرتب نہیں کیا اس میں ادبی چاشنی اور علمی ذائقہ بھی پیدا کر دیا ہے۔

کشور ناہید نے اپنے کسی کالم میں مختار مسعود کے بارہ میں یہ لکھا تھا کہ وہ ملازمت کے دوران اپنے ادیب ساتھیوں سے رابطہ رکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس کی بات ٹھیک ہوگی مگر ہمارا اپنا تجربہ یہ ہے مختار مسعود زمانہ مابعد ملازمت میں بھی اسی سنت پر عمل پیرا ہیں۔ ہم نے مختار مسعود کے باپ کو دیکھا ہے کہ اپنے علمی کام میں ہمہ تن مصروف ہیں اور کسی جانب نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتے جو شخص ایسی میراثِ پدر کا وارث اور شاد مان میں ''العطا'' کا مکیں ہو اس سے کسی اور شے کی توقع رکھنا بے جا ہے۔ ہاں اس بات کی بھی داد دینا چاہئے کہ اگر انہیں سقم پر متنبہ کیا جائے تو فوراً توجہ کرتے ہیں۔ ''سفر نصیب''، چھپی تو اس میں ایک جگہ جاپانی کھانوں کے سلسلہ میں ایک کھانے کا نام ''ساشینی'' لکھا تھا۔ ہم نے انہیں خط لکھا کہ بھائی میرے اس کھانے کا نام ''ساشیمی'' ہے۔ اس وقت مختار مسعود آر سی ڈی کے سکرٹری جنرل تھے۔ وہاں سے جواب آیا کہ متنبہ کرنے کا شکریہ نوٹس پاکستان میں پڑے ہیں دوبارہ دیکھوں گا اور درست کر دوں گا۔ معمولی سی بات تھی مگر ہم نے اپنی رو میں لکھ دیا اور مختار مسعود نے جواب دیا۔

اس کے بعد ایک خط ہم نے ''لوحِ ایام'' کے سلسلہ میں لکھا ''پاکستان کے شراب کے تاجر مینو بھنڈارا صاحب'' ان کے پاس ایران پہنچے اور ان سے کہا کہ آپ پاکستان کی وزارتِ تجارت کے سربراہ رہ چکے ہیں اس لئے آپ کے تعلقات ایران کی وزارت تجارت والوں سے ہوں گے۔ پاکستان کی پیدا کردہ شراب پر جو پابندی لگی ہے وہ نرم کروا دیں۔ اس جگہ مختار مسعود نے ان کی اس بات پر ''در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید!'' کی پھبتی کہی ہے۔ ہم پھڑک گئے اور داد دی۔ جواب ندارد۔ سی ایس پی افسران تو جا و بیجا داد کے اتنے عادی ہو جاتے ہیں کہ انہیں ایسی ادبی داد کا دماغ ہی نہیں ہوتا حالانکہ ہمارا خیال تھا کہ فارسی مصرعہ کے اس برمحل استعمال پر انہیں داد کم ہی ملے گی کیونکہ ہمارے ہاں ادبی ذوق رکھنے والوں کے ہاں سے فارسی کا ذوق عنقاء ہوتا جا رہا ہے۔ ہمارے ہاں کلاسیکی اردو نثر لکھنے والوں میں اب صرف شیخ منظور الٰہی رہ گئے ہیں یا ایک حد تک مختار مسعود۔ ان لوگوں کے بعد ''اب

انہیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر'' کا مضمون ہوگا۔ جس طرح صوفی تبسم کی فارسی شاعری کے بعد فارسی شاعری کی صف لپٹ گئی اب کہیں خال خال کوئی فارسی میں شعر کہتا نظر آتا ہے تو لگتا ہے کوئی انہونی بات ہو رہی ہے۔

حقیقت حال یہی ہے کہ ہمارے نئی نسل کے بیشتر ادیب اور شاعر فارسی سے نابلد محض ہیں اور اسے کوئی زیاں بھی نہیں سمجھتے۔ وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا۔ کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا۔

لوح ایام کے آغاز میں پاکستان اور ایران کے تعلقات کا ذکر ہے مگر وہاں جانے کی تیاریوں کے سلسلہ میں جہاں مختار مسعود نے مختلف کتابوں کے مطالعہ اور مختلف لوگوں سے ملاقات کا ذکر کیا وہاں مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کی پیش بینی بھی کر دی ہے مثلاً اپنے پیشرو مسعود نبی نور کا یہ قول بھی درج کر دیا ہے کہ ''بس ایک چھوٹا سا کام آپ کے ذمہ کرنا ہے وہ یہ کہ شہنشاہ ایران کو تخت سے اتارنا ہے۔ آپ چار سال کے لئے ایران جا رہے ہیں خاصی طویل مدت ہے اس عرصہ میں یہ کام ہو جانا چاہئے'' (صفحہ ۲۹۔۳۰) یعنی مختار مسعود ذہنی طور پر اس سارے انقلاب کے لئے پہلے ہی تیار تھے۔ جو کچھ بعد میں پیش آیا وہ بہر حال ہونا ہی تھا۔ مختار مسعود نے ایک امریکن ناول ''کریش ۷۹'' کا حوالہ بھی دیا ہے کہ ''یہ ایران کے مستقبل کے بارہ میں ایک فرضی کہانی ہے لکھنے والے نے بڑی تحقیق اور محنت کے بعد یہ ناول لکھا ہے'' (صفحہ ۶۵) اور یہ کہ ''اس ناول میں شاہنشاہ ایران کے زوال کی پیشگوئی کی گئی تھی اور وہ اسی صورت میں پوری ہوئی''۔ راقم الحروف نے متذکرہ ناول ''کریش ۷۹'' پڑھا ہے اس میں شاہ ایران کو ایسے جنونی کے طور پر پیش کیا گیا ہے جسے دنیا بھر کے تیل کے ذخائر کو اپنی تحویل میں لے لینے کا جنون ہے اور وہ اس مقصد کے حصول کے لئے سعودی عرب اور دوسرے ممالک کے تیل کے ذخائر کو ختم کرنے کے لئے ایٹمی طاقت بننا چاہتا ہے اور اسی ایٹمی طاقت کے بے جا اور غیر ماہرانہ استعمال کی وجہ سے ایٹمی تباہی کا شکار ہو جاتا ہے۔ میں نے یہ ناول پڑھنے کے بعد اسے قبلہ شیخ منظور الٰہی کو بھیج دیا کہ پڑھنے کے بعد مختار مسعود کو دے دیں جنہوں نے میری دانست میں یہ ناول پڑھا نہیں محض اس کا تذکرہ دوسروں سے سنا ہے اور اس پر ایمان لے آئے ہیں۔ کریش ۷۹ کا ایران کے

واقعات سے صرف اتنا ہی تطابق ہے کہ اس ناول میں ۱۹۷۹ میں شاہنشاہ ایران کی تباہی کا ذکر ہے اور بس! کریش کے فارسی ترجمہ میں جو معنویت پوشیدہ ہے کہ ''اچانک اور بلند دھماکے کے ساتھ ریزہ ریزہ ہو جانا'' یہ بھی ایٹمی دھماکے کی جانب اشارہ ہے۔ ایٹمی دھماکے اور انقلاب میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

لوح ایام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں یادنگاری کے اصول کے تحت بات سے بات نکلتی ہے اور یادوں کے تانے بانے ماضی کی باتوں سے ملتے چلے جاتے ہیں ''یادوں کی توزک'' لکھنے کے سارے امکانات تو مختار مسعود نے اپنے ''ضروری اور غیر ضروری کاغذات کو سپردِ آتش'' کر کے ختم کر دئے مگر ذہن میں کلبلاتی یادوں کو بھلا کس نے گرفت میں لیا اور پابند کیا ہے؟ جہاں تہاں یلغار کرتیں اور کتاب کو دلچسپ سے دلچسپ تر بناتی چلی جاتی ہیں۔ معز الدین احمد کی بیان کردہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ ایران کا وفد ۱۹۴۴ میں علی گڑھ کے دورہ کے بعد برطانوی ہند کے دورہ پر چلا تو وہ افسر رابطہ کے طور پر ساتھ تھے۔ ہر جگہ علی گڑھ کے پروفیسر ہادی حسن ترجمانی کی غرض سے پہنچ جاتے تھے اور وفد ان سے بہت تنگ آیا ہوا تھا۔ ان سے کہا بھی کہ بہت ہو چکی اب بس کیجئے مگر ہادی حسن صاحب نہ رکے۔ ایک جگہ شہد کی مکھیوں نے ڈاکٹر ہادی حسن پر ہلہ بول دیا اور وہ سوجھے ہوئے منہ سے واپس ہو گئے۔ وفد میں سے ایک نے معز الدین احمد سے کہا ''جو کام ایک آئی سی ایس افسر رابطہ سے نہ ہو سکا وہ بالآخر شہد کی مکھیوں نے کر دکھایا!''۔ معز الدین احمد بھی آخر ایک نابغہ روزگار خاندان کے فرد تھے کہنے لگے ''جناب سورہ النحل کی رو سے شہد کی مکھیوں کو پروردگار کی طرف سے وحی آتی ہے۔ میرا ان سے کیا مقابلہ؟'' (صفحہ ۲۰)۔ اس کے مقابل پر دو سی ایس پی افسران کی ذہانت و فطانت (فتانت لکھنا شاید زیادہ بہتر ہو) کا ذکر بھی ہے۔ ''سقوط مشرقی پاکستان کے بعد بھی یحییٰ خاں بچے کھچے پاکستان کے صدر رہنے پر مصر تھے۔ ایک ریٹائرڈ جنرل کا کہنا ہے کہ جب یحییٰ نے اس خواہش کا اظہار کرتے ہوئے اپنے چند مشیروں سے مشورہ طلب کیا تو اس کی پرزور تائید کرنے والے دو سول افسروں کا تعلق محکمہ دفاع اور محکمہ اطلاعات سے تھا۔ ایک نے کہا عوام کا حافظہ کمزور ہوتا ہے ہم ٹی وی پر ایسے دلچسپ پروگرام دکھائیں گے کہ لوگ مشرقی پاکستان کو بھول جائیں گے۔ بریں عقل و دانش بباید گریست!'' (صفحہ ۵۵)

افسروں کے موازنہ سے انہیں حکمرانوں کا موازنہ یاد آتا ہے کہ ''اردشیر نے جس فیاضی سے

بادشاہت تقسیم کی تھی اس کا اصل مقصد شہنشاہی حاصل کرنا تھا۔ لیکن اردشیر کی نیت پر شبہ کرنا درست نہ ہوگا۔ اسے آخر اس جھنجھٹ میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ آسان طریقہ یہ تھا کہ اس کی نامزد کابینہ ایک متفقہ قرارداد منظور کرتی اور وہ گھر بیٹھے فیلڈ مارشل اردشیر بن جاتا'' (صفحہ ۶۲) اور شاہی محلات کا ذکر انہیں پاکستان کے صادق گڑھ پیلس میں لے جاتا ہے''ایک ایسی تقریب تھی جس کی خاطر رات بھر کے لئے بریگیڈیر محمد افضل، ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر، منظور الہی، کمشنر بہاولپور، مسعود محمود ڈی آئی جی پولیس اور مجھے ایک سنگ مرمر کے مہمان خانہ میں ٹھہرنا پڑا۔ ایک چھوٹا سا محل تھا جس میں دالان کے چاروں کونوں پر چار آپارٹمان بنے ہوئے تھے نواب بہاولپور کا مہمان خانہ تھا۔ راجوں مہاراجوں کے ٹھہرنے کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ ہر شے پرانی قیمتی اور ضرورت سے ذرا زیادہ آرام دہ تھی۔ کروٹ لو تو سنہری پلنگ جھولے کی طرح جھولتا تھا۔ گدا اتنا نرم کہ سونے والا دھنس جائے۔ دلائی اور تکیے میں مرغابی کے پر بھرے ہوئے تھے۔ پردے مخملیس یا بنارسی۔ قالین کلاں اور دبیز۔ مجھے اس بات سے سرسری دلچسپی تھی کہ نوابوں کے مہمان خانے کیسے ہوتے ہیں اس لئے وقت ضائع کئے بغیر قالین پر چادر بچھائی اور سو گیا۔ صبح ہوئی۔ ہم چاروں ڈرائینگ روم میں جمع ہوئے۔ منظور الہی اور میں خاموش رہے۔ مسعود محمود کا رویہ ایسا تھا جیسے انتظامات ان کے معیار زندگی کے عین مطابق ہوں'' (صفحہ ۳۶۷۔۳۶۸)

مسعود محمود کا ذکر ساواک کے ظلم وستم کے ذکر میں ایک بار پھر ہوا ہے''ساواک نے قیدیوں کی چیر پھاڑ کرنے کے لئے جو درندے پالے ہوئے تھے ان میں ایک خونخوار ریچھ اتنا مشہور تھا کہ اسے بعض بین الاقوامی تحریروں میں بھی جگہ ملی تھی۔ اہلِ پاکستان آج تک کراچی کی تفتیشی پولیس کے ان چوہوں کو نہیں بھولے جو سن پچاس کے آغاز میں ایک خوش شکل نوجوان پولیس افسر کے حکم سے کسی کی شلوار میں چھوڑے گئے تھے۔ کراچی کے چوہوں کو وہی یاد رکھتے ہیں جنہیں تہران کے ریچھ سے واسطہ نہ پڑا ہو۔ کراچی والے واقعے کے تقریباً پچیس برس بعد وہی پولیس افسر ایک وزیر اعظم کے خلاف وعدہ معاف گواہ کی حیثیت سے پیش ہوئے۔ اس مرتبہ چوہے کا کام وہ خود کر رہے تھے'' (صفحہ ۳۸۲)۔ مگر سارے پولیس والے ایسے نہیں ہوتے''راولپنڈی کے فلیش مین ہوٹل میں ایک ملاقات فیض احمد فیض سے ہوئی میرے علاوہ صرف زیڈ اے بخاری موجود تھے۔ فیض صاحب کا موڈ بہت اچھا تھا اور وہ کھل کر

باتیں کر رہے تھے۔ گفتگو کا سلسلہ نہ جانے کیسے راولپنڈی سازش کیس اور فیض صاحب کی گرفتاری تک پہنچ گیا۔ فیض صاحب کہنے لگے تفتیش کے دوران ایک بار آدھی رات کو مجھے جگایا۔ آنکھوں پر پٹی باندھی۔ موٹر میں ڈالا اور چل دئے میں نے سوچا اب یہ تشدد کریں گے اپنے آپ کو ذہنی طور پر اس آزمائش کے لئے تیار کر لیا۔ آدھی رات کی چلی ہوئی موٹر صبح سویرے کہیں جا کر رکی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ لاہور سے راولپنڈی لے آئے ہیں حالانکہ سارا سفر لاہور سے لاہور تک تھا، ایک تفتیشی مرکز سے برڈوڈ بیرک وارث روڈ تک۔ ہاتھ پکڑ کر ایک کمرے میں لے گئے کرسی پر بٹھا کر میری آنکھوں کی پٹی کھول دی۔ مجھے کمرے میں تنہا چھوڑ کر سب باہر چلے گئے اور دروازہ بند کر دیا۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا لمبی سی میز کے دونوں سروں پر دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں، ایک پر میں بیٹھا ہوا تھا دوسری خالی تھی۔ پانچ منٹ کے وقفے کے بعد دروازہ کھلا۔ میں نے سر اٹھا کر یہ دیکھنا چاہا کہ آنے والے ہاتھ میں کون سا آلہ ضرب ہے ڈنڈا کہ درہ۔ دروازہ سے بڑی بڑی موچھوں والا لمتڑنگا اینگلو انڈین ڈی آئی جی پولیس داخل ہوا۔ کیا نام تھا اس کا پی سی ایلم۔ اس نے کہا''گڈ مارننگ سر! ناشتے کا وقت ہو گیا ہے آپ انڈے کیسے پسند فرمائیں گے فرائی یا آملیٹ؟''فیض صاحب کہنے لگے میرا جواب تھا''لاحول ولاقوۃ''رات بھر کی ٹینشن کے بعد اور کیا کہہ سکتا تھا'' (صفحہ ۳۸۱۔۳۸۲) اس کے بعد مختار مسعود نے ساواک کے اس ظالمانہ اور بہیمانہ طریق کا ذکر کیا ہے جس طریق سے وہ ملزموں کا''آملیٹ''بناتے تھے۔

شہزادوں اور شہزادیوں کے احوال سے انہیں اپنے ہاں کے لوگ یاد آتے ہیں۔''ایک شاعر افسر نے خودکشی کر لی۔ بعد مرنے کے ان کے گھر سے جو ساماں نکلا اس میں چند تصویریں بھی تھیں چیف سکرٹری اور گورنر کو ملاحظہ کے لئے پیش کی گئیں۔ چیف سکرٹری پہلی تصویر پر لاحول پڑھ کر پرے ہو گئے۔ انہیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد۔ نیک دل حوصلہ مند گورنر نے ساری تصویریں غور سے دیکھیں اور ہر ایک پر باری باری باآواز بلند لاحول بھیجی۔ چیف سکرٹری نے بار بار لاحول پڑھنے اور بھلائی حاصل کرنے کا موقعہ کھو دیا۔ گورنر سارا ثواب اور ساری تصویریں سمیٹ کر لے گئے''۔ (صفحہ ۳۶۰)

مختار مسعود نے شاہنشاہ کے زوال کے اسباب بیان کرتے ہوئے یہ بھی بیان کیا ہے کہ ''مغرب زدگی اور بے راہ روی کا ذکر ہو تو ایک شادی کا حوالہ ضرور دیا جاتا ہے۔ ۱۹۶۸ میں جنرل

خسروانی اور جنرل جہاں بانی کے لڑکوں کی آپس میں شادی کھلم کھلا اور بڑی دھوم دھام سے کموڈور ہوٹل میں ہوئی۔ جنرل خسرو کا بیٹا ملکہ فرح کی پوشاک کے ڈیزائن تیار کرتا تھا'' (صفحہ ۳۶۴)۔ پاکستان بھی اس بارہ میں کسی سے ہیٹا نہیں رہا۔ کچھ برس پہلے امریکہ سے ایک مشہور پاکستانی افسانہ نگار صحافی اور ادیب سٹاک ہالم کی ایک ادبی کانفرنس میں تشریف لائے۔ فرمانے لگے میرے شوہر بھی میرے ساتھ آئے ہیں۔ سننے والوں نے سمجھا شاید صیغہ کی غلطی لگی ہے بیوی کہنا چاہتے ہوں گے مگر انہوں نے تصریح فرمائی کہ میں ایک دوسرے مرد سے شادی شدہ ہوں اور وہ میرے شوہر ہیں۔ پچھلے دنوں وہ انڈیا تشریف لے گئے تھے اور اپنی کامیاب ازدواجی زندگی پر ایک انٹرویو دیا تھا جو وہاں کے اخبارات نے بڑے طمطراق سے چھاپا تھا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ پاکستان ترقی کی راہ میں کسی سے پیچھے رہ گیا ہے؟

قصر سعد آباد کو دیکھ کر ان کی یادیں اسلام آباد لوٹ آتی ہیں'' جن دنوں ہمارے وزیر اعظم کا دفتر راولپنڈی میں جو کا خمیر اٹھانے اور شراب بنانے والے کارخانے کے جنرل مینیجر کے گھر میں واقع تھا ان دنوں وہاں دوہرے کام کے لئے ایک چھوٹا سا ہال بنایا گیا۔ دوسو کے قریب نشستیں تھیں نام آڈیٹوریم یعنی سماعت گھر رکھا گیا۔ ابھی دیواریں گیلی تھیں کہ اس خصوصی سینما گھر میں ہفتہ وار فلم شو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ باری باری چند سول اور فوجی افسر بھی وزیر اعظم کے ہمراہ فلم دیکھنے کے لئے بلائے جاتے۔ یوسف بچ فلم کا تعارف کرواتے۔ ایک دن فلم کا تعارف کرواتے ہوئے کہنے لگے یہ نپولین کے بارے میں ہے مگر وہ نپولین نہیں جسے ہالی وڈ نے چارلس بوائر اور ویوین لے کی اداکاری کے سہارے ایک عاشق مزاج جینیئس ثابت کیا ہے۔ یہ فلم نپولین کی نفسیاتی کیفیت کا سائنٹیفک اور گہرا مطالعہ ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ بڑے فیصلے، بڑی فتوحات، بڑی حرص اور بڑی الجھنیں کس طرح ایک جینئس کو نفسیاتی اور ذہنی مریض بنا دیتی ہیں۔ اس روز اتفاقاً آڈیٹوریم میں فوجی افسر اور ان کی بیگمات کی تعداد دیگر حاضرین سے کچھ زیادہ تھی لیکن جس شخص کو یہ پیغام پہنچنا چاہئے تھا کہ بونا پارٹ ازم میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی وہ ان دنوں اردن میں بریگیڈیر کی حیثیت سے تعینات تھا اس لئے فلم دیکھ سکا نہ بچ صاحب کی تقریر سن سکا''۔ (صفحہ ۳۵۹) شاید مختار مسعود نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لے کر یہ نہیں لکھا کہ جس شخص کا مشیر اطلاعات فلموں کا تعارف کروایا کرتا تھا وہ خود اس پیغام کا سب سے زیادہ مستحق

بھی تھا اور مخاطب بھی!

وزیر اعظم بازرگان کی سادہ دعوت ان کی یادوں کو کہاں کہاں لے اڑتی ہے'' بازرگانی کھانے کا ذکر سن کر بی اے قریشی اچھے دنوں کو یاد کرنے لگے۔ یہ ۱۹۵۵ کی بات ہے۔ چوہدری محمد علی وزیر اعظم تھے کراچی میں ایک میٹنگ ہوئی میں بھی اس میں شامل ہوا۔ میٹنگ کے بعد وزیر اعظم نے چار پانچ افسروں سے کہا کہ وہ رات کا کھانا ان کے ساتھ کھائیں۔ ہم پرائم منسٹر ہاس پہنچ گئے۔ ڈرائنگ روم میں عام سے صوفہ قالین اور چند چھوٹی میزوں کے علاوہ کوئی چیز نہ تھی۔ کھانے میں تاخیر ہوتی چلی گئی ایک بار وہ باورچی خانہ کا چکر لگا کر آئے اور کہنے لگے یوں لگتا ہے جیسے آپ کو کھانے کے لئے کچھ انتظار کرنا پڑے گا رضیہ بیگم کا خیال ہے کہ وہ ایک ماہر کک ہیں میری دانست میں وہ اتنی ماہر بھی نہیں جتنا ان کا خیال ہے۔ اتنے میں بیگم محمد علی کمرہ میں داخل ہوئیں الجھے ہوئے بالوں کو پلو سے ڈھکتے ہوئے اور آٹے ہوئے ہاتھوں کو صاف کرتے ہوئے کہا آؤ بھراؤ کھانا تیار ہے''۔ (صفحہ ۳۷۶۔۳۷۷)

اسی تصویر کا دوسرا رخ ہے کہ'' ایک متمول دوست نے قریشی صاحب کی دعوت کی اور بتایا کہ اس نے پلاؤ پکانے کے لئے خاص طور سے پرائم منسٹر ہاؤس کے کک کو بلایا ہے۔ کک کو تعارف کے لئے بلایا گیا اس نے بتایا کہ کچن میں چار ہیڈ کک ہیں میں ان میں سے ایک ہوں۔ ہم سب کی اپنی اپنی تخصیص ہے میں مغلئی کھانوں کا ماہر ہوں۔ ہمارے ساتھ کچن میں بتیس افراد کا عملہ ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ریکارڈ کے مطابق ہمارے ایک لاکھ جنگی قیدیوں کو وطن واپس آئے ہوئے چار چھ ماہ سے زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا۔ (ایضاً) مجید مفتی بتانے لگے'' ہمارے وزیر اعظم نے واشنگٹن میں ہنری کسنجر کو کھانے پر بلایا۔ پاکستان سے کالے تیتر منگائے گئے۔ کالے تیتر اور باورچی دونوں ہوائی جہاز سے سات سمندر پار اس شہر میں پہنچے'' (صفحہ ۳۷۸) اور غفور مرزا کی بات سب سے بازی لے گئی۔ کہنے لگے'' یہ میرے تجربے یا مشاہدے کی بات نہیں میں نے یہ واقعہ سرکاری کاغذات میں پڑھا ہے جو مجھے چھانٹی اور درجہ بندی کے لئے دئے گئے تھے۔ میں اس نسل سے تعلق رکھتا ہوں جس نے قائد اعظم کو نہیں دیکھا وہ گئے اور ہم آئے۔ جب میں نے باورچی والی فائل پڑھی تو اپنی محرومی کا احساس بہت بڑھ گیا قائد اعظم کھانا بہت کم کھاتے تھے دبلے پتلے بوڑھے اور بیمار تھے مرض الموت میں جسمانی

کمزوری بہت بڑھ گئی زیارت کے قیام کے دنوں میں ڈاکٹر الٰہی بخش نے تشویش ظاہر کی کہ کم خوراکی کی وجہ سے ان کی حالت زیادہ تیزی سے خراب ہورہی ہے ان کی رائے تھی کہ لاہور میں جو دو باورچی کپور تھلہ برادرز کے نام سے مشہور ہیں انہیں زیارت بھیجا جائے کیونکہ ان کے ہاتھ کا بناہوا کھانا قائداعظم کو مرغوب ہے۔ کپورتھلہ کے باورچی بھائیوں کی تلاش ہوئی۔ وہ لاہور چھوڑ کر لائل پور چلے گئے تھے لائل پور سے زیارت پہنچے۔ اس روز قائداعظم نے چند لقمے شوق سے کھائے کھانے کے بعد اپنے پرائیویٹ سکرٹری فرخ امین کو بلایا کھانے میں فرق کی وجہ دریافت کی۔ وجہ بتائی گئی وہ ناخوش ہوئے چیک بک منگائی باورچیوں کے آنے جانے کے خرچ کا حساب کیا اس رقم کا چیک کاٹا رقم سرکاری خزانہ میں جمع کرائی۔ باورچی رخصت کئے اور کہا'' یہ حکومت کا کام نہیں کہ وہ گورنر جنرل کو اس کی پسند کا کھانا سرکاری خرچ پر فراہم کرے''۔ (صفحہ ۳۷۹)

یہاں پہنچ کر مختار مسعود کے ضبط کا بند ٹوٹ جاتا ہے'' کہاں قائداعظم؟ سچے کھرے بااصول اور امانت دار! کہاں جھوٹے منافق بے اصول اور خائن حکمرانوں کی کھیپ کی کھیپ۔ کہاں وہ باورچیوں کا سفر خرچ حکومت کو واپس کرنے والا شخص اور کہاں یہ کھا، اڑا، اشخاص۔ یہ مسرف اور متلف حکومتیں۔ یہ فضول خرچیاں یہ خیانتیں۔ یہ حرام کاریاں۔ جیسے ملک کی دولت کو کھانا اور ویران کرنا حکمرانوں کے سرکاری فرائض میں شامل ہو اور اس کا مینڈیٹ انہیں اس جعلی دیماکریسی سے ملا ہو جو مارشل لاء کے درمیانی وقفوں میں عوام پر مسلط ہو جاتی ہے۔ یہ حکمران کیا کچھ نہیں کھا گئے؟ پلاٹ اور پرمٹ ادارے اور بنک۔ انصاف اور اصول۔ دماکریسی اور مساوات عہد اور نظریہ روایات اور ماضی۔ اس رفتار سے یہ حکمران مملکت خداداد کو اور یہ حکومتیں ہمارے مستقبل کو کھا جائیں گی نعوذ باللہ''! (صفحہ ۳۹۷)۔

اس کتاب میں پاکستان اور ایران کی حالیہ تاریخ کا موازنہ بھی ساتھ ساتھ چلتا ہے'' صبح سویرے تہران میں مارشل لا لگ گیا قانون نظامی کے مسلح محافظوں نے بھی نہتے پرامن مگر بادشاہت بیزار جلوس پر گولیاں برسانی شروع کردیں۔ جب قتل عام تھا تو لوگ پناہ لینے کے لئے بھاگنے لگے۔ جو مرچکے تھے وہیں پڑے رہے۔ ٹرک آئے مردہ اور نیم مردہ جسموں کو بوریوں کی طرح لادنے لگے۔ مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل غلام علی اویسی کی گنتی کے مطابق صرف اٹھاون نگ ہیں۔ وزارت انصاف

پچانوے کہتی ہے اخباری نمائندہ کہتا ہے صبح سولاشیں تو میں نے گنی تھیں۔ ایک فرانسیسی اخبار نویس اپنے ڈسپیچ میں لکھتا ہے'' اس سخت اقدام سے بادشاہ کا تخت بچ گیا'' ایک ایسا ہی سخت قدم ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ کو مارشل لا والوں نے ڈھاکہ میں اٹھایا تھا اس روز ہمارے ایک ذہین سیاست دان نے بھی اس ڈسپیچ سے ملتا جلتا بیان دیا تھا'' شکر ہے پاکستان بچ گیا'' (صفحہ ۱۴۲)۔

اس ذہین سیاست دان کا تختہ الٹنے والوں اور اسے تختہ دار تک پہنچانے والوں کی سوجھ بوجھ کا تذکرہ بھی ہے کہ اس قتل عام کے معاًبعد جب لوگ اپنے عزیزوں کو ڈھونڈنے ہسپتالوں مردہ خانوں اور قبرستانوں کے چکر لگا رہے ہیں'' ساڑھے چار بجے سہ پہر پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق کی آمد آمد ہے۔ استقبالی گروہ عجب گومگو کا شکار ہے۔ سب حیران ہورہے ہیں کہ بھلا یہ بھی کوئی ایران آنے کا وقت ہے؟ آخر کیوں آرہے ہیں اور کیا کرنے آرہے ہیں؟ صدارتی سطح کے اس ناوقت سرکاری دورے کا مشورہ کس عقلمند نے دیا ہے دل میں سب کہہ رہے ہیں آنکھوں سے بھی سب کہہ رہے ہیں زبان سے کوئی کچھ نہیں کہتا۔ صدر ضیاء الحق فوجی وردی پہنے ہوئے جہاز کی سیڑھیوں سے نیچے اترے۔ انہیں لینے کے لئے محکمہ تشریفات کا ایک کمسن نمائندہ کھڑا ہے۔ رئیس تشریفات تبدیل ہوگئے ہیں یا علیل ہوگئے ہیں۔ وزیر دربار نے آج استعفاد ے دیا ہے۔ استقبالی صف میں نئی کابینہ کا کوئی وزیر نظر نہیں آتا۔ میں رائل ہلٹن کے کمرا نمبر ۵۱۵ میں جا بیٹھا یہ کرنل صدیق سالک کا کمرا ہے اس کی دوستی کو وسیلہ بناتے ہوئے اور اس کی مزاح نگاری کی آڑ لیتے ہوئے میں نے اس کے ورود نامسعود کو بدمذاقی بلکہ سراسر نالائقی سے تعبیر کیا۔ اس نے آنے کی اصل وجہ کا ذکر کیا وہ اتنی بودی نکلی کہ میں نے اس تجویز کو پیش کرنے والے اور قبول کرنے والے دونوں کو برا بھلا کہنا شروع کیا۔ صدیق سالک نے ہنسنا شروع کردیا'' (صفحہ ۱۴۳۔۱۴۴)۔

مختار مسعود شاید اپنے سفارتی آداب کے باعث کھل کر بات نہ کہہ سکے اس سفر نامسعود کی وجہ ان لوگوں کو تو سمجھ میں آتی ہے جو جانتے ہیں کہ ضیاء الحق اس خطہ ارض میں سی آئی اے کا سب سے بڑا اور قابل اعتماد ایجنٹ تھا۔ اس نامسعود دورہ کے چند ہی روز بعد صدر کارٹر کا یہ بیان آ گیا کہ'' اگرچہ ہماری خواہش ہوگی کہ کارمنصبی کی تقسیم میں شہنشاہ کی اہمیت برقرار رہے لیکن اس سلسلہ میں حتمی فیصلہ

ایران کے عوام کریں گے''اور اس پر مختار مسعود نے حاشیہ چڑھایا کہ''اس اعلان کا سیدھا سادہ مطلب یہ ہے کہ شہنشاہ کے دوست اور مربی اس کا ساتھ چھوڑنے کی تیاری کر رہے ہیں''(صفحہ ۲۰۰) جمی کارٹر کی خودنوشت سوانح عمری'' کیپنگ فیتھ'' کا وہ حصہ پڑھنے کے قابل ہے جس میں انہوں نے ایران اور شاہ کے ساتھ تعلقات کا ذکر کیا ہے۔جس نے وہ خودنوشت پڑھی ہے اس پر تو انقلاب ایران کی ساری پرتیں عیاں ہو جاتی ہیں اور سی آئی اے اور اس کے ایجنٹوں کا کردار بھی۔ایران کی بدلتی ہوئی صورت حال کو اپنی آنکھوں دیکھ کر اپنے آقاؤں تک پہنچانے والا ضیاء الحق سے بہتر کون ہو سکتا تھا؟

لوح ایام میں صرف دل جلانے والی باتیں ہی نہیں ہیں۔ ہلکے پھلکے مزاح کے چھینٹے بھی جہاں تہاں مل جاتے ہیں۔امریکہ کے سفیر کا نام مسٹر وائٹ تھا مگر ان کا تعلق سیاہ فام خاندان سے تھا مختار مسعود نے بڑے مزے کا فقرہ لکھا ہے کہ''اس باوقار سیاہ فام شخص کو نام لے کر مخاطب کرنے والے کو یوں لگتا ہے جیسے وہ کوئی سفید جھوٹ بول رہا ہو''(صفحہ ۱۵۳)

لوح ایام پاکستانیوں کو بھی بر وقت متنبہ کرنے والی کتاب ہے۔ دیباچہ مختصر اور فکر انگیز ہے ''اس کتاب کو لکھنے میں اتنا وقت نہیں لگا جتنا یہ طے کرنے میں کہ لکھا جائے یا نہ لکھا جائے اور اگر لکھا جائے تو اس کی حد بندی کیسے کی جائے۔وجہ معلوم کرنے کے لئے آپ کو کتاب پڑھنی ہوگی اس کے بعد گریبان میں جھانکنا ہوگا اگر وہ سلامت نظر آیا تو گویا انقلاب کے موضوع پر لکھنے کا فیصلہ کچھ ایسا درست نہ تھا۔انقلاب خواہ کتنا ہی پرانا کیوں نہ ہو جائے اس کی داستان ہمیشہ تازہ رہتی ہے امید اور عمل، بیداری اور خود شناسی، جنوں اور لہو کی داستاں بھی کہیں پرانی ہو سکتی ہے؟ زمانہ اس کو بار بار دہراتا ہے فرق صرف نام مقام اور وقت کا ہوتا ہے''از نقلاب زمانہ عجب مدار کہ چرخ۔ازیں فسانہ وافسوں ہزار دارد یاد''۔

میرے پاس لوحِ ایام کا پانچواں ایڈیشن تھا۔سعید شیخ نے جس ایڈیشن پر تبصرہ لکھا ہے وہ لوح ایام کا آٹھواں ایڈیشن ہے۔کل اسلامک بکس جرارڈ سٹریٹ کے پروفیسر شمیم احمد صاحب سے جو ایڈیشن میں لایا ہوں وہ اس کتاب کا اٹھارواں ایڈیشن ہے۔اس کا مطلب ہے ہم لوگ انقلاب کی داستان میں دلچسپی رکھتے ہیں مگر کیا ہم نے اپنے گریبانوں میں بھی جھانکا ہے؟

لوحِ ایام اردو زبان کے ایک مستند ادیب کی تصنیف ہے اس لئے اس کی زبان بھی مستند ہے مگر دو ایک مقامات پر ہم جیسے طالب علم کو بھی ایک دو باتیں کھٹکی ہیں۔ایک جگہ لکھا ہے'' بکری اور شیر ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں''(صفحہ ۳۱) حالانکہ محاورہ میں''شیر اور بکری کے ایک گھاٹ پانی پینے'' کا ذکر ہے اور ہمارے اساتذہ اس بات پر بہت زور دیا کرتے تھے کہ محاورہ کی صورت بہر طور قائم رہنی چاہئے۔ ایک جگہ'' پچھاڑیں مارنے''(صفحہ ۹۲) کا ذکر ہے یہاں بھی محاورہ'' پچھاڑیں کھانا'' ہے۔(فرہنگ آصفیہ جلد اول صفحہ ۵۱۳) بااین ہمہ یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر شخص اسے بقائمی ہوش و حواس پڑھے اور اس پر غور کرے۔ایسی کتابوں کا ہمارے ہاں بہت توڑا ہے۔

◎

نامہ اعمال

نواب سر محمد یامین خان صاحب کی چار جلدوں پر مشتمل اور ہزار ہا صفحات پر محیط طویل ڈائری ''نامہء اعمال'' کے عنوان سے آئینہء ادب انار کلی لاہور کی جانب سے ۱۹۷۰ میں پہلی بار چھپی۔ نواب صاحب نے اسے خودنوشت، یادیں اور تاثرات کا نام دیا ہے۔ اس نامہ ء اعمال میں نواب صاحب کے روزمرہ کے سیاسی اور سماجی کاموں کی تفصیل درج ہے اور اس روزنامچہ میں تقریباً ہر چھوٹے بڑے کام کی تفصیل موجود ہے۔ نام کے لحاظ سے اسے نامہ اعمال ہی کہا سکتا ہے۔ جناب مرزا محمد ہادی رسوا نے ''امراؤ جان ادا'' کے سر عنوان کے طور پر جو شعر لکھا تھا وہ اس نامہ ء اعمال پر ایک حد تک صادق آتا ہے۔ نہ پوچھ نامہء اعمال کی دل آویزی۔ تمام عمر کا قصہ لکھا ہوا پایا۔ تمام عمر کا قصہ تو موجود ہے مگر وہ شئے لطیف جسے دل آویزی کہا جاتا ہے اس سارے نامہء اعمال میں موجود نہیں۔

نواب سر محمد یامین خاں میرٹھ اور مارہرے کے جدی پشتی رئیس تھے۔ علی گڑھ اور میرٹھ کالج میں تعلیم حاصل کی پھر لنکنز ان میں بیرسٹری کے واسطے داخل ہوئے۔ بیرسٹر بن کر آئے تو کچھ سال کی قانونی پریکٹس کے بعد ۱۹۲۰ میں مرکزی قانون ساز اسمبلی کے ممبر بن گئے۔ اس طرح ان کی سیاسی زندگی کا بیشتر حصہ اسمبلی میں گذرا، حکومت کے وفادار تھے اس لئے سرکاری حلقوں میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ایک بار ان کے کاغذات نامزدگی کسی غلطی کی وجہ سے مسترد ہو گئے تو وائسرائے نے انہیں کونسل آف سٹیٹ میں نامزد کر دیا کہ ایک وفادار کا ووٹ ضائع نہ ہو۔ اس دوران ان کے مقابل پر جیتنے والا امیدوار فوت ہو گیا تو یہ دوبارہ اپنے حلقہ سے منتخب ہو گئے اور واپس اسمبلی میں چلے گئے۔

سر یامین خاں نے اسمبلی میں جو تقریریں مختلف مواقع پر ارشاد فرمائیں انہیں بھی بتمام و کمال اس اعمال نامہ میں درج کر دیا ہے اس عادت کا صرف یہ فائدہ ہوا ہے کہ مسلم لیگ میں شمولیت کے بعد قائد اعظم اور نواب زادہ لیاقت علی خاں کی تقریریں بھی آپ نے ریکارڈ کر دی ہیں اس طرح یہ خودنوشت اس دور کے سیاسی اتار چڑھاؤ کی کہانی بن گئی ہے اور اس لحاظ سے اہم ہے کہ مسلم لیگ اور قیام پاکستان سے ذرا قبل کی سیاسی جدوجہد کی آنکھوں دیکھی روداد ہے اور اسی وجہ سے اس کی اہمیت قائم رہے گی۔

سر یامین خاں ۱۹۳۸ میں مسلم لیگ میں شامل ہوئے تو اخباری بیان دیا وہ بھی من وعن درج ہے۔ اخبارات نے اسے ''سر یامین خاں کے زریں ارشادات'' کے عنوان سے چھاپا اور آپ نے اسی عنوان کے تحت اپنے نامہء اعمال میں درج کر دیا'' کوئی شخص اس وقت تک مسلمانوں پر اثر نہیں ڈال سکتا اور اپنے خیالات وافکار مؤثر طریق پر ان کے سامنے پیش نہیں کر سکتا جب تک وہ ان میں شامل نہ ہو جائے اور ان کے ساتھ مل کر کام نہ کرے۔ آپ اگر مسلمانوں سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ آپ کی صلاحیت غور وفکر سے فائدہ اٹھائیں تو اس کی صورت یہی ہے کہ اپنے آپ کو ان کا جزو بنا دیں یہ نہیں کہ سرحد کے سرخ پوشوں یا پنجاب کے احراریوں یا دہلی کے جمعیت العلما کے کارکنوں کی طرح اغیار کا آلہ ء کار بن کر توقع رکھیں کہ مسلمان آپ کی بات سنیں گے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے جس ملت میں پیدا کیا ہے اسے چھوڑ کر دوسروں کے ساتھ جاملنا کس بنا پر جائز ہے؟'' (نامہء اعمال جلد دوم صفحہ ۷۰۵)

اسمبلی کے واقعات آپ نے بڑی تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ ان کی صداقت کو جانچنے پرکھنے کا ایک ہی طریق ہے کہ ان کے کسی ہم عصر کی لکھی ہوئی باتوں سے ان کی باتوں کا موازنہ کیا جائے۔ ابوالکلام آزاد کے باب میں تو یہ خود کہہ چکے ہیں'' مولانا ابوالکلام آزاد نے تو واقعات کو بالکل الٹ کر بیان کیا ہے'' (جلد اول صفحہ ۱۱) اور اسی طرح مصنف پاتھ وے ٹو پاکستان، (چوہدری خلیق الزمان) کی بابت تو ان کی رائے یہ ہے کہ'' انہوں نے غلط بیانیاں کی ہیں۔۔۔ انہوں نے ظاہر نہیں کیا کہ وہ کس طرح مسلم لیگ پارٹی کے کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی میں لیڈر مقرر ہوئے اور اپنا پورا بیان جو کانگریس کا جھنڈا بلند ہوتے وقت دیا اپنی کتاب میں نہیں دیا۔'' (ایضاً صفحہ ۱۲)

اس لئے سر ظفر اللہ خان کی تحدیث نعمت ہی رہ جاتی ہے کہ اس کے مندرجات اور نامہ ء اعمال کے متعلقہ مندرجات کا موازنہ کیا جائے۔ اتفاق سے سر شادی لال کے پریوی کونسل سے مستعفی ہونے اور ان کے جانشین کے تقرر کا واقعہ دونوں کتابوں میں بیان ہوا ہے۔ سر یامین خاں لکھتے ہیں'' سر نرائن سنہا نے کہا نہایت راز کی بات ہے لیکن چونکہ آپ دوست ہیں اس لئے بتائے دیتا ہوں۔ سر شادی لال سے لارڈ چانسلر خوش نہیں ہیں اور وہ اب علیحدہ ہو رہے ہیں ان کی جگہ سر ظفر اللہ خاں کا نام

بھیجا گیا ہے۔۔۔ لارڈ بریبرن جو بمبئی کے گورنر ہیں لیکن آج کل وائسرائے کی عوضی کررہے ہیں وہ آپ کو اس عہدے کے لئے بہترین سمجھتے ہیں اور آپ کا نام بھیج دیا ہے۔ لیکن لارڈ لنلتھگو کی واپسی پر اس کا اعلان ہوگا جب لندن سے سر ظفر اللہ خاں کے پریوی کونسل میں تقرری کی اطلاع آجائے گی۔۔۔ سر شادی لعل اگرچہ صحت کی وجہ سے خود نہیں جاسکتے تھے لیکن ان کو یہ کسی طرح گوارا نہ تھا کہ سر ظفر اللہ خاں ان کی جگہ جائیں۔ سر شادی لعل پنجابی ہیں اس لئے سر ظفر اللہ خاں پنجابی مسلمان کو اپنی جگہ اپنے برخواست ہونے پر جاتا نہیں دیکھ سکتے۔۔۔ (مہا سبھائی) خوش ہیں کہ ظفر اللہ خاں نکلیں اور آپ آجائیں لیکن یہ نہیں چاہتے کہ ظفر اللہ خاں پریوی کونسل میں جائیں۔۔۔ مہا سبھا نے مسٹر جیکر کو جو فیڈرل کورٹ کے جج ہیں تیار کیا ہے کہ وہ امیدوار ہوجائیں'' (جلد دوم صفحہ ۷۰۴)۔

اب تحدیث نعمت دیکھئے۔ سر ظفر اللہ خاں لکھتے ہیں'' سر فنڈلیٹر سٹوارٹ سے رخصت ہونے لگا تو انہوں نے بتایا کہ سر شادی لال ہندوستان جاتے وقت کہہ گئے تھے کہ وہ واپس نہیں آئیں گے۔۔۔ اب کی معلوم ہوتا ہے ان کا ارادہ واپس آنے کا نہیں۔ اگر انہوں نے استعفٰی بھیج دیا تو کیا تم ان کی جگہ آنا چاہو گے؟ میں نے دریافت کیا آپ کا کیا مشورہ ہے؟ کہا میرا مشوہ ہے کہ تم ان کی جگہ آجاؤ۔ میں نے کہا اگر سر شادی لال نے استعفٰی بھیج دیا تو اس وقت سوچ لونگا۔'' (تحدیث نعمت صفحہ ۴۰۵) پھر لکھتے ہیں ''۱۹۳۸ کے آخر میں وائسرائے نے میرے ساتھ ذکر کیا کہ سر شادی لال نے پریوی کونسل سے استعفٰی دے دیا ہے اور وزیر ہند دریافت کرتے ہیں کہ کیا تم ان کی جگہ لندن جانا چاہتے ہو؟ میں نے کہا سر فنڈلیٹر سٹوارٹ نے میرے ساتھ اس امکان کا ذکر کیا تھا اور اس وقت میں نے نیم رضامندی ظاہر کی تھی لیکن مسٹر رنسی مین کمیشن متعلقہ چیکوسلواکیہ کے ناکام ہونے کے بعد مجھے یقین ہوگیا ہے کہ جنگ ناگزیر ہے اس لئے میں اب لندن جانا نہیں چاہتا اس لئے نہیں کہ میں متوقع جنگ کی وجہ سے لنڈن جانے سے ڈرتا ہوں وہاں جنگ کے دوران جو اوروں کا حال ہوگا وہی میرا بھی ہوگا لیکن میرے لئے اس منصب میں یہ کشش تھی کہ لندن میں رہتے ہوئے میں ملک کی آئینی ترقی کے لئے کچھ کوشش کر سکوں گا اور دوسرے ہندوستانی طلبا مقیم انگلستان کے لئے مزید سہولتیں بہم پہنچانے میں مدد کر سکوں گا جنگ کی صورت میں ان امور کی طرف کوئی توجہ نہیں رہے گی اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنا مجھے پسند

نہیں۔ وائسرائے نے کہا یہ تو اچھا ہے کہ تم جانا نہیں چاہتے۔ مسر جیکر بہت رنجیدہ ہیں کہ سر تیج بہادر سپرو کو تو پریوی کونسل کی رکنیت کا اعزاز عطا ہوا لیکن ان کی خدمات کو نظر انداز کیا گیا ہے وہ چاہتے ہیں کہ سر شادی لال کی جگہ ان کا انتخاب ہوجائے تمہارے انکار سے ایک تو مسٹر جیکر کی خواہش پوری ہوجائے گی دوسرے میں چاہتا ہوں کہ تم سر این این سرکار کے جانے پر قانون کا قلمدان سنبھال لو اور میری میعاد کے پورے ہونے تک میرے رفیق کار رہو'' (صفحہ ۴۱۶)

سر یامین خاں کی یہ بات درست نہیں کہ سر ظفر اللہ خاں کا نام بھیجا گیا تھا۔ ان سے صرف وزیر ہند نے استفسار کیا تھا اور وائسرائے کی بات ان کی تائید کرتی ہے۔ مسٹر جیکر جو سپریم کورٹ کے جج تھے اس منصب پر جانے کے اہل تھے سو سر ظفر اللہ خاں کے انکار پر ان کا نام بھیج دیا گیا۔ سر یامین خاں تو اس وقت سپریم کورٹ کی بار تک کے رکن نہیں تھے ان کا نام قائمقام وائسرائے کیسے بھیج سکتے تھے۔ سر یامین خاں تو اس واقعہ کے بعد سپریم کورٹ بار کے رکن بنے۔ ۱۷ دسمبر کی ڈائری میں درج ہے ''میں نے رجسٹرار فیڈرل کورٹ آف انڈیا کو پانچ سو روپے فیس بھیج دی اور سینئر ایڈووکیٹ کی حیثیت سے انرول ہوا'' (صفحہ ۷۱۳)

سر فیروز خاں نون کے انگلستان میں ہائی کمشنر مقرر ہونے کے بارہ میں تو سر یامین خاں نے بے پر کی اڑائی ہے۔ ۲۳ مارچ ۱۹۳۶ کی ڈائری میں لکھتے ہیں ''اس سیشن میں میاں سر فضل حسین کی ایک بڑی سیاسی کامیابی یہ ہوئی کہ فیروز خاں نون کو ہائی کمشنر انگلستان مقرر کرادیا۔۔۔ یہ طے تھا کہ سر جوزف بھور مقرر ہوں گے جو گذشتہ سال ریٹائر ہوئے۔۔۔ سر ہربرٹ ایمرسن گورنر پنجاب نے میاں سر فضل حسین سے کہا آپ پنجاب میں ایگزیکٹو کونسل کے ممبر ہوجائیں۔ انہوں نے کہا میں تو وزارت پسند کرتا ہوں۔ گورنر نے کہا کہ آپ کے رشتہ دار ملک فیروز خاں نون وزیر ہیں تو ایک ہی خاندان میں سب وزارتیں تو نہیں ہوسکتیں۔ گورنر نے کہا کہ اچھا میں فیروز خاں کو برخواست کر کے آپ کو کئے دیتا ہوں۔ سر فضل حسین نے کہا کہ برخواست کرا کے میں آنا نہیں چاہتا۔ لہذا فیروز خاں نون کو ہائی کمشنر بنوا دو'' (صفحہ ۶۲۶)

اب تحدیث نعمت کا حوالہ۔ سر ظفر اللہ لکھتے ہیں ''مئی ۳۵ میں جب میں ان سے چارج لے چکا تو معلوم ہوا کہ سر جوزف کے کہنے پر وائسرائے نے وزیر ہند کی خدمت میں سفارش کی تھی کہ ہائی کمشنر کا

عہدہ خالی ہونے پر سر جوزف کا اس عہدے پر تقرر کیا جائے۔ وزیر ہند نے جواب دیا کہ جلدی کیا ہے
ابھی بہت وقت پڑا ہے اور چونکہ ہائی کمشنر کا محکمہ تجارت کے محکمے کے نیچے آتا ہے لہذا وزیر تجارت کی
رائے معلوم کرنا بھی ضروری ہے۔ اس لئے ظفر اللہ خاں جب چارج لے چکیں تو میں اس کی رائے کا بھی
انتظار کروں گا۔ ۱۹۳۵ کے دوران سر سیموئیل ہور فرسٹ لارڈ آف ایڈمیرلٹی ہو گئے اور لارڈ زیٹلینڈ ان
کی جگہ وزیر ہند ہوئے۔ دسمبر ۳۵ میں مجھے سر فضل حسین کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقعہ ہوا۔ میں
نے ان سے استصواب کیا کہ لندن میں ہائی کمشنر کے لئے موزوں ترین مسلمان کون ہوگا آپ نے فرمایا
امیدوار تو بہت ہیں سر لیاقت حیات خاں، سر فیروز خاں نون وغیرہ مگر سر عبدالقادر کا انتخاب مناسب
ہوگا۔ سر عبدالقادر اس وقت وزیر ہند کی مشاورتی کمیٹی کے رکن تھے اور لندن میں مقیم تھے۔۔۔۔ لارڈ
زیٹلینڈ نے سر جوزف بھور کے تقرر پر اصرار کیا۔۔۔۔ سر جیمز گرگ اور سر ظفر اللہ نے وزیر تعلیم پنجاب
سر فیروز خاں نون کا نام تجویز کیا جو آکسفورڈ کے ایم اے ہیں۔ بیرسٹر ہیں اور آٹھ سال سے پنجاب
میں وزیر ہیں۔ وائسرائے نے وزیر ہند کی خدمت میں تار بھیج دیا آخر وزیر ہند کو اپنی ضد ترک کرنا پڑی
اور ملک سر فیروز خان نون کا تقرر بطور ہائی کمشنر لندن ہو گیا'' (۳۹۳ تا ۳۹۵ جستہ جستہ) اس سارے
سلسلہ میں سر فضل حسین کا نام صرف مشورہ کے سلسلہ میں آیا ہے اور سر ہربرٹ ایمرسن (جنہیں پنجاب
والے ان کی سکھ نوازی کی وجہ سے سر ہربرٹ امر سنگھ کہا کرتے تھے) کہیں سامنے نہیں آئے۔ سر یامین
خاں نے کہیں سے سنا ہوگا اور سنی سنائی کی بنیاد پر ہوائی اڑا دی۔ ان دو مثالوں سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ
سر یامین خاں کی باقی باتیں بھی کہیں ایسی ہی ہوائیاں نہ ہوں!

تیسری اور چوتھی جلد اعمال نامہ کی قیام پاکستان کے فوراً بعد کی ڈائری ہے اور اس لحاظ سے
دلچسپ ہے کہ مہاجروں کے بارے میں بہت سی باتوں سے پردہ اٹھاتی ہے قیام پاکستان کے بعد یہ کچھ
عرصہ تک ہندوستان ہی میں مقیم رہے۔ ان کے ساتھی چوہدری خلیق الزمان اور دوسرے دوست
پاکستان آ گئے۔ انہیں بھی آخر کار پاکستان ہی آنا پڑا۔ ان کی اس خودنوشت سے یہ اندازہ ہوا کہ یوپی
کے اکثر لوگوں نے پاکستان آنے سے قبل اپنی جائیدادوں کا تبادلہ یہاں ہندوؤں کی جائیدادوں سے کر
لیا تھا اور اس وقت تک کوئی نقل مکانی پر تیار نہیں ہوتا تھا جب تک اسے جائیداد کے تبادلہ کا یقین نہیں ہو
جاتا تھا۔ خود نواب صاحب پہلے پاکستان آئے اور اپنی بیٹی کو یہاں مضبوط بنیادوں پر آباد کر کے واپس

گئے اور اس وقت تک یہاں واپس قدم رنجہ نہیں فرمایا جب تک ان کے پاؤں مستحکم نہیں ہو گئے۔
پاکستان کے زعماء انہیں جانتے تھے اور ان کی سیاسی حیثیت سے بھی واقف تھے انہیں اس سلسلہ میں
زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ کراچی میں ہاشم رضا اور ابو طالب نقوی بادشاہ بنے بیٹھے تھے جان پہچان کا جو
آدمی ان کے دربار میں حاضر ہوتا اسے جائیداد سے مالا مال کر دیتے۔ کراچی میں غریب مہاجروں کو کسی
نے پوچھا تک نہیں ساری بندر بانٹ خوش حال یوپی والوں میں ہوتی رہی۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں
کے سوتیلے بھائی نواب زادہ صداقت علی خاں نے اپنی کرنال کی جائیداد کا تبادلہ سردار اجل سنگھ صاحب
کی میاں چنوں کی جائیداد سے کیا اس کے بعد ہجرت کی۔ (ڈائری مورخہ ۷ ستمبر ۱۹۴۷ صفحہ
۱۳۸۶)۔ نامہ اعمال اس سلسلہ کی اہم گواہی ہے۔

قائداعظم کی وفات۔ کے بعد انہیں مسلم لیگ کی صدارت بھی پیش کی گئی مگر آپ نے بوجوہ یہ
ذمہ داری قبول نہ کی۔ چوہدری خلیق الزمان ایسے کاموں کو مستعد اور موجود تھے۔ ان کی سیاسی جوڑ توڑ کی
عادت یہاں پاکستان میں بھی اسی طرح قائم رہی۔ چوہدری خلیق الزمان کو امن مشن پر پاکستان بھجوایا
گیا۔ آنے سے پہلے سر یامین ان سے ملنے کو گئے تو دیکھا کہ وہ ''رفیع احمد قدوائی کی وسیع وعریض کوٹھی
میں آرام مونڈھے پر بیٹھے ہیں۔ قائداعظم کی بابت وہ خراب الفاظ استعمال کئے جن کو تحریر کرنا خلاف
تہذیب ہے۔ لب لباب یہ تھا ایک خود سر شخص ہم سب کو تباہ کر کے پاکستان ادھورا لے کر وہاں کا گورنر
جنرل بن بیٹھا اور یہاں کشت وخون کرا گیا'' (صفحہ ۱۳۷۷) ان کے اپنے خیالات بھی عجیب وغریب
ہیں۔ انہیں قائداعظم کے پاکستان ہجرت کر جانے پر اعتراض ہے۔ لکھتے ہیں ''اگست ۱۹۴۷ میں
قائداعظم نے اپنی کوٹھی سیٹھ ڈالمیا کے ہاتھ اس سے کئی گنا قیمت پر فروخت کر دی جس قدر میں خریدی
گئی تھی۔ سیٹھ ڈالمیا کی سیمنٹ فیکٹری کراچی میں ہے۔ جس کو پاکستان کا دار السلطنت مقرر کیا جا رہا ہے۔
وہاں ایک کوٹھی قائداعظم نے سنا ہے کسی پارسی سے خریدی ہے اور خود دہلی سے کراچی منتقل ہو رہے
ہیں۔ اس نے تمام دہلی میں ہلچل مچا دی ہے اور سوداگروں میں کھلبلی پڑ گئی ہے۔ اب تک تو سب اس
خیال میں تھے کہ پاکستان علیحدہ ہو جائے گا تو ادھر کے آدمی ادھر اور ادھر کے آدمی ادھر رہیں گے اور
قائداعظم جن کی صحت خراب ہے وہ سیاست سے کنارہ کش ہو کر بمبئی میں قیام کریں گے اور پاکستانیوں
پر پاکستان چھوڑ دیں گے مگر قائداعظم کے پاکستان جانے سے رنگ بدل گیا اور لوگ حیران ہوئے کہ

ایسا کیوں کیا؟'' (صفحہ ۱۳۲۶)۔

سر یامین خان صاحب نے قومی تحریک کے دوران اپنا سر کا خطاب واپس کر دیا تھا۔ حالات دگرگوں ہوئے تو انہیں احساس ہوا کہ خطاب واپس کر کے یہ اپنا اسلحہ کا استحقاق کھو بیٹھے ہیں۔ اسلحہ دوبارہ حاصل کرنے کے سلسلہ میں آپ نے جو حیل استعمال کئے انہیں پڑھ کر استعجاب ہوتا ہے۔ اسلحہ کے لئے میں ''صرف اسی وقت مستثنٰی رہ سکتا ہوں جب اپنے آپ کو سر کہلوانا شروع کر دوں۔ چونکہ نائٹ ہڈ گورنمنٹ کا عطیہ خطاب نہیں بلکہ یہ بادشاہ کا عطا کردہ اعزاز ایک رسم کے تحت دیا جاتا ہے اور اس کی واپسی صرف اس طرح ہوتی ہے کہ بادشاہ کو واپس کیا جائے اور بادشاہ اس کو منظور کر کے گزٹ میں چھاپے۔ اور اس فہرست سے نام کاٹ دیا جائے جو نائٹ ہڈ پانے والوں کی ہے۔۔۔۔۔ اس لئے یہ خطاب کسی نے بادشاہ کے ہاں واپس نہیں کیا تھا صرف مسلم لیگ کے ریزولیوشن کی پاسداری میں اپنے آپ کو سر کے لقب سے کہلوانا بند کر دیا تھا۔۔۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ کو مسٹر ایم اے جناح نے بادشاہ کی ملازمت بہ حیثیت گورنر جنرل پاکستان اختیار کر کے بادشاہ کی وفاداری کا حلف اٹھا لیا اور اس ریزولیوشن کو نظر انداز کر دیا۔۔۔ اس لئے میں نے اعلان کر دیا کہ میں بادشاہ کا عطیہ اعزاز خطاب سر جس کو میں نے اپنے نام کے شروع سے حذف کر دیا تھا دوبارہ جاری کرتا ہوں'' (صفحہ ۱۴۰۲۔۱۴۰۳)۔ خوئے بدرا بہانہ بسیار اسی کو کہتے ہیں۔

جائزہ ختم کرنے سے قبل ایک واقعہ جو سر یامین خاں نے انگریز حاکموں کے بارہ میں لکھا ہے درج کرتا ہوں، لکھتے ہیں ''الہ آباد میں ایک میلہ تربنی کا ہوا کرتا تھا جہاں تین دریا ملتے ہیں، جب یہ میلہ ہونے والا تھا تو سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ایک کانسٹیبل کو سڑک پر تعینات کیا کہ اس راستہ سے کسی کو نہ جانے دے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ بائیسکل ہندوستان میں نئی نئی آئی تھیں اور ان کی بڑی بات تھی۔ سر انٹی میکڈانل (لفٹیننٹ گورنر) اور سر جیمس لاٹوش (چیف سکرٹری) بائیسکلوں پر چڑھ کر اس جگہ پہنچے جہاں کانسٹیبل تعینات تھا۔ ان کا مقصد خفیہ معائنہ کرنے کا تھا لیکن کانسٹیبل کو حکم تھا کہ کسی کو اس سڑک پر جانے نہ دے۔ اس نے دونوں کر روک دیا۔ سر جیمس لاٹوش نے کہا میں چیف سکرٹری ہوں اور یہ لاٹ صاحب ہیں ہم کو جانے دو لیکن کانسٹیبل نے کہا ہم کو سپلینڈنٹ کا حکم ہے کہ کسی کو نہ جانے دو۔ ہم نہیں

جانے دیں گے۔ یہ دونوں واپس آ گئے اور کمشنر کے ذریعہ جواب طلب کیا۔ ادھر کانسٹیبل جب ڈیوٹی سے ہٹا تو اس نے یہ واقعہ دوسرے کانسٹیبلوں کو سنایا اس کے دوستوں میں سے کسی تجربہ کار نے کہا کہ ارے اگر سچ مچ وہ لاٹ صاحب تھا تو تو مصیبت میں پڑ جائے گا۔ اس لئے رپٹ لکھوا دے۔ اس نے رپٹ لکھوائی کہ فدوی اس سڑک پر جو تربنی کو جاتی ہے اس لئے تعینات کیا گیا تھا کہ کسی کو اس راستہ سے جانے نہ دے لیکن دو آوارہ گرد یوروپین پیر گاڑیوں پر آئے ایک اپنے کو لاٹ صاحب کہتا تھا اور دوسرا چیف سیکرٹری۔ وہ اس راستہ سے جانے لگے لیکن فدوی نے روک دیا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی جرم کرنا چاہتے ہیں اور آوارہ گرد پھر رہے ہیں ان کی نگرانی کی جاوے۔ سر انٹی میکڈانل بڑا خونخوار قسم کا شخص تھا اور کمشنر تک کو نہایت سخت الفاظ کہہ دیتا تھا۔ اور سب اس سے ڈرتے تھے۔ جب کلکٹر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کے پاس جواب طلبی کے کاغذات آئے تو انہوں نے کانسٹیبل کو بلا کر دریافت کیا اور یہ قرار پایا کہ اس کا جواب بھیج دیا جائے۔ اس نے کہا میں نے لاٹ صاحب کو ہمیشہ چار گھوڑوں کی گاڑی میں چار سوار آگے چار پیچھے جاتے دیکھا تھا میں یہ خیال ہی نہیں کر سکتا تھا کہ لاٹ صاحب اس طرح پیر گاڑی پر جا سکتے ہیں میں یہ جھوٹ سمجھا کہ یہ لاٹ صاحب ہیں اور دونوں صاحبان کو آوارہ گرد سمجھا چنانچہ میں نے رپٹ لکھوا دی جس کی نقل ہمرشتہ بیان ہذا ہے۔ کانسٹیبل کے ساتھی سمجھتے تھے کہ وہ معطل کر دیا جائے گا مگر انٹی میکڈانل نے اس کی تعریف کی کہ حکم کی تعمیل کرتا ہے اور اپنے فرض منصبی کو ٹھیک انجام دیتا ہے اور اس کو ترقی دے کر سب انسپکٹر بنا دیا'' (جلد اول صفحہ ۱۷)۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ یہی واقعہ اگر ہمارے کسی چیف سکرٹری یا گورنر کے ساتھ پیش آیا ہوتا تو ان کا ردعمل کیا ہوتا اور اس بچارے کانسٹیبل کا کیا انجام ہوتا!

غرض نواب سر یامین خان صاحب کا نامہ اعمال ایسی ہی تفصیلات سے مملو ہے اور شاید سیاست کے طالب علموں کے لئے مفید مطلب بھی ہو۔ بلبلِ ہند مسز سروجنی نائیڈو کے حالات میں لکھتے ہیں کہ وہ علی گڑھ اولڈ بوائز کو محبت اور پیار سے (alligator کے وزن پر) ''علیگیٹر'' کہا کرتی تھیں (جلد اول صفحہ ۳۲)۔ یہ داستان ایک ایسے ہی ''علیگیٹر'' کی داستان ہے۔

◎

رسیدی ٹکٹ

امرتا پریتم کی مختصر سی خودنوشت ''رسیدی ٹکٹ'' مدتوں پہلے چھپی تھی۔ اس کا جو نسخہ میں نے لاہور میں دیکھا تھا وہ دہلی کا چھپا ہوا تھا۔ پھر سویڈن میں اس کا ایک نسخہ دیکھا وہ لاہور کا چھپا ہوا تھا اور اپنی وضع قطع سے ہی ''پائیریٹ ایڈیشن'' لگتا تھا۔ لکھائی چھپائی نہایت معمولی اور کاغذ ناقص۔ امرتا پریتم کو اکثر اس بات کا شکوہ رہا کہ ان کی کتابوں کے پائیریٹ ایڈیشن دھڑا دھڑ چھپتے اور بکتے ہیں اور پاکستان کے پبلشرز تو اس معاملہ میں حد سے بڑھے ہوئے ہیں کیونکہ انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ ہندوستان کے پبلشرز بھی انہیں رائیلٹی سے محروم رکھتے ہیں۔ اس کا مداوا کرنے کی انہوں نے بہت کوششیں کیں۔ جب اسمبلی کی نامزد رکن تھیں تو اس مضمون کا ایک بل بھی اسمبلی سے پاس کروانے کی کوشش کی مگر بے سود! ان تمام باتوں کے باوجود ان کے اخراجاتِ زندگی کا دارومدار ان کی کتابوں کی رائیلٹی پر تھا اور برصغیر میں اگر کوئی مصنف اپنے حق تصنیف کے بل بوتے پر زندہ رہ سکتا ہے تو اس کا کمال ہے۔ امرتا پریتم کے آخری سالوں میں ان کی تمام تر آمدنی کا انحصار ان کی کتابوں کی رائیلٹی پر تھا اور ان کے رفیق زندگی امروز کا کہنا ہے کہ ہمارا خرچ ہماری جیب کے مطابق تھا اس لئے ہمیں کوئی دقت نہیں تھی۔ امرتا پریتم کی خودنوشت میں اس بارہ میں کچھ موجود نہیں۔

ازاں بعد رسیدی ٹکٹ کا ایک ایڈیشن اور بھی ایسا نظر سے گذرا جس پر نہ دہلی لکھا تھا نہ لاہور اور اس پر ناول لکھا ہوا تھا۔ لگتا تھا کسی نے امرتا پریتم کے کسی ناول کا ہندی سے ''ترجمہ'' کرنے کی کوشش کی ہے کیونکہ زبان صاف نہیں تھی۔ امرتا پریتم پنجابی کی شاعرہ اور ادیبہ تھیں مگر ان کا نوجوانی کا زمانہ ایسے ماحول میں گذرا تھا جس میں زیادہ تر اردو بولی جاتی تھی ریڈیو سے ان کا نشریاتی رابطہ تھا۔ لاہور کے ادبی حلقوں سے متعارف تھیں اس لئے ان کے ہاں اردو زبان کا رچاؤ موجود تھا یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے اپنے ادبی خیالات کے اظہار کے لئے پنجابی زبان کا وسیلہ اختیار کیا۔ ان کے گھر کا ماحول بھی علمی

ماحول تھا ان کی جذباتی وابستگی بھی ایک مسلمان سے ہونا مقدر تھی حالانکہ ان کے گھر کے ماحول میں ایک مسلمان کی چھوئی ہوئی چیز کو بھی ان کی اماں سینت سنبھال کر استعمال کے برتنوں سے دور رکھ دیتی تھیں۔ امرتا نے قدرت کی اس ستم ظریفی کا ذکر بھی کیا ہے۔

خوش ونت سنگھ نے امرتا سے کہا'' تمہاری خودنوشت میں ہوگا کیا؟ اتنی سی تو باتیں ہوں گی جو ایک رسیدی ٹکٹ پر پوری آ جائیں''۔ امرتا پریتم کی خودنوشت کا نام اسی لئے رسیدی ٹکٹ ہے مگر کسی انٹر ویو میں امرتا نے کہا تھا کہ انہوں نے خوش ونت سنگھ سے کہا تھا'' خوش ونت یاد رکھو جس کاغذ پر رسیدی ٹکٹ لگ جاتا ہے وہ کاغذ پکا کاغذ ہو جاتا ہے''۔ اس لئے میں کہتا ہوں رسیدی ٹکٹ پکے کاغذ پر لکھی ہوئی خودنوشت ہے۔ کھری، کھوٹ سے پاک اور جھوٹ ملمع سازی سے دور۔

کوئی بچہ ماں سے اپنی ابویّت کے بارہ میں نہیں پوچھتا مگر امرتا کے ایک بیٹے کو اس کے سکول کے سنگیوں ساتھیوں نے طعنے دئے کہ تم اپنے باپ کے بیٹے نہیں ساحر کے بیٹے ہو تو اس نے ماں سے پوچھ لیا'' ماما! کیا میں انکل ساحر کا بیٹا ہوں؟'' ماں نے جواب دیا نہیں تم اپنے باپ ہی کے بیٹے ہو۔ اور اس بات کو رسیدی ٹکٹ میں لکھ بھی دیا کہ جب یہ بچہ رحمِ مادر میں تھا اس زمانہ میں ساحر اس کے تصورات پر چھایا رہتا تھا اس لئے بچے کی شبیہ ہو بہو ساحر کی ہے اور اسی بات سے لوگ باتیں بناتے ہیں۔ امروز سے وابستگی کی داستان چالیس برسوں پر محیط ہے دو انسانوں کی بے لوث رفاقت کی داستان!

ساحر کے ساتھ امرتا کا عشق چھپا ہوا راز نہیں تھا۔ حمید اختر نے احوالِ دوستاں اور بعد کو آشنائیاں کیا کیا میں ساحر کے خاکے میں ایشر کور کے معاشقہ کو تو بہت نمایاں کیا ہے مگر امرتا کے باب میں خاموشی اختیار کی ہے۔ امرتا نے ساحر کی بیماری میں اس کی چھاتی پر وکس ملنے اور مالش کرنے کا ذکر چھپایا نہیں رومانوی انداز میں بیان کیا ہے۔ حمید اختر اس طرح نہ کہہ سکتے جس طرح امرتا نے سب کچھ کہہ دیا۔ عورت مرد کے تعلقات کو بدنیتی بدنظری سے دیکھنا اور اسے پراسرار بنانا مردوں کا وطیرہ ہے۔ خدا جانے ان کو اس طرح کی بات کہنے میں منفی سا حجاب کیوں ہوتا ہے؟

رسیدی ٹکٹ، اپنی نوعیت کی عجیب خودنوشت ہے امرتا پریتم نے اپنے آپ کو عورت ہونے کے ناطے نہیں دیکھا نہ ہی اس حوالہ سے اپنے آپ کو کمزور یا کسی کا دست نگر جانا ہے۔ کشور ناہید جیسی

بہادر عورت نے عورت ہونے کو اپنی کم زوری سمجھا ہے اور عورتوں پر ہونے والے مبینہ اور معینہ مظالم کی متھ کو اپنی کتھا کا حصہ بنالیا ہے۔ امرتا پریتم نے اپنے اندر کی شاعرہ اور ادیبہ کو انسان ہونے کے ناطے سے ہی جانا پہچانا ہے اس کی خودنوشت اس بات کی گواہ ٹھہرتی ہے کہ ادب مذکر مؤنث نہیں ہوتا محض ادب ہوتا ہے۔

◎

میں کیا میری حیات کیا

علی گڑھ یونیورسٹی کے ریٹائرڈ پروفیسر جناب اطہر صدیقی کی خودنوشت ''میں کیا میری حیات کیا'' ۲۰۰۳ میں علی گڑھ سے شائع ہوئی۔ صدیقی صاحب کی یہ خودنوشت ان کی زندگی کی چھوٹی چھوٹی اور غیر اہم کامیابیوں ناکامیوں کی تفصیل سے بھری ہوئی ہے۔ ان کی طالب علمی کے زمانہ کی باتیں، دوستوں عزیزوں کی آویزشیں، آمیزشیں، رومان اور ان کے نتیجہ میں ہونے والی شادیاں ان کو بہت یاد ہیں اور انہی کا ذکر انہوں نے زیادہ تر کیا ہے۔ امریکہ، نائیجیریا۔ لیبیا گئے ہیں تو وہاں کے سفرنامے بھی خودنوشت کا حصہ بنالئے ہیں۔

دوسرا حصہ ایسی ہی تفصیلات کا مرقع ہے۔ علی گڑھ سے وابستگی کا پڑھتے ہی قاری جو توقعات ایک علیگ سے وابستہ کرلیتا ہے صدیقی صاحب نے ان توقعات کو اپنے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ خودنوشت قاری کی دلچسپی سے محروم ہوگئی۔ رشید احمد صدیقی سے ان کا پڑوس تھا۔ ان کی بیگم ہر وقت بیگم صدیقی کے ہاں بیٹھی رہتی تھیں سلمیٰ صدیقی اور کرشن چندر سے بھی ان کے قریبی مراسم تھے مگر ان سب باتوں کے باوجود اس خودنوشت میں ادب کے قاری کے لئے کوئی دلچسپی کا سامان نہیں۔

ان کے برادر نسبتی عثمان صاحب کی ادنیٰ ادنیٰ بے وفائیوں کا اور ان کے رفقاء کی ستم رانیوں کا بہت تذکرہ ہے اور شاید یہ خودنوشت ہی ان بے مہریوں کو ریکارڈ کرنے کے لئے لکھی گئی ہے۔ عنوان بڑا مناسب ہے میں کیا میری حیات کیا ایسی ہی غیر اہم باتوں کا تذکرہ مقصود تھا تو خودنوشت بھی کیا لکھنا ضرور تھی؟

کار جہاں دراز ہے

محترمہ قرۃ العین حیدر کا سوانحی ناول کارِ جہاں دراز ہے، بڑی مدت سے دہلی اور کراچی کے ادبی رسائل میں قسط وار چھپ رہا تھا۔ اب سنگ میل لاہور والوں نے اس سوانحی ناول کے تینوں حصوں کو یکجا کر کے تقریباً نو سو صفحے میں مدون کر دیا ہے۔ قبل ازیں جو حصے وقتاً فوقتاً کتابی صورت میں مدون ہوئے ان میں بعض تصویریں بھی شامل تھیں مگر اب تصویریں دو علیحدہ ضخیم جلدوں میں ''کفِ گل فروش'' کے عنوان سے چھپ گئی ہیں یہ گویا محترمہ قرۃ العین حیدر کی تصویری خودنوشت ہے۔ جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ! ان کی خودنوشت کے بیانیہ میں ویسے بھی ''جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی'' کا مضمون تھا۔

اپنی زندگی کے نشیب و فراز بیان کرنے کے لئے محترمہ قرۃ العین حیدر نے تاریخی ناول نویسی کا اسلوب اختیار کیا اور خوب کیا۔ ایسا کرنے سے انہیں بہت سی ایسی آسانیاں میسر آ گئیں جو بہ صورت دیگر ان کی راہ کی رکاوٹ بن جاتیں۔ احوال کے بیان میں انہیں دوسروں کی روایتوں پر انحصار کرنے کی سہولت ملی ورنہ اپنے آبا و اجداد کے تاریخی احوال و آثار کو سمیٹنا ان کے لئے ممکن نہ ہوتا۔ تاریخی ناول نویسی کا اسلوب جتنا آسان نظر آتا ہے اتنا ہی مشکل ہوتا ہے۔ وقت کے سمندر میں اتر کر ماضی میں زندگی کرنا ماضی کے لوگوں کے ساتھ رہنا اٹھنا بیٹھنا گفتگو کرنا اور پھر اس کی تہہ میں چھپی ہوئی اپنے مطلب کی بات اچک لینا آسان نہیں ہوتا۔ تاریخ کا مطالعہ کرنا ماضی کے پردوں میں لپٹے ہوئے حقائق کے کرم خوردہ پارچوں کو احتیاط سے کھولنے اور پڑھنے کا نام ہے ذرا سی بے احتیاطی حقائق کا چہرہ اور ذائقہ مسخ کر سکتی ہے۔ ''دیمک نے جو لکھے وہ نوشتے پڑھا کرو''۔ تاریخی ناول کا اسلوب دیمک کے لکھے ہوئے نوشتے پڑھنے کا نام ہے۔ اپنے آبا و اجداد یعنی سادات نٹھور کی مستند تاریخ مرتب کرنا مشکل کام تھا قرۃ العین حیدر اس مرحلہ سے بخیر و خوبی گذر گئی ہیں اور باقاعدہ ریسرچ کر کے اس فرض سے

عہدہ برآ ہوئی ہیں۔ ہر مردے و ہر کارے! کوئی اور اس تندہی سے یہ کام نہ کرتا۔ اپنے آباء سے اتنی دلچسپی لیتا ہی کون ہے؟ جوش صاحب نے دلچسپی کا اظہار تو کیا مگر دوسروں کے کہے پر انحصار کر کے اپنے مطلب کے نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اجداد کی تاریخ پدرم سلطان بود کا نعرہ بن کر رہ گئی۔ قرۃ العین حیدر نے کہیں اپنے اجداد کی بڑائی اور تفاخر کا نعرہ نہیں لگایا ہاں سادات نٹھور نے دنیا میں کہیں بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ دنیا کے جس ملک میں گئی ہیں وہاں انہیں اپنے عزیزوں میں سے کوئی نہ کوئی ضرور ملا ہے کوئی بھتیجا کوئی بھانجا کوئی اس شاخ کا پھل کوئی اس شاخ کا ثمر (کار جہاں دراز ہے جلد سوم صفحہ ۸۱۲)۔ چمن میں ہر طرف بکھری پڑی ہے داستاں میری! وہ اپنے نٹھوری عزیزوں کے مابین ''ملکہ مکھی'' یعنی Queen Bee بن کر رہیں (صفحہ ۶۵۰) کار جہاں دراز ہے انہی سادات نٹھور کی موجودگی کی وجہ سے دراز تر ہوتی رہی۔ ان کے اس سوانحی ناول میں جو ذاتی اور خصوصی لمس پیدا ہوا ہے وہ اسی قبیلے کے رومان کا لمس ہے۔ میں اپنے قبیلے کی زباں بول رہا ہوں۔ ''ذاتی طور پر میرا ادب پروستین Le Cherche du Temps Perdu گمشدہ زمانوں کی تلاش پر مبنی ہے'' (صفحہ ۱۳) اور ''ان کے ہاں سارے پیریڈ ساتھ ساتھ چلتے ہیں''۔ (صفحہ ۶۱۹)۔

خود مصنفہ نے اس ناول کی ترتیب یوں بیان کی ہے کہ ''دوستو جلد اول میں ۴۰ ۷ سے ۱۹۴۷ تک کی داستان تاجیک نژاد افسانہ خواں نے میڈیول مؤرخ، صوفی تذکرہ نگار، درباری وقائع نویس، فیوڈل داستان گو، وکٹورین ناولسٹ، سیاسی کالم نویس، اور اردو افسانہ نگار کے روپ میں آ آ کر سنائی۔ ۱۹۴۸ سے ۱۹۷۸ تک کا قصہ اپنا اور پاکستانی رشتے داروں اور دوستوں کا جلد دوم میں رقم کیا۔ جلد سوم میں ۱۹۶۲ سے تادمِ تحریر 'داستانِ کشورِ ہند' یہاں کے اعزا و احباب کی' اوپر والے اسٹیج ڈائریکٹر نے اگر چاہا تو' پیش کی جاوے گی۔'' (صفحہ ۷۶۳)

اپنی یادداشت کو وڈیو ٹیپ یادداشت کہتی ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ انہیں ''ڈھائی برس کی عمر کی باتیں یاد ہیں'' (صفحہ ۲۸۸)۔ ایسی یادداشت بہت کم تجربہ میں آئی۔ حکیم نور الدین صاحب مرقاۃ الیقین نے لکھا تھا انہیں ڈھائی برس کی عمر میں ماں کا دودھ چھڑوانا یاد ہے۔ یا خودنوشت نویسوں میں اب قرۃ العین یہ کہتی ہیں۔ اردو سکول سے یہ کہہ کر بھاگ لیں کہ ''ہم اردو سکول نہیں جائیں گے'' (صفحہ

۳۶۷) اور شہرت اردو کے ادیب کی حیثیت سے ہی نصیب ہوئی۔ حالانکہ انگریزی کے جدید ادب پر اخباروں میں اور ریڈیو پر تبصرے کرتی رہیں (صفحہ ۴۹۹) اور انگریزی رسالوں کی مدیرہ رہیں۔ ان کے لکھے پر بھی یہی پھبتی کہی جاتی رہی کہ انگریزی میں سوچتی اور اردو میں لکھتی ہیں اور انگریز مزاجی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ ''اے مادہ پرستو! میں روح کی ارسٹوکریٹ ہوں'' (صفحہ ۵۰۳)۔ کار جہاں دراز ہے روح کی ارسٹوکریسی کی نادر مثال ہے۔ ان کے ''اسلوب میں Romantic sadness موجود رہتی ہے'' (صفحہ ۴۷۹)۔ ''انسان کے اندر ایک اندرونی محل سرا ہوتی ہے'' (صفحہ ۱۹۷) قرۃ العین حیدر اپنی اسی محل سرا کی مقیم ہیں اور اس سے باہر نہیں نکلتیں اور نہ ہی کوئی اجنبی اس محل سرا تک بار پا سکتا ہے۔ اگرچہ دیکھنے میں تو ''گھمسان میں بھی بیٹھ کر لکھتی ہیں'' (صفحہ ۶۲۸)۔ اعجاز بٹالوی نے ان کی کتاب ''ستاروں سے آگے'' پر ساقی میں تبصرہ لکھتے ہوئے لکھا تھا اور انہوں نے قاری کو وہ بات یاد دلائی ہے کہ ''اس کتاب کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے لیڈی ماؤنٹ بیٹن ہندوستان سے جاتے وقت اپنی انگریزی زبان مصنفہ کے افسانوں کے لئے چھوڑ گئی ہیں'' (صفحہ ۵۲۰)۔ لندن میں اعجاز سے ملاقات ہوئی تو شکوہ کیا کہ اعجاز ''وہ مضمون بہت غیر منصفانہ تھا''۔ (صفحہ ایضاً)

خودنوشت کے لئے لازمی قرار دیا گیا ہے کہ واقعات اگر آنکھوں دیکھے نہ ہوں تو محض شنید پر اکتفا نہ کیا جائے۔ دو تین جگہوں پر ایسا ہؤا کہ محترمہ نے محض سنی سنائی پر اعتبار کر لیا۔ مثلاً کسی نے کہہ دیا کہ ''عسکری نے کہا تھا پیغمبروں نے بھی کبھی گلڈ بنائے ہیں'' (صفحہ ۶۶۴) تو اس حوالہ کو کار جہاں دراز میں وثوق سے درج کر دیا۔ یہ بات مولانا صلاح الدین احمد کی کہی ہوئی ہے۔ انتظار حسین کی خودنوشت تو خیر اب آئی ہے اس سے کہیں پہلے فتح محمد ملک ان کی توجہ اس طرف مبذول کروا چکے ہیں۔ اور ان کا خط مؤرخہ ۲۶ جنوری ۱۹۸۳ ''دامانِ باغباں'' کے صفحہ ۱۷۵ پر چھپا ہؤا ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ محترمہ ایک بار جو بات لکھ دیتی ہیں اسے پتھر کی لکیر جانتی ہیں اور اگلے ایڈیشن میں اس کی تصحیح کرنے کی پروا ہی نہیں کرتیں۔

اسی قبیل کا ایک سہو ان سے اپنے خالو میر افضل علی صاحب کے ذکر خیر کے سلسلہ میں ہؤا۔ میر افضل علی صاحب کے جاننے والوں میں اس کتاب کے مرتب ہوتے وقت صرف سر ظفر اللہ خاں زندہ

تھے اور وہی ان کے بارہ میں مستند معلومات انہیں مہیا کر سکتے تھے۔ (میر افضل علی صاحب صاحبِ تخیلات کے بارہ میں تفصیلات سر ظفر اللہ کی خودنوشت تحدیث نعمت میں صفحہ ۱۶۸۔۱۶۹ پر موجود ہیں)۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی صاحب سے انہوں نے حالات جاننے کے لئے استفسار کیا تو انہوں نے اپنے مکتوب مؤرخہ جون ۱۹۹۵ میں انہیں لکھا کہ ''مرحوم کے پرانے دوستوں میں سے اس وقت صرف چوہدری ظفر اللہ خاں صاحب موجود ہیں اگر آپ ان سے استفادہ فرمائیں تو غالباً وہ مزید معلومات مہیا کر سکیں گے'' (دامانِ باغباں صفحہ ۵۵۱)۔ معلوم ہوتا ہے محترمہ قرۃ العین حیدر، ان سے کچھ خوش نہیں تھیں حالانکہ ان سے ان کے خاندانی تعلقات تھے اور سر ظفر اللہ ان کی اماں کو اپنی بہن سمجھتے تھے۔ انہوں نے ایک افواہ کار جہاں دراز میں درج کی ہے کہ میر افضل علی کا انتقال ہؤا تو ''افواہ پھیلی کہ سر ظفر اللہ دہلی سے آ گئے ہیں اور جنازے کو جنت البقیع قادیان لے جانا چاہتے ہیں''۔ (صفحہ ۳۴۵) اول تو افواہ کو درج کرنے میں کیا تک ہے؟ پھر انہیں معلوم تھا کہ میر افضل علی صاحب کا قادیان والوں سے کیا تعلق تھا اور قادیان میں ان کی صحت یابی کے لئے دعائیں بھی ہوتی رہیں (صفحہ ۳۴۴)

مگر قادیان والے تو کسی غیر موصی کو یعنی جس نے بہشتی مقبرہ میں دفن ہونے کے لئے وصیت نہ کی ہو وہاں دفن نہیں کرتے۔ ان کی وصیت تو کوئی تھی نہیں اس لئے سر ظفر اللہ انہیں قادیان تدفین کے لئے کیوں لینے کو آ جاتے؟ میر افضل علی کی تدفین ان کی وصیت کے مطابق شیعہ قبرستان میں ہوئی۔ قرۃ العین حیدر تو اپنے خالو کی مبینہ احمدیت کے باب میں بہت حساس نظر آتی ہیں۔ مالک رام نے اپنے کسی مضمون میں انہیں احمدی لکھ دیا تو باقاعدہ ان سے شکوہ کیا کہ آپ نے تو انہیں احمدی بنا کے دم لیا۔ مالک رام کا خط مؤرخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۶۸ مزے کا ہے۔ ''مرحوم افضل علی سے میری ملاقات تھی۔۔۔ یہ آپ نے کیونکر لکھا کہ میں نے مرحوم کو احمدی بنا کر چھوڑا۔ وہ احمدی تھے۔ ان کے تمام ملنے والوں کو علم ہے اور یہ ان کی کتاب سے بھی ثابت ہے'' (دامانِ باغباں صفحہ ۶۰۷)۔ ایک اور نادرست اور سنی سنائی بات محترمہ نے لکھی ہے کہ میر افضل علی کا ایم اے کا تھیسس محمود غزنوی پر تھا۔ جی نہیں یہ تھیسس بیرم خان پر تھا (تحدیث نعمت صفحہ ۱۸۶)

وامق جونپوری نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ کراچی میں قیام کے ''دوسرے دن میں عینی

کی قیام گاہ پر گیا۔ دیکھا کہ وہ اپنے مکان کے چمن میں پندرہ بیس کتابوں کو سامنے رکھ کر کوئی نوٹ تیار کر رہی ہیں۔ یہ وہی زمانہ تھا جب ان کا معرکہ آراء ناول آگ کا دریا برصغیر میں اردو ناولوں کی سست رفتار دنیا میں ایک سنگ میل بن کر سامنے آیا تھا میرے دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا تاکہ میں آدم جی ایوارڈ کے لئے ڈی بار ہو جاؤں اس لئے مجھ کو ایوارڈ کی جیوری کا ممبر بنا دیا گیا ہے اور یہ سب دوسروں کے ناول ہیں جن پر مجھ کو رائے دینی ہے کہ ان میں سے کون اس ایوارڈ کا مستحق ہے۔ میں نے سب ناول پڑھ ڈالے ہیں اور یہ سب دوسرے تیسرے درجے کے ناول ہیں تاہم کسی ایک کو تو بہرحال آدم جی ایوارڈ ملے گا'' (گفتنی ناگفتنی صفحہ ۱۸۶)۔

اب انگریزی محاورہ کے مطابق خود ''گھوڑے کے منہ'' سے اس بات کی حقیقت سنئے۔ ''فون کی گھنٹی بجی۔ عالی بول رہے تھے۔ فرمایا ''آدم جی ادبی انعام کے ججوں کی کمیٹی بن رہی ہے۔ ایوارڈ آگ کا دریا کو ملے گا۔''

''ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے میں تو یہ انعام لینے سے انکار کر دوں گی''

''''یہ کیا بوگس بات ہوئی'' عالی نے پوچھا ''بوگس'' موصوف کا پسندیدہ لفظ تھا۔

''ابھی چھ سات مہینے قبل وہ ہنگامہ برپا ہوا تھا اب لوگ کہیں گے اشک شوئی کے لئے انعام دے دیا گیا۔ مجھے سمجھا ہے کوئی ہرچرن داس۔''

''یہ کیا بوگس؟''

''مزید برآں۔۔۔ اس انعام سے بچنے کا نسخہ خاکسار کے پاس موجود ہے۔ پوچھئے۔۔۔ کیا؟ ناچیز کو ججوں کی کمیٹی میں شامل کر لیجئے''۔ تین چار دن اس مسئلے پر عالی سے مزید جھائیں جھائیں ہوئی اور موصوف کو بالآخر میری بات ماننا پڑی۔ میں ایوارڈ کمیٹی میں شامل ہو گئی جس کے صدر بابائے اردو مولوی عبدالحق تھے۔ بالاتفاق رائے آدم جی ایوارڈ شوکت صدیقی کی ''خدا کی بستی'' کو دیا گیا۔ (صفحہ ۶۹۸)۔ وامق جونپوری نے جو اتنی مستند اور بے تکلف گفتگو قرۃ العین حیدر سے منسوب کی تھی اس کی حقیقت کچھ اور نکلی۔ ان کی دیگر گفتنیاں بھی اسی قسم کی ناگفتنیاں ہوں گی۔ دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا۔

احوال الرجال کے معاملہ میں کار جہاں دراز بڑی طول طویل بیانیہ کتاب ہے۔ بے شمار لوگ آتے اور ذرا سی جھلک دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں۔ بڑے ادیب، وکیل، جج، بیوروکریٹ، مگر دوام صرف نٹھوری اقربا کو حاصل ہے جو ہر جگہ ہر مقام پر موجود رہتے ہیں۔ ادھر اعجاز بٹالوی، جاوید اقبال، قدرت اللہ شہاب، عالی صاحب، ن م راشد، ادھر خواتین میں نثار عزیز بٹ، جمیلہ ہاشمی، خدیجہ مستور ہاجرہ مسرور اور بس'' ان کے ہاں زیادہ تر انسان سویٹ تھے۔ چند کریک اور تھوڑے سے کروک اور کمینے اور منافق۔ اور ایسے لوگ دنیا میں ہر جگہ پائے جاتے ہیں'' (صفحہ ۶۹۹)۔ ان کے دوستوں میں قدرت اللہ شہاب نے گورنر جنرل غلام محمد کو جس طرح قلم کی زد پر رکھ لیا تھا وہ ہر ایک کو کھلتا تھا۔ ان کے ہاں ان کے تعلق خاطر کا ایک اور رخ سامنے آتا ہے۔ ''اعجاز امریکہ جاتے ہوئے کراچی آئے۔ ایک شام اندھیرا پڑے ہم لوگ شہاب صاحب کو ملنے گورنر جنرل ہاؤس گئے۔ گورنر جنرل غلام محمد صاحب کا انتقال چند روز قبل ہوا تھا جن کے شہاب صاحب سکرٹری تھے شہاب صاحب کا وسیع و عریض عالیشان دفتر روشنیوں سے بقعہ نور بنا ہوا تھا موصوف میز پر بیٹھے ایک مضمون لکھ رہے تھے۔ فرمایا ''آپ کو معلوم ہے مرحوم و مغفور ولی اللہ تھے میں نے ان کو جذب کے عالم میں دیکھا ہے اپنے مضمون میں مرحوم کی شخصیت کے اسی پہلو پر روشنی ڈال رہا ہوں''۔

''شہاب صاحب بات یہ ہے کہ ہم سب ولی اللہ ہو چکے ہیں۔ یہی تو سارا پرابلم ہے'' میں نے قصہ مختصر کیا۔ شہاب صاحب نے مضمون پڑھ کر سنایا'' (صفحہ ۶۴۱)۔ کار جہاں دراز ہے میں کیسے کیسے رازہائے درون میخانہ واشگاف لفظوں میں بیان ہوئے ہیں۔

ایک دو مقامات پر ایک آدھ فاش غلطی بھی نظر آئی مثلاً ایک جگہ جاپانی ہائیکو کا حوالہ دیا تو باشو کو ہاشو لکھ گئی ہیں۔ خیال تھا یہ کتابت کی غلطی ہوگی مگر مکرر ہاشو کا نام نظر آیا۔ اور جس ہائیکو کا حوالہ دیا ہے وہ کوئی خود ساختہ ہائیکو ہے باشو کا ہائیکو نہیں۔ مگر زندگی کے طویل سفر میں ایسی ضمنی باتیں کیا یاد رکھنا بہت ضروری ہوتی ہیں؟

''محمد علی ردولوی ساری عمر مولویوں کی جان کو آئے رہے'' (صفحہ ۵۲۳) مگر یہ مولویوں سے ڈرتی رہیں۔ ایک گاؤں میں پنجاب کے جھومر رقص کی فلم بندی کروا رہی تھیں کہ دیہاتی مولوی ڈنڈے

لے کر پہنچ گئے تو وہاں سے بھاگ لیں۔ مگر یہ لکھنا نہیں بھولیں کہ ''جمخانہ میں دولت مند خواتین رقص کرتی رہیں کیونکہ وہاں مولوی نہیں آسکتے تھے'' (صفحہ ۶۱۱)۔

یادوں کی مکمل باز آفرینی کے باوجود یہ خودنوشت بڑی مکمل اور دلچسپ خودنوشت ہے اور قاری کو اپنی مضبوط گرفت میں لے کر چلتی ہے۔ یہ گرفت کہیں کمزور نہیں پڑتی اور یہ قرۃ العین کی زبان اور اسلوب کا کمال ہے۔ بہت کم خودنوشتیں ایسی مسحورکن ہوتی ہیں۔ نو سو صفحات پر پھیلی ہوئی اس طویل خودنوشت کا خلاصہ یہی ہے ''میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ'' (صفحہ ۶۱۰) اور اس تسبیح روز و شب کا ہر دانہ اپنی جگہ پر صلیب کی طرح گڑا ہوا ہے۔

◎

غبار کارواں

بیگم انیس قدوائی کی ناتمام خودنوشت ''غبار کارواں'' کے نام سے مکتبہ جامعہ نئی دہلی سے ۱۹۸۳ میں چھپی۔ انیس قدوائی، ''کامریڈ'' اور ''نیوایرا'' کے مشہور مضمون نگار ولایت علی بمبوق کی دختر نیک اختر تھیں۔ لکھنے پڑھنے کا شوق رکھنے کے علاوہ سیاسی میدان میں بھی فعال تھیں۔ ان کا گھرانا اودھ کے ان گھرانوں میں تھا جنھوں نے کانگریس کی سیاست کو اختیار کیا۔

غبار کارواں کے نام سے اپنی خودنوشت لکھنا شروع کی مگر ۱۹۲۶ تک ہی پہنچ پائی تھیں کہ اجل نے ان کے ہاتھ سے قلم رکھوالیا۔ جو کچھ لکھ دیا ہے اس میں ان کے خاندان کے ابتدائی حالات اور ماحول کا بیان موجود ہے۔ مرتب کرنے والوں نے ان کی مختصر سی روداد حیات کے ساتھ ان کے مضامین کا انتخاب شامل کر کے کوئی پونے دو سو صفحات کی کتاب بنا دیا۔ ان کی خودنوشت بہ مشکل ایک سو بیس صفحات پر مشتمل ہے۔ اس خودنوشت میں دلچسپی کا سامان ان کے جیٹھ رفیع احمد قدوائی صاحب کا ذکر خیر ہے یا کانگریسی رہنماؤں کے ساتھ ان کے خاندان کے قریبی تعلقات کا۔ اودھ کے اشرافیہ کا تعلق آزادی ہند کی سیاست سے زیادہ تر کانگریس کی وساطت سے ہی رہا۔ اور یہ مختصر سی خودنوشت اس پہلو کو بڑی دل آویزی سے بیان کرتی ہے۔

◎

یادخزانہ

جمیل زبیری کی خودنوشت ''یادخزانہ'' ریڈیو پاکستان سے ان کی پچیس سالہ وابستگی کی کہانی ہے۔جس میں ان کی ملازمت کی چھوٹی چھوٹی باتیں بیان ہوئی ہیں۔کہاں رہے کیوں رہے۔رفقاء کی غیبت ان کا مرغوب مشغلہ ہے۔خواتین فنکاروں پر ان کی خصوصی توجہ ہے۔مشفق خواجہ نے اس یاد خزانہ کو جان عالم کا پری خانہ کہا ہے تو کوئی بے جا نہیں کہا۔لکھنے والے کو اتنا غلو اپنے احوال کے بیان میں ہوتا تو بھی کوئی بات ہوتی اور قاری شاید ان کی باتوں کو پڑھنے میں دقت محسوس نہ کرتا۔

◎

امرتسر کی یادیں

یادداشتی ادب پر لکھنے کا سلسلہ شروع کیا تو برسوں پہلے کی چھپی ہوئی اے حمید کی کتاب امرتسر کی یادیں یاد آئی۔ یہ کتاب یادوں، حسرتوں، آرزوں اور خوابوں کا ایک مرقع ہے۔یوں لگتا ہے اے حمید اپنی چھوڑی ہوئی جنم بھومی کا نوحہ نہیں لکھ رہا ہے بلکہ کھلی آنکھوں اپنے ماضی اور مستقبل کے خواب دیکھنے میں مصروف ہے۔امرتسر اس کی خوابوں کا مرکزی نقطہ ہے۔اے حمید کی ان یادوں کو نوسٹلجیا کہنا بھی مشکل ہے کیونکہ اس نے صرف ماضی کو ہی اوڑھنا بچھونا نہیں بنایا ہے حال کا احتساب اور مستقبل کی آرزومندی بھی ساتھ ساتھ چلتی ہے۔اس کا ماضی کا تانابانا امرتسر سے لے کر اندلس اور غرناطہ تک ممتد ہے۔امرتسر کے کمپنی باغ کی سرحدیں قصر الحمراء کے باغوں سے جاملتی ہیں۔امرتسر کی نوحہ خواں اور ویران مسجدوں سے اسے مسجد قرطبہ یاد آتی ہے اور وہ بھی اقبال کی طرح ''شوق مری لے میں ہے شوق میری نے میں ہے'' کا رجز پڑھنے لگتا ہے۔

اے حمید اردو کا وہ ادیب ہے جس کی تحریر رومانیت کی خوشبو سے معطر ہوتی ہے۔ میں نے برسوں پہلے اس کا ناولٹ ''زرد گلاب'' پڑھا تھا اس کا انتساب اب بھی ذہن میں گونجتا ہے اور یہ کوئی شعر نہیں۔اے حمید کی خوب صورت نثر ہے ''موتیئے کے پھولوں پر گرنے والی شبنم! ہمارے پیار میں گھنے جنگلوں کی آگ ہے اور ہماری آواز میں نیلے سمندروں کے گیت ہیں۔ہم رات کی دہلیز پر بیٹھ کر سورج نکلنے کا انتظار کریں گے''۔

اے حمید رات کی دہلیز پر بیٹھ کر سورج نکلنے کا انتظار کر رہا ہے اور امرتسر کی یادیں اس کے سفر کا واحد اثاثہ ہیں۔ وہ بات کرتا ہے تو ہر جگہ اس کی خوشبوں میں ایک تیسری خوشبو شامل ہو جاتی ہے ''کشمیری چائے کی لطیف بھاپ نے کارنس پر رکھے گلاب کے پھولوں کی خوشبو سے مل کر کمرے کو مہکا دیا۔ریحانہ نیلی پتی دار جاپانی پیالیوں میں چائے ڈالنے لگی اور میں نے پائپ سلگالیا اب کمرے کی

فضا میں ایک تیسری خوشبو نے جنم لیا۔ کشمیری چائے، گلاب کے پھول اور ایرن مور تمباکو کی فلیور کا ملاپ۔ یہ تھی تیسری خوشبو امرتسر کی خوشبو۔ کمپنی باغ کے بارش میں بھیگتے اور گرم دوپہروں میں نہر کے کنارے اگے ہوئے مرطوب گھاس اور رات کے پچھلے پہر امرتسر کی کسی گلی میں رخصت ہوتی ہوئی دلہن کی خوشبو۔ امرتسر اس وقت میری سبز چائے کی پیالی میں تھا اور میرے پائپ کے فلیور میں تھا اور میرے سامنے بیٹھے ہوئے والد صاحب کی سمٹی ہوئی آنکھوں میں تھا''۔ (صفحہ ٦٧) یہ اقتباس کسی رومانوی افسانہ کا حصہ نہیں بلکہ جلیانوالہ باغ کے خونیں حادثہ سے متعلق باب کا حصہ ہے۔ اے حمید نے اس حادثہ پر لکھنے کی ابتدا بھی امرتسر کی خوشبو سے کی ہے۔ یہی اُے حمید کی انفرادیت ہے۔ یہی خوشبو ہے جس سے اس کی تحریر مہکتی ہے۔ اس نے خود بھی تو یہی کہا ہے کہ ''وہ قلم سے نہیں لکھتا گلاب کی ٹہنی سے لکھتا ہے!'' (صفحہ ٨٨)

کتاب ''چند یادیں چند باتیں'' سے شروع ہو کر عنوان بہ عنوان ''امرتسر میں چودہ اگست''، ''امرتسر کا جلیانوالہ باغ''، ''امرتسر کا کمپنی باغ''، ''امرتسر کی ایک گلی''، ''امرتسر کی مسجدیں'' غرض امرتسر کے ہر پہلو کو بیان کرتی ہے حتیٰ کہ ''امرتسر کے جن بھوت'' تک اے حمید کی نگاہ سے اوجھل نہیں رہتے۔ مگر کتاب محض رپورتاژ بن کر نہیں رہ گئی ہے۔ اس کتاب میں یادنگاری کی تمام خوبیاں جوبن پر ہیں۔ بیانیہ میں دل آویزی ہے وہی دل آویزی جو اے حمید کی رومانی تحریر کا طرہ ءامتیاز ہے۔ دروازہ مہان سنگھ کا ذکر ہے مگر آغاز باغوں اور پھولوں سے ہوتا ہے ''باغ میں یوکلپٹس کے نوعمر چھریرے درخت ہوا کرتے تھے جن کی لمبوترے پتوں والی ٹہنیاں گرمیوں کی صبح کی ٹھنڈی ہوا میں جھولا کرتی تھیں۔ قیام پاکستان کے پانچ سال بعد جب میں امرتسر گیا تو ان درختوں نے دور سے مجھے آتا دیکھ کر اپنی شاخیں ہلا ہلا کر مجھے اپنی طرف بلایا۔ مجھے اپنی بے زبانی میں خاموش آوازیں دیں اپنی سونفی خوشبو میں میرا نام لے لے کر پکارا! میں نے ایک درخت کے تنے پر ہاتھ رکھا اس کا دل دھڑک رہا تھا درخت کی ایک ٹہنی نے میرے سینے پر ہاتھ رکھا میرا دل بھی دھڑک رہا تھا'' (صفحہ ١٣۔١٤ جستہ جستہ) جب درختوں اور انسانوں کے دل ایک ساتھ دھڑکنے لگیں تو پیار کا جو رشتہ جنم لیتا ہے وہ امر ہوتا ہے۔ ''اس مٹی میں بوئے ہوئے بیج اب تناور گھنے درخت بن کر میری محبتوں کے پرانے درختوں پر سایہ کئے ہوئے ہیں۔ ان درختوں کی

چھاؤں میں کہیں موتیئے کے جھاڑ ہیں اور کہیں جنگلی گلاب کھلے ہیں۔ زندگی کے سٹیج پر جب آخری پردہ گرے گا تو میں واپس موتیئے کی خوشبوں سے مہکتے ہوئے اپنی محبتوں کے ان پرانے رستوں پر نکل جاؤں گا (صفحہ ٩٤) ''جہاں پرندے ہیں جو محبت کرنے والوں کو نہیں بھولتے'' (صفحہ ٢٤) اور ''ایک بڑی پیاری آنکھوں والی گلہری ہے جو شیشم کے پتوں پر بیٹھی سورج کی تابناک روشنی میں اس کی طرف دیکھ رہی ہے''۔ (صفحہ ٦٢) ''گھنی بیلیں ہیں جن کی شاخیں موسم بہار میں گلابی پھولوں کے جھومروں سے لد جاتی ہیں اور ہر طرف گہری ٹھنڈی شبنم آلود خاموشی ہے'' (صفحہ ١٢٣۔١٢٤) اے حمید کا یہی رنگ ہے کہ وہ فطرت سے ہم آہنگ ہو کر زندگی کر رہا ہے اور مر کر بھی اسی فضا کا جزو بن جانا چاہتا ہے۔

یہ کتاب امرتسر کی تمدنی اور تہذیبی زندگی کا بڑا شفاف آئینہ ہے۔ اس شہر میں امیر بھی ہیں غریب بھی ہیں، مسلمان بھی ہیں ہندو بھی ہیں سکھ بھی ہیں مگر سب ''امبرسری'' ہیں جن کے نام اے حمید نے اپنی کتاب معنون کی ہے۔ مگر تقسیم کا غلغلہ ہوا تو مسلم غیر مسلم تفریق ابھر کر سامنے آ گئی اور امرتسر واضح طور پر دو گروہوں میں بٹ گیا وہ جو کلمہ گو تھے اور وہ جو کلمہ گو نہیں تھے۔ مارچ ٤٧ میں فسادات شروع ہو گئے انسان انسان کا دشمن ہو گیا اور اس دشمنی میں انسانیت نے دم توڑ دیا۔ مسلمانوں نے غیر مسلموں کو لوٹا غیر مسلموں نے مسلمانوں کی تکا بوٹی کر دی جو بہیمیت ہوئی اسے اے حمید نے بڑی دیانت داری سے بیان کیا ہے۔ اس نے اپنے ابا جی سے لوٹ مار کی جو داستان سنی وہ اس نے بے کم و کاست بیان کر دی ہے وہ بھی جو مسلمانوں نے کی وہ بھی غیر مسلموں نے روا رکھی۔ اے حمید نے خود جو لوٹ مار کی اسے بھی نہیں چھپایا ''ہال بازار میں سکھ اور ہندو اپنے دکانیں بند کر کے بھاگ گئے۔ مسلمانوں نے ان دکانوں کو لوٹ کر آگ لگا دی۔ ہمارے محلے میں کیسر سنگھ اور لکھی ٹال والے کی منیاری کی دکانیں لوٹ لی گئیں۔ کیسر سنگھ سے جب کوئی گاہک نمبر آٹھ مارکہ ڈور کی گوٹ لینے آتا تو وہ سیڑھی لگا کر بندر کی طرح اوپر چڑھتا اور ایک ڈبے میں سے گوٹ نکال کر لے آتا۔ لوٹ مار کے دن میں نے بھی اسی طرح سیڑھی دیوار کے ساتھ لگائی بندر کی طرح پھرتی سے اوپر چڑھا اور نمبر آٹھ کی ڈور کی پوری درجن گوٹیں لے کر نیچے آ گیا۔ لکھی والی دکان سے میں نے جیلٹ بلیڈ کے کتنے ہی پیکٹ لوٹے اور گھر سنبھال کر رکھ دئے یہ سب کچھ وہیں پڑے کا پڑا رہ گیا'' (صفحہ ٣٧)

اے حمید فروری ۴۷ کے اخیر یا مارچ کے شروع میں کولمبو سے واپس آیا اور مارچ میں اپنی امی اور بہنوں کو لاہور چھوڑ کر واپس کولمبو چلا گیا جہاں سے اس کی واپسی ۱۳ اگست کو ہوئی۔ اس لئے مارچ سے اگست تک کے حالات کا اے حمید عینی گواہ نہیں۔ جلیاں والا باغ پر پورا ایک باب ہے مگر اس باب کے راوی اس کے والد صاحب ہیں جو اس حادثۂ خونچکاں کے موقع پر اس باغ میں موجود تھے۔ یہ اے حمید کی ادبی دیانت ہے ورنہ یوپی کے جلیل قدوائی صاحب نے اپنی خودنوشت ''حیاتِ مستعار'' میں جلیانوالہ باغ کے واقعات یوں بیان کئے ہیں گویا وہ اس وقت اس ''رینگنی گلی'' میں بذات خود موجود تھے۔ حمید نسیم نے بھی اپنی خودنوشت ''ناممکن کی جستجو'' میں امرتسر کا ذکر کیا ہے مگر اس کے امرتسر اور اے حمید کے امرتسر میں پوری ایک نسل کا فرق ہے۔ حمید نسیم کے ہاں رشید جہاں ہیں، رشید الظفر ہیں، ڈاکٹر تاثیر ہیں، فیض احمد فیض ہیں اور چراغ حسن حسرت ہیں۔

اے حمید کے ہاں ان میں سے کوئی موجود نہیں مگر اس کی امرتسر کی یادوں میں محض باغ پھول اور شگوفے ہی نہیں امرتسر کے چھوٹے بڑے سارے عام لوگ شامل ہیں۔ سینڈو ہے جو تنور پر کلچے لگاتا ہے۔ راجپوتی شان کی سفید گچھے دار مونچھوں والے شیخ حبیب ہیں۔ سیف الدین سیف کی ''پرسکون نیم وا گرم آنکھیں'' ہیں بابو غلام محمد بٹ ہے جو سمرقند والوں کے اس قالین کے جواب میں جس پر میکسم گورکی کی تصویر بنی ہوتی ہے ایسا قالین بنا کر انہیں بھیجتا ہے جس پر قائداعظم کی تصویر بنی ہوتی ہے اور سمرقند والوں سے اپنے فن کی داد پاتا ہے۔ امرتسر کا رجز گو نفیس خلیلی ہے۔ موٹی موٹی نشیلی آنکھوں والا اور دبلا پتلا نازک احساس شاعر علاؤالدین کلیم ہے۔ سنہری داڑھی اور لمبے لمبے سنہری بالوں والا ظہیر کاشمیری ہے جو تانگہ ڈرائیور یونین کا جنرل سکرٹری ہے۔ آغا خلش کاشمیری ہیں جو ''شعر کی زمین ختم ہو جائے تو پانی میں اتر جاتے ہیں اور وہاں سے بھی شعر نکال لاتے ہیں'' (صفحہ ۲۰۴) اور سب سے اہم کامریڈ موہن سنگھ بجلی ہے جو جلتے سلگتے شہر میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ایک معصوم شہید لڑکی رضیہ کی دی ہوئی امانت اے حمید کو پہنچانے آتا ہے۔ رضیہ نے شہید ہونے سے پہلے یہ امانت کامریڈ کے سپرد کی تھی۔ یہ ایک تعویذ ہے جس پر سورۃ فاتحہ لکھی ہوئی ہے۔ رضیہ نے یہ تعویذ کامریڈ کے سپرد کیا تھا اور اسے وصیت کی تھی کہ وہ اسے کسی مسلمان کو پہنچا دے۔ (صفحہ ۱۹۴) غرض یہ کتاب ''امبرسریوں'' کی

معاشرت کی نہایت اعلیٰ تصویر ہے وہ معاشرت جو اے حمید کی رگوں میں خون کی طرح دوڑ رہی ہے۔

اے حمید نے محض یادوں کو ہی قلمبند نہیں کیا اپنی نئی نسل کو یاد دلانے کی سعی بھی کی ہے کہ ''کیا کیا کچھ پاکستان پر قربان ہوگیا، کیسے کیسے انمول موتی خاک میں مل گئے، ہماری تاریخ کا یہ ایک الم انگیز باب ہے۔ جس کا ہر ورق ہمارے عظیم شہدا کے خون سے سرخ رو ہے۔ جس کی ہر سطر ایک دیوار گریہ ہے'' ''کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ پاکستان کی نئی نسل کو اس دیوار گریہ کے سامنے لے جاؤں''۔ (صفحہ ۱۲۰) یہ کتاب ہمیں یاد دلاتی ہے کہ ہم پاکستان کی تاریخ کے اس باب کو اپنی قومی زندگی کی تاریخ سے سے پھاڑ کر علیحدہ نہیں کر سکتے اور جو قومیں ایسا کرتی ہیں تاریخ انہیں دیوار گریہ بنا دیا کرتی ہے۔

یادوں کے سائے

"یادوں کے سائے"، محترم عتیق صدیقی کی تصنیف ہے جو ۱۹۴۷ء میں پہلی بار مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہوئی۔ اس میں ان کی اس زندگی کا احوال درج ہے جو سرزمین عراق ومصر میں بسر ہوئی۔ پیش لفظ میں لکھتے ہیں "یادوں کے سائے خودنوشت ہے یا سفرنامہ؟ رپورتاژ ہے یا تاریخی تجزیہ؟ ناول ہے یا افسانوں کا مجموعہ؟ کتابی دنیا کی کس صنف سے آخر اس کا تعلق ہے؟ خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے! لیکن اس کتاب کے بارہ میں یہ بات قطعیت سے کہی جاسکتی ہے کہ یہ اور کچھ بھی ہو مگر ناول یا افسانوں کا مجموعہ نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کتاب میں جو انداز بیان اختیار کیا گیا ہے وہ افسانوی ہے لیکن جو باتیں اس میں کہی گئی ہیں وہ کم وبیش اسی طرح ظہور پذیر ہوئی تھیں" (صفحہ ۵)

عتیق صدیقی کا تعلق فوج کے تعلقات عامہ کے محکمہ سے تھا اور وہ اپنے فرائض کی ادائیگی کے سلسلہ میں جنگ عظیم دوم کے دوران تہران، بغداد اور قاہرہ میں مقیم رہے۔ جنگ عظیم کے خاتمہ پر ان کی ملازمت عرب لیگ کو منتقل کردی گئی۔ قاہرہ میں وہ انڈین لیگ کے عہدیدار رہے۔ مزاجاً کانگریسی تھے اور ثابت قدمی کے ساتھ کانگریس ہی سے وابستہ رہے۔ سیاسی معاملات میں بھی ان کی ہمدردیاں کانگریس کے ساتھ رہیں۔

اس کتاب میں مرقوم واقعات کا دورانیہ چوتھی دہائی کے اواخر کا ہے جب ہندوستان میں آزادی کی جدوجہد اپنے عروج پر تھی اور اپنے مقبوضہ ملکوں پر برطانیہ کی گرفت کمزور پڑ رہی تھی۔ شرق اوسط کے ان علاقوں میں برطانیہ کی جانب سے لڑنے والے ہندوستانی فوجی مشتاق نگاہوں سے آنے والی آزادی کو دیکھ رہے تھے۔ ان میں کوئی مسلمان یا ہندو یا سکھ نہیں تھا وہ سب ایک فوج کے سپاہی تھے مگر آزادی کی خاطر سب کی ہمدردیاں اپنے سیاسی رہنماؤں کے ساتھ تھیں۔ گاندھی، نہرو، جناح تینوں ان کے رہنما تھے۔ لندن اور دہلی میں ہونے والے سیاسی واقعات پر ان کی نظریں لگی ہوئی تھیں۔

اس کتاب کا آغاز ہوا تو شملہ کانفرنس ہو رہی تھی جس میں ہندوستان کے تینوں سیاسی رہنماؤں کو شامل ہونا تھا۔ فوجیوں کی آپس کی گفتگو سے ہی اس کتاب کا آغاز ہوتا ہے۔

عتیق صدیقی صاحب نے شملہ کانفرنس کی ناکامی کا ذمہ دار جناح صاحب کو قرار دیا ہے کہ یہی کانگریس کا موقف تھا۔ قاہرہ میں جب ان کی ملاقات جناح صاحب سے ہوئی تو انہوں نے انہیں مصر میں مسلم لیگ اور ہندوستانی مسلمانوں کے موقف کی نمائندگی کرنے کو کہا صدیقی صاحب نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ وہ "اس کام کے اہل نہیں" (صفحہ ۲۶۹) نہرو سے ان کی وابستگی کھل کر سامنے رہی اور اس پر انہیں یک گونہ فخر ہے۔ کانگریسی حکومت کی جانب سے آصف علی قاہرہ گئے تو ان کا استقبال کرنے والوں میں یہ پیش پیش تھے۔ مسلم لیگ کے ساتھ ان کا رویہ معاندانہ رہا۔

"یادوں کے سائے" سیاسی بحثوں اور مکالموں سے لدی پھندی سرگزشت ہے۔ انہیں افسانوی انداز اختیار کرنے کا خاص شوق ہے اور کہیں کہیں اپنی یادوں کے ذکر کو لذیذ تر بنانے کے لئے رومانوی باتوں کو درمیان میں لے آئے ہیں۔ حسیناؤں سے انہیں ملاقات کے مواقع میسر رہے ان کے ذکر سے اپنے بیان کو معطر کرتے رہتے ہیں۔ کرنل محمد خان نے ایک رنگین مزاج میجر "ن" کا ذکر کیا تھا کہ یہ لوگ ان کے خلوت کدہ میں گئے تو ایک حسینہ نے ان کا استقبال کیا جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی باقی جسم پر کچھ نہ تھا۔ عتیق صاحب نے بھی ایک مصری رقاصہ کا ذکر کیا ہے جس کے جسم پر غالب کے لفظوں میں چارگرہ کپڑے کے سوا کچھ نہ تھا مگر انہیں حیرت ان حاضرین پر ہوئی جن کے ہاتھوں میں تسبیحیں تھیں" اور رقاصہ کے جسم کی گردش جوں جوں تیز ہوتی اسی مناسبت سے تسبیح کے دانوں پر ان کی انگلیوں کی رفتار بھی تیز ہوجاتی" (صفحہ ۱۶۹)

اس کتاب کے لکھنے کی وجہ تسمیہ ان کے قول کے مطابق یہ ہے کہ عتیق صاحب نے قاہرہ میں جناح اور نہرو سے اپنی ملاقات کا احوال کسی رسالہ میں لکھا تھا اس سے ان کے دوست نے تحریک کی کہ انہیں اپنا سارا احوال لکھنا چاہئے۔ نہرو اور جناح سے ان کی ملاقات کا حال اس کتاب میں درج ہے اور سیاسی لحاظ سے کوئی نئی بات اس سے مترشح نہیں ہوتی البتہ ایک راز سے ضرور پردہ اٹھتا ہے کہ سرآغا خان نے انہیں نواب حمید اللہ خان کے نام ایک خفیہ خط دیا تھا کہ وہ انہیں محفوظ طریق سے پہنچادیا

جائے۔ عتیق صاحب نے وہ خط کھول لیا اور پڑھنے کے بعد اسے نواب صاحب کو دہلی بھیج دیا۔ غالباً اس کی نقل بھی اپنے پاس رکھ لی کیونکہ اس کتاب میں اس خط کے مندرجات درج ہیں۔ انہوں نے اپنے قاری کو بتادیا ہے کہ ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

عتیق صدیقی ردولی کے رہنے والے تھے ان کے ہاں محمد علی ردولوی کا ذکر ہے۔ تہران میں ن۔ م۔ راشد ان کے دفتر کے افسر تھے ان کا ذکر ہے۔ دہلی میں میجر فیض احمد فیض سے ان کی ملاقات ہوئی تھی ان کا ذکر ہے۔ ''نگار'' میں یہ لکھا کرتے تھے اس لئے علامہ نیاز فتحپوری کا ذکر ہے۔ بس ادب سے ان کی اتنی ہی وابستگی کا سراغ ان کی اس کتاب سے ملتا ہے۔

ایک ذرا سا واقعاتی مزاح بھی آیا ہے۔ علی گڑھ کے پڑھے ہوئے خان ولی خان تحریک خلافت اور ہجرت کے دوران ہجرت کر کے قاہرہ میں جا بسے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر کے دورہ پیرس کے دوران پیرس میں تھے اور تبلیغ اسلام کا کام کرتے تھے۔ مولانا نے ایک خوب صورت فقرہ چست کیا ہے ''حسن نظامی کی طرح یہ بھی مبلغ ہیں حسن نظامی کی تبلیغ کا مادہ ''بلغ'' ہے ان کی تبلیغ کا مادہ ''بلوغ'' ہے (صفحہ ۱۷۵)

قاہرہ کے دورہ کے لئے میرٹھ کے مولانا کرم علی اور مولانا عبدالعلیم صدیقی (مولانا شاہ احمد نورانی کے والد) بھی قاہرہ پہنچے۔ ان کی زیادہ پذیرائی نہ ہوئی انہیں خیال ہوا کہ عتیق صدیقی ان کی راہ کی روک بنے رہے مگر صدیقی صاحب کا کہنا ہے کہ ''ان کے خلاف پروپیگنڈے کا سب سے بڑا حربہ خود ان کی طویل و عریض داڑھیاں تھیں جو عرب ملکوں میں یہودیوں کے لئے مخصوص سمجھی جاتی ہیں'' (صفحہ ۲۸۹)۔

یہ سرگزشت واضح طور پر ایک کانگریسی کی سرگزشت لگتی ہے مصنف نے مسلم لیگ کے ساتھ اپنے بے جا اور بڑھے ہوئے تعصب کو چھپانے کی ذرا کوشش نہیں کی۔

◎

منزلیں گرد کے مانند

خلیق ابراہیم خلیق صاحب کی خودنوشت ''منزلیں گرد کے مانند۔۔۔'' فضلی سنز کراچی کی جانب سے ۱۹۹۹ میں شائع ہوئی۔ پونے آٹھ سو صفحات کی اس خودنوشت میں تہذیبی تاریخی سیاسی ادبی موضوعات پر شذروں، رودادوں کا طومار بندھا ہوا ہے خود، خودنوشت لکھنے والا اس طومار میں کہیں کھو گیا ہے۔ اب اسے ڈھونڈھ چراغِ رخ زیبا لے کر!

اردو خودنوشت سوانح عمریوں کی تاریخ میں ایسا حادثہ پہلے بھی ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق صاحب نے اپنی جان پہچان کے لوگوں کے سی وی تک اپنی خودنوشت میں درج کر دئے تھے خود ایک طرف چپکے بیٹھ گئے تھے۔ اب حکیم خلیق ابراہیم خلیق صاحب نے وہی وطیرہ اختیار کیا ہے۔ این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔

خلیق ابراہیم خلیق لکھنؤ کے اطبائے جھوائی ٹولہ کے مشہور خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ لکھنؤ کے یہ اطباء دہلی کے شریف خانی خاندان کے حکماء کی ٹکر کے لوگ تھے۔ میں اس مقام پر ''کینڈے'' کا لفظ لکھنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر خلیق صاحب نے اپنی خودنوشت میں ایک جگہ یہ لکھ کر کہ ''غالب اور یگانہ ایک ہی کینڈے کے شاعر ہیں'' (صفحہ ۱۸۶) اس لفظ کی معنویت بدل دی ہے اس لئے ''کینڈے'' کے لفظ سے میرا اعتبار اٹھ گیا ہے۔

ہمارے ہاں لکھنؤ والوں کی بہت کم خودنوشتیں دستیاب ہیں۔ جنرل شاہد حامد صاحب کی خود نوشت ''جنرل کی آپ بیتی''۔ آغا سہیل صاحب کی لاہور سے چھپنے والی خودنوشت ''خاک کے پردے'' اور اب یہ کراچی سے چھپنے والی ''منزلیں گرد کی مانند''۔ جوش ملیح آبادی کی خودنوشت ''یادوں کی بارات'' بھی لکھنؤ والوں کی خودنوشت سمجھی جانی چاہئے مگر خلیق صاحب نے انہیں قصباتی (صفحہ ۳۷) کہہ کر رد کر دیا ہے اس لئے میں انہیں کس منہ سے لکھنؤ والا کہہ دوں؟ میں اس خودنوشت کو پڑھنے کا بہت شوق رکھتا تھا کیونکہ دہلی والوں سے دہلی کا ذکر تو بہت سنا اور ان کے ساتھ دہلی کی بربادی

پر رویا بھی بہت کیونکہ انہیں تو ''سوادِ رومتہ الکبریٰ میں بھی دلی یاد آتی ہے''، مگر لکھنؤ والوں کی یادیں کسی لکھنؤ والے سے سننے کی آرزو تھی۔ اب یہ روداد سنی ہے تو یوں لگتا ہے کہ نہیں سنی۔ لکھنؤ کے باب میں امیر مینائی نے کہا تھا ''یا تو ہم پھرتے تھے ان میں یا ہوُا یہ انقلاب۔ پھرتے ہیں آنکھوں کے آگے کوچہ ہائے لکھنؤ''، مگر اس خودنوشت سے تو یوں معلوم دیتا ہے کہ لکھنؤ سے جو ایک بار نکل گیا وہ نکل گیا اب لوٹ کر آنے یا لکھنؤ کو یاد کرنے کا نہیں۔ خلیق صاحب کی اس خودنوشت میں سب کچھ ہے لکھنؤ کی یادیں نہیں ہیں اور یادیں اس لئے نہیں ہے کہ خود خلیق صاحب نہیں ہیں۔ اور خلیق صاحب اس لئے نہیں ہیں کہ وہ ہجوم شناسان و ناشناساں میں گھرے ہوئے ہیں ان سے فارغ ہولیں تو اپنی یادوں کی طرف توجہ فرمائیں۔ یہ خودنوشت یادوں سے عاری خودنوشت ہے۔

خودنوشت کا عام اصول ہے کہ احوال الرجال میں صرف ان لوگوں کا ذکر کیا جائے جن سے لکھنے والا ذاتی طور پر واقف ہو اور وہ لوگ اس کے احوال میں دخیل ہوں۔ جن کے ساتھ اس نے زندگی کی ہو اور اس کا تعلق محض روشناسی کا نہ ہو۔ خلیق صاحب نے ایک بار کی ملاقات کو ہی کافی جانا ہے اور ایسے لوگوں کے احوال میں بھی طول بیانی سے کام لیا ہے، جن سے ان کی محض جان پہچان تھی۔ نواب جعفر علی خاں اثر صاحب سے انہیں صرف ایک ملاقات کا شرف ملا تھا اس پر انہوں نے ان کی زندگی اور ان کی شاعری کے بارہ میں پورا ایک مضمون لکھ مارا ہے اور اسے اپنی خودنوشت کا حصہ بنا دیا ہے۔ چوہدری محمد علی ردولوی سے ملنے کے لئے ابا کی انگلی پکڑ کر گئے ہیں مگر ان پر یوں مبسوط تبصرہ لکھا ہے جیسے ان کے ساتھ کے کھیلے ہوں۔ یہ کتاب خودنوشتوں کی زمرہ میں اسی لئے کمزور تر سمجھی جائے گی کہ اس میں لکھنے والے نے احوال الرجال کی اہمیت کو سمجھے بغیر بے شمار لوگوں کے حالات کو اپنی خودنوشت میں بیان کر دیا ہے۔ اور تو اور الہ آباد گئے ہیں تو وہاں سے مغربی رقاصہ ایسا ڈورا ڈنکن کی خودنوشت خریدی ہے اور ۵۰۴ سے ۵۱۸ تک چودہ صفحے، ایسا ڈورا ڈنکن کے حالات بیان کرنے میں ضائع کر دئے ہیں۔ تمہی کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے؟

اس کتاب کی دوسری کمزوری یہ ہے کہ خلیق صاحب نے دوسروں کی زندگی کے بعض واقعات یوں بیان کئے ہیں جیسے وہ سب کچھ ان کی آنکھوں کے سامنے ہوُا ہو حالانکہ وہی واقعات وہ لوگ اپنی خودنوشتوں میں زیادہ بہتر طریق سے بیان کر چکے ہیں۔ ذوالفقار بخاری کا استاد بندو خاں سے معافی مانگنے کا واقعہ تو اب زبان زد خلائق ہے۔ خلیق صاحب نے اسی واقعہ کو غیر دلچسپ طریق سے روایت کیا

ہے اور غلط روایت کیا ہے یوں اپنے آپ کو ضعیف راویوں کی صف میں بٹھا لیا ہے۔ (صفحہ ۶۱۹)۔ جگر اور اصغر کے بارہ میں ان کا یہ کہنا قاری کو زہر خند پر مجبور کر دیتا ہے کہ ''اصغر کا انتقال ہو گیا تو (جگر نے) ان کی بیوہ سے شادی کر لی۔ معلوم نہیں یہ کہاں تک صحیح ہے کہ مگر اس زمانہ میں سنا جاتا تھا کہ جگر اپنی جوانی میں انہی خاتون سے محبت کرتے تھے'' (صفحہ ۴۳۸)۔ اول تو یہ کہ آپ سنی سنائی بات اپنی خود نوشت میں کیوں درج کر رہے ہیں؟ دوسرے یہ کہ یہ راز تو ایک ''رازِ افشا'' ہے کہ جگر نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی تاکہ اصغر اس سے شادی کر سکیں۔ اصغر کی وفات کے بعد جگر نے اپنی ہی سابقہ مطلقہ بیوی سے دوبارہ شادی کر لی تھی۔ ایسی کھلی ہوئی باتوں کو سنی سنائی کے طور پر اپنی خودنوشت کا حصہ بنانا کسی صورت میں بھی روا نہیں مگر خلیق صاحب یہ بھی کر گذرے ہیں۔

اس طویل ''خودنوشت'' کے پہلے ۱۵۹ صفحات میں خلیق صاحب کا کوئی وجود نہیں لکھنؤ کی سیاسی سماجی اور ادبی صورت حال پر طویل تبصرے ہیں۔ یہ درست ہے کہ انسان کا ماحول اس کی شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے مگر ماحول کا بیان اپنی شخصیت کے حوالے سے ہونا چاہئے۔ اس خودنوشت میں ماحول کا بیان لکھنے والے کی شخصیت کے حوالے سے نہیں تاریخی سماجی حوالے سے کیا گیا ہے۔ اگر اس طویل حصہ کو اس خودنوشت سے جدا کر کے تاریخ کی کسی نصابی کتاب کا حصہ بنا دیا جائے تو بھی اس تبصرے کی افادیت میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔ احساس یہ ہوتا ہے کہ خلیق صاحب لکھنؤ کی ایک عمومی تاریخ لکھنا چاہتے تھے سو انہوں نے لکھ دی مگر خودنوشت مرتب کرتے وقت اس تاریخ کو اٹھا کر اپنی خودنوشت میں پیوند کر دیا۔ یہ غیر ضروری تفصیلات اس کتاب کی ضخامت کی ذمہ دار ہیں۔ یہی حال اس کے آخری باب کا ہے، بمبئی کے حالات میں جہازیوں کی ہڑتال تک بیان ہو گئی ہے۔ اس کا ان کی خودنوشت سے کہاں کا تعلق ہے؟

لاہور دہلی الہ آباد بمبئی جن جن شہروں میں ان کا جانا ہوا خواہ قلیل ترین مدت کے لئے ہی کیوں نہ ہوا نہوں نے ان شہروں کے ادیبوں شاعروں سے اپنی مختصر ملاقاتوں کے حوالے سے ان کے طول طویل سوانحی حالات اور ان کی شاعری پر توصیفی یا توضیحی مضمون لکھ مارے ہیں اور انہیں خاکوں کے طور پر اپنی خودنوشت میں شامل کر لیا ہے۔ امرتسر میں تو ان کا شاید جانا بھی نہیں ہوُا ڈاکٹر رشید جہاں اور

صاحبزادہ محمود الظفر کے قیام امرتسر کی روداد لکھ دی ہے اور میرا تاثر یہ ہے کہ یہ روداد حمید نسیم کی خود نوشت ''ناممکن کی جستجو'' سے ماخوذ ہے۔ اس وقت حمید نسیم کی خودنوشت میرے سامنے موجود نہیں مگر یہ سب کچھ اس میں کہیں احسن طریق پر بیان ہوا ہے۔ اسی طرح مجاز کے سلسلہ میں جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وہ حمیدہ سالم کی اپنی خودنوشت ''شورش دوراں'' میں زیادہ بلیغ طریق سے بیان ہو چکا ہے۔ خلیق صاحب محض ایک ضعیف راوی لگتے ہیں۔

جاں نثار اختر کے ساتھ انہیں بمبئی میں رہنے کا اتفاق ہوا اس لئے یہ جاں نثار اختر کا دفاع کرنے میں آگے آگے ہیں۔ ۷۳۳ سے ۷۵۷ تک چوبیس صفحات جاں نثار اختر کے رومانوں اور شاعری کی تفصیلات سے مملو ہیں۔ ندا فاضلی نے اپنی خودنوشت ''دیواروں کے بیچ'' میں جاں نثار اختر پر، فاطمہ زبیر کے حوالہ سے بدچلنی کا گھناؤنا الزام لگایا تھا خلیق صاحب اس کے بارہ میں کیوں چپ ہیں؟ حمیدہ سالم کی خودنوشت میں صفیہ اختر کی بے پناہ محبت اور اختر کی ظالمانہ بے رخی اور کٹھور پن کا ذکر ہے انہیں سامنے کی یہ باتیں کیوں نظر نہیں آتیں؟ آتی ہیں تو انہیں دفاع کی کیا ضرورت ہے؟ انہیں تو یہ تک معلوم نہیں ہے کہ صفیہ سراج جو بعد کو صفیہ اختر کہلائیں علی گڑھ کالج میں اقتصادیات کی لیکچرار نہیں تھیں (صفحہ ۷۳۶) اقتصادیات تو حمیدہ سالم کا مضمون تھا۔ صفیہ اختر گوالیار کالج میں اردو کی لیکچرار اس لئے مقرر ہوئیں کہ ان کا مضمون اردو ادب تھا علی گڑھ کالج میں بھی وہ اردو ادب کی استاد تھیں۔

غرض خلیق ابراہیم خلیق کی طویل خودنوشت کے مختلف حصے اپنی اپنی جگہ مختلف شاعروں کی سوانح مختلف ادبی اجلاسوں کانفرنسوں کی رودادوں، مختلف شہروں کے حالات کے طور پر اہم ہوں گے مگر اس خودنوشت کی اکائی کو مجروح کرنے والے ہیں۔ اس خودنوشت میں لکھنے والے کے ذاتی احوال کی عدم موجودگی کا احساس ناشر کو بھی ہے اس نے کتاب کے آخر میں ایک نوٹ عرضِ ناشر کے عنوان سے شامل کردیا ہے جس میں ان کے ذاتی احوال کا ہلکا سا چھینٹا بھی ہے۔ میں اس خودنوشت کو اسی لئے احوالِ دیگراں کہتا ہوں۔ اس خودنوشت کی سرنوشت کے طور پر فراق کا شعر درج ہے ''منزلیں گرد کی مانند اڑی جاتی ہیں۔ وہی اندازِ جہانِ گذراں ہے کہ جو تھا''۔ معلوم ہوتا ہے خلیق صاحب نے دوسرے مصرعہ میں تصرف کرلیا ہے اور جہانِ گذراں کو جہانِ دیگراں سمجھ لیا ہے۔

◎

احوال دوستاں

حمید اختر ہمارے ہاں کے ترقی پسند ادب کا اہم نام ہے۔ وہ ایک بلند پایہ ادیب اور منجھے ہوئے صحافی ہیں۔ ان کی عمر اسی دشت کی سیاحی میں گذری ہے۔ بائیں بازو کی صحافت اور سیاست کی کوئی تاریخ انہیں نظر انداز کر کے مکمل نہیں کی جاسکے گی۔ انہوں نے اس عمر میں بھی قلم کو ہاتھ سے رکھ کے نہیں دیا اب ان کے ہاں یادوں کی جوت جگانے کا سلسلہ جاری ہے۔ میں ان کی خاکوں اور کالموں کی کتابوں کو ان کی خودنوشت کے طور پر دیکھتا ہوں اور ان کا جائزہ لے رہا ہوں۔

ان کی کتاب ''احوالِ دوستاں'' (۱۹۸۸) میں ان کے بعض دوستوں کے علاوہ ان کا اپنا خاکہ بھی شامل تھا۔ اب وہی احوالِ دوستاں ''آشنائیاں کیا کیا'' کے عنوان سے ۲۰۰۳ میں دوبارہ چھپی ہے تو اس میں بعض اور دوستوں کے خاکے بھی شامل ہیں اور اپنے خاکہ کے نیچے یہ نوٹ دے دیا ہے کہ ''رحلت کے بعد اشاعت کے لئے لکھا گیا تھا مگر دیر ہونے کی وجہ سے قبل از وقت شائع کیا جارہا ہے''۔ اب اللہ کے فضل سے ۲۰۰۶ جارہا ہے خدا کرے حمید اختر جگ جگ جئیں کہ اب ان وفاداروں میں یہی ایک رہ گئے ہیں۔ ان کے ساتھیوں میں احمد ندیم قاسمی صاحب تھے وہ بھی ابھی اسی مہینے رخصت ہوئے ہیں۔ رہے نام اللہ کا!

حمید اختر پکے اور وفادار کارڈ ہولڈر کمیونسٹ ہیں اور اپنے اس موقف پر قائم ہیں۔ تقسیم سے قبل بمبئی میں سجاد ظہیر کے ساتھ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے رکن بنے اور یہ تعلق پارٹی اور انجمن دونوں کے منتشر ہو جانے کے باوجود بھی قائم رہا۔ پاکستان آجانے کے بعد سجاد ظہیر اور سبطِ حسن کے ساتھ مل کر پارٹی کی تنظیم کا کام کرتے رہے۔ اس سلسلہ میں قید و بند کی صعوبتیں بھی اٹھائیں لیکن ان کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آئی۔ کمیونسٹ پارٹی کے پرچوں کی اشاعت میں ان کا فعال حصہ رہا پھر امروز سے وابستہ ہوئے۔ تقسیم ملک سے قبل بمبئی میں بعض فلموں میں

اداکاری کے جوہر بھی دکھائے مگر پاکستان آنے کے بعد اپنی پارٹی کے ہمہ وقتی کارکن بن گئے۔ سجاد ظہیر
اور سبط حسن کے خاکے ان کی زندگی کے اس پہلو کی عمدہ تصویر کشی کرتے ہیں۔

حمید اختر کی کوئی خودنوشت سوانح حیات بہ حیثیت خودنوشت نہیں لکھی گئی مگر ان کے خاکوں
میں دوسروں کے حالات ان کے حوالے سے بیان ہوئے ہیں اور عمدگی سے حمید اختر کی زندگی ان کے
خیالات میلانات اور رجحانات کی عکاسی کرتے ہیں۔ ''احوالِ دوستاں''، ''آشنائیاں کیا کیا''، ''کال
کوٹھڑی'' اور ان کے اخباری کالموں کا مجموعہ ''احوالِ واقعی'' چاروں کتابیں ان کی زندگی کا آئینہ
ہیں۔ (ان کے کالموں کا ایک مجموعہ اور بھی ہے پرسشِ احوال مگر وہ میری دسترس میں نہیں) ان
آئینوں میں سلیم کوثر کے اس مصرعہ کے برعکس کہ ''سرِ آئینہ میرا عکس ہے پسِ آئینہ کوئی اور ہے'' صورت
حال یوں ہے کہ ''پسِ آئینہ یہ خود آپ ہیں سرِ آئینہ کوئی اور ہے''۔ یہ مصرعہ سامنے آیا تو وہ پیروڈی
سامنے آگئی جسے حمید اختر نے اپنے کسی کالم میں روایت کیا تھا کہ ''میں تو اہل ہوں کسی اور کا میری اہلیہ
کوئی اور ہے!'' پانچ سو صفحے کے اس مجموعہ میں شامل کردہ حمید اختر کی یادوں یادداشتوں کے علاوہ اس
پیروڈی نے بھی ہمیں بہت لطف دیا۔ حمید اختر نے پیروڈی کی صنف پر ایک دو کالم بھی کبھی لکھے تھے
کاش وہ اس باب میں اور لکھتے۔ ہمارے ہاں سے یہ صنف نایاب ہوتی جارہی ہے۔ اگرچہ اخلاق احمد
دہلوی کی یہ بات بھی ایک حد تک درست ہے کہ اچھے شعر نہ کہے جائیں تو اچھی پیروڈیاں کہاں سے
آئیں؟ ہم یادنگاری کے حوالہ سے اخلاق احمد دہلوی کے اسلوب کے مداحوں میں ہیں اور اب حمید
اختر کے خاکہ سے اخلاق صاحب کی وفات کا ذکر پڑھ کر دکھ ہوا ہے کہ اس نابغۂ روزگار شخص کے جنازہ
میں صرف تین لوگ شامل تھے۔ بھرے شہر میں تین لوگ! ایسی بے حسی اور ناقدری پر تین حرف!! اپنے
شہر میں اجنبی ہونا اسی کو کہتے ہیں۔

احوالِ دوستاں اگرچہ کالموں کا انتخاب ہے مگر اس میں بھی ان کی یادوں کے جھروکے کھلتے بند
ہوتے ملتے ہیں۔ پاکستان کے ''مردِ مومن مردِ حق'' کے بارہ میں بھارتی صحافی ایم جے اکبر کی بات دل
کو لگتی ہے۔ کہ ''اگر آپ لوگ یا آپ جیسے کچھ دوسرے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صدر ضیاء سے آپ نجات
حاصل کرسکتے ہیں تو آپ غلطی پر ہیں۔ میں آپ لوگوں کو لکھ کردینے کو تیار ہوں کہ یہ شخص جب تک زندہ

ہے آپ کا پیچھا نہیں چھوڑیگا'' (احوالِ واقعی صفحہ ۲۷۵)

یہ بھارتی صحافی ضیاء الحق سے انٹرویو اور ملاقات کرنے کے بعد حمید اختر سے ملے تھے اور اپنی
واردات قلب بیان کی تھی۔ انہوں نے ضیاء الحق سے کہا ''ہم مسلمان تو ہیں مگر بھارت میں پیدا ہونے
اور پرورش پانے کی وجہ سے اسلامی تعلیمات سے کلیتہً نابلد ہیں۔ آپ تو ماشاء اللہ سچے اور کھرے
مسلمان ہیں اور اسلام کی حقیقی روح کو سمجھتے ہیں۔ میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اسلام میں جھوٹے
کی سزا کیا ہے؟'' ضیاء کا جواب تھا جھوٹا بخشا نہیں جائے گا۔ پھر انہوں نے دو تین حدیثیں سنائیں جن
میں رسول اللہ نے کہا تھا اللہ تعالیٰ جھوٹے کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔۔۔۔ اکبر صاحب نے دوسرا
سوال پوچھا ''اپنے اس بیان کی روشنی میں آپ کی اپنے بارے میں کیا رائے ہے؟ کہ آپ نوے روز
میں انتخاب کرا کے اقتدار منتخب نمائندوں کو سونپنے کے وعدے کر کے سات برس سے اقتدار پر بیٹھے
ہیں۔ خیال تھا کہ وہ اس پر ملاقات ہی ختم کردیں گے مگر ضیاء الحق کا جواب تھا۔۔۔۔۔'' ہاہاہا۔
اگلا سوال'' (احوالِ واقعی صفحہ ایضاً)۔

فیض صاحب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جائے گا مگر ملکہ ترنم نور جہاں کی جو بات حمید اختر
نے فیض صاحب کے خاکہ میں بیان کی ہے وہ مرحومہ بیگم سرفراز اقبال کی کتاب دامنِ یوسف سے بھی
کہیں آگے ہے اور ہمیشہ نمایاں رہے گی۔ نور جہاں نے کہا تھا ''میں فیض صاحب سے محبت کرتی
ہوں مگر یہ فیصلہ نہیں کرپائی کہ یہ محبت کس قسم کی ہے۔ اس لئے کہ کبھی تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ میرے
محبوب ہیں۔ کبھی ان کو میں اپنا عاشق تصور کرتی ہوں کبھی وہ مجھے اپنے باپ کی طرح نظر آتے ہیں کبھی
شوہر کبھی بزرگ اور کبھی برخوردار'' (صفحہ ۴۲۔ آشنائیاں کیا کیا) ایسی ہمہ جہت محبت کون کرتا ہے؟

سجاد ظہیر کی شخصیت پر اس سے جامع خاکہ میری نظر سے نہیں گذرا۔ یہ صرف ان کی ذات کا
بیان نہیں ہے کمیونسٹ پارٹی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی ذہنی تاریخ کا حکم رکھتا ہے۔ ہمارے ایک
مرحوم استاد کہا کرتے تھے کہ سجاد ظہیر کی ''روشنائی'' سیاہی سے لکھی ہوئی کتاب نہیں سرخی سے لکھی ہوئی
کتاب ہے۔ حمید اختر نے بھی یہ خاکہ قلم کی روشنائی سے نہیں، دل کے خون سے لکھا ہے۔ سبط حسن کا
خاکہ بھی اسی زمرہ کی چیز ہے۔ یہ حمید اختر کے محض دوست نہیں تھے سیاسی اور قلمی رفیق اور ''صاحب

الجمن'' بھی تھے۔ ان کی دوستی برسر زمین بھی تھی اور ''زیر زمین'' بھی۔ اب یہ زیر زمین کی ترکیب قلم کو کھینچ کر سجاد ظہیر کے خاکہ کی طرف لے آئی ہے۔ ترقی پسند مصنفین کی ۱۹۴۹ والی پہلی کانفرنس میں تاجکستان کے شاعر ترسوں زادہ اور موسیٰ ایبک بھی آئے ہوئے تھے۔ لاہور کے فلیٹیز ہوٹل کے کمرے میں ''احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، سید مطلبی فرید آبادی، صفدر میر، عبداللہ ملک، خود میں اور کچھ دوسرے دوست انجمن کی سرگرمیوں کے بارہ میں باتیں کر رہے تھے۔ مہمانوں کو انگریزی نہیں آتی تھی اور ہم سب روسی زبان سے نابلد۔ البتہ فارسی کی شد بد کا دعویٰ سبھی کو تھا۔ ہم نے سید مطلبی مرحوم کو مترجم کے فرائض انجام دینے کی درخواست کی جو انہوں نے قبول کی۔ مرزا ترسوں زادہ نے پہلا سوال انجمن کے بانی کے بارہ میں کیا۔ اس سوال کا جواب سب نے اجتماعی طور سے دیا کہ سید سجاد ظہیر انجمن کے بانی ہیں۔

''او کجاست؟'' ترسوں زادہ نے سوال کیا (یعنی وہ کہاں ہے؟)

''زیر زمین است'' سید صاحب نے فرمایا (یعنی انڈر گراونڈ)

اس پر ترسوں زادہ اور ایبک دونوں نے انا للہ پڑھی اور فاتحہ کے لئے ہاتھ بلند کئے''
(آشنائیاں کیا کیا صفحہ ۱۴)

بڑی مشکل سے انہیں یقین دلایا گیا کہ وہ مرے نہیں بلکہ لوگوں کی نگاہ سے اوجھل رہ کر کام کر رہے ہیں تو ترسوں زادہ نے سادگی سے فرمایا اچھا تو ''پنہاں است''۔ یہ معمولی سا لفظ فارسی دانوں کی تمام تر فارسی دانی کے باوجود ان کے ذہن میں نہ آیا۔ مگر بات ختم نہیں ہوئی بہت آگے پہنچی۔ ''ہاجرہ اور خدیجہ کے تعارف کے بعد انہوں نے پوچھا کہ پاکستان کی خواتین لکھنے پڑھنے یعنی کہانیاں اور شعر لکھنے کے علاوہ اور کیا کیا کام کرتی ہیں۔ کس میدان میں انہوں نے کوئی کارنامہ انجام دیا ہے وغیرہ۔ اس کا جواب سید مطلبی فرید آبادی نے دیا ''زناں ایں جا پیشہ نمی کنند''۔ (صفحہ ایضاً) کہ (''ہمارے ہاں خواتین پیشہ نہیں کرتیں'') ظاہر ہے سید صاحب کا مطلب تھا کہ ہمارے ہاں خواتین ملازمت نہیں کرتیں مگر بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ اس جواب باصواب سے ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کے دل پر کیا گذر گئی ہوگی؟

ساحر اور ابن انشاء کے خاکے تو گویا خود ان کی سوانح حیات کا ایک باب ہیں کہ یہ تینوں ایک ہی شہر اور ایک ہی علاقہ کے ہیں اور پھر ان کی جوانی دیوانی کا عالم و عرصہ یکجائی میں گذرا ہے۔ اگر شورش کاشمیری جیسے نیک آدمی کی سعی مشکور سے ساحر کو لاہور نہ چھوڑنا پڑتا (احوالِ واقعی صفحہ ۳۱۲) تو شورش صاحب دنیا کو کیا منہ دکھاتے؟ حمید اختر نے لکھا ہے ساحر لدھیانوی'' فرضی نام سے ٹکٹ خرید کر جہاز میں سوار ہوگیا۔ اپنے تئیں اس نے یہ سفر خفیہ طور سے کیا تھا جون کی ایک گرم دوپہر کو ایک لمبا کوٹ اور ہیٹ پہن کر وہ ائرپورٹ پہنچا۔ کہا جاتا ہے کہ جن لوگوں سے چھپ کر وہ گھر سے ائرپورٹ گیا تھا وہ وہاں تک پیچھے پیچھے گئے اور واپس آکر رپورٹ لکھی ''مسمیٰ ساحر لدھیانوی ملک چھوڑ کر چلا گیا ہے'' (آشنائیاں کیا کیا۔ صفحہ ۹۶۔۹۷) ہم نے جو کچھ سنا تھا اس کے مطابق ''چلا گیا ہے'' کے بعد ''الحمدللہ'' بھی لکھا ہوا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

''احوالِ دوستاں'' میں ابنِ انشاء کا خاکہ پڑھ کر میں نے احمد بشیر کے سوانحی ناول ''دل بھٹکے گا'' میں مذکور کردار'' بیدل صحرائی'' کو پہچانا تھا اور اپنی اس پہچان کی داد احمد بشیر سے حاصل کی تھی کہ ''میں پروفیسر پروازی کو داد دیتا ہوں کہ وہ میرے سارے بھید جانتے ہیں اور میرے ناول کے کردار بیدل صحرائی کا اصل نام بھی ان سے چھپا نہیں یہ میں مانتا ہوں میں انہیں نہیں جانتا اگر جانتا تو کم از کم انہیں شکریہ کا خط ہی لکھ دیتا'' (نیا زمانہ۔ اکتوبر ۲۰۰۴) حیف کہ نیا زمانہ کے لئے یہ خط احمد بشیر کا آخری خط ثابت ہوا۔ احمد بشیر کا اتنا کہہ دینا ہی حمید اختر کی کامیاب خاکہ نویسی کی دلیل ہے کیونکہ یہ خاکہ پڑھنے سے قبل میں ذاتی طور پر ابنِ انشاء کی شخصیت سے اس حد تک واقف نہ تھا کہ بیدل صحرائی کو پہچان لیتا۔

اپنے خاکہ میں حمید اختر نے لکھا ''خوش پوش، خوش گفتار، نیک نفس مگر کم عقل بلکہ بیوقوف، یہ تھے حمید اختر۔ عمر بھر توہمات، تعصبات اور مذہبی جنون پرستوں کے خلاف سینہ سپر رہے'' (آشنائیاں کیا کیا صفحہ ۱۲۷)۔ خاندانی طور پر سید تھے مگر بزرگوں نے سید کہلوانا چھوڑ دیا تھا۔ بچپن میں قرآن حفظ کیا برس ہا برس تک کوئی نماز قضا نہیں کی اور مسجد میں جا کر پڑھتے رہے مگر چودہ پندرہ برس کی عمر کے بعد ادھر کا رخ نہیں کیا۔ اس کی وجہ ان کے استاد کی بلاوجہ کی مار پٹائی تھی۔ لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی

سے ہم۔ چالیس برس معاشرہ کو بہتر بنانے کی جدوجہد میں گزارے اور عین ممکن ہے اس ثبات قدم کی وجہ بھی حکومت وقت اور پولیس کی بلا وجہ کی سختیاں اور قید و بند کی صعوبتیں ہوں۔ ''البتہ آخری عمر میں اپنی کوتاہیوں اور بیوقوفیوں پر بہت کڑھتے تھے'' (ایضاً صفحہ ۱۷۸)۔ احوال واقعی میں آپ نے بیوقوفی کے لئے فارسی کا مترادف ''سادہ لوح'' بیان کیا ہے (احوال واقعی صفحہ ۲۴۵) اسی ناطہ سے ہم نے اس تجزیہ کا عنوان سادہ لوح وفادار رکھا ہے۔

ان کے خاکے نہایت مکمل اور ان کا طرز بیان نہایت جامع و بلیغ ہے۔ مزاح اور شگفتگی کی ایک لہر مسلسل چلتی ہے جس کی وجہ سے ان کی تحریر کا بہاؤ قاری کو بہائے لئے جاتا ہے۔ بین السطور طنز کی کاٹ گہری ہے اور وہی لوگ اسے محسوس کر سکتے ہیں جو ہمارے ادب کی روایات سے پوری آگاہی رکھتے ہیں۔ نئی نسل کے لئے ان کی باتیں سبق آموز اور قابلِ تقلید ہیں۔

آپ بیتی

شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلوی کی ''آپ بیتی'' (یادایام) بڑی تقطیع کے پندرہ سو صفحات اور سات اجزاء پر مشتمل ہے اور اس میں ان کے بچپن سے لے کر پیرانہ سالی تک کے ہر دور کے واقعات وحالات درج ہیں جو مولانا نے خود لکھوائے ہیں۔ کتاب کے آغاز میں ''سوانح یوسفی'' یعنی ان کے بھائی مولانا محمد یوسف کے سوانح حیات مرتبہ سید محمد ثانی لکھنوی پر ان کا ایک تنقیدی خط بھی شامل کیا گیا ہے جس میں ان کے والد صاحب کے اور ان کے اپنے حالات کا تذکرہ ہے۔ کتاب کا یہ حصہ مولانا علی میاں کا لکھا ہوا ہے۔ علی میاں نے غالباً اس خیال سے کہ ان کے والد صاحب کی سیرت پر کوئی حرف نہ آئے تربیت اولاد کے باب میں ان کی شدت کا ذکر ترک کر دیا تھا مگر مولانا زکریا نے اس بات کو سخت ناپسند کیا اور علی میاں کو لکھا کہ ''تم نے گلاب کی حوض میں ایک بوتل پیشاب کی ڈال کر یا مہذب الفاظ میں نفیس مخمل میں پرانے ٹاٹ کا پیوند لگا کر کتاب کو بدنما کر دیا'' (آپ بیتی صفحہ ۶)۔ اور پھر تفصیل سے تربیت کے ضمن میں والد صاحب کی شدت کا ذکر کیا۔ اس شدت کی وجہ سے خود ان کی شخصیت میں ''جمود اور تنگ نظری پیدا ہوگئی وہ بڑی تنبیہات کے بعد پیدا ہوئی ہے'' (صفحہ ۴)

اس کے بعد تفصیل کے ساتھ اپنے والد محترم مولانا محمد یحیٰ کی تنبیہات کا ذکر کیا ہے۔ اور ان کا ایک قول بیان کیا ہے کہ ''اگر تو پٹتے پٹتے مر گیا تو تو شہید ہوگا مجھے ثواب ہوگا'' (صفحہ ۲۰) انہی تنبیہات کا اثر ہے کہ جب خود منصب تدریس پر فائز ہوئے تو اپنے شاگردوں پر ایسی ہی سختیاں روا رکھیں۔ اس امر کا ذکر اس لئے بھی ضروری ہے کہ ہمارے دینی مدارس میں طلبا کو ذہنی طور پر تنگ نظر بنانے کی سعیء بلیغ کی جاتی ہے اور تنبیہات کے نام پر انہیں یک رخا بنا دیا جاتا ہے اور ان کی ایسی ذہنی صفائی کر دی جاتی ہے کہ وہ اپنے مسلک کے سوا دوسرے کسی مسلک کی بات سننے کے روادار نہیں رہتے۔ مولانا زکریا نے اپنے مدرسہ مظاہر العلوم میں اپنے شاگردوں پر جو قیود عائد کیں ان کا نمونہ رئیس الاحرار مولانا حبیب

الرحمٰن کے صاحبزادوں پر عائد کی جانے والی قیود سے کیا جاسکتا ہے۔

''اول اخبار دیکھنے کی بالکل اجازت نہیں ہوگی۔

دوم۔ کسی جلسہ میں جانے کی اجازت نہیں ہوگی۔

سوم میری اجازت کے بغیر مدرسہ سے نکلنا نہ ہوگا

چہارم طلبا سے تعلقات رکھنے نہ ہوں گے نہ دوستی نہ دشمنی نہ محبت کے نہ مخالفت کے۔ (صفحہ ۲۰۔ آپ بیتی حصہ دوم)

ایسی قیود میں جو بچہ تعلیم حاصل کرے گا وہ یک رخا اور تنگ نظر نہ ہوگا تو کیا ہوگا۔

مولانا زکریا کی آپ بیتی مدرسوں کی اصلاح کا دعویٰ کرنے والے لوگوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوسکتی ہے۔ انداز روزانہ کی ڈائری کا ہے جس میں روزمرہ کے معمولاتِ زندگی و تدریس بیان ہوئے ہیں۔ اپنے مدارس کے اور اپنے تخصص کے ساتھ وقف جیسی وابستگی قابلِ ستائش ہے۔

◎

کالا پانی

مولانا جعفر تھانیسری کی خودنوشت موسوم بہ ''کالا پانی'' دو حصوں میں لکھی گئی۔ پہلا حصہ تاریخ عجیب کے نام سے اپریل ۱۸۷۹ میں اور دوسرا حصہ تواریخ عجیب کے نام سے ۱۸۸۵ میں لکھا گیا۔ دونوں حصوں میں کوئی چھ سال کا فصل ہے۔ عام طور پر اس خودنوشت کو اردو کی پہلی خودنوشت سمجھا جاتا ہے اور میں نے اس کا ذکر اس کتاب کے آغاز میں اسی طور سے کیا ہے۔ مگر اب دونوں حصے دستیاب ہیں اس لئے تفصیلی تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کتاب کے ساتھ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب خطیب مسجد اہل حدیث گوجرانوالہ کا دیباچہ ہے جس پر ۳ ستمبر ۱۹۴۱ کی تاریخ درج ہے۔

مولانا جعفر تھانیسری اہالیانِ تھانیسر کے معززین میں سے تھے، نمبردار تھے وکالت پڑھے ہوئے تھے۔ عقائد کے لحاظ سے اہلِ حدیث کے اکابر سے تعلق تھا۔ انگریزوں نے انہیں وہابی قرار دے رکھا تھا اور اس فرقہ کے درپے تھے۔ انگریزوں کے خلاف مغربی ہند میں جو جہاد جاری تھا اس میں دامے درمے قدمے سخنے حصہ لیتے تھے۔ ۱۸۶۳ میں ایک مخبر کے کہنے پر ان کی خانہ تلاشی ہوئی اور ان کا ایک خط جس میں کچھ قابلِ اعتراض باتیں تھیں پولیس کے ہاتھ لگ گیا جس پر ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوگئے۔ یہ وہاں سے فرار ہوئے مگر علی گڑھ سے گرفتار ہوگئے۔ اپنے فرار پر اپنے آپ کو ملامت بھی کرتے رہے۔ قید و بند کی حالت میں کسی نے ان سے پوچھا کہ ان کی گرفتاری کی کیا وجہ ہے تو اسے جواب دیا ''میں جس کا غلام تھا اس کے حکم کے بغیر بھاگ نکلا۔ وہ ناراض ہوگیا اور مجھے راستہ ہی میں پکڑوا دیا'' (کالا پانی صفحہ ۳۱)۔ کتاب میں متعدد مقامات پر اپنی تدبیر پر بھروسہ کرنے اور خدا کی تدبیر و اعانت کو نظر انداز کرنے کا خمیازہ بھگتنے کا ذکر ہے۔

ان پر بے پناہ جسمانی تشدد کیا گیا لیکن اسے جھیل گئے اور کسی دوسرے کا نام ملوث نہیں ہونے دیا۔ وہابیوں پر جو ظلم و تشدد مسٹر چیمبرلین کی سرکردگی میں ہو رہا تھا اس میں شیخ الکل میاں نذیر حسین کی

طلبی بھی ہوئی مگر ''احکم الحاکمین اور سریع الانتقام کو اپنے برگزیدہ بندوں پر ظلم کی یہ کارروائی پسند نہ آئی اور اس نے چیمبرلین صاحب کی ناگہانی موت کے وارنٹ جاری کر کے اسے اپنے دربارِ عالی میں طلب کر لیا'' (صفحہ ۶۳) چیمبرلین کے مرنے کے بعد یہ محکمہ ہی ٹوٹ گیا۔

اس موقع پر کتاب میں مسٹر ہنٹر کی کتاب Our Indian Musalmans کا بڑے کرب سے اور اس کی تردید میں لکھی جانے والی سر سید کی کتاب Reveiw on Dr. Hunter's Indian Musalmans کا بڑی فراخ دلی سے ذکر کیا گیا ہے۔

ان پر انبالہ میں مقدمہ چلا۔ اپنی پیروی خود کرتے رہے۔ اور ۲ مئی ۱۸۶۴ کو انہیں سزائے موت سنائی گئی۔ سیشن جج نے انہیں مخاطب کر کے کہا ''تم بہت عقلمند، ذی علم، قانون دان اپنے شہر کے نمبردار اور رئیس ہو۔ تم نے اپنی ساری عقلمندی اور قانون دانی کو سرکار کی مخالفت میں خرچ کیا۔ تمہارے ذریعہ سے سرکار کے دشمنوں کو آدمی اور روپیہ جاتا تھا تم نے انکار بحث سے کام لیا اور سرکار کی خیر خواہی کا قطعاً دم نہیں بھرا اور فہمائش کے باوجود تم نے قطعاً سرکار کی خیر خواہی نہ کی لہذا تمہیں پھانسی دی جائے گی، تمہاری کل جائیداد بحق سرکار ضبط ہوگی۔ تمہاری لاش بھی وارثوں کو نہیں دی جائے گی بلکہ نہایت ذلت کے ساتھ جیل کے گورستان میں گاڑ دی جائے گی۔ آخر میں یہ بھی کہا میں تمہیں پھانسی پر لٹکتا دیکھ کر بہت خوش ہوں گا۔ صاحب موصوف کا یہ سارا بیان میں نے نہایت سکوت سے سنا اور صرف آخری فقرہ کے جواب میں کہا کہ جان دینا اور لینا خدا کا کام ہے آپ کے اختیار میں نہیں ہے۔ وہ رب العزت قادر ہے کہ میرے مرنے سے پہلے تم کو ہلاک کر دے۔۔۔۔ اس وقت میرے منہ سے یہ الہامی فقرہ نکلا کہ میں تو اس وقت تک زندہ موجود ہوں مگر وہ اس حکم کے دینے کے تھوڑا عرصہ بعد ناگہانی موت سے راہی ملک عدم ہوگیا۔۔۔ مجھے اپنی اس وقت کی کیفیت خوب یاد ہے کہ میں پھانسی کے حکم کو سن کر اتنا خوش ہوا کہ شاید ہفت اقلیم کی سلطنت ملنے پر بھی اس قدر مسرور نہ ہوتا۔ اس حکم کے سننے سے میری تو یہ کیفیت ہوئی کہ گویا جنت الفردوس اور حوروں کا منظر آنکھوں کے سامنے ہے'' (صفحہ ۴۶۔۴۷)۔ چیف کورٹ میں اپیل پر سزائے موت کو کالے پانی کی سزا میں بدلنے کا فیصلہ ہوا۔ ''ڈپٹی کمشنر پھانسی گھروں میں تشریف لائے اور چیف کورٹ کا حکم پڑھ کر سنایا کہ تم لوگ پھانسی کی سزا کو بہت محبوب سمجھتے ہو اور اسے شہادت تصور کرتے ہو اس لئے حکومت تمہیں تمہاری پسندیدہ سزا دینے کے لئے تیار نہیں لہذا تمہاری

پھانسی کی یہ سزا حبس دوام بہ عبور دریائے شور سے بدلی جاتی ہے'' (صفحہ ۵۲)

اس موقع پر محمد علی جوہر کا مزے کا شعر لکھا ہوا ہے ''مستحق دار کو حکمِ نظر بندی ملا۔ کیا کہوں کیسے رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی''۔ مگر میں حیران ہو رہا ہوں کہ مولانا جعفر تھانیسری نے ۱۸۸۵ میں مولانا جوہر کا یہ شعر کہاں سے سن لیا؟ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مرتب کرنے والے نے بعد کو موقعہ کی مناسبت سے یہ شعر متن میں زائد کر دیا۔ عین ممکن ہے مرتب نے اور مواقع پر بھی کتاب کے اصل متن میں ایسی ترمیمات روا رکھی ہوں واللہ اعلم بالصواب!

ان کی اسیری کا زمانہ ان کی والدہ اور اہل وعیال نے بڑے صبر وتحمل سے گذارا۔ بلکہ ان کی والدہ ان کے مقدمہ کی سماعت کے دوران تھانیسر میں سانپ کے ڈسنے سے فوت ہوئیں۔ والدہ کے ایمان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''آپ بہت استقلال سے جاں بحق تسلیم ہوئیں۔ لوگوں نے جھاڑ پھونک کرنے والے مشرک لوگوں کا بلا کر ان کی صحت کے لئے کچھ شرکیہ رسومات کرنا چاہا تھا مگر انہوں نے اس کی اجازت نہیں دی اور فرمایا مدت ہوئی شرک وبدعت میرے گھر سے اٹھ گیا ہے اب میں اپنے بیٹے کی غیر حاضری میں اپنے گھر میں شرک نہ ہونے دوں گی'' (صفحہ ۵۰)

اس کے بعد ان صعوبتوں کا ذکر اذکار ہے جو انہیں جزائر انڈیمان پہنچنے تک اٹھانا پڑیں۔ وہاں پہنچ کر گویا ان کو آزادی نصیب ہوگئی کیونکہ وہاں اس طرح کی قید وبند کی صورت نہیں تھی سزا پانے والے وہاں آزادانہ پھرتے اور جو کام کر سکتے تھے وہ کام کرتے اور باقاعدہ تنخواہیں پاتے تھے۔ اگرچہ بعد کو وہاں بھی قیدیوں والی پابندیاں عائد ہوگئیں مگر یہ ان سے محفوظ رہے۔ ان سے قبل اسی تحریک کے مولانا احمد اللہ وغیرہ پہنچ چکے تھے اس لئے ان کا پہنچنا گویا اپنے مستقر پر پہنچنا تھا۔ اٹھارہ برس وہاں گذارے۔ دو شادیاں کیں آٹھ اولادیں اللہ نے دیں۔ اور جب واپس روانہ ہوئے تو اہل وعیال کے علاوہ تقریباً آٹھ ہزار روپیہ بھی ان کے پاس موجود تھا۔

کتاب کی زبان صاف ستھری روزمرہ کی زبان ہے۔ پڑھنے میں لطف دیتی ہے عام علماء والی معرب مفرس زبان نہیں اسی لئے پڑھنے والے کو متاثر کرتی ہے۔ اپنے مشن کے ساتھ وفاداری اس کتاب کا نکتۂ مرکزی ہے۔

ڈھلتے سائے

منیر الدین احمد کی خودنوشت ''ڈھلتے سائے'' مجھے سی ڈی کی صورت میں ملی ہے۔ یہ خودنوشت ایک ایسے شخص کی داستان ہے جس کی نیک اور دیندار ماں کی انتہائی پرخلوص خواہش تھی کہ اس کا بیٹا دین کا مبلغ بنے اور دنیا میں دین کا بول بالا کرے مگر حیف کہ اس کا بیٹا مبلغ تو بنا مگر جرمنی میں پہنچتے ہی لہو لعب میں مبتلا ہو کر دین کی رسی کو چھوڑ بیٹھا۔

یہ خودنوشت اپنی مرحومہ ماں اور ننھیال کے دیگر افراد کے خلاف اس کی جنگ کا اعلان نامہ ہے۔ اس نے اپنی خودنوشت میں فاحشہ عورتوں اور برہنہ جسموں کے ساتھ اپنے روابط کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے اور مرحومہ ماں کی روح کو اذیت پہنچانے کی کسی کوشش سے دریغ نہیں کیا۔ اس کی زبان کمزور اور بیان اس سے بھی زیادہ الجھا ہوا ہے اور نفسِ مضمون بعض مقامات پر گھناؤنا ہے۔ ایسا شخص جس کی زندگی فی طغیانهم یعمهون کی عبرت ناک تصویر ہے۔

◎

گمنام و بے ہنر

''گمنام و بے ہنر'' ایک نہایت مخلص اور دیندار افسر محمد سعید احمد کی داستان ہے جو اپنے عقیدہ پر پختہ ایمان رکھتا ہے اور ہر حال میں اپنی دینداری پر ثابت قدم ہے۔ سعید صاحب پیشہ کے لحاظ سے انجینئر ہیں اور ایم ای ایس سے وابستہ رہے ہے جس سروس کو لوگ (ایم ای ایس) ملٹری انجینئرنگ سروس کی بجائے عرفِ عام میں ''منی ارننگ سروس'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں مگر محمد سعید احمد کا حال یہ ہے کہ جہاں جاتے ہیں ان کی پہلی توجہ اس طرف ہوتی ہے کہ کیا انہیں کوئی دیندار ساتھی میسر ہے جو نماز باجماعت میں ان کا ساتھی بن سکے۔ اس دینداری کی وجہ سے بہت تکالیف بھی اٹھائیں مگر راضی برضا رہے۔ سروس کے دوران مختلف شہروں میں متعین رہے اور اپنے فرائض منصبی کے علاوہ تبلیغ واشاعت حق کا فریضہ ادا کرتے رہے۔ علمائے دین کے ساتھ ان کی ملاقاتیں رہیں حتیٰ کہ مولانا مودودی سے بھی ملاقات کی اور بعض ایسے سوال کئے جن کا جواب ان سے بن نہ پڑا اور وہ خاموش ہو گئے۔ غلام احمد پرویز صاحب سے ان کی ملاقات کی روداد بھی درج ہے۔ یہ خودنوشت خود ان کے قول کے مطابق صرف احمدی احباب کے استفادہ کے لئے ہے۔ اور یہ بات محض اس لئے لکھی گئی ہے کہ پاکستان میں احمدیوں کے خلاف مخالفانہ لٹریچر تو بے دریغ شائع کیا جاتا ہے مگر احمدیوں کو اپنے عقائد کا اظہار کرنے کی اجازت نہیں اور ان کی جانب سے کوئی کتاب چھپے تو ان کو قابلِ تعزیر سمجھا جاتا ہے۔ تفو برتو اے چرخ گرداں تفو۔

اگر سعید صاحب اس خودنوشت میں اپنے خاندانی حالات بھی رقم کر دیتے تو فنی لحاظ سے یہ بہتر خودنوشت ہوتی محض سروس کے حالات اور اپنی تبلیغی مساعی کو بیان کر دینا اس خودنوشت کو یک رخا بنا دیتا ہے۔

◎

داستانِ حافظ بزبان حافظ

"داستانِ حافظ بزبانِ حافظ" ہالینڈ اور انڈونیشیا میں اسلام کی ترویج واشاعت کرنے والے بے لوث اور مخلص مجاہد کی داستان ہے جس کا نام حافظ قدرت اللہ ہے۔ حافظ صاحب پندرہ برس ہالینڈ میں اور دس برس انڈونیشیا میں جہادِ کبیر میں مصروف رہے اور ہزارہا سعید روحوں کو مشرف بہ اسلام کیا۔ یہ داستان حافظ صاحب نے ۱۹۹۳ میں لکھی مگر پہلی بار ۲۰۰۶ میں کینیڈا میں چھپی۔ حافظ صاحب ایک مخلص خاندان کے فرد تھے بچپن ہی میں قرآن حفظ کرنے کی توفیق ملی اور رمضان میں تراویح میں قرآن سناتے رہے۔ لحن اچھا تھا اس لئے ان کی تلاوت سننے کو دور دور سے لوگ تراویح میں شامل ہونے کو پہنچتے تھے۔ راقم الحروف نے بھی حافظ صاحب کی قرأت سنی ہوئی ہے۔ دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہالینڈ پہنچے اور پہلی مسجد بنوانے اور اس کی لمبے عرصہ تک امامت کرنے کی توفیق پائی۔ دنیا کی چکا چوند ان کی نگاہوں کو خیرہ نہ کرسکی۔ یہ نصیبوں کی بات ہوتی ہے اسی کتاب میں ایک جگہ ایک اور بدنصیب کی خودنوشت کا ذکر بھی ہوا ہے جسے اسی نیک مقصد کے لئے جرمنی بھیجا گیا مگر وہ لہوولعب اور آوارگی کا شکار ہوکر دین ہی سے برگشتہ ہوبیٹھا۔

حافظ قدرت اللہ صاحب کی یہ سرگزشت ایمان افروز واقعات سے بھری ہوئی ہے جن سے صحیح لطف تو وہی اٹھا سکتے ہیں جو نیکیوں میں سبقت کرنے کو زندگی کا منتہائے مقصود سمجھتے ہیں۔ زبان صاف ستھری اور بیان اخلاص ومحبت کا آئینہ دار ہے۔ تین سو صفحے کی اس خودنوشت میں مناسب تصویریں بھی موجود ہیں۔ کتاب کے آخری ٹائیٹل پر مسجد مبارک ہالینڈ کی تصویر ہے جو حافظ صاحب کی مساعی کی گواہی دیتی ہے اور دیتی رہے گی۔

◎

کارنامہ سروری

کارنامۂ سروری، سرورالملک، سرورالدولہ نواب آغامرزا بیگ خان بہادر سرور جنگ مرحوم سابق معتمد پیشی واستادِ خاص میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کی خودنوشت سوانح حیات ہے جو ان کے فرزند دلبند نواب ذوالقدر جنگ بہادر سابق جج ہائی کورٹ نے ۱۹۳۳ میں مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے طبع کرواکے شائع کروائی تھی۔ ان کے برادر نواب جیون یار جنگ نے اپنے ابا کی خودنوشت کا انگریزی ترجمہ پہلے شائع کیا، اردو کا ایڈیشن بہت بعد میں چھپا۔

نواب آغامرزا رشتہ میں غالب کی نسل سے تھے۔ لکھتے ہیں "میرے پھوپا نواب علی بخش خان ابن نواب الٰہی بخش خاں معروف ریاست لوہارو وفیروز پور جھرکا کے شرعاً حقدار تھے مگر بخت نے یاوری نہ دی۔۔۔ مرزا غالب دو بھائی تھے بڑے کا اسم شریف یوسف تھا۔ چونکہ مرزا غالب لاولد تھے اس لئے بڑے بھائی کی اکلوتی بیٹی کی اولاد ہی مرزا کی اولاد ہے یعنی میری اور مرزا غلام فخر الدین خاں کی اولاد۔ عزیز النسا بیگم غلام فخر الدین خاں کی زوجہ اور میری ساس تھیں۔ غلام فخر الدین خاں نواب صاحب لوہارو کے برادرزادہ تھے" (حاشیہ صفحہ ۱۲) ان کے صاحبزادے نے دیباچہ میں ان کی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے "ان کا بچپن دہلی میں گذرا جہاں شاہی اقتدار کو بگڑتے دیکھا۔ تعلیم کا زمانہ لکھنؤ میں گذرا جہاں انگریزی اقتدار کو قائم ہوتے دیکھا اور ملازمت کا عہد فرخندہ بنیاد حیدرآباد میں گذرا جہاں شاہی شان وشوکت کا پھر جاہ وجلال دیکھا" (صفحہ ۳) مرزا یوسف کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ "مرزا یوسف برادرِ حقیقی کلاں مرزا اسد اللہ خاں غالب افواجِ قاہرہ دولت آصفیہ میں نہایت مقتدر عہدہ پر سرفراز تھے کسی دشمن نے ایسا جادو کیا یا ایسی دوا کھلادی کہ وہ مجنون ہوگئے اور تاوقت انتقال مجنون رہے" (صفحہ ۱۹) غالب پر جو ڈاکومنٹری دہلی والوں نے بنائی ہے اس میں مرزا یوسف کو مجنوں تو ضرور دکھایا گیا ہے ان کی ملازمت افواج قاہرہ دولت آصفیہ کا کوئی ذکر نہیں۔

نواب سرور الملک غدر کے بعد افتاں خیزاں رنجِ مسافرت کھینچتے مئی ۱۸۷۲ء کے لکھنؤ سے چلے ہوئے اگلے سال کے اوائل میں حیدر آباد پہنچے۔ سفر کے رنج وتعب کی خاصی تفصیلی روداد نواب صاحب نے بیان کی ہے۔ دہلی اور کلکتہ کے درمیان تو سفر نسبتاً آسان تھا لکھتے ہیں ''اس زمانہ کے سفر بھی خاص لطف رکھتے تھے۔ انگریزوں نے اپنے رسل ورسائل کے واسطے میل کاٹ اور مسافرین کے واسطے شکرم، اسپ گاڑی دہلی سے کلکتہ تک جاری کر رکھی تھی۔ میل کاٹ پر شاید ایک یا دو مسافر کی جگہ تھی کرایہ مہنگا تھا شکرم میں چار آدمی اندر اور دو باہر چھت پر سستے کرائے سے بیٹھا کرتے تھے۔ پوری شکرم بھی بلا شرکت غیرے بدست ہو سکتی تھی مگر میل کاٹ یا شکرم پر صرف اہلِ ضرورت سفر کرتے تھے، عام طور پر بیلوں کی گاڑیاں جنہیں 'بہلی' کہتے تھے کرایہ پر بدست ہوتی تھیں اور منزل بہ منزل سفر ہوتا تھا۔ مقامات منزل مقرر تھے ہر مقام پر سرائیں بنی ہوئی تھیں جن میں بھٹیارے بسے ہوئے تھے۔ ہر روز بھٹیارے اپنی سرائے سے دور تر جا کر مسافروں کو استقبال کر کے لاتے تھے آپس میں خوب لڑائیاں ہوتی تھیں ہر بھٹیارا اپنی صفات بیان کر کے مسافروں کو اپنی طرف راغب کرتا تھا مسافر بیچارا ان کی باہم کشمکش میں حیران وپریشان ہو جاتا تھا۔ سرائے کے دروازے میں داخل ہوتے ہی عجیب سماں نظر آتا تھا۔ جدھر دیکھئے گاڑیاں، بیل، گھوڑے اونٹ وغیرہ سواریوں کا جمگھٹ ہے۔ درختوں پر جانوروں کا شور وغل، بسیرے کا وقت بھٹیاروں کی مسافرین کے ساتھ چھین جھپٹ مسافروں کے غول کے غول پکانے ریندھنے کی فکر میں ادھر ادھر دوڑ دھوپ اور غل غپاڑا، گھوڑوں کا ہنہنانا، بیلوں کا ڈکارنا، اونٹوں کا بلبلانا، شام کا رفتہ رفتہ رات ہو جانا، ایک خاص سماں بندھ جاتا تھا۔ بی بھٹیاری کی پکائی ہوئی موٹی موٹی روٹیاں اور کھڑی چھلکوں کی ماش کی دال اس میں بڑا لوندا گھی کا رکھا ہوا۔ روٹیاں بھی گھی سے چپڑی ہوئی۔ تھکے ماندے مسافروں کو وہ مزا دیتی تھیں کہ بادشاہوں کی اغذیہ لطیفہ بھی ان پر صدقہ کر دی جائیں۔ دس بجے رات تک ہر طرف چہل پہل کہیں بھنگ والوں کے نعرے، کسی طرف طبلہ سارنگی وستار کے نغمے، کہیں گاؤں کی رنڈیاں رقص کناں اور کسی طرف مسافروں کی لڑائی بھڑائی کا ہنگامہ، عجب ایک تماشا لائق دید ہوتا تھا جس کو ریل کے سفر نے ہمیشہ کے واسطے معدوم کر دیا اور اب تو خود رو گاڑی یعنی موٹر کار زمین کی چھاتی پر دال دلتی ہے اور اڑن کھٹولا آسمان کی چادر کو پاش پاش کرتا ہے'' (حاشیہ صفحہ ۲۰۔۲۱)۔ (ان

کے دادا مرزا غالب کا کلکتہ تک کا سفر بہلی پر طے ہوا تھا۔)

حیدر آباد پہنچتے ہی ملازمت کی سبیلیں ہونے لگیں۔ پہلی باریابی کوئی تین سال کے بعد ہوئی۔ نظام کے انگریز ٹیوٹر کے مددگار کے طور پر ان کا تقرر ہوا گویا یہ نظام کے استاد مقرر ہو گئے۔ پہلی باریابی کی روداد دلچسپ ہے۔ روشن بنگلہ میں تعلیم شروع ہوئی۔ لکھتے ہیں ''کچھ عرصے کے بعد حضور پر نور برآمد ہوئے تو انہوں نے مجھے طلب کیا۔ چھوٹا سا دالان چھوٹی سی انگنائی۔ دالان میں مسند بچھی ہوئی۔ اس پر حضور کلاہ زرنگار بر سر، انگرکھا دکنی در بر، لمبی لمبی چوٹیاں تا بہ کمر عمر شریف کوئی آٹھ برس کی جلوہ افروز تھے۔ دو تین مامائیں سفید مثل برف دوپٹوں میں لپٹی ہوئیں پس پشت استادہ بڑے میاں اور اور ان کے بیٹے دست بستہ روبروئے مسند بیٹھے ہوئے۔ اول لفظ جو حضور نے ارشاد فرمایا یہ تھا کہ ''انگریزی بولی کیسی ہوتی ہے سناؤ''۔ میں نے انگریزی میں عرض کیا

I pray for your highness's life and prosperity

اس کے بعد فوراً برخاست ہو گئے'' (صفحہ ۱۳۷)

اس طرز شاہانہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ''حضور پرنور'' کو پڑھانا کتنا مشکل کام تھا۔ اور یہ تو بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ حضور نظام کے استاد اپنے تعارف کے لئے ''حضور کا شاگرد'' کے لفظ استعمال کیا کرتے تھے۔ (صفحہ ۳۴۵)

نواب سرور الملک کی یہ خود نوشت اس بات کا بین ثبوت ہے کہ جس کسی نے بھی ''حیدر آباد کو hotbed of intrigue (صفحہ ۲۴۱) کہا تھا اس نے کتنی صحیح بات کہی تھی۔

نظام سادس میر محبوب علی خاں ان کی تربیت میں رہے اور نواب صاحب نے اس بات کی سر توڑ کوشش کی کہ ان کے علاوہ اور کوئی حضور کے مزاج میں دخل حاصل نہ کر سکے۔ مولوی مسیح الزمان کو خدمت سے علیحدہ کروایا۔ ''یہ فیصلہ بھی بہ کثرت آراء ہوا کہ آغا مرزا بیگ علاوہ اپنی خدمت موجودہ کے کل خدمات مولوی صاحب پر فوراً سرفراز کئے جائیں اور اس خدمت کے واسطے مہاراجہ پیشکار ایک رقم ماہوار بطور اضافہ جاری کریں۔ اس انتظام سے ڈیوڑھی مبارک کل سازشوں سے تا ختم تعلیم محفوظ ہو گئی'' (صفحہ ۲۱۱)۔ نواب صاحب نے اس صورت حال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اور موقع بموقع حضور پرنور

کے گوش مبارک میں اپنی رائے پھونکتے رہے۔ ڈیوڑھی مبارک سے وابستگی اور حضور نظام کے قرب سے حسب دلخواہ فوائد سے بھی متمتع ہوتے رہے حتیٰ کہ اس حد تک رسائی حاصل ہوئی کہ حضور کے ہاتھ سے لکھے ہوئے احکامات کو بے پروائی میں ضائع بھی کرتے رہے ۔(صفحہ ۲۰۴) مگر ڈیوڑھی مبارک میں کسی اور کا تقرر نہیں ہونے دیا۔

مولوی نذیر احمد کو سر سالار جنگ نے بڑی منتوں سے بلایا تھا۔ ان کے باب میں لکھتے ہیں ''یہ صاحب دہلی کے قریب کے قصبہ کے رہنے والے انگریزی سرکار میں سر رشتۂ تعلیم کے اعلیٰ عہدیدار صاحبِ تصانیف کثیر پنشن لے کر حیدر آباد میں بعہدۂ صدرُ تعلقداری سرفراز تھے۔ سن رسیدہ نہایت چست وچالاک کپتان صاحب (کپتان کلاڈ کلارک سپر نٹنڈنٹ تعلیم حضور نظام) کو بہت جلد گوندے پر لگا لیا اور خوش خط قلمی رسالے اصطلاحات صیغہ مال وضوابط مال گذاری صاف سیدھے اردو زبان میں تالیف کر کے کپتان صاحب کو دئے اور یہ قرار پایا کہ درس انگریزی کے ساتھ ملکی نظام کی بھی تعلیم دی جائے۔ ادھر ریزیڈنٹ کو خود وزارت پناہ پر اعتراضات تھے اور مولوی صاحب علامۂ دہر اور سرکار انگریزی کے پنشن یافتہ قابلِ اعتماد۔۔۔ الغرض وزارت پناہ کو بجبوری یہ تقرر منظور کرنا پڑا۔۔۔۔ مولوی صاحب کے ہاں یہ حال تھا کہ تقرر سے ایک روز قبل ہی تمام خدمات ڈیوڑھی مبارک کو نام بنام، اپنے رشتہ داروں اور ہوا خواہوں میں بانٹ چکے تھے۔ سوائے مولوی امین الدین خاں اور عنایت الرحمٰن خان کے کوئی ہندوستانی ایسا نہ تھا کہ مولوی صاحب کی خوشامد اور مبارک بادی کے واسطے نہ گیا ہو ایک دربار عظیم ان کے ہاں قائم ہو گیا (صفحہ ۱۶۴)۔ نواب سرور الملک یہ سارا احوال کیسے برداشت کر لیتے؟ غرض ایسا انتظام کیا کہ مولوی نذیر احمد تقرر کے باوجود چارج نہ لے سکے۔ کلارک صاحب کو بعد میں جتلایا بھی کہ'' مولوی نذیر احمد نیچری خیال کے تھے اور مولوی مہدی علی تو نیچریوں کے گرو ہیں (صفحہ ۱۸۸)

اب ان کے عہد مبارک میں دوسرے نیچریوں کا احوال بھی سن لیجئے۔ ''ماموں صاحب (یعنی سر سید احمد خاں) نے دستار و کمر سے انکار کیا اور صرف ترکی ٹوپی اور کالے کوٹ اور پتلون سے قدم بوسی کرنا چاہی۔ نواب وزارت پناہ (یعنی وزیر اعظم) نے اپنے قاعدۂ قدیم کے شکست کو نامنظور

فرمایا'' (صفحہ ۱۹۷)۔ ''جب نواب وزیر ہندوستان کے سفر میں مصروف تھے تو سر سید احمد خاں نے مرحوم نواب صاحب کو ٹی پارٹی میں مدعو کیا تھا۔ اثنائے صحبت میں سید صاحب نے مولوی مہدی علی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ جب آپ نے میری سفارش کو منظور اور مولانا کو نوکر رکھ لیا ہے تو میرا فرض ہے کہ ان کی تعریف کے ساتھ جو سقم ان میں ہے وہ بھی عرض کر دوں۔ عرض کیا کہ مولانا کو ایک گھڑی تصور فرمایئے جو دنیا کے بہترین کاریگر نے بنائی ہے مگر گھڑی میں ایک نقص یہ رہ گیا ہے کہ اگر یہ گھڑی سامنے سے ذرا بھی ہٹے تو الٹی چلنے لگتی ہے۔ نواب صاحب نے ہنس کر کہا کہ سید صاحب آپ خاطر جمع رکھیں میں اس گھڑی کو الٹا نہیں چلنے دونگا'' (صفحہ ۱۸۶)۔

اس الٹا چلنے کی یعنی ناجائز کام نہ کرنے کی ایک مثال تو درج ہے کہ ''ایک روضہ پر ایک مقبرہ کا پتہ مجھے (ایک عزیز نے دیا) جس میں میری رشتہ کی ایک نانی مدفون تھیں اور اس میں فی الحال ایک ڈاک بنگلہ بنا ہوُا تھا۔ بڑی عالیشان عمارت اور وسیع احاطہ ہے۔ میں نے اس کا ذکر وزارت پناہ سے کیا انہوں نے وعدہ فرمایا کہ بلدہ چل کر یہ عالیشان عمارت تجھ کو دے دی جائے گی۔ چنانچہ اس کی بابت مولوی مہدی علی معتمد مال کے پاس حکم بھی نافذ ہوُا تھا مگر میری بدقسمتی سے وزارت پناہ کا یکا یک انتقال ہو گیا۔۔۔ اور یہ کارروائی بھی یوں ہی رہ گئی'' (صفحہ ۱۹۰)۔ ''مولوی مہدی علی نے بھی قدم آگے بڑھایا اور نواب لائق علی خاں کو اپنی خیر خواہی کا اطمینان دلا کر ریزیڈنسی میں آمد و رفت شروع کر دی۔ اور صاحبان انگریز کی دعوتیں ان کے یہاں بھی ہونے لگیں۔ سر سید احمد خاں کے دست چپ تھے چہرہ پر کمال درجہ کی متانت اور سنجیدگی، زبان نہایت شیریں۔ کلام نہایت پر اثر۔ ہر شخص سے اپنے نفع کے بعد سلوک کرنے میں دریغ نہ کرتے تھے۔ ان کے ماتحت لوگ ان پر جان نثاری کرنے کو مستعد۔ ایک گروہ خوش لیاقت ذی علم کارگزاروں کا اپنے گرد جمع کر لیا تھا۔ عام طور پر نہایت ہر دل عزیز بنے ہوئے تھے اور گو میں ہمیشہ گوشہ نشیں رہا مگر ان حضرت نے مجھ سے بھی رسم و راہ پیدا کر لی۔۔۔۔ (جب ان سے حساب فہمی کروانے یعنی آڈٹ کرنے کا حکم وزیر اعظم کی طرف سے جاری ہوُا) تو مولوی بچارے کے ہوش اڑ گئے۔ ایک روز صبح کے وقت میں ڈیوڑھی مبارک جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ سواری تیار تھی کہ مولانا پریشان حال میرے پاس آئے میرے روبرو آئینہ تھا اور قرآن مجید طاق پر رکھا ہوُا تھا مجھ سے

علیک سلیک بھی نہ کی ہاتھ بڑھا کر قرآن سر پر رکھ لیا اور کہا یار اگر تو اس وقت مجھے بچا لے گا تو یہی کلام پاک ضامن دیتا ہوں کہ میں مدت العمر تیرا ممنون رہوں گا ورنہ کچھ کھا کر سو رہوں گا اور خون ناحق ایک سید کا تیری گردن پر ہوگا۔۔۔۔ میں نے ان کو مہاراجہ (یعنی وزیر اعظم) سے ملوا دیا۔۔۔ مولوی نے پاؤں مہاراجہ کے پکڑ لئے اور کچھ ایسی چرب زبانی اور لسانی سے کام لیا کہ مہاراجہ بچند شرائط ان کی آبرو ریزی سے دستبردار ہو گئے" (صفحہ ۲۱۷) اس سے نواب صاحب کے اثر و رسوخ کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ایک بار انگریز ریزیڈنٹ نے بھی سرور جنگ کے بارہ میں نظام سے کہا کہ وہ ریاست کے خیر خواہ نہیں اس پر حضور پرنور نے فرمایا "وہ میرے بچپن سے استاد رہے ہیں اور اس وقت سوائے ان کے مجھ کو کسی پر بھروسا نہیں ہے" (صفحہ ۲۶۳)

اب مولوی مشتاق حسین صاحب "ان میں سوائے ضد اور ہٹ کے کوئی عیب نہ تھا ریاست کے خیر خواہ وزارت کے بھی خیر خواہ۔ متدین متقی و پرہیز گار محنت و جفاکشی میں تیلی کا بیل۔ شب و روز قلم دوات کاغذ سے سروکار مگر چونکہ نرے مولوی تھے بلند پروازی میں کبھی ایک منزل کوٹھے سے زیادہ نہ اڑ سکتے تھے انگریزی معاشرت اور انگریزی خیالات سے ناواقف تھے" (صفحہ ۲۸۲) انجام اس نیک متقی کا یہ ہوا کہ آخر "مولوی مشتاق حسین شہر بدر کئے گئے" (صفحہ ۳۱۹) یہ دو بزرگ وہ تھے کہ ایک محسن الملک سے ملقب ہوا دوسرا وقار الملک سے۔

مولوی چراغ علی صاحب "نہایت ذی لیاقت ہر علم میں دستگاہ کامل رکھتے تھے اعلیٰ درجے کا ادیب عربی اور انگریزی اس کے ساتھ بے مثل محاسب۔ کم گو لغو باتوں سے بری (صفحہ ۲۱۹)

کلکتہ میں "کپتان کلارک نے مجھ سے کہا کہ سید امیر علی جج ہائی کورٹ کل ہز ہائینس کی ملاقات کو آئیں گے۔ ہز ہائینس کو سویرے برآمد کروانا صرف ہم لوگ حاضر رہیں گے گویا مختصر خانگی دربار ہو جائے گا۔۔۔ میں نے کہا میں صرف ایک شرط سے راضی ہوتا ہوں کہ سید صاحب کمر بستہ حاضر دردولت ہوں اور سر سید احمد خاں کا قصہ یاد دلایا۔۔۔ مگر سید صاحب کمر بستگی پر راضی نہ ہوئے۔ سید صاحب آئے بھی اور چلے بھی گئے کسی نے یہ بھی نہ جانا کون آیا کون گیا۔ سید صاحب نہایت ذی علم صاحب تصانیف کثیرہ ہیں دستار و کمر باندھنے میں کیا ان کے نام و شان میں فرق آ سکتا تھا؟" (صفحہ ۲۹۲) مگر نواب

صاحب کو یہ یاد نہیں رہتا کہ وہ ملازم سرکار انگریزی تھے کسی دیسی والیٔ ریاست کے سامنے اس طرح کمر بستہ حاضر نہیں ہو سکتے تھے۔ سر سید نے بھی اپنی بات پر اصرار کیا تھا اور ٹھیک کیا تھا۔

اپنے کارناموں میں ایک کارنامہ یہ بھی درج کیا ہے کہ "میں نے ڈاکٹر اگھور ناتھ کو جو نہایت لائق اور علم دوست تھے بار دگر خدمت دلوادی تھی اور ان کی دختر سروجنی نامی کو بوظیفہء معقول برائے تعلیم انگلستان بھجوایا تھا اسی طرح اکثر ہنود کو باوقعت عہدوں پر سفارش کر کے ترقیاں دلوائی تھیں اب میرے ان سب کاموں کی مذموم تاویلات کر کے ہر چہار طرف سے حملے شروع کر دئے اور بلیغ کوشش کی کہ جرم بددیانتی یا بدخواہی کا مجھ پر لگائیں مگر چونکہ دامن میرا بفضل الٰہی پاک و صاف تھا کوئی گنجائش ان تہمتوں کی ان کے ہاتھ نہ لگی" (صفحہ ۳۲۳) یہ بی سروجنی وہی سروجنی نائیڈو ہیں جنہیں بلبلِ ہندوستان کہا جاتا تھا۔ ان کے دشمن تو جو کہتے تھے کہتے تھے مگر "حضور پرنور ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ میں نے ایک شیر ڈیوڑھی میں بٹھا رکھا ہے" اس پر پریس والے کہتے تھے یہ شیر مردم خور ہے اس کو گولی سے مارنا چاہئے۔" (صفحہ ۳۲۴)

ایک مرتبہ حضور نظام کے نکاح کی تجویز ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ کیا کسی پہلے نظام کا بھی نکاح ہوا ہے؟ یہ مسئلہ میر عثمان علی خاں کی ولی عہدی کے سلسلہ میں پیدا ہوا کہ ان کی ماں سے نظام سادس کا نکاح نہیں ہوا تھا۔ اس وقت میر محبوب علی خاں نے یہ حلف نامہ عدالت میں داخل کیا تھا کہ ہمارے ہاں نکاح کرنے کا رواج ہی نہیں۔ جس عورت کو نظام اپنی بیوی کہے وہ بیوی اور جس بیٹے کو اپنی اولاد کہے وہ بیٹا تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ کی ایک اہم کتاب بھی میری نظر سے گذری تھی جو کسی ریسرچ سکالر نے نظام حیدرآباد کی عائلی زندگی کے اس پہلو پر تصنیف کی تھی۔ یہ لندن یونیورسٹی کا ایک تھیسس تھا افسوس کہ اس وقت حوالہ کے لئے مجھے دستیاب نہیں۔

غرض نواب سرور الملک کی یہ خودنوشت حیدرآباد اور نظام حیدرآباد کے دربار دُربار کی عمدہ تصویر پیش کرتی ہے اور بہت سے تاریخی حقائق کو عمدگی سے بیان کرتی ہے۔

یادایام

نواب حافظ احمد سعید خاں چھتاری سابق گورنر یوپی اور وزیر اعظم حیدر آباد دکن کی خودنوشت ''یادایام'' کے عنوان سے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ سے طبع ہوئی تھی۔ اس پر سن طباعت درج نہیں مگر اس خودنوشت کا آخری فقرہ یہ ہے ''جون ۴۷ میں اعلیٰ حضرت حضور نظام کا فرمان صادر ہوا کہ میں حیدر آباد کی خدمت کے لئے پھر حاضر ہو جاؤں۔ یہ ''خودکلامی'' یک بیک ختم ہوگئی اور عمر رفتہ کے تصور کا خواب شیریں ناتمام رہ گیا۔ دیکھئے یہ سلسلہ اب کب شروع ہوتا ہے'' (صفحہ ۲۸۰)۔ حضور نظام کے اس فرمان پر عمل پیرا ہونے کے بعد نواب صاحب پر کیا گذری اس کے بارہ میں یہ خودنوشت خاموش ہے۔ حیدر آباد پر تو ستمبر ۴۸ میں نام نہاد پولیس ایکشن کے ذریعہ قبضہ کرلیا گیا تھا اور یو این او میں حیدر آباد کی شکایت کو یہ کہہ کر واپس لے لیا گیا کہ یہ حیدر آباد اور ہندوستان کا داخلی معاملہ تھا جو طے ہو چکا ہے۔ جب جنرل اسمبلی کے پیرس والے اجلاس میں اس شکایت پر بحث کا موقع آیا تو حیدر آباد کی جانب سے کوئی موجود نہیں تھا پاکستان کے وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خاں نے اس سارے معاملہ کو کھول کر دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار!

نواب چھتاری یوپی کے رئیس تھے اور سیاست ملکی اور حکومت انگریزی کی وفاداری میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے صوبہ میں وزیر رہے۔ پھر ہوم ممبر رہے۔ گول میز کانفرنسوں میں ملک کی نمائندگی کی۔ مسلمانوں کے مفادات کی خاطر وفاداری سے کام کرتے رہے۔ ان کا خاندان نیک اور دیندار لوگوں کا خاندان تھا۔ ان کے دادا ہجرت کر کے مدینے چلے گئے تھے۔ ان کے امی ابا انہیں واپس لانے کے لئے مدینے گئے مگر دونوں وہیں فوت ہو گئے۔ دادا کو بزرگوں نے مشورہ دیا کہ واپس جائیں اور یتیم پوتے کی پرورش کریں یہی ان کے لئے نیکی ہے چنانچہ نواب صاحب واپس آئے اور اپنے اس یتیم پوتے کی کماحقہ تربیت کی۔ انگریزی تعلیم کی بجائے اسے قرآن کا حافظ بنایا۔ کچھ دیر تک یہ علی گڑھ میں بھی

پڑھتے رہے لیکن تعلیم نامکمل رہی۔ جب گورنر نے انہیں صوبہ میں وزیر بنایا تو ان سے پوچھا کہ آپ کونسا محکمہ لینا پسند کریں گے؟ نواب صاحب نے کہا تعلیم کے علاوہ کوئی سا محکمہ دے دیجئے کیونکہ میں وزیر تعلیم بن کر یہ تہمت نہیں اٹھا سکتا کہ ''ایک غیر تعلیم یافتہ شخص وزیر تعلیم بن بیٹھا ہے'' (صفحہ ۱۰۳)۔ کیسے بھولے لوگ تھے۔ ہم نے تو اپنے زمانہ میں ان پڑھوں کو علم و دانش کی کرسیوں پر بیٹھے دیکھا ہے۔ تلک الایام نداولہا بین الناس۔

دادا کی خداترسی کی ایک مثال نواب صاحب نے درج کی ہے کہ انہوں نے اپنے کارندوں اور مختار کاروں کو ایک روبکار ۲۲ جون ۱۸۴۸ کو جاری کی کہ ''یہ لوگ وقت فتحیابی مقدمات یا اسلوبیء کارہائے متعلقہ ریاست یہ الفاظ تحریر کرتے ہیں کہ ''فلاں مقدمہ بفضل الٰہی و باقبال سرکار فتح ہو گیا یا باقبال سرکار فلاں کام ہو جانے کی امید ہے'' تاریخ امروزہ سے ہدایت کی جاتی ہے کہ آئندہ کو لفظ باقبال سرکار یا کوئی اور کلمہ مثل اس کے تحریر نہ کیا کریں صرف فضل الٰہی کافی ہے'' (صفحہ ۱۰)۔ ان اکرمکم عنداللہ اتقٰکم۔

یہ خودنوشت بڑی سادگی اور صاف دلی کے ساتھ قلمبند کی گئی ہے کہیں احساس نہیں ہوتا کہ یہ کسی والیء ریاست کی خودنوشت ہے۔ تفاخر یا بڑائی کا شائبہ تک نہیں۔ نواب صاحب کے لفظوں میں ''یہ زمانہ کی دھوپ چھاؤں سے گذرنے کی ایک کوشش ہے'' (تمہید) انہیں یہ بھی اعتراف ہے کہ ''قرآن پڑھنے اور اس کا حافظ ہونے کے باوجود بعض خلاف شریعت کام بھی کرتا ہوں'' (صفحہ ۱۰)۔ بیان میں کہیں کہیں مزاح کا ہلکا سا چھینٹا بھی مل جاتا ہے۔ سکول کی شرارتوں کے باب میں لکھتے ہیں کہ استاد کی ''کرسی کی پشت پر چاک سے الٹا ''الو'' لکھ دیا جب ماسٹر صاحب نے کمر لگائی تو ''الو'' سیدھا ہو گیا'' (صفحہ ۲۹)۔ ''انڈی پنڈنٹ ممبر وہ تھے جن پر کوئی ''ڈی پنڈ'' نہ کر سکے'' (صفحہ ۱۳۰)۔ ''ہز ہائینس رامپور کا لنچ مہاراجہ محمود آباد کے بٹلر پیلس میں تھا۔ کھانے اتنے انواع واقسام کے تھے کہ اگر ایک ایک نوالہ بھی کھایا جائے تو ''مرضِ مبارک'' ہو جائے۔ مرض مبارک کا قصہ یہ ہے کوئی تازہ ولایت خان ہندوستان کے کسی شہر میں پہنچے۔ طالب علم تھے مسجد کی روٹیوں پر تنگی ترشی سے بسر ہوتی تھی ایک جنازہ سامنے سے نکلا۔ خان نے پوچھا بائی یہ شخص کیسے مر گیا۔ جواب ملا یہ ہیضہ سے مر گیا۔ خان صاحب نے

پوچھا یہ ہیضہ کیا ہوتا ہے؟ جواب ملا زیادہ کھا لینے سے یہ مرض ہو جاتا ہے۔ خان صاحب نے حسرت سے کہا بار خدایا یہ مرض مبارک ہم کو کبھی نہ ہوُا'' (صفحہ ۲۰۲)۔

ان پھلجڑیوں کے علاوہ جس چیز نے مجھے بہت متاثر کیا وہ سر تیج بہادر کا شستہ و رفتہ اردو میں لکھاہوُا دیباچہ اور پنڈت موتی لال نہرو کا خط ہے۔ یہ لوگ اردو فارسی کا کیسا صاف ستھرا ذوق رکھتے تھے۔نواب صاحب نے سپرو صاحب کے بارہ میں لکھا'' سر تیج بڑے مخلص دوست ہیں ان کا طرز بیان اتنا دلکش ہوتا ہے کہ گھنٹوں بیٹھے باتیں کرتے رہئے اور دل نہیں گھبراتا۔ جتنی دیر ان کے پاس بیٹھئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ نئی چیزیں معلوم ہو رہی ہیں جس سے ذہنی اور دماغی آسودگی پیدا ہوتی ہے۔۔۔

پرانے کاغذات میں موصوف کا ایک خط مل گیا جو بجنسہ درج ذیل ہے اس سے آپ سر تیج کے ذہنی اور تہذیبی سرچشموں کا اندازہ لگا سکتے ہیں'' (صفحہ ۱۷۲)۔ خط میں ایک فارسی کی غزل درج ہے۔جس کے درج کرنے کا یہ محل نہیں کیونکہ کوئی اس کو سمجھے گا نہیں؟۔اب دیباچہ کا کچھ حصہ دیکھئے۔ سر تیج بہادر لکھتے ہیں''نواب صاحب نے میرے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ ان کی دوست نوازی ہے مگر میں اس کو ضرور مانتا ہوں کہ اردو فارسی کا مجھ کو ہمیشہ شوق رہا ہے اور آج کل جو ہنگامہ اس صوبہ میں اردو کے خلاف ہو رہا ہے اس سے مجھے کوئی ہمدردی نہیں۔ میرا یقین ہے کہ بہت دنوں تک یہ یورش نہیں رہے گی۔ میں ہندی کے خلاف نہیں ہوں مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کہ جو الفاظ فارسی عربی یا سنسکرت کے اردو زبان میں پیوست ہو گئے ہیں ان کو کیوں علیحدہ کیا جاوے۔ میں نے کبھی اردو کو مسلمانوں کی زبان نہیں سمجھا ہمیشہ یہی سمجھا کہ اردو زبان کے بانی مبانی ہندو مسلمان دونوں ہیں اور یہ دونوں کی زبان ہے مگر یہ خیال آج کل کے زمانہ کی روش کے خلاف ہے اور مجھے سخت افسوس ہے کہ ہندوستان کو آزادی ملنے کے بعد ہمارا زیادہ تر وقت ان مباحثوں میں صرف ہوتا ہے۔'' (صفحہ ۷)۔ یہ دیباچہ ۷ جنوری ۱۹۹۴ کا لکھاہوُا ہے۔

اب پنڈت موتی لال نہرو کا خط دیکھئے جو ۱۰ دسمبر ۱۹۳۲ کا لکھاہوُا ہے۔

''مخدومی تسلیم۔

والا نامہ لکھنؤ میں ایسے وقت ملا کہ میں نہایت عجلت میں تھا لہذا حامل والا نامہ سے جواب از عقب بھیجے جانے کا وعدہ کر کے فوراً پنڈت گوکرن ناتھ مصرا کی خدمت کے لئے ضلع لکھنؤ کے دیہات

کی طرف روانہ ہو گیا۔ والا نامہ اور نیز ان پرچہ جات کا جو اس کے ساتھ ہیں شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں مجھے افسوس ہے کہ آپ کے آدمی کو میرے پیچھے چند مقامات پر جانا پڑا اور بالآخر میں اس وقت ملا جب ان پرچہ جات کی ضرورت کسی نہ کسی طرح پر رفع ہو چکی تھی۔ بنارس گھورکھپور ڈویژن کے لئے سخت ضرورت تھی مگر اس وقت وہاں کا کام ختم ہو چکا تھا لہذا ان پرچہ جات پر قبضہ رکھنا مناسب نہیں معلوم ہوتا اور نہ ان سے وزن میں معقول کمی آتی ہے جو اٹھایا جا چکا تھا۔ اس لئے پرچہ جات معہ شکریہ ہم دست حامل ابلاغ خدمت ہیں۔ علاوہ اس کے ابھی تو بہت کچھ چھیڑ چھاڑ باقی ہے نہ معلوم آپ کے طبقہ کے متعلق کیا پالیسی اختیار کی جائے۔ چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد۔ نہ سہی عشق عداوت ہی سہی۔

ایسی حالت میں پرچہ جات رکھنا اخلاقی اصول کے خلاف سمجھتا ہوں۔ زمینداروں کے خلاف تو میں نے ایک لفظ نہیں کہا اور نہ کبھی ان کا مقابلہ کیا ہے۔ آپ جانتے ہی ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ زمینداروں کی طرف سے کیا جواب ملتا ہے۔ لبرلوں نے تو کونسل ختم کر دی ایک بھی کامیاب نہ ہوُا سوراج کے جھنڈے جہاں تہاں نصب کئے ہیں ہر مقام پر زوروں سے لہرا رہے ہیں۔

آپ کا مخلص

موتی لال نہرو'' (صفحہ ۱۰۸)

اس خط کا پس منظر یہ ہے کہ پنڈت جی سوراج پارٹی کو انتخابات کے لئے تیار کر رہے تھے تا کہ لبرل پارٹی کا راستہ روکا جائے۔ اس لئے نواب صاحب نے الیکشن فنڈ میں پانچ ہزار روپے ان کو بھیجے تھے مگر وہ اس وقت پہنچے جب ضرورت پوری ہو چکی تھی اس لئے پنڈت جی نے وہ روپے واپس کر دئے۔ خط میں جن پرچہ جات کا ذکر ہے وہ یہی روپے ہیں۔ یہ پڑھ کر مجھے یوسفی صاحب کا ایک فقرہ یاد آتا ہے کہ'' صاحب ہندوؤں میں اسلامی سادگی پائی جاتی ہے''۔ کیا کوئی مسلمان اس چندہ کو واپس کرتا؟ خط میں جس طبقہ کا ذکر ہے وہ زمینداروں کا طبقہ ہے۔

احوال الرجال میں مولانا محمد علی کا ذکر'' مولانا محمد علی مرحوم بڑی شخصیت کے حامل تھے اپنے سیاسی مسلک کی خاطر انہوں نے بڑی قربانیاں کیں۔ یوں تو کتاب سیاست میں ان کے ہم سبق اب بھی موجود ہیں لیکن ان کی طرح کسی نے صحرانوردی کی اور نہ رسوائے کوچہ و بازار ہوُا۔ پہلی گول میز

کانفرنس میں ان کی تقریر مجھے یاد ہے قلب کی شکایت انہیں پہلے سے تھی غالباً اس تقریر نے انہیں ختم کر دیا مجھے یاد ہے ہوٹل میں ان سے ملنے گیا۔ بستر مرگ پر لیٹے تھے اپنی تقریر کے متعلق کہنے لگے یہ میرا swans song تھا دو تین روز کے بعد ان کا انتقال ہو گیا''۔ (صفحہ ۱۶۶) مولانا محمد علی اپنی وصیت کے مطابق بیت المقدس میں دفن کیے گئے۔

سائمن کمیشن کے آنے پر سارے ملک میں احتجاج ہؤا تھا اور سب نے سائمن گو بیک کے نعرے لگائے تھے۔ لکھنؤ والوں کی ایک جدت اس کتاب سے سامنے آئی۔ لکھتے ہیں'' تعلقہ داران اودھ نے کمیشن کو قیصر باغ میں ایٹ ہوم دیا۔۔۔ مظاہرہ کرنے والوں نے جدت یہ کی ہوا کا رخ دیکھ کر مختلف مقامات سے پتنگیں اڑائی گئیں جن پر جلی قلم سے انگریزی میں لکھا تھا سائمن گو بیک۔ ان پتنگوں کو غوطہ دے کر دھاگے کو اس طرح توڑا کہ وہ پتنگ ٹھیک وہاں جا کر گرے جہاں سائمن کمیشن کا ایٹ ہوم ہو رہا تھا۔ پولیس کے لوگ دوڑ دوڑ کر انہیں پکڑ رہے تھے اراکین پولیس کی خفت اور خفگی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی''۔ (صفحہ ۲۵۳)۔

غرض نواب صاحب کی یہ خودنوشت اردو کی خودنوشتوں میں نمایاں سمجھی جائے گی کہ انہوں نے اپنی خود کلامی سے گریز کر کے خودستائی اختیار نہیں کی اور فی زمانہ یہ بہت بڑی بات ہے۔

◎

سفر زندگی

ڈاکٹر کرن سنگھ، سابق مہاراجہ کشمیر کی انگریزی خودنوشت Heir Apparant کا اردو ترجمہ ''سفر زندگی'' کے نام سے گلشن پبلشرز، ریزیڈنسی روڈ سرینگر کشمیر کی جانب سے شائع ہؤا۔ یہ ترجمہ آر۔ کے۔ بھارتی نے کیا ہے اور اردو سے ناواقفیت کی بنا پر جہاں کہیں انہیں مسلمانوں کے نام لکھنا پڑے ہیں وہاں انہیں بہت دقت ہوئی ہے۔ نظام حیدر آباد کے دو بیٹوں کی بیویاں انہیں یاد ہیں ایک تو نیلوفر تھیں اور دوسری ذرا کم حسین شہزادی ''دریشور'' تھیں (صفحہ ۶۸) یہ دریشور دراصل شہزادی درِ شہوار ہیں جن کے نام کا تلفظ ان سے نہیں ہو سکا اسی طرح ذوالفقار علی بھٹو کو بھی ''زلفکار علی بھٹو'' لکھا ہے۔

ڈاکٹر کرن سنگھ مہاراجہ ہری سنگھ کے اکلوتے صاحبزادے ہیں۔ تقسیم ملک کے وقت مہاراجہ ہری سنگھ نے ہندوستان سے الحاق کا فیصلہ کیا تھا ہندوستان کی حکومت نے انہیں معزول کر کے ان کے بیٹے یوراج کرن سنگھ کو کشمیر کا صدر بنا دیا اور پھر رفتہ رفتہ ریاست کو اپنے اندر ضم کر لیا۔ ڈاکٹر کرن سنگھ نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ گریجوایشن اپنی کشمیر یونیورسٹی سے کی جس کے خود چانسلر تھے (صفحہ ۲۳۰) اس کے بعد ایم اے اور پھر پی ایچ ڈی کیا، ان کے مضامین اکنامکس اور سیاسیات تھے مگر ریسرچ ہندو فلسفہ کے ایک موضوع پر کی۔

ایک روشن خیال شخص کی طرح اپنے ماں باپ کی خامیوں خوبیوں کا تذکرہ کھل کر کیا ہے ''میری والدہ کانگڑہ کی ایک دیہاتی لڑکی تھی اور میرے والد ہندوستان کی پانچ سو سے زائد ریاستوں میں سب سے بڑی ریاست کے حکمران تھے۔ میری ماں دل کی گہرائیوں سے خدا ترس تھی اور میرے والد آخر تک ملحد رہے۔ میری والدہ مہر و محبت کی پتلی گرم جوش اور بچوں سے پیار کرنے والی تھی لیکن میرے والد سخت مزاج ترش اور صرف اپنے منتخب درباریوں کے درمیان رہنے والے بہت کم یار باش۔ میری ماں خوب باتیں کرتی تھیں میرے والد اتنے غضبناک کہ ان کے سامنے بولنا بھی ناممکن تھا۔ میری والدہ توہم پرست، ظاہر پرست اور جذباتی تھی میرے والد صاف ستھرے باریک بین اور ظاہر داری سے دور

رہنے والے تھے'' (صفحہ ۴۴)۔ مگر باپ کی یہ خصوصیت خصوصیت سے لکھی ہے کہ ''وہ کسی پر بھروسہ نہیں کرتے تھے'' (صفحہ ۵۶)، جاگیردارانہ مزاج رکھتے تھے (صفحہ ۶۳) اور انتہا پسند تھے ان کے لئے میانہ روی کا کوئی رستہ نہیں تھا (صفحہ ۷۳)۔ ۱۹۴۷ کے کڑے وقت میں چھوٹے دل اور کوتاہ اندیش لوگوں نے ان کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا (صفحہ ۱۰۶) مسٹر ''اے''، یعنی ان کے والد سفر انگلستان میں جس سکینڈل اور بلیک میلنگ کا شکار ہوئے تھے اس کا بھی ذکر موجود ہے۔ (صفحہ ۴۸)

شیخ عبداللہ سے یہ بھی بہت نالاں ہیں اور ان کے والد محترم بھی بہت نالاں تھے۔ جہاں کہیں شیخ عبداللہ کا ذکر ہے تحقیر کے ساتھ ہے ''ایک غیر معروف سکول ماسٹر'' کہہ کر ان کا ذکر شروع کیا ہے۔ بہر حال انہیں وزیر اعظم بنانا ان کی مجبوری تھی۔ شیخ عبداللہ نے جیل سے رہائی کے وقت جو ''مشروط معافی نامہ'' ۲۸ ستمبر ۱۹۴۷ لکھا تھا وہ اس کتاب میں درج ہے۔

''جناب عالی!

اب مجھے جیل میں تقریباً ڈیڑھ سال ہوا ہے اور جیسا میں بہت عرصہ سے چاہ رہا تھا مجھے ٹھاکر نچنت سنگھ جی سے تفصیلی بات چیت کا موقع ملا ہے اس دوران ریاست میں جو افسوسناک واقعات پیش آئے میں ان کا ذکر نہیں کرنا چاہتا لیکن ہر محب ریاست کو پتہ چل گیا ہے کہ جو کچھ ماضی میں ہو گذرا اس کی وجہ آپس کی غلط فہمی تھی اور جو کچھ ایسے لوگوں کی کارستانی تھی جو اس سے ذاتی فائدہ حاصل کرنا چاہتے تھے سابقہ وزیر اعظم آر بی رام چندر کاک نے شرانگیز طریقے اور ہتھکنڈے استعمال کر کے ان غلط فہمیوں کو خوب بڑھا دیا اور وہ عارضی طور پر اس میں کامیاب بھی ہوا۔ اس نے مجھے اور میری تنظیم کو اس طرح پیش کیا کہ ہم نے آپ کو آپ کی رعایا کے قریب لانے کی جتنی بھی کوششیں کیں وہ رائیگاں ہو گئیں۔ مجھ پر لغو اور خود غرضانہ الزامات عائد کئے گئے۔ خدا کا شکر ہے کہ ریاست اور جناب والا کے یہ دشمن آج ننگے ہو گئے ہیں۔

ماضی میں درپیش آئے واقعات کے باوجود میں جناب والا کو یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں ذاتی طور پر یا میری پارٹی نے آپ کی ذات کے تئیں آپ کے تخت یا خاندان کے تئیں کبھی بے وفائی نہیں کی ہے۔

اس خوبصورت ملک اور یہاں کے عوام کی بہبودی ہمارا مشترکہ منتہائے مقصد ہے اور میں

جناب والا کو اپنے اور اپنی تنظیم کی طرف سے پوری پوری وفاداری کا یقین دلاتا ہوں۔ اور جو بھی تنظیم خواہ وہ ریاست کے اندر ہو یا ریاست سے باہر اور جو ہماری کوششوں میں روڑا اٹکانے کی کوشش کرے، ہم اسے اپنا دشمن قرار دیتے ہوئے اس سے اسی طرح کا برتاؤ کریں گے۔

متذکرہ بالا مشترکہ مقصد کی حصول یابی کے لئے آپسی اعتماد اور بھروسے کی اشد ضرورت ہے اس کے بغیر یہ ممکن نہیں کہ ہم ان مشکلات کا کامیابی سے مقابلہ کر سکیں جنہوں نے ہماری ریاست کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہے۔

اپنے خط کو ختم کرنے سے پہلے میں جناب والا کی خدمت میں دوبارہ یہ یقین دلانے کی جسارت کروں گا کہ میں آپ کا پورا وفادار ہوں اور خدا سے دعا گو ہوں کہ جناب والا کی سرپرستی میں امن و آشتی و خوشحالی و بہترین سرکار بنی رہے کہ یہ لا مثال ہو اور دوسروں کے لئے باعث تقلید ہو۔

جناب والا کا فرماں بردار رعیت

ایس ایم عبداللہ'' (صفحہ ۱۶۸-۱۶۹)

اب مہاراج ادھیراج کا وہ خط بھی ملاحظہ کیجئے جو مہاراج نے اپنے وزیر اعظم کو ۳ دسمبر ۱۹۴۸ کو لکھا تھا

''وزیر اعظم!

میں آپ کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ میرے خلاف شرانگیز پروپیگنڈا ریاست کے اندر اور باہر کیا جا رہا ہے۔ میرا خیال ہے یہ بات وزیر اعظم اور اس کی کابینہ کے سامنے بھی آ گئی ہوگی۔ لیکن اس کو روکنے یا اس کا منہ توڑ جواب دینے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ میں اس خط کے ساتھ ایسے اقتباسات کی نقل بھیج رہا ہوں جو کچھ وزراء اور نیشنل کانفرنس کے رہنماؤں نے اپنی تقریروں میں کی ہیں۔ اور جو اسی طرح میری توہین کا باعث ہیں جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے۔

یقیناً آپ اس بات پر متفق ہوں گے کہ ایسی باتیں کرنا آئینی اور اخلاقی طور پر بے حد بیجا ہے۔ میں یہ ذمہ داری آپ پر ڈالتا ہوں کہ میری سرکار، اور میری ذات کو اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ ریاست کے سربراہ کی عزت، توقیر اور منصب کی پوری حفاظت کی جانی چاہئے اور ایسی حرکات کو،

چاہے وہ کسی کی جانب سے ہوں ہر ممکن عجلت کے ساتھ دبا دیا جانا چاہئے۔ مجھے امید ہے کہ آپ فوری طور پر اس بارے میں مناسب اقدامات کر کے اس نہج اور اس پروپیگنڈہ پر روک لگا دیں گے۔ مجھے اس بات سے مسرت ہوگی اگر آپ بواپسی مجھے یہ لکھ کر بھیج دیں کہ آپ اس بارے میں کیا کارروائی کر رہے ہیں۔

مہاراج ادھیراج

'' 3.12.1948

مگر اس خط کا کوئی جواب ڈاکٹر کرن سنگھ صاحب کو ریکارڈ میں نہیں ملا۔ یہ دونوں خط اس وقت کی صورت حالات کو سمجھنے میں مد ہو سکتے ہیں۔

ماؤنٹ بیٹن اور ایڈوینا کشمیر گئے تو مہاراجہ نے پیٹ درد کا بہانہ کر کے ان سے ملاقات نہیں کی (صفحہ ۱۱۴)۔ گاندھی جی نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ وہ رعایا کا منشا معلوم کر کے کوئی فیصلہ کریں (صفحہ ۱۱۸) یوراج مہاراج کہہ رہے ہیں کہ '''' لالہ مہر چند مہاجن کہیں سے سامنے آ گیا'' (صفحہ ۱۲۵) مگر جسٹس مہر چند مہاجن کی خودنوشت میں انہوں نے لکھا ہے کہ مہارانی اور ولیعہد لاہور میں ان سے ملے اور کشمیر کا وزیراعظم بننے کی خواہش کی جس کا انہوں نے یہی جواب دیا کہ ہائی کورٹ کے جج ہیں اس لئے ان کے لئے ایسا ممکن نہیں اس پر انہی ولیعہد نے سوالیہ انداز میں ان سے کہا مہر چند جی کیا کشمیر کا وزیراعظم ہونا کوئی چھوٹی بات ہے؟ یہ ساری باتیں تفصیل کے ساتھ Looking Back میں موجود ہیں اب وہی یہ کہہ رہے ہیں لالہ مہر چند مہاجن کہیں سے آ گئے؟ مہاراج وہیں سے آئے جہاں سے انہیں بلایا گیا تھا۔ ''امرتسر پہنچ کر میں نے گورنر کو درخواست دی کہ مجھے آٹھ مہینہ کی چھٹی اور دوسری جگہ ملازمت کرنے کی اجازت دی جائے۔ ۱۰۔ اکتوبر کو میں سونے کے لئے چلا گیا تھا سردار پٹیل کی فوری کال آئی سردار نے پوچھا میں ابھی تک گیا کیوں نہیں؟ میں نے انہیں بتایا کہ میں نے درخواست دی ہوئی ہے ابھی تک جواب نہیں آیا۔ پٹیل نے گورنر ترویدی کو احکامات دئے کہ وہ فوراً میری چھٹی منظور کریں ایک بجے صبح کے قریب پھر سردار پٹیل کا فون آیا کہ میں لیڈی ماؤنٹ بیٹن کے ہمراہ جو اتفاق سے اس روز امرتسر تھیں ان کے طیارہ میں دلی پہنچوں۔ صبح صبح گورنر ترویدی کا فون پر پیغام ملا کہ چھٹی منظور کر لی گئی ہے اور کسی دوسری جگہ کام کرنے کی اجازت بھی دی جاتی ہے کہ میں دس اکتوبر سے ہی دوسری جگہ کام کر

سکتا ہوں۔ میں گیارہ کی صبح دہلی پہنچا۔ پنڈت نہرو گاندھی جی اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملا میرا خیال ہے ماؤنٹ بیٹن سمجھتے تھے مہاراجہ پاکستان سے الحاق کرے گا اس لئے انہوں نے صرف اتنا کہا کہ گورنر جنرل کی حیثیت سے میری خواہش ہے کہ مہاراجہ انڈیا سے الحاق کرے انہوں نے مجھے وی پی مینن سے ملنے کو کہا۔ مینن کے ساتھ شیام پرشاد مکر جی تھے دونوں نے مجھ پر زور دیا کہ مجھے بہر صورت کشمیر کا الحاق انڈیا سے کروانا چاہئے'' (لکنگ بیک صفحہ ۱۷۲)۔ اب تو انہیں معلوم ہو گیا ہوگا کہ لالہ مہر چند مہاجن کہاں سے آئے تھے؟ مگر یہ تو ان کا تجاہل عارفانہ لگتا ہے کیونکہ اسی کتاب میں انہوں نے وہی الفاظ دہرائے ہیں جو جسٹس مہاجن نے کشمیر کا مسئلہ سیکیوریٹی کونسل میں پیش کرنے پر لکھے تھے۔ ڈاکٹر کرن سنگھ لکھتے ہیں ''چالباز ظفر اللہ خاں ہندوستانی وفد پر چھا گیا'' (صفحہ ۱۴۲) اور مہاجن صاحب نوحہ کناں ہیں پاکستانی وفد کی قیادت سر ظفر اللہ خاں کر رہے تھے اور ''انہوں نے بے پناہ قابلیت اور وکالت کا لوہا منوایا اور ہندوستانی وفد کو غیر ضروری اور غیر متعلقہ باتوں میں الجھا دیا'' (لکنگ بیک صفحہ ایضاً)۔

ڈاکٹر کرن سنگھ کی روداد حیات میں لکھا ہے پدمجا نائیڈو جو نہرو کی منظور نظر دوست تھیں ایک صوبہ کی گورنر تھیں۔ گورنر کانفرنس میں نہرو کارروائی کے دوران ہی سو جایا کرتے تھے۔ پدمجا کہنے لگیں ''جواہر ایسی گورنر کانفرنسیں زیادہ ہونی چاہئیں۔ نہرو نے کہا کیوں کیا ایک کافی نہیں۔ پدمجا نے مسکراتے ہوئے کہا ویسے تو ایک کافی ہے مگر زیادہ ہوں تو آپ کو سونے اور آرام کرنے کا زیادہ موقع مل جایا کرے گا اور آپ کی صحت پر خوشگوار اثر پڑے گا'' (صفحہ ۴۴۶) کیا ہمارے ہاں کوئی اپنے وزیراعظم کو اس طرح بے تکلفی سے کوئی بات کہہ سکتا ہے؟

اور یہ بات جو ڈاکٹر صاحب نے لکھی ہے نئی تو نہیں مگر حیرت افزا ضرور ہے کہ ''لال بہادر شاستری مرے تو ان کے پاس نہ کوئی جائیداد تھی نہ کوئی روپیہ پیسہ'' (صفحہ ۵۲۸)

یہ خودنوشت ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے پہلے دور تک کی ہے اس کے بعد کی باتیں انہوں نے دیباچہ میں مختصراً لکھ دی ہیں لیکن توقع ہے دوسرا حصہ اس سے بھی زیادہ معلومات افروز ہوگا۔ ایک راجے مہاراجے کا اس طرح صاف گوئی سے باتیں کرنا ناممکن تو نہیں مگر محال ضرور لگتا ہے۔ اس خود نوشت کا مجموعی تاثر صاف گوئی کا ہے۔

◎

نشانِ جگر سوختہ

ڈاکٹر پروفیسر سلیم اختر کی خودنوشت ''نشانِ جگر سوختہ'' سنگ میل والوں نے ۲۰۰۵ میں لاہور سے چھاپی ہے۔ ڈاکٹر صاحب ملتان اور لاہور میں اردو ادب کے استاد رہے اور میرے ہم پیشہ ہیں۔ دو تین کتابیں اقبال پر بھی لکھیں مگر ان کا تخصص نفسیات اور جنسی معاملات کا ہے۔ 'نفسیات کے بارہ میں ان کی کتاب ''تخلیق اور لاشعوری محرکات'' نمایاں ہے اور جنسی معاملات میں ''عورت، جنس اور جذبات''، ''ہماری جنسی اور جذباتی زندگی''، ''مرد جنس کے آئینے میں''، ''عورت جنس کے آئینے میں''، ''شادی، جنس اور جذبات'' ان کی اہم کتابیں ہیں۔ جنسی موضوعات پر افسانہ نگاری کے میدان میں بھی اپنی جودت طبع کا مظاہرہ فرما چکے ہیں۔ انشائیہ کے موضوع پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ اقبال پر دو کتابیں ''اقبال اور ہمارے فکری رویے'' اور ''فکر اقبال کا تعارف'' ان کے قلم سے نکلی ہیں۔ افسانوی ادب کے باب میں بھی بند نہیں۔ داستان اور ناول اور افسانہ اور افسانہ نگار کے موضوعات پر بھی خامہ فرسائی کرتے رہے ہیں۔ غرض ڈاکٹر صاحب ہمہ جہت اور بسیار نویس مصنف ہیں۔

''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' نے ان کو ادب کا مؤرخ بھی بنا دیا۔ اردو کی ادبی کتابوں کا سال بسال یک فقری دو فقری جائزہ بھی لیتے رہے اور شاید یہ جائزہ ہی ان کی مختصر ترین تاریخ کی بنیاد بنا۔ ان کی اسی علت نے انہیں مختلف ادبی حلقوں میں متنازعہ بنایا اور شاید یہی ان کا مقصود بھی تھا۔ ان کی خودنوشت پڑھتے ہوئے جابجا احساس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنی زندگی کے ان واقعات کا تذکرہ بار بار اور مختلف طریقوں سے کر رہے ہیں جن سے ان کی خود پرستی آشکار ہوتی ہو۔ آخر ان کی روٹھ جانے والی محبوبہ کا طعنہ کہ ''اے خود پرست انسان'' (صفحہ ۱۵۲) حرف آخر کے طور پر وارد ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی جو تحلیل نفسی فرمائی ہے اس کا نتیجہ بھی یہی نکلتا ہے کہ ''لکھ رہا ہوتا ہوں تو ذہن کا ایک گوشہ خود اذیتی پر مبنی تصورات کی آماجگاہ بنا ہوتا ہے'' (صفحہ ۲۸۴)۔ وہی راہ چلتوں پر پتھر پھینک کر اپنے

لئے مصیبت کھڑی کر لینے کی عادت۔ نماز پڑھنے کے باوجود ماسٹر صاحب سے نماز نہ پڑھنے کی سزا کے طور قمچیاں کھانے کی عادت'' کیا اس کا باعث حق گوئی کا جذبہ تھا یا یہ منفی صورت میں خودنمائی خود نمائشی کا اسلوب تھا؟ یا پھر میں اتنا خود پرست تھا کہ میری نرگسیت کی عام لڑکوں والی باتوں سے تسکین ہی نہ ہو سکتی تھی'' (صفحہ ۶۳) بچپن ہی سے جو عادت راسخ ہو گئی بڑے ہوئے تو اس کے اظہار کے اور راستے اختیار کر لئے۔ میں نفسیات دان ہوں نہ مجھے ان کی تحلیل نفسی کی علت سے کوئی دلچسپی ہے مگر یہ باتیں آپ نے اپنی خودنوشت میں بیان فرمائی ہیں اس لئے ان کے فرمودات کو سامنے رکھ کر ڈاکٹر سلیم اختر صاحب کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

عجیب تر اتفاق یوں ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا ہم پیشہ ہونے کے باوجود ہمارا کبھی آمنا سامنا نہ ہؤا۔ ایک دو بار گورنمنٹ کالج کے شعبہ اردو میں جانا ہؤا تو وہاں میرے ہم جماعت پروفیسر اسرار احمد تھے یا میرے استاد بھائی ڈاکٹر معین الرحمٰن صدر شعبہ تھے ان سے تو ملاقات ہو گئی مگر سلیم اختر صاحب سے نہ ہوئی۔ ربوہ کالج کا استاد ہونے کے ناطے میرا اپنے پڑوسیوں ڈاکٹر وزیر آغا اور انور سدید سے تعلق رہا مگر میں ان کی ان تمام سرگرمیوں سے جنہیں سلیم اختر صاحب نے ''دشنامی مہم'' کہا ہے لاعلم اور لاتعلق رہا۔ اور ڈاکٹر صاحب نے ''ربع صدی تک وزیر آغا گروپ سے جو گالیاں کھائیں'' (صفحہ ۲۶۲) ان سے بےخبر رہا۔ یہ ساری داستان پہلی بار ڈاکٹر سلیم اختر صاحب کی خودنوشت میں پڑھی ہے۔ وزیر آغا کی خودنوشت ''شام کی منڈیر سے'' بھی میں پڑھ چکا ہوں انہوں نے تو نام لے کر ڈاکٹر سلیم اختر صاحب پر کوئی پھبتی نہیں کہی۔ سلیم اختر صاحب نے سرگودھا گروپ پر 'سرگودھا کا کٹلری باکس' کی (پرانی اور از کار رفتہ اور مانگے تانگے کی) پھبتی کہی ہے اور اپنی خودنوشت میں اپنی 'جودت طبع' کا ثبوت دیتے ہوئے کہی ہے حالانکہ ان کا دعویٰ ہے کہ ''بیشتر آپ بیتی تحریر کرنے والوں نے حقیقی مفروضہ مبینہ دشمنوں پر تبرا کیا ''نشانِ جگر سوختہ'' اس سے پاک ملے گی'' (صفحہ ۱۷)۔ حیف کہ یہ کتاب اس ناپسندیدہ عنصر سے پاک نہ نکلی۔

ڈاکٹر سلیم اختر صاحب کی اس تین سو صفحے کی خودنوشت کے پہلے ڈیڑھ سو صفحات ان کی ''۲۶ سالہ بے مقصد زندگی'' (صفحہ ۱۵۷) کے بیان میں صرف ہوئے ہیں ان کا بیان اختصاراً بھی کیا

جاسکتا تھا مگر ڈاکٹر صاحب نفسیات کے ماہر ہیں اس لئے بچپن اور لڑکپن کی زندگی کو اہمیت دیتے ہیں۔
انہیں اپنے جوانی دیوانی کے زمانہ کے القابات سے یک گونہ لگاؤ ہے ''شتونبڑا'' (صفحہ ۱۴۰) اور
''واورولا'' یعنی بگولا (صفحہ ۱۵۰) انہوں نے خاص طور سے بیان کئے ہیں۔ پشاور کے قیام کے دوران
''ہیجڑے'' کی خدمت گذاری (صفحہ ۱۱۸) کا قصہ بھی ہے مگر اس کی ساری ذمہ داری آپ نے اپنے
دوست 'ح' پر ڈال دی ہے حالانکہ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب تو ایک ہیجڑے سے ہاتھ پاؤں دبوانے کی
خدمت بھی لیتے رہے ہیں (گنجینۂ گوہر صفحہ ۱۹۹) انہیں تو کوئی کامپلیکس نہیں۔ یہ کوئی کامپلیکس تو نہیں
جس نے انہیں ہیجڑے کی حالتِ زار اور اس کی کچلی ہوئی جنسیت پر افسانہ نہ لکھنے دیا ہو؟

ڈاکٹر صاحب محکمہ تعلیم سے وابستہ ہونے کے باوجود بعض اوقات بے خبری کی بات کرتے ہیں
تو حیرت ہوتی ہے۔ ایک طالبہ کی جنسی فرسٹریشن کا ذکر فرما رہے ہیں لکھتے ہیں ''ایک دن ایک پروفیسر
نے بی اے انگریزی کا پرچہ دکھایا۔ یہ ملتان کے امتحانی سنٹر کا تھا اور لڑکی کا تھا۔ پرچے میں کسی سوال کا
کوئی جواب نہ تھا صرف sexual fantasy تھی جسے درست انگریزی میں قلم بند کیا گیا تھا۔ ہم
سب اساتذہ نے وہ پرچہ پڑھا۔ بیشتر نے چسکے کے لئے تو مجھ جیسوں نے عبرت کے لئے''
(صفحہ ۱۶۸) میں حیران ہو رہا ہوں کہ بی اے کے امتحانی پرچہ کے سنٹر کا اور پھر امیدوار کے خاتون
ہونے کا انہیں کیسے پتہ چلا؟ بی اے کے امتحانی پرچوں پر تو صرف رول نمبر ہوتے ہیں اور وہ بھی
ficticious۔ اور اسی لئے اصلی رول نمبر ظاہر نہیں کئے جاتے کہ ممتحن کو امیدوار کی پہچان نہ ہو۔ یہ تو
ممکن ہے کہ طالبہ کے انداز بیان سے انہیں اس کے خاتون ہونے کا اندازہ ہو گیا ہو مگر امتحانی سنٹر کی
تعیین کیسے ہوئی؟ جو شخص امتحان کے ان اصولوں سے واقف نہ ہو وہ تو ایسی بات کہہ سکتا ہے مگر ایک
استاد کس طرح ایسی بے تکی بات کہے؟ مگر آپ نے کہہ دی۔ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند!

اپنی فرسٹریشن کی بات تو آپ نے زنانہ کالج کے کسی بزرگ پروفیسر کے نام پر کہی ہے کہ
'انہوں نے کلاس میں شعر پڑھا ''نالہ سر کھینچتا ہے جب میرا۔ شور اک آسماں سے اٹھتا ہے''۔ ایک
کونے سے کسی شوخ چشم کی آواز بلند ہوئی ''سر آپ نے کب نالہ کھینچا''۔ بزرگ صورت استاد اتنے
نروس ہوئے کہ کلاس چھوڑ کر چلے گئے'' (صفحہ ۱۷۲) سوال یہ ہے کہ ''نالہ کھینچنے'' کی بات سے اگر اس

بزرگ استاد کا ذہن کسی جنسی پہلو کی طرف منعطف ہوتا ہے تو اس میں طالبہ کا کیا قصور؟ اس نے تو
سیدھا سادہ سوال کیا تھا کہ کیا نالہ کھینچنے کی کیفیت آپ پر گذری ہے اور گذری ہے تو کب؟ ڈاکٹر
صاحب تحلیل نفسی کے اتنے رسیا ہیں کیا انہیں اس میں اس بزرگ استاد کی جنسی محرومی نظر نہیں آئی؟ وہ
طالبہ کو خواہ مخواہ الزام دے رہے ہیں۔

ایک جگہ آپ نے علم نجوم کی بات کہتے ہوئے تیرھویں برج کا نام لیا ہے۔ (صفحہ ۱۱۷) میں تو
نہیں جانتا کہ ایسا کوئی برج ہوتا ہے یا نہیں مگر ڈاکٹر صاحب نے بعض دوستوں اور اپنے بعض دشمنوں
کے تیرھویں برج کا نام لیا ہے وزیر آغا کو ہول کا تیرھواں برج الاٹ کیا ہے انور سدید کو برج دشنام بخشا
ہے اپنے قریبی دوستوں اور شناساؤں کو اچھے اچھے برج الاٹ کر دئے ہیں مگر اے کاش وہ اپنے برج
کا نام بھی لے دیتے۔ قرین قیاس ہے کہ اپنے برج کے لئے کسی ایک برج پر اکتفا نہ کرتے اور کہتے میرا
برج تو ''چوبرجی'' ہے۔

ڈاکٹر صاحب ڈراؤنی خوابیں بھی دیکھتے رہے (صفحہ ۱۹۸) اور راتوں کو ڈر ڈر کے اٹھتے رہے
یہ کس بات کا خوف تھا انہیں خود معلوم نہیں تو قاری کو کیا بتائیں راتوں کو چیخیں مار مار کر اٹھ بیٹھنے کا ذکر
آپ نے خصوصیت سے کیا ہے اس کا کوئی سبب تو ہوگا؟ کیا ڈاکٹر سلیم اختر اپنے قارئین سے کوئی چیز
چھپا تو نہیں رہے؟

ایک استاد کی زندگی کا سب سے دلچسپ واقعہ بھی سن لیجئے لکھتے ہیں ''سب سے دلچسپ 'وہ' تھی
کئی سال بعد ملی۔ شادی ہو چکی تھی ساتھ خاوند جس نے بچہ گود میں اٹھا رکھا تھا میں نے بزرگانہ انداز میں
گلے لگایا تو کان میں سرگوشی کی ''میں جب چاہتی تھی اس وقت تو گلے نہ لگایا اب کیا فائدہ''؟ فوراً پیچھے ہٹی
اور چہک کر بولی ان سے ملئے! میرے شوہر!! یہ آپ سے ملنے کے بہت مشتاق ہیں'' (صفحہ ۲۱۶)۔
کہئے؟ کیا آپ نے کسی بزرگانہ انداز میں گلے لگانے والے استاد کو ایسی سرگوشی سنتے دیکھا یا سنا ہے؟

میں پروفیسر سلیم اختر صاحب سے پہلی بار ان کی اس خودنوشت سے متعارف ہوا ہوں۔ مجھے
توقع تھی کہ اس خودنوشت میں ان کی علمی و ادبی زندگی کے خدوخال موجود ہوں گے اور میں انہیں بہتر
طور پر جان سکوں گا مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ ان کی خودنوشت سے ایک کھلنڈرے بے فکرے

اور سرکش نوجوان کی جنسی محرومیاں تو ظاہر ہوئیں ان کی بزرگانہ شخصیت ابھر کر سامنے نہ آئی۔ اس کی ایک ہی وجہ مجھے سمجھ میں آئی ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر کو کسی کامل استاد کی نگاہ میسر نہیں آئی۔ نفسیات ہے تو اس کا علم کتابی ہے کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر کے نہیں سیکھا گیا اور ایسے علم میں ایک آنچ کی کسر ضرور رہ جاتی ہے۔ ادب ہے تو اس کی تحصیل کتابی ہے۔ ادب کے مستند اساتذہ کے قرب کے باوجود انہیں ان کی سرپرستی میسر نہ آئی۔ میں پرائیویٹ طور پر تحصیل علم کرنے والوں کی تنقیص نہیں کر رہا ہوں صرف یہ عرض کر رہا ہوں کہ جب تک کسی استاد کی نظر نہ ہو کتابی علم ''اسماعیل کو آدابِ فرزندی'' نہیں سکھاتا۔ ڈاکٹر صاحب نے اعتراف فرمایا ہے کہ میری ہر بات میں ایک آنچ کی کسر رہ جاتی ہے شاید یہی اس کا سبب ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔ یہی واللہ اعلم بالصواب کی ترکیب سامنے آ گئی تو ایک فاضل اجل ادیب یاد آئے جو کسی کالج سکول کے پڑھے ہوئے نہیں تھے۔ مجھے ایک خط میں انہوں نے لکھا ''ولا آلم'' اس بات کی اصلیت کیا ہے؟۔ میں حیران پریشان ہو کر اس ولا آلم کی ترکیب سمجھنے کی کوشش میں لگا رہا اچانک خیال آیا کہ حضرت واللہ اعلم کو پنجابی میں لکھ رہے ہیں اور چونکہ اس کے بنیادی مطلب سے نابلد ہیں اس لئے اعلم کو آلم بنا دیا ہے۔ ایسا ہونا کوئی ناممکن امر نہیں۔ پرانے زمانے میں جو شاعر کسی مستند استاد شاعر کا شاگرد نہیں ہوتا تھا اسے ''بے استادا'' کہتے تھے اور ایسے لوگ غلطیوں میں پختہ ہو جاتے تھے۔ اب وقت بدل گیا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر صاحب خود استاد رہے ہیں اس لئے ان کے شاگردوں میں وہ ایک آنچ کی کسر نہیں رہے گی جس کا سامنا انہیں کرنا پڑا۔

اتنی ساری نفسیات کو سمجھنے کی کوشش تو کی مگر ان کی ایک بات کی سمجھ نہ آئی۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا کہ ان کے شاگردوں میں سے ''ایک لڑکی بھی یہ نہ کہے گی کہ سر نے دست ہوس دراز کیا ہمارے کمزور لمحات کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، ہمیں ورغلایا اپنے اچھے برے مقاصد کا آلۂ کار بنایا اور تھیسس کی نگرانی کے کام کا'' کچھ اور طرح کا' معاوضہ چاہا'' (صفحہ ۲۱۶)۔ یہ گواہی دلوانے کی ضرورت ہی کیوں ہے؟ کیا کوئی باپ اپنی بیٹیوں سے یہ گواہی دلوایا کرتا ہے کہ ہمارے باپ نے ہم پر کبھی دست درازی نہیں کی؟۔ المیہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں سے استاد اور شاگرد کے رشتہ کا جو تقدس تھا وہ اٹھ گیا ہے اور یہ بہت بڑا زیاں ہے۔ کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا۔

یہ خودنوشت ادب کے ایک استاد کی خودنوشت ہے اور اس میں زیادہ تر اشعار جو سند کے طور پر درج کئے گئے ہیں وہ طلباء کے نصاب کی کتابوں میں سے ہیں۔ کیا ڈاکٹر سلیم اختر صاحب کا مطالعہ ان نصابی کتب سے آگے نہیں گیا؟

کتاب کے سرورق پر ماریشس کے سرسبز و شاداب منظر کی ایک تصویر ہے جس کے پیش منظر میں ڈاکٹر سلیم اختر بیٹھے ہیں کتاب کے اندر بھی وائس چانسلر اور وزیر اعظم اور ان کی دھرم پتنی کی تصویر موجود ہے مگر ساری کتاب میں ماریشس جانے کا کوئی ذکر نہیں۔ ڈاکٹر صاحب ایک آدھ فقرہ اس سفر کے باب میں لکھ دیتے تو قاری کو تشنگی نہ رہتی۔

◎

بتیس برس امریکہ میں

جناب ابوالحسن نغمی کی یادداشتوں کی دوسری کتاب ''بتیس برس امریکہ میں'' سنگ میل لاہور کی جانب سے ۲۰۰۶ میں چھپی ہے۔ یہ کتاب ان کی امریکہ میں آمد سے لے کر اب تک کی زندگی کا بیان ہے۔ امریکہ آئے تو صدائے امریکہ کی دعوت اور ویزے پر تھے مگر کچھ ہی دیر بعد صدائے امریکہ والوں سے ان کی ٹھن گئی انہوں نے انہیں فارغ کر دیا۔ مگر ان کا ویزا معطل نہ کیا، اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے اس نے اس دوران ان کے لئے اور راستے کھول دئے اور انہوں نے ان کو سپانسر کردیا۔

ان کی کتاب ''یہ لاہور ہے'' کا تجزیہ کرتے ہوئے میں نے شکوہ کیا تھا کہ نغمی صاحب اپنے سے سینئر لوگوں پر تنقید کرنے کے عادی ہیں بلکہ ''لاہور سٹیشن کے افسروں کے بارہ میں یہ تک کہا ہے کہ وہ نا اہل ہیں'' (یہ لاہور ہے صفحہ ۳۶۷) صدائے امریکہ میں بھی وہی ہؤا '' مجھے ملازمت کے اولیں دنوں ہی میں یہ یقین دلانے کی کوشش کی گئی کہ میرا ترجمہ ناقص ہے۔۔۔اور میرے ترجمہ کو اصلاح کی ضرورت ہے۔ جس ہاتھ میں اصلاح کے لئے قلم تھمایا گیا اس نے وی او اے کی ملازمت سے قبل کبھی ایک پیراگراف کا ترجمہ نہ کیا تھا نہ کسی روزنامہ میں نہ کسی ریڈیو سٹیشن میں نہ کسی ٹیلی ویژن سٹیشن میں نہ کسی انفارمیشن ڈپارٹمنٹ میں۔ اصلاح کرنے والے اس ہاتھ نے نہ تو کبھی نثر لکھی نہ نظم لیکن اب اسے اصلاح تو بہر حال کرنا ہی تھی'' (صفحہ ۱۲۷)۔

میرا لکھا ہؤا تجزیہ میرے دوست ڈاکٹر داؤد رہبر نے پڑھا تو انہوں نے لکھا کہ نغمی صاحب کے افسران کی ترقی کی راہ میں روڑے اٹکاتے تھے اس لئے '' مجھے تو قلمی مزدوری کرنے والے نغمی صاحب مظلوم لگے'' (داؤد رہبر کا نامہ میرے نام)۔ بجا ارشاد ہؤا مگر دوسری مرتبہ بھی قلم کی مزدوری کرتے ہوئے نغمی صاحب اپنے امریکی ادارے کے افسران کے بارہ میں وہی بات کہہ رہے ہیں جو آپ نے لاہور کے پرانے افسروں کے بارہ میں کہی تھی۔ اگر میں یہ نتیجہ نکالوں کہ نغمی صاحب کو اپنے ''قلم

ہارے'' (صفحہ ۲۳) سے ذرا سا اختلاف کرنے والا بھی اچھا نہیں لگتا اور یہ کہ نغمی صاحب کا مزاج اپنے آپ کو'' کچھ'' سمجھنے کی وجہ سے کسی کی ماتحتی کرنے والے کا مزاج ہی نہیں تو کیا یہ بات درست نہ ہوگی؟

میرا مقصد نغمی صاحب پر تنقید کرنا نہیں میں ان کی جدوجہدِ مسلسل کی روداد پڑھ کر ان کا مداح ہوں میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ خودنوشت کا مزاج اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ لکھنے والا اپنے آپ کو دوسروں سے بالاتر نہ سمجھے۔ اور ہر وقت یہ نہ سمجھتا پھرے کہ میں بھائیجان نغمی ہوں اور ہر شخص کو میرے کمالات کا اعتراف کرنا لابدی ہے۔

نغمی صاحب ماشاء اللہ سے دیندار آدمی ہیں اللہ تعالیٰ کی قدرتوں پر مکمل یقین رکھتے ہیں مگر شرک کی حد تک قبر پرست نظر آتے ہیں ''اللہ کی مرضی سے امریکہ جانے کا آرڈر داتا سے ایشو ہوگا'' (صفحہ ۳۰) قرآن سے فال نکالنے کو نا مناسب سمجھنے کے باوجود فال نکالنے سے گریز نہیں کرتے۔ (صفحہ ۱۸۲) قرآن حکیم کی آیتوں کا حوالہ دیتے ہیں اور بڑے مناسب مقام پر اور مناسب طریق سے دیتے ہیں۔ ایک ایسا مقام تھا جہاں انہیں قرآنی آیت کا حوالہ ضرور دینا چاہئے تھا وہاں انہوں نے اس حکمت کی بات کو دور پار کے ایک عزیز سے منسوب کردیا جس نے انہیں نافع الناس بننے کی تلقین کی۔ یہ وقت تھا کہ قرآن کا ارشاد بیان کیا جاتا کہ اما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض کہ جو وجود خلق خدا کے لئے نافع ہو اللہ تعالیٰ اس کو زمین میں دیر تک قائم رکھتا ہے۔ ہمیں تو اس بات کی خوشی ہے کہ کوئی تو ہے جو اس دور میں بھی قرآن کی حکمتوں کا حوالہ دیتا ہے۔ '' کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں''

ایک بات جو کھٹکتی ہے وہ بے جا کی تکرار ہے۔ ہر باب شروع کرنے سے قبل اس باب کا لب لباب درج کرتے ہیں اور پھر اس کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔ چاہئے تو یہ تھا کہ کتابی صورت میں مرتب کرتے وقت ابتدائیہ کے وہ حصے حذف کر دئے جاتے مگر نہیں کئے جس سے قاری کو الجھن بھی ہوتی ہے اور کتاب کے حجم میں بھی خوامخواہ اضافہ ہؤا ہے۔ واقعاتی تکرار کہ بیٹے نے اپنی تنخواہ لاکر ماں کے ہاتھ پر رکھ دی تو اس کا ذکر دو سے زیادہ مرتبہ کیا (صفحہ ۲۵۲)

پرہیزگاری کا یہ عالم ہے کہ سؤر کا گوشت غلطی سے کھا گئے تو ڈاکٹر کے پاس جا کر استفراغ کی دوائیں حاصل کیں اور جب تک ذرہ ذرہ جسم سے خارج نہ ہو گیا چین سے نہ بیٹھے۔ (صفحہ ۴۸۷)

حالانکہ قرآن کی جو آیت حوالے کے طور پر لکھی ہے اس میں اجازت ہے کہ اگر اضطراراً ایسا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی باز پرس نہ ہوگی۔ مگر انہیں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اس رعایت سے استفادہ منظور نہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ پھر ان میں اور ان کٹر علمائے کرام میں کیا فرق ہے جو اسلام کی تعلیمات کو ایک محدود نظر سے دیکھتے ہیں۔ بڑے ابا ریاض خیر آبادی کے بہت سے شعر آپ نے موقع بموقع حوالے کے طور پر لکھے ہیں گویا نگینے جڑ دیئے ہیں۔ مگر غالب کے مصرعہ میں تحریف کر گئے ہیں ''زخم بھرنے تک مرے ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا''۔ غالب کا مصرعہ یوں ہے ''زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا''۔ نغمی صاحب خود ہی اپنے مصرعے اور غالب کے مصرعہ کا موازنہ کر لیں۔ ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔ نہ ہوئے غالب کے شاگرد میرن صاحب! بابائے اردو نے لکھا ہے کہ ''کسی نے غالب کا ایک مصرعہ غلط پڑھ دیا تو وہ لٹھ لے کر پڑھنے والے کے گرد ہو گئے کہ اماں یہ کوئی حدیث یا آیت ہے کہ غلط پڑھ جاؤ گے تو کوئی پوچھے گا نہیں۔ یہ غالب کا مصرعہ ہے خبردار جو اس کو غلط پڑھا!'' اللہ اللہ! خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں۔

نغمی صاحب نے فریدہ خانم سے جس طرح محبت کا اظہار کیا ہے اس پر طبیعت خوش ہوگئی ''فریدہ میری یادوں کی دائمی خوشبو۔ وہ جب بھی یاد آتی ہے تو اس کا گورا رنگ میرے کاشانۂ دل کی انگنائی میں چاندنی کی طرح محیط ہو جاتا ہے اور اس غیرت ناہید کی آواز گھپ اندھیرے میں نور کی لکیر بن جاتی ہے'' (صفحہ ۲۷۳)

اور اب ایک چھوٹی سی بات۔ اتنی ضخیم کتاب میں کتابت کی کوئی غلطی نظر نہ آئی تو جی بہت خوش ہوا کہ اب ہمارے ہاں بھی صحت کتابت کا خیال رکھا جانے لگا ہے صرف ایک جگہ توطن کو ''طوطن'' (صفحہ ۵۴) لکھا ہوا پڑھا تو یوسفی صاحب یاد آئے انہوں نے لکھا ہے بعض لوگ 'توتا' ت سے لکھتے ہیں مگر طوطا طوئے سے لکھا جائے تو زیادہ ہرا معلوم ہوتا ہے۔

امید ہے نغمی صاحب کی یہ خودبیتی بہتوں کے لئے سامان انبساط مہیا کرے گی۔

◎

گئے دنوں کا سراغ

مظفر وارثی کی خودنوشت پر لکھنے سے قبل ہمیں فیصل آباد کالج کے ایک رفیق کار ڈاکٹر ریاض احمد ریاض یاد آئے۔ ایک روز کہنے لگے کسی صاحبِ دل کی تلاش میں ہوں کہ اس سے بیعت ہوسکوں؟ ہم نے ایک سیدزادہ کا نام لیا جو خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی نسل سے تھے۔ کہنے لگے ''نا بابا نا ان میں 'تو' میں' بہت ہے''۔ میں نے کہا تو آپ اپنے آپ سے بیعت کیوں نہیں ہو جاتے؟ کہنے لگے ہاں یہ بات سوچنے کی ہے مگر میرے اندر بھی 'میں' بہت ہے اسی لئے تو میں کسی دوسرے سہارے کا متلاشی ہوں۔ مگر مظفر وارثی کی نثار عزیز بٹ سے مستعار لئے گئے نام والی خودنوشت ''گئے دنوں کا سراغ'' پڑھی ہے تو معلوم ہوا ''میں'' کیا ہوتی ہے اور انا کسے کہتے ہیں۔ ہم نے بہت خودنوشتیں پڑھیں مگر اتنی خودنمائی اور خودپرستی کہیں نظر نہ آئی۔ حالانکہ انہیں معلوم ہے ''احساس برتری ہو یا کمتری ویسے ہیں دونوں ایک ہی چیز'' (صفحہ ۲۳۴) اللہ معاف کرے کیا غیب کی آواز پر داڑھیاں رکھ لینے والے (صفحہ ۲۳۷) اور ''پاک پتن شریف میں شراب سے توبہ کر لینے والے'' (صفحہ ۲۴۶) سب ''نیک'' ایسے ہی ہوتے ہیں''؟ اور خود ان کے قول کے مطابق ''گنہگار پارسائی کا لبادہ اوڑھ'' لیتے ہیں (صفحہ ۲۶۵)

ہمیں مظفر وارثی صاحب کا ایک انٹرویو بھی یاد آ رہا ہے جو آپ نے کسی رسالے کو دیا تھا۔ سوال یہ تھا ''اگر آپ کو بیک وقت دو مشاعروں کا دعوت نامہ ملے ایک عام مشاعرہ کا اور دوسرا نعتیہ مشاعرہ کا تو آپ کس کو ترجیح دیں گے؟'' آپ نے برجستہ فرمایا ''جہاں سے زیادہ معاوضہ ملے''۔ اب آ کے معلوم ہوا ہے کہ وارثی صاحب تو انٹرویو میں جواب بے سوچے سمجھے دیا کرتے تھے۔ ''ہم سے پوچھا گیا اس عہد کا نعت گو سب سے بڑا کون ہے؟ ہم نے بغیر سوچے سمجھے کہا ''مظفر وارثی'' (صفحہ ۱۱۲) گویا ان کی بے سوچے سمجھے کہی ہوئی بات ہی ان کی سوچی سمجھی بات ہوتی ہے۔

ابا بھی شاعر تھے اس لئے شاعری ان کے گھر کی لونڈی ہے۔ بچپن میں ابا کے ساتھ ''پمفلٹ گا

گا کر بیچا کرتے تھے'' (صفحہ ۵۸) اس لئے شاعری ان کا ذریعہ روزگار بھی رہی۔ ترنم اللہ نے اچھا دیا تھا اس لئے مشاعروں میں پہلے ابا کی غزلیں گا کر پڑھتے تھے اور داد سمیٹتے تھے پھر اپنی غزلیں پڑھنے لگے۔ ابا سے وارثی ہونا بھی ورثہ میں پایا اس لئے نعتیں کہنے لگے اور ضیاء الحق کے زمانہ میں جب نعتیں کہنا لوگوں کا پیشہ بن گیا تو ان کے وارے نیارے ہو گئے یہ نہ صرف نعت گو تھے (نعت خواں بھی بن گئے) اور اپنی ''نعت کو بالکل اچھوتی آواز، نیا اسلوب فکر، نئی ہیئت، نئی تشبیہہ استعارات نئی لفظیات'' کا حامل کہنے لگے (صفحہ ۱۹۷) مشاعرے پڑھتے تو لوگ بار بار ان کے کلام کی فرمائش کرتے۔ اب یہ بچارے دبدھا میں کہ ''کس کس مشاعرے کی کامیابی کا سہرا اپنے سر باندھوں'' (صفحہ ۲۲۲)۔ سنیل دت صاحب نے فتویٰ دیا کہ ''یہ ہندوستان پاکستان کے شاعر نہیں عالمی شاعر ہیں'' (صفحہ ۲۰۸) تو پھولے نہ سمائے لوگ ان کی مشاعروں میں کامیابی کو ان کے ترنم یا ان کی نعت خوانی سے منسوب کریں تو انہیں یہ ایک ''ہی تصویر کے دو رخ نظر آتے ہیں اور ایک بدنیتی کے دو پہلو'' (صفحہ ۱۳۵)۔ انہیں یقین ہے کہ ''قدرت ہم سے کام لینا چاہتی ہے''

(صفحہ ۱۶۸) اور کام کیا لیا؟ آپ طاہر القادری کی جماعت میں شامل ہو گئے کہ ''ان جیسا مقرر شاید ہی کوئی ہو'' ان کی مجبوری تھی کہ سٹیٹ بنک میں ملازم تھے اس لئے فوری طور پر میدان عمل نہیں اتر سکتے تھے قادری صاحب نے ایک لمحہ میں یہ مسئلہ حل کر دیا کہ آپ جو تنخواہ سٹیٹ بنک سے لے رہے ہیں اس سے زیادہ ہر ماہ ادارہ آپ کو پیش کیا کرے گا'' (صفحہ ایضاً) اور آپ ''مصطفوی انقلاب کے لئے میدان عمل میں ''ایک سپاہی کی طرح اتر پڑے'' (صفحہ ۱۷۰)۔ جو نہ آنا تھا نہ آیا۔ بچارے ضیاء الحق سے بھی اسلامی انقلاب کے سلسلے میں بہت مایوس ہوئے۔ ان کے اقتدار کے دسویں سال میں ان سے فرمانے لگے ''اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر کو اقتدار کے ساڑھے گیارہ سال عطا کئے تھے انہوں نے آدھی دنیا فتح کر لی تھی آپ کی حکومت کو دسواں سال جا رہا ہے لیکن اسلام کا دور دور تک پتہ نہیں جس کا آپ نے وعدہ کیا تھا۔ کمال تحمل اور سنجیدگی سے انہوں نے ہمیں مختصر جواب دیا لیکن اس جواب سے ہم متاثر ہوئے نہ مطمئن۔ اگر ان جیسا مرد مجاہد بھی کسی طاقت کے سامنے اتنا مجبور اور بے بس ہو جائے تو نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ خود تو کرسی پر آکر بیٹھنے سے رہا'' (صفحہ ۱۴۴)۔ اس شکوہ سے وارثی صاحب کی سیاسی

بصیرت کی قلعی کھل جاتی ہے بصارت کے باب میں تو وہ طاہر القادری صاحب کی مریدی کا ذکر کر کے ثبوت دے چکے ہیں۔

ضیاء الحق کا طریقہء واردات یہی تھا کہ وہ لوگوں سے نہایت تپاک سے ملتا تھا اور اپنے ملاقاتیوں کو گاڑی تک رخصت کرنے جاتا تھا اس کی ان مہربانیوں کو آپ نے بڑے اترا اترا کر بیان کیا ہے'' جب بھی ہم جی ایچ کیو سے لوٹتے ضیا صاحب فرط محبت سے ہماری گاڑی کا دروازہ کھول کر کھڑے ہو جاتے۔ ایسے ہی ایک موقع پر جب ہم گاڑی میں بیٹھ گئے اور پہیے کھسکنے لگے تو ضیا صاحب نے ایک بند لفافہ ہماری جھولی میں ڈال دیا اور گاڑی چل پڑی۔ لفافہ کھولنے سے پہلے ہم نے سوچا آج ضیا صاحب نے جانے کیا ہمیں بخش دیا ہوگا وہ لفافہ کھولا تو غیرت نے سر پیٹ لیا واپس بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اس میں پانچ سو روپے کا ایک عدد نوٹ تھا وہ نوٹ اور ان کی بیگم کا بھیجا ہوا دو واسکٹوں کا کپڑا ہمارے نامہ اعمال میں ہے'' (صفحہ ۱۴۷) اور وہ سر پیٹ لینے والی غیرت بھی ماشاء اللہ کیا تھی۔ جو خیال مبارک ان کے ذہن میں آیا وہ بڑے انعام کی امید رکھنے والوں کے دل میں ہی آیا کرتا ہے۔ اقبال کے ایک قطعہ کا ایک حصہ بھی اسی مضمون کا ہے ''غیرت فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول۔ جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکوٰۃ''۔

اب آپ نے اپنی تعریف کے سلسلہ میں جو جو باتیں لوگوں کے منہ میں ڈال دی ہیں ذرا ان کا بھی تذکرہ ہو جائے۔ حفیظ جالندھری میں انا کوٹ کوٹ کر بھری تھی مگر وہ ''مظفر وارثی سے سوا کسی اور کو شاعر مانتے ہی نہیں تھے'' (صفحہ ۸۷) اور حفیظ صاحب کے علاوہ احسان دانش بھی کہتے تھے ''اس دور کی غزل گوئی کا معیار مظفر وارثی سے قائم ہوگا'' (صفحہ ۹۵) جب لوگوں نے حفیظ اور احسان دانش کی بات نہیں مانی تو انہیں سراج منیر سے سرٹیفکیٹ لینا پڑا کہ ''آپ سے زیادہ حاسد اور مخالف میں نے کسی کے نہیں دیکھے'' (صفحہ ۱۱۰)۔ احسان دانش صاحب نے اپنی خودنوشت کے حصہ دوم ''جہان دگر'' میں ان کا ذکر دو جگہ کیا ہے اس ذکر خیر میں تو کوئی غیر معمولی بات ہمیں نہیں ملی۔ احسان دانش لکھتے ہیں ''مظفر وارثی اسٹیٹ بنک میں ملازم ہیں فلمی دنیا میں بھی ان کی قدر و قیمت کچھ کم نہیں اور ادبی دنیا میں بھی انہوں نے اپنی تعمیر کی نیو میں کنکریٹ بھر دی ہے جو کھوکھلی نہیں۔ ان کے کلام میں ان کی اپج اور تنوع

پسندی عوام وخواص کو ایسی غذا اور جسموں کے لئے ایسی آب و ہوا ہے جس میں تندرستی چونکتی نظر آتی ہے۔ جس مشاعرے میں یہ ہوتے ہیں اس سے شعر پسند اور نغمہ پسند حضرات دونوں مطمئن اٹھتے ہیں۔ ہر چند کہ ان کا مستقبل پورے طور پر سامنے نہیں لیکن اس کے باوجود قد آور ہیں'' (جہانِ دگر صفحہ ۳۶۶)۔ دوسری جگہ لکھتے ہیں ''مظفر وارثی نوجوانوں میں اچھی غزل کہتے ہیں لیکن مشاعروں پر زیادہ قطعات کی تکرار ہوتی ہے یہ جناب صوفی وارثی مرحوم کے صاحبزادے ہیں اور انہیں ورثہ میں شاعری پہنچی ہے پہلے قدیم رنگ میں کہتے تھے اب کچھ دنوں سے جدید کی طرف رخ کرلیا ہے اور تیزی سے بڑھ رہے ہیں مشاعروں میں ترنم سے پڑھتے ہیں جس سے شعر میں اور تیکھا پن آجاتا ہے اور داد و تحسین کی بھرپور آوازیں ان کا استقبال کرتی ہیں'' (صفحہ ۷۸۶) جہانِ دگر کا یہ حصہ ان کی خودنوشت سے پہلے چھپ چکا تھا مگر مظفر صاحب نے اس سے استفادہ کرنا ضروری نہیں جانا۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ احسان صاحب کا زور بھی ترنم کی دلآویزی پر ہے۔

جنرل جہانداد خاں نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ ریفرنڈم کے روز پولنگ بوتھ خالی پڑے تھے جنرل صاحب نے فوراً ضیاء الحق کو مشورہ دیا کہ ''اپنے پسندیدہ مولویوں کو ٹی وی پر بٹھادیں اور انہوں نے میری بات پر عمل کیا''۔ (پاکستان کا بحران صفحہ ۲۰۰)۔ کون سے پسندیدہ مولوی ٹی وی پر بٹھائے گئے اس کی روداد ان سے سنئے۔ ''سراج منیر صاحب نے انہیں بتایا ریفرنڈم کے موقع پر اسلام آباد ٹی وی پر وہ مبصر کی حیثیت سے موجود تھے کہنے لگے اچانک ایک فون آیا فون نہیں آیا جیسے بھونچال تھا آپ کی نعتوں کی ڈھنڈھائی مچ گئی۔ مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگ وہاں موجود تھے یہ سن کر کہ ضیاء الحق صاحب نے ٹی وی پر آپ کی نعتیں لگانے کے لئے فون کیا ہے سب کا ردعمل تقریباً ایک جیسا تھا سب کی پیشانیوں پر پڑنے والی لکیریں آپ کے خلاف زہر اگل رہی تھیں'' (صفحہ ۱۱۱) گویا جنرل خداداد کے مشورہ پر مولوی نہیں مظفر وارثی ٹی وی پر بٹھائے گئے تھے۔ جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار۔ اور ان کا دعویٰ ہے کہ ''جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنا ان کی مجبوری ہے'' (صفحہ ۲۲۶)۔ اور یہ بھی ان کا کہنا ہے کہ ''میں نے ضیاء الحق سے اپنا حق مانگا ہے بھیک نہیں مانگی'' (صفحہ ۱۲۳)

احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، منیر نیازی کے بارہ میں تین باب انہوں نے باندھے ہیں۔ معلوم

ہوا کہ یہ شاعران کے سب سے بڑے حاسد اور دشمن ہیں۔ قاسمی صاحب کو تو اس کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں کہ ان کا راستہ روکتے رہیں اور انہیں پرائڈ آف پرمنس ایوارڈ نہ ملنے دیں۔ (صفحہ ۱۱۰) قتیل شفائی کی ''خواہش ہے کہ اب انہیں بڑا شاعر مان لیا جائے'' (صفحہ ۱۱۵) ان کا ایل ڈی اے کا پلاٹ کسی نے کینسل کروادیا تو انہیں مدیر نقوش محمد طفیل نے بتایا کہ ''قتیل صاحب نے کہا مظفر وارثی میرے اس وار سے بچ نکلا اگلے وار سے نہیں بچ سکے گا'' (صفحہ ۱۲۲) منیر نیازی کو تو سوائے انہیں گالیاں نکالنے کے اور کچھ آتا ہی نہیں تھا ''ایسے لگا جیسے آج تک انہوں نے شعر نہیں کہے گالیاں دی ہیں'' (صفحہ ۱۳۱) مرتضیٰ برلاس کینہ پرور ہے (صفحہ ۱۱۷)۔

اپنے شاعرانہ مرتبہ کا انہیں ایسا زعم ہے کہ اس عہد کے مشہور شعرا کی باقاعدہ مثالیں دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ ان کے خوشہ چیں ہیں۔ قاسمی صاحب، احمد فراز، منیر نیازی، محسن بھوپالی، مرتضیٰ برلاس، خالد احمد، امید فاضلی، سلیم کوثر، امجد اسلام امجد۔ اس فہرست میں شامل ہیں (صفحہ ۲۲۳) اور خوشہ چینی کی جو مثالیں دی ہیں وہ ایسی ہیں کہ ان کی سادہ دلی پر ہنسی آتی ہے۔ اپنے بھی کچھ ایسے شعر درج فرمائے ہیں جن کی گونج انہیں دوسروں میں سنائی دیتی ہے۔ ہمیں تو یوں لگتا ہے انہیں اپنے سوا کوئی شاعر شاعر ہی نہیں لگتا! اس باب کا عنوان آپ نے سرقہ توارد استفادہ رکھا ہے۔ یعنی مظفر وارثی ایسا عظیم شاعر ہے کہ اس عہد کے سب شاعران سے مستفیض ہوتے رہے ہیں۔ ہم یہاں تک لکھ پائے تھے کہ ایک صاحب دیوان شاعر دوست کا امریکہ سے فون آیا۔ پوچھا کیا ہورہا ہے ہم نے بتایا کہ ہم مظفر وارثی کی خودنوشت پر لکھ رہے ہیں۔ کہنے لگے یہ کون صاحب ہیں؟ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا!

کتاب کے آخر میں آپ نے اپنے معمولات اور پسند و ناپسند کا ذکر بھی کیا ہے اور ہمعصر شاعروں کا بھی جن کے ساتھ انہیں مشاعرے پڑھنے کے مواقع ملتے رہے۔

غرض مظفر وارثی کی خودنوشت ایک ایسے انانیت بھرے شخص کی خودنوشت ہے جسے اپنے سوا ہر شخص چھوٹا نظر آتا ہے اور وہ خود ایسا قد آور ہے کہ کوئی اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ ٹائیٹل پر سورج مکھی کی تصویر ہے۔ جس کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ چڑھتے سورج کی طرف اپنا رخ رکھتا ہے۔

◎

یادوں کی مالا

''یادوں کی مالا'' محکمہ آبپاشی کے ایک ریٹائرڈ چیف انجینئر رمیض احمد ملک کی خودنوشت ہے جو تخلیقات مزنگ روڈ لاہور والوں کی طرف سے نومبر ۲۰۰۱ میں شائع ہوئی۔ یہ خودنوشت ایک نیک نام اور دیندار افسر کی سرگزشت ہے جس نے آبپاشی جیسے محکمہ میں اپنا وقت نیک نامی سے گذارا۔ مصنف کو دینداری سے شغف ہے اور کتاب کے ایک باب میں آپ نے مجرب وظائف بھی بیان کئے ہیں۔ یہ کتاب ایسی باتوں سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے مفید ہوگی۔

ملک صاحب نے اپنے بعض دوستوں ساتھیوں کا ذکر بھی کیا ہے ان میں ڈاکٹر عبدالسلام جیسا نابغہء روزگار شخص بھی شامل ہے۔ رمیض صاحب نے ڈاکٹر سلام کے ساتھ ایک ملاقات کے حوالہ سے لکھا ہے ''انہوں نے (سلام صاحب) نے بتایا کہ ۱۹۵۹ میں ایک دن لندن میں مقیم ہندوستانی سفیر انہیں ملنے آیا اور کہا پنڈت جواہر لال نہرو کی بڑی خواہش ہے ڈاکٹر صاحب ہندوستان جا کر ان کے ملک میں سائنس کی تعلیم کی ترویج کے لئے کوئی لائحہء عمل تجویز کریں۔ انہوں نے ہندوستان جانے کی حامی بھر لی اور ہندوستانی سفیر کے ساتھ مل کر ہندوستان جانے کا پروگرام وضع کر لیا۔ پروگرام کے مطابق ڈاکٹر صاحب ہندوستان گئے دہلی میں ان کا پرتپاک استقبال کیا گیا نہرو سے رسماً تھوڑی دیر ملاقات ہوئی ڈاکٹر صاحب نے تجویز پیش کی کہ وہ کوئی ٹھوس لائحہء عمل پیش کرنے سے پیشتر ہندوستان کی چیدہ چیدہ یونیورسٹیوں کا معائنہ کرنے اور ان کے وائس چانسلروں سے تبادلہء خیال کرنا چاہیں گے چنانچہ انہیں بنارس، پٹنہ، بمبئی، مدراس، کلکتہ جیسی بڑی یونیورسٹیاں دکھانے کے لئے مسلمان وزیر ہمایوں کبیر نے ایک پروٹوکول افسر ساتھ دیا۔ چار پانچ یونیورسٹیاں دیکھنے کے بعد ڈاکٹر صاحب دہلی آئے۔ ڈاکٹر صاحب قادیانی عقیدہ رکھتے تھے انہوں نے قادیان کی زیارت کی خواہش ظاہر کی اس پر فوراً عمل درآمد کیا گیا۔ ایک چھوٹے ہوائی جہاز میں انہیں امرتسر لایا گیا وہاں پر ڈی سی ایس پی موجود تھے وہ انہیں کار میں قادیان لے گئے اور قادیان کی زیارت کے بعد انہیں دہلی واپس لایا گیا'' (صفحہ

۲۲۴)۔ سلام صاحب کے حوالہ سے جو بات رمیض صاحب نے لکھی ہے وہ درست ہے۔ اس کے بعد حکومت ہندوستان نے ایٹمی پروگرام کے بارہ میں جو پیشکش سلام صاحب کو کی وہ سلام صاحب نے پاکستان کے صدر کو لکھ دی۔ صدر ایوب نے سلام صاحب سے ملاقات کرنے کے بعد انہیں اپنا سائنٹیفک مشیر مقرر کر دیا۔ آگے لکھتے ہیں ''مجھے معلوم نہیں کہ (سلام صاحب نے) پاکستان کی ایٹم بم کی ریسرچ میں کوئی کردار ادا کیا یا نہیں'' ((صفحہ ۲۲۶)۔ یا تو رمیض صاحب تجاہل عارفانہ سے کام لے رہے ہیں یا انہیں واقعی پاکستان میں ایٹمی توانائی کی تاریخ کا علم نہیں۔ پاکستان میں ایٹمی توانائی کے ادارہ کی بنیاد سلام صاحب ہی کی رکھی ہوئی ہے اور اس کی بابت ایٹمی توانائی کمیشن والے بار بار سلام صاحب کی خدمات کا اعتراف کر چکے ہیں۔ ان کی وفات پر جو اعلامیہ کمیشن کی جانب سے جاری ہوا تھا اس میں یہ سب کچھ موجود ہے۔

ایک اور بات جو رمیض صاحب نے لکھی وہ بھی پورے طور پر درست نہیں۔ کہ ''آخری عمر میں ڈاکٹر صاحب کو دماغی اختلاج کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا اور اس کے ایک سال بعد وہ لندن میں راہیء ملک عدم ہوئے'' (صفحہ ۲۲۷)۔ سلام صاحب کو دماغی اختلاج کا عارضہ نہیں تھا ان کا دماغ آخر وقت تک ٹھیک کام کر رہا تھا اعصابی بیماری تھی جس نے ان کے اعضاء کو بے حس اور بے جان بنا دیا تھا۔ اور یہ بیماری کئی سال پر محیط تھی۔

پروفیسر سراج صاحب سلام صاحب کے استاد تھے اور سلام صاحب ہمیشہ ان کا نام بہت ہی احترام سے لیا کرتے تھے رمیض صاحب نے پروفیسر سراج کا ذکر جس طرح کیا ہے سلام صاحب اسے دیکھتے تو ناپسند کرتے۔ وہ اپنے اساتذہ کا انتہائی احترام کرنے والے تھے۔ نوبل پرائز ملنے کے بعد وہ دہلی میں گئے تو وزیر اعظم کی موجودگی میں اپنے پرائمری کے ایک استاد کو جا کر گلے ملے اور انہیں سٹیج پر لا کر اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ نوبل پرائز ملنے کے بعد سلام صاحب سے پاکستان والوں نے جو سلوک روا رکھا اس کے بارہ میں رمیض صاحب کیوں چپ ہیں؟

''یادوں کی مالا'' سیدھے سادہ دیندار آدمی کی سرگزشت ہے۔

ان دیکھی گہرائیاں

''ان دیکھی گہرائیاں'' نیوی کے کیپٹن ہارون ابن علی کی انگریزی خودنوشت کا ترجمہ ہے جو انگریزی میں Uncharted waters کے عنوان سے ایون بکس لندن کی جانب سے ۲۰۰۶ میں شائع ہوئی تھی۔ شاہ محی الحق فاروقی کا ترجمہ بزم تخلیق ادب پاکستان کراچی کی طرف سے شائع ہوا ہے۔

ہارون ابن علی نے پاکستان کے ابتدائی دنوں میں بحریہ میں خدمات سرانجام دیں۔ پھر اقوام متحدہ کی سروس سے وابستہ ہوگئے اور کلیدی افسر کی حیثیت میں قومی اور علاقائی نقل وحمل اور مواصلات کے مسائل حل کرنے میں نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ ۱۹۶۶ سے آرسی ڈی کے بحری نقل وحمل کے محکمہ کے انچارج رہے اس زمانہ میں پاکستان کے مسرت حسین زبیری آرسی ڈی کے سکرٹری جنرل تھے۔ بعد ازاں اقوام متحدہ کے افسر کی حیثیت میں جنوب مشرقی ایشیا اور شرق اوسط کے ممالک کی مواصلاتی اور بحری نقل وحمل کے روابط کی تشکیل میں اہم خدمات انجام دیں۔ چین، جاپان، تھائی لینڈ، اردن، متحدہ عرب امارات، سب جگہ ان کی خدمات کا سلسلہ جاری رہا اور اقوام متحدہ کی ملازمت میں ہونے کے باوجود اپنے پاکستانی ہونے کی پہچان قائم رکھی۔

کتاب کا دیباچہ ایڈمرل حاجی محمد صدیق چوہدری کا لکھا ہوا ہے جو پاکستان کی بحریہ کے پہلے کمانڈر انچیف تھے۔ حاجی محمد صدیق چوہدری کا اسم گرامی مخفف کرکے ایچ ایم ایس چوہدری لکھا جاتا تھا اور ایچ ایم ایس انگریزوں کی نیوی کا امتیازی مخفف تھا یعنی ہز مجسٹیز سروس یا ہر مجسٹیز سروس اور ہر جہاز کا نام لکھنے سے قبل لکھا جاتا تھا ''ایچ ایم ایس فلاں''۔ کہا جاتا ہے کہ جب حاجی صاحب مالٹا تشریف لے گئے تو مالٹا والوں کو اطلاع دی گئی کہ ایچ ایم ایس چوہدری ہوائی جہاز سے تشریف لائیں گے تو ان کے ہوش گم ہوگئے کہ بھلا ایک بحری جہاز ہوائی جہاز سے کیسے آسکتا ہے؟ وہ تو ان کے ورود مسعود سے انہیں معلوم ہوا کہ ایچ ایم ایس کسی جہاز کا نہیں ان کے اپنے اسم گرامی کا مخفف ہے۔ یہ بحری جملہ معترضہ

درمیان میں آن پڑا مگر صرف اس لئے کہ یہ خودنوشت کسی نیوی والے کی پہلی پہلی خودنوشت ہے۔ ہماری فوج اور ہوائی فوج کے بعض افسران کی خودنوشتیں تو آچکی ہیں مگر نیوی والوں کی جانب سے بارش کا پہلا قطرہ ہے۔

ہارون ابن علی صاحب نے اپنی زندگی کے حالات بے کم وکاست دیانت داری سے بیان کر دئے ہیں۔ ان کے والد صاحب سول سروس میں تھے یہ نیوی میں کمشن لے کر نیوی میں گئے مگر ان کی سول سروس کا ورثہ انہیں اقوام متحدہ کی سول سروس میں لے گیا جہاں ان کا وقت بڑی نیک نامی سے گذرا۔

نیوی کے زمانہ کا ایک دلچسپ واقعہ ایک روسی افسر کی مدد کرنے کا ہے اور ایسے وقت میں مدد کرنے کا ہے جب ''یو۔ٹو'' کی امریکی مہربانی سے پشاور کے گرد سرخ نشان خروشچیف صاحب نے لگا رکھا تھا۔ ہوا یوں کہ ایک روسی بحری جہاز اس وقت کہیں ہمارے آس پاس تھا اس کے ایک وی آئی پی افسر کی طبیعت خراب ہوگئی اور اس کی جان کو خطرہ لاحق ہوگیا۔ روس کی حکومت نے پاکستان کی حکومت سے درخواست کی کہ اس روسی وی آئی پی کو طبی امداد کے لئے کراچی کے ہسپتال میں پہنچایا جائے۔ روسی وی آئی پی کو اس کے جہاز سے اپنے ہاں لانے کی ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی۔ آگے ان کی زبانی ''معمول کی احتیاطی تدابیر کے طور پر روسی سفارت خانہ کے ایک افسر کے ہمراہ رہنے کے لئے بھی ایک افسر ہمارے ساتھ چل پڑا۔ یہ آئی ایس آئی کے ایک میجر تھے لیکن یہ سوویٹ افسر کی نگرانی میں بہت محتاط نہیں تھے۔ ایک بار روسی افسر غسل خانے میں جانے کے لئے اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور آئی ایس آئی کے میجر سے کہا ''جناب آپ کی اجازت سے''۔ حقیقت یہ ہے کہ یا تو روسی افسر کو معلوم تھا کہ وہ شخص کون تھا یا اس نے بالکل صحیح اندازہ لگایا کہ اس شخص کا تعلق آئی ایس آئی سے تھا۔ ہم نے اپنے عملے کے ارکان کو سختی سے بتادیا تھا کہ روسی مہمان سے بات چیت میں وہ کیسا رویہ اختیار کریں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ روسی اردو سے اچھی طرح واقف ہو۔ جہاز روانہ ہونے کے دوسرے دن ہی روسی افسر نے جنگ اخبار اٹھا کر پڑھنا شروع کردیا اس کا اردو لہجہ پختہ تھا'' (صفحہ ۱۷۹)

ہارون ابن علی کی یہ کتاب پاکستان نیوی کے ایسے چھوٹے موٹے کارناموں سے بھری پڑی

ہے۔ ۶۵ کی جنگ میں دوارکا پر بحری حملے کا بھی ذکر ہے اور سقوط مشرقی پاکستان کے وقت مشرقی محاذ پر بحریہ کی صورت حال کا بھی۔ صاحبِ کتاب نے بڑی دیانت داری سے سارے واقعات بیان کر دیے ہیں۔ سقوط مشرقی پاکستان سے ذرا قبل یہ مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل ٹکا خاں کے بحری مواصلاتی رابطوں کے مشیر تھے اس سلسلہ کی تمام کارروائیاں بھی معرض بیان میں آئی ہیں۔ اس کے بعد ان کا یو این میں تقرر ہو گیا اور پھر ان کی مساعی کا محور بین الاقوامی نوعیت کا ہو گیا۔

پاکستان کی دو شخصیتوں کا ذکر دو مختلف مقامات پر ہے ایک سر ظفر اللہ کا کہ ''۱۹۴۸ کے خزاں کے سمندری سفر میں جس ڈسٹرائر میں کام کر رہا تھا وہ الجزائر میں رکا جو فرانس کی الجیریائی نو آبادیات کا صدر مقام تھا۔ وہاں لوگوں نے بڑی گرمجوشی سے میرا استقبال کیا ان لوگوں نے پاکستان کے وزیر خارجہ چوہدری محمد ظفر اللہ خاں کا نام بڑے احترام سے لیا انہوں نے اقوام متحدہ میں الجیریا کی آزادی کے معاملے کی بڑی سرگرمی سے حمایت کی تھی'' (صفحہ ۱۰۲) اور ضیاء الحق کا کہ '' شاہ حسین کی حمایت میں جنرل ضیاء الحق نے فلسطینیوں کو اردن میں دبانے کے لئے جو کردار ادا کیا تھا اس کی بنا پر بہت سے فلسطینی جنرل ضیاء الحق سے نفرت کرتے تھے یا سر عرفات ہمیشہ ضیاء الحق کی مذمت کیا کرتے تھے''۔ (صفحہ ۳۰۷)۔

ہارون ابن علی صاحب کی کتاب میں بعض بوالعجبیاں بھی در آئی ہیں '' میں چھٹی کے دوران میں الٰہ آباد سے گھر آیا ہوا تھا مجھے یاد ہے کہ نواب زادہ لیاقت علی خاں نے مجمع کو پاکستان کے معانی سے آگاہ کیا انہوں نے وضاحت کی عربی حروف تہجی کے لحاظ سے ''پ'' پنجاب کی ''الف'' آسام بنگال کا ''کاف''، کشمیر کی ''سین''، سندھ کی اور ''تان'' بلوچستان کی نمائندگی کرتے ہیں'' (صفحہ ۴۰)۔ یہ توجیہہ چوہدری رحمت علی کی توجیح سے بھی مختلف ہے اور اس میں سرحد کا کوئی ذکر اذکار ہی نہیں اسی طرح چوہدری رحمت علی کی پاکستان سکیم میں آسام بنگال کو کوئی ذکر نہیں تھا۔ یہ ساری بات ہوائی بات ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ مسلم لیگ نے پاکستان کی اس توجیہہ کو کبھی قبول نہیں کیا تھا۔ بہتر ہوتا کہ ہارون صاحب اس بات پر تھوڑا سا غور کر لیتے اور تاریخ کا تھوڑا سا مطالعہ کر لیتے۔ اسی طرح کی ایک تاریخی غلطی بھی ان سے ہوئی ہے۔ لکھتے ہیں '' یو پی کے گورنر سر مالکم ہیلی رخصت پر انگلینڈ گئے تو

ان کی جگہ نواب سر احمد سعید خاں چھتاری عارضی گورنر مقرر کئے گئے'' (صفحہ ۳۲)۔ یہ درست ہے کہ نواب چھتاری قائمقام گورنر مقرر کئے گئے تھے مگر وہ گورنر یو پی کے اچانک انتقال کی وجہ سے گورنر مقرر کئے گئے تھے سر مالکم ہیلی نے نواب احمد سعید خاں چھتاری سے گورنری کا چارج لیا تھا۔ نواب احمد سعید خاں چھتاری کی خودنوشت میں اس کا ذکر موجود ہے۔ سر مالکم ہیلی جب انگلینڈ گئے تو خیال تھا کہ نواب چھتاری دوبارہ قائمقام گورنر مقرر کئے جائیں گے مگر ایسا نہ ہوا انگریز چیف سکرٹری کو قائمقام گورنر مقرر کیا گیا۔

بہر طور یہ خودنوشت ایک سیدھے سادہ نیک دل بین الاقوامی سول سرونٹ کی داستان حیات ہے جس میں کوئی تفاخر یا بیجا تعلّی کی بات نہیں۔ جو پاکستان نیوی سے وابستہ کسی فرد کی داستان حیات جاننے کا خواہشمند ہو اس کے لئے یہ ایک مفید مطالعہ کی کتاب ہے۔ ہمارے ہاں صاف اور سیدھی سادہ خودنوشتوں کا توڑا ہے۔

یادوں کی نگری

جناب بدرالدین الحافظ کی خودنوشت ''یادوں کی نگری'' مارچ ۲۰۰۲ میں دہلی سے شائع ہوئی۔ بدرالدین الحافظ عربی زبان و ادب کے استاد ہیں اور اسلامی موضوعات پر کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور ہندوستان کے صدارتی ایوارڈ یافتہ ہیں۔ ان کی یہ خودنوشت سیدھی سادہ زبان میں لکھی ہوئی یادوں کی بازیافت کی کہانی ہے جس میں صرف ان پڑھنے والوں کے لئے دلچسپی کا سامان ہے جو مولانا کو جانتے ہیں یا ان کے خاندان کے بعض علما سے واقف ہیں۔ خاندان کے بزرگوں کا تذکرہ موجود ہے مگر اپنے خاندان میں ہونے والے پیچ در پیچ رشتوں اور رشتہ داریوں کی تفصیل میں طول بیانی سے کام لیا گیا ہے۔ خود مصنف کی زندگی کے حالات و واقعات ان تفصیلات کی دھول میں چھپ گئے ہیں۔ ان کی طبیعت تو اس بات سے ظاہر ہے کہ جب انہیں معلوم ہوتا ہے کہ دو طالبات بھی ان کی ہم درس ہونگی تو فرماتے ہیں ''تب تو ایمان خطرہ میں ہے'' (صفحہ ۱۵۹) اس ایک گھونٹ سے سارے پانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

مولانا نے اپنے خاندانی حالات کے بیان میں بڑی صاف گوئی سے کام لیا ہے اور ان افراد خانہ کو بھی جو ہاتھ سے کام کر کے حلال روزی کماتے رہے اپنی یادوں میں معرض بیان میں رکھا ہے کسی احساس کمتری کے تحت ان کے ذکر سے اعراض نہیں کیا۔ وہ جوان کے رفیق کار ظفر احمد صدیقی صاحب نے ان کے بارہ میں لکھا ہے کہ ان کی خودنوشت آپ بیتی کے معیار پر پورا اترتی ہے اس حد تک تو صحیح ہے کہ یہ آپ بیتی ہے اور اس میں حافظ صاحب نے اپنے حالات بیان کئے ہیں مگر جس معیار پر صدیقی صاحب نے اس آپ بیتی کو پرکھا ہے وہ معیار ان کا اپنا خود ساختہ ہے۔ اے کاش جناب بدرالدین الحافظ صاحب آپ بیتی لکھنے سے قبل کچھ دوسری آپ بیتیاں ملاحظہ فرما لیتے۔

◎

چھتیس سال

پولیس کے ایک ریٹائرڈ آئی جی جناب ایم ایم حسن کی خودنوشت ''چھتیس سال'' انجمن علم و دانش کراچی کی طرف سے فروری ۱۹۹۳ میں پہلی بار شائع ہوئی۔ حسن صاحب علی گڑھ یونیورسٹی کے ایم اے تھے اور اپنی ریسرچ کا کام مکمل کر کے ہجرت کر کے کراچی آ گئے۔ ماشاء اللہ بھرا پرا خاندان تھا گیارہ بہن بھائی تھے اس وقت والد صاحب ریٹائر ہو چکے تھے اور جلد ہی فوت ہو گئے ملازمت کے لئے سفارشیں ڈھونڈتے پھرے سکرٹری خارجہ سے ملے تو انہوں نے خوب جھاڑا کہ سفارشوں کے پیچھے کیوں پڑے ہو؟ ملازمت تو مقابلے کے امتحان میں بیٹھنے سے ملتی ہے۔ یہ تیر چل گیا آپ نے مقابلہ کا امتحان دینے کا مصمم ارادہ کر لیا اور اللہ کے فضل سے پولیس سروس میں چن لئے گئے۔ ان کی والدہ نہایت دیندار خاتون تھیں۔ ہجرت سے قبل ان کے ایک بھائی پولیس میں چن لئے گئے تو والدہ نے منع کر دیا اور کہا کہ وہ ہمیشہ یہ دعا کرتی رہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی اولاد کو پولیس کی سروس سے بچائے۔ اب ان کا پولیس سروس میں چناؤ ہوا تو والدہ نے بخوشی اجازت دے دی اور فرمایا کہ ''اب آزادی کے بعد حالات بدل چکے ہیں۔ یہ اسلامی حکومت ہے اور اپنا ملک ہے اس کا ہر محکمہ مثالی ہونا چاہئے مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات سے قوی امید ہے کہ میری محنت اور تربیت رائیگاں نہیں جائے گی'' (صفحہ ۱۰)۔ چنانچہ آپ پولیس ٹریننگ کے لئے ساردا روانہ ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے نیک نام رہے اور چھتیس برس سروس میں گذار کر وظیفہ یاب ہوئے۔

ان کی خودنوشت کا وہ حصہ جو علی گڑھ سے متعلق ہے بہت دلچسپ ہے۔ ملازمت کے سلسلہ میں یہ مشرقی پاکستان میں رہے اس لئے مشرقی پاکستان کے حالات و واقعات پر ان کی رائے بڑی وقعت رکھتی ہے۔ اتفاق یوں ہے کہ مغربی پاکستان میں متعین ہونے کے بعد عین اس وقت جب سقوط مشرقی پاکستان کا سانحہ ہونے والا تھا انہیں دوبارہ مشرقی پاکستان میں تعینات کیا گیا اور آپ بھی

دیگر سول افسروں کے ہمراہ بھارت میں جنگی قیدی کے طور پر رہنے کے بعد واپس آئے۔ چونکہ یہ ڈی آئی جی سپیشل برانچ تھے اس لئے خیال تھا کہیں یہ بھی ان لوگوں میں شامل نہ ہوں جن پر مقدمہ چلانے کی دھمکیاں دی جا رہی تھیں۔ مگر ایسا نہ ہوا اور انہیں بریلی کے کیمپ میں بھیج دیا گیا جہاں کے دلچسپ اور روح فرسا واقعات انہوں نے بڑے صاف اور سادے انداز میں بیان کردئے ہیں۔

ٹریننگ کے بعد ان کا تقرر کومیلا میں ہوا۔ وہاں ''مغربی پاکستان سے کچھ شعراء اور ادیب آئے ہوئے تھے جن میں قرۃ العین حیدر بھی شامل تھیں۔۔۔ وہ ایک دن سب مہمانوں کو ہمارے ہاں لے آئے جہاں بریگیڈیئر شیریں خاں اور ان کی بیگم بھی مدعو تھے اتفاق سے قرۃ العین کو بیگم شیریں خان کے پہلو میں جگہ ملی۔ بیگم احسان نے دونوں کا تعارف کروایا۔ بیگم شیریں خاں بولیں اچھا آپ قرۃ العین رائٹر ہیں مگر میں نے تو آپ کا کوئی مضمون کبھی شمع میں نہیں پڑھا۔۔۔ بیچاری قرۃ العین نے سر پیٹ لیا'' (صفحہ ۸۰) حسن صاحب کو یہ تاریخی بات یاد رہ گئی قرۃ العین حیدر نے اپنی خودنوشت میں بھی یہی واقعہ لکھا ہے ''کومیلا چھاؤنی کے میس کے ڈنر میں ایک پنجابی بریگیڈیئر کی بیگم نے مجھ سے اور جمیلہ ہاشمی سے دریافت کیا کیا آپ بھی رائٹر ہیں؟

''جی ہاں ایسے ہی کچھ لکھ وکھ لیتے ہیں'' میں نے عرض کیا۔

''لیکن میں نے تو شمع اور بیسوی صدی میں آپ کے نام کبھی نہیں دیکھے''۔ اس مکالمہ سے واضح ہوا کہ ہندوستان کے یہ دو عوامی رسالے پاکستان کے ''غیر انٹیلیکچوئل'' طبقے میں کس قدر مقبول تھے'' (کارِ جہاں دراز ہے۔ صفحہ ۶۸۴)

ہمیں تو ان کی خودنوشت میں مشہور عربی سکالر پروفیسر عبدالعزیز میمن کا ذکر پڑھ کر بہت لطف آیا۔ پروفیسر میمن کے بارہ میں ان کی معلومات سنی سنائی نہیں ''۱۹۴۴ میں بی اے کا امتحان پاس کرلیا اور پھر عربی میں ایم اے کرنے کا قصد کیا۔ پروفیسر عبدالعزیز میمن کی بدولت علی گڑھ کے شعبہ عربی کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ میمن صاحب نہایت ہی لائق استاد تھے ان کی لیاقت اور علم وفضل کے عرب ممالک بھی قائل تھے۔ انہوں نے متعدد تصانیف کا عربی زبان میں اضافہ کیا ہے۔ ان کا ذاتی کتب خانہ قابل دید تھا جس میں کثیر تعداد میں نادر قلمی نسخے بھی شامل تھے میمن صاحب کا بلا کا حافظہ تھا جو کتاب ایک

مرتبہ ان کی نظر سے گذر جاتی انہیں حفظ ہو جاتی۔ لاکھوں عربی اشعار ان کے حافظے میں محفوظ تھے وہ بغیر کتاب دیکھے ہوئے پڑھاتے تھے ہم قصیدے کا مطلع پڑھ دیتے اور پھر وہ پورا قصیدہ فرفر سنا دیتے۔ انہیں مستشرقین سے سخت نفرت تھی اور انہیں ''نچاچر'' کہتے تھے (یعنی خچروں کی جمع)۔ مگر اس زمانہ کے تمام مستشرقین ان کی لیاقت سے بے حد مرعوب تھے اور انہیں عجوبہء روزگار تصور کرتے تھے۔ اگر علی گڑھ کے کسی استاد یا طالب علم کو یورپ جانے کا اتفاق ہوتا تو وہاں کے مستشرقین میمن صاحب کے متعلق ضرور یہ سوالات کرتے کہ ان کا سر کتنا بڑا ہے اور وہ مطالعہ میں کتنا وقت روزانہ صرف کرتے ہیں۔ ان سب کو موصوف کے حافظے نے حیرت میں ڈال دیا تھا جب یہ گفتگو میمن صاحب کے سامنے دھرائی جاتی تو وہ کافی محظوظ ہوتے۔

میمن صاحب نے کسی مدرسے یا سکول میں باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی اور نہ کوئی خاص ان کا استاد تھا۔ ان کی لیاقت ان کی ذاتی کاوشوں اور محنت کا نتیجہ تھی۔ یہی چیز کافی عرصہ ان کی ترقی میں حائل رہی۔ یونیورسٹی کے آئین میں ایک شق یہ تھی کہ جب تک کسی استاد کے پاس بیرون ملک کسی یونیورسٹی کی سند نہ ہو اسے پروفیسر کے عہدے پر فائز نہیں کیا جاسکتا۔ آخر کار میمن صاحب کے لئے اس پابندی کو ختم کرنا پڑا۔ موصوف نے نہایت سادہ طبیعت پائی تھی اور ان کے مزاج میں کسی قسم کا تصنع یا بناوٹ کا مطلق شائبہ نہ تھا۔ وہ خود سائیکل پر سوار ہو کر بازار جاتے اور روزمرہ کی جنس ترکاری وغیرہ خرید کرلاتے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کچھ سامان ان کی سائیکل کے پیچھے بندھا ہوتا اور دو تین جنس سے پر تھیلے آگے ہینڈل پر لٹکے ہوتے۔ وہ اکثر ذکر کیا کرتے تھے کہ جب میری ترقی کا معاملہ زیر غور آتا ہے تو یہ اعتراض اٹھایا جاتا ہے کہ میمن بازار سے سائیکل پر جا کر خرید وفروخت کرتا ہے۔ مجھے جب یہ علم ہوتا ہے تو میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوتا ہے اور میں فخر محسوس کرتا ہوں کیونکہ یہی اعتراض ہمارے رسول صلی اللہ علی وسلم پر بھی ہوتا تھا کہ یہ کیسا نبی ہے کہ بازار کے گلی کوچوں میں پھرتا ہے'' (صفحہ ۲۸)۔ میمن صاحب کا ذکر خیر مجھے پہلی بار کسی خودنوشت میں نظر آیا تو میں نے وہ حوالہ درج کر دیا۔ ایک بار میمن صاحب پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں تشریف لائے تھے۔ استاذی ڈاکٹر سید عبداللہ نے کہا تھا ''بچو علامہ میمن کو دیکھ لو۔ فخر کیا کروگے کہ ہم نے علامہ میمن کو دیکھا ہوا ہے۔'' خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ

پنہاں ہوگئیں۔ علامہ میمن کا تو نہیں ڈاکٹر مولوی محمد شفیع صاحب کا ذکر اپسالا یونیورسٹی کے ایک سیمینار میں ہوا۔ جب ہم نے لوگوں کو بتایا کہ ہم نے ڈاکٹر محمد شفیع کو دیکھا ہوا ہے اور ان سے ہم کلام ہونے کا شرف بھی رکھتے ہیں تو لوگوں نے بڑے احترام سے ہمارے ساتھ مصافحہ کیا کہ ہم نے ڈاکٹر شفیع جیسے محقق کو دیکھا ہوا ہے۔

ان کے قبلہ والد صاحب ریاست مالیر کوٹلہ میں وزیر قانون بن کر گئے تو یہ بھی ان کے ہمراہ رہے۔'' یہاں کی خاص چیز نواب صاحب کی ذات تھی موصوف موت سے بہت خائف تھے اس لئے محل سرا کی چھت بھی لکڑی کی بنوائی تھی کہ اتفاقاً گر پڑے تو موت واقع نہ ہو۔ محل میں سورۃ یٰسین بھی پڑھنے کی اجازت نہ تھی کیونکہ عام طور سے نزع کے وقت اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ بالآخر ان کا بھی وہی انجام ہوا جو سب کا ایک دن ہونا ہے''۔ (صفحہ ۲۹)

حسن صاحب رنگون گئے تو بہادر شاہ ظفر کی قبر تلاش نہ کر سکے'' برما کی پولیس کی کارکردگی کا اندازہ آپ اس حقیقت سے لگا سکتے ہیں کہ وہ لوگ انتہائی کوشش کے باوجود بہادر شاہ کے مزار کا کھوج نہ لگا سکے اور ہم اپنی حسرت دل میں لئے رنگون سے رخصت ہوئے'' (صفحہ ۶۹) مگر کچھ روز قبل ہی ہم نے نیوی کے ایک افسر کی خودنوشت '' ان دیکھی گہرائیاں'' پڑھی ہے۔ جس میں وہ بہادر شاہ ظفر کے مزار پر کھڑے ہیں اور ایک تصویر میں بہادر شاہ ظفر کے مزار پر پھولوں کی چادر چڑھا رہے ہیں۔ شاید اس لئے ہارون ابن علی کے لئے رنگون والوں نے زیادہ مستعدی دکھائی کہ وہ خیر سگالی کے مشن پر تھے اور اقوام متحدہ کے نمائندگی کر رہے تھے۔ بہادر شاہ کی لوح مزار پر چاند تارا بھی بنا ہوا ہے۔ یا شاید حسن صاحب جس وقت رنگون تشریف لے گئے اس وقت تک واقعی یہ مزار گوشہء گمنامی میں ہو! واللہ اعلم بالصواب۔

اس خودنوشت نے ہمیں اپنے ایک پرانے شاگرد کی یاد دلا دی۔ لکھا ہے'' زمینداروں میں قابل ذکر ہستی خرم خاں پنی کی تھی جو کروٹوا کے بڑے زمیندار تھے ان کا تعلق نواب ڈھاکہ کے خاندان سے تھا ان کے گھر اردو بولی جاتی تھی'' (صفحہ ۱۷) ہم (۱۹۵۸ـ۱۹۶۰) میں ایچیسن کالج میں پڑھاتے تھے تو ہماری شام کی اردو کلاس میں ایک بنگالی لڑکا اردو پڑھتا تھا اس کا نام تھا واجد علی پنی۔ اس کے

ابا خرم خاں پنی اس زمانہ میں کسی ملک میں پاکستان کے سفیر تھے۔ حسن صاحب نے خرم خاں پنی کا ذکر کیا ہے تو ہمارے سامنے وہ نفیس اور مہذب لڑکا آ گیا جس کی اردو کمزور تھی اور اس کے والدین نے سکول والوں کو خاص طور سے ہدایت کر رکھی تھی کہ واجد کو اردو کے کسی مناسب استاد کے سپرد کیا جائے تا کہ اس کی اردو درست ہو جائے۔ اب تو خدا معلوم واجد علی پنی کہاں ہے اور کس حال میں ہے مگر یہ جان کر ہمیں خوشی ہوئی کہ اس کے امی ابا نواب ڈھاکہ کے خاندان سے تھے اور اردو ان کے گھر کی زبان تھی۔

پولیس کے نک چڑھے آئی جی میاں بشیر احمد اور بابائے اردو کی ایک جھڑپ قابلِ ذکر ہے'' ایک بار طالب علموں کا جھگڑا ہو گیا اور پولیس نے اردو کالج کے کچھ طلبا کو گرفتار کر کے حوالات میں ڈال دیا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق اپنے شاگردوں کے لئے توشے دان میں کھانا لے کر تشریف لائے۔ اتفاق سے میاں بشیر بھی وہاں موجود تھے انہیں بابائے اردو کی اس حرکت پر بڑا غصہ آیا انہوں نے مولوی صاحب سے سوال کیا'' یہ تمہارے کون لگتے ہیں؟'' مولوی صاحب کہاں دبنے والے تھے انہوں نے نہایت انکساری کے ساتھ عرض کیا'' یہ میرے باپ لگتے ہیں'' میاں صاحب دم بخود رہ گئے'' (صفحہ ۱۰۷)

ایف ایس ایف میں انہیں مسعود محمود کھینچ کر لے گئے اور ان کو ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل کا عہدہ دیا۔ ایف ایس ایف کے کارنامے کسی سے پوشیدہ نہیں رہے۔ مسعود محمود نے تو جو کرنا تھا کر گذرے اور کیفر کردار کو پہنچے ان کے ساتھ کیا ہوا اس کی روداد ان سے سنئے۔ یہ مسعود محمود کی غیر حاضری میں ڈی۔جی کا کام کر رہے تھے۔'' ایک رات ڈیڑھ بجے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ وزیر اعظم کے اے ڈی سی نے مطلع کیا کہ وزیر اعظم بات کریں گے۔۔۔ وزیر اعظم نے فرمایا'' حسن! یہ نورانی بڑی بدتمیزی کر رہا ہے۔ کبھی مجھے گالیاں دیتا ہے، کبھی میرے بیوی بچوں کو برا بھلا کہتا ہے میں چاہتا ہوں کہ تم اسے ٹھیک کر دو'' میں ابھی پوری طرح سے بیدار بھی نہ ہوا تھا مگر قبل اس کے کہ میں کوئی جواب دوں وزیر اعظم نے ٹیلیفون رکھ دیا''۔۔۔'' میں اگلے روز اسمبلی ہال پہنچا۔۔۔ بھٹو صاحب نے انتہائی مصروفیت کے باوجود مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور زیر مطالعہ فائل چھوڑ کر پیچھے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انگریزی میں گویا ہوئے'' میں نورانی کو مروانا نہیں چاہتا مگر یہ ضرور میری خواہش ہے کہ اس کی دو

چار ہڈیاں توڑ دی جائیں تاکہ وہ سبق سیکھ جائے'' میں نے بڑی ہمت کر کے عرض کیا یہ ''بات نامناسب ہے''۔ وہ بگڑ پڑے اور بولے ''تم کیا سمجھتے ہو یہ فورس میں نے کس لئے بنائی ہے کیوں اس پر اتنا روپیہ ضائع کر رہا ہوں''؟ (صفحہ ۱۹۰)

''ایک روز وزیراعظم کی طرف سے دس ہزار روپے وصول ہوئے ہدایت کی گئی تھی کہ یہ رقم ڈپٹی ڈائریکٹر غلام حسین بٹ کو بطور انعام دی جائے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایف ایس ایف میں میری آمد سے قبل بٹ نے یہ کارنامہ سرانجام دیا تھا کہ بھٹو صاحب کے احکامات پر پیپلز پارٹی کے ایک بانی جناب جے اے رحیم کی مرمت کی تھی'' (صفحہ ۱۹۱)۔

غرض ایم ایم حسن صاحب کی یہ خودنوشت بڑی معلومات افزا اور دیدۂ عبرت نگاہ رکھنے والوں کے لئے عبرت آمیز وآموز ہے۔ حسن صاحب کی زبان صاف ستھری ہے اور کہیں کہیں مزاح کے چھینٹے بھی مل جاتے ہیں۔ پی او ڈبلیو کیمپ میں تھے۔ ''مغرب کے فوراً بعد ہی کھانا آجاتا اور وہی گزشتہ سے پیوستہ ہوتا یعنی دوپہر کی بچی ہوئی چنے کی دال'' (صفحہ ۱۵۳)۔

حسن صاحب عربی کے عالم ہیں مگر جہاں جہاں عربی کے اشعار کا حوالہ دیا ہے شعر غلط لکھے ہیں یہ تو عین ممکن ہے کاتب کی کارستانی ہو مگر انہیں کتاب کی نوک پلک کا خیال رکھنا چاہئے تھا۔ ہمارے کاتب اردو شعروں کا ستیاناس کر دیتے ہیں یہ تو عربی کے شعروں کا معاملہ تھا۔

خودنوشت پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ ان کی والدہ کی کی ہوئی دعائیں رائیگاں نہیں گئیں۔ اس قسم کے افسر ہمارے ہاں ناپید ہیں۔ حکیم محمد سعید صاحب نے ان کی کتاب پر جو تبصرہ فرمایا تھا وہ باون تولے پاؤ رتی کا ہے۔ ''میں نے آپ بیتیاں بہت سی پڑھی ہیں مگر ایم ایم حسن کی آپ بیتی ایک نہایت دلچسپ تاریخ بھی ہے۔ پاکستان کے نظم ونسق میں جن لوگوں کا دخل رہا ان بڑوں کی دلچسپ داستانیں بھی اس میں سموئی ہوئی ہیں۔ انداز بیان سیدھا سادہ تصنع سے ماوراء، کذب سے مبرا، صدق سے آراستہ۔ ایسی اچھی داستان لکھنے پر ایم ایم حسن سزاوار تحسین ہیں اور مستحق آفریں''۔ ہم بھی حکیم صاحب مرحوم کی باتوں کی تصدیق کرتے ہیں۔

◎

دیدہ وشنیدہ

دیدہ وشنیدہ جناب سید شہاب الدین دسنوی کی خودنوشت ہے جو جون ۱۹۹۳ میں مکتبہ جامعہ نئی دہلی سے شائع ہوئی۔ سید شہاب الدین انجمن الاصلاح بمبئی کے صدر اور صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ کے پرنسپل رہے۔ تقسیم ملک کے بعد مسلمانوں کی اور اردو کی خدمت کرتے رہے۔ ان کی پیدائش قصبہ دسنہ میں ہوئی اور یہ قصبہ اس لئے بھی مشہور ہے کہ سید سلیمان ندوی بھی اسی کی خاک سے اٹھے۔ دسنہ کے حالات میں خاص طور سے مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کا ذکر خیر ہے اور اس چھوٹے سے قصبہ کی اہم لائبریری کا بھی جس میں بہت مفید کتابیں جمع کی گئی تھیں بالآخر وہ کتابیں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب گورنر بہار کی تحریک پر خدابخش اورینٹل لائبریری پٹنہ کا حصہ بنا دی گئیں۔

سید سلیمان ندوی دسنہ میں ہوتے تو نوجوانوں کے کبڈی میچوں میں ریفری بنتے۔ کوئی صاحب پکڑے جاتے تو فرماتے جناب آپ انتقال فرما گئے ہیں۔ بچ کر نکل آتے تو ارشاد ہوتا آپ ابھی بقید حیات ہیں۔ ان کی وضع داری کا عالم یہ تھا کہ گھر سے چار قدم بھی باہر جانا ہو تو شیروانی اور ٹوپی اوڑھ کر نکلتے (صفحہ ۱۰)۔ مسجد میں اجتماعی افطاری کا انتظام تھا مگر اس میں بیٹھنے میں اشراف غیر اشراف کو علیحدہ علیحدہ بٹھایا جاتا (صفحہ ۱۵) تھا۔

مونگیر شہر میں گئے تو وہاں انگریزوں کے قبرستان سے گذرتے ہوئے ایک عورت کی قبر پر کتبہ دیکھا لکھا تھا Hush she sleeps. غرض اس طرح کی چھوٹی چھوٹی باتیں اس کتاب میں موجود ہیں۔ بمبئی کے مسلمانوں کی حالت کا تذکرہ ہے محمد علی جناح صاحب سے بھی ایک ملاقات کا بیان ہے۔ کچھ امریکہ آسٹریلیا کے سفر کی روداد ہے کچھ سفر حج کا مختصر تذکرہ۔ غرض دسنوی صاحب کی سو سوا سو صفحے کی خودنوشت ان کی ذات اور ان کے احباب اور ہندوستان کے مسلمانوں کے بارہ میں مفید معلومات بیان کرتی ہے۔

◎

تمنا بیتاب

ڈاکٹر رشید امجد کی خودنوشت تمنا بیتاب کے عنوان سے ۲۰۰۱ میں حرف اکادمی راولپنڈی کی جانب سے پہلی بار شائع ہوئی۔ میرے پیش نظر جو ایڈیشن ہے وہ دوسرا اور ۲۰۰۳ والا ایڈیشن ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں اس لئے ان کی خودنوشت میں بھی کہیں کہیں یہ احساس ابھرتا ہے کہ ان کے اندر کا افسانہ نگار اس خودنوشت کے اسلوب پر بھی حاوی ہو جاتا ہے۔ مثلاً اس خودنوشت کا ابتدائیہ بھی کسی افسانہ کا ٹکڑا لگتا ہے ''مارچ میں سرینگر کے پھرنوں میں گرماہٹ بکھیرتی کانگڑیاں ٹھنڈی پڑنے لگتی ہیں شہر برف کی کینچلی اتار کر نیم گرم سانسیں لیتا ہے بادام کے درختوں پر سفید بور آ جاتا ہے اور شہر کا شہر بادام وری کے سفید سفید منظر سے لطف اٹھانے کے لئے طرح طرح کے پکوانوں کے ساتھ باغوں میں امڈ آتا ہے'' (صفحہ ۹)۔ پیدائش کشمیر کی ہے مگر اوائل عمر میں اپنے ماں باپ کے ساتھ راولپنڈی آ گئے اور پھر حالات نے واپس جانے کے تمام راستے مسدود کر دیے۔ راولپنڈی ان کا وطن ثانی بن گیا۔ والد نقشی قالینوں کے ڈیزائینر تھے اپنے مرکز سے اکھڑے تو پھر انہیں مالی یا ذہنی آسودگی نصیب نہ ہوئی۔ واں سے نکل کے پھر نہ فراغت ہوئی نصیب۔ آسودگی کی جان تری انجمن میں تھی۔

رشید امجد کا بچپن مہاجر بچوں کی طرح مالی ناآسودگی میں گذرا۔ اپنی بچپن کی عادتیں علتیں پوری کرنے کے لئے چوری چکاری سے بھی باز نہ رہے اور ماں کو دکھی کرتے رہے مگر ماں نے انہیں جھڑکا گھرکا تو ضرور ان پر ایسی پابندیاں عائد نہ کیں کہ ان کی شخصیت کچلی جاتی۔ باپ سے عملاً علیحدگی رہی مگر ماں سے بھاگ کر باپ کے پاس ہی سہارا لینے کو پہنچتے رہے مظفر آباد ہو یا لاہور باپ انہیں دو چار روز اپنے پاس رکھ کر واپس ماں کو لوٹا دیتے رہے۔ تعلیم اسی طرح بے قاعدگی سے ہوئی۔ ملازمتیں کرتے اور ساتھ ساتھ تعلیم کا شوق پورا کرتے رہے۔ نیک اور دیندار ماں کا کہا ان کی رہنمائی کرتا رہا کہ میرا بیٹا اعلیٰ ترین تعلیم حاصل کرے گا چنانچہ ماں کی وفات کے پندرہ برس بعد پی ایچ ڈی کی ڈگری

بھی لے لی۔

راولپنڈی میں ان کا زیادہ وقت ادیب دوستوں ساتھیوں میں گذرا۔ غلام رسول طارق جیسے اچھے ہمدرد لوگ مل گئے جنھوں نے انہیں افسانہ نگاری کے راستہ پر ڈال دیا اور یہ چل نکلے۔ ادب کے شوق نے ان کا دامن نہیں چھوڑا۔ چنانچہ راولپنڈی اسلام آباد کے ادبی حلقوں سے ان کی وابستگی رہی۔ ''رابطہ'' کے کرتا دھرتا تھے ''دائرہ'' سے بھی نہ نکل سکے۔ حلقہ ارباب ذوق سے بھی منسلک رہے غرض فیڈرل ایریا کی ہر ادبی سرگرمی میں ان کا وجود محسوس ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ سرکاری تنظیمیں اکادمی ادبیات یا مقتدرہ قومی زبان قائم ہوئیں تو ان سے بھی یہ غافل نہیں رہے۔ ان سرکاری تنظیموں کے صدور کے بارہ میں تو رشید امجد یوں باتیں کرتے ہیں گویا یہ سب ان کے گھر کے لوگ ہیں۔ مگر ''ان کے مزاج میں تیزی سے بڑھنا بھی ہے اور اسی تیزی سے ہٹنا بھی ہے'' (صفحہ ۱۶۹) اسلئے ان کے اختلاف بھی جلد ہی سامنے آ جاتے رہے۔ اور لوگوں کے بارہ میں ان کی رائے بھی بدل جاتی رہی۔ شفیق الرحمن کی بابت ان کا ارشاد کہ ''وہ بنیادی طور پر جرنیل اور مردم بیزار شخص ہیں'' (صفحہ ۲۶۷) اس بات کی چغلی کھاتا ہے کہ شفیق الرحمن ان پر مہربان نہیں رہے۔

''اوراق'' کے حلقہ ادبا میں شامل رہے مگر احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا کے دوست نما دشمنوں کی سرگرمیوں سے انہیں آگاہی رہی۔ بڈابیر کے ایرفورس کے مشاعرہ میں میں بھی حاضر تھا۔ قاسمی صاحب ضرور تھے مگر وزیر آغا موجود نہیں تھے ہم سب ایئر مارشل ظفر چوہدری کے مہمان تھے۔ رشید قیصرانی اس مشاعرہ کا میزبان تھا آگے جو کچھ رشید امجد نے لکھا ہے وہ سنی سنائی بات ہے۔ لکھتے ہیں ''دونوں میں صلح کروائی گئی۔ رشید قیصرانی نے دونوں کا شکریہ ادا کیا اور کہا اب دونوں طرف سے کوئی بھی شخصی یا اختلافی کالم یا مضمون نہیں لکھے گا۔ دوسرے یہ کہ احمد ندیم قاسمی اوراق کے لئے اور وزیر آغا فنون کے لئے اپنی تخلیقات بھیجیں گے۔ اس پر احمد فراز بول اٹھے اوراق کے لئے تو قاسمی صاحب اپنی نظم بھیج دینگے لیکن فنون کے لئے وزیر آغا کی تخلیق لے کر فنون کا معیار نہیں گرایا جا سکتا'' (صفحہ ۱۶۴)۔

احمد فراز سے بعید نہیں کہ وہ ایسی بات کہہ دیں مگر بڈابیر کے مشاعرہ کی حد تک یہ بات درست نہیں یہ بات فراز نے کسی اور جگہ کہی ہوگی۔

ان کے ہاں باتوں کی تکرار بھی ہے بعض باتیں ایک سے زیادہ مرتبہ لکھی ہیں۔ مثلاً ''شہاب نے گلڈ کے ذریعہ ادیبوں کو اور لطاف گوہر نے لفافوں کے ذریعہ صحافیوں کو طرح طرح کی مراعات کا عادی بنانا شروع کر دیا'' (صفحہ ۷۶) یہی بات صفحہ ۱۷۸ پر بھی بعینہ موجود ہے۔ اس کا مطلب یہ کہ انہوں نے خودنوشت کے ابواب پر نظر ثانی نہیں کی۔

پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ ان دونوں کے بارہ میں ان کے سیاسی تجزیے محض مبتدیانہ ہیں کیونکہ یہ ان کا میدان نہیں، بہتر ہوتا کہ یہ اپنی خودنوشت کو ان تجزیوں سے معرا رکھتے۔ البتہ نواز شریف کے بارہ میں جو بات انہوں نے عبدالقادر حسن کے حوالہ سے لکھ دی ہے وہ بڑی پتے کی بات ہے ''جنرل جیلانی جس زمانہ میں پنجاب کے گورنر تھے نواز شریف وزیر خزانہ تھے ایک دن گورنر ہاؤس کی ایک تقریب کا بلاوا آیا لوگ پہنچے تو دربار ہال میں نواز شریف جھینپے جھینپے سے ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ اتنے میں جنرل جیلانی اندر آ گئے انہوں نے اعلان کیا کہ نواز شریف کو وزیر اعلیٰ بنایا جا رہا ہے۔ لوگ نواز شریف کے گرد اکٹھے ہو گئے اور مبارک باد دینے لگے۔ پگڑیاں باندھے ویٹر مشروبات پیش کرنے لگے۔ جنرل جیلانی کے دل میں خدا جانے کیا آیا انہوں نے ایک ویٹر کے سر سے پگڑی اتار کر نواز شریف کے سر پر رکھ دی اور ہنسنے لگے۔ نواز شریف کی حالت عجب تھی اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے'' (صفحہ ۳۴۰)۔

ضیاء الحق کی مجلس شوریٰ کو لوگ ''ابلیس کی مجلس شوریٰ کہتے تھے'' (صفحہ ۳۳۵) اور اہل قلم کانفرنس کو ''ادیبوں کا میلہ مویشیاں'' (صفحہ ۲۶۸) مگر اس کے باوجود رشید امجد اس میں شریک ہوتے رہے۔

فخر زمان نے پیپلز پارٹی کے زمانہ میں جو بین الاقوامی کانفرنس بلائی اس میں ان کا بیان ایک جوڑے کے بارہ میں یہ ہے وہ ادب سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتے تھے اسے سفیر صاحب نے محض اپنی دوستی کے ناطے کانفرنس میں مندوب بنا کر بھجوا دیا تھا۔ سویڈن کی حد تک ہم بھی ایک ایسے ہی حادثہ کے گواہ ہیں۔ سویڈش رائٹرز یونین کے دو ہی پاکستانی رکن تھے ایک ہم اور ایک سائیں سچا جو یورپ کے نمایاں افسانہ نگار ہیں۔ یونین کے صدر نے ہمیں اس وفد میں شامل کرنا چاہا ہم نے عذر کر دیا۔ سائیں سچا راضی ہو گئے ان کے کاغذات بھی تیار ہو گئے۔ ایک روز اچانک معلوم ہوا کہ فخر زمان کے ایک پاکستانی

دوست جن کے ہاں وہ سویڈن میں قیام فرمایا کرتے تھے سویڈن کے پاکستانی ادیبوں کی نمائندگی میں پاکستان پہنچ گئے ہیں اور سائیں سچا کا نام اس فہرست سے ہٹا لیا گیا ہے۔ جب سویڈش ادیبوں کا وفد واپس آیا تو اتفاق سے سالانہ کانفرنس کا وقت تھا۔ ہم نے صدر صاحب سے پوچھا کہ سائیں سچا کو پاکستان جانے سے کیوں روکا گیا تھا تو انہوں نے فخر زمان صاحب کی فیکس پڑھ دی جس میں لکھا تھا کہ کسی پاکستانی ادیب کو لانے کی ضرورت نہیں صرف سویڈش ادیب ہی آئیں۔ ہم نے کہا خوب مگر جو پاکستانی صاحب گئے تھے وہ کہاں کے ادیب ہیں؟ صدر صاحب نے کہا اکادمی آف لیٹرز والوں نے انہیں سویڈش وفد میں شامل کر دیا تو ہم کیسے انکار کر دیتے؟ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

محترم رشید امجد ہمارے ہم عصر ہیں اس لئے ان کی خودنوشت میں موجود بیشتر ادباء و شعرا کو ہم ذاتی طور پر جانتے ہیں۔ وقار بن الٰہی۔ محمد منشاء یاد، احسان اکبر، اکبر حمیدی یہ سب لوگ ہمارے جانے پہچانے ہیں اور جن بزرگوں کا ذکر ہے ان سے ہمیں بھی شرف نیاز مندی حاصل رہا۔ وزیر آغا، قاسمی صاحب، ممتاز مفتی، ضمیر جعفری۔ ہمیں توقع تھی کہ وہ ان بزرگوں کے بارے میں اپنی ذاتی وابستگی کے حوالے سے بہت کچھ لکھیں گے مگر رشید امجد صاحب کو ادبی آویزشوں سے ہی فرصت نہ ملی۔ ہمیں رشید امجد سے اس سے بہتر خودنوشت کی توقع تھی۔

◎

عمر رفتہ

جناب نقی محمد خاں خورجوی کی آپ بیتی ''عمر رفتہ'' ادارہء علم وفن کراچی نے ۲۰۰۳ میں شائع کی ہے۔اس سے قبل یہ آپ بیتی ساقی کے ایک خاص نمبر کی صورت میں اپریل ۱۹۵۸ میں چھپی تھی۔اس جدید ایڈیشن کے باب میں خود مصنف کا کہنا ہے کہ یہ ساقی کا سالنامہ نہیں میرا اعمال نامہ ہے۔''ہر شخص کی زندگی دلچسپ اور تجربے کے لحاظ سے سبق آموز ہوتی ہے مگر میری زندگی کچھ عجیب وغریب قسم کے واقعات کا مجموعہ ہے۔ ایشیا کے باشندے اپنے واقعات کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اگر ان کی اولادوں کو کچھ علم ہوتا بھی ہے تو اس کا اثر ایک دو پشت کے بعد زائل ہو جاتا ہے۔لیکن یورپ والے کچھ نہ کچھ لکھ کر چھوڑ جاتے ہیں۔یہ واقعات محض قصہ کہانی نہیں ہوتے بلکہ اپنے زمانے کی تاریخ مرتب کرنے میں مدد ملتی ہے''(صفحہ۱۴)۔نقی محمد خاں خورجہ کے ایک معزز خاندان میں ۱۸۸۰ میں پیدا ہوئے ان کے والد پولیس انسپکٹر تھے۔یہ بھی پولیس میں سپاہی بھرتی ہوگئے اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کے عہدہ تک پہنچ کر وظیفہ یاب ہوئے۔ملازمت کا اکثر حصہ سی آئی ڈی میں یا ریاستوں میں بہ طور پولیس چیف گذرا اس طرح ان کی زندگی واقعی دلچسپ واقعات کا مجموعہ بن گئی۔کہیں شکار کا ذکر ہے کہیں راجوں مہاراجوں کی عادات کا کہیں اہلِ ذوق کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا اور کہیں شاہد احمد دہلوی کی طرح اساتذہء موسیقی کی صحبتوں کا۔صوفیا کی سماع کی محفلیں اور طوائفوں کے گانے بجانے کا چرچا ان کے ہاں شانہ بشانہ چلتا ہے۔فارسی ادب کا نہایت صاف ستھرا ذوق رکھتے ہیں اور فارسی اشعار جا بجا نگینوں کی طرح جڑتے چلے جاتے ہیں۔شاہد احمد دہلوی کی طرح یہ بھی کلاسیکی موسیقی کے شیدائی ہیں یہ قدر مشترک ان دونوں کو قریب تر لانے کا موجب بنی۔یہ الگ بات ہے کہ جب یہ پولیس انسپکٹری کا امتحان دینے کو گئے تو شاہد احمد کے دادا، مولانا نذیر احمد ان کا انٹرویو لینے والے بورڈ میں شامل تھے اور ان کی ترجمہ کی ہوئی مجموعہء تعزیرات ہند ہی معرض امتحان میں تھی۔اس طرح انہیں پولیس انسپکٹر بننے میں بہت مدد ملی۔

ان کی زبان صاف ستھری اور روزمرے کی زبان ہے پڑھنے میں رواں دواں ہے انہیں محاورے باندھنے کا شوق نہیں ہاں جہاں کہیں عبارت کی روانی میں کوئی محاورہ آ گیا ہے وہ نگینہ کی طرح جڑا ہوا لگتا ہے۔''ملاجی فرشتہ صورت نیک سیرت عالم فاضل زاہد متقی اور شریف النفس تھے نہ اتنے کڑوے کہ تھوتھو کرنے کو دل چاہے نہ اتنے میٹھے کہ لونڈے مٹھائی سمجھ کر چٹ کر جائیں''(صفحہ۵۰)۔ ۱۸۵۷ کے بعد بقول شخصے ''مسلمانوں کی دلیری بھاگتے کے آگے اور مارتے کے پیچھے''(صفحہ۱۵۷) رہنے تک محدود ہوگئی تھی۔

ان کی پولیس ٹریننگ علی گڑھ میں ہوئی۔سید محمود کا حال ان سے سنئے ''مسٹر محمود کی والی کوٹھی میں رہا کرتے تھے یہ وہ زمانہ تھا جب وہ ہر وقت مخمور رہتے تھے اور اس حالت میں عجیب عجیب حرکتیں کرتے تھے۔اکثر نوکروں کو مارتے رات کو تنہا قلعے کی سڑک پر چلے جاتے۔ان کی حفاظت کی غرض سے کلکٹر ضلع کو ازرہ ہمدردی پولیس کے ایک ہوشیار ہیڈ کانسٹیبل کی ضرورت پیش آئی جو سادہ لباس میں ان کی کوٹھی پر رہ کر حفاظت کا کام انجام دے۔۔۔۔سید محمود انہیں مشٹر کہتے تھے۔۔۔ایک روز پوچھنے لگے دعائے قنوت یاد ہے؟ یہاں مشٹر کھوئے گئے کہا پوری تو یاد نہیں ہے۔سید محمود کرسی سے اٹھے کمرے کے دونوں دروازے بند کئے اور ڈنڈا لے کر آئے مشٹر نے کواڑ کھول کر بھاگنا چاہا مگر مار امار شروع ہوگئی۔۔خدا خدا کر کے کواڑ کھول پائے اور بھاگ کر پولیس لائن سیدھے میرے پاس آئے''(صفحہ۸۵)

اور اب سر سید مگر سر سید کے واقعات ان کے بڑے بھائی کے سنائے ہوئے ہیں۔''یہ ابتدائی زمانہ تھا جب علی گڑھ میں صرف ساٹھ طالب علم تھے۔اسٹریچی ہال کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا اور عمارت زیر تعمیر تھی۔سامنے ایک عارضی حوض تقریباً چار فٹ گہرا اور بیس فٹ لانبا اس غرض سے بنوالیا تھا کہ اس میں اینٹیں تر کی جائیں جو تعمیر کے کام آئیں۔سر سید مرحوم خود حوض کے پاس نیم کے سایہ میں بیٹھ جاتے تھے اور قریب ان کے کوڑیوں کا ڈھیر ہوتا تھا۔دیہات سے بہت سے چھوٹے لڑکے آ جاتے جو خشک اینٹیں حوض میں لا کر ڈالتے اور تر اینٹیں اٹھا کر لے جاتے تھے ہر پھیرے کی دو کوڑیاں ملتی تھیں۔انہیں میں ایک شریر لڑکا بھی تھا جو دوسرے لڑکوں کو طرح طرح سے دق کرتا تھا کسی کو مارتا کسی کی آدھے راستے سے اینٹیں چھین کر بھاگ جاتا اور کوڑیاں وصول کر لیتا۔لڑکے آن کر سر سید سے شکایت کرتے

تھے ایک روز سرسید نے سب لڑکوں کو جمع کیا اور شریر لڑکے کو قریب بلا کر کہا کہ شاید تجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ میں شریر لڑکوں کو زندہ نگل جاتا ہوں (سرسید کے گلے میں ایک کافی بڑی رسولی تھی جو داڑھی سے چھپی رہتی تھی) اپنی داڑھی اوپر اٹھا کر اس لڑکے کو رسولی دکھلائی اور کہا کہ ابھی ایک لڑکے کو نگل گیا ہوں یہ اس کی ٹانگ ہے اب تجھے بھی کھا جاؤں گا یہ کہہ کر اس کو قریب بلایا لیکن رسولی دیکھ کر وہ ایسا خائف ہؤا کہ چیخ کر بھاگا اور باوجود بلانے کے وہ نہ آیا'' (صفحہ ۸۷)

اکبرالہ آبادی سے ان کے مراسم رہے بلکہ ان کے مکان ہی کے ایک حصہ میں کرایہ دار کے طور پر رہتے رہے۔ حضرت اکبر کی ان سے خط وکتابت بھی رہی اور بہت سے خط اس کتاب میں بھی شامل ہیں اور اکبر کی وظیفہ خواری کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اکبر کے صاحبزادے ہاشم کا انتقال ہؤا تو یہ تعزیت کے واسطے حاضر ہوئے اور ''فارسی شعر سنایا ''از بیابان عدم تا سرِ بازارِ وجود۔ بتلاش کفن آمدہ عریانے چند''۔ شعر سن کر طبیعت کا رخ بدل گیا۔ پوچھا کس کا شعر ہے؟ میں نے کہا کہ نام تو نہیں معلوم مشہور یہ ہے کہ حافظ کی غزل پر شیراز کے کسی حلوائی نے یہ شعر کہا تھا۔ وہ غزل یوں ہے۔ حسبِ حالے نہ نوشتی شدہ ایامے چند۔ قاصدا کو کہ فرستم بتو پیغامے چند''۔ مشہور تو یہ ہے کہ حافظ نے یہ شعر سنا تو کہا کہ اس ایک شعرِ نے میری غزل کو بے کیف کر دیا'' (صفحہ ۱۳۱)۔ یہ تو اکبر کے فارسی کے ذوق کی بات ہے اب ان کی طبیعت کا یہ رخ بھی دیکھئے ''اکبر کہنے لگے 'بیگم اور مس میں کیا فرق ہے؟' میں نے کہا کہ 'ایک ہی باغ کے دو پھول ہیں ایک میں خوشبو ہے دوسرا بلا خوشبو'۔ فرمایا اس شاعرانہ تخیل کو چھوڑو 'یہ کیوں نہیں کہتے ایک پیچوان ہے اور دوسری سگرٹ'۔'' (صفحہ ایضاً)

مسٹر چنتامنی ایڈیٹر اخبار لیڈر ان سے ملنے آئے اور حالات جنگ پر گفتگو شروع ہوئی جس کا ماحصل یہ تھا کہ صحیح حالات سے ہمیں بے خبر رکھا جاتا ہے اکبر نے ہنس کر فرمایا ''ہم سے سن لو خلاصہء اخبار۔ جس کو مدت سے سنتے آتے ہیں۔ ہر طرف ہے شکست جرمن کو۔ بجز اس کے کہ بڑھتے آتے ہیں''۔ مسٹر چنتامنی نے دوسرے ہی روز اس کو لیڈر میں شایع کر دیا اور ہندوستان کے گوشے گوشے میں اس کی شہرت ہوگئی''۔۔۔۔ ''ایک مرتبہ گورنر کی کوٹھی میں مسٹر براؤن رک کمشنر الہ آباد سے اکبر کی ملاقات ہوگئی۔ اس نے کہا میں آپ کا کلام پڑھتا ہوں جس میں پہلو بچا بچا کر انگریزوں کی مخالفت کی

جاتی ہے۔ ممکن ہے آپ کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے۔ اکبر نے جواب دیا حضور والا مجھے اپنے قصور کا اعتراف ہے لیکن قانونی کارروائی میں آپ کو شکست ہو جائے گی کیونکہ آپ سے زیادہ میں قانون جانتا ہوں'' (صفحہ ۱۳۲)۔ غرض اکبر کے حالات و واقعات میں دو تین صفحات لکھ گئے ہیں۔'' ۱۹۱۳ میں اقبال اکبر سے ملنے گئے تو اپنی نظم شکوہ جواب شکوہ ترنم سے سنائی'' (صفحہ ۲۱۱)

شکاریات میں بہت سا وقت صرف ہؤا ہے اس لئے شکاریات کے بیان میں بھی ان سے طوالت سرزد ہوئی ہے بلکہ شکار کے سلسلہ میں دو تین واقعات انگریزی سے ترجمہ کر کے بھی لکھ گئے ہیں (صفحہ ۱۸۸) جن کا ان کی سرگزشت سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح کتاب کے اواخر میں خود اپنے قول کے مطابق ''دلچسپ حالات بیان کرتے کرتے وعظ شروع کر دیتے ہیں'' (صفحہ ۴۰۳)۔

ریاست دتیا میں ڈیپوٹیشن پر تھے وظیفہ خواری کے بعد کے حالات پر ان کی نگاہ تھی۔ مہاراجہ شرابی تھا مگر ''۴۷ کے فسادات کے زمانہ میں مہاراجہ کی فوج بغاوت پر آمادہ ہوگئی اور ایک مسجد جو مہاراج نے شہر کے باہر اپنے محل سے تھوڑے ہی فاصلے پر خود تعمیر کروائی تھی اس کے منہدم کرنے کے واسطے فوج کے افسران اور سپاہی جمع ہو گئے۔ عین وقت پر مہاراج کو اطلاع ہوئی مہاراج نے رائفل لیا اور موٹر میں بیٹھ کر چند ہی منٹ میں موقع پر پہنچ گئے ان کو منع کیا اور کہا یہ مسجد میری ہے جو اس میں عبادت کرنا چاہے اس کی ہے خدا کا گھر ہے جہاں اس کا نام لیا جاتا ہے اگر اس کو منہدم کرنے کا ارادہ کیا تو اپنے جھولے کے تمام کارتوس اس کی حفاظت میں ختم کر دوں گا یہ سن کر سب کی ہمت پست ہوگئی اور چلے گئے'' (صفحہ ۲۸۱)۔ اسی طرح دہرہ دون کے ایک لالہ اگرسین کا بھی ذکر ہے ''بلوہ کے وقت سکھ مسجد کی بے حرمتی کرنا چاہتے تھے لالہ اگرسین پستول لے کر مسجد کے پھاٹک پر کھڑے ہو گئے اور سکھوں سے کہا کہ میں برس ہا برس سے اس مسجد کے زیر سایہ رہتا ہوں جہاں خدا کا نام لیا جاتا ہے اگر تم مسجد اور اس میں پناہ لینے والے مسلمانوں پر حملہ کرو گے تو میں تمہارا مقابلہ کروں گا'' (صفحہ ۳۸۳)

خواجہ حسن نظامی اور دیوان سنگھ مفتوں کے مابین خاصی دشمنی پیدا ہو گئی تھی مگر جب مفتون کو گرفتار کرنے کے لئے پولیس ریاست دتیا آئی تو حسن نظامی ان کی سفارش کرنے کے لئے آئے (صفحہ ۲۹۸) اور ریاست نے انہیں گرفتار نہ ہونے دیا۔ اسی طرح ''مفتون خواجہ حسن نظامی کی آخری

بیماری میں ان کی عیادت کو گئے'' (صفحہ ۲۹۹)۔

کلکتہ والی گوہر جان جنہیں اکبر کے اس شعر نے مشہور کر دیا تھا کہ ''کون خوش قسمت ہے اس دنیا میں گوہر کے سوا۔ سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا''۔ مہاراجہ رام سنگھ آف دتیا نے اپنے ایک اے ڈی سی کو کلکتہ جانے اور گوہر جان کو لانے کا حکم دیا۔ گوہر نے کبھی ریاست دتیا کا نام بھی نہ سنا تھا اس نے سمجھا کہ کوئی چھوٹی موٹی جاگیر ہوگی اور جانے سے انکار کر دیا۔ اے ڈی سی ناکام واپس آ گیا۔ مہاراج نے دوسرے اے ڈی سی کو بھیجا۔ اس نے ایک ہزار روپیہ روزانہ فیس مانگی۔ اور آ گئی۔ مہاراجہ نے کہا اسے گھوڑوں کے اصطبل کے داروغہ کے مکان پر ٹھہرایا جائے طویلے کو ہر روز سجایا جاتا نیچ ذات کے لوگ آتے گانا سنتے اور گوہر جان کو ایک ہزار روپے ادا کر دئے جاتے۔ دس دن یہی صورت رہی۔ گوہر جان نے مہاراجہ سے کئی بار گانا سننے کی درخواست کی مگر مہاراجہ نے کان نہ دھرے۔ جب وہ بہت پریشان ہوگئی تو مہاراجہ نے دربار کیا اور سب عمائدین شہر کو اور جاگیرداروں کو مدعو کیا اور گوہر کا گانا سنا۔ جو رقم مل چکی تھی اس کے علاوہ ایک لاکھ روپیہ اور دو گھوڑے مع ہاتھ پاؤں کے زیورات کے اسے دئے اور کہا ''تم بڑی ریاستوں کی جانے والی ہو میری چھوٹی سی ریاست ہے۔ میری طرف سے یہ چھوٹا سا رخصتانہ قبول کرو''۔ گوہر ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوگئی۔ ۔ خدا کے لئے میرا قصور معاف کریں میں آپ کے احسان سے تاعمر سبک دوش نہیں ہو سکتی۔ مہاراجہ نے اسے معاف کر دیا اور وہ مرتے دم تک مہاراجہ کی احسان مند رہی'' (صفحہ ۳۲۱)۔

ہندوستان کی ریاستوں کے والی ایسی ہی داد و دہش کیا کرتے تھے کیونکہ انہیں سوائے عیش و عشرت کے اور کوئی کام ہی نہیں تھا۔ نقی محمد خاں صاحب کئی ریاستوں میں رہے اور اپنے ذاتی علم کی بنا پر ان کے حالات بیان کئے ہیں۔ اس نے ان کی آپ بیتی کو پڑھنے کی چیز بنا دیا ہے۔ کہیں خود پسندی یا تعلّی بھی نظر نہیں آتی کیونکہ یہ تو اگلے وقتوں کے لوگ تھے اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب لوگوں کی آپ بیتیوں سے تاریخ نہیں بنتی قصے کہانیاں بنتے ہیں۔

تقسیم ملک کے وقت آپ کراچی میں آ گئے اور یہیں پیوند خاک ہوئے۔

◎

عمر گذشتہ

جناب سمیع محمد خاں کی آپ بیتی ''عمرِ گزشتہ'' ۱۹۲۸۲ء میں کراچی سے پہلی بار شائع ہوئی، اس کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۶ میں چھپا اور میرے پیش نظر وہی ایڈیشن ہے۔ ان کے قبلہ والدِ محترم جناب نقی محمد خاں خورجوی کی خودنوشت ''عمرِ رفتہ'' ۲۰۰۳ء میں کراچی سے طبع ہوئی تھی۔ باپ بیٹا دونوں پولیس کی سروس میں رہے بلکہ سمیع خاں صاحب کے دادا بھی پولیس میں تھے اس طرح یہ ان کا خاندانی پیشہ رہا۔ ان کے قریبی عزیز بھی یا پولیس میں رہے یا سول سروس میں خدمات سرانجام دیتے رہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ پولیس جیسے محکمہ میں رہنے کے باوجود اس خاندان میں دیانت داری کی مستحکم روایت قائم رہی۔ ایں سعادت بزور بازو نیست، تانہ بخشد خدائے بخشندہ!

''عمر رفتہ'' میں نقی محمد خاں صاحب نے خورجہ کی مردم خیزی کا ذکر تو ضرور کیا ہے مگر سماجی اور معاشرتی تفصیلات کم کم بیان کی ہیں ان کے صاحبزادے سمیع محمد خاں صاحب نے ''عمر گزشتہ'' میں اس کی تلافی کر دی اور سماجی تفصیلات کا بیان خاصی فراخ دلی سے کیا ہے۔ اگر پدر نتواند پسر تمام کند! قبلہ والد صاحب نے ان سے کہا تھا کہ ''تجربہ ہی آپ بیتی کا نام ہے'' (صفحہ ۲۰) اس لئے آپ بیتی لکھنا کوئی بیکار کا مشغلہ نہیں تاریخ کو محفوظ کرنے کا نام ہے۔

ان کو موسیقی سے لگاؤ ورثہ میں ملا ہے مگر معذرت سے کہتے ہیں ''مجھے حسن خوشبو اور موسیقی سے پیار ہے'' (صفحہ ۷۰) درست مگر اس میں معذرت کی کیا ضرورت ہے؟ راجپوتانہ کی عورتوں کے حسن کے باب میں رطب اللسان ہیں ''راجپوت عورتیں صحت مند اور خوش شکل ہوتی تھیں۔ لانبے قد، کالے بال۔ خوبصورت کاجل لگی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں، گورا رنگ، گلابی رخسار، ہاتھوں میں کنگن، پیروں میں جھانجن، انگلیوں میں چاندی کے چھلے ہاتھ اور پیروں میں گہری مہندی لگی ہوئی، ماتھے پر بندیا، پتلے پتلے خوبصورت ہونٹ، کمر اور جسم کا خوبصورت تناسب، چال متوالی آواز سریلی، شوخی اور شرارت ان کی

مجموعی زندگی کا حصہ، پہناوے میں پھولدار رنگ انگیا، دوپٹے اور بڑے گھیرے کا لہنگا'' (صفحہ ایضاً) جو شخص ''سراپے'' کے بیان میں اتنی تفصیل میں جاسکتا ہو اسے معذرت خواہانہ انداز زیب نہیں دیتا۔ حیرت اس بات پر ہے کہ ان کا حسن کا تفصیلی مطالعہ صرف راجپوتانے کی عورتوں تک کیوں محدود رہا؟ راجپوتانہ سے آجانے کے بعد انہیں حسن نظر نہیں آیا؟ یا سراپا بیان کرنے کی فرصت نہیں ملی؟

سمیع خاں صاحب کی تعلیم دہرہ دون میں ہوئی کھلاڑی تھے اس لئے کھیل کود کے میدان میں نمایاں رہے۔ دہرہ دون میں ان کے ساتھ نواب زادہ عبدالغفور خاں ہوتی بھی تھے جنہیں ان کے خادم'' دنیا کا سب سے بڑا نواب کہتے تھے'' (صفحہ ۸۰) اور دنیا کے سب سے بڑے نواب کی معیت میں انہیں پہلی بار طوائف کے کوٹھے پر جا کر گانا سننے کا موقع ملا۔ پولیس سروس میں آگئے تو مستقبل میں پاکستان کے بڑے پولیس افسر کاظم رضا صاحب سے تعارف ہوا اور انہوں نے ہی تقسیم ملک کے وقت انہیں کراچی طلب فرما کر پولیس کی سروس میں لیا۔ قائداعظم کو انہوں نے پہلی بار آگرہ کی ایک عدالت میں پیش ہوتے ہوئے دیکھا'' ایک خوب صورت انسان دبلا پتلا لمبا، بہترین سلے ہوئے سفید سوٹ میں ملبوس پیکر عظمت مجسمہء انسانیت'' (صفحہ ۱۳۱)۔ اس کے بعد پاکستان آکر قائداعظم کے ذاتی محافظوں میں شامل ہوگئے تو انہیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا'' ایک بار کسی صوبائی سربراہ کو قائداعظم نے صبح دس بجے ملنے کا وقت دیا۔ وقت کی پابندی کیلئے ہمارے پاس جو فہرست اگلے دن ملنے والوں کی ہوتی تھی اس میں ان کے آنے کا وقت درج ہوتا تھا۔ حکم یہ تھا کہ اگر کوئی چند منٹ کی تاخیر سے بھی آئے تو اس کے لئے صدر دروازہ نہ کھولا جائے۔ چنانچہ یہ صاحب دس منٹ دیر سے آئے۔ سنتری نے دروازہ نہیں کھولا میں خود گیا مجبوری کا اظہار کیا بہت چراغ پا ہوئے اور رعب ڈالنے کی کوشش کی۔ مجبوری کی حالت میں کار سے اتر کر ہمارے ٹینٹ میں آئے اور کرنل نولز سے اپنے دیر سے آنے کی وجہ بیان کی کرنل نے بھی مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ قائداعظم سے معلوم کر کے بتائیں گے۔ چنانچہ دو تین منٹ کے بعد کرنل نے بتایا کہ قائداعظم وقت کی پابندی نہ کرنے پر ناخوش ہیں اور حکم دیا ہے کہ کل پھر وقت مقررہ پر آئیں'' (صفحہ ۱۸۹)۔

اپنی ملازمت کے سلسلہ میں انہیں خوب تجربے ہوئے ایک لالہ جی سے سامنا ہوا'' ایک دن

معہ شاف میں لکھنؤ کانپور روڈ پر چیکنگ کر رہا تھا۔ میں اور میرا اسٹاف باوردی تھے میری سٹیشن ویگن کے قریب ایک نئی کار آ رکی جس میں ایک لالہ جی دھوتی اور جواہر کٹ کی واسکٹ پہنے بیٹھے تھے۔ مجھ سے پوچھا تم کون ہو؟ میں نے اپنا تعارف کرایا۔ نام سنتے ہی آگ بگولہ ہوگئے چیخ چیخ کر کہنے لگے کہ اب مسلمانوں کا ہندوؤں پر حکومت کرنے کا کیا حق ہے جگہ خالی کرو۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ انہیں کیا تکلیف پہنچی جب فرضی پارہ اوپر چڑھنے لگا تو میں نے اپنے حوالدار کو آواز دی اور مہاشے کی طرف اشارہ کر کے کہا ان کو سرکاری کام میں مداخلت کے الزام میں گرفتار کرلو۔ یہ کہنا تھا کہ لالہ جی کا پارہ کھٹ سے نیچے گر گیا یہ کہہ کر کہ وہ ممبر پروونشل اسمبلی ہیں اپنے ڈرائیور سے کہا چلو بھئی چلو یہ ڈیوٹی دے رہے ہیں۔ نمسکار۔ اور بھاگ کھڑے ہوئے ان حضرت کی کم ظرفی اور تنگ نظری پر میرا ہندو سٹاف بھی ہنسنے لگا'' (صفحہ ۱۵۱)

ریل میں ان کی ملاقات سر تیج بہادر سپرو سے ہوئی'' میرے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی ایک اور بزرگ تشریف لے آئے۔ معمر، سفید اور خشخشی داڑھی، گرم بھورے رنگ کی شیروانی اسی رنگ کا پاجامہ، نیوکٹ جوتا، سر پر شیروانی کے کپڑے کی رام پور کی وضع کی ٹوپی، گلے میں گلوبند لپٹا ہوا۔ رنگ سانولا، چھریرا بدن، میانہ قد اور چہرے پر سنجیدگی۔۔۔ میں نے بھی شیروانی پہنی ہوئی تھی تھوڑی دیر بعد مجھ سے کہا میاں صاحبزادے میرے قریب آؤ۔ میں ان کے پاس بیٹھ گیا کہنے لگے پاکستان جا رہے ہو؟ میں نے کہا کہ آپ کو کیسے اندازہ ہوا۔ فرمانے لگے تمہارے چہرے سے پریشانی افسردگی اور نفرت کا اظہار ہو رہا ہے۔ وطن؟۔ میں نے کہا میرے لئے دہرہ دون کیونکہ میں وہیں پلا بڑھا اور تعلیم حاصل کی۔۔۔ اس گفتگو کے بعد گہری سوچ میں پڑ گئے اور بغیر میری طرف مخاطب ہوئے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہنے لگے'' ہائے افسوس! مسلمان اس سرزمین کو خیرباد کہہ رہے ہیں ان سے تو ہم نے اخلاق سیکھا ان کی وضعداریوں کو اپنایا علم صداقت اور محبت کی تعلیم حاصل کی یہ کہتے ہوئے ان کے ہونٹ کانپنے لگے اور آنسو امڈ آئے۔۔۔

کہنے لگے برخوردار میں تمہیں اپنی اوائل عمری کے تاثرات بتاتا ہوں۔ ہمارا مکان ایک نواب صاحب کے متصل تھا ہمیں برسوں یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ کہ اصلی گھر وہ تھا آبائی مکان۔ ان کے بچے اور

ہم ہر وقت ساتھ رہتے اکثر رات کو میں وہیں سو جاتا نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کی شفقت میرے والدین سے کم نہ تھی بلکہ ان سے زیادہ۔ ان کے بچوں کے ساتھ مکتب میں پڑھا قرآن شریف برابر والی مسجد کے پیش امام نے پڑھایا فارسی اور عربی تعلیم حاصل کی اس گھرانے کے اخلاق بلند اور بے مثال تھے نواب صاحب کا انداز گفتگو اتنا شیریں اور علمی قابلیت اتنی وسیع تھی کہ بیان نہیں کر سکتا۔ جتنی عید کی خوشی ان کے بچے مناتے اس سے زیادہ مجھے ہوتی۔ چاند رات کو بیگم صاحبہ کہتیں بیٹے چاند دیکھ کر دعا مانگو اور بزرگوں کی دعائیں لو۔ چاند کو دیکھ کر ہم سب حویلی میں بھاگتے جاتے اور نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کو سلام آداب کہتے اور دعائیں لیتے۔ رات کا کھانا کھا کر بیگم صاحبہ اصرار کرتیں کہ جلدی سو جاؤ صبح جلدی اٹھنا ہے صبح ہوتی تو بیگم صاحبہ پہلے مجھے غسل دیتیں خوشبو لگاتیں نیا جوڑا اور نئی شیروانی ہر سال بنواتیں اور مجھے پہناتیں۔ اس کے بعد اپنے بچوں کو نہلاتیں اور کپڑے پہناتیں۔ ان کے ساتھ میں عیدگاہ نماز پڑھنے جاتا۔ سب کا ایک صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا اور بغل گیر ہونا بہت بھلا معلوم ہوتا۔ گھر آ کر شیر (خرما) کھاتے عیدی ملتی اور ہنسی خوشی گھر چلا جاتا۔۔۔۔ الہ آباد آ گیا۔ ٹرین رکی یہ صاحب کھڑے ہوئے مجھے گلے لگایا ایک صاحب ان کا سامان لینے اندر آئے تو میں نے پوچھا بھائی یہ کون صاحب ہیں؟ اس نے کہا شریمان تیج بہادر سپرو'' (صفحہ ۱۷۱۔۱۷۲)۔ سر تیج بہادر سپرو اور پنڈت موتی لال نہرو کی نسل کے لوگ اسلامی تمدن رکھتے تھے عربی فارسی جانتے تھے اور مسلمانوں کے ساتھ معاشرتی تعلقات رکھنا ان کا شیوہ تھا۔ نواب احمد سعید خاں چھتاری کی خودنوشت میں پنڈت موتی لال نہرو کا ایک خط مندرج ہے جسے پڑھ کر کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ خط کسی مسلمان کا لکھا ہوا نہیں۔ مگر زمانہ بدل گیا قدریں بدل گئیں اب خود مسلمان عربی فارسی اور اپنے تہذیبی اثاثوں سے نابلد ہو گئے۔

ہجرت کے وقت ان کی ملاقات بمبئی میں کمانڈر مراج (معراج؟) اور ان کی بیگم سے ہوئی جو مسلمانوں کو کراچی بھیجنے پر مامور تھے۔ ان کی بے لوث خدمات کا تذکرہ نہایت شاندار الفاظ میں کیا ہے مگر مجھے تو ان کی یہ بات پسند آئی کہ ''ان دونوں میاں بیوی کو فرشتہ کہنا حق بجانب ہوگا میں نے قصداً کمانڈر مراج اور مسٹر مراج کا تذکرہ مفصل اس وجہ سے کیا ہے کہ پاکستان کی تاریخ میں اگر سہواً ان کا نام نہ آئے تو میری حقیر سی سوانح حیات ان کے بلند کردار کی شہادت دے گی'' (صفحہ ۱۷۵) ہم ان کی

شہادت کو دہرا رہے ہیں تا کہ پاکستان کی تاریخ میں ایسے محسنوں کا نام ہونا چاہئے اور تاریخیں ایسے ہی بے لوث ناموں کی وجہ سے زندہ رہتی ہیں۔

کتاب میں اپنے دورہ انگلستان اور وہاں کی پولیس کے ''اخلاقی فرائض'' کا تذکرہ کیا ہے جو اپنے ملک کے سیاق وسباق میں اجنبی لگتے ہیں حالانکہ یہی وہ اخلاق تھے جو ہمارے اسلاف نے دنیا کو سکھائے تھے۔ گنوادی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی۔ ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا۔

اور اب ان کی خودنوشت کا تذکرہ ختم کرتے ہوئے مختصر سا تعارف مسٹر بھٹو کا۔ مارشل ٹیٹو شکار کے لئے تشریف لائے ان سے ذرا قبل ذوالفقار علی بھٹو صاحب وزیر خارجہ پہنچے۔۔۔۔ صدر کا جلوس آ کر رکا۔ صدر ایوب نے مارشل ٹیٹو سے مسٹر بھٹو کا تعارف کچھ اس طرح کرایا یہ ہیں ذوالفقار علی بھٹو میں انہیں بیٹا کہوں یا فارن منسٹر۔ مارشل ٹیٹو نے ہاتھ بڑھا کر کہا اس صورت میں میں آپ کے بیٹے سے ملوں گا'' (صفحہ ۲۶۰) باقی کی سب باتیں اب تاریخ کا حصہ ہیں اور تاریخ میں احسان فراموشی کی بڑی بڑی داستانیں محفوظ ہیں۔

◎

داستان امیر حمزہ

مشہور پشتو ادیب، شاعر، ڈرامہ نگار اور صوفی جناب امیر حمزہ شنواری کے خود روایت کردہ حالات '' داستانِ امیر حمزہ شنواری'' سنڈیکیٹ آف رائٹرز پشاور کی جانب سے ۱۹۹۶ میں شائع ہوئے۔ یہ انٹرویو خاطر غزنوی نے لیا تھا۔ ایک سو چالیس صفحات کی یہ دستاویز امیر حمزہ شنواری کے تخلیقی اور صوفیانہ سفر کی مستند روداد ہے اور ان کی زندگی کے ہر پہلو کی مناسب تصویر کشی کرتی ہے۔ سیاسی اور دینی معاملات میں ان کی اپنی رائے ہے اور وہ اس پر ثابت قدمی سے قائم ہیں۔ بنیادی طور پر قبائلی کلچر سے متعلق ہیں اس لئے ان کے ہاں دوستی دشمنی ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ زندگی کا بیشتر حصہ سفر میں گذرا۔ کبھی بمبئی کبھی اجمیر شریف کبھی دہلی کبھی لاہور اور کبھی کابل۔ ان کے بعض سفرنامے بھی چھپ کر پشتو حلقوں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کی جانب سے انہیں بیعت کرنے کی بھی اجازت تھی۔ ہر پہلو پر ان کا شاعرانہ پہلو غالب رہتا ہے جہاں کہیں ذکر آتا ہے ان کی غزل گوئی کا ذکر آتا ہے اردو غزل کے علاوہ یہ اپنے مرشد کی ہدایت کے مطابق پشتو میں بھی غزل کہتے تھے۔

تعصب ان کے ہاں نام کو بھی نہیں۔ شیعہ سنی کی تمیز ان کے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتی خود کو تفضیلی سنی کہتے ہیں۔ حتیٰ کہ اپنے ایک احمدی دوست کا ذکر بڑی محبت سے کرتے ہیں '' قلندر مومند ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور مذہبی علوم گویا انہیں اپنے گھر میں حاصل ہوئے تھے اس لئے بڑے پکے مذہبی بن گئے بعد میں اپنے بزرگوں کے اصرار پر خلیفہ قادیان سے بھی بیعت فرمائی اور اب کٹر احمدی ہیں'' (صفحہ ۴۵)۔

جنگ عظیم کے دوران روس کے عظیم عالم حضرت موسیٰ جار اللہ صاحب تاج محل ہوٹل بیرون ڈبگری بازار پشاور میں نظر بند تھے۔۔۔۔انہوں نے عربی زبان میں ۱۱۸ کتابیں لکھی ہیں میں نے پوچھا '' مولانا آپ داڑھی کیوں منڈواتے ہیں؟'' فرمایا '' اپنی بہترین عقل کو اس قسم کے معمولی مسائل

میں نہ الجھایا کرو۔ داڑھی لباس کی قسم سے ہے''۔ میں نے کہا '' مولانا عریاں رہنا بھی تو اچھا نہیں''؟ مسکرا کر فرمایا '' عریانی بھی لباس ہی کی ایک شکل ہے'' (صفحہ ۵۰) تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس۔

کتاب کے اواخر میں تصوف کے مسائل کا ذکر ہوا ہے اور امیر حمزہ نے بڑی خوبی سے تصوف کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب ان کی زندگی کے حالات سے اور ان کی تخلیقات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بہت مفید کتاب ہے۔

کہانی مختصر کوئی نہیں ہے

''کہانی مختصر کوئی نہیں ہے'' جناب غوث متھراوی کی خودنوشت ہے جو ''ظہوریہ اکیڈمی'' کراچی کی جانب سے جولائی ۲۰۰۳ میں شائع ہوئی۔ غوث متھراوی آئی ڈی بی پی کے سینئر افسر کے طور پر ریٹائر ہوئے مگر ان کی اصل پہچان ان کی سجادہ نشینی ہے۔ آپ اپنے والد کی وفات کے بعد سلسلہء ظہوریہ تاجیہ کی سجادہ نشینی پر فائز ہوئے۔ اس کتاب کے آخری صفحہ پر پیرزادہ سید غوث محمد شاہ سجادہ نشین کی عالم جذب کی ایک تصویر ہے جو کسی محفلِ سماع کے موقع پر کھینچی گئی تھی۔ یہ محفل سماع کا ذوق تو آپ نے اپنے قبلہ والد محترم سے ورثہ میں پایا ہے جو اس حد تک اس کے والا وشیدا تھے کہ ایک بار اپنا سب کچھ قوال کو بخش دینے کے بعد اپنی اولاد بھی اسی کو بخشنے لگے تھے (صفحہ ۶۱) مگر قوال کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے کہ ایسا نہ کیجئے۔ ایسا ہو گیا ہوتا تو محترم ایس۔ جی ایم شاہ صاحب کسی قوال پارٹی کے رکن رکین ہوتے۔ ان کے گلے میں نور ہے جو اس قوالی میں بہت ممد ہوتا۔ اور طبلہ سارنگی کے رمز شناس تو آپ ہیں ہی۔ ان کے اپنے ہاں بھی جذب کی کمی نہیں ایک تصویر میں یہ والہانہ رقص کناں ہیں اور مریدین بچشم حیرت ان کی جانب دیکھ رہے ہیں۔ یہ رقص ''رقصِ بسمل بود شب جائے کہ من بودم'' لگتا ہے۔ رقص کی تربیت انگلستان میں حاصل کی اس لئے رقص تو ان کے لئے کوئی اجنبی کیفیت نہیں۔ حتیٰ کہ جدہ میں پولیس کے سامنے بھی ان کا یہ حال ہوا ''ہم پر جذب وسرور کی کیفت طاری ہونے لگی ہم نے دھیرے دھیرے اس خیالی دف کی آواز سے پاؤں ملاتے ہوئے جو ہمارے لاشعور میں کہیں دور سنائی دے رہی تھی اپنی نوعیت کا دھمال شروع کر دیا اس دھمال میں تیزی آتی گئی ہمیں کچھ ہوش نہ تھا۔۔۔ (اور) جب ہم لٹو کی طرح گھومنے لگتے ہیں تو لوگوں کو پھر ایک سفید لٹو ہی نظر آتا ہے'' (صفحہ ۲۹۸)

سید غوث محمد شاہ متھراوی کی تربیت ایسے ماحول میں ہوئی کہ والد بزرگان دین کے ساتھ والہانہ وابستگی رکھتے تھے۔ والدہ جو نواب خاندان سے تھیں مگر ایک فقیر کے ساتھ نباہ کر گئیں۔ ننھیال کا

اثر ان کی طبیعت میں نہیں ہے البتہ نوابوں والی عادتیں تو بچوں کی نگاہ میں رہتی ہی ہیں۔ ''نانا پکے نمازی تھے مگر کلکٹر صاحب دورہ پر آتے تو ان کے لئے شراب اور طوائفیں مہیا کرتے'' (صفحہ ۳۰) تھے۔ اس لئے شراب ان کے ہاں بھی ''حاضر'' ہے۔

ان کے ماموں نواب یامین خاں تھے اب یہ معلوم نہیں کہ وہی ''نامہء اعمال'' والے نواب یامین خاں ہیں یا کوئی اور ہیں مگر یہ بات تو غوث صاحب نے لکھ دی ہے کہ ان کے نانا کی اولاد تقسیم کے وقت ٹنڈو محمد خان کے ایک زمیندار سے اپنی جائیداد کا تبادلہ کرنے کے بعد ہجرت کر کے پاکستان آئی (صفحہ ۳۶) اور یہی بات نامہء اعمال میں بھی موجود ہے۔

غوث متھراوی صاحب اپنے خاندان میں پہلے آدمی ہیں جنہیں نوکری کرنا پڑی (صفحہ ۱۹۳) اس لئے اس کا انہیں ملال بھی ہے مگر زری پری صاحبزادگی میں وہ اللے تللے تو نہ ہوتے جو انہیں سرکاری نوکری اور ڈرائیور والی کار میں حاصل ہوئے۔ اپنی خوبصورتی کا احساس انہیں نرگسیت کی انتہائی حد تک ہے۔ خود اپنے منہ سے جب یہ کہتے ہیں کہ ''اکلوتا بیٹا جو شاہزادوں سے زیادہ خوبصورت ہے'' (صفحہ ۲۰۴) تو قاری ان کی طرف حیرت سے دیکھتا ہے۔ اس احساس نے انہیں ایک حد تک ایب نارمل (صفحہ ۲۶۶) بنا دیا ہے۔ خود اپنے آپ کو ''ہم جیسے ایماندار'' (۳۸۲) لوگ کہتے ہیں حالانکہ بچپن سے ''چوری سینہ زوری'' اور فریب کاری کے کارہائے نمایاں آپ نے خود بیان کئے ہیں۔ سجادہ نشین بننے کے بعد بھی کوریا گئے ہیں تو اپنی پرانی ''وضع رندانہ'' سے باز نہیں آئے۔ آپ نے ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کی طرح اپنے انگلستان کے زمانہ کی سرگرمیوں کی تصویری روداد کتاب میں شامل کر دی ہے تاکہ سند رہے (صفحہ ۱۷۴)

ان کا خدا پر یقین اتنا ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیماری سے صحت عطا کی تو اسے بھی مزاروں کی کرامت کہنے لگے (صفحہ ۲۹) مگر ان کے ابا نے ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے بہتر ملازمتوں کی استدعا کی تو ان کا لہجہ بے یقینی کا ہے کہ ''والد صاحب کیف کے عالم میں تھے کہ ان کے دوست (یعنی اللہ میاں) نے ان کی دعا کو قبول فرما لیا تھا''۔ (صفحہ ۱۸۳)

ان کے ہاں وہی بدعت چل رہی ہے کہ سند میں اپنے شعروں کی مثال دیتے ہیں اور ان کے

شعران کی نثر سے کمتر ہیں۔ اگر چہ نثر بھی کوئی ایسی بامحاورہ اور شستہ نہیں کہ پڑھنے والا لطف لیتا رہے۔
اپنی بیگم صاحبہ کے ذکر خیر پر پورا ایک باب باندھا ہے اسی طرح اپنی شاعری کے ذکر اذکار پر بھی بہت کچھ لکھا ہے مگر وہ سب عام درجہ کی باتیں ہیں۔ کچھ سفر اسفار ہیں حج کا ذکر خیر بھی ہے اور اس میں نمایاں ترین ان کی احرام والی تصویر ہے جس میں آپ شرمائے شرمائے سے لگ رہے ہیں ''تیرا دل تو ہے صنم آشنا''!

الغرض غوث متھراوی صاحب کی یہ خودنوشت ان کی زندگی کی تفصیلی اور لمحہ کی روداد ہے۔ جس میں ان کے دوستوں کا ذکر خود ان کے اپنے بیان سے زیادہ ہے بلکہ ایک جگہ تو شاہ صاحب نے اپنے دوستوں واقف کاروں کی ایک فہرست مرتب کی ہے جس میں غالباً انتالیس چالیس افراد کے نام دئے ہیں جو زندگی میں ان کے قریب سے گذرے ہیں اور اس لمحاتی وابستگی کو بھی انہوں نے اپنی زندگی کے حالات میں شامل کرلیا ہے۔ یہ کتاب ان کے دوستوں شناساؤں کے لئے تو دلچسپی کا سامان ہوسکتی ہے عام قاری کے لئے اکتاہٹ کے وافر سامان اس خودنوشت میں موجود ہیں۔ یہ تو بہت اچھا ہوا کہ غوث صاحب نے اپنی طول طویل خودنوشت کو مختصر کرلیا (یوسفی صاحب کے قول کے مطابق اپنا اپنڈکس خود نکال لیا) ورنہ قاری اس طومار سے عہدہ برانہ ہوپاتا۔ اور یوسفی صاحب کی ایک اور بات لکھ دینے میں کیا حرج ہے کہ ''کامیاب وہی ہیں جن کے ایک ہاتھ میں دین ہے اور دوسرے میں دنیا مگر دائیں ہاتھ کو پتہ نہیں بائیں ہاتھ میں کیا ہے'' اور یہ بات غوث متھراوی کی خودنوشت پر صادق آتی ہے۔

جگرِ لخت لخت

پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی خودنوشت ''جگرِ لخت لخت'' مکتبہء خیابانِ ادب لاہور سے اپریل ۲۰۰۴ میں شائع ہوئی۔ ذوالفقار صاحب اورینٹل کالج لاہور میں اردو کے پروفیسر رہے اس کے بعد انقرہ یونیورسٹی میں تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ قیام ترکی کے دوران ڈاکٹر صاحب نے ظفر حسن آئبیک صاحب کی خاطرات کو مرتب کر کے شائع کیا۔ اپنی خودنوشت کے بارہ میں بھی وہ بار بار خاطرات کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ خاطرات فارسی زبان میں خودنوشت آپ بیتی کو کہتے ہیں۔ ملکہ فرح پہلوی کی خودنوشت بھی خاطرات کے عنوان سے چھپی ہے۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ہمارے ہاسٹل کے ساتھی ہیں۔ ہم دونوں دو برس تک دیوار بہ دیوار وولنر ہاسٹل کے کمرہ نمبر ۲۳ اور ۲۴ میں قیام پذیر رہے۔ دو سال کے دوران کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر کوئی بات کی ہو یا کسی بات کا جواب مسکرا کر دیا ہو۔ ہمارا تاثر ان کے بارہ میں یہی تھا کہ وہ یک رخے اور خشک آدمی ہیں۔ ان کی خودنوشت نے اس بات کی تصدیق کردی ہے لکھتے ہیں ''میں نے گذشتہ تیس برس یونیورسٹی اور اورینٹل کالج میں بڑے خلوص وانہماک سے گذارے دوستوں سے گھل مل کر بھی اور الگ تھلگ ہو کر اپنے تالیفی و تصنیفی کاموں میں مصروف رہ کر بھی۔ اگر میں اعتراف کرلوں تو کوئی مضائقہ کی بات نہ ہوگی کہ یہ سب میری زندگی سے فرار کی مختلف صورتیں تھیں۔ میں اپنے آپ کو ہر طرح مصروف رکھ کر بھلا دینا چاہتا تھا۔ میری کم آمیزی کی بڑی وجہ بھی یہی تھی جسے میرے اکثر دوستوں نے میری ترش روئی اور سخت کوشی پر محمول کیا'' (صفحہ ۳۴۰)۔

اس خودنوشت سے ایک بات اور بھی سامنے آئی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے اندر کے تعصبات بڑے گہرے ہیں شاید یہ تعصبات ان کی ''آوارگی اور لاپرواہی'' (صفحہ ۶۹) کے زمانہ کی پیداوار ہیں وہ ابھی تک ان تعصبات سے رہائی حاصل نہیں کرسکے۔ حالانکہ انہیں اس بات کا احساس ہے کہ ''اگر استاد کم

ظرف اور دل آزار'' (صفحہ ۸۸) ہو تو لوگ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ ''بعض لوگ غلطی سے معلمی کے پیشہ میں آجاتے ہیں'' (صفحہ ایضاً)۔ ایسی ترش روئی ریلوے کی ملازمت میں تو چل جاتی ہے معلمی میں کام نہیں آتی اور ذوالفقار صاحب نے ریلوے کے محکمہ میں اپنی زندگی کے ایسے سال گذارے ہیں جو انسان کی سائیکی پر گہرے اثر چھوڑ جاتے ہیں اور اورئینٹل کالج سے وابستگی کے تیس سال ان کی معلمی کے سال ہیں اور ان سالوں میں بھی انہوں نے ''کسی کو اپنے دل کے اندر جھانکنے کا کبھی موقع ہی نہیں دیا'' (صفحہ ۳۴۸) اور غالباً اسی لئے ''ان کے مضامین اور اسلوب میں کھچڑی سی پکتی رہتی ہے'' (صفحہ ۱۴۱)

اس خود نوشت کے پہلے دو سو صفحات بٹالہ اور امرتسر کی سیاسی اور سماجی تفصیلات سے مملو ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بٹالہ میں پیدا ہوئے جو ''احرار کا گڑھ'' تھا (صفحہ ۱۷۲) اور احرار کانگرس کے ساتھ تھے ڈاکٹر صاحب ۱۹۴۰ میں مسلم لیگ میں شامل ہوئے اور مسلم نیشنل گارڈ کی تنظیم میں بھی شامل رہے۔ اوائل عمر میں ملازمت کرنا پڑی تو ریلوے کے کمرشل محکمہ میں ملازم ہو گئے مگر ملازمت کے دوران اپنی سیاسی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے رہے۔ سیاسی میدان میں آئے تو انہیں سیاسی پارٹیوں سے واسطہ پڑا۔ بٹالہ کی بڑی پہچان یہ رہی ہے کہ یونینسٹ پارٹی کے اکابر بٹالہ شہر سے تعلق رکھتے تھے مگر یونینسٹ پارٹی سے انہیں ایسا بغض ہے کہ میاں سر فضل حسین کا جنازہ تدفین کے لئے بٹالہ پہنچا تو وہ بھی انہیں ناگوار ہوا (صفحہ ۱۱۶) اب ایک سکول کے بچے کی زبانی ہندوستان کے اس نامور سیاست دان کی وفات پر بٹالہ والوں کی داستان سنئے ''معلوم ہوا کہ پنجاب کے بڑے لیڈر اور حکومت کے ستون میاں سر فضل حسین کا جنازہ ہے۔ عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے۔ لاہور میں ان کا انتقال ہوا وہ بٹالہ کے رہنے والے تھے ان کا آبائی قبرستان کھجوری دروازے سے باہر تھا وصیت کے مطابق میت دفن ہونے کے لئے لاہور سے بٹالہ لائی گئی تھی بٹالہ کی عام آبادی میں اس سانحہء ارتحال پر کوئی خاص ردعمل دیکھنے میں نہ آیا۔۔۔ میاں صاحب برطانوی حکومت کے منظور نظر تھے اور بٹالہ کے عوام کا بیدار سیاسی ذہن ان کی سیاسی بڑائی کا زیادہ قائل نہ تھا تیسرے بٹالہ قادیان کے خلاف ایک بڑا مورچہ تھا اور میاں صاحب کے بارہ میں مشہور تھا کہ وہ خود تو مرزائی نہیں مرزائی نواز ضرور ہیں۔ ظفر اللہ خاں کو مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے مرکزی حکومت میں بھجوانا انہی کے ایما سے ممکن ہوا تھا۔ میں نے اس روز

اکثر لوگوں کو یہ چہ میگوئیاں کرتے سنا'' (صفحہ ۱۱۶)۔ داد دیجئے کہ سکول کے ایک بچے نے ان چہ میگوئیوں پر بنا کر کے کیسی صاف سیاسی روداد بیان کی ہے۔ مولانا عبد المجید سالک نے سرگزشت میں لکھا ہے کہ میاں سر فضل حسین کی وفات پر جھنڈے سرنگوں کر دئے گئے تھے اور دفتروں اور عدالتوں میں سرکاری طور پر تعطیل کر دی گئی تھی۔ (سرگزشت صفحہ ۳۶۸) اور ظاہر ہے بٹالہ میں اس تعطیل کی وجہ سے خاصی ہماہمی رہی ہو گی مگر آپ نے کچھ لوگوں کی چہ میگوئیاں تو بیان کر دیں عام لوگوں کا ردعمل انہیں نظر نہیں آیا اور ایک بچے کو نظر بھی کیا آتا!

احمدیوں سے انہیں ایسا بغض ہے کہ جہاں موقع ملتا ہے ان کا اندرونی تعصب باہر نکل آتا ہے۔ ۱۹۴۵ کے الیکشن میں احمدیوں نے اپنے امام کی اطاعت میں اپنے حریف ظفر علی خاں کو ووٹ دئے۔ اس کی روداد ان سے سنئے ''بٹالہ میں ''مسلم نیشنل گارڈز نے مسلم لیگ کے کیمپ اور پولنگ سٹیشن پر خدمات سرانجام دینے کا فیصلہ کیا ہم نے مناسب موقعوں پر رضا کار متعین کر دئے۔۔۔ قادیان سے آنے والی صبح کی ٹرین سے قادیانی ووٹرز باجماعت آئے اور ہمیں ہدایت تھی کہ اس جماعت کو مسلم لیگ کیمپ میں نہ آنے دیا جائے۔ چنانچہ ہم نے اس پر عمل کیا۔ لطف کی بات تھی کہ مولانا ظفر علی خاں کی حریف یہ قادیانی جماعت اپنے امیر کی اطاعت میں اپنے ازلی حریف کو ووٹ دینے آئی تھی''۔ (صفحہ ۱۶۵)۔ مسلم لیگ کے یہ نام نہاد گارڈز اس بات پر خوش تھے کہ انہوں نے احمدیوں کو مسلم لیگ کے کیمپ میں نہیں جانے دیا نہ یہ بیان فرمایا کہ ''کس کی جانب سے ہدایت تھی''؟ مگر احمدیوں کے ووٹوں کی وجہ سے ظفر علی خاں کامیاب ہو گئے اور اتنے ووٹوں سے کامیاب ہوئے کہ دوسروں کی ضمانت ضبط ہو گئی۔

پھر صوبائی اسمبلی کے الیکشن میں چوہدری فتح محمد سیال جماعت احمدیہ کی طرف سے مسلم لیگ کے نمائندے کے طور پر الیکشن لڑ رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کی کامیابی کا ذکر یوں لاتعلقی سے کیا ہے کہ ''قادیانی امیدوار فتح محمد سیال جیت گیا'' (صفحہ ۱۷۳)۔ گویا فتح محمد سیال ان کی طرح کا کوئی مبتدی سالا وارث سیاسی کارکن تھا۔ سیال صاحب گورنمنٹ کالج کے ایم۔اے تھے اور انگلینڈ میں دین حق کے مبلغ رہ چکے تھے۔ تعصب انسان کی آنکھوں پر کیسا پردہ ڈال دیتا ہے۔ یہ بغض بہت دور تک ان

کے ساتھ رہا۔ ۱۹۵۸۔۱۹۵۹ء میں پنجاب یونیورسٹی میں ایک بین الاقوامی اسلامی کلوکیم منعقد ہوا۔ اس میں یہ ڈاکٹر سید عبداللہ کے ایما پر ایک خاص مہم میں مصروف تھے (صفحہ ۲۹۵)۔ یہاں بھی ان کا بغض ظاہر ہو گیا'' میاں افضل حسین وائس چانسلر تھے۔ اسلامی کلوکیم کی تشکیل اور غیر ملکی سکالروں سے خط و کتابت اور بیشتر انتظامی امور کالوکیم کے ڈائریکٹر علامہ محمد اسد نے سرانجام دئے تھے جنہیں عین موقع پر میاں صاحب نے جن کا خاندانی واسطہ قادیانیت سے تھا کولوکیم کے فرائض سے سبک دوش کر دیا تھا۔ پاکستان کے معروف علمائے کرام کو بھی کالوکیم سے دور رکھا گیا انتظام میں پیش پیش زیادہ تر آزاد خیال (فری تھنکرز) اور لبرل قسم کے لوگ تھے۔۔۔۔ ہم نے اپنا چھاپہ مار پروگرام بنایا کہ اسلامی ممالک کے مندوبین نماز جمعہ بجائے شاہی مسجد کے مسجد وزیر خاں میں ادا کریں۔۔۔ وہاں مولانا عبدالستار خاں نیازی (وہی داڑھی منڈوا کر فرار ہونے کی کوشش کرنے والے) نے فصیح عربی میں خطبہ دیا اس کا بہت اثر ہوا'' (صفحہ ۲۹۷) گویا ڈاکٹر صاحب اس کلوکیم کو ناکام بنانے کے لئے چھاپہ مار سرگرمیوں میں اور کلوکیم کو ناکام کرنے کی سعیءمذموم میں مصروف تھے۔ بنیاد اس مفروضہ پر تھی کہ میاں افضل حسین کا خاندانی واسطہ قادیان سے تھا۔ اور یہ تاریخی حقیقت ہے کہ بٹالہ کے ہر شریف اور معزز خاندان کا ''واسطہ'' قادیان سے تھا۔

ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ ''یہ تالیف تاریخی واقعات کی متحمل نہیں ہو سکتی یہ میری آپ بیتی ہے جسے اصولاً میرے مشاہدات پر مبنی ہونا چاہئے'' (صفحہ ۲۲۱) مگر جہاں موقع ملتا ہے آپ اپنے ''مشاہدات'' کے نام پر تاریخی عوامل کا تجزیہ شروع کر دیتے ہیں اور من پسند نتائج اخذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کا اپنا دعویٰ ہے کہ یہ ''ناممکن کو ممکن بنا سکتے ہیں'' (صفحہ ۲۰۱) سر خضر حیات خاں نے قیام پاکستان کے وقت عین مناسب وقت پر منظر سے ہٹ کر مسلم لیگ کا راستہ صاف کر دیا تھا ان کے اس اقدام کو ہر صائب الرائے شخص نے سراہا ہے سوائے ڈاکٹر صاحب کے جن کا خیال ہے کہ ''جو لوگ خضر حیات کو منظر سے ہٹ جانے پر پارسائی کا سرٹیفکیٹ دیتے ہیں مجھے ان کی عقل پر پتھر پڑے نظر آتے ہیں'' (صفحہ ۲۱۲) یہ محاکمہ ایک ایسے شخص کا ہے جس کی سیاسی بصیرت محل نظر ہے۔ اگر اس وقت خضر حیات خاں (سر ظفر اللہ کے مشورہ پر) مستعفی ہو کر مسلم لیگ کا راستہ صاف نہ کرتے تو مسلم لیگ کی

راہ میں بہت مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں مگر سر خضر منظر سے ہٹ گئے اور قیام پاکستان کے بعد بھی اپنے اس موقف پر سختی سے قائم رہے کہ میں نے قومی مفاد میں ایسا کیا تھا میں اس کا کوئی معاوضہ نہیں چاہتا اور عملاً وہ سیاست سے کنارہ کش رہے۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار پنجاب یونیورسٹی سے وظیفہ یاب ہونے کے بعد انقرہ یونیورسٹی میں چلے گئے ان سے قبل استاذی ڈاکٹر عبادت بریلوی اس یونیورسٹی میں اردو کا شعبہ قائم کر چکے تھے اس لئے ان کے اس کہے کی کیا وقعت رہ جاتی ہے کہ ''انقرہ میں نئے شعبہ کی بنیاد رکھنی میرے مقدر میں تھی'' (صفحہ ۳۰۴) کہیں ایسا تو نہیں کہ قبلہ ڈاکٹر صاحب دوسروں کے کئے ہوئے کام کا سہرا اپنے سر باندھنے کی عادت میں مبتلا ہیں؟

یہ خودنوشت ڈاکٹر صاحب کے مزاج کی آئینہ دار ہے حیرت ہے کہ اتنے برس اہل علم کے جلو میں رہنے کے باوجود انہوں نے اپنی عادات کو ترک نہیں کیا۔ ادب کے استاد کی خودنوشت ہو اور ادب سے معری؟ بسوخت عقل ز حیرت کہ این چہ بوالعجبی ست!

◎

زندگی کی یادیں

ریاست رامپور کے وزیراعظم نواب سر عبدالصمد اور بیگم ہر ہائینس رفعت زمانی آف رامپور کی بہن جہاں آرا حبیب اللہ کی خودنوشت ''زندگی کی یادیں۔ ریاست رامپور کا نوابی دور'' آکسفرڈ والوں نے اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ۲۰۰۳ میں شائع کی ہے۔ یہ خودنوشت لکھنؤ اور رامپور کے تہذیب وتمدن کی ایک نادر دستاویز ہے۔ ان کی والدہ نواب لوہارو کے خاندان سے تھیں جو بیاہ کر رامپور آئیں اور پھر وہیں پیوند خاک ہوئیں اس لئے ریاست لوہارو کے نوابین اور مرزا غالب کا ذکر بھی جہاں تہاں موجود ہے۔ پیدائش سے لے کر موت تک ان نوابین کی زندگی ایک کڑے ثقافتی بندھن میں جکڑی ہوئی تھی۔ قدم قدم پر رسوم ورواج کی پابندی کرنا ان کا شیوہ تھا۔ ان کے خدمت گاران کی تہذیبی رسوم سے آشنا تھے اور اپنے مخدوموں سے ان کی پابندی کرواتے تھے۔ عورتوں کے لئے پردہ میں رہنا اور صرف زنانہ محفلوں میں جانا لابدی تھا مگر نواب سر عبدالصمد کے گھر کی خواتین نے پہلی بار پردہ ترک کیا اور پھر اپنی ایک بہن کے علاج کے لئے یورپ کا سفر بھی اختیار کیا۔

جہاں آراء حبیب اللہ نے اپنے سفروں کا صرف تذکرہ کیا ہے اگرچہ جب اپنی آپا جان بیگم رامپور سے ملنے گئی ہیں تو انہوں نے بھی فرمائش کی کہ اپنے سفروں کا حال ضرور قلمبند کرنا مگر وہ حال صرف اجمالاً بیان ہوا تفصیل معرض بیان میں نہیں آئی۔ غرض یہ کتاب اس تہذیب رامپور کی تہذیبی تاریخ ہے۔ نوابین کا لباس ان کی عادات ان کے مشاغل ان کی رقص وسرود کی محفلیں اور ان کے مصاحب ان کے اعزا واقربا۔ ان کے عقائد ان کی محرم کی مجلسیں اور تعزیئے ان کی عزاداری اور ان کی علم دوستی۔ لکھنؤ کے اجڑنے کے بعد تمام اہلِ علم اور اہلِ کمال رامپور میں آگئے اور ریاست نے ان کی قدردانی کی۔ ان اہل کمال میں موسیقی کے استاد اور فن طباخی کے رکابدار بھی شامل تھے۔ ہمیں تو حیرت اس بات پر ہے کہ بیگم حبیب اللہ موسیقی کے رموز واسرار سے پوری طرح آشنا ہیں۔ رقص کی جزئیات

ان کی نگاہ میں ہیں۔ پکے راگوں کا انہیں پورا علم ہے۔ رامپور کے کھانوں کی بھی دھوم ہے اور بیگم صاحبہ نے کھانوں کے ذکر میں بھی خاصی دلچسپی دکھائی ہے۔ خواتین کا کھانوں اور کھانوں کے لوازمات سے آشنا ہونا تو دور کی بات نہیں مگر جس تفصیل سے مختلف کھانوں کے ذائقوں اور تیاریوں کا ذکر ہوا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔

یہ خودنوشت بتاتی ہے کہ محلات کے اندر کی ان بیگمات کی تربیت میں اس بات کا لحاظ رکھا جاتا تھا کہ موسیقی اور رقص کے علوم سے بھی انہیں بہرہ ور رکھا جائے تاکہ وہ بھی مردوں کی طرح موسیقی کی محفلوں سے پورا لطف اٹھا سکیں۔

ریاست رامپور کا شہرہ کسی زمانہ میں کسی اور سلسلہ میں بہت سننے میں آیا تھا شرر کے ناول ''دربار حرام پور'' کے بارہ میں کہا جاتا تھا کہ وہ اسی دربار کے کسی قصہ پر مشتمل ہے مگر بیگم جہاں آرا کی خودنوشت سے جس رامپور کا تاثر ابھرتا ہے وہ ایک متمدن اور مہذب ریاست کا تاثر ہے۔

جوش ملیح آبادی نے اپنے پردادا نواب فقیر محمد خاں گویا کے حالات میں لکھا تھا کہ انہوں نے کسی نواب رامپور کی مدد کی تھی اور انہیں ان کا غصب شدہ تخت واپس دلوایا تھا اور یہ کہ جوش صاحب نے اس معاملہ کی ساری خط وکتابت ریاست کے دارالانشاء میں پڑھی تھی (یادوں کی بارات صفحہ ۳۳۳)۔ یہ زمانہ نواب حامد علی خاں کا زمانہ تھا جن کا اور جن کے خلف الرشید نواب رضا علی خاں کا ذکر اس خودنوشت میں ہے۔

بیگم جہاں آرا کا تعارف پاکستانی قارئین کے لئے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کے چھوٹے بھائی لفٹیننٹ جنرل صاحبزادہ یعقوب خاں پاکستان آرمی کے بڑے نیک نام جرنیل تھے اور اپنے دادا جرنیل عظیم الدین خاں کی روایتوں کے امین تھے۔ یہ خود بھی تقسیم ملک کے وقت پاکستان آگئیں اور اپنے شوہر اشاعت حبیب اللہ چیئرمین پاکستان ٹوبیکو کمپنی کے ساتھ کراچی کی سماجی زندگی میں بھرپور حصہ لیتی رہیں۔ سرکاری طور پر دعوتیں ہوتیں تو انہیں ضرور مدعو کیا جاتا کیونکہ ان جیسا لباس اور ان جیسے زیورات عام خواتین کے پاس تو نہیں ہوتے۔ مگر خواتین کا مقام محض لباس اور زیورات کی وجہ سے ہی تو نہیں ہوتا ان کی شخصیت بڑی بارعب اور باوقار شخصیت ہے۔

یہ کتاب آکسفرڈ پریس والوں کی عمدہ روایات کی امین ہے نہایت عمدہ کاغذ نہایت اعلیٰ کتابت مگر ایک سہو، ان سے ایسا ہوا جس نے ساری کتاب کے حسن کو گہنا دیا وہ ہے غالب کے شعر کی غلط کتابت۔ ڈھونڈے ہے اس مغنّیِ آتش نفس کو جی۔ جس کی صدا ہو جلوہ برقِ فنا مجھے۔ کاتب صاحب نے مغنّی کو "منحنی" لکھ دیا ہے گویا غالب کو کسی منحنی آتش نفس کی تلاش تھی!

◎

پاپ بیتی

اشفاق نقوی نے اپنی خودنوشت "پاپ بیتی" کو ایک اور طرح کی آپ بیتی کہا ہے اور یہ بات باون تولے پاؤ رتی کی ہے۔ اس دور میں جب ہر شخص نے اپنی شخصیت پر نیکی اور پارسائی کا ملمع چڑھا لیا ہے ایک معصوم، نیک دل اور صاف باطن رند کی رندانہ بسر کی ہوئی زندگی کی روداد چھپنا واقعی ایک معجزہ ہے۔ جس طرح ملبوس لوگوں کے ہجوم میں ایک ننگ دھڑنگ شخص نمایاں ہو جاتا ہے اور عجیب لگتا ہے اسی طرح اشفاق نقوی نیکی کا سوانگ بھرنے والے معاشرہ میں اپنی برہنہ گفتاری کی وجہ سے اجنبی لگ رہا ہے اور اس اجنبی کی صاف گوئی ہی اس کی خودنوشت کا جوہر ہے۔ پہلی بار جاپان کے عوامی غسلخانہ میں اپنے الف ننگے دوستوں شاگردوں کے ہجوم میں جب ہمیں لباس برہنگی اختیار کرنا پڑا تو جو کیفیت ہوئی وہ یاد کر کے ہمیں اب تک پسینہ آ جاتا ہے مگر اشفاق نقوی کی خودنوشت کہہ رہی ہے پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے اس حمام میں ہر کوئی ننگا ہے۔ یہ برہنہ گفتاری ایک رندِ پاک باطن کے سوا اور کس کو میسر آتی ہے؟ سنا کرتے تھے رند منافق نہیں ہوتے اشفاق نقوی کی آپ بیتی اس بات کا بین ثبوت ہے۔ ہمیں کشفی ملتانی کا یہ شعر بہت اچھا لگتا ہے کہ رند بخشے گئے قیامت میں۔ شیخ کہتا رہا حساب حساب!! جن رندوں کا ذکر کشفی صاحب نے اس شعر میں کیا ہے اشفاق نقوی یقیناً ان میں سے ایک ہوں گے۔ عطاء الحق قاسمی کی باتوں کا ہمیں کبھی یقین نہیں آیا مگر لگتا ہے اس پاپ بیتی کے پچھلے ورق پر اس کی لکھی ہوئی باتیں واقعی درست ہیں اور عطا صرف عطایئے ہی نہیں لکھتا عبدالماجد دریابادی بھی بن سکتا ہے۔ سچی باتیں لکھنے والا۔ مایہ آزاریِ شود والا۔

اردو کی جتنی خودنوشتیں اب تک ہمارے مطالعہ میں آئی ہیں یہ پاپ بیتی ان میں منفرد ہے۔ اگر اس میں بعض فنی خامیاں موجود نہ ہوتیں تو ہم بلا تردد اسے بہترین خودنوشت کہہ دیتے اور مولویوں کی دشنام طرازی کا مورد بنتے جو ہم ویسے بھی بنتے رہے ہیں اور بنتے رہتے ہیں۔ این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنم۔ اس خودنوشت کی سب سے بڑی خامی تو اس کی تفصیلات ہیں یعنی وہی انگریزی کی بات

total recall of memory کی کوشش۔ اس صورت حال میں یادداشت غیر متعلق باتوں کو راہ دیتی چلی جاتی ہے اور بعض اہم باتیں رہ جاتی ہیں۔ متعدد جگہ ایسا ہوا ہے کہ لکھنے والے نے رک کر فراموش شدہ باتوں کا ذکر کیا ہے اور کئی باتیں اپنے سیاق وسباق سے ہٹ کر بیان ہوئی ہیں۔ علمائے ادب کا کہنا ہے کہ انسان کا حافظہ صرف چیزوں کو یاد ہی نہیں رکھتا غیر ضروری تفصیلات کی کانٹ چھانٹ بھی کرتا رہتا ہے اس لئے خودنوشت لکھتے ہوئے اگر کوئی شخص ہر چیز کو یاد کرنے اور بیان کرنے کی کوشش کرے تو اس میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوسکتا۔ لہذا خودنوشت کا اصل اصول یہ ہے کہ لکھنے سے قبل لکھنے والا اپنے ذہن کو مجتمع کرے اور پھر غور وخوض کے بعد بیان کرنے کی باتوں کو بیان کرتا چلا جائے اور غیر ضروری باتوں کو چھوڑتا چلا جائے۔ اس عمل میں اس کا حافظہ پورا مستعد رہتا اور اس کا ساتھ دیتا ہے ورنہ کئی مقامات پر اسے بعض باتوں کے بیان کرنے سے روک بھی دیتا ہے مگر مکمل باز آفرینی کی کوشش کی صورت میں حافظہ ردعمل کا اظہار کرتا ہے۔ لکھنے والا لکھ چکے تو پھر اسے احساس ہوتا ہے کہ میں نے اتنا رطب ویابس کیوں اکٹھا کرلیا ہے۔ لکھنے کے بعد کانٹ چھانٹ کرنے کی کوشش عام طور سے کامیاب نہیں ہوتی اور خودنوشت یادوں کے چمن کی بجائے یادوں کا طومار بن جاتی ہے ایسا چمن جس میں جھاڑ جھنکاڑ بہت ہو اور گل وگلزار کمتر۔

اشفاق نقوی کی اس خودنوشت کو ہی لیجئے جونا گڑھ کے حالات علیحدہ کتاب میں بیان کر چکے ہیں اس کتاب میں ذکر، ذکر مکرر ہے اور خاصی تفصیل کے ساتھ۔ اتفاق سے میں وہ پہلا ذکر بھی پڑھ چکا ہوں اس لئے اس حرف مکرر نے وہ لطف نہیں دیا۔ روداد حیات میں اس کا بیان ضروری تھا اس لئے لکھ تو گئے ہیں مگر خود بھی مطمئن نہیں ہیں۔ سعودیہ گئے ہیں تو عربی الفاظ کے تلفظ میں الجھا کر قاری کا بہت سا وقت ضائع کیا ہے۔ اس امر کو بیان کرنے سے ان کو کون سی ذہنی آسودگی ملی ہے؟ نہ بیان کرتے تو کیا کمی رہ جاتی؟ اسی طرح قبلہ والد گرامی کے ذکر خیر میں جو جاسوسی کہانی لکھ کر انہوں نے حکایت والوں سے انعام حاصل کیا ہے وہ اس خودنوشت میں شامل کر دینے سے اس خودنوشت کو کون سے چار چاند لگ گئے ہیں؟ عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ غیر ضروری اور غیر متعلق واقعات کا بیان خودنوشت کے اصول کے خلاف ہوتا ہے اے کاش نقوی صاحب اس امر کا لحاظ رکھتے!

نقوی صاحب کی بہنوں کا کہنا ہے کہ ان کی پیدائش پر ماں نے پانچ برس روزے رکھے کیونکہ انہوں نے منت مان رکھی تھی۔ نجومی کا زائچہ یہ کہتا تھا کہ انہیں پانچ برس پانی سے بچا کر رکھا جائے (صفحہ ۴) یہ نجومیوں کے زائچے بھی خوب ہوتے تھے۔ ہم نے جسٹس مہر چند مہاجن سابق چیف جسٹس ہندوستان کی خودنوشت پڑھی ہے ان کے زائچہ کے مطابق انہیں گیارہ سال تک باپ کی شکل نہیں دیکھنا تھی اور نہیں دیکھی۔ ان کی پرورش اجنبیوں میں ہوتی رہی کہ کہیں باپ کی نظر نہ پڑ جائے۔ بچپن کی باتوں کے بارہ میں ان کا کہنا ہے کہ بہنوں سے سنی ہوئی ہیں۔ ایک بات اور بھی کہی ہے کہ ان کی بہن سلیمہ کو ہسپتال میں داخل کروایا گیا تو ساتھ کے کمرہ میں نواب شاہنواز کا انتقال ہو گیا (صفحہ ۱۹)۔ ان نواب شاہنواز کو انہوں نے بیگم شاہنواز کا میاں بتایا ہے۔ نواب شاہنواز نواب آف ممدوٹ تھے۔ نواب افتخار حسین خاں ممدوٹ کے والد۔ بیگم شاہنواز کے میاں تو میاں شاہنواز تھے لاہور کی میاں فیملی والے اور نواب نہیں کہلاتے تھے۔ اس مرنے والے کا تصفیہ بھی کرلیا جاتا تو مناسب تھا۔ یہ سطور پڑھتے ہوئے قارئین کو اندازہ ہو جائے گا کہ مکمل باز آفرینی کی کوشش میں کیسی کیسی قباحتیں در آتی ہیں۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ میٹرک میں ان کی سیکنڈ ڈویژن آئی اور چوہدری محمد حسین کی وساطت سے وہ گورنمنٹ کالج میں داخل ہوئے (اپنا گریباں چاک صفحہ ۴۹)۔ نقوی صاحب کا کہنا ہے کہ ''جاوید اقبال۔۔۔ پاس تو ہو گیا مگر اتنے نمبر حاصل نہ کرسکا کہ گورنمنٹ کالج میں داخلہ کی جسارت کر سکے۔ مگر ہمارے اس زمانے کے پرنسپل جی ڈی سوندھی کہاں گوارا کر سکتے تھے کہ علامہ اقبال کا بیٹا ان کے کالج میں نہ آئے۔ اس خیال سے کہ ممکن ہے جاوید داخلہ کے لئے درخواست ہی نہ بھیجے وہ خود علامہ اقبال کی میو روڈ والی کوٹھی پہنچ گئے اور جاوید کو گھر بیٹھے داخلہ دے آئے'' (صفحہ ۲۹)۔ ہمیں ڈاکٹر جاوید اقبال کی خودنوشت پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ شکوہ رہا کہ وہ اپنے والد محترم کے احسانات کو قبول نہیں فرماتے اور اس حقیقت سے فرار چاہتے ہیں۔ نقوی صاحب کی بات ہماری تصدیق کرتی ہے کہ علامہ اقبال کا مرتبہ اور مقام ہر ہندوستانی کے دل میں خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلمان اتنا ارفع تھا کہ وہ ان کی اولاد کی بہتری کا خواہاں تھا اور جاوید اقبال صاحب کو جو کچھ ملا اس میں ان کے والد گرامی کے مقام کا بھی حصہ ہے محض جاوید اقبال صاحب کی قابلیت اور لیاقت کا صلہ نہیں ہے۔

جونا گڑھ کے حالات میں ایک مشاعرہ کا ذکر ہے، جس میں کسی جاگیردار نے ایسا ٹھاٹھ کا شعر پڑھا کہ انہیں اب تک یاد ہے اور قارئین کو بھی شاید یاد رہے ''ہزاروں سر ہیں اور اک آستاں ہے۔ وہاں سجدوں کی گنجائش کہاں ہے''! وہاں کی ایک سنگ لرزاں کی مسجد کا بھی ذکر ہے (صفحہ ۶۵) ایسی ہی سنگِ لرزاں کی مسجد ہمارے پڑوس کے شہر چنیوٹ میں بھی ہے جسے نواب سعد اللہ خاں نے بنوایا تھا جو دربار مغلیہ میں وزیر اعظم تھے۔

اسی سفر کی روداد میں لکھا ہے کہ انہیں جونا گڑھ پہنچنے سے پہلے راجکوٹ میں اتار لیا گیا اور وہاں سے پولیس کی حفاظت میں آگے روانہ ہوئے (صفحہ ۴۲) چالیس صفحے کے بعد صفحہ ۸۲ پر بھی یہی واقعہ مکرر درج ہے۔ جس سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ لکھنے بیٹھتے ہیں تو پہلے سے لکھے کو پڑھے بغیر اگلا حصہ لکھنا شروع کر دیا ہے۔

ریاست جونا گڑھ نے سر ظفر اللہ خاں کے مشورہ پر پاکستان سے الحاق کیا تھا الحاق کی دستاویز سر ظفر اللہ کی تیار کردہ تھی (صفحہ ۹۹) اور چودہ اگست کو جونا گڑھ پاکستان کا حصہ بن گیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ہندوستان کی شر پسندی تھی۔ نقوی صاحب سر شاہنواز بھٹو وزیر اعظم کے اے ڈی سی تھے۔ ''اکتوبر کی ۲۶ تاریخ کو نواب صاحب اور شاہی خاندان کے افراد طیارے کے ذریعہ کراچی روانہ ہو گئے'' (صفحہ ۱۰۸) نواب جونا گڑھ کے پاکستان وارد ہونے کی ایک روداد جناب مسرت حسین زبیری صاحب نے بھی اپنی خودنوشت میں لکھی ہے ''نواب جونا گڑھ اور ان کے خاندان کو پاکستان منتقل کرنے کے لئے فوری امداد کی درخواست موصول ہوئی۔ میں چونکہ سول ایوی ایشن کا انچارج تھا میں نے ایک ڈکوٹا فوری طور پر بھیجا۔ ڈکوٹا واپس پہنچا تو سول ایوی ایشن کے ڈائریکٹر آف آپریشنز نے مجھے نہایت پریشانی کی حالت میں بتایا کہ جب ڈکوٹا کا دروازہ کھلا تو اس میں سے چالیس کتے باہر نکلے ان کے ساتھ چودہ نوکر بھی تھے نواب صاحب اور ان کے خاندان کا کوئی فرد نہیں تھا۔ میں نے فوراً ڈکوٹا کو صاف کر کے واپس بھیجنے کا حکم دیا اور نواب صاحب اور ان کی فیملی انچوں کے حساب سے ہندوستانی فوج سے بچ کر نکلی۔ نواب صاحب طیارہ میں سوار ہو رہے تھے ادھر ہندوستانی فوجیں جونا گڑھ میں داخل ہو رہی تھیں بلکہ ایک بکتر بند گاڑی نے تو ڈکوٹا کا پیچھا بھی کیا۔ نواب صاحب نے کتوں کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھا۔'' (Voyage through History volume 11 p 64) میں

نہیں کہہ سکتا کہ نقوی صاحب نے نواب صاحب کی ہجرت کی جو تفصیل بیان کی ہے وہ کہاں تک درست ہے۔ نقوی صاحب کہتے ہیں وہ طیارہ ان کے بڑے بھائی لے کر آئے تھے زبیری صاحب کہتے ہیں وہ طیارہ سرکاری سول ایوی ایشن کا تھا۔ اور پھر سرکاری ریکارڈ تو یہ کہتا ہے کہ جناب نواب صاحب کے کتے پہلے آئے تھے نواب صاحب بعد میں۔!

ہاں وہ بات میں تسلیم کرتا ہوں جو نقوی صاحب نے لکھی ہے کہ ''سر شاہنواز بھٹو کہتے تھے ہندوستان انہیں زندہ نہیں پکڑ سکے گا۔ بھٹو صاحب نے انہیں تین زہریلے کیپسول دیئے تھے ایک ان کے لئے ایک ان کی بیوی کے لئے اور ایک ان کی بیٹی منور بھٹو کے لئے۔ کراچی کے ہوائی اڈہ پر اترتے ہی میں نے یہ کام کیا کہ منا سے وہ کیپسول واپس کرنے کو کہا وہ کہنے لگی میں کیوں دوں یہ میری ملکیت ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ زہر کا کیپسول ہے تو اس نے دے دیا اور میں نے اسے پاؤں سے مسل کر ضائع کر دیا'' (صفحہ ۱۱۲)۔

نصرت بھٹو سے ذوالفقار علی بھٹو کی شادی ان کے ابا سر شاہنواز بھٹو کی مرضی کے خلاف ہوئی۔ بھٹو صاحب شادی کر کے ایک ہوٹل میں اٹھ گئے۔ نقوی صاحب نے باپ بیٹے میں صلح کروائی۔ (صفحہ ۱۲۱) انہی ذوالفقار علی بھٹو کا یہ واقعہ بھی روایت کیا ہے کہ دوسرے الیکشن کے سلسلہ میں دورہ کرتے کرتے فیصل آباد سے بذریعہ کار سرگودھا آئے تو تھکے ہوئے تھے ان کے ساتھ وزیروں کی فوج ظفر موج تھی ان میں فیصل آباد کا رہنے والا وزیر بھی تھا جس کی اچھی خاصی لمبی داڑھی تھی۔۔۔ بھٹو صاحب نے سب کے سامنے ان وزیروں سے کہا ''حرامزادو اب تم بھی تو کچھ کرو'' (صفحہ ۳۴۰)۔ سعودی عرب میں ضیاء الحق کے ہمزلف بھی ان کے ساتھ تھے ضیاء الحق اردن سے ہر دوسرے چوتھے، عمرہ کے لئے ان کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ ایک بار ان کے ہمزلف نے ان سے کہا ''وہ مولوی پھر آ گیا ہے شام کو بور کرے گا کہیں باہر چلنے کا پروگرام بناؤ'' (صفحہ ۲۷۶)

چلئے بھٹو اور بھٹو کے ''تارا مسیح'' کی بہت باتیں ہو چکیں اب ان کی کارکردگی دیکھئے۔ سرگودھا بیس کے ویلفیئر افسر تھے۔ شکایت آئی کہ ایرمین میس میں گرم روٹی ملنے میں دیر ہو جاتی ہے اس لئے سٹیشن کمانڈر ردادو پوتا صاحب نے ان سے کہا اس کا تدارک کریں۔ ادھر ادھر معلوم کیا تو پتہ چلا کہ ربوہ میں ایسا انتظام ہے کہ جتنے بھی لوگ ایک وقت کھانے پر جمع ہو جائیں انہیں کھانا بھی گرم ملتا ہے اور روٹی

بھی۔ ہمارے سکول کے پرنسپل وائن کی وہاں کے ایک پروفیسر سے شناسائی تھی اس لئے میں نے انہیں ساتھ لیا اور تیس میل طے کر کے جا پہنچا ربوہ۔۔۔ انہوں نے وہاں کا ایس ٹی کالج دکھایا (نقوی صاحب کو تسامح ہوا کالج کا نام ٹی آئی کالج ہے یعنی تعلیم الاسلام کالج)۔ جہاں ایسے ایسے سائنسی آلات موجود تھے جو پنجاب یونیورسٹی کے پاس بھی نہیں تھے۔ یہ تمام عطیات سر ظفر اللہ خاں اور ڈاکٹر عبد السلام کے تھے۔ پروفیسر صاحب ہمیں اپنے مہمان خانہ لے گئے وہاں دیکھا تمام کمروں میں صاف ستھرے بستر لگے ہیں اور غسل خانوں میں بے داغ تولیہ کے علاوہ پیئرس سوپ کی نئی ٹکیہ پڑی ہے۔ خیر ہمیں تو ان کے باورچی خانہ سے غرض تھی۔ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ انہوں نے کوئیں کے رہٹ یا چرخی کی طرح کی چیز بنا رکھی ہے جس پر بیک وقت بہت سی روٹیاں لگ سکتی ہیں اور وہ رہٹ آگ کے اوپر مسلسل گھومتا رہنے سے روٹیاں تیار ہو کر اترتی رہتی ہیں۔ بس سرگودھا پہنچ کر میں نے ایسا ہی رہٹ تیار کرا کے نصب کرایا اور ایرمینوں کی شکایت دور ہوگئی''۔ (صفحہ ۳۵۳)۔ شکر ہے نقوی صاحب الحکمۃ ضالتہ المومن پر عمل پیرا رہے ورنہ کوئی کٹ ملا ہوتا تو ربوہ والوں کا تتبع کیوں کرتا؟ ٹی آئی کالج ہماری مادر علمی ہے اس لئے ہمیں تو اس مادر علمی کا ذکر پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ہمارے کالج میں فزکس کی پوسٹ گریجوایٹ کلاسیں تھیں اور یہ بات درست ہے کہ اس کی لیبارٹریوں کا اکثر سامان ڈاکٹر سلام صاحب کا دیا ہوا تھا مگر سلام صاحب نے اپنے نوبل پرائز کی ساری رقم جھنگ اور ضلع جھنگ کے کالجوں کو دے دی تھی خدا جانے کسی اور کالج نے بھی ان کی اس امداد سے فائدہ اٹھایا یا نہیں؟

عربی الفاظ کے اردو میں ہجے کرتے ہوئے انہیں مشکل پیش آئی ہے مگر یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا جس پر نقوی صاحب کئی صفحے ضائع کرتے۔ البتہ یہ ضرور محسوس ہوا کہ کتاب کی کتابت کے بعد اس کی پروف ریڈنگ سلیقہ سے نہیں ہوئی۔ قرعہ فال کو کم از کم دو مرتبہ کرہ فال لکھا گیا ہے (صفحہ ۴۵ اور ۴۱۲) منحنی کو منہنی اور مشکلات کو حل کرنے کی بجائے انہیں 'ہل' کیا گیا ہے مگر ۴۳۶ صفحے کی کتاب میں ایک آدھ کتابت کی غلطی تو رہ ہی جاتی ہے ہم نے تو ایسی کتابیں بھی دیکھی ہیں جو تمام تر کتابت کی غلطی ہی لگتی تھیں۔

غرض اشفاق نقوی صاحب کی یہ خودنوشت اپنی مومنانہ صاف گوئی اور منافقت سے مبرا احوال نویسی کی وجہ سے اردو کی خودنوشتوں میں ممتاز رہے گی۔

◎

حیات بقا

جناب ڈاکٹر محمد مظہر بقا استاد جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ کی خودنوشت ''حیات بقا اور کچھ اور یادیں'' زوّار اکیڈمی پبلیکیشنز کراچی کی جانب سے اپریل ۲۰۰۶ میں شائع ہوئی۔ بقا صاحب فاضل دیوبند ہونے کے علاوہ پی ایچ ڈی بھی ہیں۔ ایس ایم کالج کراچی، جامعہ سندھ حیدر آباد، کراچی یونیورسٹی میں پڑھاتے رہے اس کے بعد کوئی پندرہ بیس سال سے مکہ مکرمہ میں ہیں۔ میرا خیال تھا کہ دنیاوی تعلیم و تعلم نے ان کے اندر بیٹھے ہوئے فاضل دیوبند کو کسی حد تک معتدل بنا دیا ہوگا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے شوق سے علم تو حاصل کر لیا مگر اس علم کی روشن خیالی اور میانہ روی کو اپنے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیا۔ ان کے وجود کے اردگرد مذہبی تنگ نظری کی آکاس بیل لپٹی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی صاحب نے انہیں ''ہمارے مولانا'' کہا ہے۔

بقا صاحب کی خودنوشت کا ابتدائی حصہ تو ان کے خاندانی حالات، قبلہ والد محترم والدہ محترمہ اور دیگر عزیزوں کے حالات پر مشتمل ہے۔ جس سے ان کی شخصیت پر گہرے اثرات ہیں۔ والد محترم کی مار پٹائی اور تشدد کا خصوصی طور پر ذکر ہے مگر اس تربیتی سختی کے لئے اپنے والد محترم کے بہت ممنون احسان ہیں اور ہمیں یہ بات اچھی لگی ہے کہ جتنے بھی حج یا عمرے کئے ہیں ان کا ثواب والدین کو بخشتے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ (صفحہ ۲۸) اب رہا تربیت کے لئے مارنا پیٹنا تو وہ ہمارے معاشرہ کا حصہ تھا۔ خاص طور سے مذہبی رجحانات رکھنے والے والدین تو بچوں پر بے پناہ سختی روا رکھتے تھے۔ اس صورت حال میں بچے تنگ نظر اور متشدد نہ ہوں تو کیا ہوں؟ یہ خود بھی بڑے بیٹے پر سختی کرتے رہے لیکن باقی بچوں کو اس لئے نہ مارا پیٹا کہ خود اپنے ہاتھ کو بہت چوٹ آتی تھی۔

فاضل دیوبند ہوئے اس کے بعد رفتہ رفتہ میٹرک ایف اے بی اے اور ایم اے کیا عربی جزو بدن بن گئی تھی اس لئے راستے کھلتے چلے گئے۔ مگر ان کی تقریر کا یہ عالم ہوگیا کہ جہاں کسی سند کی

ضرورت ہوتی ہے فوراً صحابہ کے زمانہ کی طرف دوڑتے ہیں۔ مگر طبیعت میں جو عادتیں راسخ ہوئی ہیں ان کا ذکر کرنا نہیں بھولتے۔ بچپن میں بغیر ٹکٹ ریل کا سفر کیا کرتے تھے۔ اس کامیاب ذریعہ سفر کے لئے مجرب نسخے بھی درج کئے ہیں مگر حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ بغیر ٹکٹ سفر کرنے کو ثواب سمجھتے تھے اور "چونکہ حضرت مولانا (حسین احمد) مدنی رحمتہ اللہ علیہ کی وجہ سے ننانوے فیصد طلبا کانگریسی تھے اس ذہنیت کے مطابق انگریزی حکومت کو نقصان پہنچانا کار ثواب تھا۔ اس لئے ہم نے اس طرح کی جو حرکتیں بھی کیں وہ نیک کام سمجھ کر کیں" (صفحہ ۹۰)۔ جو کام ہم نے کیا از رہ ثواب کیا!

آسیبی اثرات کے قائل ہیں "میں آسیبی اثرات کا کبھی منکر نہیں رہا لیکن اتنا زیادہ قائل بھی نہ تھا کہ چھینک بھی آئے تو اسے آسیب کی طرف منسوب کردوں مگر میرے ساتھ ایسے واقعات پیش آئے کہ منکر بھی ہوتا تو قائل ہو جاتا" (صفحہ ۱۶۸)۔ اس کے بعد کئی ایسے واقعات بیان کئے ہیں کہ ان کی ضعیف الاعتقادی پر حیرت ہوتی ہے کہ اتنا پڑھا لکھا آدمی کس طرح لایعنی باتوں کا قائل ہو جاتا ہے اگر کواڑ بند کرتے ہوئے کسی کا انگوٹھا بھی دروازہ میں پھنس کر سیاہ ہو گیا ہے تو اسے بھی آسیب کا اثر خیال کرتے ہیں اور جب تک حاجی صاحب سے آسیب کا اثر دور کرنے کے لئے کیلیں لے کر مکان کے چاروں طرف گاڑ نہیں لیتے انہیں چین نہیں آتا۔

جن باتوں کو جائز نہیں سمجھتے ان پر رضامند ہو جاتے ہیں۔ ایک تاجر کتب نے ان سے کہا "آپ قرآن کریم کا ترجمہ کر دیجئے میں متن کے بغیر ترجمہ شائع کرنا چاہتا ہوں متن کے بغیر اگرچہ ترجمہ شائع کرنا جائز نہیں لیکن میں نے حامی بھرلی"۔۔۔ "اس زمانہ میں کچھ زیادہ ہی مالی پریشانی تھی پھر شیطان نے ضمیر کی آواز کو یہ کہہ کر بھی دبا دیا کہ میرا کام تو ترجمہ کرنا ہے گناہ گار تو وہ ہوگا جو اسے متن کے بغیر شائع کرے گا"۔ (صفحہ ۱۸۶) شاید باب الحیل ایسی ہی باتوں کی طرف راہنمائی کرتا ہوگا؟

جب یہ مفتی محمد شفیع صاحب کے پاس فتویٰ نویسی کا کام کرتے تھے احمدیوں کے خلاف ۱۹۵۳ کی ایجی ٹیشن کے وقت ایک استفتاء آیا "قادیانیوں کے خلاف اس تحریک میں شامل ہونے اور اس میں مرجانے کے کا شرعی حکم کیا ہے۔" مفتی صاحب نے فرمایا اس کا جواب نہ دو اور وجہ یہ بتائی کہ بعض مرتبہ اس طرح کے استفتاء کا مقصد واقعتہً شرعی مسئلہ دریافت کرنے کی بجائے یہ ہوتا ہے کہ مفتی کو فتنہ میں مبتلا

کیا جائے۔ لیکن اس سے قطع نظر شرعی صورت حال یہ ہے کہ دارالاسلام کی ادنیٰ تعریف یہ ہے وہاں مسلمان اس پوزیشن میں ہوں کہ اگر اسلامی قوانین نافذ کرنا چاہیں تو کوئی دوسری داخلی قوت انہیں اس سے روک نہ سکے۔ اس اعتبار سے پاکستان دارالاسلام ہے اور دارالاسلام کے خلاف اس طرح کی تحریک جائز نہیں" (صفحہ ۲۵۷)۔

ان کی خودنوشت کا دوسرا حصہ ان کے احباب اور علما کے ذکر اذکار پر مشتمل ہے مگر زیادہ تر سماعی باتیں ہیں۔ مولوی عبدالسلام صاحب دہلی کے مشہور بزرگ تھے ان کے بارہ میں انہوں نے جو کچھ کسی سے سنا اور اس کو بیان کر دیا اس سے شبہ ہوتا ہے کہ باقی احباب کے بارہ میں بھی ان کی باتیں محض شنید ہیں۔ ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی صاحب تو ان کے دوست ہیں مگر ان کی اکثر باتیں بھی اور ان کے اکثر خواب بھی انہوں نے روایت کئے ہیں توثق ان میں نہیں۔ "ایک خواب میں دیکھا کہ نعمانی صاحب کی بیٹی کی قبر میں چالیس چراغ ہیں صرف ایک چراغ بجھا ہوا ہے باقی سب روشن ہیں۔ معلوم ہوا کہ مرحومہ نے چالیس بچیوں کو قرآن پڑھایا تھا ان میں سے ایک لڑکی قادیانی تھی" (صفحہ ۳۴۵) یہ معلوم ہوا والی بات خود ان کی اپنی وضع کی ہوئی ہے کشفی صاحب نے یہ بات کسی اور سے بھی کہی تھی مگر انہوں نے اس ایک چراغ کے روشن نہ ہونے کی توجیہہ اور فرمائی تھی اور اس لڑکی کے قادیانی ہونے کا ذکر بہرحال نہیں تھا۔ مولانا صاف گوئی سے کام کیوں نہیں لیتے؟ ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی صاحب کے بعد ہم اوساکا کی زبانہائے خارجی کی یونیورسٹی میں پڑھانے کو گئے تھے اس لئے کشفی صاحب کا احوال ہم سے پوشیدہ نہیں۔ مولانا ماشاء اللہ اب تو خوش حال ہیں مگر جب ایسی کشادگی میسر نہیں تھی تو اس وقت انہیں ایک مجذوب کی کرامات نے بہت متاثر کیا تھا یہ بات ان کی قلم پر آ ہی جاتی ہے کہ اس وقت ان سے نیکی اور خاتمہ بالخیر کے لئے دعا کرنے کی درخواست کی اب پچھتاوا ہے کہ "شمع معمہ کا حل ہی پوچھ لیا ہوتا جس کا انعام ایک لاکھ روپیہ تھا" (صفحہ ۳۹۵)۔

غرض مولانا کی خودنوشت ان کے ظاہر و باطن کے احوال بیان کرنے کی خاصی فراخدلانہ کوشش ہے۔ ایک ایسے عالم کی سرگزشت جس کا دنیا دار مرا نہیں مگر اس کی دینداری پر حاوی بھی نہیں۔

جنت سے نکالی ہوئی حوا

جنت سے نکالی ہوئی حوا، محترمہ نفیس بانو شمع کی خودنوشت ہے جو ۱۹۹۸ میں آبشار پبلیکشنز۔ جامعہ نگر دہلی سے شائع ہوئی۔ نفیس بانو کی اس خودنوشت کے پہلے سینتیس صفحات پر مختلف ادبا اور نقاد حضرات کے توصیفیے درج ہیں۔ اس کے بعد مصنفہ کی اپنی کہانی شروع ہوتی ہے جسے وہ ''اپنی بازیافت کی کوشش'' (صفحہ ۴۰) سے تعبیر کرتی ہیں۔

کتاب کے دائیں فلیپ پر ان کی جانب سے ان کے پیرومرشد صوفی لیاقت حسین شاہ صاحب کا ذکر ہے۔ لکھتی ہیں ''آپ سے نسبت کا شرف مجھے اس عالم میں حاصل ہوا جب میں اضطراب ہیجان اور شدید مایوسی کا شکار تھی۔ اگر اس وقت مجھے پیر کی رہنمائی اور نسبت نہ ملتی تو پھر اللہ ہی جانے میرا کیا حشر ہوا ہوتا''۔ ان الفاظ کے ساتھ محترمہ نے اپنے عمر بھر کی کمائی ان کے حضور ہدیہ کی ہے۔

اس خودنوشت میں ایک دکھی عورت کی داستان نہیں کئی دکھی عورتوں کی داستان بیان ہوئی ہے۔ انہوں نے عورت ذات کی مظلومی کے حوالے سے جتنے افسانے بھی لکھے تھے وہ اس خودنوشت کا حصہ بنا دئے ہیں اور وہ الگ الگ محسوس بھی ہوتے ہیں۔ برصغیر جنوبی ایشیا میں عورت کے ساتھ جو سلوک ہوتا ہے وہ کسی سے بھی پوشیدہ نہیں۔ اس بیرحمانہ سلوک کے خلاف ہماری خواتین کا احتجاج بھی جاری رہتا ہے۔ خواتین کی جتنی خودنوشتیں ہمارے ہاں لکھی گئی ہیں ان میں سوائے حمیدہ اختر حسین کی ہمسفر اور محترمہ ادا جعفری بدایونی کی جو رہی سو بیخبری رہی کے باقی سب ہی عورتوں کی عمومی حالت کا نوحہ ہیں۔ کشور ناہید کی بری عورت کی کتھا، سارا شگفتہ کی نظمیں، اسی المیہ کی آئینہ دار ہیں۔ محترمہ نفیس بانو کی اس خودنوشت میں بھی ان کے اپنے دکھ درد کی کسک کم ہے دوسری عورتوں پر ہونے والے مظالم کا نوحہ زیادہ ہے۔

◎

کاروانِ حیات

''کاروانِ حیات'' جناب مشتاق احمد خاں، سابق ایجنٹ جنرل، مملکتِ آصفیہ حیدرآباد دکن کی داستان حیات ہے جو مصنف نے ۱۹۷۴ میں لاہور سے شائع کی۔ مشتاق احمد خاں صاحب کے والد گرامی جناب فخر یار جنگ حیدرآباد میں نظامت تنقیح وحسابات میں ملازم ہوئے اور ترقی کرتے کرتے وزارت مالیات تک پہنچے اس لئے انہیں نوعمری کے زمانہ سے حیدرآباد میں رہنے کا موقع ملا۔ وہاں کے تہذیب وتمدن کو انہوں نے بہت قریب سے دیکھا اور برتا۔ تعلیم کے لئے علی گڑھ میں بھیجے گئے جہاں ان کے ہم عصروں میں ڈاکٹر ذاکر حسین، رشید احمد صدیقی، غلام السیدین اور خواجہ منظور حسین تھے۔ اساتذہ میں ڈاکٹر ضیاء الدین، پروفیسر ایم ایم شریف، پروفیسر کریم حیدر لودھی اور اساتذہ میں نئے نئے شامل ہونے والے'' ملک غلام محمد بھی تھے جنہیں ان کی طبیعت کی مناسبت سے (طلبا نے) غلام محمد ''مغالطہ'' کا خطاب دے رکھا تھا۔ ایک دوسرا خطاب لارڈ ''نوز بری'' بھی رائج تھا جو غالباً ان کے جسمانی ڈھانچہ کے اس حصہ کے نمایاں ہونے کی مناسبت سے پڑ گیا تھا'' (صفحہ ۸۶)۔

جناب مشتاق احمد خاں کی خودنوشت اس لئے بھی بڑی اہم ہے کہ آپ نے حیدرآباد کی ثقافت اور نظام دکن کے دربار کی نہایت عمدہ تصویر کھینچی ہے جو کسی دوسری خودنوشت میں مجھے نظر نہیں آئی۔ دکن کی تہذیب پر سب سے عمدہ کتاب تو مرزا ظفر الحسن کی ''ذکر یار چلے'' ہے مگر اس کو چھوڑ کر بیشتر خودنوشتیں حیدرآبادی تمدن کی نامکمل تصویر کشی کرتی ہیں۔ مہاراجہ کشن پرشاد کا دربار مغلیہ تہذیب وتمدن کاشئی سمجھا جاتا تھا۔ جوش صاحب بھی اتنا سا لکھ کر آگے بڑھ گئے تھے کہ مہاراجہ کا ہر بن مو تہذیب میں گوندھا ہوا تھا مگر مشتاق احمد خاں صاحب نے جو لکھا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے'' یمین السلطنت مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے ہاں کئی بار جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک مرتبہ عید کے موقع پر ان کے ہاں ایک دلچسپ مغلیہ رسم بھی دیکھی۔ حیدرآباد کی رسم کے مطابق خدام نے سب مہمانوں کو عطر اور پان پیش کئے۔ جب میری باری آئی تو چوبدار پان کی تشتری لئے ہوئے میرے پاس سے گذر گیا۔ میں حیران تھا

کہ مجھے کیوں اس طرح نظر انداز کر دیا گیا۔ اتنے میں وہی چوبدار ایک خوبصورت زری کا بٹوہ چاندی کی تشتری میں رکھ کر لایا۔ جب میں نے ذرا ہچکچاہٹ کا اظہار کیا تو اس نے کہا ''یہ آپ کے لئے ہے''۔ میں نے وہ بٹوہ لے لیا اور کھول کر دیکھا تو اس میں چاندی کے ورق میں منڈھی ہوئی چکنی الائچی تھی۔ واپسی پر جب میں نے ابا جان سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے بتایا کہ مغلیہ دربار کی رسم تھی کہ باپ کے سامنے بیٹے کو پان نہیں دیا جاتا تھا'' (صفحہ ۶۸)۔

اب ذرا اس سراپا نخوت نظام کی اورنگ زیب عالمگیر کے مزار پر حاضری بھی دیکھئے۔ ''اعلیٰ حضرت نظام کی تشریف آوری پر جو منظر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ مسلمانوں کی گذری ہوئی شان وشوکت کا دل ہلا دینے والا منظر تھا۔ میر عثمان علی خاں اپنے عمائدین سلطنت اور درباریوں کے ساتھ پورے درباری لباس میں تشریف لائے اور احاطہ کے دروازہ پر رک گئے۔ ایک شاہی چوبدار نے جو مغلیہ دربار کا مخصوص لباس پہنے ہوئے تھا اورنگ زیب کے مزار کی پائنتی کھڑا ہوا تھا آواز بلند شاہی القاب پڑھنے شروع کئے ''محی الملت والدین اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ وغیرہ وغیرہ شاہی القاب ختم ہونے کے بعد جس انداز سے اس نے صاحبِ مزار سے نظام کی حاضری کی اجازت طلب کی وہ ہمارے لئے بڑی حیرت کا باعث تھی۔ اس نے یہ نہیں کہا والیء دکن سلام کے لئے حاضر ہے بلکہ یہ کہا ''عثمان علی خاں صوبہ دار دکن سلام کے لئے حاضر ہے''۔۔ ان الفاظ کو سن کر نظام ذرا سے توقف کے بعد اپنے درباریوں سمیت جلوس کی شکل میں آگے بڑھے جب مزار کے قریب پہنچے تو حیدر آبادی طریق سے جھک کر تسلیمات بجالائے اس کے بعد فاتحہ پڑھی پھر صدر دروازہ سے الٹے پاؤں واپس ہوئے'' (صفحہ ۱۷)

علی گڑھ میں ابھی سیکنڈ ائر ہی میں تھے کہ ان کے والد محترم نے انہیں انگلستان بھیجنے کا فیصلہ کیا اور آپ کیمبرج سے گریجوایشن کرنے کے لئے وہاں داخل ہو گئے۔ ساتھ میں بیرسٹری اور آئی سی ایس کے امتحان کی تیاری بھی کرتے رہے۔ بیرسٹری تو کر لی آئی سی ایس میں کامیاب نہ ہوئے اور واپس حیدر آباد چلے آئے۔ بچپن سے اپنے نانا جان کو ریلوے کی ملازمت کرتے دیکھا تھا اس لئے ریل کا محکمہ انہیں پسند تھا اچھی خاصی معقول رقم کی نوکری چھوڑ کر ریلوے میں سروس شروع کر دی اور سولہ سال کی سروس کے بعد ریلوے کے سب سے بڑے عہدے تک پہنچ گئے۔

کیمبرج میں ان کے ہم عصر میاں امین الدین سابق گورنر سندھ، ابوالحسن اصفہانی سابق سفیر

متعینہ واشنگٹن، جسٹس اے آر کارنیلیس، جلال الدین عبدالرحیم (جے اے رحیم) ایس ایم شریف، ڈاکٹر عمر حیات ملک سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، اکرام اللہ سابق سکرٹری خارجہ اور فخر الدین علی احمد سابق صدر ہندوستان تھے۔ انگلستان کے واقعات میں غلام السیدین اور سر مائیکل ایڈوائر کی ایک جھڑپ قابل بیان ہے۔ ''ہندوستان کی آزادی کے موضوع پر ایک جلسہ میں رسوائے عالم سر مائیکل اڈوائر نے تقریر کی اس کے بعد حاضرین نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جب سیدین کی باری آئی تو اس نے نہایت شستہ اور سلجھے ہوئے انداز میں سر مائیکل کے ایسے لتے لئے کہ ان سے کچھ کہتے بن نہیں پڑا۔ تقریر کے بعد سر مائیکل نے سیدین سے کہا ''نوجوان تم بہت اچھی تقریر کرتے ہو مگر مجھے اس کے بعض حصوں سے شدید اختلاف ہے''۔ سیدین نے بلا توقف جواب دیا ''سر مائیکل آپ کی رائے کے لئے آپ کا ممنون ہوں مگر مجھے آپ کی پوری تقریر سے مکمل اختلاف ہے'' یہ سن کر سر مائیکل اپنا سا منہ لے کر رہ گئے'' (صفحہ ۱۱۰)۔

اسی طرح ان کے قیام کے دوران مسٹر ''اے'' اور مسز رابنس کے معاشقہ کا شرمناک واقعہ بھی ہوا۔ یہ مسٹر اے مہاراجہ کشمیر ہری سنگھ تھے جو مسز رابنس کے معاشقہ کے چنگل میں پھنس گئے اور پھر انہوں نے انہیں عدالتوں میں گھسیٹا۔ مہاراجہ سرکار کے مہمان تھے اور حکومت برطانیہ کے یار وفادار تھے اس لئے حکومت بھی بہت پریشان رہی بالآخر ایک زر کثیر کے عوض اس بلا سے چھٹکارا حاصل کیا گیا۔ اور مہاراجہ خیر سے بدھو گھر کو آئے کی تصویر بنے ہوئے واپس ہوئے۔ مہاراجہ کے صاحبزادے ڈاکٹر کرن سنگھ نے بھی اپنی خودنوشت میں اس واقعہ کا سرسری سا ذکر کیا ہے۔ اگر اس وقت مسز رابنس اپنے مقدمہ میں کامیاب ہو جاتیں اور مسٹر اے کو بطور سزا معزول ہونا پڑتا تو شاید کشمیر کا مسئلہ اب کسی اور صورت میں دنیا کے سامنے آتا اور ہزار ہا بیگناہ کشمیریوں کا خون نہ ہوتا۔

۱۹۴۷ میں تقسیم ملک کے وقت انہیں پاکستان میں حیدر آباد کا ایجنٹ جنرل مقرر کیا گیا۔ یہ سفارتی عہدہ تھا مگر سقوط حیدر آباد کے بعد اس عہدہ کی اہمیت ختم ہو گئی۔ کراچی میں ان کے ابا کے دوست ملک غلام محمد صاحب پہلے وزیر مالیات تھے پھر گورنر جنرل تھے ان کے ساتھ ان کی جو ملاقاتیں ہوئیں وہ عبرت کا نمونہ ہیں۔ ''وہ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے حضور نظام۔ اکابر سلطنت اور حیدر آباد کے

نظم ونسق جس سے تین سال تک وہ خود بھی منسلک رہے تھے جلی کٹی سناتے رہے۔۔۔ ملک غلام محمد کا لہجہ اتنا تلخ تھا کہ عام حالات میں شاید میری حساس طبیعت اسے برداشت نہ کرتی مگر میں نے سفارتی طوق گلے میں ڈال رکھا تھا اس لئے قہر درویش برجان درویش خاموش رہنے ہی میں مصلحت سمجھی۔ (صفحہ ۲۴۱)۔ ان مخدوش حالات میں نظام کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ہندوستان ان کی ریاست کو ہڑپ کرنے پر کیوں تلا بیٹھا ہے۔

مشتاق احمد خاں ایک خفیہ مشن پر ہندو نام سے حیدر آباد بھی گئے اور واپس آ کر قائداعظم سے ملے قائداعظم نے جو کچھ فرمایا وہ یہ تھا ''تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ تاریخ میں ایسے لوگوں کا کیا حشر ہوتا ہے جو زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے فرار ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔'' ایک سفارتی نمائندہ کیلئے اپنے سربراہ مملکت کے بارہ میں ایسی بات سننا اور وہ بھی ایسے شخص کی زبان سے جو امت مسلمہ کا مسلّمہ اور قابلِ احترام لیڈر ہو ایک انتہائی تلخ تجربہ تھا اور میں قصر گورنر جنرل سے بہت افسردہ اور ملول ہو کر لوٹا'' (صفحہ ۲۴۲)۔ نظام کا خیال تھا کہ برطانیہ ان کی مدد کو ضرور آئے گا۔ نظام نے اپنے ایجنٹ متعینہ پاکستان کے ذریعہ برطانوی حکومت کو پیغام بھجوایا کہ نہرو نے سکندر آباد کی چھاؤنی پر جارحانہ قبضہ کی دھمکی دی ہے مگر اس کا کوئی جواب نہ آیا۔ حملہ ہوتے ہی نظام نے شاہ برطانیہ کو ایک نہایت دردمندانہ اپیل کی ''کیا ''یور میجسٹی اپنے یار وفادار کو بھارت کے رحم وکرم پر چھوڑ دیں گے؟'' (صفحہ ۳۶۹) اس کا بھی کوئی جواب نہیں آیا ''شاہ برطانیہ تو خیر کیا جواب دیتے برطانیہ کے وزیراعظم نے بھی اپنی اخلاقی ذمہ داریوں سے بداخلاقی کی حد تک گریز کیا''۔ اس طرح برطانیہ کا دو سو برس کا یار وفادار اس کی سیاسی مصلحتوں کی بھینٹ چڑھ گیا'' (صفحہ ایضاً)

حیدر آباد کا کیس سلامتی کونسل میں پیش ہوا مگر ہندوستان نے پولیس ایکشن کے نام پر ریاست پر قبضہ کر لیا۔ جب اس کیس کی سماعت کا وقت آیا تو سوائے پاکستان کے وزیر خارجہ کے کوئی اور اس کیس کی وکالت کرنے والا موجود نہیں تھا۔ وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خاں تو ہر ممکن مدد انہیں دیتے رہے مگر گورنر جنرل کا رویہ ان سے مخاصمانہ ہی رہا۔

پاکستان پولیس کے ایک افسر سمیع محمد خان نے اپنی خودنوشت ''عمر گزشتہ'' میں میر لائق علی وزیر اعظم حیدر آباد کی پاکستان میں ہوائی جہاز سے پراسرار طریق سے آمد اور غلام محمد سے ان کی ملاقات کا

ذکر کیا ہے۔ (عمر گزشتہ صفحہ ۱۹۸) مشتاق احمد خاں صاحب کی خودنوشت میں اس ملاقات کا ذکر نہیں کیا میر لائق علی کی آمد ورفت حیدر آباد کے ایجنٹ جنرل سے بھی پوشیدہ تھی؟

۱۷ اکتوبر ۱۹۴۸ کو انہیں سقوط حیدر آباد کے بعد نظام کا ایک فرمان بھی موصول ہوا کہ فوراً واپس حیدر آباد آ جائیں اور اس دوران کوئی بیان اخبارات کو جاری نہ کریں۔ ظاہر ہے یہ فرمان جنرل، چوہدری کے ایما سے جاری ہوا تھا اس لئے یہ نہیں گئے اور جاتے تو شاید یہ کتاب لکھنے کے لئے موجود نہ ہوتے۔

خواجہ ناظم الدین کے گورنر جنرل ہونے کے زمانہ کی بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''ایک دن خود خواجہ صاحب نے ٹیلیفون کر کے مجھے کھانے پر بلایا۔ کھانے پر سوائے میرے اور سٹاف کے لوگوں کے اور کوئی نہیں تھا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد خواجہ صاحب نے ایک معاملہ کے بارہ میں مجھ سے استفسار کیا۔ میری وضاحت پر وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گئے کہ وہ نوابزادہ لیاقت علی خاں سے اس معاملہ پر بات کریں گے۔ اس واقعہ سے مجھے یہ تاثر ملا کہ انہیں جمہوری قدروں کا پاس ہے اور وہ بلاوجہ ذمہ دار حکومت کے معاملات میں دخل انداز نہیں ہوتے'' (صفحہ ۲۸۷)

مشتاق احمد خاں کی ایجنٹ جنرل کی سفارتی پوزیشن اپنی اہمیت کھو بیٹھی اور پھر انہیں پاکستان میں اپنی روزی حاصل کرنے کے لئے بہت سی نوکریاں بھی کرنا پڑیں۔ حیدر آباد میں ریلوے کے انتہائی اعلیٰ افسر تھے یہاں بھی غلام محمد نے انہیں ایسی ہی مگر اس عہدہ سے کمتر نوکری پیش کی جسے آپ نے مسترد کر دیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ شاید ان کی سفارتی پوزیشن بہتر ہو جائے مگر نہیں ہوئی۔ پنجاب روڈ ٹرانسپورٹ کے چیرمین کی نوکری کی مگر معاہدہ سے قبل مستعفی ہو گئے۔ مغربی پاکستان روڈ ٹرانسپورٹ کے جنرل مینیجر بنے کراچی روڈ ٹرانسپورٹ کا کام کیا غرض کئی نوکریاں کیں تا کہ روزی سے لگے رہیں مگر اپنی آن بان کا سودا نہیں کیا۔

ان کی یہ خودنوشت ایک حوصلہ مند شخص کی خودنوشت ہے جس نے کامیابی وکامرانی کی زندگی گذاری مگر اپنے ملک کی خاطر نامساعد حالات کو بھی ثابت قدمی سے انگیز کیا صاف ستھری زبان میں لکھی ہوئی یہ خودنوشت پڑھنے کی چیز ہے۔

◎

یادکی رہ گزر

"یاد کی رہ گزر" محترمہ شوکت کیفی کی خودنوشت ہے جو دانیال والوں نے ۲۰۰۶ میں کراچی سے شائع کی ہے۔شوکت کیفی مشہور ترقی پسند شاعر کیفی اعظمی کی شریک حیات ہیں۔ان کی روداد حیات ایک کامریڈ کی شریک حیات کی روداد ہی نہیں برصغیر ہند میں کمیونسٹ پارٹی کی ابتدائی جدوجہد کی دل آویز کہانی بھی ہے۔حیدر آباد کے سرمایہ دارانہ ماحول سے نکل کر آنے والی شوکت کیفی نے اپنی متاہلانہ زندگی کا آغاز بمبئی کے ایک کمیون سے کیا" کمیون کی دنیا میرے لئے ایک بالکل نئی دنیا تھی۔ پیپل اور کٹھل کے بڑے بڑے پیڑوں سے گھری ہوئی یہ جگہ بہت ہی خوبصورت تھی۔اور اس سے بھی خوب صورت تھے وہاں کے لوگ۔ روشن دماغ، انسان دوست، کچلے ہوئے پریشان حال بھوکے انسانوں کے لئے ایک نئی دنیا بنانے کی دھن میں جدوجہد کرتے لوگ۔ ہندوستان کے مختلف شہروں سے آئے ہوئے لوگ۔لیکن لگتا تھا سب ایک ہی خاندان کے فرد ہیں سبھی کامریڈ کامریڈ پکارے جاتے تھے اس وقت کامریڈ کا مطلب تھا مکمل آدمی" (صفحہ۲۷)۔

ان کی شادی بھی افسانوی انداز میں ہوئی۔ حیدرآباد کے ایک مشاعرہ میں دوسرے ترقی پسند شعرا کے علاوہ کیفی اعظمی بھی شریک تھے۔مشاعرہ کے بعد" کیفی کے چاروں طرف کالج کی لڑکیاں مکھیوں کی طرح جمع ہوگئیں"۔یہ آٹوگراف لینے کے لئے علی سردار جعفری کی طرف گئیں۔"کیفی نے اتنے ہجوم میں بھی کن انکھیوں سے مجھے سردار جعفری کی طرف جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔۔۔کیفی نے میرے آٹوگراف پر نہایت مہمل سا شعر لکھ دیا۔میں نے ناراضگی سے پوچھا آپ نے اتنا خراب شعر میرے آٹوگراف بک پر کیوں لکھا؟ کیفی شرارت سے مسکرائے اور کہا آپ نے پہلے جعفری صاحب سے آٹوگراف کیوں لیا؟" (صفحہ۴۰) شوکت نے خاندان والوں کی مرضی کے خلاف ان سے شادی کا فیصلہ کرلیا۔ پھر وہ ہوا جو ہمارے معاشرے میں ہونا ممکن ہی نہیں۔کیفی نے انہیں اپنے خون سے

جو محبت نامہ لکھا وہ انہوں نے اپنا ابا کو دکھا دیا۔۔۔ابا کہنے لگے" بمبئی چل کر آپ خود فیصلہ کیجئے کہ آپ کیا چاہتی ہیں اگر آپ کو ان کی زندگی پسند آئی تو میں آپ کی وہیں شادی کردوں گا ماں اور بہن بھائیوں کو بتائے بغیر" (صفحہ ۶۰) اور وہ ان کو ہمراہ لے کر بمبئی آگئے۔وہاں بنے بھائی یعنی سجاد ظہیر کے گھر کیفی سے ان کی شادی کا فیصلہ ہوگیا۔جوش صاحب دولہا کے باپ بنے۔" مجھے سب سے زیادہ حیرت اس بات پر ہوئی کہ ان کے ماحول میں کسی نے اس بات کا بتنگڑ نہیں بنایا نہ مذاق اڑایا نہ مجھے یہ احساس دلایا کہ میں نے کوئی شرمناک بات کی ہے نہ کسی نے مجھے حقارت سے دیکھا ہر بات بالکل نارمل تھی۔میں نے سوچا یہ ماحول اس ماحول سے کس قدر مختلف ہے جو میں چھوڑ کر آئی ہوں جہاں کے لوگ چھوٹے ،دقیانوسی، پرانے قدروں کے حامی، انسانی کمزوریوں کو نظر انداز کرنے کی بجائے انہیں اہمیت دے کر تذلیل کرنے والے ہیں" (صفحہ۶۳)" شادی میں جوش ملیح آبادی، مجاز، کرشن چندر، مہندرناتھ، ساحر، پطرس بخاری اور ان کے چھوٹے بھائی ذوالفقار بخاری، وشوامتر عادل، سکندر علی وجد، عصمت چغتائی، سردار جعفری، سلطانہ آپا، رفعت سروش، میرا جی وغیرہ شریک ہوئے۔۔۔۔ (صفحہ ۶۸)۔" دوسرے دن جوش کی محبوبہ نے منہ دکھائی میں دو روپے دئے۔۔۔جوش صاحب اور بنے بھائی اباجان سے مل کر بے حد خوش تھے بنے بھائی تو اباجان کے فین ہوگئے تھے کہنے لگے" اس دور میں اتنا ترقی پسند اور reasonable آدمی کم دیکھنے میں آتا ہے" (صفحہ۷۰)۔

شادی کے بعد یہ کیفی کے ساتھ اندھیری کمیون میں چلی گئیں اور پھر ایک سچے کامریڈ کی طرح کمیون کا حصہ بن گئیں۔" ہم کمیون پہنچے اپنے کمرے میں آکر میں نے پیار سے اس کا بکھرا پن اور غریبی دیکھی سب سے پہلے جھاڑو لے کر آئی جھاڑو دی ان کی کتابوں کو جھٹک کر صاف کیا نیچے اخبار بچھائے اس پر گدا اور رنگین چادر بچھائی جھلنگا پلنگ نکال باہر کیا ایک چھوٹی سی میز اور کرسی بھی تھی انہیں سلیقہ سے ایک طرف رکھا میز پر کتابیں رکھیں چائے پینے کے لئے ایلومونیم کا ایک گلاس بھی تھا اس میں کچھ پھول پتے لگادئے المونیم کے جگ کو خوب چمکایا۔۔۔صبح سویرے میں نے باہر جاکر کمیون کا جائزہ لیا دیکھا آنگن میں ایک بڑا سا چائے کا پتیلا انگیٹھی پر چڑھا ہوا ہے کامریڈ اپنے اپنے مگ میں چائے لئے اخبار کھولے پڑھنے میں مصروف ہیں کسی کی نظر مجھ پر پڑ جاتی تو ہیلو کامریڈ کہہ کر پھر اخبار پڑھنے

میں مصروف ہو جاتا۔۔۔ (صفحہ ۷۱) ''آہستہ آہستہ مجھے احساس ہونے لگا کہ یہ دنیا حیدرآباد کی دنیا سے بالکل مختلف ہے ان لوگوں کا رشتہ چند انسانوں سے نہیں بلکہ ساری انسانیت سے بندھا ہوا ہے۔ یہ اپنے گھر اپنی بیوی بچوں کا اتنا نہیں سوچتے جتنا مزدور کسان اور محنت انسانوں کے بارے میں سوچتے ہیں اس کا مقصد انہیں اس استحصال کرنے والے سرمایہ دارانہ نظام کے پنجۂ غصب سے چھڑانا ہے'' (صفحہ ۷۵) ''پی سی جوشی میرے کمرے میں آئے خاکی رنگ کا نیکر سفید رنگ کی آدھی آستینوں والی شرٹ پہنے ہوئے تھے۔ میں گھبرا کر کھڑی ہوگئی ابھی تک میں نے انہیں اتنے قریب سے نہیں دیکھا تھا رنگ کھلتا ہوا سانولا، نمکین، نیک چہرہ، لگتا تھا کہ محبت کرنے والے آدمی ہیں۔ پوچھا تمام دن کیا کرتی رہتی ہو؟ میں نے شرما کر کہا کچھ نہیں۔ وہ مسکرائے اور بہت ہی نرم لہجے میں کہا'' کمیونسٹ شوہر کی بیوی کبھی بیکار نہیں رہتی اس کو اپنے شوہر کے ساتھ پارٹی کا کام کرنا چاہئے پیسے کمانے چاہئیں اور بعد میں بچے ہوں تو انہیں اچھا شہری بنانا چاہئے تب ہی وہ مکمل کمیونسٹ کی بیوی بن سکتی ہے'' (صفحہ ۷۸) یہ تو تقسیم ملک کے وقت کی یعنی ۱۹۴۷ کی باتیں تھیں۔ بعد کی بات ہے ان کا ایک بیٹا پیدا ہوا اور آٹھ مہینے کا ہو کر مر گیا۔ ۱۹۴۹ میں بمبئی آئیں تو کمیون ٹوٹ چکا تھا سب مفلس کامریڈ ے۔ سیکری بھون میں بس گئے تھے (یہ سردار جعفری کا ٹھکانہ تھا) شبانہ ہونے کو تھی اس لئے میں تو بہت خوش تھی لیکن پارٹی کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ آرڈر ہوا ''ابارشن کروا دیا جائے'' کیونکہ کیفی انڈر گراؤنڈ ہیں میں بے روزگار ہوں بچے کی ذمہ داری کون لے گا مجھے بے حد تکلیف پہنچی۔۔۔ بہت قیل و قال کے بعد آخر پارٹی نے مجھے بچہ پیدا کرنے کی اجازت دے دی'' (صفحہ ۹۹)

میں نے یہ طول طویل باتیں اس لئے درج کی ہیں کہ اس وقت کے ماحول اور کمیون اور کمیونسٹوں کامریڈوں کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔ ان لوگوں کو داد دینا پڑتی ہے کہ اپنے مقصد کی خاطر چھوٹی چھوٹی اور بڑی بڑی قربانیوں کے لئے تیار رہتے تھے۔ کیفی چونکہ ''ہول ٹائمر'' تھے اس لئے شوکت کیفی ملازمتیں کرتی رہیں اور اِپٹا یعنی انڈین پیپلز تھیٹر میں اداکاری کر کے اپنا اور بچوں کا خرچ چلاتی رہیں۔ غربت میں بسر ہوئی مگر اپنے بچوں کو غربت کا احساس نہیں ہونے دیا۔ یہ داستان ایک حوصلہ مند کامریڈ ماں کی سرگزشت ہے۔

کیفی اعظمی کا اصل نام اطہر حسین زیدی تھا وہ لکھنؤ کے قریب ایک قصبہ مجواں کے رہنے والے تھے ان کے گھر کا ماحول شاعرانہ تھا باپ بھی شاعر تھے بھائی بھی۔ مگر اخلاقیات پر بہت زور تھا۔ ایک بار ایک بزرگ ان کے گھر بیٹھے تھے کیفی پاس سے گذرے اور انہیں سلام نہیں کیا۔ ابا نے بلا کر سرزنش کی اور پوچھا آپ نے ان کو سلام نہیں کیا؟ کیفی نے کہا میں نے انہیں دیکھا نہیں تھا ابا نے کہا کوئی بات نہیں بعض اوقات ایسا ہو جاتا ہے ''اچھا اب ایسا کرو جو سامنے تاڑ کے درخت ہیں جاؤ باری باری سب کو سلام کرو'' (صفحہ ۸۷) اس سلام سے صدیق سالک کی بات یاد آئی ان کی ٹریننگ کے لئے جو سارجنٹ مقرر تھا وہ انہیں سلیوٹ کرنے کا طریق سکھا رہا تھا۔ یکایک اسے خیال آیا کہ سالک صاحب تو کیپٹن ہیں وہ نرا سارجنٹ ہے وہ سلیوٹ لینے کا حقدار نہیں اس نے ان سے کہا آپ سامنے کھڑے کھمبوں کو اپنا افسر سمجھ کر سلیوٹ کرتے رہیں میں مزید ہدایات لے کر واپس آتا ہوں، صدیق سالک نے لکھا ہے بس ''اس وقت سے اب تک میں سینئر کھمبوں کو سلیوٹ کر رہا ہوں''۔

پھر ان کی کمیون کی زندگی کی طرف واپسی۔ سردار جعفری صاحب کا کمیون ریڈ فلیگ ہال تھا اس کے ایک کمرے میں جعفری صاحب اور ایک کمرہ میں کیفی صاحب رہتے تھے۔ لکھتی ہیں ''ان نو برسوں میں مجھے ان کی انسان دوستی رحم دلی اپنے بیوی بچوں بہنوں سے پیار دیکھنے کا موقع ملا (صفحہ ۱۱۴) اپٹا کے سب لوگ پرتھوی راج کو پاپا کہتے تھے۔ ان کا ذکر'' وہ بے انتہا رحم دل تھے۔ ایک مرتبہ کلکتہ میں ایک ورکر جس کا نام ڈھونڈو تھا اسے ہیضہ ہو گیا۔ پرتھوی راج کسی میٹنگ میں باہر گئے ہوئے تھے دن کے ڈیڑھ بجے تھے اس کی الٹیوں اور فضلے سے کمرہ بے حد گندہ ہو گیا تھا۔ ہم لڑکیاں تو ڈر کے مارے اس کمرے کے آس پاس بھی نہیں جا رہی تھیں۔ جب پرتھوی جی باہر سے آئے تو کسی نے کہہ دیا ڈھونڈو کو کالرا ہو گیا ہے۔ بس پاپا جی بغیر جوتے اتارے اس کے کمرے کی طرف بھاگے اور جا کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا ڈھونڈو کا جسم ٹھنڈا ہوتا جا رہا تھا مگر پاپا جی اسے ڈاکٹر کے آنے تک اس طرح لپٹائے رہے کہ اس کے جسم کو حرارت ملتی رہے۔ جب ڈاکٹر آیا تو اس نے کہا پرتھوی راج جی اس شخص کی جان صرف آپ نے اپنے جسم کی گرمی دے کر بچائی ہے ورنہ یہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا تھا'' (صفحہ ۱۳۰)۔

جب شبانہ اعظمی فلموں میں کام کر کے خوب مالدار ہو گئیں تو اپنے ابا کا بہت خیال رکھا۔ کیفی

صاحب اپنے گاؤں میں جا کر آباد ہو گئے اور شبانہ بی بی نے اپنے وسائل سے اس گاؤں کو بہت ترقی دی۔ وہاں ہائی سکول اور کمپیوٹر سنٹر کھلوائے۔ شبانہ ایم پی تھیں تو اپنے فنڈ سے اپنے علاقہ کو فیضیاب کیا۔ یہ تو کیفی صاحب کی اور ان کی بیٹی کی اپنے ملک کی خدمات تھیں ملک نے بھی ان کی قدر افزائی کی ساہتیہ اکیڈمی کا ایوارڈ انہیں دیا۔ یونیورسٹی میں ان کے نام سے میڈیا سنٹر کھولا۔ آل انڈیا کیفی اعظمی اکیڈمی بی جوان کے نام پر بڑا آڈیٹوریم تعمیر کروا رہی ہے۔ ان کے وطن کے علاوہ دہلی میں بھی ایک سڑک کا نام کیفی اعظمی روڈ رکھا گیا۔ کیفی کی وفات کے بعد اعظم گڑھ سے دہلی جانے والی ایک فاسٹ ٹرین کا نام کیفی کے مجموعہ اشعار کے نام پر ''کیفیات'' رکھا گیا۔ یہ باتیں لکھتے ہوئے میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ہمارے ہاں بھی تو فیض جیسا عظیم محب وطن شاعر موجود تھا۔ ہم نے تو اس کا داخلہ ٹی وی پر بند کر رکھا تھا اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی ہمارے ٹی وی والے اس کے جنازے کو کور دینے کے لئے بھاگے تھے مگر ایلس نے یہ کہہ کر ان کے منہ بند کر دئے تھے کہ اگر زندہ فیض ٹی وی پر نہیں آسکتا تھا تو مردہ فیض بھی ٹی وی پر نہیں آئے گا۔ اور یہ بات تو ہمارے وہم و گمان بھی نہیں آسکتی کہ ہمارے ملک کی کسی ٹرین کا نام ''دستِ صبا'' ایکسپریس ہو سکتا ہے۔

غرض شوکت کیفی کی یہ خودنوشت ایک سے زیادہ وجوہات کے سبب ہمارے ادب کی اچھی خودنوشت سمجھ جائے گی۔ ہم ان کے نظریات سے اختلاف کر سکتے ہیں مگر ان کی بیان کردہ باتوں کی سچائی پر حرف گیری نہیں کر سکتے۔

دنیا ساری خواب

مشہور سندھی شاعر شیخ ایاز کی سندھی میں لکھی گئی آپ بیتی کا اردو ترجمہ ''دنیا ساری خواب'' ۱۹۹۸ میں لاہور سے ''الفاظ'' والوں نے شائع کیا۔ یہ ترجمہ اسلم راحیل مرزا کا کیا ہوا ہے اور بڑا رواں دواں اور خوب صورت ترجمہ ہے جس میں شیخ ایاز کی ڈکشن کو بڑی چابک دستی سے قائم رکھا گیا ہے۔

شیخ ایاز کا کہنا ہے کہ ''میری یہ آپ بیتی ایک گھومنے پھرنے والے سیلانی کا مانند ہے جس کے رنگا رنگ آئینے منتشر رنگوں کے نقش و نگار تو بنا رہے ہیں مگر ان میں کوئی تسلسل نہیں ہے۔ شاعری میں تسلسل ''زلف جاناں'' کی علامت بھی ہوتا ہے اور زنجیر کا بھی مگر میں اپنی عمر کے اس حصہ میں پہنچ چکا ہوں کہ ان دونوں سے کنارہ کش رہوں تو بہتر ہے'' (ابتدائیہ میں شیخ ایاز کے ایک خط سے اقتباس) اس خط میں شیخ ایاز نے یہ بھی کہا ہے کہ ''میں سمجھتا ہوں کہ میں اپنی شخصیت کی بھرپور عکاسی کسی ''ڈاکٹر ژواگو'' جیسے ناول میں ہی کر سکتا ہوں۔'' میں سمجھتا ہوں شیخ ایاز کو ایسا ناول لکھنے کی ''فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملتی''، تو بھی وہ ایسا نہ کر سکتے کیونکہ ان کے اسلوب میں جو ''ایمائیت'' ہے وہ ڈاکٹر ژواگو نامی ناول کے اسلوب میں نہیں۔ ''بورس پیس ترناک'' کا ذہن کسی شاعرانہ تخیل کا متحمل ہی نہیں۔ یہ ناول قسمت کی ستم ظریفی کی وجہ سے دنیا کے نوبیل پرائز یافتہ ناولوں میں شمار ہونے لگا ہے ورنہ اپنے ملک میں اس کو پڑھنے اور سمجھنے اور قدر کرنے والے نہیں ملے۔ میں یہ بات اس لئے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کیونکہ جس سویڈش مصنفہ نے اس ناول کا روسی زبان سے سویڈش زبان میں ترجمہ کیا تھا وہ میری رفیق کار تھی۔ ایک ترجمہ انگریزی میں ہوا تھا مگر وہ ترجمہ روسی زبان سے نہ تھا روس کی کسی ملحقہ زبان سے ہوا تھا۔ جب اس ناول کو نوبل پرائز دینے کا اعلان کیا گیا تو روسیوں کو ''بورس پیسترناک'' کو تلاش کرنے میں کافی دقت ہوئی تھی کہ یہ کون صاحب ہیں اور مغرب کے سرمایہ دار لوگوں میں کیوں مقبول ہو رہے ہیں؟ روسی حکومت کی غیر ادبی حرکات کی وجہ سے یہ ناول زیادہ مشہور ہو گیا۔ جس طرح سلمان

رشدی کا ناول ''اشعارِ شیطانی'' ایران والوں کے غیر مناسب فتویٰ کی وجہ سے مشہور ہو گیا تھا اگر ایران والے ایسا سخت فتویٰ جاری نہ کرتے تو کوئی بھی نہ جانتا کہ سلمان رشدی کس باغ کی مولی ہے اور اس کا ناول اپنی موت آپ مرجاتا کیونکہ اس میں ناولوں والی کوئی بات نہیں حتیٰ کہ اس کا ترجمہ بھی ''آیاتِ شیطانی'' کیا گیا جو سیاق وسباق میں درست ہی نہیں تھا۔

شیخ ایاز کے ہاں جو ایمائیت ہے وہ ان کی شاعری کا غالب جزو ہے اور یہی ایمائیت ان کی نثر میں بھی ابھرتی ڈوبتی نظر آتی ہے ''ایمان کو اس نے خوف پر پرانی چادر کی طرح لپیٹ رکھا تھا'' (صفحہ ۴۶) ''موسم گرما کا دن تازہ سنگترے کی طرح کٹ کر دو آدھے آدھے ٹکڑے ہو گیا'' (صفحہ ۵۰) مترجم کا کمال ہے کہ اس نے ترجمہ میں ان کے الفاظ کی روح کو زندہ رکھا اور مرنے نہ دیا۔ ''شاعری کا تیسرا دور؟'' میں نے پوچھا ''بھئی قبل از مسیح اور بعد از مسیح اور بعد از تارا مسیح کا دور'' (صفحہ ۶۲)۔ ادوار کی کیا اچھی تقسیم ہے۔

شیخ ایاز کی آپ بیتی میں اپنے دور کی سیاسی اور سماجی زندگی کی سچی تصویر موجود ہے۔ سیاسی زندگی میں پیپلز پارٹی کے ''کیڑوں مکوڑوں'' (صفحہ ۸۵) سے لے کر قبل از تقسیم کے سندھ کے سیاسی ماحول کا تجزیہ موجود ہے۔ ان کا اپنا رجحان کمیونزم کی طرف ہے مگر کمیونزم نے ان کے آدرش کو بہت ٹھیس پہنچائی ہے۔ مقامی شراب پینے کے بعد ان کا ایک دوست ''ایک کھجور سے اپنا سر ٹکرانے لگا۔ وہ بار بار ایک ہی فقرہ دہرا رہا تھا ''آخر یہ چینی روسی آپس میں کیوں لڑ رہے ہیں''؟ میں نے اسے سمجھایا ۔۔۔کامریڈ خروشیف ماؤ سے نہیں لڑ رہا دراصل سٹالن اپنی موت کے بعد بھی روسی ذہن پر کچھ اس طرح چھایا ہوا ہے جس طرح ماؤ اس وقت چین پر چھایا ہوا ہے اور خروشیف ماؤ کا بت مسمار کر کے گویا سٹالن کا بت توڑ رہا ہے'' ۔۔۔ہم سب سو گئے سونے کے بعد اٹھے تو وہ ''کامریڈ اٹھ کر گھر کے اندر چلا گیا اور مائیکل شولوخوف کی کتاب ڈان بہتا رہا کا اردو ترجمہ لے آیا۔ ترجمہ سید مطلبی فرید آبادی کا کیا ہوا تھا۔ ۔۔۔میں نے کامریڈ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا اس کتاب کو لکھے ہوئے کتنے سال ہو چکے ہیں؟ کامریڈ نے کھاٹ کے پائے سے سر ٹکراتے ہوئے جواب دیا مگر تم یہ کیوں نہیں پوچھتے کہ میں نے کتنے سال تک اس نظریہ پر اعتبار کیا ہے۔ اس وقت میری عمر پچاس سال کی ہے اور میں اس نظریے

کے مطابق ایک بین الاقوامی برادری میں اس وقت سے اعتبار کرتا رہا ہوں جب کہ شولوخوف کا یہ ناول ترجمہ بھی نہیں ہوا تھا۔۔۔ وہ مجھے دھوکا دے گئے ۔۔۔ وہ میری زندگی کے پچیس سال چھین کر لے گئے پچیس سال مجھے فریب میں مبتلا کیا'' (صفحہ ۸۸) اگر وہ کامریڈ اب زندہ ہوتے اور یو ایس ایس آر کی ریاستوں کو بکھرتا دیکھتے تو خدا جانے وہ اپنا کیا حال کرتے۔ بہرطور شیخ ایاز کی آپ بیتی کا یہ اقتباس ان کے ذہن کو خوب کھول کر بیان کر رہا ہے۔ کمیونزم کے ساتھ ان کی وابستگی اپنی جگہ مگر ایک سچے دانشور کی طرح انہوں نے ایک کامریڈ کا سہارا لے کر اپنی کیفیت بیان کردی ہے۔

اب ایک پیارے کا ذکر۔ ان کے ایک دادا تھے ان کے ابا کے بڑے بھائی۔ ''وہ بڑے درویش صفت انسان تھے ہر رات وہ چکنی ملتانی مٹی میں لیموں کے درخت کے پتے ملا کر بھگور کھتے تھے اور علی الصبح مٹی کا یہ برتن لئے دو میل چل کر شکار پور کے مشہور سرخ بنگلے سے ایک میل آگے جا کر کنویں پر نہاتے تھے اور خواہ کتنی ہی سردی پڑ رہی ہو وہ وہاں جا کر ضرور نہاتے تھے۔ ایک دن وہ شدید سردی میں نہا کر واپس آئے تو انہیں اپنی قمیص کے دامن پر ایک چیونٹی رینگتی ہوئی نظر آئی انہوں نے چیونٹی کو چٹکی میں لے کر ایک شیشی میں ڈالا اور پھر میری دادی سے کہنے لگے میں کنوئیں پر واپس جا رہا ہوں ''کیوں تم ابھی تو واپس آئے ہو'' میری دادی نے حیرانگی سے پوچھا ''ہاں یہ چیونٹی میرے کپڑوں پر اسی کنوئیں سے چڑھی ہے اس کا گھر وہیں کہیں کنوئیں کے آس پاس ہی ہے اور میں اسے واپس اس کے گھر چھوڑنے جا رہا ہوں!'' میرے دادا کے بھائی نے جواب دیا ''کسی بھی جاندار کو اس گھر سے بے گھر کرنے سے بڑا گناہ اور کوئی نہیں'' (صفحہ ۹۷)۔

شیخ ایاز کے اسفار کا خاص طور سے روس کے اسفار اور اپنی خوب صورت ساتھی کا ذکر بڑے جمالیاتی انداز میں کیا ہے۔ سرکاری وفد کے ساتھ روس گئے ہیں تو اس وقت یہ وفد کے سربراہ تھے اور جام شورو یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ سفر سے قبل فیض کے ساتھ روسیوں کی سرکاری ضیافت میں شریک ہوئے۔ شیخ ایاز اور فیض صاحب کی یہ گفتگو قابل غور ہے ''میں نے فیض صاحب کو بتایا کہ احمد سلیم نے میری سندھی شاعری کے قریباً تین سو صفحات اردو شاعری میں ترجمہ کئے ہیں جو چھپنے کے لئے پریس میں دئے جا چکے ہیں اور میں نے انہیں بتایا کہ ترجمہ دیکھ کر مجھے اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ میری

شاعری کے ساٹھ فیصد الفاظ اور قافئے اس پنجابی ترجمہ میں بڑی آسانی سے کھپ گئے ہیں۔اس پر فیض صاحب نے کہا ہاں مجھے یہ بات معلوم ہے اور احمد سلیم کو میں نے ہی تمہارے پاس بھیجا تھا میں سمجھتا ہوں جتنی ہمدردی اور محبت سے آپ اس کے ساتھ چلیں گے اتنی محبت اور ہمدردی اسے پنجاب میں نہ مل سکے گی۔دراصل پنجابی کلاسیکل ادب اور جدید ادب کے ترجمے پنجابی زبان میں بھی ہونے چاہئیں دونوں کے درمیان سرائیکی ہے اور ان زبانوں میں کئی الفاظ مشترک ہیں اور بے شمار لفظوں میں صرف تلفظ کا تغیر و تبدل ہے‘‘ میں نے فیض کو بتایا کہ انسٹی ٹیوٹ آف سندھیالوجی کی طرف سے احمد سلیم کو شاہ عبداللطیف کے رسالے کا منظوم ترجمہ کرنے کا کام بھی سونپا گیا اور امداد حسینی کے سپرد پنجاب کی منتخب کلاسیکی شاعری کا سندھی منظوم ترجمہ کرنے کا کام کیا گیا ہے۔اس پر فیض صاحب مسکرائے اور کہا ایاز کیا تم پاکستان کو سندھ کی ثقافتی کالونی بنانا چاہتے ہو‘‘ (صفحہ ۸۱۔۸۲) یہ آپ بیتی ایک سچے دانشور کی آپ بیتی ہے اور پڑھنے کی چیز ہے۔

ایم ایف حسین کی کہانی اپنی زبانی

برصغیر کے نامور مصور ایم ایف حسین کی خودنوشت ’’ایم ایف حسین کی کہانی اپنی زبانی‘‘ احمد مقصود حمیدی کے زیر اہتمام دسمبر ۲۰۰۴ میں کراچی سے شائع ہوئی۔اس خودنوشت کے ساتھ ہر صفحہ کی مناسبت سے مصور کی بنائی ہوئی تصویریں بھی شامل ہیں۔مقبول ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے ان کی ماں ان کے بچپن کے ایسے مرحلہ میں انتقال کر گئیں کہ بچہ ابھی چہرہ شناسی کی عمر تک بھی نہیں پہنچا تھا اس المیہ کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں ہر عورت کا روپ ان کی ماں کا روپ ہے اور ہر عورت بے چہرہ ہے۔احمد مقصود حمیدی صاحب کے پیش لفظ کا پہلا فقریوں ہے ’’ذرا دیکھئے حسین صاحب کو موقلم کی جگہ قلم کان پر رکھ کر گھر سے نکل پڑے اور بنا انتظار کئے کہ کوئی ان سے خط لکھواتا چمن طرازیء داماں کرنے بیٹھ گئے اور ایسی شفاف نثر لکھ ڈالی کہ واہ! مگر حسین کی نثر ہے کہ ہمیں لمحے بھر کے لئے بھی بھولنے نہیں دیتی کہ وہ ایک مصور ہی نہیں بلکہ بہت بڑے مصور ہیں۔ان کی تصویرکشی ان کی نثر میں بھی نمایاں ہے وہ ایک طرح کی امیج اسٹ imagist یعنی تمثال دار نثر لکھتے ہیں‘‘۔

’’ماں‘‘ ان کے ہاں ہر جگہ موجود رہتی ہے صرف ’’ایک سفید ساڑھی سیاہ بیک گراؤنڈ پر دکھائی دیتی ہے۔۔۔سفید ساڑھی میں کوئی انسانی جسم نہیں کسی ماں کا چہرہ نہیں۔ساڑھی کے بارڈر پر نیلے رنگ کی دو دھاریاں یہ دنیا کی ایک مشہور دیوی منفرد مدر ٹریسا۔جن کی پہچان چہرہ نہیں ان کی بے پناہ محبت ہے‘‘ (صفحہ ۳۲) ایم ایف حسین یہی محبت دنیا میں بانٹتے پھرتے ہیں۔

ان کے دادا کی تیل کے چراغوں کی چھوٹی سی دکان تھی۔تین بچے تھے دو بیٹے فدا اور مراد ایک بیٹی تھی سلیمہ۔فدا میٹرک تک پڑھ کر مل میں ٹائم کیپر لگ گئے۔مراد پہلوانی کرتے رہے۔فدا کی شادی زینب سے ہوئی وہ ایک بیٹا چھوڑ کر سدھار گئیں۔ماں والا باب خود حسین کی زبان میں دیکھئے ’’مقبول کی ماں کیوں اپنی کوئی نشانی نہیں چھوڑ کر گئی؟ کیا بیٹے کو اس دنیا میں چھوڑ جانا ہی کافی سمجھا؟ کیوں باپ کے

جوتوں میں کھڑا کرا سے آنسوؤں بھری آنکھوں سے دیکھا کرتی؟ کتنی تمنائیں ہونگی۔ سب اپنے ساتھ لے گئی۔ بیٹا آج بھی جہاں کوئی مراٹھی ساڑھی ادھرادھر پڑی نظر آ جائے تو اس کی ہزاروں تہوں میں ماں کو ڈھونڈنے لگتا ہے۔ ڈھونڈتا ہے وہ ماں کا چہرہ جس کی دو آنکھوں میں نہ معلوم کتنے خواب ڈوبے۔ ڈھونڈتا ہے وہ سانس جس میں بچے کے سارے بدن کی بھینی خوشبو کھچ کر کلیجے کے اندر سما گئی اور باہر نہ نکل سکی۔ کہاں ہیں وہ ہونٹ؟ وہ ماں کی محبت کا جوالامکھی؟ وہ ممتا کے جسم کے ہر پور سے ابلتا ہوا بے پناہ پیار کا لاوا۔ شاید لڑکے کی یہی اندرونی کراہتی چنگاری دربدر ماری ماری پھر رہی ہے دنیا کا کونا کونا چھان مارا جنگل بیابان کے نقش کو کریدا۔ یہی کراہتی چنگاری انسانی تہذیب کی گپھاؤں میں گئی جمال اجنتا کی اپسراؤں سے ملی۔ موئن جودڑو کی زمین میں دفن ٹوٹے برتنوں کو ٹٹولا۔ کربلا کی تپتی ریت پر انگلی سے ''ابن زینب'' لکھا، نمرود کی نیفرطیطی سے پوچھا۔ ڈی میلو کی 'وینس' مائیکل انجلو کی 'پی یے تا' لیونارڈو داونچی کی 'مونالیزا' یہاں تک کہ پکاسو کی 'مادموزیل اوینیو' سے ملنے سے نہیں گھبرائی۔ آرٹ کی تاریخ میں کئی پینٹرز نے اپنی ماں کو کینوس اور کاغذ پر نقش کر کے فانی زندگی سے پرے ایک ایسی روح کے وجود کو منوایا جو ساری کائنات کی حقیقت ہے خدا کی تخلیق کا تنہا راز'' (صفحہ ۲۷ تا ۳۰)۔

ماں کی موت کے بعد دادا نے انگلی پکڑی اور ماں کی طرح بچے کا سہارا بنے اور ایسے بنے کہ۔

''ایک بار لڑکے سے کسی نے پوچھا تم کس سے پیدا ہوئے؟ اس نے جواب دیا'' دادا کے پیٹ سے'' (صفحہ ۴۵) اور'' یہ پندھڑپور کا لڑکا اندور جا کر مقبول پینٹر بنا بمبئی نے اسے ایم ایف حسین کا خطاب دیا۔ دلی نے پدم بھوشن سے سجی شال پہنائی۔ میسور اور بنارس یونیورسٹیوں نے ڈی لٹ کی ڈگری چپکا دی جب برلن اپنی فلم لے کر گیا تو اس نے اس کے پیچھے گولڈن بھالو (golden bear) لگا دیا'' (صفحہ ۲۷۴)۔ یہ مقبول فدا حسین کی زندگی کا خلاصہ ہے جو چھ برس راجیہ سبھا کے رکن بھی رہے۔

اس تجزیہ میں مصنف کے طول طویل اقتباس درج کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس کے اسلوب کا اندازہ ہو جائے۔ وہ لکھتا نہیں تصویریں بناتا ہے کیمرے کی طرح سنیپ شاٹس نہیں مصور کی طرح جزئیات سے مملو خاکے۔

لالٹین اس کا خاص استعارا ہے۔ ''یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ لالٹین کس ناز و انداز سے زمین پر ٹکتی

ہے اس کے پیندے کی گولائی سے اٹھتی دو متوازن بانہوں کے درمیان آہستہ سے دھری شیشے کی چمنی گنبد مینائی اور مکمل کرہ ارض کا ایک سمٹا ہوا اجالا''۔ (صفحہ ۱۳۲)۔

ہندوستان میں اس کے چار میوزیم قائم ہیں۔ ''پہلا میوزیم 'حسین کی سرائے' دلی کے قریب فرید آباد میں۔ دوسرا میوزیم 'حسین سنگکن' کورا منگلم بنگلور میں۔ تیسرا میوزیم 'امداوادنی گپھا' احمد آباد گجرات میں۔ چوتھا میوزیم 'آرٹ اور سنیما' حیدر آباد دکن میں'' (صفحہ ۲۳۱) بین الاقوامی طور پر اس کے آرٹ کی قدر ہوتی ہے وہ ملکوں ملکوں پھرا ہے اور نمائشیں کی ہیں۔ ''او میرے مقبول دیکھا تم نے ایم ایف کو؟ مگر مقبول میں تمہارے رنگوں کو پہچانتا ہوں جو تم بڑے پیار سے میری مٹی کی مورتیوں میں بھرتے ہو رنگین ہو رنگ ریز ہو بھی لیکن یہ ایم ایف تو بڑا انگریز ہے ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایجنٹ لگتا ہے مارکیٹنگ کا ماہر چالیس سال ہندوستان کی چار سمتوں میں اپنے میوزیم کھڑے کر دئے مگر ہم دونوں کو اس کی ایک بات اچھی لگی انگریز تو اپنی ہر چیز اٹھا کر اپنے گھر ولایت ساتھ لے گیا لیکن ایم ایف کیسے بھی ہیں یہیں کے ہیں ان کی ہر ادا ہر خطا ہماری ہے'' (صفحہ ۲۳۰)۔

''ڈر یہی ہے کہ آج کل جب کوئی بڑا اپنی داستان لکھنے بیٹھتا ہے تو آٹھ دس جلدوں سے اس کا پیٹ نہیں بھرتا جیسے اس کی زندگی کسی تیس مار خاں کی زندگی ہے جس سے آنے والی نسلیں سبق سیکھتی رہیں۔ میں نے مقبول سے یہ بات کہی وہ سمجھ بھی گیا مگر ایم ایف حسین کا کوئی ٹھکانا نہیں'' (صفحہ ۲۱۳)

پھر یہ اپنے ابتدائی سکول میں اپنی نمائش کرنے جاتے ہیں۔ ''نمائش کے آخری دن ان بائیس سٹوڈنٹس کو چنا جن جن کی نظریں تصویروں پر کچھ دیر تک ٹھہریں ادھر ادھر نہیں جھانکا۔ ان سے کہا گیا نمائش کی شروعات بے شک مدھیہ پردیش کے چیف منسٹر سے کراوئی گئی مگر تصویریں تم بائیس چنے ہوئے اسٹوڈنٹس کے ہاتھوں دیواروں سے اتاری جائیں گی۔ لڑکے لڑکیاں دوڑ کر اپنی اپنی پسند کی تصویر کے نیچے ٹھیک چھ بجے شام کو کھڑے ہو گئے تالیاں بجیں اور مقبول نے کہا اب تصویریں اتار لو لڑکے لڑکیاں پوچھنے لگے سر کہاں رکھیں؟ مقبول نے کہا'' اپنے اپنے گھر لے جاؤ'' (صفحہ ۲۲۷)

ایم ایف حسین لاہور بھی آئے۔ ''کل رات جاوید ڈرائیور کو یوں ہی فون کیا حسین آدھی رات گئے کیوں ایک سنسان گلی انارکلی سے ڈرائیو کرنا چاہتا ہے؟ اسی رات شاہی مسجد کے باہر دیوار سے لگے

ایک سنگ میل پر نظر پڑی۔ اس پر کھدا شاعرِ مشرق اقبال کا کلام ''نہ افغانیم نے ترک و تتاریم'' پاس ہی کھڑا ایک سنتری دور سے اس لئے دکھائی دیا کہ اس کا ہاتھ کلاشنکوف سے چمک رہا ہے یہ فوجی پہرا کیوں؟ اس کے سینے پر شمشیر وسناں کب تک؟ ابھی رات باقی ہے۔ جاوید ڈرائیور پوچھ رہا ہے ''کہاں چلوں''؟ اس کی ٹیکسی کی کیسٹ سے فیض کی آواز سنائی دی

''تم نہ آئے تھے تو ہر چیز وہی تھی کہ جو ہے

آسماں حدِ نظر راہ گزر، راہ گذر، شیشۂ مے، شیشۂ مے''

'خیابانِ اقبال' سے گذرے تو کوچۂ فیض کے بے چہرہ دریچوں کو جھانکا، تانگہ چلا رات چلی۔ کشور ناہید کی کہانی کے اوراق پر ایک کاغذ کورا نہیں چھوٹا۔ ان کا سفید دوپٹا ہی سہی۔ کاغذ نہ ملنے پر احمد فراز کی ضد پر دوپٹے پر حسین کا برش چلا'' (صفحہ ۲۰۲۔۲۰۳)

ایم ایف حسین کی مصورانہ اسلوب میں لکھی ہوئی سرگزشت اردو کی خودنوشتوں میں اپنے اندازِ سبک گوئی کی وجہ سے ممتاز رہے گی۔ ''آپ بیتی لکھنے میں یہی ایک بڑی کمی ہے اپنے منہ اپنی باتیں نہیں کرسکتے جو تھوڑی بہت اچھی ہوں جیسے محبت کی بات 'اک لفظ محبت کا اتنا سا فسانہ ہے۔ سمٹے تو دلِ عاشق پھیلے تو زمانہ ہے' اور ایم ایف حسین کا زمانہ ابھی ختم نہیں ہوا'' (صفحہ ۲۷۵) مقبول فدا حسین کا زمانہ!! اور یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ''حسین جیسے فنکار کو ایک سرسوتی کی تصویر بنانے پر جس لعنت ملامت کا سامنا کرنا پڑا تھا'' (میرے حصہ کی روشنائی از نور ظہیر صفحہ ۱۴) حسین نے اپنی خودنوشت میں اسے ذرہ بھر بھی اہمیت نہیں دی۔ فنکارانہ حوصلہ مندی اسی کو کہتے ہیں۔

◎

ڈی سی نامہ

''ڈی۔ سی نامہ'' محمد سعید شیخ کی آپ بیتی ہے۔ سعید شیخ پنجاب سول سروس کے افسر ہیں اور ان کے قول کے مطابق پی سی ایس افسروں کو ڈپٹی کمشنر اس وقت بنایا جاتا ہے جب ''اس کے سر کے آدھے بال سفید ہوجاتے ہیں'' (صفحہ ۵) حالانکہ ہم نے سی ایس پی کے کاڈر کے بعض ایسے ڈپٹی کمشنر بھی دیکھے ہیں جنہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ سیدھے کالج سے نکل کر چلے آرہے ہیں۔ پی سی ایس افسروں کی اس محرومی کا احساس ساری کتاب میں جاری وساری ہے۔ ''آج کل حالات ہی کیا انسان بھی بے اعتبارے ہوگئے ہیں کوئی بھی واقعہ جس پر ڈپٹی کمشنر کا بے شک کوئی اختیار نہ ہو یا پھر عوامی نمائندوں کی تسلی کے مطابق کام نہ کرسکتا ہو یا کوئی اور معمولی سی وجہ بھی ڈی سی کی تبدیلی کا باعث ہوسکتی ہے اور خاص طور پر اگر وہ ڈپٹی کمشنر پی سی ایس سروس سے تعلق رکھتا ہو تو اس کی پوزیشن اور بھی کمزور ہوتی ہے اور اسے ہر روز اپنی بقا کے لئے بھاگ دوڑ کرنی پڑتی ہے اور اس بھاگ دوڑ کے لئے بڑا وسیع تپتا ہوا صحرا اس کا منتظر ہوتا ہے اور کبھی اسے گھنگرو باندھ کر ناچنا پڑتا ہے'' (صفحہ ۳۱۹) شاہ مراد کرتھیا تھیا!!'' اس سیاسی بے یقینی کے دور میں پی سی ایس کیڈر کے ایک ملازم کے لئے ڈپٹی کمشنر لگنا مشکل ہے۔ وہ بھی اس آدمی کے لئے جو دوسروں سے مختلف تھا اسے اپنے مختلف ہونے کا دردناک حد تک احساس تھا'' (صفحہ ۱۸) ''پھر ضلع کی پولیس ہے جس کا ایس پی پہلے سے تین ڈسٹرکٹ کرچکا ہے اور جس کی اپنی پالیسی ہے اپنے مشاغل ہیں اپنا انداز ہے اور جو خود کو ڈی سی کا ماتحت تصور نہیں کرتا اور پھر اس پر پی ایس پی کا ٹھپہ لگا ہوا ہے جب کہ میرے نام پر پی سی ایس کی تہمت لگی ہے جسے کسی کلاس کی سپورٹ نہیں'' (صفحہ ۲۳۰)۔

سعید شیخ صاحب کی آپ بیتی ان کے پاکپتن میں تقرر سے شروع ہوتی اور ان کے ڈپٹی سکرٹری لیبر کی آبرومندانہ کلرکی پر تقرر سے ختم ہوجاتی ہے۔ پاکپتن میں تقرر کے لئے خشیت قلب سے

دعائیں کرتے رہے" اور انہیں ان دعاؤں کی قبولیت کا کوئی زیادہ یقین نہیں تھا" (صفحہ ۹) مگر اللہ تعالیٰ کا فضل ہوا ان کو پاکپتن شریف کی ڈپٹی کمشنری مل گئی مگر اس فضلِ الٰہی کو بجائے اللہ تعالیٰ کی عنایت سمجھنے کے انہوں نے یہی سمجھا کہ "باباجی نے بلالیا ہے" (صفحہ ۱۴)۔ دربار بابا فرید کے ساتھ ان کی وابستگی اور عقیدت حد سے بڑھی ہوئی ہے اور کہیں کہیں شرک کی حدوں کو جاچھوتی ہے مگر انما الاعمال بالنیات، مجھے وثوق ہے کہ ان کی نیت شرک کی نہیں ہوگی کیونکہ خدا خوفی ان کے ہاں موجود ہے۔ ہمارے ہاں بزرگوں کی درگاہوں اور مزاروں پر جو کچھ روا رکھا جاتا ہے وہ بزرگانِ سلف کے اعمال وافعال وروایات سے ہرگز ثابت نہیں۔

سول سروس میں داخل ہوئے تو اپنے گھر کے علاقہ یعنی تھانہ گوالمنڈی کے علاقہ مجسٹریٹ مقرر ہوئے۔ باپ نے دفتری اوقات کے بعد کسی کی ضمانت لینے کی سفارش کی مگر اپنے خود ساختہ اصول پر انکار کر دیا اس وقت باپ نے جس بیچارگی اور خفت سے بیٹے کو دیکھا وہ نظر انہیں نہیں بھولی کیونکہ بعد کی سروس میں انہیں سیاسی دباؤ پر اس سے بھی زیادہ ناجائز کام کرنا پڑے اور "جب نوکری کے اس نظام میں رہنے کے لئے قدم قدم پر سمجھوتے کرنے پڑے تو اپنے باپ کا وہ چہرہ یاد آتا رہا اس لئے کبھی اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکتا تھا اس نے اپنے باپ کو ان آئیڈیلز کے لئے دکھی کیا تھا جنہیں خود اس نے اپنے ہاتھوں توڑ دینا تھا اور پھر اس نے کئی راتیں کانٹوں پر گذارنا تھیں" (صفحہ ۴۸)

درگاہ پر وزیراعلیٰ کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑا تو انہیں خیال آیا "ان صاحبان اقتدار کو بابا صاحب کی چوکھٹ پر انتظار کرنا پڑا تو ٹھیک ہے ان صاحبان اقتدار کو بھی کہیں نہ کہیں کسی کے در پر جھکنے سرنگوں ہونے کا تجربہ ہونا چاہئے اور جھکنے سرنگوں ہونے کے لئے بابا فرید کے در سے بہتر آستانہ کون سا ہو سکتا ہے" (صفحہ ۱۱۶)۔ یہ ان کی عقیدت کی انتہا ہے ورنہ سوائے خدا کے اور کوئی در جھکنے کے لئے بنایا ہی نہیں گیا۔

آپ بیتی میں کچھ جرم وسزا کی باتیں ہیں کچھ خدمت خلق کی مسرتیں ہیں۔ کچھ سرکاری پیر ہیں جو سرکاری سرٹیفیکیٹ لئے پھرتے ہیں کچھ لوگوں کی درگاہ سے اولاد حاصل کرنے کی خواہشیں ہیں اور چاہنے نہ چاہنے کے باوجود حاضریاں ہیں۔ بہشتی دروازہ اور اس کے ساتھ وابستہ برکات کا بیان ہے اور یہ باتیں صرف اس لئے کہ یہ ڈپٹی کمشنر بڑا دیندار" اور ہمبل humble ہے۔" (صفحہ ۱۲۵) اکبر الٰہ

آبادی یاد آ گئے "اب ہمارے امام "حنبل" ہیں"۔

افغان جہاد میں شریک ہونے والے ایک مجاہد اور شہید کا ذکر ہے جس کے پیچھے دین کے ساتھ قربان ہو جانے کی لذت کا ذکر ہے شہید کی ماں کے قدموں کی خاک کو آنکھوں سے لگا لینے کی نیک خواہش ہے "میرا دل چاہا صوفی رفیق سے کہوں کہ "اس علاقہ کا ڈپٹی کمشنر اس ماں کے قدموں کی مٹی اٹھا کر اپنے ماتھے پر لگانا چاہتا ہے جس نے ایسے بچے کو جنم دیا" (صفحہ ۲۵۰) مگر اب جہاد اور افغانستان اور نوجوان شہیدوں کی قربانیاں سب طاق نسیان پر رکھی ہوئی ہیں اور سیاسی حالات اور زیادہ دگرگوں ہیں۔ جس جہاد کا ذکر ان کے ہاں ہوا ہے ۱۱ ستمبر کے حادثہ کے بعد اس کا تصور بھی بدل گیا ہے۔ ہمیں یاد ہے ہمارے ایک بزرگ نے جب کہا کہ اب تیغ وتفنگ کا جہاد منع ہے تو ساری دنیا پنجے جھاڑ کر ان کے پیچھے پڑ گئی کہ یہ اسلامی جہاد کو منسوخ کرنے کی مذموم کوشش ہے۔ اور اب یہی بات بش صاحب نے کہی تو لوگ اس پر آمنا وصدقنا کہتے ہوئے بش کی سی کہہ رہے ہیں اور بقول شخصے beating about the bush کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

غرض سعید شیخ کی آپ بیتی مختلف سیاسی پابندیوں اور روحانی وارداتوں کا ایک اچھا مجموعہ ہے خدا اس نیک نفس ڈی سی کو نیکی اور نیک نامی کا اجر دے۔ میں تو اس بات کو ہی سعید شیخ کی کامیابی سمجھتا ہوں کہ انہوں نے اپنی نیکی کو شہاب صاحب کی طرح عام عوام کے سامنے تماشا نہیں بنایا۔

◎

آپ بیتی

پریم چند نے اپنی کوئی خودنوشت بہ حیثیت خودنوشت سوانح قلمبند نہیں کی۔ مگر جناب مدن گوپال نے پریم چند پر تحقیق کرتے ہوئے ان کے'' مضامین یا افسانوں کی شکل میں پیش کی گئی یادداشتوں یا خطوط کے اقتباس کو اس طرح سے ایک مالا میں پرو دیا ہے کہ 'پریم چند کی آپ بیتی' بن گئی ہے (صفحہ ۶)۔ ان کے دیباچہ نگار مانک ٹالا لکھتے ہیں'' مدن گوپال صاحب نے بائیس جلدوں میں پریم چند کی مختلف تحریروں کہانیوں ناولوں ڈراموں کو اپنے عالمانہ مقدموں کے ساتھ مرتب کر کے انہیں کونسل (قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان) کو سونپ دیا ہے۔۔۔ اور کونسل نے انہیں شائع کرنے کا کام شروع بھی کر دیا ہے۔ ۱۹۳۲ میں پریم چند نے ماہنامہ ہنس کے'' آتم کتھا'' نمبر (خودنوشت نمبر) میں اپنی کشمکش حیات کی کچھ جھلکیاں اپنے مضمون 'جیون سار' میں پیش کی تھیں۔۔۔۔ پریم چند کی بہت سی کہانیوں اور ناولوں میں ان کے بچپن سے لے کر آخری عمر تک کے واقعات کی کہیں نہ کہیں جھلکیاں ملتی ہیں ان کے خطوط میں بھی ان کی زندگی سے وابستہ بہت سے حالات و حادثات کا ذکر ملتا ہے۔ ان کی شریکہء حیات شریمتی شیورانی دیوی کی کتاب ''پریم چند گھر میں'' بھی کچھ ایسے واقعات ملتے ہیں جن کا عام قاری کو قطعی علم نہیں تھا'' (صفحہ ۸۔۹)۔

مدن گوپال صاحب نے اپنے حواشی کو خط نسخ میں لکھا ہے اور پھر داستان کا سرا وہیں سے پکڑ لیا ہے جہاں پریم چند کی کہانی یا مضمون یا خطوط میں چھوڑا گیا تھا اس طرح قاری کو پریم چند کی باتوں اور مرتب کی باتوں کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ مشاہیر کی سوانح کو مرتب کرنے کا یہ انداز کوئی اجنبی انداز نہیں۔ ہمارے ہاں برادرم ڈاکٹر معین الرحمن مرحوم نے اسی اسلوب میں رشید احمد صدیقی کی خودنوشت مرتب کی تھی مگر اس میں مدن گوپال کی مرتب کی ہوئی پریم چند کی خودنوشت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ معین الرحمن صاحب نے مختلف ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک'' رلی'' تیار کی تھی (رلی سندھیوں کی اس چادر کو کہتے ہیں جو کپڑے کے چھوٹے چھوٹے رنگین ٹکڑے جوڑ کر تیار کی جاتی ہے اور یہ سندھ کی خاص

صنعت ہے) مگر مدن گوپال صاحب نے اپنے حواشی اور تبصرہ کو بھی جگہ دی ہے اس طرح بات زیادہ واضح ہو گئی ہے۔ اور اچھا کام یہ کیا ہے کہ گھریلو زندگی کی تصویر کشی کو مکمل بنانے کے لئے پریم چند کی بیوی شریمتی شیورانی دیوی کی کتاب سے مناسب اقتباس شامل کر لئے ہیں اس طرح پریم چند کی زندگی کی مکمل تصویر سامنے آ جاتی ہے۔ جس طرح اختر حسین رائے پوری کی خودنوشت'' گرد راہ'' بیگم حمیدہ اختر حسین کی'' ہمسفر'' کے بغیر ادھوری لگتی ہے اسی طرح شریمتی شیورانی دیوی کا کہا ہوا حصہ شامل نہ ہوتا تو یہ داستان ادھوری لگتی۔

پریم چند ہمارے ادب کا بہت بڑا نام ہے اس لئے اس کی سوانح مرتب کرتے ہوئے احتیاط کی ضرورت تھی اور مدن گوپال نے احتیاط کا پہلو نظر انداز نہیں کیا۔ یہ آتم کتھا پہلے ہندی میں چھپی بعد کو اردو میں شائع ہوئی اس لئے اردو زبان و بیان میں کہیں کہیں معمولی جھول نظر آتا ہے مگر کام کی اہمیت کے پیش نظر نظر انداز کرنے کے قابل ہے۔ جہاں جہاں ہندی لفظ آ گئے ہیں وہ بھی نگینے کی طرح جڑے ہوئے لگتے ہیں۔ زیادہ سونے والے کئے'' سلکڑ'' (صفحہ ۳۷) کا لفظ ہمیں تو بہت اچھا لگا، زیادہ بھولنے والا بھلکڑ ہے تو سونے والا سلکڑ کیوں نہیں؟

اپنے فن کے بارہ میں پریم چند کا بیان ہے'' میں جب تک کوئی افسانہ اول سے آخر تک ذہن میں جما نہ لوں لکھنے نہیں بیٹھتا کیرکٹروں کا اختراع اس اعتبار سے کرتا ہوں کہ اس افسانے کے حسب حال ہوں میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ افسانے کی بنیاد کسی پر لطف واقعہ پر رکھوں'' (صفحہ ۱۳۹) یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں فطرتی بہاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی حال ان کے ناولوں کا ہے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس میں پریم چند نے جو خطبہ صدارت پڑھا تھا وہ من وعن اس کتاب میں شامل ہے اور شامل نہ ہوتا تو پریم چند کی شخصیت کا بیان ادھورا رہتا۔ خودنوشت سوانح عمریوں میں اپنے مضامین یا خطبے شامل کرنا مستحسن نہیں سمجھا جاتا مجھے یقین ہے کہ پریم چند اپنی خود نوشت خود لکھتے یا مرتب کرتے تو اس خطبہ کا فلسفہ تو ضرور شامل ہوتا سارا متن شامل نہ ہوتا۔

بہر حال یہ خودنوشت پریم چند کی زندگی کی پوری پوری تصویر کشی کرتی ہے۔ اس کے لئے مدن گوپال صاحب کی محنت کی داد دینا چاہئے۔

◎

داستاں کہتے کہتے

ریڈیو پاکستان کراچی کے ایک ریجنل ڈائریکٹر جناب صبیح محسن کی یادداشتیں ''داستاں کہتے کہتے'' مکتبہء جمال گلستان جوہر کراچی کی جانب سے اپریل ۲۰۰۶ میں شائع ہوئی ہیں۔ اس میں جناب صبیح محسن نے کچھ شخصیات کا ذکر کیا ہے کچھ واقعات بیان کئے ہیں اور پھر ''ذاتیات'' پر اتر آئے ہیں یعنی کچھ ذاتی احوال و آثار کا ذکر کیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب ان کی یادداشتوں کا مجموعہ بن گئی ہے۔ ریڈیو والوں کی یادداشتیں ہمارے لئے ہمیشہ ہی دلچسپی کا باعث رہی ہیں۔ حمید نسیم کی ناممکن کی جستجو، ذوالفقار بخاری کی سرگزشت، عشرت رحمانی کی عشرت فانی، زبیر رضوی کی گردش پا اور اخلاق احمد دہلوی کی دو یادداشتی ادب کی کتابیں اور اب صبیح محسن صاحب کی داستاں کہتے کہتے۔ صبیح صاحب نے اپنے پیش رو براڈ کاسٹروں کا ذکر بھی بڑے احترام سے کیا ہے اور مناسب بھی یہی تھا مگر ہمیں اندازہ ہوا کہ آپ نے ان سے انصاف نہیں کیا۔ بخاری صاحب کی ریڈیو سے پہلے کی ملازمت کے بارہ میں بلا ضرورت ردوقدح کی ہے حالانکہ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ بخاری صاحب ریڈیو میں آنے سے پہلے شملہ میں منشی تھے، مولوی تھے یا چیف مولوی تھے۔ بخاری صاحب نے سرگزشت میں اس ملازمت کی تفصیل اسی لئے بیان نہیں کی کہ ایسی باتیں غیر ضروری ہوتی ہیں۔ صبیح محسن صاحب اس تفصیل کو بیان کر کے دراصل بخاری صاحب کا استخفاف چاہتے ہیں۔ ان کی معلومات کا ماخذ فاطمی صاحب ہیں جن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ رنجور صاحب کے نواسے ہیں۔ فاطمی صاحب کے کہنے کے مطابق ان کے والد کو کرنل بوائل نے جاتے ہی چیف مولوی مقرر کر دیا کیونکہ (وہ رنجور کے داماد تھے؟) یا ان کی ''وضع قطع مولویانہ تھی'' (صفحہ ۲۶) یہ بات غیر اغلب ہے کیونکہ ایسی جگہوں پر تقرر کرنا کسی ایک شخص کی صوابدید پر نہیں ہوتا تھا اس کا ایک معین طریق تھا۔ دوسری بات آپ نے یہ کہی کہ کرنل بوائل بخاری صاحب کی غیر از نصابی سرگرمیوں کو پسند نہیں کرتے تھے مگر اس کا کوئی ثبوت ان کے پاس نہیں ہے۔

بخاری صاحب کے کہنے کے مطابق کرنل بوائل تو انہیں وہاں سے فارغ کرنے کو تیار نہیں تھا۔ بخاری صاحب نے اپنے مترجم ہونے کا ذکر چھپایا نہیں اور کہیں اپنے ''چیف مولوی'' ہونے کے رتبے کا ذکر کیا نہیں۔ صبیح صاحب کیوں ایک غیر ضروری بات پر اپنا اور قارئین کا وقت ضائع کر رہے ہیں؟

ہمیں تو صبیح صاحب کی ایک بات سمجھ میں نہیں آئی وہ یہ کہ آپ ہمارے ہم عمر ہیں اور نومبر ۱۹۳۶ کی پیدائش ہیں یعنی ہم سے ایک مہینہ چھوٹے ہیں فرماتے ہیں ''۱۹۴۶ میں میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا'' (صفحہ ۳۹) صبیح صاحب دس سال کی عمر میں آٹھویں کلاس میں کیسے پہنچ گئے؟ معلوم ہوتا ہے آپ نے فسانہء آزاد پڑھنے اور سمجھنے کا ثبوت دینے کے لئے اپنی عمر بڑھا کر لکھ دی ہے؟ ورنہ خود ہی آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ''ہمارا میٹرک کا امتحان 1950 میں ہونے والا تھا'' (صفحہ ۲۳۷) گویا آنجناب ۱۹۴۶ میں چھٹی جماعت میں تھے اور یہی بات ٹھیک لگتی ہے۔

ان کے وطن مالوف کے ایک اور بزرگ سید شہاب الدین دسنوی کی خودنوشت ''دیدہ وشنیدہ'' بھی ہماری نگاہ سے گذری ہے وہ اپنے آپ کو دسنوی لکھتے ہیں اور جگہ بجگہ گاؤں کا نام دسنہ ہی لکھا ہے صبیح صاحب دیسنہ لکھتے اور پڑھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے وطن کے مشہور ہونے والے لوگوں میں صبیح محسن صاحب کا ذکر بھی کیا ہے۔ دسنہ کے سب سے مشہور تو مولانا سید سلیمان ندوی ہوئے۔ دسنہ کے کتب خانہ کا چرچا بھی ہر دو نے بہت کیا ہے اور یہ واقعی کسی قصبہ کے لئے قابل افتخار بات ہے۔ اب اس قصبہ کی لائبریری خدا بخش اورینٹل لائبریری کا حصہ ہے اور اہل ذوق کی کشش کا سامان!

صبیح محسن صاحب کا کہنا ہے کہ ''ریڈیو نے اپنے ابتدائی دور میں ایسے بہت سے افراد کو جن میں ادب کے حوالے سے بڑی اچھی تخلیقی صلاحیتیں موجود تھیں اپنے یہاں ملازمتیں دے کر خراب کیا'' (صفحہ ۵۱) ریڈیو کا ہر کارکن یہی کہتا ہے کہ ریڈیو کے لئے لکھی ہوئی تحریریں محض وقت کا ضیاع ہوتی ہیں اور یہ لوگ ''برباد'' ہوتے رہتے ہیں مگر اس کا حل کوئی نہیں بتاتا۔ یا ریڈیو والے ادبی دوڑ میں پیچھے رہ جانے کی وجہ سے ایسی توجیہات کر کے دل کو تسلی دیتے رہتے ہیں؟ خود صبیح محسن صاحب کو ادبی حیثیت میں وہ پہچان نہیں ملی جس کی انہیں توقع تھی۔ کیا اس کا الزام بھی وہ اپنی ریڈیو سروس پر ڈال دینگے؟ ریڈیو ہی برا ہے تو اکبر کی بات یاد رہنی چاہئے۔ عبث یہ ٹوہ ہے کیڑے پڑے کیوں۔ میں تم سے پوچھتا

ہوں تم سڑے کیوں؟

ایک براڈ کاسٹر کی کتاب میں پرانے دور کے ایک نامور براڈ کاسٹر کا ذکر ہو اور اس میں بعض واقعاتی غلطیاں راہ پا جائیں تو عجیب لگتا ہے۔ اول تو سید انصار ناصری صاحب کو مضمون میں تواتر کے ساتھ انصاری ناصری لکھا ہے (صفحہ ۱۲۱) دوسرے ان سے جو بات منسوب کی ہے وہ درست نہیں۔ ۳۔ جون ۱۹۴۷ کے تاریخی دن کا تذکرہ ہے جب قائداعظم سٹوڈیو میں تقریر کرنے کو تشریف لائے تھے۔ اس وقت ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل پی سی چودھری (صفحہ ۱۲۳) نہیں لکشمن صاحب تھے جن کا تقرر بخاری صاحب کی جگہ ہؤا تھا۔ (میرا بیان اخلاق احمد دہلوی صفحہ ۱۶)۔ سید انصار ناصری میر ناصر علی صاحب ''صلائے عام'' کے پوتے تھے۔ یونہی خیال آرہا ہے کہ کہیں نئی نسل کے کوئی صاحب یہ نہ پوچھ بیٹھیں یہ میر ناصر علی کون تھے؟

غرض صبیح محسن صاحب کی یادداشتیں پڑھنے میں رواں ہیں اگرچہ پڑھنے والے ان سے اچھی اور پرلطف اور شستہ زبان کی توقع رکھتے تھے۔ کیا یہ سب کچھ بھی ان کی ریڈیو والوں کی ''ٹکر نویسی'' کا شاخسانہ ہے؟

◎

اردو والوں کی انگریزی خودنوشتیں

باغی شہزادی کی یادداشتیں

شہزادی عابدہ سلطان بھوپال کے نواب سر حمید اللہ خان کی صاحبزادی اور ان کی ولی عہد تھیں مگر تقسیم ہند کے بعد ۲۔ اکتوبر 1950 کو اپنی ولیعہدی پر لات مار کر پاکستان آ گئیں اور ۱۱ مئی ۲۰۰۲ کو کراچی میں جان جاں آفریں کے سپرد کی اور یہیں پیوندِ خاک ہوئیں۔ ان کی یہ یادداشتیں ۲۹ مارچ ۲۰۰۲ کو مکمل ہوئیں اور ان کی وفات کے بعد ان کے اکلوتے صاحبزادے، سفیر کبیر شہریار محمد خان کے لکھے ہوئے اختتامیہ کے ساتھ شائع ہوئیں۔ کتاب کا دیباچہ صاحبزادہ یعقوب خان نے لکھا ہے۔

شہزادی عابدہ نے اپنے آپ کو باغی اس لئے کہا ہے کہ طبعاً آزادی پسند تھیں۔ ضدی، ہٹی اور دھن کی پکی تھیں، دلیر تھیں جو چاہتی تھیں کر گزرتی تھیں۔ مردانہ کھیلوں اور مشاغل میں دلچسپی تھی گھوڑ سواری چوگان اور شکار ان کے مشغلے تھے۔ ایک اوسط درجہ کے اسلامی معاشرہ میں ان کی طبیعت کی لڑکی کو باغی ہی کہا جا سکتا ہے۔ شہزادی عابدہ نے اپنی اصول پرست، پردہ دار، اور اسلامی اصول حیات کی پابند، دادی ''سرکار اماں'' کی سخت گیر نگرانی میں پرورش پائی جو بھوپال کی حکمران تھیں اور برقعہ میں رہ کر امورِ مملکت سرانجام دیتی تھیں۔ ان کے ابا، نواب حمید اللہ خان، ولی عہد نہیں تھے کیونکہ ان کے دو بڑے بھائی اور بھی تھے اور ولیعہدی کا بار بڑے بیٹے کے کاندھوں پر تھا مگر قدرت کو منظور یہ ہوا کہ ان کے دونوں بڑے بھائی یکے بعد دیگرے پانچ مہینے کے قلیل عرصہ کے اندر راہیٔ عدم ہو گئے۔ اب ان کی جانشینی کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ حکومت انگریزی کے عہدیداروں اور وائسرائے کا خیال تھا کہ اب حکمرانی کا جُوا ولی عہد کے بڑے بیٹے کو منتقل ہو جانا چاہئے۔ سرکار اماں چاہتی تھیں کہ اب ان کا تیسرا بیٹا جو زندہ موجود ہے وہ ولی عہد بنے۔ بات بہت دور تک پہنچی۔ نواب سلطان جہاں بیگم بایں پردہ داری انگلستان تشریف لے گئیں اور بادشاہ جارج پنجم سے جا کر ملیں۔ بادشاہ نے از بسکہ وہ آئینی حکمران تھا ان کی مدد کرنے سے معذوری کا اظہار کیا تو اس کو اپنا برقعہ اتار کر اپنے سفید بال دکھائے کہ دیکھو یہ بال سرکار

انگریزی کی وفاداری میں سفید کئے ہیں ان کا ہی لحاظ کرو۔ بہر حال حکومت برطانیہ نے اپنے قانونی مشیروں کے مشورہ پر وائسرائے کی رائے کے خلاف ان کی بات مان لی اور ان کے سب سے چھوٹے بیٹے حمید اللہ خان کو ولی عہد تسلیم کر لیا۔ سرکار اماں نے اس خوشی میں اچانک تخت سے اپنی دستبرداری کا اعلان کر کے اپنے بیٹے کو اپنا جانشین بنا دیا۔ اس طرح بھوپال کی تاریخ میں ۱۰۷ سال کی خواتین کی حکمرانی کے بعد پہلا مرد حکمران تخت پر بیٹھا۔ ان کے بعد حکمرانی پھر ایک خاتون کو منتقل ہوگئی جو عابدہ سلطان کی چھوٹی بہن تھیں۔

شہزادی عابدہ سلطان نے ہجرت کے فیصلہ کی جو وجوہات بیان کی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آزادیٔ ہند کے وقت ریاستوں کو بہر طور کسی ایک آزاد ملک میں ضم ہونا تھا۔ بھوپال کے لئے سوائے بھارت کے ساتھ الحاق کے اور کوئی رستہ کھلا نہیں تھا۔ اس وقت ان کے ابا نے دستبردار ہونا چاہا تا کہ بھارت کے ساتھ الحاق کا فیصلہ ان کی جانشین شہزادی عابدہ سلطان کرے اور وہ خود اس روسیاہی کے کرب سے بچ جائیں۔ باغی شہزادی عابدہ سلطان کو یہ گوارا نہ ہوا کہ وہ ایک خود مختار مسلمان ریاست کے ایک غیر مسلم ملک کے ساتھ الحاق کی ذمہ دار قرار پائیں اس لئے وہ پاکستان چلی آئیں۔ آزادی ہند کے وقت بہ ظاہر بھوپال کے آزاد رہنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی اس لئے نواب سر حمید اللہ خان الحاق کا اعلان کرتے یا شہزادی عابدہ سلطان کرتیں، ہونا وہی تھا جو ہوا۔ اس لئے شہزادی عابدہ سلطان کا فرمودہ محض ان کے دل کی تسلی کا باعث ہی ہو سکتا ہے اس کے سوا اس کی کوئی سیاسی اہمیت نہیں بنتی اور ہاں ایک محبِ وطن شہزادی نے اپنے وطن کی محبت میں ہجرت کی کلفتیں اٹھانے کا کڑا فیصلہ کیا تو اس پر انہیں داد دینی چاہئے اگرچہ ہجرت کی وجوہات میں ان کی اپنے والد ہز ہائینس سے رنجشیں بھی بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

نواب سر حمید اللہ خان بڑے تعلیم یافتہ بیدار مغز حکمران تھے۔ تقسیم ملک کے وقت چیمبر آف پرنسز کے چانسلر تھے بڑے اور مقتدر حلقوں میں ان کی رسائی تھی مگر حالات کی سنگینی ان کی راہ میں حائل تھی۔ جائے ماندن نہ پائے رفتن کا مضمون تھا۔ چاروں طرف سے بھارت میں گھرے ہوئے ملک کے لئے سوائے ایک راستہ کے اور کوئی راستہ کھلا نہیں تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ شہزادی عابدہ سلطان کے

سکول کی سہیلی سے دوسری شادی رچا بیٹھے تھے اور ان کی والدہ کو کالمعلقہ چھوڑ رکھا تھا۔ بس یہ بات باپ بیٹی میں اختلاف اور تفرقہ کا باعث بن گئی۔ اور باپ بیٹی کی ملاقات بارہ سال کے لمبے عرصہ تک ملتوی رہی اور ہوئی بھی تو باپ کی وفات سے تین دن پہلے ہسپتال میں ہوئی۔ اتفاق یوں ہوا کہ نواب سر حمید اللہ خان کا انتقال ہوا تو ان کی ولی عہد عابدہ سلطان بھارت میں موجود تھیں مگر پاکستان کی شہری تھیں اور ایک غلام، ریاست کی حکمرانی میں کوئی دلچسپی نہ رکھتی تھیں۔ باپ کے چہلم میں شریک ہوئیں اور خاموشی سے واپس پاکستان آ گئیں۔

شہزادی عابدہ سلطان کی یہ خودنوشت آزادیء ہند کے پر آشوب زمانہ کے سیاسی احوال و اثرات سے بالکل خالی ہے۔ لگتا ہے شہزادی موصوفہ کسی خلاء میں زندگی بسر کر رہی تھیں البتہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ برصغیر کی کسی مسلمان ریاست کے اندرونی جوڑ توڑ کی آئینہ دار ہے ورنہ عام طور سے ریاستی حکمرانوں کی زندگی پر اسرار کا دبیز پردہ پڑا رہتا ہے۔ ان کے تعارف نگار نے برصغیر کے سوانحی ادب سے ناواقفیت کی بنا پر دور کی کوڑی لانے کی کوشش ہے اور اس خودنوشت کو ایک معرکہ قرار دیا ہے۔ ایسی کوئی بات اس خودنوشت میں موجود نہیں سیدھی سادہ لڑکی کی کہانی ہے جو مذہبی تعلیم کے سلسلہ میں روا رکھی جانے والی پابندیوں کے خلاف بغاوت کا اعلان کرتی ہے اور ثابت قدم رہتی ہے۔ کٹر مذہبی گھرانوں میں بچوں پر جو سختیاں روا رکھی جاتی ہیں عابدہ سلطان کی خودنوشت ان کے خلاف اعلانِ جہاد ہے۔ خود ان کے اپنے حکمران گھرانے میں صدیق حسن خان کی کٹر وہابیت کا نمونہ موجود رہا ہے جس کی وجہ سے نواب شاہجہان بیگم نے بہت تکلیف اٹھائی اور نواب صدیق حسن خان بھی اعزازاتِ جاہ و جلال سے محروم کئے گئے اور ناکامی کا منہ دیکھ کر خائب و خاسر مرے۔ شہزادی عابدہ سلطان نے ان کا ذکر جہاں بھی کیا ہے محض صدیق حسن خان کہہ کر یک گونہ نفرت و بیزاری سے کیا ہے جس سے یہ مترشح ہوتا ہے صدیق حسن خان اپنی کوتاہ نگاہی کی وجہ سے صرف حکومت کی ہی نہیں اپنے خاندان کی ہمدردیاں بھی کھو بیٹھے تھے۔ تاریخ یہی بتاتی ہے کہ اپنے دنیاوی مراتب کے زعم میں خدا کے برگزیدہ لوگوں پر نگاہِ غلط ڈالنے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔

شہزادی عابدہ سلطان اپنے ایک عزیز نواب صاحب کروائی سے بیاہی گئیں جن سے ان کی

ایک ہی اولاد ہوئی۔ ان کا اکلوتا بیٹا شہریار محمد خان۔ میاں بیوی میں نباہ نہ ہوا تو یہ اپنے میکے اٹھ آئیں۔ بیٹے کی پیدائش کے بعد ان کے شوہر بیٹے کی تولیت کے دعویدار ہوئے اور دھمکی دی کہ وہ زبردستی بچے کو حاصل کر لیں گے۔ اب شہزادی کے اندر کے باغی نے کروٹ لی۔ راتوں رات اکیلی تنِ تنہا جنگلوں بیابانوں میں دھاوا مارتے ہوئے ڈیڑھ سو میل کا سفر کر کے اپنے سسرال جا پہنچیں اور سیدھی اپنے شوہر کے کمرہ میں جا دھمکیں۔ گولیوں سے بھرا پستول نکال کر ان کی طرف پھینکا کہ لو میرا کام تمام کر دو بچہ تمہاری تولیت میں آ جائے گا ورنہ جیتے جی میں اپنے بچے کو اپنے سے جدا نہیں کر سکتی۔ نواب صاحب کو جراءت نہ ہوئی اس سارے باغیانہ معرکہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ بچے کی تولیت انہی کے پاس رہی اور بچے کے باپ نے حینِ حیات پھر ایسا کوئی مطالبہ نہ کیا۔ شوہر اور بیوی میں تعلقاتِ ازدواج تو نہ رہے مگر دشمنی بھی نہ رہی۔ میاں بیوی دوستوں کی طرح ملتے بھی رہے۔

شہزادی عابدہ سلطان نے اپنی خودنوشت میں بہت سی سیاسی اور اہم شخصیتوں کا سرسری ذکر کیا ہے مگر مسز سروجنی نائیڈو اور سر ظفر اللہ خان کا تذکرہ بڑی محبت سے کیا ہے۔ سروجنی نائیڈو تو دراصل ان کی ''سرکار اماں'' کی چہیتی تھیں۔ سر ظفر اللہ خان ایک قلیل عرصہ تک ان کے ابا نواب سر حمید اللہ خان کے آئینی مشیر رہے۔ اس وقت اور پھر پاکستان آ جانے کے بعد ان سے ملنے کے انہیں بہت مواقع میسر آتے رہے۔ سر ظفر اللہ کے باب میں ان کا کہنا ہے کہ: ''میں پہلے پہل سر ظفر اللہ خان سے اس وقت ملی جب وہ ہز ہائی نس کے مشیر بن کر بھوپال تشریف لائے۔ (۱) ہز ہائی نس ۱۹۴۴ سے ۱۹۴۷ تک چیمبر آف پرنسز کے چانسلر تھے۔ میں ولیعہد اور کابینہ کی صدر تھی اور مجھے ان سے طویل گفتگو کرنے کا موقعہ ملتا تھا۔ اس وقت مجھے ان کی غیر معمولی قابلیت' خلوص اور انسانیت کا ادراک ہوا۔ قادیانی ہونے کے ناطے وہ ویسے بھی نایاب سے لگتے تھے کیونکہ بھوپال میں ہم نے قادیانیوں کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ ہمارے ہاں لوگوں کے ذاتی عقائد کا احترام روا رکھا جاتا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان کی آزادی سے قبل کے مشکل سالوں میں سر ظفر اللہ خان ایک مضبوط پاکستان کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔ ان کی دانست میں پاکستان کو مضبوط بنانے کا ایک طریق یہ بھی تھا کہ دیسی ریاستوں کو مجتمع کر کے ایک تیسرا بلاک بنایا جائے اور وہ بلاک پاکستان کے مقابلہ میں بھارت کی بالادستی میں مناسب توازن پیدا

کرنے کا موجب بنے۔ سر ظفر اللہ خان ہز ہائینس کو ''راجستھان'' کے اس تصور کو عملی طور پر ظہور میں لانے کے لئے مناسب مشورے دے رہے تھے۔ سر ظفر اللہ خان نے اپنے دلائل سے بہت سی ہندو ریاستوں مثلاً جودھ پور، اندور، کشمیر اور بیکانیر کے ہندو راجاؤں کو اس بات کی افادیت کا قائل کر لیا تھا۔ سر ظفر اللہ خان کا خیال تھا کہ اس طرح مستقبل میں قائم ہونے والے پاکستان کو فائدہ ہوگا۔ پاکستان کو ابھی قائم ہونا تھا مگر سر ظفر اللہ ابھی سے اس کی مضبوطی اور توانائی کے لئے کوشاں تھے۔''

سر ظفر اللہ سے میری بعد کی ملاقاتیں ان کے وزیر خارجہ بننے کے بعد کی ہیں۔ ۱۹۵۴ میں جب میں یو این جنرل اسمبلی والے وفد میں شامل تھی اس وقت وہ اس وفد کے قائد تھے۔ ان کے ساتھ قریب رہ کر کام کرنے کا موقعہ ملا تو ان کی بے پناہ حب الوطنی اور اخلاص کا اندازہ ہوا۔ وہ ذیابیطس کے مریض تھے مگر پاکستان کی خاطر اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام کرتے تھے اور یو این کے دفتر ہی میں ذرا سی دیر کو آرام کر لیتے تھے اس طرح ملک کو پانچ ستاروں والے ہوٹل کے اخراجات سے زیر بار نہیں کرتے تھے۔ ذہانت اور سوجھ بوجھ کی وجہ سے وہ یو این میں موجود وزراء خارجہ کے جھرمٹ میں ستارے کی طرح چمکتے تھے۔ اور پاکستان کا کیس انتہائی مدلل انداز میں اپنے خاص انگریزی لہجہ میں پیش کرتے تھے۔ کشمیر کے مسئلہ پر مسٹر کرشنا مینن کے ساتھ ان کے معرکے یو این میں ہر ایک کی زبان پر تھے۔ سر ظفر اللہ اپنی تقاریر بڑی محنت سے اور توجہ سے خود تیار کرتے تھے جو سینے میں تیر کی طرح اترتی تھیں مگر ان میں کسی دشمنی یا عداوت کا شائبہ تک محسوس نہیں ہوتا تھا۔ ظفر اللہ خان کی معلومات کی وسعت کا عالم یہ تھا کہ انہیں یو این کی تمام کمیٹیوں میں ہونے والی باتوں کی تفصیلات کا علم رہتا تھا۔

ظفر اللہ خان نہایت عمدہ انسان تھے۔ ان کے عقاید کی بنا پر ان کے خلاف بہت کچھ کہا جاتا تھا مگر وہ یہ سب کچھ بڑے وقار اور بردباری سے انگیز کر لیتے تھے۔ یہ تمام یاوہ گوئیاں انہیں پاکستان اور اسلامی اہداف سے مکمل وابستگی کی راہ سے نہیں ہٹا سکیں۔ عالمِ عرب اور خاص طور سے شمالی افریقہ اور شرقِ اوسط کے ممالک میں ظفر اللہ بڑے احترام سے دیکھے جاتے تھے۔ (میرے بیٹے) میاں (شہریار محمد خان) نے مجھے بتایا کہ تیونس میں جہاں وہ ۱۹۶۲۔۶۴ میں پاکستان کے سفیر رہے، بہت سی ماؤں نے اپنے بچوں کے نام ظفر اللہ کے نام پر رکھے تھے۔ کسی پاکستانی سے ملنے پر شمالی افریقہ کے لوگوں کا

پہلا ردعمل یہ ہوتا تھا کہ وہ ظفر اللہ خان کی تعریف کرتے تھے کہ انہوں نے کس قابلیت سے ان کی امنگوں کی ترجمانی کی تھی۔ میاں نے یہ بھی بتایا کہ یہی حال اردن اور شرق اوسط کے ممالک کا تھا۔
ظفر اللہ یقیناً بڑے مخلص قادیانی تھے مگر قادیانیت ان کے افعال میں اتنی سی تھی کہ وہ مہینہ بھر کی جمع جتھا ربوہ بھیج دیتے تھے۔ ظفر اللہ کی مشہور عالم جز رسی بڑے مقاصد کی خاطر تھی کسی ذاتی انتفاع کے لئے نہیں تھی۔

میں ظفر اللہ کو عظیم محبِ وطن اور بے پناہ صلاحیتوں والے انسان کی حیثیت سے جانتی ہوں۔ وہ بااصول، مخلص، معزز و محترم اور انتہا کے پڑھے لکھے انسان تھے۔ انہوں نے پڑھنے میں ایسی مہارت حاصل کر لی تھی کہ وہ ایک بار سرسری دیکھ کر سارے صفحہ کا مضمون جان جاتے تھے۔ علاوہ ازیں، ظفر اللہ، سادہ مزاج، انسان پرست اور شگفتہ طبع آدمی تھے۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ امر پاکستان کے لئے باعثِ ندامت ہے کہ ان کے ذاتی عقاید کی وجہ سے ان کے بیش بہا ملی کارناموں اور خدمات پر پردہ ڈال دیا گیا ہے اور یہی سلوک پاکستان کے عظیم ترین سائنسدان اور واحد نوبل لاریٹ پروفیسر عبدالسلام سے روا رکھا گیا ہے۔'' (صفحہ ۲۷۷۔۲۷۸) ایک باغی شہزادی کی سرگزشت اس قابل ہے کہ اسے پاکستان کے قارئین کے لئے جلد سے جلد اردو میں منتقل کرنے کی سعی کی جائے۔ امید ہے شہریار خان کرکٹ کے انتظام و انصرام سے کچھ وقت نکال کر اس کام پر صرف کریں گے یہ ان کی اماں حضور کا حق ہے۔

◎

خیمہ میں واپسی

جنرل عتیق الرحمن، پاکستان کی فوج کے واحد جرنیل ہیں جو فوج اور سول حکومت کے بہت سے مقتدر عہدوں پر رہنے کے باوجود نیک نامی سے یاد کئے جاتے ہیں اس کی سب سے بڑی وجہ ان کی دیانت داری ہے اور یہی جنس ہمارے ہاں کمیاب بلکہ نایاب ہوگئی ہے اور ہمیں اس کا احساس تک نہیں۔

کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا۔

جنرل عتیق الرحمن کی خودنوشت انگریزی میں ہے BACK TO THE PAVILION یہ محاورہ کرکٹ کے کھیل کا محاورہ ہے اور اس وقت استعمال میں آتا ہے جب کوئی کھلاڑی آؤٹ ہو کر یا اپنی اننگز کھیل کر واپس آتا ہے۔ جنرل عتیق الرحمن نے بھی اپنی اننگز مکمل کرنے کے بعد یعنی نوکری کے کھیل سے فارغ ہونے کے بعد یہ خودنوشت لکھی ہے اور بجا طور پر انگریزی میں لکھی ہے ورنہ اردو میں لکھتے تو اپنے قول کے مطابق رومن اردو میں لکھتے کیونکہ آپ ویسی ہی اردو بولتے تھے اس کی لِم یہ تھی کہ آپ کی ابتدائی تعلیم انگلستان کے سکولوں میں ہوئی وہاں سے فارغ ہوئے تو انگریز کی ہندوستانی فوج میں چلے گئے صاحب بہادری میں جو کسر رہ گئی تھی وہ پوری ہوگئی۔ ساری عمر اسی اردو میں فوج کی کمان اور مارشل لاء اور گورنری کے فرائض انجام دیتے رہے حتیٰ کہ پبلک سروس کمشن کے انٹرویو بھی اسی زبان میں لیتے رہے۔ ہمیں ان کے سامنے ایک بار انٹرویو کے لئے حاضر ہونا پڑا۔ آپ کے ساتھ فوج کے کوئی پڑھے لکھے بریگیڈئر بیٹھے تھے۔ پڑھے لکھے اس لئے کہ وہ ہمارے ہر جواب کے بعد اپنی ڈائری میں لکھے جوابات سے ہمارے جوابات کا موازنہ کرتے اور غلط یا صحیح ہونے کا فیصلہ صادر کرتے تھے۔ جنرل صاحب نے صرف ایک سوال پوچھا تھا کہ آپ ادب کے استاد ہیں۔ ہم نے کہا جی۔ فرمانے لگے مگر آپ نے تو اردو میں پی ایچ ڈی کر رکھی ہے۔ ہم نے کہا اسی لئے تو اردو ادب کے استاد ہیں۔ جنرل صاحب مایوس ہو کر چپ ہو گئے پھر کچھ پوچھ کے نہیں دیا کہ یہ اردو کا آدمی

ہے ہمارے کس کام کا ہے؟ اور بہ قول شخصے بریگیڈئر صاحب کو ہم پر چھوڑ دیا۔

ہم فوج کے تعلیمی اداروں میں پروفیسر کی اسامی کے امیدوار کے طور پیش ہوئے تھے بریگیڈئر صاحب نے سوائے اردو کے اور سب سوالات پوچھ ڈالے۔ اسی فیصد سوال کا تعلق تو اسلامیات سے تھا۔ مثلاً دعائے قنوت سنایئے پھر فرمایا قرآن نے تو شعر کہنے سے منع کیا ہے آپ نہ صرف شعر کہتے بلکہ لوگوں کو پڑھاتے بھی ہیں۔ ہم نے جواباً قرآن کی وہ آیت پڑھی جس میں شعراء کی شان میں کچھ فرمایا گیا ہے مگر اس امر سے اپنی بے خبری کا اظہار کیا کہ کوئی ایسی آیت بھی ہے جس میں شعر کہنے سے منع کیا گیا ہے؟ آپ نے اردو میں فرمایا کہ وہ آیت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ہم نے پیغمبر کو شعر کہنا سکھایا ہی نہیں نہ اس کو شعر کہنا آتا تھا۔ ہم نے سورۃ یاسین کی وہ آیت سنائی۔ بریگیڈئر صاحب کو بڑا غصہ آیا کہنے لگے آپ قرآن کی آیتیں فر فر پڑھ رہے ہیں کیا آپ کا وضو ہے؟ ہم نے کہا جی نہیں وضو تو نہیں البتہ تیمم ہے۔ اس پر جنرل صاحب نے دل کھول کر قہقہہ لگایا اس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ صاحبِ ذوق ہیں۔ بریگیڈئر صاحب سے کہنے لگے دیکھا آپ نے ایک احمدی امیدوار دوسرے امیدواروں سے زیادہ مسئلہ مسائل سے آگاہ ہے! یہ خودنوشت پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ جنرل صاحب واقعی صاحبِ ذوق ہیں یعنی سچ کو سچ کہنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ اور یہ سچ تو جنرل صاحب نے کتاب میں بول بھی دیا ہے کہ ہم قابل ترین امیدوار کو چننے کے پابند تھے نہ ایسا کرتے تھے۔

ذاتی واردات برطرف ہمیں اس کتاب کی جس خصوصیت نے لکھنے پر اکسایا وہ صاحبِ کتاب کی صاف بیانی اور اس کتاب کی سچائی ہے۔ ایک وصف جنرل صاحب میں یہ تھا کہ چھوٹی چھوٹی لغزشوں کو پکڑنے کے فیل پا میں مبتلا تھے اور ماتحتوں کو معاف نہیں کرتے تھے کسی کا بٹن کھلا ہے تو اس پر برس پڑے کسی نے سلیوٹ نہیں کیا تو اس کو دھر پکڑا۔ کسی کی جرابیں یکرنگ نہیں تو اس کو جھاڑ پلا دی مگر انصاف کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے۔ سیالکوٹ چھاؤنی میں اپنی جھنڈے والی گاڑی میں سوار جا رہے تھے کہ ایک سپاہی نے انہیں سلیوٹ نہیں کیا۔ اسے پکڑ بلایا کہ تم نے سلیوٹ کیوں نہیں کیا فوراً چھ بیٹھکیں لگاؤ۔ سپاہی نے بیٹھکیں لگا کر کہا جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں؟ فرمایا کہو۔ اس نے کہا جناب والا آپ کی کار کی نمبر پلیٹ پر تو پردہ پڑا ہوا ہے اور میں ایسی صورت میں سلیوٹ کرنے کا پابند نہیں۔

جنرل صاحب نے دیکھا کہ جوان کی بات درست ہے فرمایا "تم ٹھیک بولتا"۔ خود بھی بیٹھکیں لگانے کو تیار ہو گئے ڈرائیور کو بھی تیار کیا اور دونوں نے سب کے سامنے چھ چھ بیٹھکیں لگائیں۔ جب جرنیل ایسے ہوں تو جوان بھی ان کی عزت کرتے ہیں اور ہمارے ہاں ایسے کتنے جرنیل ہیں؟ جرنیل تو چھوڑیے، کمتر درجہ کے افسروں کا تبختر دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ وہ صرف حکم دینا جانتے ہیں اپنی غلطی کو تسلیم کرنا نہیں جانتے!

آپ کو انگریزی محاورہ کے مطابق THEATRICS یعنی عملی مذاق کا بھی بہت شوق تھا۔ جنگی مشق کے دوران یکایک آپ کو اپنڈیسائٹس کا درد اٹھا کراہنے لگے اور اتنے بیمار ہو گئے کہ اپنے نائب کو بلا کر کمان اس کو سونپ دی اور خود ڈاکٹری معائنہ کے بعد بستر پر پڑ گئے۔ ساری کمان میں کمانڈر کی بیماری نے تہلکہ مچا دیا مگر تیسرے ہی دن صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اچھے بھلے ہو کر واپس کمان کرنے کو پہنچ گئے۔ بیچارے ڈاکٹر کے کان کھینچے کہ میاں تمہیں اتنا بھی نظر نہیں آیا کہ میرا اپنڈیسائٹس کا اپریشن پہلے ہو چکا ہے اور اس کے زخم کا نشان موجود ہے۔ تم کیسے ڈاکٹر ہو؟ شکر ہے یہ ڈرامہ فوج میں ہوا اگر سول میں ہوا ہوتا تو ڈاکٹر کہہ دیتا کہ زخم تو نظر آ گیا تھا کمانڈر کا مکر نظر نہیں آیا تھا اس لئے میں یہی سمجھا جرنیل صاحب عملی مشقوں میں حصہ لینے سے گھبرا رہے ہیں اور جعلی سرٹیفکیٹ چاہتے ہیں۔ اس سے زیادہ شکر کا مقام یہ ہے کہ جرنیل صاحب کسی سول ہسپتال میں نہیں تھے ورنہ ڈاکٹر ان کی اولیں غفلت میں دوبارہ اپریشن کر کے ان کا باقی ماندہ مکر بھی نکال دیتے!

جرنیل صاحب دوسری جنگِ عظیم میں برطانوی فوجوں کی برما سے پسپائی کے وقت فوج میں تھے اور باقاعدہ بھاگتے دوڑتے، پسپا ہوئے تھے۔ پسپائی کی افراتفری کا خوب نقشہ اس کتاب میں موجود ہے۔ ان کے پسپائی کے ساتھیوں میں سام مانک شاہ بھی تھے جو بعد میں ہندوستانی فوج کے کمانڈر انچیف ہوئے۔ اس جنگ میں وہ سخت زخمی ہوئے تھے اور ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ مناسب دیکھ بھال اور مرہم پٹی تک ان کا بچنا ناممکن ہے۔ مگر وہ نہ صرف بچ گئے بلکہ پاکستانی فوج سے ہتھیار ڈلوانے کے موقعہ تک زندہ رہے اور اس کارنامہ کی بنا پر فیلڈ مارشل کا رینک حاصل کیا۔ جنرل صاحب اور وہ ملٹری اکیڈمی میں اکٹھے تھے۔ ہندوستانی فوج کے بیشتر جرنیل ان کے ساتھ کے پڑھے ہوئے

تھے اس لئے جہاں کہیں ان کا ذکر آتا ہے ان کا ذکر بڑے احترام سے کرتے ہیں اور یہی ملٹری کا ضابطہٗ اخلاق ہے۔

ملٹری کے قوانین وضوابط کا ذکر آ گیا تو یہ بھی لکھ دوں کہ جرنیل صاحب نے ضوابط کا سہارا لے کر بارہ ڈویژن میں اپنے پیشرو جنرل اختر ملک کی شخصیت کو دھندلانے کی ناکام کوشش بھی کی ہے۔ جب انہیں معلوم ہے کہ جنرل اختر ملک کو عین فتح ونصرت کے لمحہ میں کمان سے علیحدہ کر کے جی ایچ کیو میں بلا لیا گیا تھا تو کاغذ پر لکھے گئے مقاصد کے حصول کی ذمہ داری بھی ان کے اس جانشین کی تھی جو ان کی جگہ بھیجا گیا تھا۔ جنرل صاحب نے یہ لکھ کر کہ "جی ایچ کیو کی جانب سے جو مقاصد متعین کئے گئے ان میں سے بہت تھوڑے پورے ہوئے تھے اور ہم نے جی ایچ کیو کو اس کے مطابق جواب بھیج دیا" اپنی دانست میں اپنے پیشرو کے کاموں کا سقم پکڑا ہے گویا ان کی غلطیاں پکڑنے کی عادت نہیں گئی۔ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ جرنیل صاحب کو قسمت کا شکر گذار ہونا چاہئے کہ جس ڈائریکٹر ملٹری ٹریننگ کو وہ رپورٹ بھیجی گئی تھی وہ خود جنرل اختر ملک تھے کوئی اور نہیں تھا۔

جرنیل صاحب پبلک سروس کمشن کے چیئرمین تھے تو انہیں ہندوستان کا دورہ کرنے کا موقعہ ملا۔ اس دورہ کا ذکر آپ نے بڑے ناسٹلجک انداز میں کیا ہے پرانے دوستوں سے ملے ہیں۔ بے تکلفی کی باتیں کی ہیں۔ ان مقامات کو دیکھا ہے جہاں ان کے اباتعینات رہے اور جہاں خود اپنی فوجی سروس کے دوران رہے۔ انہیں کے کمشن کے ایک رکن شیخ منظور الٰہی نے بھی اسی دوران ایک دورہ ہندوستان کا کیا تھا ان کے دورہ کے ساتھ بھی وہی ناسٹلجک یادیں وابستہ تھیں۔ جنرل صاحب نے سب کچھ انگریزی میں لکھا اور انہیں یہ بات بہت اچھی لگی کہ ہندوستان میں انگریزی پاکستان سے زیادہ اچھے طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے مگر منظور الٰہی نے ایک ادیب کی حیثیت سے پرانے منظرنامہ کو نئے تناظر میں دیکھا اور ان کا موازنہ بھی کرتے گئے۔ وہی لوگ تھے جوان کے میزبان تھے وہی لوگ تھے جو شیخ صاحب کے میزبان تھے مگر نکتہ نظر کا فرق یوں سمجھئے کہ جرنیل صاحب لکھتے ہیں کمشن کے چیئرمین ڈاکٹر سہارے اچھوتوں میں سے تھے اور انہیں اس کا کوئی کمپلیکس نہیں تھا۔ ہمارے ہاں جو بھی آتا ہے اس کے باپ دادوں میں کوئی نواب ہوتا ہے کوئی میر، کوئی خان اور کوئی سردار۔ صرف وہی آگے آتے

ہیں جو جنگجو اقوام سے متعلق ہیں۔ مگر شیخ صاحب اس صورت کو یوں دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر سہارے نے زراعت کی تحقیقات میں نام پیدا کیا۔ ہنس مکھ، خوش گپ۔ عمر کوئی باون برس کے لگ بھگ۔ باتوں باتوں میں ذکر آ گیا کہ ہمارے چیئر مین کی تعلیم انگلستان میں ہوئی تھی اس لئے اردو زبان پہ انہیں وہ ملکہ حاصل نہیں جو ہونا چاہئے مگر انٹرویو کے دوران جب کسی امیدوار کو انگریزی بولنے میں تامل ہوتو وہ ازخود اردو میں بات شروع کر دیتے ہیں کہ اسے اظہارِ خیال میں دقت نہ ہو۔ ''پھر اپنے چیئر مین سے کہہ دیجئے کہ اس معاملہ میں میں ان کی ضد ہوں'' ڈاکٹر سہارے نے کہا۔ ''وہ کیسے جناب''؟ میں نے پوچھا۔ ''میں ایک ایسے مزارع کا بیٹا ہوں جس کی اپنی کوئی زمین نہ تھی''۔ ''یہ تو بڑی قابلِ قدر بلکہ قابلِ فخر بات ہے آپ نے زندگی بھر جدو جہد کی اور بڑا رتبہ پایا''۔ ''اس پر مستزاد کہ میں ہریجن ہوں۔ طالب علمی کے زمانہ میں کمرہء جماعت میں مجھے کونے میں بٹھاتے تھے۔ سزا دیتے وقت استاد دور سے بید دے مارتا مبادا چھونے سے بھرشٹ ہو جائے!''۔

اس سارے تقابل میں یہ بات سامنے آئی کہ جرنیل صاحب کے اور شیخ صاحب کے زاویہء نظر میں کتنا نمایاں فرق ہے۔ ایک کو یہی فرق بہت لگتا ہے کہ ایک نچلے طبقہ کا آدمی اونچے مرتبہ تک پہنچا دوسرے کو ساری تفصیلات سے دلچسپی ہے جن میں ذات پات سے لے کر تعلیم وترقی تک سب باتیں شامل ہوگئی ہیں۔ ایک ادیب کے اور ایک جرنیل کے انداز میں یہ فرق تو ہونا ہی چاہئے تھا۔

جنرل عتیق الرحمٰن کی خودنوشت اپنے مواد کے اعتبار سے بڑی مستند اور بیان کے لحاظ سے بڑی کھری خودنوشت سمجھی جائے گی۔

◎

زندگی کی شاہراہیں اور پگڈنڈیاں

پاکستان کے ریٹائرڈ چیف جسٹسوں کی خودنوشتوں کے مطالعہ کے دوران چیف جسٹس محمد منیر کی انگریزی میں لکھی ہوئی کتاب '' زندگی کی شاہراہیں اور پگڈنڈیاں'' یعنی Highways & Bye-ways of Life بھی مطالعہ میں آئی۔ کتاب پر سن اشاعت درج نہیں مگر اس کا دیباچہ جنوری ۱۹۷۸ کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں جج صاحب موصوف کی زندگی کے متفرق حالات درج ہیں۔ ان کی شکاریات وتفریحات، کوہ نوردی وکوہ پیمائی اور اسفار کا تذکرہ بھی ہے۔ احوال الرجال کے سلسلہ میں واقعات کے بیان میں جہاں تہاں ان کے دوستوں اور جان پہچان کے لوگوں کا ذکر بھی آ جاتا ہے۔ خود جج صاحب نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ''عجیب عنوان والی یہ کتاب میری خودنوشت سوانح عمری نہیں مگر آدمی اپنے تجربات وتاثرات کو لکھنے بیٹھے تو موضوعی تو اسے بننا ہی پڑتا ہے''۔ اس کتاب میں جج صاحب کے خاندانی حالات، سرکاری ملازمت کے دوران ان کے تجربات، پیشہ ورانہ قانونی اور عدالتی تصریحات سب کچھ آ گیا ہے گویا موضوع کے لحاظ سے یہ جج صاحب کی خودنوشت بن گئی ہے۔

جسٹس محمد منیر پاکستان کے بڑے نیک نام اور قابل جج سمجھے جاتے ہیں۔ آپ نے جسٹس اجمل میاں کی طرح اپنی تاریخ پیدائش کے سلسلہ میں رجماً بالغیب سے کام نہیں لیا صاف صاف لکھا ہے کہ ''۳ مئی ۱۸۹۵ کی تاریخ پیدائش میرے سرکاری ریکارڈ میں درج ہے مگر مجھے علم نہیں کہ یہ صحیح ہے یا غلط کیونکہ جب میں سکول میں داخل ہوا اس وقت بکرمی سن کا رواج تھا خدا جانے انہوں نے یہ عیسوی تاریخ کس طرح اخذ کی ہوگی'' (صفحہ ۲) ان کے دادا فوج میں افسر تھے ان کے ابا نے لاہور میڈیکل سکول میں تعلیم پائی اور ڈاکٹر بنے۔ جج صاحب نے قانون کا پیشہ اختیار کیا اور امرتسر میں وکالت شروع کی۔ پھر لاہور میں عدالتی کام کیا۔ دلی میں انکم ٹیکس اپیلیٹ ٹریبونل کے صدر مقرر کئے گئے اور وہیں سے ۱۹۴۲ میں ہائی کورٹ کے بنچ پر سرفراز ہوئے۔ قیام پاکستان کے وقت پنجاب باؤنڈری کمیشن میں مسلمانوں کی طرف سے جج نامزد کئے گئے۔ لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اور پھر پاکستان کی

فیڈرل کورٹ کے چیف جسٹس مقرر ہوئے۔ ان کی عدالتی مصروفیات کی یہ تمام تفصیلات میں اپنی یاد داشت کے بل پر لکھ رہا ہوں جج صاحب نے ان تفصیلات کا ذکر اپنی کتاب میں نہیں کیا۔

۱۹۵۳ کی پنجاب کے فسادات کی انکوائری کے لئے جو ٹریبونل بنایا گیا آپ اس کے صدر تھے دوسرے رکن جسٹس ایم آر کیانی تھے۔ اس کمیشن کی معرکہ آراء رپورٹ شائع ہو چکی ہے جو منیر رپورٹ کہلاتی اور قانونی حلقوں میں بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ فیڈرل کورٹ کے چیف جسٹس کی حیثیت سے آپ نے گورنر جنرل کے اسمبلیوں کو برطرف کرنے کے شہرہء آفاق کیس کا فیصلہ لکھا اور وہ فیصلہ دنیا بھر کے قانونی حلقوں میں آج تک زیر بحث ہے۔ جہاں بین الاقوامی حلقوں میں اسے تحسین کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے وہاں ہمارے ہاں کی سپریم کورٹ نے اس فیصلہ کے اوپر اپنا فیصلہ دے کر اس فیصلہ کو مسترد کر دیا ہے۔ جسٹس نسیم حسن شاہ کی خودنوشت پر لکھتے ہوئے میں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ججوں کو اپنے جاری کردہ فیصلوں کو اپنی خودنوشت میں زیر بحث نہیں لانا چاہئے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ جسٹس منیر نے بھی ایسی ہی بات لکھی ہے اور لکھا ہے ''جب کوئی جج کوئی فیصلہ صادر کرتا ہے تو فیصلہ صادر کر چکنے کے بعد وہ functus officio بن جاتا ہے اور عموماً عوام کے سامنے اپنے فیصلوں پر اظہارِ خیال نہیں کر سکتا'' (صفحہ ۲۰۲)۔ اس لئے جسٹس موصوف نے ساری کتاب میں کہیں اپنے فیصلوں کو موضوع نہیں بنایا۔

مگر ہماری قومی عادت یہ رہی ہے کہ ہم ججوں کے ریٹائر ہونے کے بعد نہ صرف ان کے فیصلوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں بلکہ ان پر گندگی اچھالنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اس لئے جسٹس منیر نے بادلِ ناخواستہ اس کتاب کے آخری باب میں پاکستان کی دستوری تاریخ کے ان تاریخی فیصلوں کو موضوع بنایا ہے جن میں ان کا وہ تاریخی فیصلہ بھی شامل ہے جس میں جسٹس منیر نے دنیا کی آئینی تاریخ کا پہلا فیصلہ لکھا تھا اور ''نظریہء ضرورت'' کی ترکیب وضع کی تھی اور یہ ترکیب آج تک سانپ کے منہ میں چھچھوندر بنی ہوئی ہے اگلے بنے ہے نہ نگلے بنے ہے! ہمارے ہاں کے آئینی معاملات کے بزرجمہر اس ترکیب پر اپنی قانونی اور غیر قانونی قابلیتیں صرف کر چکے ہیں مگر اس نظریہ کا بطلان ان سے ممکن نہیں ہو سکا۔ کتاب کے اس آخری باب میں جسٹس شیخ انوار الحق صاحب کا وہ فیصلہ بھی زیر بحث آیا ہے جس کے باب میں ایس ایم ظفر کی روایت بیان کی جا چکی ہے کہ کس طرح جج

صاحب موصوف نے اپنے قلم سے اور اپنے دستِ مبارک سے ایک ہمہ مقتدر شخص کو آئین میں بھی ترمیم کرنے کا حق تفویض کر دیا تھا کیونکہ وہ ایسا نہ کرتے تو ان کی چیف جسٹس کی کرسی ان سے چھن جاتی۔ جسٹس منیر نے لکھا ہے کہ ''انہیں مارشل لاء کو جائز قرار دینا ہی تھا نہ کرتے تو تین صورتیں ممکن تھیں

(۱) یا تو عدالت برطرف شدہ حکومت کو بحال کر دیتی مگر عدالت تو اس حکومت کے اقدامات کی بڑی سختی سے مذمت کر چکی تھی جن اقدامات کی وجہ سے مارشل لا ناگزیر ہو گیا تھا۔

(۲) عدالت اور مارشل لا حکومت میں محاذ آرائی ہوتی اور حکومت عدالت کے احکامات کی تعمیل نہ کرتی

(۳) ایسا ہوتا تو ملک کے قانونی نظام میں خلا پیدا ہو جاتا اور افراتفری پھیل جاتی'' (صفحہ ۲۵۳)

جسٹس منیر نے ان تینوں صورتوں سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قانونی طور پر کوئی نہ کوئی قانونی صورت نکالنی ضروری ہو جاتی ہے۔ جسٹس نسیم حسن شاہ نے نام لئے بغیر جسٹس منیر کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اگر حکومت عدالت کے احکام کی خلاف ورزی کرتی ہے تو اسے یہ صلیب بھی اٹھانی چاہئے اور اس کے نتائج بھگتنے کو تیار رہنا چاہئے'' (خودنوشت صفحہ ۷۹) عدالت کا کام صرف فیصلہ دینا ہے۔ غالباً اسی لئے جج صاحب نے نواز شریف کے کیس کی سماعت کے آغاز ہی میں کہہ دیا تھا کہ ''میں جسٹس منیر نہیں ہوں۔ میں ایسا فیصلہ لکھوں گا جس سے قوم خوش ہو جائے گی'' (سجاد علی شاہ کی خود نوشت صفحہ ۱۷۶)

جسٹس منیر صاحب نے تفصیلاً اس فیصلہ پر بحث کی ہے مگر وہ قانونی معاملات ہیں اور ہماری فہم سے برتر ہیں۔ ہمیں تو صرف اتنا پتہ ہے کہ جسٹس منیر نے اپنے برادر ججوں کے بارہ میں جنہوں نے ان کے فیصلہ سے اختلاف کر کے اسے مسترد کیا ہے کوئی ناروا نا ملائم کلمہ نہیں لکھا۔ عدالتی نظام عدالت ججوں وکلاء کسی کے باب میں اس نہایت مجبوری کے عالم میں لکھے گئے باب میں بھی کوئی سخت بات موجود نہیں اور یہی دنیا بھر کی انصاف کی روایت ہے۔ مگر ہمارے ہاں کے ججوں نے اپنی ہی عدالت کو کانچ کے گھر میں لا کھڑا کیا (جسٹس سجاد علی شاہ کی خودنوشت) اور اپنے ہی ساتھیوں اور پیش روؤں کے بارہ میں ''بددیانت اور بے اصولے'' کے لفظ لکھے۔ (جسٹس اجمل میاں)۔ اور تو اور ایک جونیئر نیک نہاد جج (جسٹس جاوید اقبال) نے اپنی خودنوشت اپنا گریباں چاک میں اپنے ساتھیوں کے بارہ

میں باقاعدہ ہسٹری شیٹ مرتب کی کہ فلاں جج شیزوفرینیا کا مریض تھا فلاں جج دشمن کا موت تک پیچھا کرنے والا تھا فلاں ٹرکس آف ٹریڈ کا ماہر تھا۔ یہ سب کچھ کیا ہے؟ کیا ان نام نہاد دانشوروں کو اتنا بھی علم نہیں ہوتا کہ عدالت اور نظام عدالت کے احترام کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ یوں تو وہ ذرا ذرا سی بات پر توہینِ عدالت کے قانون کا سہارا لینے پر تل جاتے ہیں۔ تفو برتو اے چرخِ گرداں تفو!

جسٹس منیر کی یہ کتاب ان کی شکاریات اور اسفار کی تفصیل سے بھری پڑی ہے کیونکہ جج کے مرتبہ پر فائز ہونے کے بعد ان کے لئے دیگر معاشرتی تقریبات میں حصہ لینا ممکن نہیں رہا تھا کہ یہی اس عدالتی نظام کا ورثہ تھا جو انہوں نے پایا تھا۔ جو وقت بچتا اسے شکار اور تفریح اور کوہ پیمائی میں صرف کرتے۔ اس طرح یہ کتاب سارے برصغیر جس میں ہندوستان اور پاکستان دونوں شامل ہیں، کی سیاحت کا ایک نادر نمونہ بن گئی ہے۔ رہتانگ، کیلانگ، لنگتی، دھرمسالہ، چمبہ سے پانگی، کشمیر، مشرقی پاکستان، نئی دہلی، دہرہ دون، کرنال، پٹیالہ، شوالک کی پہاڑیاں، دریائے کابل، کاغان، بلتستان، سوات، دیر چترال، چولستان، بہاولپور، خیر پور، بلوچستان، ڈیرہ غازی خان، سندھ، رانی پور، رحیم یار خان، خانپور، فورٹ منرو، جہلم، جھنگ، بجوات، کالا باغ، جابہ، اور خدا جانے کہاں کہاں جج صاحب سیاحت اور شکار کرتے پھرے ہیں ہم نے تو بیشتر جگہوں کے نام پہلی بار ان کی کتاب میں پڑھے ہیں۔ یہ درست بات ہے ججوں کو اگر بے محابہ سوشل تقریبات میں شرکت کی مناہی ہے تو ان کے پاس اس کے سوا اور چارہ ہی کیا رہ جاتا ہے؟ مگر ہمارے معاشرہ میں جج سوشل تقریبات تو الگ رہیں سیاسی تقریبات میں بھی مہمانِ خصوصی بننے سے گریز نہیں کرتے جسٹس نسیم حسن شاہ نے تو فخر کے ساتھ یہ بات کہی ہے کہ ''عدالتی کام کے بعد میرا سوشل کیلنڈر ہمیشہ بھرا رہتا تھا'' (خودنوشت صفحہ ۷۹) اور نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ ہمارے عدالتی نظام نے اپنا وقار کھو دیا ہے۔

جسٹس منیر نے ڈاکٹروں کے باب میں پورا ایک باب باندھا ہے شاید اس لئے کہ ان کے والدِ محترم بھی ڈاکٹر تھے۔ ڈاکٹروں کے علاج کے مؤثر یا غیر مؤثر ہونے اور ان کی پیشہ ورانہ عادتوں کا جج صاحب نے کہیں کہیں مذاق بھی اڑایا ہے مگر ایک حد تک ہی گئے ہیں کسی کے بارہ میں حدِ اعتدال سے تجاوز نہیں کیا البتہ مولویوں کے استنجے کے ڈھیلوں کا بہت مضحکہ اڑایا ہے۔ ''وٹوانی'' کے لئے انہیں کوئی انگریزی لفظ نہیں ملا اس لئے آپ نے یہ بعینہ اسی صورت میں استعمال کی ہے (میرا مطلب ہے

ترکیب)۔ مری میں ایک بنگلہ میں ٹھہرے ہوئے تھے تو سامنے کے بنگلے میں ایک سول سرونٹ کے پیر صاحب اپنے مریدوں کے ساتھ قیام فرماتے تھے ان کے مریدانِ باصفا بلا ناغہ ان کے بنگلے کے سامنے ٹہلتے ہوئے وٹوانی فرماتے تھے، ان سے یہ برداشت نہ ہوا۔ سول سرونٹ دوست سے شکایت کی تو وہ فرمانے لگے ''یہ لوگ سنت پر عمل پیرا ہیں آپ کو کیا اعتراض ہے؟''۔ جج صاحب نے کہا ''اگر میں نے انہیں سنت پر دوبارہ عمل پیرا دیکھا تو ان کو پٹوا دوں گا'' (صفحہ ۱۵۷)۔

لکھتے ہیں ''یہی سول سرونٹ جھنگ کے ڈپٹی کمشنر بن کر گئے تو بازار میں گدھے پر سواری فرمائی اور ڈاکٹر نذیر احمد پرنسپل گورنمنٹ کالج جھنگ کو بھی مشورہ دیا کہ وہ طلباء کے جلو میں گدھے پر سوار ہو کر کالج جائیں'' (صفحہ ایضاً) بات یہیں ختم نہیں کی لکھتے ہیں ''میں ہائی کورٹ میں مسٹر سلیم کے ہمراہ بیٹھا تھا۔ وہ ایک گواہ کا بیان سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے جس نے کہا تھا کہ ''جب میں نے یہ وقوعہ دیکھا اس وقت میں چالیسویں بار وٹوانی کر رہا تھا۔'' سلیم صاحب کو ان باریوں کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ پھر یہ قصہ جنیوا تک پہنچ گیا۔ لکھتے ہیں ''میں ہوٹل میں ٹھہرنے کے لئے گیا تو انہوں نے کہا افسوس ہے ہم پاکستانی مہمانوں کو نہیں ٹھہرا سکتے۔ میں نے پوچھا کیوں؟ تو کہنے لگا پاکستانی مہمان ہمارے فلش کے پائپ بند کر دیتے ہیں۔ اور ایسی مٹی سے بند کر دیتے ہیں جو یہاں کی مٹی ہے ہی نہیں۔ وہ اپنے ساتھ اپنی مٹی لے کر آتے ہیں'' (صفحہ ۱۵۷)۔

جسٹس اجمل میاں نے اپنی خودنوشت میں ججز کیس میں اس امر پر پر بڑا زور دیا ہے کہ سب سے سینئر جج کو چیف جسٹس بنائے جانے کا رواج رائج ہے۔ ''ایس ایم ظفر نے عدالت کو بتایا کہ ایوب کے مارشل لاء کے دوران بھی اس رواج کا خیال رکھا جاتا تھا'' (صفحہ ۱۷۸) میں نے ان کی خودنوشت پر لکھتے ہوئے لکھا تھا جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے منظور قادر صاحب کو لاہور ہائی کورٹ کا چیف جسٹس بنایا گیا تھا حالانکہ وہ ہائی کورٹ کے جج تک نہیں تھے۔ جسٹس منیر کی اس کتاب سے اس بات کی تصدیق ہو گئی ہے۔ لکھتے ہیں۔ ''قومی اسمبلی کے پہلے دن منظور قادر کو بہت گالیاں پڑیں۔ بوگرا صاحب نے انہیں راسپوٹین کہا۔ دوسروں نے انہیں ایوب کا نفسِ شیطانی قرار دیا۔ حالانکہ وہ اسمبلی میں موجود نہیں تھے (کیونکہ ان کی جگہ جسٹس منیر وزیر قانون تھے)۔ ایوب بھی اس رویہ سے بہت نالاں ہوئے اور

مجھے کہا کہ جلد سے جلد منظور قادر کو مغربی پاکستان ہائی کورٹ کا چیف جسٹس مقرر کر دیا جائے'' (صفحہ ۹۵) جس روز منظور قادر صاحب پر لے دے کی جا رہی تھی میں شام کے وقت ایوب سے ملا۔ کہنے لگے اور میں ان کے الفاظ دہراتا ہوں ''یہ لوگ مجھے اتنا احمق سمجھتے ہیں؟ میں انہیں اس لونڈے کی انگلی پکڑ کر چلنے والا نظر آتا ہوں'' (صفحہ ایضاً)۔ وہ یہ بتانا چاہتے تھے کہ یہ دستور ان کی اپنی تصنیف ہے جس میں منظور قادر کا صرف نام کا حصہ ہے۔

جسٹس منیر نے عدالتی زندگی میں جو فیصلے دئے ان میں سے اکثر اپنی نوعیت کے پہلے پہلے فیصلے تھے اور عدالتی ریکارڈ میں ان کی نظیر موجود نہیں تھی۔ وکیل تھے تو بھی ایک ایسا مقدمہ لڑا اور جسٹس شادی لال جیسے جج سے جیتا اور پریوی کونسل تک سے توثیق حاصل کی، جس کی نظیر پہلے نہیں تھی اور اب، اب تک اس نظیر کی مثال دی جاتی ہے۔ قانونی نکتہ یہ تھا ''آیا کوئی باپ خود کو اپنے نابالغ بیٹے کا ولی مقرر کئے جانے کی درخواست کر سکتا ہے؟'' ہمارے ہاں جو موشگافی کا محاورہ ہے وہ غالباً ایسی ہی صورتوں کو دیکھ کر وضع کیا گیا ہے۔

سر فضلِ حسین کی ایک بدحواسی بھی پہلی بار جج صاحب کی اس کتاب میں نظر سے گذری۔ قائد اعظم کے دبدبہ کے بارہ میں لکھتے ہوئے لکھا ہے ''قائد اعظم سے سامنا ہؤا تو سر فضلِ حسین ایسے گھبرائے کہ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کی بجائے کہنے لگے میں آپ سے فرماتا ہوں'' (صفحہ ۳۷)۔ کسی کو دیکھا تو ساقی کے ایسے ہوش اڑے۔ شراب سیخ پہ ڈالی کباب شیشہ میں! قائد اعظم کے سامنے بڑے بڑوں کے اوسان خطا ہو جاتے تھے۔

جسٹس منیر کی یہ کتاب ان کے اس عمل کی منہ بولتی تصویر ہے کہ ججوں کو عام لوگوں سے ملنے جلنے سے گریز کرنا چاہئے کیونکہ اس طرح ججوں کی جانبداری کا دروازہ کھلتا ہے۔ ہمارے ہاں روایتیں بدل گئی ہیں اور لوگوں کی اور ججوں کی عادتیں بھی۔ جسٹس سجاد علی شاہ نے ہمارے عدالتی نظام کے باب میں اپنی خودنوشت کے سرورق پر جو ترازو کی تصویر دی ہے وہ ترازو صرف جھکی ہوئی نہیں اس کا انصاف کا پلڑا ہوا میں معلق ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار!

◎

یادداشتیں

جسٹس ڈاکٹر سید نسیم حسن شاہ کا دورِ منصفی برصغیر کے تمام ججوں سے زیادہ تھا مگر مجھے کئی اور وجوہ کی وجہ سے بھی ان کی یادداشتیں پڑھنے کا شوق تھا۔

ہم لوگ یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین میں پہنچے تو ڈاکٹر سید نسیم حسن شاہ ہماری یونین کے اعزازی مشیر اور نگران تھے۔ لاء کالج میں شاید پڑھاتے بھی تھے مگر طلباء کی زائد از نصاب سرگرمیوں میں انہیں بہت دلچسپی تھی۔ اپنے طالب علمی کے زمانہ میں خود بھی مباحثوں میں حصہ لیتے رہے تھے اس لئے مباحثوں میں شرکت کرنے والے طلباء ان کی توجہ کا مرکز بنتے تھے۔ ہمیں یاد نہیں پڑتا کہ شاہ صاحب کو کسی مباحثہ میں آنے کو کہا گیا ہو اور انہوں نے انکار کر دیا ہو بلکہ اپنی دیگر سرگرمیوں کو چھوڑ کر بھی ایسی تقریبات میں شرکت کرتے تھے اس لئے ہمارا ان سے رابطہ بھی بہت تھا اور دوسرے طلباء کی نسبت تھوڑی بہت بے تکلفی بھی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے ان کی ملنساری کی وجہ سے ہر طالب علم یہی سمجھتا ہو کہ میرے ساتھ دوسروں سے زیادہ بے تکلف ہیں۔

سید نسیم حسن شاہ صاحب سے پہلا تعارف تو ان کے والدِ گرامی سید محسن شاہ کی وجہ سے ہؤا۔ وہ انجمن حمایت اسلام کے صدر تھے بے پناہ مستعد اور پر جوش آدمی تھے ہم لوگ اسلامیہ کالج کے ایک مباحثہ کے بعد ان سے ملنے کو حاضر ہوئے تھے۔ جب یہ معلوم ہؤا کہ ہم لوگ ربوہ تعلیم الاسلام کالج کی نمائندگی کر رہے ہیں تو پرانی یادوں کے دریچے کھول کر بیٹھ گئے۔ سر محمد ظفر اللہ خاں انہی دنوں وزارتِ خارجہ کی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو کر انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کے جج کے منصب پر فائز ہوئے تھے ان کی مہربانیوں کا تذکرہ کرتے رہے کہ کس طرح ۱۹۱۹ کے مارشل لاء ٹربیونل کے سامنے انہوں نے ان کے کیس کی پیروی کی اور پہلے آدھے معاوضہ پر اور پھر کسی معاوضہ کے بغیر ان کا کیس لڑتے رہے۔ تحدیثِ نعمت تو بہت بعد میں چھپی ہے ہم نے سید محسن شاہ صاحب سے اس بات کا ذکر پانچ کی

دہائی کے اواخر میں سنا۔ پھر شاہ صاحب آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی خدمات کا ذکر کرتے رہے کہ کس طرح اس کمیٹی نے حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد امام جماعت احمدیہ کی ولولہ انگیز قیادت میں کشمیری عوام کی خدمات سرانجام دیں اور شاہ صاحب کس طرح اس کمیٹی میں ان کے ساتھ مستعد رہے۔ یہ سب کچھ ہم جیسے طالب علموں کے لئے بالکل نیا تھا اور سید محسن شاہ صاحب کی شرافت نسبی پر دال تھا کہ کس طرح وہ اپنے محسنوں کو یاد کرتے تھے اور برملا ان کے بارہ میں کہنے کی جرات رکھتے تھے۔ پھر ہم نے سید محسن شاہ صاحب کو اس وقت بھی دیکھا جب انہوں نے صدر ایوب کو انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں مدعو کیا اور اس جلسہ میں مولانا صلاح الدین احمد نے صدر ایوب کو اور ان کے آئین کو کھری کھری سنائیں۔ سید محسن شاہ اس وقت بھی وقار کی تصویر بنے ہوئے بیٹھے تھے اور ایک آمر کے غصہ کا پورا وبال جھیلنے کو تیار لگتے تھے۔ سید نسیم حسن شاہ کی یادداشتیں پڑھنے کا یوں بھی اشتیاق تھا کہ سید صاحب اپنے والد ماجد کے نقشِ قدم پر چلنے کے بہت دعوے دار تھے اور ہیں۔

چند برس پہلے ڈاکٹر سید نسیم حسن شاہ پاکستان کے چیف جسٹس کے طور پر سٹاک ہالم تشریف لائے اور سویڈش پاکستان فرینڈ شپ سوسائٹی کے ایک خصوصی اجلاس میں مقبوضہ کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے خلاف سویڈش لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے ایک تقریر کی۔ اس محفل میں ہم بھی مدعو تھے۔ تقریب سے قبل شاہ صاحب سے ملاقات ہوئی تو آپ نے نہ صرف ہمیں پہچان لیا بلکہ دوسروں کو چھوڑ کر ہمارے ساتھ بات چیت بھی فرماتے رہے۔ سفیر پاکستان ہمارے ساتھ کچھ خوش نہیں تھے اس لئے انہیں خدشہ ہوا کہ ہم کہیں بھری مجلس میں چیف جسٹس صاحب سے سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کے خلاف کچھ نہ پوچھ بیٹھیں جو انہی دنوں سپریم کورٹ کے ایک بنچ نے اپنی حدود سے تجاوز کرتے ہوئے اور عدل وانصاف کے تمام تقاضوں کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے مارشل لاء کے اس ضابطہ کو جائز قرار دینے کے لئے صادر کیا تھا کہ احمدیوں کے خلاف ضیاء الحق کا جاری کردہ ضابطہ آئین سے متصادم نہیں اور اس کے نتیجہ میں سپریم کورٹ احمدیوں کے انسانی حقوق کی خلاف ورزی میں ایک فریق بن گئی تھی۔ جسٹس نسیم حسن شاہ نے ایک صحافی کے اس سوال پر کہ پاکستان میں احمدیوں کے انسانی حقوق کی جو خلاف ورزی ہو رہی ہے سپریم کورٹ نے اپنے فیصلہ کے ذریعہ اس کو

جائز قرار دے دیا ہے۔ کیا وہ اس کے بارہ میں کچھ کہنا پسند کریں گے؟ جج صاحب نے جواب دیا کہ وہ کچھ کہنا پسند نہیں کریں گے کیونکہ احمدیوں نے اس فیصلہ کے خلاف اپیل دائر کر دی ہے اور معاملہ عدالت کے زیر غور ہے۔

اس پر مسٹر کرسچین سن جو سوسائٹی کے پریذیڈنٹ تھے اٹھے اور کہنے لگے اس مجلس میں کشمیر کے سوا کسی اور معاملہ پر سوال کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ چلئے چھٹی ہوئی۔ ہم نے صدر کی اجازت سے ایک سادہ سا سوال کیا کہ جناب کشمیر کی جد و جہد آزادی کا ذکر آپ نے ۱۹۴۷ سے شروع کیا ہے حالانکہ یہ جد و جہد تو ۱۹۳۱ سے جاری ہے جب کشمیر کمیٹی نے اس کام کو شروع کیا تھا اور آپ کے والد ماجد بھی اس کمیٹی کے رکن تھے۔ کیا اس جد و جہد کو شروع کرنے والی جماعت کو پاکستان میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا نشانہ نہیں بنایا جا رہا؟ جسٹس سید نسیم حسن شاہ نے اس بات پر صاد فرمایا کہ کشمیر کی آزادی کی جد و جہد ۱۹۳۱ میں شروع ہوئی تھی اور کشمیر کمیٹی نے جس کے صدر حضرت امام جماعت احمدیہ تھے اس بارہ میں بہت کام کیا تھا۔ جسٹس نسیم حسن شاہ نے ہماری درخواست پر پاکستان کے عوام کے نام ہمارا یہ پیغام پہنچانے کی حامی بھی بھری مجلس میں بھری کہ پاکستان میں احمدیوں کے انسانی حقوق کی خلاف ورزی بند کر دی جائے۔ اس پر حاضرین جلسہ نے جن کی تعداد کوئی دو سو کے قریب تھی پرزور تالیوں سے شاہ صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ اگلے روز کے سویڈش اخبارات نے جسٹس سید نسیم حسن شاہ کی اس یقین دہانی کا بڑے پرجوش الفاظ میں خیر مقدم کیا۔ چیف جسٹس صاحب پاکستان واپس پہنچے تو لوگوں نے ان سے پوچھا کہ یہ کیا بیان آپ سٹاک ہالم میں دے آئے ہیں؟ جناب چیف جسٹس صاحب نے صاف کہہ دیا کہ انہوں نے اس بارہ میں کوئی بات کہی ہی نہیں اور اخباروں میں جو کچھ چھپا ہے وہ جھوٹ کا پلندہ ہے۔ ہم نے ان تمام حاضرین کو جو شاہ صاحب کے جلسہ میں حاضر تھے اور سویڈش پاکستان فرینڈ شپ سوسائٹی کے اراکین تھے، قبلہ شاہ صاحب کا وہ جواب سویڈش زبان میں ترجمہ کر کے بھیج دیا تا کہ ان کے علم میں رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے۔ ہم اس لئے بھی بیچین تھے کہ دیکھیں شاید اس باب میں بھی جناب چیف جسٹس صاحب نے کچھ کہا ہو۔ نہیں کہا! اور کہتے بھی کس برتے پر؟ سویڈش پاکستان فرینڈ شپ سوسائٹی کے صدر مسٹر کرسچین سن اسی بات پر تو مستعفی ہو گئے

تھے کہ چیف جسٹس نے ان کی صدارت میں ایک بات کہی اور پاکستان جا کر لوگوں کے دباؤ پر اس سے بالکل مکر گئے۔

ان ذاتی وجوہ اور دلچسپی کی بنا پر ہم جسٹس ڈاکٹر سید نسیم حسن شاہ صاحب کی خودنوشت پڑھنے کو بہت بیتاب تھے۔ پڑھ ڈالی ہے اور اب بیٹھے ذوق کا شعر گنگنا رہے ہیں۔ بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا۔ جو چیرا تو اک قطرہ خوں نہ نکلا!

جسٹس ڈاکٹر نسیم حسن شاہ، ہمارے ہم عصر ہیں ہم نے اس تمام دور کو دیکھا برتا اور جھیلا ہے جس دور میں وہ عدالت کی کرسی پر متمکن رہے اور انصاف بانٹتے رہے۔ شاید اس بات کا شاخسانہ ہے کہ شاہ صاحب نے اپنے عدالتی فیصلوں کو بھی اپنی یادداشتوں میں شامل کر لیا ہے۔ حالانکہ یادداشتی ادب کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ لکھنے والا اپنی ذات کو اپنے پیشہ ورانہ معاملات سے علیحدہ رکھے۔ جج کا پیشہ ورانہ فرض ہے کہ وہ انصاف کرے اس نے انصاف کر دیا۔ اس کا انصاف یا ناانصافی وقت کا حصہ بن گئی وقت فیصلہ کرے گا کہ وہ فیصلہ درست تھا یا نادرست تھا۔ جج اگر یادداشتوں میں اپنے کئے ہوئے فیصلوں کو موضوع بناتا ہے تو اس کا صرف ایک مطلب بنتا ہے کہ وہ اپنے فیصلہ کے بارہ میں مطمئن نہیں۔ وقت گذرنے کے بعد اب قارئین سے وہ اپنے ان فیصلوں کی توثیق چاہتا ہے۔ جسٹس نسیم حسن شاہ جیسے پڑھے لکھے جج سے اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ اپنے فیصلوں پر دوسروں سے ''داد'' چاہیں گے۔ نواز شریف حکومت کو بحال کرنے کے فیصلہ پر انہیں بہت ناز ہے اور بار بار وہ اس فیصلہ پر دوسروں کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھتے ہیں مگر وہ بھول جاتے ہیں کہ یہ فیصلہ ان کے دوسرے عدالتی رفقاء کی نگاہ میں بھی متنازعہ فیصلہ تھا اور اس کے پس منظر کی چمک دمک سے تو ایک جہان کی نگاہیں خیرہ ہوگئیں تھیں۔ جہاں تک پاکستان کے عدالتی نظام کی استواری کا تعلق ہے جسٹس سید سجاد علی شاہ کی خودنوشت اس نظام کے ساتھ وابستہ لوگوں کو آئینہ دکھا چکی ہے اور کوئی اس کو جھٹلانے والا سامنے نہیں آیا۔ اور تو اور جسٹس سید نسیم حسن شاہ نے بھی اس سارے ''حادثہ فاجعہ'' کا ذکر تو کر دیا ہے اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا حالانکہ پڑھنے والا مشتاق نگاہوں سے دیکھ رہا تھا کہ دیکھئے ایک چیف جسٹس کا جانشین چیف جسٹس کیا کہتا ہے؟ پھر جسٹس نسیم حسن شاہ نے خود اعتراف کیا ہے کہ بھٹو کی اپیل کے دوران جسٹس

مولوی مشتاق حسین اور شریف الدین پیرزادہ ان کے ہاں آئے تھے اور ان سے بنچ میں ''شامل'' ہونے کی پرزور اپیل کی تھی۔ یہ کیسا عدالتی نظام ہے؟ پھر جسٹس نسیم حسن شاہ نے ''پہلی بار'' اعلان فرمایا ہے کہ انہوں نے جسٹس انوارالحق کے کہنے پر جسٹس دراب پٹیل کو بھٹو کے کیس میں کچھ کہنے سننے کی کوشش کی تھی۔ یہ سب کچھ کیا ہے؟ کیا دنیا میں کہیں اور بھی ایسا ہوتا ہے؟ جسٹس سجاد علی شاہ نے رفیق تارڑ کا نام لے کر یہ الزام لگایا تھا کہ وہ کوئٹہ بنچ والوں کے لئے سوٹ کیس بھر بھر کر ''مشورے'' لے کر گئے تھے اور رفیق تارڑ کو اس الزام کی تردید کرنے کی جرات نہیں ہوئی۔ اے کاش سید نسیم حسن شاہ ''چمک دمک'' والے الزامات کا کوئی کافی شافی جواب دے سکتے!

جسٹس نسیم حسن شاہ جس عہدہء جلیلہ سے سبک دوش ہوئے اس کا تقاضا تھا کہ وہ انصاف کو ملحوظ رکھتے، شاہ صاحب کی یادداشتیں پڑھنے والے کا تاثر یہ بنتا ہے کہ وہ انصاف کے لفظ پر تو یقین رکھتے ہیں انصاف کی روح ان کے نزدیک اہمیت نہیں رکھتی۔ وہ عمر بھر حکومت کے ساتھ رہے۔ مارشل لاء کے آمروں کے ساتھ تعاون کرنا ان کا شیوہ رہا۔ ضیاء الحق کے پی سی او کے تحت حلف محض اس لئے اٹھالیا کہ ابھی ان کی سروس کے چودہ پندرہ سال باقی تھے اور جن لوگوں نے حلف اٹھانے سے انکار کیا ان کی سروس ایک یا دو سال میں اختتام کو پہنچنے والی تھی! یہ لکھ کر جسٹس نسیم حسن شاہ نے جسٹس فخرالدین جی ابراہیم اور جسٹس دراب پٹیل جیسے جراتمند ججوں سے بڑی زیادتی اور ناانصافی کی ہے کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جن لوگوں نے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے خلاف قربانیاں دی ہیں! جسٹس نسیم حسن شاہ پر تو ایسا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔ معلوم ہوتا ہے ہمارے دوست اکبر حمیدی کا یہ شعر نسیم حسن شاہ صاحب نے سن رکھا ہے'' ہماری جنگ اندھیروں سے ہے ہوا سے نہیں۔ دیا جلا کے نہ یوں سامنے ہوا کے رکھ''! جسٹس نسیم حسن شاہ نے بزعم خود اندھیروں سے جنگ کی ہوا کے سامنے دیا جلا کر رکھنے کی غلطی نہیں کی۔ ''عزت آبرو'' کے ساتھ ریٹائر ہوئے ہیں اور ہمارے ملک میں یہ کیا کوئی کم کارنامہ ہے۔

جسٹس نسیم حسن شاہ کی یہ یادداشتیں پراگندہ یادداشتیں ہیں۔ آغاز اپنی کوتاہ قامتی کے تذکرہ سے کیا ہے اور اس احساس نے عمر بھر ان کو نہیں چھوڑا۔ حالانکہ ان کے والد ماجد بھی کوتاہ قامت تھے مگر

انہیں اپنی اس کمی کا کوئی کامپلیکس نہیں تھا۔ ان کے اوصاف ان کی اس کمی کو ڈھانپ لیتے تھے۔ نسیم حسن شاہ باپ کے خلف الرشید تو ہیں مگر باپ کی خوبیوں کا ورثہ ان کے ورثاء میں تقسیم ہو گیا ہے احسان شناسی، جرات، قربانی، یہ تمام اوصاف بکھر گئے ہیں۔

فنی لحاظ سے ایک کمی بہت نمایاں ہے کہ یادداشتوں میں جس دوست یا شخصیت کا ذکر آتا ہے اس کے سوانحی حالات لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ کم از کم مجھ جیسے کم علم کو بہت سی شخصیات کے سوانحی حالات کا علم ان کی خودنوشت سے ہوا مثلاً کیا آپ یہ کتاب پڑھنے سے پہلے جانتے تھے کہ بیرسٹر خالد انور، چوہدری محمد علی سابق وزیراعظم کے صاحبزادے ہیں؟ یا ایس ایم ظفر کہاں کے رہنے والے ہیں؟ یا غلام محمد سابق گورنر جنرل کے داماد کا کاروبار کیا تھا؟

اتفاق ہے کہ ہمالیہ کے دامن میں بسنے والی بستی کانگڑہ سے تعلق رکھنے والے دو قانون دان اپنے اپنے ملک میں چیف جسٹس ہوئے جسٹس مہاجن بھارت کے اور جسٹس نسیم حسن شاہ پاکستان کے۔ دونوں کے باپ قانون کے پیشہ سے وابستہ تھے اور اپنے اپنے حلقہ میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ دونوں نے اپنے اپنے نکتہ ءنظر سے کشمیر سے اپنی وابستگی کا اظہار کیا ہے، جسٹس نسیم حسن شاہ نے اپنے والد ماجد کی خدمات کا ذکر تو کیا مگر کشمیر کمیٹی سے ان کی وابستگی کا ذکر گول کر گئے ہیں۔ پھر اپنی قانونی موشگافیوں سے کشمیر کے مسئلہ کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ جسٹس مہاجن نے سر ظفر اللہ کے نکات قانونی کو 'ان کی بے پناہ قانونی قابلیت' کا شاخسانہ قرار دے کر انہیں رد کیا ہے جسٹس نسیم حسن شاہ نے اپنے زعم قانون دانی میں سر ظفر اللہ خاں کے پیش کردہ نکات کو اپنے نکات کہہ کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ بنیادی نکات وہی ہیں جو سر ظفر اللہ خاں نے یو این او میں منوا لئے تھے باقی جو کچھ ہوا وہ بین الاقوامی سیاست کا کیا دھرا ہے۔ کشمیر میں جو خوں ریزی ہو رہی ہے اس کا ذمہ دار ماؤنٹ بیٹن ہے۔ جسٹس نسیم حسن شاہ کی اس کتاب میں ایک ایسا باب ہے جو پاکستان کے ساتھ ہونے والی بے انصافیوں کے تذکرہ پر مشتمل ہے اور اس کا عنوان ہے "باوفا دوستوں کی بے وفائی"۔ یہ باب مفید (مگر پرانی اور، غیر اوریجنل) معلومات پر مشتمل ہے اور ان تاریخی حقائق کا تجزیہ پیش کرتا ہے جن کی وجہ سے پاکستان کو ناقابل بیان مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور لاکھوں لوگ ظلم اور بربریت کا شکار ہوئے۔

جسٹس نسیم حسن شاہ نے اپنے مرشد اور محسن، جسٹس منیر کے بارہ میں لکھا ہے کہ انہوں نے مولوی تمیز الدین خاں سپیکر کی اسمبلی توڑنے کے فیصلہ کو جائز قرار دیدیا تھا مگر فیصلہ سنا کر واپس اپنے گھر جاتے ہوئے اپنے ایک عزیز کے ہاں ٹھہرے تو اتفاق سے نسیم حسن شاہ بھی وہاں پہنچ گئے دیکھا کہ عدالت میں شیر ببر کی طرح گرجنے اور رعب داب رکھنے والے چیف جسٹس صاحب ایک صوفہ پر بیہوش پڑے ہیں اور لوگ ان کے تلوے مل رہے ہیں اور ان کے منہ پر پانی کے چھینٹے دے کر انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ (ملک کی قسمت کو بدلنے والا فیصلہ دینے کے بعد چیف جسٹس کے ضمیر پر جو بوجھ تھا وہ اپنا اثر دکھا رہا ہوگا) نسیم حسن شاہ صاحب نے دوسرا رخ بھی دکھایا ہے کہ قسمت کی خوبی دیکھئے کہ ایوب کے آئین کے تحت جو الیکشن ہوئے اس میں مولوی تمیز الدین خاں پھر اسمبلی کے سپیکر چن لئے گئے۔ جسٹس منیر ریٹائر ہونے کے بعد ایوب خاں کی کابینہ میں وزیر قانون مقرر ہوئے اور اس طرح اسمبلی میں داخل ہوتے تو انہیں، مولوی تمیز الدین خان کو جھک کر آداب بجالاتے! مولوی تمیز الدین خاں اپنے عہدہ کے فرائض ادا کرتے ہوئے فوت ہوئے، جسٹس منیر ۸۵ سال کی عمر میں بڑی افسردگی کے عالم میں راہی ءملکِ بقا ہوئے کیونکہ ان کے نزدیک حکومت، آئین و قانون کی دھجیاں اڑا رہی تھی۔

مجموعی طور پر جسٹس نسیم حسن شاہ کی یہ یادداشتیں سوانحی ادب میں بھی ان کے بعض فیصلوں کی طرح شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی اے کاش وہ زیادہ انصاف پسند ہوتے اور آمروں کو تحفظ دینے کے اقدامات کو ٹھیک ثابت کرنے کی بجائے ان پر ندامت کا اظہار کرتے تو ان کی قدر و قیمت پڑھنے والوں کی نگاہ میں بہت بڑھ جاتی!

ایک تماشائی کی یادداشتیں

جناب اقبال اخوند پاکستان کے جانے پہچانے اور مشہور سفارت کار تھے۔ آپ نے ملازمت سے فراغت کے بعد اپنی خودنوشت ایک تماشائی کی یادداشتیں memoirs of a bystander کے عنوان سے انگریزی میں لکھی۔ اخوند صاحب کا تعلق صوبہ سندھ سے ہے مگران کی بیگم مشرقی پاکستان حال بنگلہ دیش سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی سفارتی زندگی کا بیشتر حصہ ملک سے باہر گذرا مگر ملک کے اندر باہر کے سیاسی وسماجی تغیرات ان کی نگاہِ دوربین سے اوجھل نہیں رہے۔ سفارت کار ہونے کے ناطے ان کے نظریات اس طرح الم نشرح نہیں ہو سکتے تھے جس طرح دوسرے لوگ علی الاعلان اپنے احساسات وتعصبات کا اظہار کر سکتے ہیں مگر ملازمت سے فراغت کے بعد آپ نے اولیں فرصت میں اپنی یادداشتوں کو بیان کر دیا ہے۔ ان کا زیادہ حصہ یو این سے متعلق ہے اور یو این کا حلقہ تیسری دنیا کے ہر ملک کے لئے بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔

اقبال اخوند چھٹی دہائی میں یو این سے متعلق تھے۔ ''چوہدری ظفراللہ خاں، (جو پرنس علی خاں کے بعد، ایوان میں پاکستان کے مستقل نمائندے بن کر آگئے تھے) جنرل اسمبلی کے صدر منتخب ہو گئے اور اس عہدہ کے اعزاز میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔ انہوں نے اس عہدہ کی شہرت کو چار چاند لگا دئے جو ان سے قبل کوئی نہیں کر سکا تھا یعنی اسمبلی کے اجلاسوں کا عین وقت پر شروع کر دینا۔ ان کا طریق بڑا جراتمندانہ اور سادہ تھا۔ وہ عین ساڑھے دس بجے، سٹیج پر آتے، اپنی کرسی پر متمکن ہوتے اور صدارتی ہتھوڑا میز پر مارتے۔ شروع شروع میں مندوبین بڑے بے مزہ ہوئے مگر رفتہ رفتہ عادی ہو گئے۔ چنانچہ ایک اجلاس بھی ایسا نہ ہوا جو وقت پر شروع نہ ہوا ہو۔ حتیٰ کہ وہ اجلاس بھی عین وقت پر شروع ہو گیا جس میں الجیریا کو لمبی تگ ودو کے بعد آخر کار، یو این اسمبلی کا رکن بننا اور اپنی جگہ سنبھالنا تھی۔ مصیبت یہ تھی کہ الجیریا کا وفد ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ چوہدری ظفراللہ خاں نے اپنے دستور کے مطابق

صدارتی ہتھوڑا میز پر مارا اور اجلاس کی کارروائی شروع کرنے کا اعلان کر دیا (گویا ہیملٹ کا ڈرامہ پرنس آف ڈنمارک کے بغیر ہی شروع کر دیا) اتنے میں اسمبلی کا چیف آف پروٹوکول الجیریا کے وفد کے ساتھ ہانپتا کانپتا ہال میں داخل ہوا۔'' (صفحہ ۵۸۔۵۹)۔ یہ گواہی ایک عینی گواہ کی ہے اور ہمارے ہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو حقائق کا جانتے بوجھتے ہوئے بھی اخفا روا رکھتے ہیں مگر اقبال اخوند کو داد دینی چاہئے کہ انہوں نے اپنی گواہی بہ تمام وکمال دنیا تک پہنچا دی اور کسی تعصب کو اپنی راہ میں حائل نہ ہونے دیا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب سلامتی کاؤنسل میں کشمیر کا سوال دوبارہ اٹھایا گیا تھا۔ اس ضمن میں بھی ان کی گواہی پڑھنے کی ہے۔ ''سلامتی کاؤنسل میں کشمیر کا سوال اٹھایا گیا تو انڈیا کے نمائندہ مسٹر کرشنا مینن نے اپنے مخصوص انداز میں پانچ گھنٹے تک تقریر کی اور حسبِ معمول ادھر ادھر کی ہانکتے رہے کہ ''پاکستان میں 'بنیادی جمہوریت' رائج ہے مگر ہمارے ہاں جمہوریت بنیادی ہے''۔ وغیرہ۔ کشمیر کے بارہ میں انہوں نے کہا کہ جموں اور کشمیر انڈیا کا حصہ بن چکا ہے کیونکہ مہاراجہ کے الحاق کر لینے کے بعد ریاست میں کئی بار انتخابات ہو چکے ہیں اور اس بات کی تصدیق کی جا چکی ہے اس لئے پاکستان کے موقف میں کوئی جان نہیں ہے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ انڈیا نے یو این سی آئی پی (یعنی یونائیٹڈ نیشنز کمیشن فار انڈیا اینڈ پاکستان) کے ریزولیشنز کے خلاف موقف اختیار کیا۔ ظفراللہ خاں نے نہ صرف اس سے (کرشنا مینن) سے ایک گھنٹہ زیادہ تقریر کی بلکہ قانونی لحاظ سے انڈیا کے موقف کے پرخچے اڑا کر رکھ دئے۔'' (صفحہ۷۱)۔

میری کتاب ''پس نوشت'' میں کسی جگہ ایک شپرہ چشم سول سرونٹ ہاشم رضا کی بات بیان ہوئی ہے کہ ''سرظفراللہ خان کو امورِ خارجہ کے معاملہ میں قابل ترین آدمی قرار دینا محض پراپیگنڈا تھا اور یہ کہنا کہ وہ اقوام متحدہ میں مسحور کن اثر رکھتے تھے ان کی غلط تصویر کشی کے مترادف تھا'' (ہماری منزل صفحہ ۱۱۴) ہاشم رضا کو یہ ساری باتیں اس لئے نظر نہیں آئیں کہ انہیں وزارت خارجہ نے من مانی کارروائیاں کرنے سے حکماً روک دیا تھا اور اتفاق یوں ہے کہ اس زمانہ میں سرظفراللہ خاں پاکستان کے وزیر خارجہ کے منصب پر فائز تھے۔ ان کی وزارت خارجہ کے زمانہ میں بھی اخوند صاحب سفارتی منصب پر

تھے۔ان کی یہ بات بھی سن لیجئے ''۱۹۴۷ سے ۱۹۵۲ تک کا دور نسبتاً خوش خلقی کا دور تھا۔ وزیر خارجہ چوہدری ظفراللہ خاں نے فلسطین کے قضیہ کے علاوہ اریٹیریا سے لے کر الجیریا تک کے مسلمانوں کے مسائل کو بڑی خوبی سے یو این او میں پیش کیا تھا اس کی وجہ سے پاکستان کی شہرت عربوں کے موقف کے سب سے بڑے اور سب سے زبردست حامی کی تھی۔'' (صفحہ ۱۷۸) اور ابھی شاید ہاشم رضا صاحب کو سابق سکرٹری خارجہ اور سینئر سفیر جناب شہر یار خان کی یہ ''ناگوار'' بات بھی سننا پڑے جو شہر یار خان کی والدہ محترمہ بیگم عابدہ سلطان نے اپنی خودنوشت میں لکھی ہے کہ ''تیونس میں ماؤں نے اپنے بچوں کے نام ظفراللہ کے نام پر رکھ دیئے تھے کیونکہ انہوں نے شمالی افریقہ کے ان ممالک کی آزادی کی جدو جہد میں نمایاں کارنامے سرانجام دئے تھے'' (باغی شہزادی کی یادداشتیں صفحہ ۲۷۸)۔ بھلا سورج کی روشنی کو بھی دھندلایا جاسکتا ہے؟

اقبال اخوند نے سندھی ہونے کے باوجود بھٹو صاحب کی سیاسی غلطیوں سے صرفِ نظر نہیں کیا اور برملا کہا کہ'' سیاسی سطح پر بھٹو سے دو غلطیاں ہوئیں۔ایک تو یہ کہ اس نے سرحد اور بلوچستان کی حکومتوں کو جو این اے پی کی حکومتیں تھیں برطرف کر دیا۔ دوسری غلطی اس سے یہ ہوئی کہ اس نے قادیانی مسئلہ کو سلجھانے کے لئے غلط طریقہ اختیار کیا۔۱۹۷۴ میں ربوہ کے سٹیشن پر معمولی سی جھڑپ ہوئی، یہ فساد پھیلنے کا خطرہ تھا اس موقعہ سے بنیاد پسندوں نے فائدہ اٹھایا اور شور مچایا کہ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا جائے۔بھٹو کو ڈر تھا کہ یہ صورت ۱۹۵۳ والی صورت نہ بن جائے اس نے کہا یہ مسئلہ اسمبلی حل کرے گی اور (اسمبلی میں پی پی پی کی اکثریت تھی) چنانچہ اسمبلی نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا۔بھٹو بڑا خوش تھا کہ اس نے نے ایک پرانے مسئلہ کو خوش اسلوبی سے حل کرلیا ہے۔مگر اس نے مذہبی جماعتوں پر اپنی کمزوری عیاں کر دی تھی اور مذہبی جماعتوں کو پتہ چل گیا تھا کہ وہ اپنے سیاسی مقاصد کے لئے مذہب کو استعمال کرسکتی ہیں۔مذہبی جماعتوں نے بھٹو کو ذرا سا کریڈٹ بھی نہیں دیا۔ ۱۹۷۷ کے الیکشن میں یہی مذہبی جماعتیں اس کی مخالفت میں پیش پیش تھیں۔بعد میں ضیاء الحق کے زیر سایہ ملاؤں کے سنہرے دور میں قادیانیوں کی ایذادہی اور حق تلفی کے لئے قرونِ وسطیٰ جیسے قوانین وضع کئے گئے اور انہیں باقاعدہ قانونی شکل میں نافذ کیا گیا'' (صفحہ ۳۰۷-۳۰۸)

اقبال اخوند صاحب کا یہ تجزیہ بھی آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ'' وہ رہنما جو کسی قسم کے سیاسی اصولوں سے وابستہ نہیں ہوتے محض سیاسی اقتدار اور اس کے ساتھ جو مفادات وابستہ ہیں ان کے حصول میں لگے رہتے ہیں ۔ پاکستان میں ایسے ہی رہنماؤں کی وجہ سے سیاست بے اصولی کا کھیل بن کر رہ گئی ہے۔بھٹو نے بھی جب محسوس کیا کہ اس کا اقتدار خطرہ میں ہے تو اس نے اپنے مفاد کے لئے قادیانی مسئلہ پر بے اصولی دکھائی اسی طرح اپنے اقتدار کے آخری دنوں میں شراب اور جوئے پر پابندی عاید کرنے کا اعلان کیا''۔ (صفحہ ۳۹۲) یہ تمام باتیں ان کے ڈولتے ہوئے راج سنگھاسن کو سنبھالا نہ دے سکیں۔

اخوند صاحب جیسے جراتمند سفارت کار کی یادداشتیں تاریخ میں اپنی صداقت بیانی کی وجہ سے ممتاز طور سے باقی رہیں گی۔

◎

کانچ کے گھر میں

پاکستان کے عدالتی نظام کے بارہ میں جس خود نوشت نے دنیا بھر میں تہلکہ برپا کر دیا وہ سابق چیف جسٹس سید سجاد علی شاہ کی انگریزی خود نوشت ''پاکستان کا عدالتی نظام: کانچ کے گھر میں'' ہے۔ سجاد علی شاہ کی شہرت ایک خدا ترس' نیک اور انصاف پسند جج کی ہے۔ وہ ایک اوسط درجہ کے گھرانے سے اٹھے اور پاکستان کے عدالتی نظام کے اعلیٰ ترین درجہ تک پہنچے۔ وکیل رہے پھر ایڈیشنل سیشن جج ہوئے پھر ہائی کورٹ کے جج اور انجام کار پاکستان کے چیف جسٹس۔ ان کے ساتھ عام طور سے کسی سیاسی وابستگی کا تصور وابستہ نہیں تھا مگر جب انہیں ان کی باری سے ہٹ کر چیف جسٹس بنایا گیا تو لوگوں نے انگلیاں ضرور اٹھائیں کہ ایک سندھی کو ایک سندھی سربراہ حکومت نے چیف جسٹس بنا دیا ہے حالانکہ صدر نے اپنی صوابدید پر ایسا فیصلہ کیا تھا بعد کو جسٹس سجاد نے خود سپریم کورٹ سے یہ فیصلہ صادر کیا کہ چیف جسٹس کے عہدہ کے لئے سب سے سینئر جج کو ہی چیف جسٹس بننا چاہئے۔ یہ فیصلہ مؤخر بہ ماضی نہیں تھا مگر ان کے بعض رفقا ہی نے سیاسی اغراض کے پیش نظر اسی فیصلہ کو ان کے خلاف فیصلہ دینے کا بہانہ بنایا اور دنیا کی عدالتی تاریخ میں ایک گھناؤنی روایت کی بنیاد ڈالی۔

اس خود نوشت کی سیاسی اہمیت اس لئے بھی بڑھ گئی کہ اب پچھلے دنوں پاکستان کے نئے حکمران جنرل پرویز مشرف نے پاکستان کے نام نہاد منتخب صدر رفیق تارڑ کو بیک بنی و دو گوش ایوان صدر سے رخصت کر دیا۔ بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچہ سے ہم نکلے! رفیق تارڑ، نواز شریف کی غلط بخشیوں کی نادر مثال تھے۔ ان کے صدارت کے عہدہ پر فائز ہونے کے ما لہٗ اور ما علیہ کا ذکر بہت ہو چکا ہے۔ چیف جسٹس سجاد علی شاہ نے اپنی خود نوشت اس کے دسویں باب میں رفیق تارڑ کی ان ''خدمات جلیلہ'' کا ذکر کیا ہے جن کے نتیجہ میں وہ اس انعام عظیم کے مستحق قرار دئے گئے۔ یہ داستان دلچسپ بھی ہے عبرت انگیز بھی۔

اول اول تو محسن بھوپالی کا شعر یاد آتا ہے کہ نیرنگیٔ سیاست دوراں تو دیکھئے۔ منزل انہیں ملی

جو شریک سفر نہ تھے۔ پھر وہ دن یاد آتے ہیں جب نواز شریف نے اپنے چیلے چانٹوں کے ذریعہ پاکستان کی اعلیٰ ترین عدالت کی عمارت پر ہلہ بول دیا تھا اور پھر وہ منظر سامنے آتا ہے تو ہر پاکستانی کا سر شرم سے جھک جاتا ہے کہ عدالت کے بعض جج صاحبان نے محض دنیاوی مراعات کے لالچ میں اپنے ہی چیف جسٹس کے خلاف ایک فیصلہ صادر کر کے عدلیہ کی تاریخ کا سب سے گھناؤنا جرم کیا تھا۔ اس جرم کے پس پردہ جو شخص تھا وہی پاکستان کی معزز ترین کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

ہمیں یاد ہے جب پانچ کی دہائی میں پنجاب کی سیاسی تاریخ میں ایک صاحب مسمی عبدالغنی گھمن وزارت کی کرسی پر بٹھائے گئے تو ایک اخبار نے اپنے اداریہ میں صرف اتنا لکھا کہ چوہدری عبدالغنی گھمن بھی وزیر ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون مگر ہماری بدقسمتی کہ اس موقعہ پر کسی کو ایسا لکھنے کی جرات نہ ہوئی۔ یا تو ہماری صحافت زرد تھی یا ہمارا رنگ زرد تھا۔

چیف جسٹس ریٹائرڈ جسٹس سجاد علی شاہ کی خود نوشت میں سے متعلقہ حصہ یوں ہے ''۱۵ دسمبر ۱۹۹۷ کو کابینہ کے ایک نیم شبی اجلاس کے بعد وزیر اعظم نواز شریف نے اعلان کیا کہ وہ مسلم لیگ کی جانب سے جسٹس ریٹائرڈ رفیق تارڑ کو صدر مملکت کے عہدہ کے لئے نامزد کر رہے ہیں۔ اس امیدوار کا ذکر نامزدگی سے قبل (انگریزی محاورہ کے مطابق) دور دور تک کہیں 'کالے گھوڑوں' میں بھی نہیں تھا۔ وزیر اطلاعات مشاہد حسین نے سینئر تارڑ کو سیدھا سادہ مسلمان اور پاکستان سے گہری وابستگی رکھنے والا مسلمان اور مضبوط کردار کا مالک قرار دیا۔ آپ لاہور ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس اور سپریم کورٹ کے جج رہے اور ۱۹۹۴ میں ریٹائر ہونے کے بعد مسلم لیگ کے ٹکٹ پر لاہور سے سینیٹ کے رکن منتخب کئے گئے۔ یہ نامزدگی سب کے لئے حیران کن تھی کیونکہ صدارت کے عہدہ کے لئے نمایاں امیدواروں میں وسیم سجاد (چیرمین سینیٹ) الٰہی بخش سومرو (سپیکر قومی اسمبلی) سرتاج عزیز، اور غوث علی شاہ کے نام لئے جا رہے تھے۔ نواز شریف نے اس اعلان سے قبل چیف آف آرمی سٹاف سے بھی ملاقات کی۔ افواہ یہ تھی کہ سینئر تارڑ کے نواز شریف کے والد سے قریبی تعلقات تھے اور یہ کہ یہ انہی کا انتخاب تھا۔ اپوزیشن والوں یعنی پی پی پی والوں نے آفتاب شعبان میرانی کو صدارت کا امیدوار نامزد کیا تھا۔

قائمقام چیف الیکشن کمشنر جسٹس مختار احمد جونیجو کے سامنے ۱۸ دسمبر ۱۹۹۷ کو بہت سے کاغذات نامزدگی داخل کئے گئے۔ سینئر رفیق تارڑ کے کاغذات نامزدگی کے خلاف بہت سے اعتراض

اٹھائے گئے۔ مختلف فریقوں کی طرف سے پیش ہونے والے وکلاء کو سننے کے بعد قائمقام چیف الیکشن کمشنر نے صدر کے عہدہ کے لئے سینیٹر رفیق تارڑ کے کاغذات مسترد کر دئے۔ امیدوار نے کاغذات کے استرداد کے خلاف لاہور ہائی کورٹ میں بیرسٹر اعجاز بٹالوی کے ذریعہ رٹ درخواست دائر کی۔ یہ رٹ ایک بنچ کے روبرو پیش ہوئی جس میں چیف جسٹس راشد عزیز خاں اور جسٹس ملک محمد قیوم شامل تھے۔ چیف جسٹس نے عذر کیا کہ چونکہ وہ الیکشن کمیشن کے رکن ہیں اور قائمقام چیف الیکشن کمشنر نے کاغذات کے استرداد کا فیصلہ دیا ہے اس لئے ان کا سماعت کرنے والے بنچ میں شامل ہونا مناسب نہیں۔ مسٹر بٹالوی نے جواب میں کہا کہ ان کی رائے میں جج موصوف کی چیف جسٹس کی حیثیت اپنی جگہ مسلم ہے اور دوسرے عہدے اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ اندریں حالات وہ بنچ میں شامل بھی رہیں تو ان پر کوئی حرف نہیں آتا۔ چیف جسٹس نے جسٹس قیوم سے مختصر سا مشورہ کرنے کے بعد یہی فیصلہ کیا کہ وہ اس بنچ میں شرکت نہیں کریں گے۔

مسٹر بٹالوی نے دلائل دیتے ہوئے کہا کہ قائمقام چیف الیکشن کمشنر نے اپنے فیصلہ کی بنیاد دو تراشوں پر رکھی ہے۔ ایک تراشہ 'تکبیر' جون ۱۹۹۶ کا ہے جس میں درخواست دہندہ کا انٹرویو چھپا ہے۔ دوسرا تراشہ ایک بیان کا ہے جو 'جنگ' راولپنڈی مؤرخہ ۴ دسمبر ۱۹۹۷ میں چھپا ہے۔ درخواست دہندہ رفیق تارڑ ۱۹۹۶ میں سینیٹ کا رکن منتخب ہوا تھا۔ اس کا مذکورہ بیان اور اس کا یہ انٹرویو سینیٹ کے امیدوار کی حیثیت سے اس کے کاغذات نامزدگی کی منظوری کی راہ میں یا پارلیمنٹ میں ایک سینیٹر کی حیثیت سے اس کے داخلہ کی راہ میں حائل نہیں ہوا تھا۔ سینیٹر رفیق تارڑ کا وہ بیان یہ تھا' مسٹر تارڑ نے کہا کہ یہ مسئلہ ایک ایسے جج کی جانب سے کھڑا کیا گیا تھا جو انگریزوں کا (جیالا) پٹھو اور عدالتی دہشت گرد تھا۔ اور یہ کہ اب وہ بے عزت اور ذلیل ہو کر منظر سے ہٹ گیا ہے'۔

مسٹر بٹالوی نے وضاحت کی کہ 'جیالے' کا لفظ برطانوی راج کے پس منظر میں کسی جج پر منطبق نہیں ہوتا اور ان الفاظ کو کہ 'وہ بے عزت اور ذلیل ہو کر منظر سے ہٹ گیا ہے' بالکل غلط مفہوم پہنایا گیا ہے کیوں کہ کوئی جج ۲ دسمبر ۱۹۹۷ کو منظر سے نہیں ہٹا تھا۔ فاضل جج نے فیصلہ پر عمل درآمد روک دیا' قائمقام چیف الیکشن کمشنر اور حکومت کو نوٹس جاری کر دئے۔ چیف جسٹس سے درخواست کی کہ وہ اس درخواست کی سماعت کے لئے بڑا بنچ تشکیل دیں اور مزید سماعت کے لئے سماعت ملتوی کر دی۔

صدر کے انتخاب کے لئے ۳۱ دسمبر ۱۹۹۷ کو الیکشن ہونا تھا۔ پہلا کام تو یہ کیا گیا کہ قائمقام چیف الیکشن کمشنر کی جگہ مستقل چیف الیکشن کمشنر مقرر کر دیا گیا۔ آرٹیکل ۲۱۳ کی رو سے چیف الیکشن کمشنر کا تقرر خالصتہً صدر کی صوابدید پر منحصر ہوتا ہے اور اس کے لئے وزیر اعظم کی ہدایت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جسٹس مختار احمد جونیجو کو قائمقام چیف الیکشن کمشنر مقرر کیا گیا تھا تو باقاعدہ چیف جسٹس سے استصواب کیا گیا تھا۔ اس موقعہ پر صدر مستقل چیف الیکشن کمشنر کا تقرر بھی کر سکتے تھے مگر صدر نے چیف الیکشن کمشنر کا تقرر نہ کیا۔ اب ایک قائمقام صدر نے مستقل چیف الیکشن کمشنر کا تقرر کر دیا (کیسے کر دیا یہ ایک قابل غور مسئلہ ہے)۔ ظاہر ہے وزیر اعظم کی ہدایت پر قائمقام صدر وسیم سجاد نے جسٹس ریٹائرڈ عبدالقدیر چوہدری کے تقرر کا حکم جاری کر دیا۔ ۲۸ دسمبر ۱۹۹۷ کو چیف جسٹس آف پاکستان نے ان سے اس عہدہ کا حلف لیا۔

لاہور ہائی کورٹ نے سینیٹر رفیق تارڑ کو الیکشن لڑنے کی اجازت دے دی اور قائمقام چیف الیکشن کمشنر کے کاغذات نامزدگی کے استرداد کے بارہ میں جاری کردہ احکام منسوخ کر دئے۔ انہوں نے اپنی الیکشن مہم شروع کی اور صدر کی حیثیت میں جو اعزاز و اکرام انہیں ملنے والا تھا وہ پہلے ہی وصول کرنا شروع کر دیا کیونکہ وزیر اعظم کی نامزدگی حاصل کرنے کے بعد ان کی کامیابی یقینی ہو گئی تھی۔ خاص طور سے چودھویں ترمیم کے بعد تو قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے ارکان پاکستان مسلم لیگ نواز گروپ کے لیڈر کے خلاف کوئی قدم اٹھا سکتے تھے نہ ان کے فیصلوں پر تنقید کر سکتے تھے۔ اس لئے نامزدگی کا یہ فیصلہ خفی و جلی طور پر ناطق تھا اور تمام اتحادی پارٹیوں نے اس پر اسی روح کے ساتھ عمل بھی کیا۔

سینیٹر رفیق تارڑ اسلام آباد سے دوسرے صوبوں کے مراکز تک وزیر اعظم کے خصوصی طیارہ میں گئے۔ کراچی میں ایم کیو ایم کے ہیڈکوارٹر میں بھی قدم رنجہ فرمایا۔ مبینہ طور پر ان کے الیکشن پر اٹھنے والے تمام اخراجات حکومت نے برداشت کئے۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۹۷ کو الیکشن ہوا اور سینیٹر رفیق تارڑ صدر بن گئے۔ آپ نے قومی اسمبلی، صوبائی اسمبلیوں اور سینیٹ کے مجموعی طور پر ۴۵۷ ووٹوں میں سے ۳۷۴ ووٹ حاصل کئے۔ الیکشن کے بعد احتساب سیل کے سربراہ سینیٹر سیف الرحمٰن نے یہ الزامات مسترد کر دئے کہ سینیٹر رفیق تارڑ کی انتخابی مہم پر حکومت نے روپیہ خرچ کیا تھا۔ حلف برداری کی

تقریب کے بعد رپورٹروں سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ وہ مسٹر تارڑ کے دوروں کے دوران ان کے ہمراہ رہے ہیں اور وزیراعظم کے طیارہ کے تمام اخراجات پارٹی کی طرف سے ادا کئے گئے تھے۔انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ اور رفیق تارڑ کوئٹہ اور کراچی میں سرکاری رہائش گاہوں کی سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کی بجائے ہوٹلوں میں ٹھہرتے رہے ہیں اور یہ بھی کہ حکومت اور عدالت کے جھگڑے کے دوران وہ لاہور میں قیام پذیر تھے اور ''دیگر فرائض'' انجام دینے میں مصروف تھے۔

(ایک پیراگراف چھوڑ کر آگے لکھا ہے) بہت سے لوگوں کو اس بات کے سوا کچھ علم نہیں کہ مسٹر تارڑ سپریم کورٹ کے جج تھے اور اس بنچ کے رکن تھے جس نے نواز شریف کی حکومت کو بحال کیا تھا اور وہ لاہور سے سینیٹ کے رکن چنے گئے تھے۔'' فرائیڈے ٹائمز'' نے اپنے شمارہ (۲۶ دسمبر ۱۹۹۷ تا یکم جنوری ۱۹۹۸) میں ''تابوت میں ایک اور کیل'' کے عنوان سے اداریہ لکھا جس میں کہا گیا کہ مسٹر تارڑ اس ''اسلامی سکیم'' کے مصنفین میں سے ایک ہیں جو 'اباجی' نے وضع کر کے نواز شریف کے سامنے رکھی ہے۔جس میں سعودی عرب جیسا متوازی نظام عدل قائم کرنے کی تجویز ہے۔مسٹر تارڑ نے حکومت اور جسٹس سجاد علی شاہ کے تنازعہ میں سپریم کورٹ کے کئی ججوں کو حکومت کے حق میں رام کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔اخباری رپورٹوں میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ مسٹر تارڑ شہباز شریف کے ہمراہ طیارہ میں کوئٹہ گئے اور ان ججوں کے لئے جو چیف جسٹس کے تقرر کے خلاف درخواست کی سماعت کر رہے تھے ''تھیلے بھر بھر'' کے ''مشورے'' لے کر گئے۔تارڑ نے اس بات کا اعتراف کیا کہ انہوں نے اخباری نمائندوں سے باتیں کرتے ہوئے کہا تھا کہ جسٹس شاہ ''عدالتی دہشت گرد'' ہیں۔

(کچھ پیراگراف بعد) جہاں تک رفیق تارڑ کے صدر کے عہدے پر تقرر کا تعلق ہے میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ میرا پہلے پہل ان سے تعارف اس وقت ہوا جب ہم دونوں ماتحت عدالتوں میں رفیق کار تھے اور دونوں ۱۹۶۷ میں سیشن جج تھے اور بہاولنگر میں ہماری ملاقات ہوئی تھی۔پھر ہم دونوں اپنے اپنے صوبوں میں ہائی کورٹ کے جج بنے پھر چیف جسٹس ہوئے اور ۱۹۹۰ میں دونوں سپریم کورٹ کے بنچ پر سرفراز ہوئے۔ریٹائرمنٹ کے بعد تارڑ کو نواز شریف نے ٹکٹ دیا اور وہ پنجاب سے سینیٹ کے رکن منتخب ہوئے۔ان سے پہلے نواز شریف دو ریٹائرڈ ججوں کو سینیٹ کے ٹکٹ دے چکے تھے یعنی

جسٹس ریٹائرڈ جاوید اقبال اور جسٹس ریٹائرڈ افضل لون کو۔یہ بات ظاہر و باہر ہے کہ نواز شریف کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ وہ عدلیہ کے لوگوں کو سیاسی عہدوں پر متمکن کرتے رہیں۔جو ان کے قریب رہے انہیں وہ خوب نوازتے رہے تاکہ دوسرے لوگ بھی نواز شریف کے اقتدار میں ہونے کی صورت میں روشن مستقبل کی امید رکھیں۔اور جو اختلاف کریں ان سے وہی سلوک روا رکھا جائے جس کے وہ مستحق ہیں۔تعاون کرنے والوں کے لئے عروج کی انتہا آسمان تک ممتد تھی!

تارڑ نے حکومت اور عدالت کے تنازعہ میں ججوں کے درمیان تفرقہ پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔۱۴ اگست ۱۹۹۷ کو انہوں نے جسٹس اجمل میاں کو پرچم کشائی کی تقریب میں شرکت کے لئے اسلام آباد مدعو کیا۔جسٹس میاں آئے' پارلیمنٹ کی تقریب پرچم کشائی میں شریک ہوئے مگر سپریم کورٹ کی پرچم کشائی کی تقریب میں شریک نہ ہوئے حالانکہ باقی جج صاحبان اور قانون کے افسران اس میں شریک ہوئے تھے۔تارڑ' جسٹس اجمل میاں کو ایوان صدر کی دعوت میں بھی لے گئے اور اعلیٰ سیاسی عہدیداروں سے ان کا تعارف کروایا۔اسی طرح سپریم کورٹ کے کوئٹہ بنچ کے دو ججوں سے ملے جنہوں نے چیف جسٹس کے تقرر کی نوٹیفکیشن کو معطل کیا تھا۔اس سے ایک روز پہلے تارڑ شہباز شریف کے ہمراہ کوئٹہ گئے تھے اور ججوں سے ملاقات کی تھی۔اندریں حالات جب نواز شریف کی جانب سے مسٹر تارڑ کا نام صدارتی امیدوار کے طور پر سامنے آیا تو ان لوگوں کو جو حالات سے باخبر تھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔انہوں نے سپریم کورٹ کے ججوں کے مابین افتراق پیدا کرنے میں جو خدمات سرانجام دی تھیں ان کی وجہ سے وہ اس انعام کے بہمہ وجوہ حقدار تھے''۔(صفحہ ۵۴۰ تا ۵۴۶)۔

اس طویل اقتباس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہمارے ہاں عدالتی نظام کو کس شخص کی تخریب کاری نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا۔اور حیرت یہ ہے کہ ایسے لوگ اب بھی پاکستان میں سر اٹھا کر چلتے ہیں انہیں اپنے کئے پر کوئی ندامت بھی نہیں۔

چیف جسٹس ریٹائرڈ جسٹس سجاد علی شاہ کی یہ خودنوشت سوانح عمری مستقبل کے مؤرخ کے لئے ایک نادر دستاویز ثابت ہوگی۔

جج بولتا ہے

چیف جسٹس، جسٹس اجمل میاں کی انگریزی خودنوشت شائع ہوئی ہے۔اس کا عنوان ہے کہ A Judge Speaks out یعنی ''ایک جج بولتا ہے''۔اس سے ملتے جلتے نام کی انگریزی کتاب جسٹس میر خدا بخش مرّی، سابق چیف جسٹس بلوچستان ہائی کورٹ نے لکھی تھی۔ A Judge May Speak اس کا اردو ترجمہ نذیر حق صاحب نے کیا تھا ''مارشل لاء۔ آئین اور عدالتیں''۔ جسٹس میر خدا بخش مرّی کی سربراہی کے دوران بلوچستان ہائی کورٹ نے مارشل لا کے زمانہ میں مارشل لاء کے ضابطوں کے خلاف فیصلہ دیا تھا اور فوجی عدالتوں سے دی جانے والی موت کی سزاؤں پر عمل درآمد روک دیا تھا۔اس طرح جسٹس مرّی، مارشل لا حکام کی نظروں سے گر گئے تھے اور انہیں نیا حلف دینے سے انکار کر دیا گیا تھا۔اپنی کتاب میں جسٹس مرّی نے ان فیصلوں کے مالہ، اور ماعلیہ کو موضوع بنایا ہے۔لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس صمدانی نے اپنی اردو میں لکھی گئی خودنوشت ''جائزہ'' میں بلوچستان ہائی کورٹ کے ان فیصلوں کا بڑے احترام اور فخر کے ساتھ ذکر کیا ہے حالانکہ لاہور ہائی کورٹ نے مارشل کے سامنے ہتھیار ڈال دئے تھے اور اس عدالت سے ایسے ایسے فیصلے سرزد ہوئے تھے کہ خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے۔

جسٹس نسیم حسن شاہ کی یادداشتوں کے بارہ میں لکھتے ہوئے میں نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ ججوں کو اپنی خودنوشت سوانح عمری میں اپنے فیصلوں کو زیرِ بحث نہیں لانا چاہئے کیونکہ اگر کوئی جج اپنے دئے ہوئے فیصلوں کو اپنی سوانح حیات میں موضوع بناتا ہے تو احساس یہ ہوتا ہے کہ وہ جج اپنے متذکرہ فیصلہ سے مطمئن نہیں تھا اس لئے وہ اس فیصلے کے جاری ہونے کے برسوں بعد اسے معرضِ بحث میں لا کر دراصل اپنے ضمیر کی تسکین کرنا چاہتا ہے۔اور اب میرے اس نظریے کے علی الرغم جسٹس اجمل میاں کی خودنوشت سامنے آئی ہے جس میں جج صاحب موصوف کی زندگی کے حالات کم کم اور ان کے

فیصلوں کا ذکر اذکار زیادہ ہے۔انہیں تو اپنے فیصلے اتنے عزیز ہیں کہ وہ ہر فیصلہ کو ''عہد ساز فیصلہ'' (صفحہ ۱۴۷) سمجھتے ہیں۔اور اس کے حق میں اخباری مضامین کا حوالہ دینے سے گریز نہیں کرتے۔اور اب میں سوچ رہا ہوں کہ جسٹس اجمل میاں کے سارے فیصلے تو متنازعہ ہو نہیں سکتے اس لئے شاید میرا خیال خیالِ خام تھا اور محض واہمہ! جسٹس اجمل میاں تو خوب بولے ہیں۔جج کی کرسی پر تھے تو بول نہیں سکتے تھے محض ایک طرف بیٹھ کر تماشا کر سکتے تھے۔بولے ہیں تو بھی طرفہ تماشا ہے۔اب ان کے قاری خاموش ہیں اور حیرت سے انہیں دیکھ رہے ہیں۔تماشا کہ اے محوِ آئینہ داری۔ تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں۔

جسٹس سجاد علی شاہ نے تو تمام عدالتی نظام کو ہدفِ تنقید بنایا تھا مگر جسٹس اجمل میاں نام لے کر جسٹس سجاد علی شاہ کو ہدف بنا رہے ہیں۔تقریباً ساڑھے تین سو صفحے کی اس کتاب میں ۱۳۶ صفحات پر جسٹس سجاد علی شاہ کا ذکرِ خیر موجود ہے۔لگتا ہے ان کی زندگی کا ایک ہی مقصد رہ گیا تھا کہ ریٹائر ہوتے ہی آپ ''ریکارڈ کو سیدھا رکھنے کی غرض سے'' (دیباچہ) جسٹس سجاد علی شاہ کے خلاف کتاب لکھیں گے اور لکھ دی ہے۔ریکارڈ تو خبر نہیں سیدھا ہوا یا نہیں معاملاتِ من و تو اور زیادہ ٹیڑھے ہو گئے ہیں۔جسٹس اجمل میاں نے اس سلسلہ میں غالباً جسٹس سجاد علی شاہ کی کتاب کو خود بالاستیعاب پڑھا تک نہیں دوسروں کے کہے سنے پر ایمان لے آئے ہیں ''میرے کچھ دوستوں نے میری توجہ جسٹس سجاد علی شاہ کی خودنوشت کی طرف مبذول کروائی ہے جس میں انہوں نے۔۔۔۔'' (صفحہ ۲۱۹)۔تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟

میں ادب کا ایک عام سا طالب علم ہوں میری جسٹس سجاد علی شاہ صاحب سے شناسائی ہے نہ جسٹس اجمل میاں کو میں جانتا ہوں۔ان سے اتنا ہی تعارف ہے کہ دونوں میرے وطن کی عدالتِ عظمیٰ کے سربراہ رہے۔سجاد علی شاہ صاحب کی خودنوشت پہلے چھپی تھی اسے پڑھا تھا اب اجمل میاں صاحب کی خودنوشت سامنے آئی ہے تو اسے پڑھا ہے۔جو کچھ قرینِ دیانت سمجھا وہ لکھ رہا ہوں۔ڈاکٹر سید نسیم حسن شاہ صاحب سے ملنا جلنا بھی رہا اس لئے ان کی خودنوشت کے باب میں مری معروضات کا لہجہ بھی اور تھا ان دو خودنوشتوں کے بارہ میں لہجہ اور ہوگا اور یہی مناسب معلوم دیتا ہے۔سوال دونوں خودنوشتوں

نے اٹھائے ہیں جواب بھی لکھنے والے ہی دے سکتے ہیں ایک عام قاری تو ایسے سوالوں کے اٹھانے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ چہ جائیکہ وہ چیف جسٹسوں کی دیانت وامانت کے بارہ میں سوال اٹھانے لگے؟ قبلہ جسٹس اجمل میاں نے چیف جسٹس کے بارہ میں وہ لفظ لکھ دیئے ہیں جو ہمارے گلے سے تو نہیں اترتے کہ ''کوئی بے ایمان اور بے اصولا چیف جسٹس ۔۔۔۔'' (صفحہ ۱۷۰۔ مکرر صفحہ ۳۴۷)، گستاخی معاف ہم تو کسی چیف جسٹس کے بارہ میں ایسے الفاظ لکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے یہ جسٹس اجمل میاں ہی کا حوصلہ ہے کہ اسی عہدہء جلیلہ سے وظیفہ یاب ہوئے ہیں۔ ہر مردے وہر کارے!

یہاں جملہ معترضہ کے طور پر ایس ایم ظفر کی کتاب یاد آرہی ہے ''سیاسی شطرنج کی بساط پر مکالمہ''۔ اس میں انہوں نے انہی کے ایک نامور پیش رو چیف جسٹس انوار الحق کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''دستور میں ترامیم کرنے کا حق، سپریم کورٹ آف پاکستان نے جنرل ضیاء الحق اور جنرل پرویز مشرف کو دیا تھا حالانکہ دونوں انقلاب نہیں لائے تھے اور نہ ہی انقلابی ہونے کے دعویدار تھے۔ جس تاریخی پس منظر میں جنرل ضیاء الحق چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو یہ حق تفویض کیا گیا وہ انصاف وعقلیت کے منافی تھا۔ جسٹس انوار الحق نے نصرت بھٹو کیس میں فیصلہ لکھا تھا۔ عام طور پر مشہور ہے کہ فیصلہ کے اعلان سے ایک دن قبل، شام کے وقت، وزیر قانون جناب شریف الدین پیرزادہ جسٹس انوار الحق کو ملنے کے لئے گئے۔ جج صاحب نے اپنا فیصلہ انہیں پڑھنے کو دیا یا اس کے مالہ وماعلیہ سے انہیں آگاہ کیا۔ (مجھے بڑا دکھ ہے کہ جسٹس انوار الحق جیسے تجربہ کار اور مشہور جج سے ایسی حرکت سرزد ہوئی)۔ فیصلہ کے اس ڈرافٹ میں چیف جسٹس نے آئین میں ترمیم کرنے کا کوئی حق چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کو تفویض نہیں کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مسٹر پیرزادہ نے فیصلہ میں بیان کئے گئے قانونی نکات پر تحسین کا اظہار کیا۔ ساتھ ہی کہا کہ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کو قانون سازی کے اختیارات تو دئے جارہے ہیں کہ وہ قوانین میں تو ترمیم کرسکتے ہیں مگر آئین میں ترمیم نہیں کرسکتے۔ مگر جونہی سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ جاری کیا جائے گا جسٹس انوار الحق کو چیف جسٹس کے عہدے سے دستبردار ہونا پڑے گا کیونکہ وہ تو چیف جسٹس ہی جسٹس یعقوب علی خان کے قبل از وقت ریٹائر ہونے کی وجہ سے بنائے گئے تھے اور جسٹس یعقوب علی کی ریٹائر منٹ ایک آئینی ترمیم کے نتیجہ میں عمل میں آئی تھی۔ بس یہ تیر چل گیا اور جسٹس انوار الحق نے اپنے قلم

سے ٹائپ شدہ مسودہ میں ''اور آئینی ترمیم کا حق بھی'' کے الفاظ لکھ دئے۔

اس واقعہ کی ایک اور دل چسپ روایت بھی مجھ تک پہنچی ہے کہ جب پیرزادہ صاحب نے فیصلہ کے قانونی نکات کی تحسین کی تو جسٹس انوار الحق نے انہیں اگلے روز اسلام آباد میں اپنے گھر پر کھانا کھانے کی دعوت دی۔ پیرزادہ صاحب نے کہا کہ وہ بڑی خوشی سے لاہور میں ان کے گھر کھانے کے لئے حاضر ہو جائیں گے مگر اسلام آباد میں تو مشکل ہوگا۔ جج صاحب نے پوچھا ہیں اسلام آباد میں کیوں نہیں؟ تو پیرزادہ صاحب نے انہیں وہ بات بتائی جس کا ذکر میں اوپر کر آیا ہوں۔ بہرحال چیف جسٹس اور حکومت کے وزیر قانون کے مابین جو کچھ بھی گفتگو ہوئی ہو یہ سب کچھ انصاف واخلاقِ منصفانہ کی روایات کے منافی تھا۔ نصرت بھٹو کیس کا فیصلہ پڑھنے کے بعد بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کو آئینی ترمیم کا حق دینے کے حق میں کوئی دلیل بھی فیصلہ میں بیان نہیں کی گئی نہ ہی ترمیم کرنے کی حدود ہی معین کی گئی ہیں۔ فیصلہ کی اس خامی کا جنرل ضیاء الحق نے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ سپریم کورٹ نے بعد کے ایک فیصلہ (پی ایل ڈی ۱۹۹۷۔ ایس سی ۴۲۶) میں بے محابا آئینی ترامیم کے اس حق کو تنقید کا نشانہ بنایا مگر اس کی حیثیت وہی تھی کہ اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت''۔ (سیاسی شطرنج کی بساط پر مکالمہ۔ باب ۳۔ صفحہ ۲۳۔۲۴)۔ خدا جانے جسٹس اجمل میاں سپریم کورٹ کے اس بنچ میں شامل تھے یا نہیں۔ مگر چیف جسٹس اجمل میاں نے اپنے ہی پیش رووں پر تنقید کرتے ہوئے ''بے ایمان اور بے اصولے'' کے ظالمانہ لفظ لکھ دئے ہیں۔ قاری کا عالم غالب کے لفظوں میں یہ ہے ''حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں''!

جملہ معترضہ طویل ہوگیا میں پھر ان کی خودنوشت کی طرف لوٹتا ہوں۔ ان کی خودنوشت کے پہلے دو فقرے یہ ہیں ''میں دہلی کی جامع مسجد کے نواح میں ایک نیک پرہیزگار متوسط گھرانے میں پیدا ہؤا۔ ہمارے ہاں بچوں کی پیدائش گھر کے اندر دائیوں کے ہاتھوں انجام پذیر ہوتی تھی اس لئے تاریخ پیدائش کا ریکارڈ رکھنے کا رواج نہیں تھا'' (صفحہ ۱)۔ میں اس فقرہ پر چونکا تھا کہ جج صاحب کو اپنی خود نوشت کے شروع میں ہی ایسی ''بے تکی'' بات کہنے کی کیا ضرورت پیش آئی؟ میں لمبے عرصہ سے پاکستان سے باہر ہوں اس لئے مجھے یہ خودنوشت پڑھنے سے قبل اس بات کا علم نہیں تھا کہ جسٹس اجمل

میاں کی تاریخ پیدائش عدلیہ کے ''معرکۂ ناخوش زیبا'' کے دوران معرضِ بحث میں آئی تھی۔ اس بحث کی پیش بندی کے طور پر جج صاحب نے یہ دلیل وضع فرمائی ہے کہ پیدائش کا ریکارڈ اس لئے نہیں رکھا جاتا تھا کہ ان کے ہاں زچگی کا کام گھر کے اندر ہوتا تھا۔ دہلی جیسا مقام ہو اور بیسویں صدی کی تیسری دہائی ہو اور بچہ کی پیدائش کا ریکارڈ میونسپل ریکارڈ میں درج نہ کروایا جائے؟ جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے۔ ہم تو ایک دور افتادہ قصبہ میں پیدا ہوئے تھے اور تیسری دہائی کے دوران پیدا ہوئے تھے ہماری پیدائش کا ریکارڈ تو کمیٹی کے ریکارڈ میں موجود تھا اور اس لئے موجود تھا کہ حکومت وقت کا قانون ایسا تھا۔ جج صاحب کی تاریخ پیدائش ان کے برادر اکبر نے آگرہ کے سکول میں اندازے سے کچھ اور لکھوائی۔ کراچی میں پچھلا ریکارڈ سامنے نہیں تھا اس لئے ایک اور اندازہ لگایا گیا۔ گویا جج صاحب کی تاریخ پیدائش کے مسئلہ میں ''رجماً بالغیب'' پر ہی عمل ہوتا رہا۔ چلئے اتنا تو طے ہو گیا کہ جج صاحب بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ابوالکلام آزاد کے لفظوں میں ''کتمِ عدم سے عالمِ وجود میں آئے تھے اور تہمتِ حیات سے متہم!''۔ جج صاحب کی خودنوشت سے ایک اور مسئلہ بھی پانی ہو گیا ہے کہ آپ نے بی اے اور بار ایٹ لاء کرنے سے قبل میٹرک کا امتحان بھی پاس کیا تھا۔ (صفحہ ۲۶۴) ہماری عدلیہ سے وابستہ ارکان کیسی کیسی ناگوار باتوں میں الجھتے اور قوم کا اور اپنا وقت ضائع کرتے رہے ہیں؟

پاکستان کی تاریخ میں عدالتِ عظمیٰ کا بحران پیدا ہوا تو سب لوگ انگشت بدنداں رہ گئے کہ کیا کسی ملک کی عدالت عظمیٰ کے ارکان آپس میں اتنا بھی الجھ سکتے ہیں کہ ایک دوسرے کے دشمنِ جانی بن جائیں؟ مسئلہ یہاں سے پیدا ہوا کہ جسٹس سجاد علی شاہ کو سینیارٹی سے ہٹ کر چیف جسٹس مقرر کر دیا گیا تھا۔ تین جج بشمول جسٹس اجمل میاں جو ان سے سینئر تھے نظر انداز کر دئے گئے۔ اب تین صورتیں تھیں۔ یا تو جونیئر جج ریٹائر ہو جاتے یا استعفیٰ دے دیتے یا بہ دل وجان بہ رضا و رغبت چیف جسٹس کی سرکردگی میں کام کرتے رہتے۔ آخر جسٹس منیر کو بھی تو سینیارٹی سے ہٹ کر چیف جسٹس بنایا گیا تھا تو جسٹس اے ایس ایم اکرم نے بہ رضا و رغبت اس فیصلہ کو قبول کیا تھا (صفحہ ۱۹۷)۔ جسٹس اجمل میاں نے قانونی نکتہ اٹھایا ہے کہ اس فیصلہ کو نظیر نہیں بنایا جا سکتا (صفحہ ایضاً)۔ کیوں؟ اس کا علم قانونی موشگافیوں کا علم رکھنے والوں کو ہو گا۔ جج صاحب نے تو یہاں تک کہا ہے کہ صدر ایوب کے زمانہ میں بھی

اس بات کا لحاظ رکھا جاتا تھا کہ صرف سینئر موسٹ جج کو چیف جسٹس بنایا جائیگا۔ ہمیں یاد پڑتا ہے کہ منظور قادر صاحب مرکزی وزارت سے فارغ ہوئے تھے تو انہیں مغربی پاکستان ہائی کورٹ کا چیف جسٹس بنا دیا گیا تھا حالانکہ اس سے قبل وہ ہائی کورٹ کے جج تک نہیں تھے۔ فوج میں بھی سینئر موسٹ جرنیل کو چیف نہیں بنایا جاتا۔ اگر جونیئر موسٹ جرنیل کو چیف بنانے کا فیصلہ کر لیا جائے تو باقی جرنیل اطمینان سے ریٹائر ہو جاتے ہیں یا پوری دیانت داری کے ساتھ نئے چیف کی اطاعت کرتے ہیں یہاں تو عدلیہ درمیان میں تھی۔ لگتا ہے سجاد علی شاہ صاحب چیف جسٹس تو بن گئے مگر ان کے ساتھیوں نے ان کی اطاعت کا جُوا دیانت داری سے قبول نہیں کیا۔ جسٹس اجمل میاں کی خودنوشت زبانِ حال سے کہتی ہے کہ انہوں نے اپنے چیف جسٹس کی اطاعت کرنا تو کجا انہیں زک پہنچانے کا کوئی موقعہ نہیں گنوایا۔ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند؟

جسٹس اجمل میاں نے استعفیٰ نہ دینے کی توجیح یوں فرمائی کہ انہوں نے اس لئے استعفیٰ نہ دیا کہ اگر وہ مستعفی ہو جائیں گے تو ''حکومت ان کی جگہ اپنی پسند کا آدمی لے آئے گی اور یہ چیز عدلیہ کے حق میں مفید نہیں ہوگی'' (صفحہ ۱۵۸) مگر جج صاحب کے عمل سے واضح ہوتا ہے اگر وہ مستعفی ہو جاتے تو عدلیہ اس بحران سے دوچار ہی نہ ہوتی۔

جب سپریم کورٹ میں جسٹس سعد سعود جان کو ایکٹنگ چیف جسٹس بنانے کے بارہ میں آئینی درخواست دائر ہوئی کہ سب سے سینئر جج کو چیف جسٹس بنایا جانا چاہئے اور یہ کہ عدلیہ کے بارہ میں آئینی نکات کا جائزہ لیا جائے تو گویا بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ نظر انداز کئے جانے والے ججوں نے سعی بلیغ کی کہ اس کیس کی سماعت ایسے بنچ میں ہو جس میں سجاد علی شاہ شامل نہ ہوں۔ رسہ کشی شروع ہو گئی۔ اس کتاب کا پورا ایک باب ججز کیس کے بارہ میں ہے کہ سینئر موسٹ جج کو چیف جسٹس بننا چاہئے۔ اس بنچ میں چیف جسٹس بھی شامل تھے۔ جسٹس میر ہزار خاں کھوسو کو داد دینی چاہئے کہ انہوں نے دیانت داری سے صاف کہہ دیا کہ اس کیس میں اگر چیف جسٹس کے سینیارٹی کی بنیاد پر تقرر کا فیصلہ دینا ہے تو اس کا اطلاق سپریم کورٹ کے چیف جسٹس پر بھی ہونا چاہئے۔ (صفحہ ۱۸۰)۔ مگر ججوں نے ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت کے بعد فیصلہ کیا کہ اصولاً چیف جسٹس کو سینئر موسٹ جج ہونا

چاہئے مگر چیف جسٹس سپریم کورٹ کا نکتہ نہ اٹھایا جائے۔ اس درخواست کا فیصلہ جسٹس اجمل میاں نے لکھا۔ جسٹس سجاد علی شاہ نے اس فیصلہ میں کچھ نکات زائد کرنے تھے ان میں تاخیر ہوتی گئی۔ جسٹس اجمل میاں اتنے بے صبرے ہوگئے کہ ڈپٹی رجسٹرار کو ہدایت کی کہ چیف جسٹس کے نکات کا انتظار نہ کیا جائے ان کا لکھا ہوا فیصلہ جاری کر دیا جائے۔ اس کی وجہ جج صاحب نے یہ بیان کی کہ ''مجھے ڈر تھا کہ کہیں جسٹس سجاد علی شاہ میرے فیصلہ کے اوپر اپنا کوئی فیصلہ لکھنے نہ بیٹھ جائیں اور اس طرح میرے فیصلہ کی اولیت ختم ہو جائے'' (صفحہ ۱۸۹)۔

وہی ہوا جسٹس سجاد علی شاہ نے اپنا فیصلہ لکھا اور اس پر بنچ کے دیگر ارکان سے دستخط بھی کروا لئے حالانکہ وہ رفقاء جسٹس اجمل میاں کے لکھے ہوئے فیصلے پر پہلے ہی دستخط کر چکے تھے۔ جسٹس فضل الٰہی خاں نے بغیر پڑھے سجاد علی شاہ کے فیصلہ پر بھی دستخط ثبت فرما دئے (صفحہ ۱۹۰) اور تو اور ''جسٹس منظور حسین سیال سے ریٹائرمنٹ (۲۴ مارچ ۱۹۹۶) کے کئی روز بعد (۴ اپریل ۱۹۹۶) کو فیصلہ پر دستخط کروائے گئے'' (صفحہ ایضاً)۔ اخاہ! جسٹس منظور حسین سیال!! زباں پہ بارے خدایا یہ کس کا نام آیا۔ یہ تو وہ نیک نام جج تھے جنہوں نے ضیاء الحق کے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں والے بدترین آرڈیننس نمبر ۲۰ کو قطعاً جائز اور مستحب قرار دینے والا ''تاریخی'' فیصلہ لکھا تھا اور اسلام کے ارکان کو اسلام کے ''ٹریڈ مارک'' قرار دیا تھا اور یہ فیصلہ صادر فرمایا تھا کہ اگر مسلمانوں کے علاوہ کوئی شخص اسلام کے شعائر کو استعمال کرتا ہے تو وہ ''ٹریڈ مارک'' کے قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ گویا شعائر اسلام نہ ہوئے ''کوکا کولا'' ہوگیا۔ ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہئے؟

جسٹس اجمل میاں کی خودنوشت کا اگلا باب نواز شریف اور سجاد علی شاہ کی چپقلش کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ اس چپقلش کی بنیاد اے ٹی اے یعنی اینٹی ٹیررسٹ ایکٹ تھا۔ جسٹس سجاد علی شاہ تو اس معاملہ کے طے ہونے سے پہلے ہی ریٹائر ہوگئے بعد کو جسٹس اجمل میاں جب چیف جسٹس بنے تو آپ کا اعتراف ہے کہ آپ نے اس آرڈیننس کی دس بارہ دفعات کو غیر قانونی قرار دے کر مسترد کر دیا تھا۔ (صفحہ ۲۱۸) جسٹس سجاد علی شاہ اس قانون کے خلاف حکومت سے ٹکرلیں تو ان کے رفقاء اسے پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھیں اور خود چیف جسٹس کی کرسی پر بیٹھیں تو اے ٹی اے کی بارہ دفعات کو قلمزد کر دیں۔

تمہاری زلف میں آئی تو حسن کہلائی۔ وہ تیرگی جو مرے نامہ ءسیاہ میں ہے!

جسٹس اجمل میاں نے جسٹس سجاد علی شاہ کی طرف سے لگائے گئے اس الزام کی سختی سے تردید کی ہے کہ ان کے رفیق تارڑ سے خصوصی تعلقات تھے۔ جج صاحب کا کہنا ہے کہ ان کی اور رفیق تارڑ کی جان پہچان ان کے رفیق کار بننے کے بعد شروع ہوئی مگر رفیق تارڑ کے اور سجاد علی شاہ کے تعلقات کہیں زیادہ پرانے اور پکے تھے اور جسٹس سجاد علی شاہ نے کہیں رفیق تارڑ سے اپنے پرانے تعلقات کی تردید نہیں کی۔ جج صاحب موصوف اپنی کتاب کے صفحہ ۲۲۰ پر یوں طعنے تشنے سے کام لے رہے ہیں جیسے رفیق تارڑ کوئی نہایت ہی ناپسندیدہ شخص ہو اور اس سے تعلقات رکھنا بری بات ہو۔ جسٹس سجاد علی شاہ کو تو رفیق تارڑ اس لئے برے لگنے لگے تھے کہ انہوں نے سجاد علی شاہ کو ''عدالتی دہشت گرد'' کہا تھا اور وہ سپریم کورٹ کے باغی کوئٹہ بنچ کے لئے ''سوٹ کیس بھر بھر کر مشورے لے کر گئے تھے''۔ (سجاد علی شاہ کی خودنوشت صفحہ ۵۴۳)۔ خدا معلوم جسٹس اجمل میاں ان سے کیوں ناراض ہیں؟ یوں دیکھنے میں تو انہوں نے رفیق تارڑ کی تصویر اپنی خودنوشت کے سرورق پر شائع کی ہے۔ گستاخی معاف جسٹس اجمل میاں سے اتنا تو پوچھا جا سکتا ہے کہ قبلہ پارلیمنٹ ہاؤس والی پرچم کشائی کی تقریب میں آپ کو کراچی سے مدعو کیا گیا تھا حالانکہ اس تقریب میں سپریم کورٹ کا کوئی اور جج موجود نہیں تھا سب سپریم کورٹ والی تقریب میں شریک تھے اور آپ اس تقریب کے لئے کراچی سے اپنے خرچ پر تشریف لائے تھے اور چوتھی صف میں بٹھائے گئے تھے۔ اگر چیف جسٹس یہ کہتا ہے کہ آپ کو ایک مخصوص سینیٹر کے کہنے پر بلایا گیا تھا تو اس میں سیخ پا ہونے کی کون سی بات ہے؟ حکومت نے بلایا ہوتا تو آپ کو پورا پروٹوکول دیتی۔ پھر آپ فرماتے ہیں میں کسی سے ملوایا نہیں گیا چیف جسٹس اپنی خودنوشت کے صفحہ ۳۷۰ پر کہتے ہیں ''انہوں نے شام کو بہ چشمِ خود آپ کو اور سینیٹر رفیق تارڑ کو پریزیڈنسی میں اکٹھے دیکھا اور آپ سے تھوڑی دیر باتیں بھی کیں'' اور لوگوں نے دیکھا کہ آپ سینیٹر تارڑ کی معیت میں لوگوں سے مل رہے تھے۔ دونوں چیف جسٹسوں میں سے کون سچا ہے؟ ہم تو کسی کو جھوٹا نہیں کہتے مگر کسی ایک کی بات تو بعید از صداقت ہے۔

بات درمیان میں آگئی تو کوئٹہ کے باغی بنچ کا ذکر بھی ہو جائے۔ اس بنچ میں جسٹس ناصر اسلم زاہد شامل تھے جنہیں ایک بار تو سجاد علی شاہ نے سپریم کورٹ کے جج کے طور پر حلف دینے سے انکار کر دیا

تھا (صفحہ ۲۰۱) جسٹس ارشاد حسن خان تھے اور جسٹس خلیل الرحمن تھے۔ تینوں جسٹس سجاد علی شاہ سے نالاں تھے۔ سجاد علی شاہ نے حکومت کے خلاف اپنی سرگرمی تیز کی تو (غالباً رفیق تارڑ کے مشوروں سے بھرے ہوئے سوٹ کیس وصول کرنے کے بعد) کوئٹہ سے جسٹس ناصر اسلم زاہد کا اجمل میاں کو فون آیا کہ "سجاد علی شاہ کو سپریم کورٹ کو نقصان پہنچانے سے روکیں" (صفحہ ۲۳۷)

جب اجمل میاں صاحب نے سکوتِ مداہنت آمیز اختیار کیا تو اس بنچ نے ایک آئینی درخواست کا سہارا لے کر اپنے ہی چیف جسٹس کو کام کرنے سے روک دیا۔ ادھر پشاور میں جسٹس سعید الزمان صدیقی ادھار کھائے بیٹھے تھے کہ ان کے خلاف چیف جسٹس نے صدر کو انضباطی کارروائی کرنے کا لکھ رکھا تھا۔ پھر چل سو چل۔ جسٹس اجمل میاں دور بیٹھے تماشا دیکھتے رہے اسی لئے تو میں نے عرض کیا تھا کہ اس تماشا دیکھنے کی عادت نے انہیں تماشا بنا دیا۔

احمد بشیر کی ڈکشن میں اگرچہ "رپورٹ پٹواری مفصل ہے" مگر جسٹس اجمل میاں کی خودنوشت انہیں سجاد علی شاہ کے لگائے ہوئے الزامات سے بری نہیں کر سکتی۔ سجاد علی شاہ نے ساری عدلیہ کو ہدف بنا کر بات کی تھی جسٹس اجمل میاں کی خودنوشت جسٹس سجاد علی شاہ کے الزامات کی توثیق کرتی ہے تردید نہیں کرتی۔ اس لئے ان کی کتاب کا عنوان درست ہے کہ جج بولتا ہے۔ میری دانست میں اس عنوان کے آگے سوالیہ نشان ثبت ہونے سے رہ گیا ہے۔ عنوان یوں ہونا چاہئے کہ ان سب باتوں کے باوجود "جج بولتا ہے؟"

اس کتاب کی تقریب رونمائی کراچی میں آکسفرڈ پریس والوں نے منعقد کی۔ اس تقریب کی رپورٹ بزنس ریکارڈر مورخہ ۱۳ جولائی ۲۰۰۴ میں نظر آئی۔ اصل مقرر تو "اپنا گریباں چاک" والے جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب تھے مگر کام کی بات جسٹس فخر الدین جی ابراہیم نے کی۔ انہوں نے ماضی قریب کا ذکر کرتے ہوئے کہا "میں بڑے کرب سے کہتا ہوں کہ شومئ قسمت سے جسٹس ارشاد حسن خاں اور جسٹس ریاض جیسے لوگ بھی ہمارے چیف جسٹس رہے۔ ہم نے تاریخ سے کوئی سبق نہیں سیکھا"۔ الحمدللہ کہ جسٹس اجمل میاں کا نام ان لوگوں کے ساتھ شامل نہیں۔

◎

گولیوں کی زد میں

صدر پرویز مشرف کی خودنوشت In the line of Fire (گولیوں کی زد میں) ابھی پچھلے ہفتے ان کے دورہ امریکہ کے دوران شائع ہوئی ہے اور ساری دنیا میں اس کا چرچا ہو رہا ہے۔ دیکھتے دیکھتے اس کی خریداری بہترین کتابوں کی خریداری کی فہرست میں ایک سو بتیسویں نمبر سے گیارھویں نمبر پر پہنچ گئی ہے مگر کینیڈا کا اردو پریس اس بات کو فرشتوں کی طرف سے خریداری سے موسوم کر رہا ہے۔ صدارت کے عہدہ پر فائز رہنے کے دوران اپنی خودنوشت شائع کرنے کا یہی ردعمل ہوتا ہے۔ صدر ایوب کی Friends not Masters کی اشاعت پر بھی ایسے ہی آوازے تاویزے کسے گئے تھے۔ ایک اور مماثلت بھی یاروں نے ڈھونڈ نکالی ہے کہ صدر ایوب کی کتاب کی تیاری میں الطاف گوہر کا ہاتھ تھا پرویز مشرف صاحب کو الطاف گوہر کے صاحبزادے ہمایوں گوہر کا تعاون حاصل ہے۔ اگر پدر نتواند پسر تمام کند۔

کتاب کے ٹائیٹل پر صدر کی ایک تصویر ہے جس میں وہ قارئین کو ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کر رہے ہیں۔ اس پوز کو دیکھ کر مجھے کسی پرانے شاعر کا شعر یاد آ رہا ہے کہ "دیوار پھاندنے میں دیکھوگے کام میرا۔ جب دھم سے آ کہوں گا حضرت سلام میرا"۔ انقلاب کے ذریعہ جمہوری حکومت کا تختہ الٹنے اور اقتدار پر قابض ہونے کے بعد عوام کو سلام کہنے کا یہی انداز ہوتا ہے اور یہ تصویر غالباً اسی موقع کی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب! اقتدار پر مجبوراً قبضہ کرنے کی بڑی تفصیل صدر صاحب نے کتاب میں درج کی ہے اور بڑی محنت کے ساتھ اس سازش سے پردہ اٹھایا ہے کہ کس طرح نواز شریف اور ان کے حواری انہیں اور ان کے طیارے کو بھارت کے کسی ہوائی اڈہ پر اتارنے کی کوشش کر رہے تھے اور ان کو اس بات کا احساس تک نہیں تھا کہ وہ اپنی فوج کے کمانڈر انچیف کو دشمن کے حوالے کر رہے ہیں۔ اس سازش کی لمحہ وار تفصیل صدر صاحب نے اپنی خودنوشت میں بیان کی ہے حالانکہ یہ ساری باتیں پہلے پریس میں چھپ چکی ہیں اور تاریخ کا حصہ ہیں۔ اسی طرح القاعدہ کے اراکین کی گرفتاری اور ان کے کھوج لگانے کی

ساری جزئیات صدر صاحب کی خودنوشت کا حصہ ہیں یوں لگتا ہے کہ ان کی زندگی ہی اس سراغرسانی اور SIM کارڈوں کے تجزیہ میں گذری ہے۔ ایسی باتیں کسی جاسوسی ناول میں یا آئی ایس آئی کی خفیہ فائلوں میں تو کھپ سکتی ہیں کسی مقتدر صدر کی خودنوشت میں ان کی موجودگی قاری کو بہت کھلتی ہے۔

با ایں ہمہ اس خودنوشت کے بعض اچھے اور مفید پہلو بھی ہیں۔ صدر صاحب نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ہر مہاجر کو علم تھا کہ ''پاکستان ہندوؤں کی اقتصادی اور سیاسی بالادستی اور سماجی ناانصافی کے خلاف مسلمانوں کی پناہ گاہ ہے''۔ (صفحہ ۱۳۶) اس لئے وہ سب کچھ چھوڑ کر نئے ملک میں بسنے کو آرہے تھے۔ صدر نے حق گوئی سے کام لیتے ہوئے سچ بات کہہ دی ہے اور نام نہاد دانشوروں کی طرح اس ملک کو دینی ریاست قرار نہیں دیا۔

یہ متوسط طبقہ کے ایک کھلنڈرے اور شرارتی بچے کی داستان ہے جس کے ماں باپ دونوں نے ملازمتیں کر کے بڑی محنت سے ان کی پرورش کی اور وہ بچہ اپنی محنت اور ماں کی دعاؤں کے طفیل اللہ تعالیٰ کے فضل سے فوج کے اعلیٰ ترین عہدہ تک پہنچا اور پھر تقدیر اسے اٹھا کر ملک کے مقتدر ترین عہدے پر لے آئی۔ لکھنے والے کی شخصیت میں کسی غرور یا تکبر کا شائبہ محسوس نہیں ہوتا اس کی باتوں اور اس کے لہجہ میں ایک گونہ انکساری اور عاجزی ہے۔ فرینڈز ناٹ ماسٹرز میں جو ''میں'' تھی وہ اس خودنوشت میں نہیں ہے اور یہ کوئی چھوٹی بات نہیں۔ صدر پرویز مشرف نے اس بات کے بیان کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کیا کہ ان کے ماں باپ بال روم ڈانس کے شوقین تھے اور اپنے حلقہ کے چیمپین۔ خود مشرف اپنی محبوبہ کے ساتھ ڈیٹنگ کرتے رہے اور ڈسکو جاتے رہے۔ ان کی صاف گوئی بساغنیمت ہے ورنہ ہمارے ہاں تو صدر کے عہدے پر فائز ہوجانے والا شخص اپنی ذاتی زندگی میں کیسا بھی فلموں فلم ایکٹروں کا شوقین ہو عوام کے سامنے اسلام کا چیمپین بن کر آنا چاہتا ہے۔

مشرف صاحب نے ایک بڑا دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ کوئٹہ میں انہوں نے صدر ضیاء کے اعزاز میں ایک ثقافتی تقریب کا اہتمام کیا اور لاہور سے ایک ثقافتی طائفہ بلایا۔ طائفہ لاہور سے روانہ ہو چکا تو [illegible] شمولیت نہیں کرنا چاہتے جس میں عورتوں کا رقص وسرود ہو۔ ساتھ ہی یہ بھی ہدایت ملی کہ وہ اس طائفہ کا کوئٹہ میں موجود ہونا بھی پسند نہیں کرتے کہ کہیں بنیاد پرست ملاؤں کے کان میں اس کی بھنک نہ پڑ

جائے'' (صفحہ ۶۶) چنانچہ راتوں رات گاڑی کے سکھر پہنچنے پر اس طائفہ کی بوگی کو واپس لاہور جانے والی گاڑی سے جوڑ دیا گیا۔

ترکی میں قیام کے دوران انہیں کتوں سے رغبت پیدا ہوئی اور وہ اب تک قائم ہے۔ پہلی تصویر بھی صدر صاحب کی جو پریس کو جاری کی گئی تھی اس میں دو کتے ان کی بغل میں تھے۔ مگر یہ کتوں کی محبت یہیں تک محدود نہیں رہی۔ جب ان کا طیارہ ہوا میں تھا اور جائے ماندن نہ پائے رفتن کا مضمون تھا اس وقت ایک جنرل نے ان سے رابطہ کیا اور بتایا کہ اب حالات ٹھیک ہو گئے ہیں اس لئے آپ بلاخوف و خطر زمین پر اتر آئیں۔ مشرف صاحب نے اس جنرل کی پہچان کرنے کے لئے جو سوال کیا وہ یہ تھا ''کیا تم میرے کتوں کے نام بتا سکتے ہو؟'' جب اس نے ٹھیک نام بتا دئے تو انہیں اس کی صداقت کا یقین ہو گیا'' (صفحہ ۱۰۶) غالباً انگریزی کا مقولہ love me love my dog ایسے ہی کسی موقع کے لئے وضع کیا گیا ہوگا۔ اگر اس جنرل کو کتوں کے نام معلوم نہ ہوتے تو کیا ہوتا؟

معرکۂ کارگل پر ایک پورا باب ہے اور یہ موضوع اسی بات کا متقاضی تھا۔ صدر کلنٹن نے اپنی خودنوشت میں صاف صاف لکھا ہے کہ انہوں نے نواز شریف کو صرف اس شرط پر امریکہ آنے کی اجازت دی تھی کہ وہ پیشگی اس بات کا یقین دلائیں کہ وہ کارگل سے اپنی فوجیں واپس بلالیں گے اور نواز شریف نے یہ فیصلہ کرنے کے بعد سفر امریکہ اختیار کیا تھا۔ (کلنٹن کی خودنوشت میری زندگی صفحہ ۵۳۱)۔ اب مشرف صاحب کی بات سنئے۔ ''میرے اور وزیر اعظم کے درمیان جس واقعہ نے ایک بڑی خلیج حائل کر دی وہ کارگل کا واقعہ تھا۔ ہم دونوں کشمیر کے مسئلہ کو سیاسی اور فوجی لحاظ سے دنیا کے راڈار سکرین پر لانا چاہتے تھے۔ کارگل کی پیش قدمی نے کامیابی سے اس مقصد کو پورا کر دیا۔ جب باہر ان پر سیاسی دباؤ بڑھا کہ آپ وہ علاقہ خالی کر دیں تو وزیر اعظم حوصلہ ہار بیٹھے۔ اور بجائے اس کے کہ وہ قومی یکجہتی سے کام لیتے اور اس سے قوت حاصل کرتے انہوں نے فوج کو الزام دینا شروع کر دیا اور خود اس ذمہ داری سے بری الذمہ ہو بیٹھے۔ انہوں نے سمجھا کہ وہ کارگل اپریشن سے لاعلمی کا اعلان کر کے زیادہ محفوظ ہوں گے۔ اس سلسلہ میں بہت سے مضامین لکھوائے اور چھپوائے گئے حتیٰ کہ امریکہ کے اخباروں میں ایک پورے صفحہ کا اشتہار بھی شائع کیا گیا جس میں فوج کو مورد الزام قرار دیا گیا اس طرح

فوج اور حکومت میں افتراق پیدا کیا گیا۔ کارگل کا مسئلہ ہی تھا جس نے وزیر اعظم کی کم عقلی کا پردہ چاک کر دیا اور فوج کو اور مجھے تصادم کے راستہ پر گامزن کر دیا (صفحہ ۱۳۶۔۱۳۷)

نواز شریف کی سزا اور جلاوطنی کا بھی ذکر ہے۔ لکھتے ہیں ''نواز شریف کو طیارہ اغوا کرنے کے جرم میں عمر قید کی سزا دی گئی مگر وہ قید تنہائی کی سختی نہ جھیل سکے۔ انہوں نے سعودی ولی عہد (اب بادشاہ) شہزادہ عبداللہ کو درمیان میں ڈالا جو مجھے بھائی کہتے تھے اور میں انہیں بھائی سمجھتا ہوں۔ انہوں نے مجھے کہا کہ میں نواز شریف کو سعودی عرب میں جلاوطن ہونے کی اجازت دے دوں۔ میں نے سوچا کہ شاید سارے خاندان کو جلاوطن کر دینا سیاسی لحاظ سے مفید ثابت ہو ہم نے ایک معاہدہ کیا کہ میں نواز شریف کو مشروط معافی دے دوں گا مگر وہ اور ان کے خاندان کے کچھ افراد دس سال تک سعودی عرب میں رہیں گے اور سیاست سے کنارہ کش رہیں گے۔۔۔۔ چنانچہ معاہدہ ہوا نواز شریف ان کے بھائی شہباز شریف اور ان کے اباجی نے دستخط کئے ورشریف فیملی جدہ روانہ ہوگئی۔ ۲۰۰۶ میں نواز شریف نے مجھ سے میرے ایک عزیز دوست کے ذریعہ رابطہ کیا اور کہا ان کا بیٹا بڑا سخت بیمار ہے اس کے علاج کے لئے انہیں لندن جانے کی اجازت دی جائے۔ میں نے بچے کی صحت کی دعا کے ساتھ انہیں اجازت دے دی مگر لندن پہنچتے ہی نواز شریف سیاست میں ملوث نہ ہونے کے تمام وعدے وعید بھول گئے اور اپنی روایتی کج خلقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھ پر بہتان طرازی شروع کر دی۔'' (صفحہ ۱۶۶)۔

نواز شریف کے امیر المومنین بننے کی کوششوں کا ذکر بھی ہے (۱۳۹) اور فرائیڈے ٹائمز کے ایڈیٹر کا کورٹ مارشل کروانے کی سعی نامشکور کا بھی۔ (صفحہ ۱۳۶) یہ فرائیڈے ٹائمز والے صحافی وہی تو ہیں جنہوں نے حسین حقانی کے قول کے مطابق آئی ایس آئی کو invisible soldiers of Islam کا مخفف قرار دیا تھا۔ نواز شریف پر الزام تراشی کرتے ہوئے صدر صاحب نے یہ الزام بھی لگایا ہے کہ ''نواز شریف اور شہباز شریف اباجی کے سامنے بالکل مسکین بن کر بیٹھے رہتے تھے'' (صفحہ ۱۱۳) تو کیا اپنے باپ کے سامنے ادب لحاظ سے بیٹھنا کوئی بری بات ہوتی ہے؟ صدر صاحب ثابت یہ کرنا چاہتے ہیں کہ اصل فیصلے اباجی ہی کے ہوا کرتے تھے۔ یہ ٹھیک ہی ہوگا مگر اولاد کی ایک مستحسن اور بنیادی خوش خلقی کو معرض اعتراض میں لے آنا کون سی خوش خلقی کی بات ہے؟

اپنے دور کے بعض کارناموں کا بھی ذکر ہے کہ ہم نے ''جداگانہ انتخاب کا سلسلہ ترک کر کے مخلوط انتخاب کا ڈول ڈالا'' (صفحہ ۱۶۹) مگر صدر صاحب یہ لکھنا بھول گئے کہ ہم اس انتخابی طریقہ پر ثابت قدم نہیں رہ سکے اور ملاؤں کے احتجاج پر اس پر عمل درآمد نہیں کیا۔ یہ بھی صدر صاحب نے بیان نہیں کیا کہ پاسپورٹ سے مذہب کے خانہ کو نکالنے کی سعی ملاؤں کے دباؤ کی وجہ سے سعیٔ لاحاصل ثابت ہوئی۔ بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی والے توہین رسالت کے قانون میں ترمیم نہ کی جا سکی۔ اسی طرح صدر صاحب نے حدود آرڈیننس پر بھی طبع آزمائی شروع کی ہے کہ ''اس قانون نے ہماری بین الاقوامی ساکھ کو بے انتہا نقصان پہنچایا ہے'' (صفحہ ۳۱۹) مگر یہ نہیں بتایا کہ اسمبلی میں ملاؤں نے ان کے ترمیمی مسودہ کو پاؤں تلے روند روند ڈالا ہے اور وہ کسی صورت میں اس بدنام زمانہ قانون کو بدلنے کی اجازت دینے پر تیار نہیں اور صدر صاحب اور ان کی پارٹی خاموش تماشائی بنی دیکھ رہی ہے۔ پھر انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے باب میں صدر صاحب کیوں خاموش ہیں۔ ساری کتاب میں تین مقامات پر انسانی حقوق کا لفظ آیا ہے اور صدر صاحب یہ لفظ لکھ کر سرخرو ہو گئے ہیں کیا انہیں اپنے ہاں ہونے والی اقلیتوں کی حق تلفیاں نظر نہیں آتیں؟ ابھی ان کی کتاب چھپنے کے دو دن بعد ہی ایمنیسٹی انٹرنیشنل نے لوگوں کو پکڑ پکڑ کر امریکہ کے حوالے کرنے کو انسانی حقوق کے خلاف ایک اقدام قرار دیا ہے۔ اور انعام کے طور پر کروڑ ہا ڈالر کمانے کی بڑو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اور میں یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ صدر صاحب نے اس عمل سے جو کروڑ ہا ڈالر حاصل کئے ہیں وہ واقعی مستحق افراد کو دئے بھی گئے ہیں یا نہیں؟ اگر صدر صاحب ایک فقرہ اس امر کی وضاحت میں لکھ دیتے تو لوگ ان کی ایسی حلال کی کمائی پر عش عش کرتے۔

بین الاقوامی پریس میں جن باتوں کا بہت چرچا ہوا ان کا براہ راست تعلق گیارہ ستمبر کے حادثۂ فاجعہ سے ہے۔ یہ تو ہر ایک کے علم میں تھا کہ امریکہ نے صدر سے یہ کہا تھا کہ ''یا آپ ہمارے ساتھ ہیں یا آپ ہمارے دشمن ہیں'' مگر امریکی نائب وزیر خارجہ نے جو دھمکی ان کے آئی ایس آئی کے چیف کے ذریعہ انہیں دی تھی کہ ''اگر آپ ہمارا ساتھ نہیں دیں گے تو ہم بمباری کر کر کے آپ کو پتھر کے زمانہ تک پہنچا دیں گے'' پہلی بار اس کتاب کے ذریعہ سامنے آئی ہے۔ ٹی وی پر انٹرویو کے دوران بھی صدر سے یہ سوال پوچھا گیا تو صدر نے یہی جواب دیا۔ جب سوال کرنے والے نے کہا کہ آپ کا کیا ردعمل تھا تو

صدر نے کہا ''یہ کج خلقی (rude) تھی''۔ٹی وی والوں نے آرمیٹیج صاحب کو بھی پکڑ بلایا تھا اور ان سے پوچھا تھا کہ آپ نے ایسی کج خلقی کا مظاہرہ کیوں کیا تو انہوں نے ڈھٹائی سے کہہ دیا کہ مجھے تو یاد نہیں کہ میں نے دھمکی دی ہو البتہ صدر بش کا پیغام ضرور پہنچایا تھا یہ سارا سوال و جواب اس بات کو واضح کردینے کے لئے کافی تھا کہ امریکہ ہر قسم کی دھونس دھاندلی اور کج خلقی پر اترا ہوا ہے۔ بعد کے واقعات نے اس بات کی تصدیق بھی کر دی کہ جمہوریت کے اس علمبردار نے کیسی کیسی غیر انسانی حرکتیں روا رکھیں۔تاریخ کے صفحات میں چنگیز اور نادر شاہ کے مظالم بھی لکھے ہوئے ہیں اور مستقبل کے بچے دنیا کی سب سے بڑی جمہوری طاقت کے مظالم بھی پڑھیں گے۔تاریخ تو کسی کو معاف نہیں کیا کرتی۔

آئی ایس آئی کی جہاد افغانستان کی سعی کے حق میں جناب صدر رطب اللسان ہیں۔جرمنی کی خفیہ ایجنسی نے برلن وال کے ایک ٹکڑے کو یادگاری تختی بنا کر اسے آئی ایس آئی کو دیا تھا اور اس پر کندہ کیا تھا'' اس کے نام جس نے پہلا وار کیا'' (صفحہ ۲۷۸)۔مگر اس بات کا ذکر بھی کرتے ہیں کہ ضیاء الحق کی اس جہادی کوشش سے پاکستان کو دہشت گردی اور ہیروئن اور ناجائز ہتھیاروں کا تحفہ بھی ملا۔صدر صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ اس جہاد سے ہمیں کتنا فائدہ ہوا اور کتنا نقصان؟ یا وہ اسے بھی معاملات محبت کی طرح سود و زیاں سے بالا سمجھتے ہیں؟ زیاں ہے عشق میں یہ ہم بھی جانتے ہیں مگر۔معاملہ ہی کیا ہوا گر زیاں کے لئے!

کتاب کا آغاز اپنے اوپر ہونے والے قاتلانہ حملوں کی تفصیل پر مشتمل ہے مگر کتاب میں بہت آگے جا کر یہ انکشاف بھی کرتے ہیں کہ اُن پر حملہ کی سازش کرنے والوں میں پاکستان کی ہوائی فوج کے دو تین باوردی افراد بھی شامل تھے بلکہ ان کی سپیشل سروسز گروپ کے دو جونیئر کمیشنڈ افسران کی مدد کر رہے تھے۔''ایک آدمی تو وائس چیف آف آرمی سٹاف کی سیکیورٹی کا آدمی تھا۔'' (صفحہ ۲۵۴)۔ اللہ کا شکر ہے دہشت گرد پکڑے گئے ورنہ اندرا گاندھی کے محافظوں والی صورت حال پیدا ہو سکتی تھی۔جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔

صدر صاحب کی اس خودنوشت میں معرضِ بحث میں آنے والے موضوعات کی کمی نہیں۔ انہیں حیرت ہے کہ آگرہ میں جب واجپائی صاحب کے اور ان کے اعلان کا مسودہ تیار ہو چکا تھا تو عین وقت پر اس کو مسترد کیوں کر دیا گیا؟ صدر صاحب نے تاریخ پڑھی ہوتی تو انہیں معلوم ہوتا کہ ایسا کرنا جواہر لال نہرو کے زمانہ سے ہی اس ملک کی روایت رہی ہے، کیا انہیں کرپس مشن پلان کی بات یاد

نہیں؟ کیا انہوں نے اپنے پیشرو صدر ایوب کی خودنوشت نہیں دیکھی؟ سر ظفر اللہ خاں کی تحدیثِ نعمت تو صدر صاحب نے کیا دیکھی ہوگی شہاب صاحب کی سرگزشت ہی دیکھ لی ہوتی تو انہیں اس عمل پر ذرا بھی حیرت نہ ہوتی۔

پاکستان کے ایٹم بم کو اسلامی ایٹم بم کہنے پر انہیں بجا طور پر یک گونہ حیرت ہے کیا امریکہ کے ایٹم بم عیسائی بم ہیں؟ یا اسرئیل کے ایٹم بم یہودی اور بھارت کے ایٹم بم ہندو ایٹم بم ہیں؟ مگر دنیا میں ایسا ہی ہو رہا ہے۔یہ میڈیا کا کمال ہے۔مشرف صاحب نے بڑی سچی بات کہی ہے کہ'' دہشت گردی اسی وقت ختم ہوگی جب اس کی بنیادی وجوہات کو ختم کر دیا جائے گا اور مسلمانوں کے خلاف ناانصافی کا قلع قمع کر دیا جائے گا'' (صفحہ ۲۸۱)

آگے اے کیو خان کی ''پراسرار'' اور نامناسب سرگرمیوں کا ذکر ہے مگر انہیں معاف کر دینے پر انہیں کوئی ملال نہیں کہ انہیں ایسا ہی کرنا چاہئے تھا۔ٹی وی پر انٹرویو کرنے والے صاحب اس باب میں صدر صاحب سے خاصے تیز اور جارحانہ سوالات کر رہے تھے مگر صدر صاحب نے بڑی عزیمت سے کہا کہ ہاں میں نے ان کو معاف کیا ہے۔اور ہم نے ان پر بعض حفاظتی پابندیاں لگائی ہیں۔کتاب میں صدر صاحب نے اے کیو خان کی شخصیت میں جو مین میخ نکالی ہے وہ نہ نکالتے تو بہتر تھا۔کسی ایسے شخص پر، جو جواب دینے کی پوزیشن میں نہ ہو، الزام تراشی کرنا بنیادی اسلامی اخلاق کے منافی ہے۔ہاں اے کیو خان صاحب نے اپنی بیٹی کو پاکستان کے راز افشا کرنے کے لئے جو خط لکھ مارا تھا وہ انہیں نہیں لکھنا چاہئے تھا۔مضیٰ ما مضیٰ۔

غرض یہ خودنوشت ایک مقتدر صدر کی خودنوشت ہے جسے تمام حکومتی ریکارڈ پر دسترس حاصل ہوتی ہے اس لئے اس میں بیان کئے گئے حقائق یقیناً مستند اور ٹھیک ہوں گے۔اگر پرویز مشرف دنیا کی ریت کے مطابق صدارت سے سبک دوشی تک اس کتاب کو ملتوی کر سکتے تو کیا ہی اچھا ہوتا!

بایں ہمہ یہ خودنوشت کسی رعونت بھرے صدر کی داستان نہیں لگتی کسی عام آدمی کی سرگزشت لگتی ہے اور ہم اسے بڑی کامیابی سمجھتے ہیں۔

◎

پاکستان۔ خواب پریشان

روئیداد خاں کی خودنوشت ''پاکستان۔ خواب پریشاں'' Pakistan - a dream gone sour آکسفورڈ یونیورسٹی پریس والوں کی جانب سے پہلی بار ۱۹۹۷ میں چھپی تھی۔ دس سال گذرنے کے باوجود اب تک اس خودنوشت کا تذکرہ جہاں تہاں ہوتا رہتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک ایسے بیوروکریٹ کی خودنوشت ہے جو مختلف حکومتوں میں مختلف اہم عہدوں پر فائز رہا۔ یحیٰی کے زمانہ میں سقوطِ مشرقی پاکستان کے موقع پر یہ سکرٹری اطلاعات تھے۔ ضیاء الحق کے زمانہ میں بھٹو کی پھانسی کے وقت یہ مرکزی سکرٹری داخلہ تھے اور رحم کی اپیلوں پر معرکہ خیز اور مداہنت آمیز سمری انہی کی لکھی ہوئی تھی۔ بعد کی نام نہاد جمہوری حکومتوں کے اتار چڑھاؤ بھی انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں اس لئے ان کی خودنوشت کے دلچسپ و سبق آموز ہونے میں کس کو کلام ہوسکتا ہے۔ ایسا ہی مقام شہاب صاحب کو بھی حاصل تھا کہ وہ تاریخ کو بنتے ہوئے دیکھ رہے تھے مگر ان دونوں کے بیان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ تاریخ کو بنتے دیکھنا اور اس کو دیانت داری سے روایت کردینا بڑی ذمہ داری کی بات ہوتی ہے۔ روئیداد خاں اس ذمہ داری سے خوب عہدہ برآ ہوئے ہیں اور تاریخ میں ان کی خود نوشت کو ایک دیانتدارانہ تجزیہ کی حیثیت حاصل رہے گی مگر وا حسرتا کہ شہاب نامہ کا اصل مقام تاریخ کا کوڑے دان ہوگا۔

روئیداد خاں، موضع ہوتی ضلع مردان میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان بابوزئی قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کے دادا اپنے گاؤں کے ملک تھے اور حکومت کی جانب سے لگان کی وصولی کے اختیارات رکھتے تھے۔ ان کی خدمات کے صلے میں ان کے بڑے بیٹے رحیم داد خاں صاحب کو نائب تحصیلدار بنایا گیا۔ روئیداد خاں انہی رحیم داد خاں کے صاحبزادے ہیں۔ ان کی تعلیم مختلف جگہوں پر ہوئی کیونکہ ان کے والد صاحب بسلسلۂ ملازمت مختلف جگہوں پر متعین ہوتے رہے۔ اسلامیہ کالج

پشاور، ایف سی کالج لاہور اور علی گڑھ یونیورسٹی میں تعلیم پائی اور لیکچرار کی حیثیت سے ملازمت شروع کی۔ جلد ہی جوڈیشل سروس میں منتخب ہوگئے۔ سول سروس کا امتحان دیا اور سی ایس پی ہوگئے۔ پشاور کے ڈپٹی کمشنر بھی رہے۔ اس دوران ان کی ذوالفقار علی بھٹو سے پہلی پہلی ملاقات ہوئی۔ بھٹو صاحب قائمقام وزیر خارجہ تھے۔ پشاور پہنچتے ہی ڈی سی سے خواہش کی کہ انہیں بڈا بیر کا امریکی ہوائی اڈہ دکھایا جائے۔ انہوں نے امریکیوں سے رابطہ کیا جواب ملا۔ قائمقام وزیر خارجہ صاحب بڑی خوشی سے بڈا بیر میں تشریف لائیں مگر انہیں صرف کافی ہاؤس ہی دکھایا جاسکتا ہے اور کافی سے ان کی تواضع بھی کی جاسکتی ہے مگر اور کچھ دکھانے کا سوال ہی نہیں۔ بھٹو صاحب نے ڈی سی سے پوچھا کیا انہیں پتہ ہے میں قائمقام وزیر خارجہ ہوں؟ ڈی سی صاحب نے کہا ''جی ہاں'' اور بھٹو صاحب ٹھنڈے ہوکر بیٹھ گئے۔

روئیداد خاں صاحب کراچی کے کمشنر تھے۔ لکھتے ہیں میں اپنے لان میں بیٹھا ہوا تھا کہ مجھے بتایا گیا کہ کیپٹن گوہر ایوب خاں صاحب صدر ایوب کی جیت کے بعد وکٹری جلوس نکال رہے تھے کہ جلوس میں اور مقامی لوگوں میں تصادم ہوگیا ہے۔ یہ اطلاع کسی افسر نے نہیں دی تھی بلکہ ایک عام آدمی نے دی تھی۔ انہیں کسی ایسے جلوس کی سرکاری طور پر خبر ہی نہ تھی۔ سارا دن اپنے ڈی سی اور ڈی آئی جی کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتے رہے کوئی نہیں ملا۔ پولیس کنٹرول کے ذریعہ یہ جلوس کے بارے میں تفصیلات حاصل کرتے رہے۔ میں نے کسی سول سرونٹ افسر کو اپنی کوتاہی کا اعتراف کرتے نہ دیکھا ہے نہ سنا ہے مگر روئیداد خاں پہلے بیوروکریٹ ہیں جو علی الاعلان لکھ رہے ہیں ''قطع نظر اس کے کہ قصور کس کا تھا مجھے اعتراف ہے کہ میں کراچی کے عوام کی جان و مال کی حفاظت کرنے میں ناکام رہا اور میرا ضمیر مجھے کچوکے لگاتا رہتا ہے''۔ (صفحہ ۲۱)

روئیداد خاں صاحب نے پاکستان کے چھ صدور کا دور دیکھا۔ صدر ایوب، صدر یحیٰی، ذوالفقار علی بھٹو، ضیاء الحق، غلام اسحٰق خاں اور فاروق لغاری۔ غلام اسحٰق خاں سے تو ملازمت کے آغاز سے ان کا تعلق و تعارف رہا اور یہ ان کے چند گنے چنے دوستوں میں تھے جن سے وہ بے تکلف رہے۔ صدر ایوب کے زمانہ میں انہیں مارشل لاء اور دستور کی تنسیخ کے عواقب دیکھنا پڑے اس وقت یہ پشاور کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ صدر یحیٰی کے وقت میں یہ پی ٹی وی کے ایم ڈی بنائے گئے تو ان کی والدہ محترمہ کو بڑا دکھ ہوا

بڑے کرب سے فرمانے لگیں "ان کے پاس میرے بیٹے کو دینے کے لئے یہی گویوں والی نوکری رہ گئی تھی"؟ اور جب صاحبزادے نے کہا کہ میں تو اس نوکری میں بڑا خوش ہوں تو انہیں اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آیا۔ (صفحہ ۵۴)

۱۹۷۰ کے الیکشن کی دیانتدارانہ اور مکمل کوریج پر یہ بڑے خوش ہیں کہ پی ٹی وی نے بڑا معرکہ کا کام کیا۔ آغا ناصر صاحب نے اپنی کتاب "گلشنِ یاد" میں اس کوریج کا سارا کریڈٹ خود لینے کی کوشش کی ہے اور تاثر یہ دیا ہے کہ ان کے افسران خاص طور سے ایم ڈی ان کے کام سے خوش نہیں تھے اور انہیں اس کام کا کریڈٹ نہیں دیتے تھے۔ عجیب اتفاق ہے کہ روئیداد خاں صاحب کے ایک بھائی پی پی کے ٹکٹ پر ہوتی کی سیٹ پر کامیاب ہوئے اور یہ سرحد میں پی پی کی یہ واحد سیٹ تھی، ان کا خیال تھا کہ بھٹو صاحب ان کی کامیابی پر انہیں کریڈٹ دیں گے مگر بھٹو صاحب نے ان کو ذرا سا کریڈٹ دینے کی کوشش نہیں کی اور کہا کہ انہوں نے کمزور مرغابیوں کو مار کر کون سا کام کیا ہے؟ اس پر روئیداد خاں صاحب کا ردعمل یہ ہوا کہ "بھٹو دل کے بڑے چھوٹے تھے وہ اپنی پارٹی کے کارکنان کو بھی، خواہ وہ کتنے بھی مستحق ہوں، کریڈٹ دینے پر تیار نہیں تھے" (صفحہ ۵۷) خدا کرے آغا ناصر کا تاثر غلط ہو اور روئیداد خاں صاحب اپنے ماتحتوں کو اچھے کام کا کریڈٹ فراخدلی سے دیتے رہے ہوں!

الیکشن کے بعد یہ مشرقی پاکستان گئے تو سرخ مولانا یعنی مولانا بھاشانی سے بھی ملے۔ مولانا نے ایک گھنٹہ تک ان سے نفیس اردو میں بات چیت کی اور بتایا کہ "دورہ کے دوران مجیب سے سرراہے ملاقات ہوئی مولانا نے اس سے کہا کہ اگرچہ اس وقت وہ بڑے بڑے مجمعے اکٹھے کرنے میں کامیاب ہو رہا ہے کیونکہ وہ مغربی پاکستان کے خلاف منافرت پھیلانے والی تقریریں کر رہا ہے مگر یاد رکھنا "ایک دن یہی لوگ تمہیں پھانسی چڑھا دیں گے اور تمہاری لاش کو ڈھاکہ کی گلیوں میں گھسیٹتے پھریں گے"۔ (صفحہ ۵۶)

بھٹو کے سی ایم ایل اے اور صدر اور وزیراعظم ہونے کا بہت ذکر ہے۔ بھٹو کی منتقمانہ کارروائیوں کا بھی چرچا ہے۔ مگر ان کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی جن سے معلوم ہوتا تھا کہ بھٹو کے اندر جو جینئس تھا وہ بہت جلدی میں تھا اور یہ جلدی ہی انہیں لے ڈوبی۔ جس روز ایوب نے انہیں برطرف کیا

یہ اور غلام اسحٰق خاں دونوں انہیں ملنے گئے۔ "بھٹو صاحب مکان کے لان میں بیٹھے تھے اور وسکی کا گلاس ان کے ہاتھوں میں تھا۔ غلام اسحٰق خاں نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا مگر بھٹو ان کے گلے لگ گئے اور رونے لگے پھر مجھ سے ملے اور کہا ایوب نے جو سلوک میرے ساتھ کیا ہے وہ کسی چپراسی سے بھی نہیں کیا جاتا" (صفحہ ۴۷)۔ غلام اسحٰق خاں نے انہیں تسلی دی اور کہا "آپ ابھی جوان ہیں اور سارا مستقبل آپ کے سامنے پھیلا ہوا ہے" اس لئے ہمت کریں۔ کچھ دنوں کے بعد روئیداد خاں صاحب انہیں پھر ملے تو اس وقت وہ تسلی میں تھے اور اپنے کاغذات سمیٹ رہے تھے" بے بی بے نظیر" چھوٹی سی تھیں پاپا سے کہنے لگیں "پاپا کیا اب ہم بھی عوام ہو گئے ہیں؟" (صفحہ ایضاً)

بھٹو کی سزا سپریم کورٹ نے بحال رکھی اور ان کی نگرانی کی درخواست بھی مسترد کر دی تو رحم کی اپیلوں کا مرحلہ آیا۔ "وزارت داخلہ کو کیس کا ریکارڈ لاہور سے کوئی گیارہ بجے موصول ہوا۔ سمری کو ڈرافٹ کرنے کا کام تقریباً اسی وقت شروع ہو گیا۔۔۔ ہم نے صاف صاف لکھا کہ سزا کی تخفیف کرنے یا معاف کرنے کے سلسلہ میں صدر کے تمام تر اختیارات بکلی قائم ہیں"۔ یہ سمری تیاری کے مراحل میں تھی ادھر سی ایم ایل اے سیکرٹیریٹ بے چینی و بے صبری دکھا رہا تھا اور بار بار فون کر رہا تھا کہ سمری جلدی بھیجی جائے اور تیز ترین طریقہ سے بھیجی جائے۔ یکم اپریل کے پچھلے پہر میرے جائنٹ سکرٹری ارشاد خاں سمری لے کر پہلے چیف آف سٹاف جنرل عارف کے گھر گئے اور وہاں سے آرمی ہاؤس کی جانب روانہ ہوئے۔ ارشاد صاحب نے بعد کو مجھے بتایا کہ رستہ میں ان کی کار کا ڈرائیور غلطی سے کسی غلط سڑک کی جانب مڑا تو جنرل عارف اس پر برس پڑے۔ میں جنرل عارف سے اس بات کی تصدیق نہیں کر سکا مگر اس وقت سب لوگ ہی بڑے اعصابی تناؤ کی کیفیت میں تھے۔ ارشاد نے بتایا کہ صدر نے سمری پڑھے بغیر ہی رحم کی اپیلیں مسترد کر دیں۔

دوسری طرف جنرل عارف نے اپنی کتاب working with Zia میں لکھا ہے کہ صدر نے سمری کو غور سے پڑھا تھا۔" (صفحہ ۶۹) جنرل عارف کہ کہنا ہے "جنرل ضیا نے سمری کا بغور مطالعہ کیا ان کی [illegible] تصور کئے جانے چاہئیں۔ ان کے پانچ مہلک الفاظ نے مسٹر بھٹو کی زندگی پر مہرِ مرگ ثبت کر دی۔۔۔

درخواست مسترد کی جاتی ہے''۔(ضیاء الحق کے ہمراہ۔صفحہ ۲۹۱)۔روئیداد خاں نے اس بات پر بحث بھی کی ہے''یہ کہا جاتا ہے ضیاء کا بھٹو کو پھانسی لگانے کا فیصلہ عدل وانصاف کے تحت کیا گیا تھا جنہیں دیگر تمام امور پر فوقیت دی جانی چاہیے۔اور یہ کہ ضیاء نے کبھی اعلیٰ عدالتوں کی دی ہوئی سزائے موت کو معاف نہیں کیا تھا۔اور وہ بھٹو کے معاملہ میں کوئی استثناء نہیں کرنا چاہتے تھے۔یہ بات حقیقت کے خلاف ہے۔بھٹو کی سزائے موت سے پہلے اور بعد میں ضیاء نے وزارت داخلہ سے اختلاف کرتے ہوئے اور سپریم کورٹ کے فیصلہ کے برعکس موت کی کئی سزائیں معاف کی تھیں۔''(صفحہ ۷۰)

روئیداد خاں صاحب نے دیانت داری سے یہ تجزیہ بھی اپنی کتاب میں درج کیا ہے کہ''بھٹو کے خلاف فوجی بغاوت اور مارشل لاء کے قیام کا کوئی جواز نہیں تھا۔ایک پرانے قتل کے مقدمہ کا احیاء اور اس میں بھٹو کی گرفتاری اور مقدمہ سب کچھ سیاسی مقاصد کے لئے کیا گیا تھا۔مقدمہ میں بھٹو سے انصاف نہیں کیا گیا۔فوج نے جس وقت ان کا تختہ الٹا اسی وقت ہی ان کی قسمت پر مہر لگ گئی تھی'' (صفحہ ۷۲) اور میرا خیال ہے سرسری لکھتے وقت روئیداد خاں صاحب کے سامنے ضیاء الحق کا یہ ارشاد بھی رہا ہوگا''ضیاء الحق نے ایک بار مجھ سے کہا تھا روئیداد صاحب! اس کی گردن جائے گی یا میری'' (صفحہ ۷۰) اور روئیداد صاحب نے صحیح گردن چنی!

روئیداد صاحب نے اسی کتاب میں بڑے دکھ سے یہ بھی لکھا ہے کہ''۴ اپریل ۱۹۷۹ کو ذوالفقار علی بھٹو وزیراعظم پاکستان باون سال کی عمر میں (تارا مسیح کے) پھانسی کے پھندے سے ہلاک ہو گئے، ان کے جو بھی گناہ تھے یا غلطیاں تھیں یا زیادتیاں تھیں یا بے اصولیاں تھیں وہ اس بے مثال اذیت سے ایک حد تک دھل گئی ہوں گی۔بھٹو صاحب نے مقتدر ہونے میں بھی جلدی کی اور جانے میں بھی جلدی دکھائی''(صفحہ ۱۷۱) بھٹو صاحب کی باون سال کی عمر میں موت کا ذکر بھی کسی سرکاری افسر کی تحریر میں پہلی بار کیا گیا ہے۔پچھلے دنوں جب بے نظیر بھٹو باون سال کی ہوئیں اور جلاوطنی میں ان کی سالگرہ منائی گئی تو لوگوں کو ان کے باپ کی باون سال کی عمر کا [illegible] کے آگے کس کی پیش جاتی ہے۔کرنل رفیع الدین نے اپنی کتاب''بھٹو کے آخری دن''میں لکھا ہے کہ موت کے بعد بھٹو صاحب کے جسم کے درمیانی حصے کے قریب سے فوٹو لئے گئے تھے تاکہ اس بات کا

یقین کیا جا سکے کہ ان کے ختنے ہوئے تھے یا نہیں؟ کاش روئیداد خاں صاحب اس بے حرمتی کے باب میں بھی کچھ کہہ دیتے۔

بھٹو صاحب کے ذکر نے بہت وقت لے لیا۔بھٹو صاحب کی بیٹی کا تذکرہ بھی دیکھئے۔جب فاروق لغاری صاحب صدر منتخب ہو گئے تو بے نظیر نے انہیں کھانے کی دعوت دی جس میں روئیداد صاحب بھی موجود تھے۔فاروق لغاری کہنے لگے میں صدارت کا حلف اٹھانے کے بعد قوم سے خطاب کرنا چاہوں گا۔محترمہ نے انہیں (سب کی موجودگی میں) جھڑکنے کے انداز میں کہا''آپ کو قوم سے خطاب کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ہم صدر کے عہدے کو ویسے بھی کمتر اہمیت دینا چاہتے ہیں'' (صفحہ ۱۶۰) گویا بی بی نے پہلے دن ہی منتخب صدر مملکت کو ان کی اوقات یاد دلانے کی کوشش کی اور صدر نے موقع ملتے ہی اس خفت کا بدلہ لے لیا۔

اس کتاب کا اہم حصہ قائداعظم کی وہ تقریر ہے جو قائداعظم نے ۱۴ اپریل ۱۹۴۸ کو پشاور گورنمنٹ ہاؤس میں سرکاری افسروں سے خطاب کرتے ہوئے فرمائی اور اب ہماری تاریخ میں اس تقریر کا سراغ تک نہیں ملتا۔قائداعظم نے کہا تھا''پہلی بات میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کو سیاسی دباؤ میں نہیں آنا چاہیے۔خواہ وہ دباؤ کسی فرد کی طرف سے ہو یا پارٹی کی طرف سے۔اگر آپ اپنی سروس کی عزت بڑھانا چاہتے ہیں تو آپ کو دباؤ قبول نہیں کرنا چاہیے۔آپ قوم اور ملک کے خادم کے طور پر اپنے فرائض بے خوفی اور دیانت داری سے ادا کرتے رہیں۔سروس تو حکومتوں کی ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے۔گورنمنٹ بنتی ہے ٹوٹتی ہے وزراءاعظم آتے ہیں چلے جاتے ہیں مگر آپ لوگ اپنی جگہ قائم رہتے ہیں اس لئے آپ کے کندھوں پر بھاری ذمہ داری ہے۔آپ لوگوں کو اس سیاسی لیڈر یا اُس سیاسی لیڈر کی یا اس سیاسی پارٹی یا اس سیاسی پارٹی کی پشت پناہی کرنے کی ضرورت نہیں یہ آپ کا کام نہیں۔جو حکومت آئینی لحاظ سے قائم ہو اور جو بھی وزیراعظم اقتدار میں ہو آپ کا فرض ہے کہ حکومت کو دیانت داری اور وفاداری سے اور بے خوفی سے چلائیں اور اپنی سروس کی عزت و آبرو اور اعلیٰ معیار کو قائم رکھیں۔''(صفحہ ۱۸۲)

یہ تقریر جو سرکاری افسروں کا منشور ہے نہ جانے کس کی فریب کاری سے منظرعام پر نہیں آتی

اور ہمارے عمال حکومت جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے کے مصداق جو چاہتے ہیں کرتے رہتے ہیں۔اور سیاسی رہنما یا پارٹیاں؟ وہ تو جیسے کھل کھیلنے کو اپنا حق جانتی ہیں اور روئیداد خاں صاحب نے پاکستان کو خواب پریشان ہی اسی لئے کہا ہے کہ کسی ایک کو کسی دوسرے کی دیانت داری اور وفاداری کا یقین ہی نہیں رہا۔

روئیداد خاں تاریخ داں ہیں اس لئے ہر موقعہ پر ہر مقام پر تاریخ عالم سے کوئی نہ کوئی مثال یا مقولہ ڈھونڈ کر اس کا حوالہ دیتے رہتے ہیں۔انہیں داد دینا پڑتی ہے کہ ان کا مطالعہ بہت وسیع اور ان کا انداز بیان نہایت مناسب و موزوں ہے زبان پر انہیں بڑی دسترس حاصل ہے اور اپنے دوست اور بزرگ غلام اسحٰق خاں کی طرح انہیں انگریزی زبان کی صحت کا بہت خیال رہتا ہے اسی لئے ان کی یہ خود نوشت بہت رواں دواں ہے اور پڑھنے والا ان کے زور بیان کی رو میں بہتا چلا جاتا ہے۔

اختتامیہ کو آپ نے فیض کی نظم صبح آزادی سے شروع کیا ہے یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر۔وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں۔یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں۔فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل۔کہیں تو ہوگا شبِ سست موج کا ساحل۔کہیں تو جا کے رکے گا سفینہء غمِ دل! ساری قوم ہی سفینہء غمِ دل کے کنارے لگنے کا انتظار کر رہی ہے۔

ایک مہمان خود نوشت

خاطرات

ایران کی سابق ملکہ فرح پہلوی کی خودنوشت فارسی میں ''خاطرات'' کے عنوان سے پچھلے سال چھپی ہے۔ اس کا فرانسیسی اور انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے اور بعض دیگر زبانوں میں تراجم ہو رہے ہیں۔ انگریزی میں اس کا عنوان ہے ''پائیدار محبت''۔ یہ خودنوشت ایک ایسی خاتون کی سرگزشت ہے جس نے زندگی میں انتہائی دنیاوی بلندی دیکھی اور پھر گردش روزگار کے ہاتھوں بے بسی کی ایسی کیفیت سے بھی دوچار ہوئی کہ دنیا اپنی تمام تر وسعتوں کے باوجود اس پر اور اس کے شوہر سابق شہنشاہ ایران پر تنگ ہو گئی اور وہ ''شہنشاہ آریہ مہر'' در در سے دھتکار دیا گیا۔ دوست دشمن ہو گئے۔ اپنے پرائے بن گئے۔ وہ جو اس کے چشم و ابرو کے اشارے پر سب کچھ کر گزرنے پر تیار رہتے تھے اس سے آنکھیں چرانے لگے۔ تلک الایام نداولھا بین الناس! یہ کتاب دنیائے دوں کی بے ثباتی کا ایک نیا زاویہ بیان کرتی ہے۔ فاعتبرو یا اولی الابصار۔

بیسویں صدی کی پانچویں دہائی کے اواخر میں ایک معصوم سی نازک اندام ایرانی لڑکی فرح دیبا کا نام اچانک اخبارات کی زینت بننے لگا۔ یہ لڑکی پیرس کے ایک سکول میں آرکیٹیکچر کی طالب علم تھی۔ وجہ یہ تھی کہ ان دنوں شاہنشاہ ایران نے اپنی ملکہ ثریا کو اس بنا پر طلاق دے دی تھی کہ وہ ان کے لئے تاج وتخت کا وارث پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوئیں اس لئے اس امید میں کہ شاید مستقبل کی ملکہ ان کے لئے تاج وتخت کا وارث پیدا کر سکے وہ نئی بیوی کی تلاش میں تھے۔ فرح دیبا ایران کے ایک معزز خاندان کی یتیم بیٹی تھیں اور اپنے ماموں کے خرچ پر پیرس میں تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں ایران واپس آئیں تو چھٹیوں کے خاتمہ کے قریب اپنے وظیفہ کی تجدید و توسیع کے لئے اپنے چچا کے ساتھ شاہ کے داماد اردشیر زاہدی سے ملیں۔ وہ وظائف میں توسیع و تجدید کے ذمہ دار افسر تھے۔ انٹرویو کے بعد انہوں نے فرح دیبا کے چچا اسفندیار دیبا سے کہا کہ وہ اس لڑکی کو اپنی بیوی یعنی

شہزادی شہناز سے ملانا چاہتے ہیں۔ شہزادی شہناز نے انہیں باقاعدہ مدعو کیا اور اسی دعوت میں اپنے ابا شہنشاہ ایران کو بھی مدعو کر لیا تاریخ کا نیا باب رقم ہونے کی شروعات شروع ہو گئیں۔ فرح دیبا بیس سال کی تھیں اور شاہنشاہ ان سے پورے بیس سال بڑے تھے۔

اس ملاقات کو کئی ہفتے گذر گئے۔ اس دوران شہنشاہ ایران نے انہیں دو چار بار ملاقاتوں کے لئے بلایا اور دونوں چپ چپاتے شہر میں ادھر ادھر گھومتے پھرتے سیریں بھی کرتے رہے۔ فرح دیبا اپنے سکول واپس جانے کی تیاری میں تھیں مگر گومگو کا عالم تھا۔ آخر انہوں نے اپنے چچا کے ذریعہ پچھوا ہی لیا کہ ان کے وظیفہ کا کیا بنا؟ جواب ملا اب اسے بھول جایئے اور انتظار کیجئے! آخر مزید دو چار ملاقاتوں کے بعد، جن میں ایک ملاقات میں شہنشاہ نے انہیں اپنے ذاتی ہوائی جہاز میں خود جہاز اڑا کر انہیں تہران کی سیر بھی کروائی اور واپسی پر ان کے لینڈنگ گیئر نے کھلنے سے انکار کر دیا تو مرتے مرتے بھی بچے، شہنشاہ نے شہزادی شہناز ہی کے گھر پر انہیں شادی کا پیغام دیا۔ تاریخ کا نیا موڑ سامنے آ گیا۔ وہ معصوم سی بھولی بھالی لڑکی دنیا بھر کی توجہ کا باعث بن گئی۔ کسے خبر تھی کہ اس لڑکی کے بطن سے شہنشاہ کے تاج وتخت کا وارث تو پیدا ہو جائے گا مگر شہنشاہ کا تاج وتخت باقی نہیں رہے گا!

۲۱ دسمبر ۱۹۵۹ کو یہ شہنشاہ ایران کی دلہن بن گئیں۔ ہمیں یاد ہے کہ اس شادی کا چرچا ایران میں تو بہت ہوا ہو گا پاکستان میں بھی کوئی کم نہیں ہوا۔ خاص طور پر نوجوانوں میں اس خوب صورت لڑکی کا بہت چرچا تھا اس زمانہ میں پیدا ہونے والی بہت سی بچیوں کا نام فرح رکھا گیا۔ یہ نام اسی شادی کی بدولت ہمارے ہاں رائج الوقت ٹھہرا۔ ہمیں یاد ہے ہم لوگ اس تاریخ کو مشہور مورخ ڈاکٹر مبارک علی کے کالج سٹی آرٹس کالج حیدرآباد کے اردو مباحثہ میں شریک تھے۔ ہم نے ٹرافی جیتی تھی۔ مباحثہ کے بعد ہم لوگ یعنی پنجاب یونیورسٹی لاہور کی اور گورنمنٹ کالج لاہور کی ٹیمیں خوش خوش اپنی قیام گاہ کی طرف جا رہے تھے کہ یکا یک ہمارے ایک ساتھی نے اپنی بلند و بالا رعب دار آواز میں کہا ''رک جاؤ تم لوگوں کو پتہ نہیں کہ آج محبت کی دنیا میں ایک عجیب سانحہ ہو گیا ہے! ظالمو شاہ ایران نے ایران کی سب سے خوبصورت لڑکی سے شادی کر لی ہے۔'' یہ کہہ کر اونچی آواز میں ساحر کی نظم الاپنے لگے ''اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق''۔ ساری فضا سوگوار ہو گئی۔ اب جب کہ

میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں اس فضا کی اداسی اب تک بول رہی ہے۔ حیف کہ اس وقت اس اداس فضا کو تخلیق کرنے والا مقرر ارشاد حسین کاظمی اس وقت ہمارے درمیان موجود نہیں۔

۲۰ فروری ۱۹۶۰ کو ان کا پہلا سرکاری دورہ بھی پاکستان کا ہی تھا۔ فرح نے اس دورہ کا ذکر بھی بڑے رومانٹک انداز میں کیا ہے کہ اس وقت یہ امید سے تھیں مگر میاں بیوی کے سوا کسی کو اس کا علم نہیں تھا۔ پاکستان کی گرمی نے حاملہ ہونے کی تکلیف کو اور زیادہ ناقابلِ برداشت بنا دیا تھا۔ ''میں صدر ایوب کے ہمراہ موٹر میں بیٹھی تھی اور وہ خوبرو آدمی مجھے پاکستان کے بارہ میں بتا رہا تھا مگر میں یہ سوچ رہی تھی کہ آیا میں منزل پر پہنچنے تک اپنی متلی کو قابو میں رکھ سکوں گی یا نہیں وہاں پہنچتے ہی میں غسل خانہ کی طرف بھاگی''۔ لوگ سوچتے تو ہوں گے کہ مجھے کیا ہو گیا ہے مگر'' میں نے اس دورہ سے بہت لطف لیا۔ پاکستان اور ایران کے سیاسی اور ثقافتی تعلقات بہت مضبوط رہے ہیں اس لئے پاکستانیوں نے میرے ساتھ بڑی محبت کا سلوک روا رکھا۔ ثقافتی شامیں بہت پر لطف رہیں۔ خاص طور سے لاہور کے باغوں میں ہونے والی تقریبات۔ انہی تقریبات میں میں نے اقبال لاہوری کے فارسی کلام کو سنا۔ فنون و ثقافت میں میری دلچسپی لوگوں پر عیاں ہوئی۔ بعد کو ہم نے شیراز کے میلہ میں پاکستانی فنکاروں کو بھی مدعو کیا'' (صفحہ ۱۰۶)۔

فرح دیبا تقریباً بیس برس تک ایران کی ملکہ رہیں۔ اس دوران اللہ تعالیٰ نے انہیں دو بیٹے اور دو بیٹیاں دیں۔ بڑا بیٹا (ولی عہد شہزادہ رضا) جلاوطنی کے بعد فائٹر پائلٹ بنا۔ دوسرے بچے بھی اپنی اپنی جگہ تعلیم حاصل کرتے رہے۔ سب ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور روزگار سے لگے ہوئے ہیں۔ ان کی بہویں بھی ان کے ساتھ ہیں۔ سب سے چھوٹی بیٹی لیلیٰ نے حالات سے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کر لی۔ شاہ کی وفات کے بعد اب یہ سارا خاندان در بہ در کی ٹھوکریں کھانے کے بعد آخر کار امریکہ میں آباد اور اپنے حال پر مطمئن ہے۔ سابق ملکہ فرح کی دو پوتیاں ہیں۔ انہوں نے حالات سے سمجھوتا کر لیا ہے۔ مگن ہیں اور اپنے اوپر ہنس بھی سکتی ہیں۔ لکھتی ہیں مارکیٹ میں ایک آدمی سے ملاقات ہوئی۔ وہ مجھ سے کہنے لگا ''مجھے کسی نے بتایا ہے کہ آپ شاہ کی بیوی ہیں؟ میرے ساتھ تصویر تو کھنچوائیں''۔ یہ راضی ہو گئیں تو اس نے اپنی بیوی کو بھی بلا لیا۔ تصویر کھچوانے کے بعد کہنے لگا ''اب لگے ہاتھوں یہ بھی

بتاتی جائیں کہ آپ کس ملک کے شاہ کی بیوی ہیں؟'' (صفحہ ۴۰۴)۔

تاریخ نے انقلاب ایران کا جو باب لکھا ہے وہ اپنی نوعیت کا انوکھا باب ہے۔ ہمارے ہاں اردو میں اس کا احوال مختار مسعود کے احوالِ ایام میں موجود ہے۔ ۱۶ جنوری ۱۹۷۹ کو شہنشاہ ایران نے ایران کو خیر باد کہا اور اس کے بعد انہیں کہیں چین نصیب نہ ہوا۔ واں سے نکل کے پھر نہ فراغت ہوئی نصیب۔ آسودگی کی جان تری انجمن میں تھی۔

یہ خاندان تہران سے روانہ ہوا تو شاہ اپنا جہاز خود اڑا رہے تھے جب تک ایران کی سرزمین پر اڑتے رہے خود اڑاتے رہے اس کے بعد دوسروں کے حوالے کر دیا۔ مصر میں آسوان پہنچے تو صدر انوار السادات اور ان کی بیگم ان کے استقبال کو موجود تھے۔ یہ واحد سربراہِ مملکت تھے جنہوں نے ان حالات میں شہنشاہ کو اپنی سرزمین پر رہنے کی نہ صرف اجازت دی بلکہ انہیں بعد کو علاج معالجہ کی ساری سہولتیں بھی مہیا کیں۔ اور شہنشاہ ایران وہیں اسی مٹی میں دفن ہیں۔ ان کے والد رضا شاہ اول بھی جلاوطنی میں مرنے کے بعد وہیں دفن ہوئے تھے ان کے بیٹے نے ان کا تابوت واپس ایران پہنچایا تھا اور ان کا شایانِ شان مقبرہ تعمیر کیا تھا جسے انقلاب کے علمبرداروں نے تاراج کر دیا۔ اس تاراجی کی عبرت انگیز تفصیلات لوحِ ایام میں محفوظ ہیں۔

شاہ کو علم تھا کہ انہیں کینسر جیسا موذی مرض لاحق ہے مگر وہ اسے دوسروں پر ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے مبادا ان کا حوصلہ پست ہو جائے۔ مصر کے بعد وہ مراکش میں پناہ گزین ہوئے۔ امریکہ، برطانیہ، فرانس نے ان پر واضح کر دیا تھا کہ وہ انہیں اپنی سرزمین پر خوش آمدید کہنے کو تیار نہیں حالانکہ یہی تین بڑے ممالک تھے جن کے سیاسی اور اقتصادی مفادات ایران سے وابستہ رہے تھے۔ مراکش کے شاہ حسن کو ان کی خفیہ پولیس نے بتایا تھا کہ ایران کے کمانڈوز ان کے خاندان کے افراد کو اغوا کرنے اور ان کے مبادلہ میں شاہ ایران کو حاصل کرنے کی تگ و دو میں ہیں مگر شاہ حسن نے اس کی پروا نہیں کی مگر فرح کا کہنا ہے کہ ہم یہ بات گوارا نہیں کرتے تھے کہ ہماری وجہ سے شاہ حسن کا اور ان کے گھر بار کا سکون برباد ہو۔ اس لئے یہ لوگ وہاں سے روانہ ہوئے اور ''باہاماز'' میں ایک چھوٹے سے مکان میں جا کر ڈیرے لگائے۔

باہاماز نے بھی راک فیلر اور ہنری کسنجر کی پرزور سفارشوں کے بعد انہیں ویزا دیا تھا۔ یہ تین کمروں کا مکان تھا سامان رکھنے کی کوئی جگہ نہیں تھی اس لئے سامان کو باہر خیموں میں رکھا گیا تھا۔ عملہ اور حفاظتی سٹاف کے لئے ہوٹلوں میں اور دیگر مکانوں میں جگہ حاصل کی گئی تھی۔ وطن سے نکلنے کے بعد تھوڑے ہی عرصہ میں محلوں میں رہنے والا خاندان مکانوں میں رہنے لگا ایران کے ملاؤں کی جانب سے پیہم دھمکیاں مل رہی تھیں کہ وہ ان لوگوں کو چین سے آرام سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔ شاہ کو قتل کرنے والے کے لئے انعامات مقرر تھے حتیٰ کہ صادق خلخالی نے اعلان کیا کہ ایرانی قاتل شاہ کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے باہاماز کی طرف چل پڑے ہیں۔ خلخالی صاحب نے فرح کو یہ لالچ بھی دیا کہ ''اگر فرح شاہ کو موت کے گھاٹ اتار دے تو اسے نہ صرف انعام دیا جائے گا بلکہ معاف کر دیا جائے گا اور ایران واپس آنے کی اجازت بھی دے دی جائے گی'' ۔(صفحہ ۳۱۶)

ویزا ختم ہونے میں تین ہفتے باقی تھے کہ باہاماز کی حکومت نے انہیں مطلع کیا کہ ان کے ویزے میں توسیع نہیں کی جائے گی۔ آخر کار ہنری کسنجر کی کوششوں سے میکسیکو انہیں خوش آمدید کہنے پر تیار ہو گیا۔ ایران سے آنے والی خبریں پریشان کن تھیں۔ امیر عباس ہویدا سابق وزیر اعظم کے قتل پر تو شاہ کمرہ سے باہر جا کر سسک سسک کر روئے۔ ادھر ان کی بیماری شدید تر ہو رہی تھی ان کا آپریشن ہونا ضروری تھا۔ ان کے خاندانی ڈاکٹر ڈاکٹر فلانڈرین میکسیکو میں ہی اس آپریشن کا انتظام کرنا چاہتے تھے مگر شہزادی اشرف پہلوی اور ان کے مشیر نے امریکہ کو مناسب جانا اور شہزادی اشرف پہلوی نے صدر کارٹر کو خط بھی لکھ دیا۔ اس پر آپریشن کے لئے انہیں بادلِ ناخواستہ امریکہ آنے کی اجازت دے دی گئی۔ حالانکہ شاہ کہہ چکے تھے کہ ''امریکہ نے ان کے ساتھ جو نامناسب رویہ روا رکھا ہے اس کے پیشِ نظر اب اگر وہ انہیں پاؤں پڑ کر بھی امریکہ آنے کو کہیں گے تو وہ امریکہ نہیں جائیں گے'' (صفحہ ۳۲۴) مگر انہیں جانا پڑا۔

ادھر ایران نے تہران میں امریکی سفارت خانہ پر قبضہ کر کے امریکی عملہ کو یرغمال بنا لیا ۔ہسپتال میں بھی ان کو قید و بند جیسی صورت حال کا سامنا تھا باہر مظاہرین شاہ مردہ باد کے نعرے لگاتے رہتے تھے۔ یہ نظر آ رہا تھا کہ انہیں یہاں امن چین میسر نہیں ہوگا۔ ایک مصر تھا کہ اپنی میزبانی پر مصر تھا

اور بالآخر انہیں وہیں واپس ہونا پڑا۔ فرح انہیں لے کر واپس مصر آ گئیں۔ شاہ کی صحت کو جو نقصان پہنچنا تھا وہ پہنچ گیا پھر انہیں صحت یابی نصیب نہ ہوئی۔

ایران میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی ہر شخص انقلابی انصاف کی زد پر تھا۔ مختار مسعود نے سادہ لفظوں میں لکھا ہے کہ انقلاب اپنے ہی بچوں کو کھا رہا تھا جس کو چاہا ''مردود شد'' کہا اور قتل کر دیا۔ میرے پاس اس وقت ''لوحِ ایام'' موجود نہیں ورنہ میں حوالے درج کرتا۔ فرح نے ایک ایسے ہی قاتل کا بیان شائع کیا ہے اس نے اپنی بیوی کو خط لکھا تھا کہ ''میں نے ملاؤں کے حکم پر فوجی افسروں کو قتل کیا ہے اس لئے میں سیدھا جنت میں جا رہا ہوں مگر تم فکر نہ کرنا۔ میں کسی حور کے پنجہ میں نہیں آؤں گا۔ تمہارا انتظار کروں گا'' (صفحہ ۲۸۹)۔

شاہ کے دور میں وفادار رہنے والوں کو چن چن کر قتل کیا جا رہا تھا جنرل نصیری، جنرل رحیمی کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا مقدمہ کے دوران شاہ کا نام آیا تو جنرل رحیمی کا ہاتھ سیلیوٹ کرنے کو اٹھ گیا اس لئے سزا یہ تجویز ہوئی کہ انہیں گولی مارنے سے قبل ان کا وہ بازو کاٹ دیا جائے اور کاٹ دیا گیا۔ (صفحہ ۳۳۹) عورتوں تک کو معاف نہ کیا گیا۔ ''وزیر تعلیم کو قتل کرنے سے پہلے اسے ایک بورے میں بند کر کے گولی ماری گئی کہ کہیں اس کا جسم قتل ہونے کے بعد عریاں ہو کر نہ گرے۔ جن کنواری لڑکیوں کو قتل کیا گیا انہیں پہلے عصمت دری کا نشانہ بنایا گیا کیونکہ عام خیال یہ تھا کنواریاں سیدھی جنت میں جاتی ہیں'' ۔(صفحہ ۱۷۹)۔ شاہ کی وفات اور جنازے کا بیان بڑا دردناک ہے۔ لکھتی ہیں ''دنیا کے تمام بادشاہوں، صدروں اور سربراہانِ مملکت سے ہمارے کوئی تیس برس سے زیادہ کے تعلقات تھے مگر جنازے پر سوائے سابق صدر رچرڈ نکسن اور یونان کے کانسٹنٹائن کے کوئی بھی نہیں آیا!۔۔۔ کوئی بھی نہیں!! فرانس کے صدر گسکارڈ نے بعد کو اپنی یادداشتوں میں لکھا کہ وہ اپنی اس بدخلقی کو کبھی معاف نہیں کر سکے۔ میں خود بھی تو شامل نہیں تھی کیونکہ اسلامی روایات کے مطابق عورتیں جنازے کے ساتھ نہیں جاتیں'' (صفحہ ۳۸۸)

فرح پہلوی کی یہ خودنوشت ایران کے اس دور کی خونی تاریخ کو بیان کرنے والی سرگزشت ہے۔ وہ خود تو اپنی قسمت کا فیصلہ دیکھ چکی ہیں اب انہیں ان ظالموں کے کیفر کردار تک پہنچنے کا انتظار

ہے۔ دیکھئے مکافات عمل کا یہ سلسلہ کب شروع ہوتا ہے۔ یہ خودنوشت ایک ایسی لڑکی کی داستان ہے جسے قسمت نے فرش اے اٹھا کر عرش تک پہنچا دیا۔ وہ اپنے شوہر کے سیاسی فیصلوں میں شریک نہ تھی مگر فیصلہ کرنے والے کی شریکِ حیات تھی اس لئے اس نے اس کی پوری پوری سزا یا جزا پائی۔ ساری خود نوشت کا مجموعی تاثر مظلومیت اور بے بسی کا تاثر ہے اور یہی ہونا چاہئے۔

◎

کتابیات

1 ''سرگزشت''۔ عبدالمجید سالک' الفیصل ناشران۔ اردو بازار لاہور 1993ء

2 ''سرگزشت''۔ ذوالفقار علی بخاری۔ غالب پبلشرز لاہور۔

3 ''آشفتہ بیانی میری''۔ رشید احمد صدیقی۔ مکتبہ جامعہ نئی دہلی 1989

4 ''زرگزشت'' مشتاق احمد یوسفی دانیال کراچی۔

5 ''خواب باقی ہیں'' آل احمد سرور۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ 1991ء

6 ''تحدیثِ نعمت'' سر محمد ظفراللہ خان۔ ڈھاکہ بینیو ولینٹ ایسوسی ایشن۔ 1971ء

7 ''مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں''۔ خواجہ غلام السیدین۔ سیدین میموریل ٹرسٹ دہلی 1974ء

8 ''شام کی منڈیر سے''۔ وزیر آغا۔ مکتبہ فکر و خیال لاہور 1986ء

9 ''ناممکن کی جستجو''۔ حمید نسیم۔ فضلی سنز کراچی 1990ء

10 ''جنرل کی آپ بیتی''۔ میجر جنرل شاہد حامد۔ جنگ پبلشرز لاہور 1992ء

11 ''یادوں کی برات'' جوش ملیح آبادی۔ مکتبہ شعر و ادب لاہور 1975ء

12 ''یادوں کی دنیا'' ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔ فکشن ہاؤس لاہور 1994ء

13 ''اعمال نامہ''۔ سر رضا علی۔ خدا بخش اورئینٹل لائبریری پٹنہ 1992ء

14 ''آپ بیتی''۔ عبدالماجد دریابادی۔ مکتبہ فردوس لکھنؤ۔ 1988ء

15 ''گردِ راہ''۔ اختر حسین رائے پوری۔ المسلم پبلشرز کراچی 1993ء

16 ''شہاب نامہ''۔ قدرت اللہ شہاب۔ سنگ میل لاہور 1990ء

17 ''میری داستانِ حیات'' ڈاکٹر غلام جیلانی برق۔ غلام علی اینڈ سنز لاہور 1982ء

18 ''جہانِ دانش'' ۔ احسان دانش۔ المسلم پبلشرز کراچی 1995ء

19 ''سلیوٹ'' صدیق سالک۔ مکتبہ سرمد بکس راولپنڈی 1989ء

20 ''ناقابلِ فراموش''۔ دیوان سنگھ مفتون۔ مکتبہ اردو ادب لاہور 1957ء

21. ''مٹی کا دیا'' ۔مرزا ادیب۔سنگ میل لاہور 1984ء
22. 'جو رہی سو بے خبری رہی'' ۔ادا جعفری بدایونی۔دانیال کراچی 1995ء
23. ''کھوئے ہوؤں کی جستجو'' شہرت بخاری۔سنگ میل لاہور 1987ء
24. ''بری عورت کی کتھا'' ۔کشور ناہید۔سنگ میل لاہور 1993ء
25. ''آتش چنار'' ۔شیخ محمد عبداللہ۔چوہدری اکیڈمی اردو بازار لاہور 1985ء
26. ''خوں بہا'' ۔احمد شجاع۔آتش فشاں پبلیکشنز لاہور 1991ء
27. ''بوئے گل نالہء دل دود چراغ محفل'' ۔شورش کاشمیری۔مکتبہ چٹان لاہور 1994ء
28. ''یادِ ایام'' ۔عبدالرزاق کانپوری۔آتش فشاں پبلیکیز۔1993ء (مضامین 'یادداشتیں' خاکے)
29. ''جو ملے تھے راستے میں'' ۔احمد بشیر۔مرتبہ یونس جاوید۔گورا پبلشرز لاہور 1996ء۔(خاکے)
30. ''میرا سیاسی سفر'' مخدوم زادہ حسن محمود۔ جنگ پبلشرز لاہور 1988ء
31. ''رو میں ہے رخشِ عمر'' ۔عبدالسلام خورشید۔آتش فشاں پبلیکشنز لاہور۔
32. ''آئینہء ایام'' کرنل غلام سرور۔نیشنل بک فاؤنڈیشن کراچی 1981ء
33. ''مرقاۃ الیقین'' حکیم نور الدین۔مرتبہ اکبر شاہ خان نجیب آبادی۔احمدیہ انجمن اشاعت اسلام۔ لاہور 1915ء
34. ''حیاتِ قدسی'' ۔مولانا غلام رسول راجیکی۔سیٹھ علی محمد الہ دین۔سکندر آباد دکن۔1951ء
35. ''بہ یادِ صحبتِ نازک خیالاں'' ۔آفتاب احمد خان۔دانیال کراچی 1997ء (شخصی خاکوں کا مجموعہ)
36. ''اس آباد خرابے میں'' ۔اختر الایمان۔اردو اکادمی دہلی 1996ء
37. ''گفتنی ناگفتنی'' ۔وامق جونپوری۔خدابخش اورینٹل لائبریری پٹنہ۔1993ء
38. ''دیواروں کے بیچ'' ۔ندا فاضلی۔معیار پبلیکیشنز نئی دہلی۔1992ء
39. ''دیواروں کے باہر'' ۔ندا فاضلی۔معیار پبلیکیشنز دہلی
40. ''گیان سنگھ شاطر'' ۔گیان سنگھ شاطر۔حیدرآباد۔انڈیا۔1996ء
41. ''در در ٹھوکر کھائے'' ڈاکٹر مبارک علی۔فکشن ہاؤس لاہور
42. ''چراغوں کا دھواں'' انتظار حسین۔سنگ میل لاہور 1999ء
43. '' شورش دوراں'' ۔حمیدہ سالم۔ادب پبلیکیز نئی دہلی 1995ء
44. ''ڈگر سے ہٹ کر'' ۔سعیدہ بانو احمد۔دہلی 1998ء

45. ''گرداب کی شناوری'' زہرا داؤدی۔جاوداں کراچی 1996ء
46. ''آپ بیتی'' ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل۔شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی لاہور۔1964ء
47. ''وردِ مسعود'' ڈاکٹر مسعود حسین خاں۔دہلی 1992ء
48. ''گردشِ پا'' زبیر رضوی۔دہلی 1999ء
49. ''ہماری منزل'' (انگریزی) سید ہاشم رضا۔کراچی 1998ء
50. ''پاکستان: قیادت کا بحران'' ۔ جنرل جہانداد خان۔الشفا ٹرسٹ اسلام آباد 2000ء
51. ''اپنا گریباں چاک'' جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال۔سنگ میل لاہور 2003 ء
52. ''جست بھر زندگی'' اکبر حمیدی۔رابطہ اسلام آباد 1997ء
53. ''متاعِ کارواں'' سردار محمد چوہدری۔لاہور 1997ء
54. ''غبارِ زندگی'' حسن نواز گردیزی۔لاہور۔1999ء
55. ''عشرتِ فانی'' ۔عشرت رحمانی۔لاہور 1994ء
56. ''انوکھا لاڈلا'' ۔محسن مگھیانہ۔لاہور 1997ء
57. ''آپ بیتی'' خواجہ حسن نظامی دہلوی۔دہلی 1914ء
58. ''اپنی تلاش میں'' کلیم الدین احمد۔پٹنہ۔1998ء
59. ''میرے ماہ و سال'' جاوید شاہین۔لاہور 1999ء
60. ''یادِ عہدِ رفتہ'' ۔ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ادارہ ادب و تنقید لاہور 1998ء
61. ''عبدالغفور نساخ کی خودنوشت'' مرتبہ ڈاکٹر عبدالسبحان۔ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ 1989ء
62. ''خامہ بگوش کے قلم سے'' ۔مرتبہ مظفر علی سید۔کراچی 1990ء (مضامین)
63. ہم سفر از حمیدہ اختر حسین کراچی 1995ء
64. نقشِ حیات از حسین احمد مدنی' دارالاشاعت اردو بازار کراچی اشاعت اول سن نامعلوم
65. گنجینہء گوہر از شاہد احمد دہلوی (خاکے)
66. ''خبر گیر'' خودنوشت قیصر تمکین۔دہلی
67. ''مشتِ غبار'' چوہدری اقبال احمد گوندل۔جنگ پبلشرز لاہور 1993ء
68. ''دلی یاد آتی ہے'' ۔روح افزا حیدر۔ملٹی گرافکس اسلام آباد۔2002ء
69. ''داستانِ غدر'' ۔1857ء کے چشم دید واقعات۔خودنوشت راقم الدولہ سید ظہیر الدین ظہیر دہلوی

داروغہ ماہی مراتب بہادر شاہ ظفر۔ مکی دار الکتب لاہور۔2002ء

70 ''میرا کوئی ماضی نہیں''۔سحاب قزلباش۔فضلی سنز۔کراچی 1995ء (خاکے)

71 ''میرا بیان''، اخلاق احمد دہلوی۔ مکتبہ عالیہ لاہور 1995ء

72 ''میری کہانی''اویس احمد دوراں۔دہلی 1990ء

73 خودنوشت ابوالکلام آزاد' مرتبہ ملیح آبادی دہلی 2002ء

74 ''لاہور کا جو ذکر کیا''۔گوپال متل' موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی'

75 ''کوچہء قاتل''رام لعل۔لکھنؤ 1995ء

76 ''دل بھٹکے گا''۔احمد بشیر۔فیروز سنز۔لاہور 2003

77 ''میری داستان''۔فرحت اللہ بیگ۔حیدر آباد دکن۔1970

78 ''خاطرات''۔ظفر حسن آئبک۔سنگ میل لاہور 1990

79 ''خودنوشت سوانح حیات''۔محمد مسعود کھدر پوش۔کھدر پوش ٹرسٹ لاہور 2003

80 ''جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی''۔کلیم عاجز۔عرشی پبلیکیشنز۔دہلی۔1981

81 ''یہ لاہور ہے''،ابوالحسن نغمی۔ سنگ میل۔لاہور

82 ''میرے ہمسفر''۔احمد ندیم قاسمی۔اساطیر لاہور

83 ''جہانِ حیرت''۔سردار محمد چوہدری۔لاہور،2002

84 ''آپ بیتی یا ایم اے او کالج علی گڑھ کی کہانی''۔میر ولایت حسین۔علی گڑھ۔1946

85 ''کتابِ زندگی''۔قیصری بیگم۔فضلی سنز کراچی۔2004

86 ''اور بستی نہیں یہ دلی ہے''۔رفعت سروش۔دلی 1993

87 ''باغی شہزادی کی یادداشتیں''۔(انگریزی) شہزادی عابدہ سلطان۔ memoirs of a rebel princess آکسفرڈ پریس 2002

88 ''گوہر گزشت''۔الطاف گوہر کراچی 2003

89 ''پراگندہ طبع لوگ''۔داؤد رہبر۔سنگ میل لاہور 2000

90 ''زندگی زنداں دلی کا نام ہے''۔ظفر اللہ پوشنی۔لاہور 2000

91 ''خیمہ میں واپسی''،جنرل عتیق الرحمن۔ BACK TO THE PAVILION آکسفرڈ پریس۔کراچی

92 ''یادداشتیں اور تاثرات''چیف جسٹس نسیم حسن شاہ۔ MEMOIRS AND REFLECTIONS۔الحمراء اسلام آباد 2002

93 ''جہانِ دگر''۔احسان دانش۔خزینہ علم وادب لاہور 2001

94 ''اور پھر بیاں اپنا''۔اخلاق احمد دہلوی۔مکتبہ عالیہ لاہور 1995

95 '' تماشائی کی یادداشتیں''۔اقبال اخوند۔ MEMOIRS OF A BYSTANDER آکسفرڈ پریس 1997

96 ''سفر آدھی صدی کا''۔عبدالکریم عابد۔ادارہء معارف اسلامی کراچی 2003

97 ''لمحات''۔خرم مراد۔منشورات لاہور 2004

98 ''عدالتیں کانچ کے گھر میں''۔چیف جسٹس سجاد علی شاہ۔ Law Courts in a Glasshouse۔آکسفرڈ پریس۔2001

99 ''میرا افسانہ''۔افضل حق۔لاہور 1991

100 ''گم شدہ لوگ''۔آغا ناصر۔سنگ میل لاہور 2003

101 ''یادداشتیں''۔پروفیسر حبیب الرحمن۔بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی

102 ''خاک کے پردے''۔آغا سہیل۔لاہور 2004

103 ''جائزہ''۔جسٹس محمد احمد خاں صمدانی۔سنگ میل لاہور 2003

104 ''ایک جج بولتا ہے''۔چیف جسٹس اجمل میاں۔ A JUDGE SPEAKS OUT آکسفرڈ پریس کراچی 2004

105 ''دیرپا محبت''۔ AN ENDURING LOVE ۔سابق ملکہ فرح پہلوی۔ Miramax Books. New York . 2004 .

106 ''آپ بیتی جگ بیتی''۔سعد راشد الخیری۔فکشن ہاؤس لاہور 2004

107 ''گئے دنوں کا سراغ''۔نثار عزیز بٹ۔سنگ میل لاہور 2004

108 ''کارِ جہاں دراز ہے''۔قرۃ العین حیدر۔سنگ میل لاہور 2003

109 ''میری داستان''۔محمد منصور کاظم۔ کراچی 2002

110 ''ہاں میں باغی ہوں''۔مخدوم جاوید ہاشمی۔ساگر پبلشرز لاہور 2005

111 ''میں کیا میری حیات کیا''۔پروفیسر اطہر صدیقی۔ایجوکیشنل بک ہاؤس علیگڑھ 2003

112 ''نامہء اعمال''۔نواب سر محمد یامین خان۔آئینہء ادب لاہور 1970
113 ''غبارِ کارواں''۔بیگم انیس قدوائی۔مکتبہ جامعہ نئی دہلی 1983
114 ''امرتسر کی یادیں''۔اے حمید۔لاہور 1984
115 ''منزلیں گرد کی مانند''خلیق ابراہیم خلیق۔فضلی سنز کراچی 1999
116 ''یادخزانہ''۔جمیل زبیری۔دانیال کراچی 1993
117 ''زندگی کی شاہراہیں اور پگڈنڈیاں''۔جسٹس محمد منیر،لاہور 1978
"Highways & byeways of life"
118 ''رسیدی ٹکٹ''امرتا پریتم۔لاہور (پبلشر اور سال اشاعت نامعلوم)
119 ''یادوں کے سائے''عتیق صدیقی۔مکتبہ جامعہ دہلی۔ 1974
120 ''شاد کی کہانی شاد کی زبانی''۔شاد عظیم آبادی۔معارف پریس اعظم گڑھ 1958
121 اردو میں خودنوشت سوانح حیات۔ڈاکٹر صبیحہ انور۔(مقالہ پی ایچ ڈی لکھنؤ یونیورسٹی)۔نامی پریس۔
خواجہ قطب الدین روڈ۔لکھنؤ بار اول 1982
122 ''آشنائیاں کیا کیا''(خاکے) حمید اختر۔جنگ پبلشرز لاہور 2003
123 ''احوالِ واقعی''۔(اخباری کالم) حمید اختر۔بک ہوم۔لاہور 2005
124 ''کال کوٹھری''۔(زنداں نامہ) حمید اختر۔جنگ پبلشرز لاہو 1993
125 ''احوالِ دوستاں''۔(خاکے) حمید اختر۔لاہو 1988
126 ''گلشنِ یاد''۔آغا ناصر،سنگِ میل لاہو 2005
127 ''گولیوں کی زد میں''۔ In the Line of Fire پرویز مشرف۔فری پریس نیویارک۔
2006۔پہلا ایڈیشن۔
128 ''ڈھلتے سائے''منیر الدین احمد۔قوسین لاہور زیر طبع
129 ''آپ بیتی''۔مولانا زکریا کاندھلوی۔مھد الخلیل الاسلامی۔بہادر آباد کراچی۔سال اشاعت نامعلوم
130 ''کالا پانی''مولانا محمد جعفر تھانیسری۔طارق اکیڈمی،فیصل آباد دسمبر 2001
131 ''چہرے''۔سحاب قزلباش۔اشارات پبلیکیشنز کراچی مارچ 2002، پہلا ایڈیشن
132 ''گمنام و بے ہنر''۔خودنوشت محمد سعید احمد،لاہور 2005 پہلا ایڈیشن
133 ''پاکستان خوابِ پریشاں''۔روئیداد خاں۔Pakistan- a dream gone sour

آکسفرڈ یونیورسٹی پریس 1997۔کراچی پہلا ایڈیشن
134 یادایام۔نواب ڈاکٹر احمد سعید خاں چھتاری۔مسلم ایجوکیشنل پبلشرز علی گڑھ۔سن اشاعت نامعلوم
135 گئے دنوں کا سراغ۔مظفر وارثی۔خزینہء علم وادب۔الکریم مارکیٹ لاہور مارچ 2000۔پہلا ایڈیشن
136 یادوں کی مالا۔رمیض احمد ملک۔تخلیقات مزنگ روڈ۔لاہور نومبر 2001۔پہلا ایڈیشن
137 ڈی سی نامہ۔محمد سعید شیخ سنگ میل لاہور 2004 پہلا ایڈیشن
138 پریم چند کی آپ بیتی۔مدن گوپال،موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی ستمبر 2001۔پہلا ایڈیشن
139 ان دیکھی گہرائیاں۔ہارون ابنِ علی۔ایون بکس۔لندن۔ترجمہ بزم تخلیق ادب پاکستان
کراچی 2006
140 یادوں کی نگری۔حافظ بدرالدین۔مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر دہلی۔مارچ 2002
141 چھتیس برس۔ایم ایم حسن۔انجمن علم ودانش کراچی فروری 1993
142 دیدہ شنیدہ۔سید شہاب الدین دسنوی مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی جون 1993
143 لخت لخت داستان۔بریگیڈیر محمد اسماعیل صدیقی۔دوست پبلیکیشنز اسلام آباد طبع اول 2001
144 تمنا بیتاب رشید امجد حرف اکاڈمی۔پشاور روڈ راولپنڈی۔طبع اول 2003۔
145 عمر رفتہ۔نقی محمد خاں خورجوی۔ادارہء علم وفن ملیر ہالٹ کراچی 2003
146 داستان امیر حمزہ شنواری (گفتگو خاطر غزنوی) سنڈیکیٹ آف رائٹرز پشاور بار اول 1996
147 کہانی مختصر کوئی نہیں ہے۔غوث متھراوی۔ظہوریہ اکیڈمی خیابن بدر کراچی جولائی 2003
148 جگر لخت لخت۔ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار۔مکتبہ خیابان ادب لاہور اپریل 2005
149 زندگی کی یادیں۔جہاں آرا حبیب اللہ۔آکسفرڈ یونیورسٹی پریس 2003
150 پاپ بیتی۔اشفاق نقوی۔نیو لائن۔کیولری گراؤنڈ لاہور۔سال اشاعت نامعلوم
151 عمر گزشتہ۔سمیع محمد خان۔بزم تخلیق ادب پاکستان کراچی اشاعت دوم 2006
152 بتیس برس امریکہ میں۔ابوالحسن نغمی سنگ میل پبلیکیشنز لاہو 2006
153 حیات بقا اور کچھ یادیں۔محمد مظہر بقا۔زوار اکیڈمی پبلیکیشنز کراچی اپریل 2006
154 دنیا ساری خواب۔شیخ ایاز کی آپ بیتی۔ترجمہ اسلم رحیل مرزا۔الفاظ پبلیکیشنز شمع پلازا لاہور
جنوری 1998
155 جنت سے نکالی ہوئی حوا۔نفیس بانو شمع آبشار پبلیکیشنز۔جامعہ نگر نئی دہلی۔1998

156 کاروانِ حیات۔ نواب مشتاق احمد خاں۔ ناشر مشتاق احمد خاں۔ ۱۸۰ اڈی۔ ماڈل ٹاؤن لاہور۔ اگست 1974

157 سفرِ زندگی۔ ڈاکٹر کرن سنگھ مہاراجہ کشمیر۔ سرینگر۔

158 نشانِ جگر سوختہ ڈاکٹر سلیم اختر۔ سنگ میل لاہور 2005

159 کارنامہء سروری۔ علی گڑھ یونیورسٹی پریس 1929

160 ایم ایف حسین کی کہانی اپنی زبانی۔ احمد مقصود حمیدی خیابانِ باغبان کراچی دسمبر 2004

161 یاد کی رہگزر۔ شوکت کیفی۔ دانیال کراچی پہلا پاکستانی ایڈیشن 2006

162 داستاں کہتے کہتے۔ صبیح محسن۔ مکتبہ جمال گلستان جوہر کراچی اپریل 2006

163 داستان حافظ بزبان حافظ۔ خودنوشت حافظ قدرت اللہ۔ لانگ ول کیوبیک کینیڈا 2006

164 حیات مستعار۔ جلیل قدوائی۔ کراچی۔ 1998

◎

ٹھنڈی ہوا کا جھونکا۔۔۔

وزیر آغا

آپ نے پورے توازن اور غیر جانب داری سے کام لیتے ہوئے حق بات کا اظہار کیا ہے۔

احمد ندیم قاسمی

آپ کی زبان کی شستگی نہایت قابلِ تعریف ہے، برمحل اشعار اور امثال سے آپ کی عبارات آراستہ ہیں، آپ کی نثر تیز رفتار ہے، موسیقی کی اصطلاح میں کہیں گے آپ کی نثر کی لے درت ہے۔ آپ نے آہ کہیں نہیں بھری نہ ہاتھ اٹھا کر واہ کہہ کر کہیں داد دی ہے۔

ڈاکٹر داؤد رہبر

Fascinating world of Urdu memoirs. This is the stuff of best sellers..... He is singular in giving a total sense of the book under consideration, red-penciling the portions that would most interest the reader, and then nailing the writer for his lies and self-serving inventions.

Khaled Ahmed, daily times, Lahore

ISBN 978-969-9179-01-3

Price Rs. 600/-